اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

سُوْرَةُ الْمُلْک (٦٧) ...... سُوْرَةُ النَّاسِ (١١٤)

(جلد: ١٢)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے،پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑ گڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِلنَّاس

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

سُوْرَۃُ الْمُلْک (٦٧) ...... سُوْرَۃُ النَّاسِ (۱۱۴)

(جلد: ۱۲)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

109527

نام کتاب	:	تفسیر روح القرآن
مؤلف	:	ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر	:	ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ
کمپوزنگ	:	زاہد حسین
پرنٹرز	:	محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت	:	ستمبر 2011ء
تعداد	:	1000
قیمت	:	800 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ 343-مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔فون:042-35426800

۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انار کلی لاہور۔

۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔

۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔

۵۔ ۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔فون: 042-37248676-37320961

ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074

۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

موبائل: 0300-8485030۔فون: 042-37225030

Marfat.com

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ ھُدًی لِلنَّاس نے اس کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کرلیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

Marfat.com

فہرست

(سورۃ الْمُلْکِ .... سُوْرَۃُ النَّاسِ)

سُوْرَۃُ الْمُلْکِ

تعارف 41
نام 41
زمانۂ نزول 41
سورۃ کا موضوع اور مضمون 41
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 42
سُوْرَۃُ الْمُلْکِ 44
تَبٰرَکَ کا مفہوم 46
قدرتِ کاملہ کی دلیل 47
انسانوں کا مقصدِ تخلیق 47
اللہ تعالیٰ کی قدرت وعظمت کے مظاہر 48
اللہ تعالیٰ کی ذات جلال وجمال کی جامع ہے 50
کفر کا نتیجہ جہنم ہے 51
شَہِیْق کے مفہوم کی وضاحت 52
جہنم کے جوش وغضب کی تعبیر 52
اہلِ جہنم کے اعتراف کی مزید تفصیل 53
اصلاحِ اخلاق کی اصل بنیاد 54
اللہ تعالیٰ کے علم کی ہمہ گیری 55
اللہ تعالیٰ کے مزید احسانات کا ذکر 58
قہر وانتقام سے انسانی ہدایت پر استدلال 59
ایک غلط فہمی کا ازالہ 60
فضائی عذاب کی دھمکی 61

Marfat.com

تاریخ کے حوالے سے قریش کو تہدید 62
مخلوق کی بے بسی اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے استشہاد 63
کفار کی خود فریبی پر تنبیہ 63
اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں قریش کی ہٹ دھرمی 64
انسان کے بگاڑ کے اصل اسباب 65
اپنے من میں ڈوب کر فیصلہ کرنا سیکھیے 66
آخرت میں جواب دہی پر ایک عقلی دلیل 66
کفار کا لغو معارضہ اور اس کا جواب 67
قیامت کے روز مخالفت کا انجام 68
حقیقت پسندی کی دعوت 68
حق و باطل کی کشمکش میں اہلِ حق کا کردار 69
گزشتہ مضمون کی مزید وضاحت 69
کفار کو تنبیہ 70

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْقَلَمِ

تعارف 73
نام 73
زمانۂ نزول 73
موضوع اور مضمون 73
سُوْرَةُ الْقَلَمِ 75
قسم، جوابِ قسم اور قلم سے مراد 77
آنحضرت ﷺ پر الزامات کا رد 78
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور پروپیگنڈے کا جواب 79
خلقِ عظیم کا مفہوم 80
آنحضرت ﷺ کیلئے تسلی اور مخالفین کیلئے تنبیہ 81

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی 82
تبلیغ ودعوت کے ضمن میں آپ کو ہدایت 83
مخالفین کی مخالفت کا اصل سبب 83
مکذبین کی قیادت کا اصل چہرہ دکھایا گیا ہے 84
قریش کے سرداروں کیلئے ایک تمثیل 88
حاصلِ نصیحت اور قریش کو تنبیہ 91
اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا انجام 93
اچھوں اور بروں میں فرق عقل اور اخلاق کا تقاضا ہے 94
ایک مغالطے کی تردید 96
قیامت کے روز مشرکین کی رسوائی 98
کشفِ ساق کا مفہوم 98
منکرین کو دھمکی اور استدراج کا مفہوم 99
مخالفین کی بے حسی پر اظہارِ تعجب 100
گزشتہ مضمون کا تسلسل 101
آنحضرت ﷺ کو دعوت پر جمے رہنے کی تلقین 101
حضرت یونس علیہ السلام کے مقام کی وضاحت 103
کفار کی طرف سے نفسیاتی حربہ 103

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْحَاقَّةِ

تعارف 106
نام 106
زمانۂ نزول 106
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 107
سُوْرَةُ الْحَاقَّةِ 108
اَلْحَاقَّةِ کا مفہوم 110

Marfat.com

اَلْقَارِعَةِ کامفہوم اور قیامت کے انکار کا اہتمام 111
قومِ عاد کا انجام اور عَاتِيَةٍ کامفہوم 113
فرعون اور قومِ عاد کا انجام 114
عذاب کا سبب 114
طوفانِ نوح سے بچ جانے والوں کا تذکرہ 115
ظہورِ قیامت کی تفصیلات 116
وقوعِ قیامت کی شدت اور قریش کی غلط فہمیوں کی تردید 117
عرشِ رحمٰن کی حقیقت 117
جزاء وسزا کی تفصیل 118
ظن کامفہوم 119
جنت کی نعمتوں کی خصوصیت اور اہلِ جنت کا اعزاز 120
اصحابُ الشمال کا حال 121
اصحابُ الشمال کے بنیادی جرائم 123
''لا'' کامفہوم 125
پیشِ نظر آیتوں میں قَسم اور جوابِ قَسم کامفہوم 125
قَلِيْلاً مَّا تُؤْمِنُوْنَ اور قَلِيْلاً مَّا تَذَكَّرُوْنَ کامفہوم 128
کفار کے الزام کا جواب 129
آنحضرت ﷺ کو تسلی 130
مکذبین کو وعید 131
آنحضرت ﷺ کا زادِ سفر 132

سُوْرَةُ الْمَعَارِج

تعارف 135
نام 135
مقامِ نزول 135
زمانۂ نزول 135

Marfat.com

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 135
سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ 137
سَأَلَ کا معنی و مراد 139
عذاب میں تاخیر کے باب میں کوتاہی فکر کی اصلاح 140
پچاس ہزار سال کا مفہوم 141
آنحضرت ﷺ کو صبر کی تلقین 142
قیامت یا عذاب کے دور یا قریب ہونے کا مفہوم 143
قیامت کی منظر کشی 144
قیامت کی مزید تفصیل 144
راہِ حق سے گریز اور حُبِ مال کو ایک ساتھ ذکر کرنے کا سبب 146
هَلُوْعٌ کا مفہوم 146
ایک شبہ کا ازالہ 147
زندگی میں بے اعتدالی سے محفوظ لوگ اور ان کی صفات 147
پہلی صفت مداومت کا مفہوم 148
دوسری صفت انفاق 149
تیسری صفت روزِ جزاء کا یقین 150
نیک بندوں کے طرزِ فکر کی تعریف 150
چوتھی صفت کردار کی پاکیزگی 151
ایک غلط فہمی کا ازالہ 152
متعہ کا رد 153
اہلِ تشیع کی جسارت 153
پانچویں اور چھٹی صفت امانتوں اور عہد کی پاسداری 154
اہلِ ایمان کی ایک اور صفت 154
ساتویں صفت ادائے شہادت 155
آٹھویں صفت نماز کی محافظت 155
مذکورہ اوصاف کے حاملین کا انعام 156

Marfat.com

قرآن کی دعوت اور تلاوت کے وقت کفار کا طرزِ عمل 158
کفار کی اس حماقت پر تنقید 159
کفار کی نوعی حقیقت سے استدلال 159
مشارق ومغارب کی قسم اور مفہوم 160
ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں 161
نُصُب کا مفہوم 162

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ نُوْحٍ

تعارف 165
نام 165
زمانۂ نزول 165
گزشتہ سورۃ سے ربط 165
مضمون 166
سُوْرَۃُ نُوْحٍ 167
پیغمبر کی بعثت کا مقصد 169
حضرت نوح علیہ السلام کی حیثیت اور ذمہ داری 169
عذاب سے بچنے کیلئے تین ہدایات 170
ان ہدایات کو مان لینے کا پہلا انعام 171
دوسرا انعام 171
حضرت نوح علیہ السلام کی عرضداشت 172
مستکبرین کے استکبار کی تصویر 173
فریضۂ رسالت پر پیغمبر کی استقامت 174
نرمی اور حکمت سے دعوت کی مثال 175
تخلیق کے مختلف مراحل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال 176
اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ہمہ گیری 178

Marfat.com

قوم کی سنگدلی 181
بگاڑ کا سبب متکبرین ہیں 181
لیڈروں کی قوم کو بت پرستی پر جمے رہنے کی تلقین 182
حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لیڈروں کی روش سے مایوسی 183
دعا کی قبولیت 183
اتمامِ حجت کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کافروں سے بیزاری 184

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ الْجِنِّ

تعارف 188
نام 188
زمانۂ نزول 188
جن کی حقیقت 190
سابق سورۃ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ 192
سُوْرَۃُ الْجِنِّ 194
نَفَرٌ کا مفہوم 196
آیت کے الفاظ سے مترشح ہونے والے بعض نکات 197
لفظ قرآن کا مفہوم 198
قُلْ سے آغاز کا سبب 198
جنات کی شرک سے توبہ 198
سَفِیْہ کا مفہوم 199
عذرِ سابق کی وضاحت 200
اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا کا مفہوم 201
جنات کو آسمانی تغیرات کا سبب جاننے کی جستجو 202
ہدایت کی طرف میلان 203
اعترافِ حق 204

Marfat.com

ایک اور فکری کوتاہی کی اصلاح 204
روئے سخن قریش کی طرف 205
کثرتِ مال و دولت ایک آزمائش ہے 206
برعکس صورتحال 207
آنحضرت ﷺ کو استقامت کا حکم 209
آنحضرت ﷺ کی حیثیت کی وضاحت 209
مزید وضاحت 210
قریش کے زعمِ باطل کا رد 210
مخالفین کے طنز کا جواب 211
قیامت کے وقتِ معین سے میری بے خبری عالم الغیب نہ ہونے کے سبب سے ہے 211
استثناء کا مفہوم 212

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

تعارف 215
نام 215
زمانۂ نزول 215
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 217
سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ 218
مُزَّمِّل کا مفہوم 220
قِیَامُ الَّیْل کی مقدار 221
تَرْتِیل کا مفہوم 221
قِیَامُ الَّیْل کا سبب 222
قولِ ثقیل سے مراد 222
نَاشِئَةَ الَّیْلِ کا مفہوم اور اس کی حکمت 223
وَاَقْوَمُ قِیْلاً کا مفہوم 224

Marfat.com

قِیَامُ الَّیل کی ایک اور حکمت 225
ذِکْرُاللّٰہ اور تَبَتُّل کا حکم اور مفہوم 226
وَکِیل کا مفہوم 227
مخالفین کی یاوہ گوئی پر صبر جمیل کا حکم 227
تکذیب کرنے والوں کو سخت دھمکی 228
قریش کو براہِ راست تنبیہ 230
رسول کی حیثیت و عظمت 230
شاہد کا مفہوم 231
قیامت کی ہولناکی سے تنبیہ 231
قِیَامُ الَّیل یا تہجد کی وضاحت، حکم میں تخفیف 234
تخفیف کی علت اور احصاء کی وضاحت 235

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّر

تعارف 240
نام 240
زمانۂ نزول 240
موضوع اور مضمون 242
سُوْرَةُ الْمُدَّثِّر 244
مُدَّثِّر اور مُزَّمِّل کا مفہوم اور مراد 246
انذار کا حکم 247
انذار کا پہلا حکم سب سے بڑے بگاڑ کی اصلاح ہے 247
ثیاب کا مفہوم 249
رُجز کا تلفظ اور مفہوم 251
مَن اور اِسْتِکْثَار کا مفہوم 251
صبر کا مفہوم 253

Marfat.com

انذار کا اصل موضوع 253
مکے اور طائف کے متکبرین کو سخت تنبیہ 254
احسان ناشناسی کی سزا 256
معاندین کے عناد کی تصویر 256
معاندین کا انجام 257
متشابہات کے ذکر سے مومنوں کی ذہنی تربیت ہوتی ہے 259
دلائلِ آفاق سے اثباتِ قیامت اور قسموں کی وضاحت 261
اعمال پر کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے 263
اہلِ جنت کا سوال اور اہلِ جہنم کا اعتراف 264
شفاعتِ باطلہ کی نفی 266
اعراض کرنے والوں کے حال پر تعجب 266
اعراض کا بہانہ 267
مشرکین کا اصل مرض 268
آنحضرت ﷺ کو تسلی 269
ہدایت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت 269

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْقِيٰـمَةِ

تعارف 272
نام 272
زمانۂ نزول 272
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 272
سُوْرَةُ الْقِيٰـمَةِ 274
قسم سے پہلے "لا" کا استعمال 275
مقسم علیہ کے ذکر نہ کرنے کی وجہ 276
نفسِ لوامہ کی حقیقت 277

Marfat.com

نفس کے توازن کو قائم رکھنے کی تدبیر 277
بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے 278
چند سوال اور ان کے جواب 278
منکرین کا اعتراض اور اس کا جواب 279
منکرینِ قیامت کا اصل مرض 280
قیامت کا منظر نامہ 282
قیامت کا مقصد 283
ایک اشتباہ کا جواب 284
ان آیات کا پس منظر 285
اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ کا مفہوم 286
تکذیبِ قیامت کی اصل علت 289
قیامت کے دن اقرار اور انکار کرنے والوں کی کیفیت 290
جان کنی کی کیفیت کو یاد رکھو 291
منکرینِ آخرت کی کیفیت اور انجام 292
انسان کی گمراہی اور اس کا رد 293
امکانِ قیامت کے دلائل 294

سُوْرَةُ الدَّهْرِ

تعارف 298
نام 298
زمانۂ نزول 298
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 300
سُوْرَةُ الدَّهْرِ 302
هَلْ کا مفہوم 304
دَهْر سے مراد 304
انسان کو مزید غور کی دعوت 305

Marfat.com

انسان کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت 307

غلط انتخاب کا نتیجہ 307

شکرگزاروں کا انعام 308

ابرار کی پاکیزہ فطرت اور ان کی صفات 309

ابرار کی ایک اور صفت 310

ابرار ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب 311

ابرار پر اللہ تعالیٰ کا انعام 312

صبر کی صفت کا صلہ 313

تقدیر کا مفہوم 314

زنجبیل اور سلسبیل کا مفہوم 314

اہلِ جنت کے خدام 315

جنت کی حیرت انگیز تصویر 315

اہلِ جنت کا ایک خاص اعزاز 317

آنحضرت ﷺ کو صبر اور انتظار کی تلقین 318

ذکر اور نماز سے توفیق ملتی ہے 319

مخالفین کی اصل بیماری 320

مخالفین کو دھمکی اور ایک شبہ کا جواب 320

بے نیازی کا اظہار 321

توفیق کیلئے اللہ تعالیٰ کی سنت 321

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

تعارف 325

نام 325

زمانۂ نزول 325

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 325

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ 328

Marfat.com

وقوعِ قیامت پر پانچ قسموں کا مفہوم اور تعین 330
نفخۂ اولیٰ کے بعد کی ہلچل 332
نفخۂ ثانیہ کے بعد کی کیفیت 334
فیصلے کے دن کی اہمیت 334
قیامت کا نتیجہ 335
قیامت کے حق میں تاریخ سے استدلال 336
قیامت کے وقوع پر ایک انفسی دلیل 337
یوم الفصل پر اہتمامِ ربوبیت سے دلیل 338
قیامت میں منکرین کا حشر 339
ظِلّ کی وضاحت 340
متقین کا انجام 342
اعمالِ حسنہ کا حیرت انگیز نتیجہ 343
اشرافِ قریش سے براہِ راست خطاب 343
منکرینِ قیامت کو ملامت 344
آخری تنبیہ 344

☆☆☆☆

سُوْرَةُ النَّبَاِ

تعارف 347
نام 347
زمانۂ نزول 347
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 347
سُوْرَةُ النَّبَاِ 350
قیامت کی اہمیت وعظمت کو اجاگر کیا گیا ہے 352
منکرین کے استہزاء کا جواب اور تنبیہ 353
قیامت اور بعض دیگر حقائق پر آیاتِ ربوبیت سے استدلال 354

Marfat.com

قیامت کے وقوع پذیر ہونے کا منظر 358
قیامت سے ڈرنے والوں کا صلہ 361
جنت کے اعمال کا صلہ بھی اور اللہ تعالیٰ کی عطا بھی 362
آخری تنبیہ 365

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ النّٰزِعٰتِ

تعارف 369
نام 369
مقامِ نزول 369
زمانۂ نزول 369
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 369
سُوْرَۃُ النّٰزِعٰتِ 371
ان پانچ قسموں کا مفہوم 372
قسم اور مقسم علیہ کا مفہوم 373
وقوعِ قیامت کی تصویر 375
قلوب پر قیامت کا اثر 375
کفار کے استہزاء کی تصویر 376
حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت سے استشہاد 377
فرعون کی سرکشی اور حضرت موسیٰؑ کی ہمدردانہ دعوت 377
سندِ ماموریت کے طور پر عظیم معجزہ کا اظہار 379
فرعون کا رویہ 379
فرعون کے ربِ اعلیٰ ہونے کا مفہوم 380
عبرت انگیز گرفت 381
مظاہر قدرت سے قیامت پر استدلال 383
فیضانِ ربوبیت سے قیامت پر استدلال 384

Marfat.com

احوالِ قیامت 386
جنت وجہنم میں جانے کے اسباب 387
آنحضرت ﷺ کو تسلی 388
منکرینِ قیامت کی بے خبری 389

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ عَبَسَ

تعارف 392
نام 392
مقامِ نزول 392
زمانۂ نزول 392
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 393
سُوْرَۃُ عَبَسَ 395
پہلی دو آیتوں میں آنحضرت ﷺ سے خطاب نہ کرنے کی وجہ 397
آیت کا شانِ نزول 397
طالبِ حق کی دو صفتیں 398
اصل تنبیہ 399
پیغمبر کی اصل ذمہ داری 400
گزشتہ مضمون کی مزید وضاحت 401
کفار پر براہِ راست عتاب 403
انسان کی ناشکری پر اظہارِ تعجب 403
انسان پر احسانات سے استدلال 404
انسان کو تنبیہ 406
تدبر کی نگاہ ہو تو دلائل کی کمی نہیں 406
قیامت کی ہولناکی 409

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ

تعارف 413

نام 413

زمانۂ نزول 413

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 413

سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ 415

وقوعِ قیامت کے وقت سورج کا حال 416

ستاروں کا حال 417

پہاڑوں کا حال 417

محبوب چیزوں سے غفلت 417

وحشی جانوروں کا حال 418

سمندر بھڑک اٹھیں گے 418

ظہورِ قیامت کے بعد کے احوال 419

مظلوم بچیوں کی دادرسی 420

اعمال نامے سب کے سامنے 421

آسمان کی کیفیت 421

جہنم کا بھڑک اٹھنا 422

جنت کا قرب 422

ہر نفس کا احساسِ ماحضر 422

اشرافِ قریش کے پروپیگنڈے کا جواب 423

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی صفات 425

قریش کو تنبیہ 426

اللہ تعالیٰ کا رسول غیب کا حریص نہیں 426

قریش کے پروپیگنڈے کا مزید جواب 427

ہدایت وضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کا قانون 428

Marfat.com

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

تعارف 431
نام 431
زمانۂ نزول 431
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 431
سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ 433
نفخۂ اولیٰ کے بعد آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر 434
ستاروں کی پراگندگی 435
سمندروں کا پھٹ جانا 435
نفخۂ ثانیہ کے بعد قبروں کا کھولا جانا 436
قیامت کے اصل مقصد کا ظہور 436
انسان کے بگاڑ کا اصل سبب جواب دہی سے بے نیازی ہے 437
اللہ تعالیٰ کا اپنی بعض صفات سے استدلال 437
مکذبینِ قیامت کو تنبیہ 438
مکذبین کی غلطی کا ازالہ 439
اللہ تعالیٰ کے نظامِ احتساب کا نتیجہ 439

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

تعارف 444
نام 444
زمانۂ نزول 444
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 445
سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ 446
مُطَفِّفِيْنَ کا مفہوم 448
ان لوگوں پر لعنت جن کے لینے کے باٹ اور، اور دینے کے باٹ اور ہیں 448
اس خصلتِ بد کا سبب 449

Marfat.com

مخاطبوں کے زعمِ باطل کی تردید 450
سجین کی تحقیق 451
قیامت کا انکار کرنے والے دو بیماریوں کے مریض ہیں 452
مکذبین کا طریقِ تکذیب 452
تکذیب کا اصل سبب 453
مکذبین کی بدنصیبی 453
ان بدنصیبوں کا انجام 454
ابرار کا مقام 454
علیین کی تحقیق 455
انسانی روحوں کا مقام کہاں ہے 455
ابرار کی عزت افزائی 457

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

تعارف 463
نام 463
زمانۂ نزول 463
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 463
سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ 465
وقوعِ قیامت سے بپا ہونے والی ہلچل 466
دنیا کے فریب خوردگان کو تنبیہ 468
قیامت کے روز اصحاب الیمین کا انجام 469
آخرت سے بے نیاز لوگوں کا انجام 470
اصحاب الشمال کی بدبختی کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے 471
اصحاب الشمال کی حماقت 471
قیامت پر تین شواہد 472
مخالفین کے ایمان نہ لانے پر تعجب کا اظہار 473

Marfat.com

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

تعارف 477
نام 477
مقامِ نزول 477
زمانۂ نزول 477
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 477
سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ 479
لفظِ بروج کی تحقیق 480
قیامت کی قیامت پر قسم 481
قریش کو تنبیہ اور اصحاب الاخدود کی وضاحت 482
کفار کے نزدیک ایمان باللہ سب سے بڑا جرم ہے 485
اللہ تعالیٰ کی صفات 486
ظالموں کو وعید 487
ایمان پر ثابت قدم رہنے والوں کو بشارت 488
سابقہ صفات کو مؤکد کرنے کیلئے مزید صفات کا تذکرہ 489
سابقہ حقائق پر تاریخ سے استدلال 490

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الطَّارِقِ

تعارف 494
نام 494
مقامِ نزول 494
زمانۂ نزول 494
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 494
سُوْرَةُ الطَّارِقِ 496
آسمان اور ستاروں کی قسم 497

109527

Marfat.com

یہ مقسم علیہ ہے اور قسم اس پر دلیل ہے 498
دوسری زندگی پر انسان کے وجود سے استدلال 498
قیامت کے پس پردہ محرکات کا بھی حساب ہوگا 499
قرآن کے قولِ فیصل ہونے پر آفاقی شہادت 500
آنحضرت ﷺ کو تسلی 501

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى

تعارف 505
نام 505
مقامِ نزول 505
زمانۂ نزول 505
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 505
سُوْرَةُ الْاَعْلٰى 507
اللہ تعالیٰ کی یاد کی اہمیت 508
تکوینِ وجود کے چار مراتب 509
اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر دلیل 511
وحی کے بارہ میں ایک وضاحت 512
آنحضرت ﷺ کو تسلی 513
آنحضرت ﷺ کو یُسر کی بشارت 513
ہدایت وضلالت کے باب میں سنت الٰہی 514
فلاح کے مستحق کون ہیں اور اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ 515
مخالفین کی مخالفت کا اصل سبب 516
ایک ہی حقیقت کی سب کو تلقین کی گئی 516

Marfat.com

سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃِ

تعارف 519
نام 519
مقامِ نزول 519
زمانۂ نزول 519
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 519
سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃِ 521
قیامت اور احوالِ قیامت کی تصویر 522
قیامت کے منکرین کا حال 523
اہلِ جہنم کی غذا 523
قیامت کے دن اہلِ ایمان کا حال 524
اہلِ جنت کی مجلس نہایت شائستہ ہوگی 524
اہلِ جنت کی آرائش وزیبائش کی تصویر 525
قیامت پر سامنے کی چیزوں سے استدلال 527
دلائل سے اثباتِ مدعا کے بعد آنحضرت ﷺ کو تسلی 529

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ الْفَجْرِ

تعارف 533
نام 533
زمانۂ نزول 533
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 533
سُوْرَۃُ الْفَجْرِ 535
ان پانچ قسموں کا مفہوم اور جوابِ قسم کا تعین اور مفہوم 537
آفاق کی شہادت کے بعد تاریخ سے استدلال 540
پہلی شہادت قومِ عاد کے حالات سے 541

Marfat.com

دوسری شہادت قومِ ثمود کے حالات سے	542
تیسری شہادت فرعون سے	542
خلاصۂ بحث	543
انسان کی فکری کجی	544
فکری کجی کا ازالہ	545
مال کے پرستاروں کو تنبیہ	547
اللہ تعالیٰ کے دین پر مکمل ایمان اور تقویٰ رکھنے والوں کو براہِ راست بشارت	548

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ الْبَلَدِ

تعارف	551
نام	551
مقامِ نزول اور زمانۂ نزول	551
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ	551
سُوْرَۃُ الْبَلَدِ	553
قسم سے پہلے ''لا'' کا مفہوم اور قسم کی وضاحت	554
آیت کے مختلف مفاہیم اور جوابِ قسم کے مناسب مفہوم	555
یہ جوابِ قسم ہے اس کی وضاحت	555
انسان کی مزید کج فہمی	557
شیخی بگھارنے والوں کا محاسبہ	557
نعمتوں کا صحیح مصرف	558
نعمتوں کی ناقدری پر افسوس کا اظہار	559
عَقَبَہ کی وضاحت	560
عَقَبَہ سر کرنے والوں کے مزید اوصاف	561
اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ اور اَصۡحٰبُ الۡمَشۡئَمَۃِ میں فرق	562

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

تعارف 565

نام 565

زمانۂ نزول 565

مضامین 565

سُوْرَةُ الشَّمْسِ 567

قسموں کی وضاحت 568

یہ قسمیں آفاق کی ایسی نشانیاں ہیں جو زوجین کی نسبت رکھتی ہیں 569

ان قسموں سے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات پر توجہ دلائی گئی ہے 569

آفاقی شہادتوں کے بعد نفسیاتی شہادت 570

الہام کی وضاحت 571

یہ جوابِ قسم ہے 572

تزکیۂ نفس کا مطلب 572

ایک تاریخی شہادت 573

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الَّیْلِ

تعارف 577

نام 577

مقامِ نزول 577

زمانۂ نزول 577

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 577

سُوْرَةُ الَّیْلِ 579

تخالف اور تضاد کے باوجود ان میں قدرِ مشترک سے استدلال 580

نیکوں کی صفات 581

نیکیوں کا انعام 582

Marfat.com

بروں یعنی اہلِ شقاوت کی خصوصیات	582
برے اعمال کی سزا	583
حُبِ مال اور بخل کا انجام	584
انسانوں کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے	585
قریش کو تنبیہ	585
قریش اور دیگر آنحضرت ﷺ کے مخالفین بدترین انجام سے دوچار ہوں گے	586
کفار سے برعکس صفات رکھنے والا جنت کا مستحق ہوگا	587
سابقہ آیت کی وضاحت	587
شانِ نزول کے مطابق اس آیت کا مصداق حضرت صدیق اکبرؓ ہیں	587

سُوْرَةُ الضُّحٰی

تعارف	591
نام	591
مقامِ نزول	591
زمانۂ نزول	591
سُوْرَةُ الضُّحٰی	592
ضُحٰی اور سَجٰی کا مفہوم	593
یہ جوابِ قسم ہے اس کی وضاحت	593
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور بشارت	594
سابقہ مضمون کی مزید وضاحت	595
آنحضرت ﷺ کی زندگی کے بعض حالات سے استدلال	596
گزشتہ مضمون کی وضاحت اور ضَآلٌ کا مفہوم	596
مزید وضاحت	597
اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے پہلے احسان کا حق	598
دوسرے احسان کا حق	599
نعمت کی وضاحت	600

Marfat.com

سُوْرَۃُ اَلَمْ نَشْرَحْ

تعارف 603
نام 603
مقامِ نزول 603
سورۃ کے مضامین 603
سُوْرَۃُ اَلَمْ نَشْرَحْ 604
شرح صدر کا مفہوم 604
نبوت اور نزولِ قرآن نے آپ کے شدید احساس کا بند تالا کھول دیا 606
آپ کے نام اور آپ کے لائے ہوئے دین کا چاردانگِ عالم میں چرچا کر دیا 607
اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون 609
آخری منزل کیلئے جدوجہد 610

سُوْرَۃُ التِّیْنِ

تعارف 614
نام 614
مقامِ نزول اور زمانۂ نزول 614
مضامین 614
سُوْرَۃُ التِّیْنِ 616
چار قسموں کی وضاحت 617
تقویم کا مفہوم 618
یہ جوابِ قسم ہے اس کی وضاحت 619
دین سے انحراف آدمی کو پست ترین حالت میں پہنچا دیتا ہے 620
یہ لوگ احسنِ تقویم کے مصداق ہیں 620
متذکرہ بالا حقیقت کے قبول کر لینے کے بعد روز جزا کی تکذیب کا کیا موقع ہے 621
اس سوال کے جواب میں ہدایت مضمر ہے 622

Marfat.com

سُوْرَةُ الْعَلَقِ

تعارف 625
نام 625
زمانۂ نزول 625
سُوْرَةُ الْعَلَقِ 628
شانِ نزول اور آیت کا مفہوم 629
انسان کی تخلیق سے اس کے مقصدِ زندگی کی یاددہانی 630
سابقہ مضمون کی تاکید اور اللہ تعالیٰ کے ایک احسان کا تذکرہ 631
مزید ایک احسان کا ذکر 632
احسانات کے جواب میں قریش کا رویہ اور اس کا سبب 633
قریش کی نادانی پر تنبیہ 633
قریش کے رویے کی ایک مثال 634
عہد سے مراد 634
امکانات پر غور کی ترغیب 635
بدتمیزی کرنے والے کے عقیدہ کے حوالے سے اسے خود فیصلہ کرنے کی دعوت 636
ان آیات کا شانِ نزول 636
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور سرکشوں کو دھمکی 637
آنحضرت ﷺ کو ہدایت 637

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْقَدْرِ

تعارف 640
نام 640
زمانۂ نزول 640
مضمون 640

Marfat.com

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ 641
ضمیر کا مرجع قرآنِ کریم ہے جو کسی کی ذاتی امنگ کا نتیجہ نہیں 641
لَیْلَۃِ الْقَدْرِ سے متعلق چند باتیں 642
لَیْلَۃِ الْقَدْرِ کون سی رات ہے 643
لَیْلَۃِ الْقَدْرِ کی عظمت 645
ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کا مفہوم 646
اس رات کا اصل کام 646
یہ رات سرتاپا سلامتی ہے، طلوعِ فجر تک رہتی ہے 647

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃِ

تعارف 650
نام 650
زمانۂ نزول 650
مضامین 650
سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃِ 652
اہلِ کتاب اور مشرکین کا جمود اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کی دلیل 653
اَلْبَیِّنَۃِ کی وضاحت 655
اہلِ کتاب کی تاریخ سے ان کی بدنصیبی پر استشہاد 655
اہلِ کتاب میں تفرقہ کا سبب 656
آنحضرت ﷺ کی مخالفت کا نتیجہ 657
ایمان لانے والوں کا اعزاز 657
اصحابِ ایمان کا صلہ اور انعام 658

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ

تعارف	662
نام	662
زمانۂ نزول	662
مضامین	662
سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ	664
ایک ہمہ گیر اضطراب اور ہلچل، مراد قیامت ہے	665
اَثْقَالُ سے مراد	665
منکرین کی بدحواسی	665
زمین سب کے اسرار کھول دے گی	666
اس دن ہر شخص اپنی جواب دہی خود کرے گا	667
ہر چھوٹا بڑا عمل سامنے آجائے گا	668

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ

تعارف	672
نام	672
مقامِ نزول	672
مضامین	672
سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ	673
پانچ قسموں کا مفہوم	674
یہ ہے جوابِ قسم جس کے اثبات کیلئے قسمیں کھائی گئی ہیں	675
انسان کی اصل بیماری کا ذکر	676
سیم وزر سے محبت کرنے والوں کو تنبیہ	676
اعمال کے محرکات کا بھی حساب ہوگا	677
اللہ تعالیٰ کا علم حدود و قیود سے ماوراء ہے	677

Marfat.com

سُوۡرَۃُ الۡقَارِعَۃِ

تعارف 680
نام 680
زمانۂ نزول 680
مضامین 680
سُوۡرَۃُ الۡقَارِعَۃِ 681
یہ قیامت کے ناموں میں سے ہے، اس کی وضاحت 682
ہیبت میں اضافہ 682
سامع کی غفلت پر چوٹ 683
وقوعِ قیامت کے پہلے مرحلے کی تصویر 683
نظامِ عالم کی برہمی کا ذکر 684
قیامت روزِ جزا بھی ہے اور روزِ عدل بھی 684

☆☆☆☆

سُوۡرَۃُ التَّکَاثُرُ

تعارف 688
نام 688
زمانۂ نزول 688
مضمون 688
سُوۡرَۃُ التَّکَاثُرُ 689
لہو اور تکاثر کا مفہوم اور تکاثر سے مراد 689
کثرت کی خواہش موت تک جاری رہتی ہے 691
تکاثر کی ہوس کامیابی نہیں 692
غفلت کا اصل سبب 693

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

تعارف 697
نام 697
زمانۂ نزول 697
شانِ نزول 697
ربط 697
سُوْرَةُ الْعَصْرِ 699
قسم کی وضاحت 699
عصر کا مفہوم 699
یہ ہے جوابِ قسم 701
خسر کا مفہوم 701
خسارے سے بچنے والوں کی چار صفات 702
ایمان کا مفہوم 702
صالحات پر عمل 704
تواصی بالحق 705
تواصی بالصبر 706

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

تعارف 710
نام 710
مضامین 710
سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ 711
هُمَزَةٍ اور لُمَزَةٍ کا مفہوم 711
متذکرہ بالا اخلاقی خرابیوں کا اصل سبب 713

Marfat.com

مال و دولت میں گہرے انہماک کا سبب 713
بخیلوں کو تنبیہ 714
الْحُطَمَةُ کی خصوصیت 714
مجرموں کی بے بسی 715

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْفِيْلِ

تعارف 718
نام 718
زمانۂ نزول 718
تاریخی پس منظر 718
سُوْرَةُ الْفِيْلِ 722
خطاب کی نوعیت 722
اصحاب الفیل کون تھے؟ 723
اللہ تعالیٰ نے ابرھہ کی تدبیروں کو ناکام کر دیا 724
ابابیل کا مفہوم 724
سِجِّيْل سے مراد اور اس کی تفصیل 725
عصف کا مفہوم اور ابرھہ کے لشکر کا انجام 725

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ

تعارف 728
نام 728
زمانۂ نزول 728
تاریخی پس منظر 728
سُوْرَةُ قُرَيْشٍ 731
ایلاف کا مفہوم اور حرف جار کے متعلق کی بحث 731

Marfat.com

اجمال کے بعد تفصیل 732
اللہ تعالیٰ کے احسان کا حق 733
متذکرہ بالا احسان کا نتیجہ 733

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ

تعارف 736
نام 736
زمانۂ نزول 736
مضامین 737
سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ 738
قیامت کی تکذیب والوں کے اخلاق 739
قریش کے سربرآوردہ لوگوں کی نمازیں اوران کے اخلاق 741
ان کی نمازیں دکھاوے کی تھیں 741
ان کی طبیعتوں کی خست 742

سُوْرَةُ الْـكَوْثَرِ

تعارف 745
نام 745
زمانۂ نزول 745
شانِ نزول 746
سُوْرَةُ الْـكَوْثَرِ 747
اِنَّـآ میں جمع کی ضمیر ہےاس سے مراد کیا ہے 747
کَوْثَر سے مراد 748
احسان پر شکر کی تلقین 749
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مخالفین کو تنبیہ 751

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَةُ الْکٰفِرُوْنَ

تعارف 755

نام 755

زمانۂ نزول 755

شانِ نزول 755

سُوْرَةُ الْکٰفِرُوْنَ 757

قُلْ کا مفہوم اور کٰفِرُوْن کے لفظ سے خطاب کی وجہ 757

قریش کی پیشکش کا جواب 758

اس میں حقیقت نفس الامری بھی ہے اور ایک غلطی کی نشاندہی بھی 759

ماضی کے حوالے سے بھی اس پیشکش کا رد 760

ایک غلط فہمی کا ازالہ 761

حرفِ انکار کی تکمیل 762

☆☆☆☆

سُوْرَةُ النَّصْرِ

تعارف 765

نام 765

زمانۂ نزول 765

سورۃ کا مرکزی مضمون 766

سُوْرَةُ النَّصْرِ 767

یہ آخری سورۃ ہے، نصر اور فتح مخصوص مفہوم میں ہے 767

فتح کا نمایاں پہلو 768

ادائے شکر کیلئے آنحضرت ﷺ کو تسبیح وحمد اور استغفار کی ہدایت 769

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَۃُ اللَّھَبِ

تعارف	773
نام	773
مقامِ نزول	773
زمانۂ نزول	773
سُوْرَۃُ اللَّھَبِ	776
لفظ ابولہب کی تحقیق	776
تَبَّتْ یَدَآہُ کا مفہوم	777
ابولہب کی امارت پر تعریض	777
مَا کَسَبَ سے مراد؟	778
آخرت میں ابولہب کا انجام	778
اَمْرَاَتُہٗ سے مراد؟	778
ابولہب کی بیوی کا انجام	779

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ

تعارف	782
نام	782
زمانۂ نزول	782
مضامین	783
فضیلت اور اہمیت	783
سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ	784
قُلْ کا مفہوم	784
آیت کی ترکیب اور مفہوم	785
اللہ کے لفظی خواص	786
صَمَد کا مفہوم	788
شرک سے پیدا ہونے والے واہموں کا ازالہ	789

Marfat.com

سُورَةُ الْفَلَقِ

تعارف 793
نام 793
زمانۂ نزول 793
معوّذتین کی قرآنیت 794
آنحضرت ﷺ پر جادو کا اثر ہونا 795
اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت 797
ایک غلط فہمی کا ازالہ 799
سُورَةُ الْفَلَقِ 801
تعوذ کا مفہوم 801
فلق کا مفہوم 802
مخلوقات کے شرور کو خالق ہی جانتا ہے اور وہی پناہ دے سکتا ہے 803
عام مخلوقات کے بعد چند خاص مخلوقات سے پناہ مانگنے کا حکم 804
روحانی و اخلاقی آفتوں سے پناہ مانگنے کا حکم 805
حاسدوں کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم 806

☆☆☆☆

سُورَةُ النَّاسِ

اللہ تعالیٰ کی تین صفتوں کے واسطے سے پناہ 809
وَسْوَاسِ کا مفہوم 811
شیطان کی وسوسہ اندازی کی تکنیک 811
شیطان کی تکنیک کے بعد اس کی تدریج کا ذکر 811
شیطان کے ہمنواؤں کا ذکر 812

☆☆☆☆

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْمُلْکِ

(٦٧)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْمُلْکِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام ''الـمُـلْک'' ہے جو اس سورۃ کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس سورۃ کو حدیث میں واقیہ اور منجیہ بھی فرمایا گیا ہے۔ واقیہ کے معنی بچانے والی۔ اور منجیہ کے معنی نجات دینے والی۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: هِیَ الْمَانِعَةُ الْمُنْجِیَةُ تُنْجِیْهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ ''یعنی یہ سورۃ عذاب کو روکنے والی اور عذاب سے نجات دینے والی ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے کو عذابِ قبر سے بچالے گی۔ (رواہ الترمذی، وقال حدیث حسن غریب، از قرطبی)

زمانۂ نزول:۔ کسی معتبر روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سورۃ کس زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ گمان یہ ہے کہ سُوْرَةُ الْکٰفِرُوْن تک مسلسل ۴۳ سورتیں مکی ہیں اور اس کے بعد پانچ سورتیں مدنی ہیں۔ سورۃ کے مضامین اور ان کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

سورۃ کا موضوع اور مضمون

مکی سورتوں کی طرح اس کے بنیادی مضامین میں بھی توحید، رسالت اور آخرت ہیں۔ لیکن اس میں زیادہ زور انذار پر دیا گیا ہے اور انذار کا انداز وہی ہے جو نبی کریم ﷺ نے کوہِ صفا پر اختیار فرمایا تھا۔ نہایت مؤثر انداز میں غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکایا گیا ہے۔ انذار کے تقاضے سے اس میں قیامت اور احوالِ قیامت کی بھی پوری تصویر ہے اور اس عذاب کو بھی قریش کی نگاہوں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہے جو رسول کی تکذیب کر دینے والوں پر بالعموم آیا کرتا ہے۔ مکہ معظمہ کی ابتدائی سورتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اسلام کی ساری تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو نہایت مستحکم انداز میں مگر اختصار کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس سورۃ میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے اور پھر نہایت حکمت سے ان تعلیمات کا اس طرح اعادہ کیا جاتا ہے کہ بتدریج لوگوں کے ذہن نشین ہوتی چلی جاتی ہے۔ استدلال میں بیشتر آفاق کے مشاہدات، تاریخ کے مسلمات اور انفس کی بینات سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ ان سورتوں میں کلام کے شکوہ، الفاظ کی شیرینی، لہجے کی دلآویزی، پیرایہ بیان کی چستی اور فصاحت و بلاغت اور استدلال کی قوت نے ایک ایسی ہلچل برپا کی کہ مکے کا ایک شخص بھی قرآن کی دعوت کے معاملے میں غیر جانبدار نہ رہ گیا بلکہ وہ یا تو اس کا جانی دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوا اور یا سچا فدائی بن گیا۔ چنانچہ اس سورۃ میں بھی یہ ساری خصوصیات دکھائی دیتی ہیں۔

Marfat.com

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

پہلی پانچ آیتوں میں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ اس کائنات کی باگ ڈور جس ذات کے ہاتھ میں ہے وہ بڑی ہی بابرکت، اور نہایت قدرت والی ہستی ہے۔ اس نے زندگی اور موت کو تخلیق کیا اور انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق پیدا فرمائی۔ اس کی یہ عظیم سلطنت اس قدر محکم اور منظّم ہے کہ جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب یا نقص یا خلل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے اس کارخانہ کو عبث پیدا نہیں کیا کہ ایک وقت تک چلتا رہے اور پھر یونہی ختم ہو جائے بلکہ لوگوں کے امتحان کیلئے اس کارخانے کو وجود دیا گیا۔ انسان کو جوہر عقل سے نوازا اور پھر اپنے پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اسی امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر انسان کی فلاح اور ناکامی کا دارومدار رکھا۔

آیت چھ سے گیارہ تک وہ ہولناک نتائج بیان کئے گئے ہیں جو جزاء وسزا کو جھٹلانے کے نتیجے میں قیامت کو پیش آنے والے ہیں۔ لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی عقل سے کام لینے اور پیغمبر کی ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کریں گے انہیں دیکھ کر جہنم بھوکے شیر کی طرح دھاڑے گی اور جب بھی انسانوں کا کوئی گروہ جہنم میں پھینکا جائے گا تو جہنم کے داروغے انہیں ملامت کریں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اگر تم اس کی بات کو قبول کر لیتے تو آج اس برے انجام سے بچ جاتے۔ وہ اعتراف کریں گے کہ انذار کرنے والے تو آئے لیکن ہم نے ان کی بات مان کے نہیں دی بلکہ الٹا انہیں گمراہ ٹھہرایا اور پھر تمنا کریں گے کاش ہم انبیائے کرام کی باتیں سنتے یا ہم غور وفکر سے کام لیتے تو آج ہم جہنم میں نہ ڈالے جاتے۔

آیت بارہ سے چودہ تک ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جو بن دیکھے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں، وہ تمہاری ہر کھلی اور چھپی بات حتیٰ کے تمہارے دل کے خیالات تک سے واقف ہے۔

آیت پندرہ سے اٹھارہ تک ان پیش پا افتادہ حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جنہیں انسان بالعموم نظر انداز کئے رکھتا ہے۔ پھر ان میں سے بعض کی طرف اشارے فرما کر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ انسان کو اپنے رب کی پکڑ سے ایک لحہ کیلئے بھی نچنت نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہر وقت یہ بات مستحضر رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے اوپر سے یا نیچے سے کوئی آفتِ ارضی وسماوی بھیج کر انسان کو تباہ کر سکتا ہے۔ تاریخ میں جابجا اس کی مثالیں موجود ہیں۔

آیت ۱۹ سے ۲۱ تک میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اس فضائے وسیع وعریض میں جو چیز بھی ٹکی ہوئی ہے، خدا کے تھامے ٹکی ہوئی ہے۔ وہی ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ اگر اس کے سہارے سے محروم ہو جاؤ تو کوئی نہیں جو تمہاری مدد کر سکے۔ اگر وہ اپنے رزق سے محروم کر دے تو تمہیں کوئی رزق دینے والا نہیں۔

Marfat.com

آیت ۲۲ اور ۲۳ میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی خواہشوں کے غلام بن کر زندگی گزاریں گے وہ کبھی منزل پر پہنچ نہیں پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جو حواس اور جو ہر عقل سے نوازا ہے ضروری ہے اس سے کام لے کر لوگ سیدھی راہ اختیار کریں۔

آیت ۲۴ سے ۲۷ تک یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس زمین پر انسان کو پھیلایا ہے۔ وہ اس کو ایک دن ضرور اکٹھا کرے گا۔ رہی یہ بات کہ وہ دن کب آئے گا، نبی کریم ﷺ کا کام یہ نہیں ہے کہ تمہیں اس کے وقت اور تاریخ بتائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ تمہیں اس آنے والے وقت سے پیشگی خبردار کر دیں۔ وہ دن کب آئے گا اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ البتہ جب وہ دن ظاہر ہوگا تو آج جو لوگ اکڑ رہے ہیں اس دن ان کے چہرے بگڑ جائیں گے۔

آیت ۲۹ اور ۳۰ میں کفارِ مکہ کو ان باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف کرتے تھے۔ اور جس طرح وہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کیلئے گردشِ روزگار کے منتظر تھے انہیں کہا گیا ہے کہ بالفرض جو کچھ تم چاہتے ہو وہی ہو جائے تو اس میں تمہارے لئے کیا اطمینان کی بات ہے۔ تمہیں تو اپنی فکر کرنی چاہئے کہ اگر خدا کا عذاب آ گیا تو تمہیں اس سے کون بچائے گا۔

آخر میں انہیں انذار کرتے ہوئے اور ان کی غفلت کا پردہ چاک کرتے ہوئے ان کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا ہے کہ عرب کے صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں تمہاری زندگی کا سارا انحصار اس پانی پر ہے جو کسی جگہ زمین سے نکل آئے۔ اگر یہ پانی زمین میں اتر کر غائب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو تمہیں پانی مہیا کر سکتا ہے جبکہ تمہاری زندگی کا مدار اسی پر ہے۔ اسے ان کیلئے ایک لمحہ فکریہ بنا دیا گیا ہے۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ٢	سُوْرَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ (٦٧)	ايَاتُهَا ٣٠

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ (١)
الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ (٢) الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ
مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ
تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (٣) ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ
الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (٤) وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ
وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ (٥)
وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (٦)
اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۙ (٧) تَكَادُ تَمَيَّزُ
مِنَ الْغَيْظِ ۭ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ
نَذِيْرٌ (٨) قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَاۗءَنَا نَذِيْرٌ ڏ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ
اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ښ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ (٩) وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا
نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (١٠) فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ

Marfat.com

فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۲﴾ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ
الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾

رکوع: ا۔ (نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے قبضۂ قدرت میں اس کائنات کی بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱) جس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سب سے اچھے عمل والا کون ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔ ۲) جس نے بنائے سات آسمان تہ بہ تہ، تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی خلل نہیں پاؤ گے، پس نگاہ دوڑاؤ، کیا تمہیں کہیں کوئی نقص نظر آتا ہے۔ ۳) پھر بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔ ۴) ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا ہے، اور انہیں شیاطین کو سنگسار کرنے کا ذریعہ بنادیا ہے اور ان شیاطین کیلئے ہم نے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۵) اور ان لوگوں کیلئے جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا، جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ۶) جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی آوازیں سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی۔ ۷) قریب ہے کہ غصے سے پھٹ جائے، جب جب ان کی کوئی بھیڑ اس میں جھونکی جائے گی تو اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا۔ ۸) وہ جواب دیں گے، ہاں! ہمارے پاس ایک خبردار کرنے والا آیا تو سہی مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ ۹) اور وہ کہیں گے، کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں شامل نہ ہوتے۔ ۱۰) (اس طرح) وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرلیں گے، پس لعنت ہو ان دوزخ والوں پر۔ ۱۱) بیشک جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں یقیناً ان کیلئے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے۔ ۱۲) تم اپنی بات چھپا کے کہو یا علانیہ کہو، وہ تو دلوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔ ۱۳) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔ ۱۴)

Marfat.com

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۝١

(نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے قبضۂ قدرت میں اس کائنات کی بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱)

تبٰرک کا مفہوم

تبٰرک ...... میں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس کا مادہ برکت ہے اور برکت کے مفہوم میں رفعت وعظمت، افزائش وفراوانی، دوام وثبات اور کثرتِ خیرات وحسنات شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو رفیع وعظیم ہے۔ وہ عظمتوں کا سرچشمہ ہے اور رفعتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ خیرات وحسنات اسی کے فیض سے وجود میں آتی ہیں۔ ہر چیز میں اضافہ اور کثرت اسی کی توجہ کا ثمر ہے۔ وہ ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اور دوسری یہ بات کہ یہ برکت سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی بزرگی اور عظمت میں سب سے فائق ہے اور اپنی ذات وصفات اور افعال میں اپنے سوا ہر ایک سے بالاتر ہے۔ اس کی ربوبیت اور فیضان بے مثال وبینظیر ہیں۔ اس کے کمالات کو کبھی زوال نہیں۔ ان دونوں باتوں کی دلیل اور نتیجہ یہ ہے کہ اسی کے قبضۂ قدرت میں ساری کائنات کی پادشاہی ہے۔ کہنے کو تو زمین پر بیشمار پادشاہ گزر چکے اور موجود ہیں لیکن ان کی پادشاہیاں اور ان کی سلطنتیں بے ثبات اور فانی بھی ہیں اور محدود بھی۔ اور پھر ان میں سے کوئی پادشاہ اور حکمران ایسا نہیں گزرا جسے اطمینان میسر ہو کہ میری پادشاہی کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ مزید براں یہ بات بھی کہ ان کے اقتدار اور پادشاہی کا فیض ان کی اپنی ذات، اپنے خاندان اور چند موالی کے سوا شاید ہی کسی کو پہنچتا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی جس طرح کبریائی کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا، اسی طرح اس کی پادشاہی کو بھی کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا۔ یہاں جسے بھی کوئی اختیار یا اقتدار حاصل ہے وہ اسی کی دین یا اس کی طرف سے آزمائش ہے۔ وہ زمین پر اپنی حاکمیت اور قدرت کے اظہار کیلئے وقتاً فوقتاً حوادث کو جنم دیتا رہتا ہے۔ اس کے لشکر بیشمار ہیں، کبھی کسی کو حرکت میں لاتا ہے اور کبھی کسی کو۔ اسی بات کی وضاحت کیلئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور اس کی قدرت چند اشیاء تک محدود نہیں بلکہ ہمہ گیر ہے۔ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔ وہ دینے پر بھی قادر ہے اور چھیننے پر بھی قادر ہے۔ بعض دفعہ اس کی طرف سے دی گئی مہلت سرکشی کا سبب بن جاتی ہے، لیکن ایسے سرکشوں کو سرکشی کی سزا دینے پر بھی وہ ہر طرح قادر ہے۔ چونکہ اس کی قدرتیں بے پناہ ہیں اس لئے وہ پکڑنے میں کبھی جلدی نہیں کرتا، کیونکہ جلدی وہ کیا کرتا ہے جو کمزور حکمران ہو اور جسے یہ اندیشہ ہو کہ آج ان سرکشوں کو چھوڑا گیا تو کل شاید طاقتور ہو کر ہاتھ نہ آئیں۔ لیکن اس کے سامنے جب کوئی فرعون بنتا ہے تو پانی کی ایک لہر اس کا خاتمہ کردیتی ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝٢

(جس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سب سے اچھے عمل والا کون ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔ ۲)

Marfat.com

قدرتِ کاملہ کی دلیل

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اس سے بڑا ثبوت اور ظہور اور کیا ہوگا کہ وہ موت اور زندگی کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل سے کام لے کر انسانوں نے کیسی کیسی محیر العقول ایجادات کی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایجاد کسی نئی چیز کی تخلیق نہیں بلکہ چند اشیاء میں مناسب ترتیب اور ترکیب کا راز پا لینے سے وجود میں آئی ہے۔ لیکن اولاً تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ جن چیزوں کو ترکیب دیا جاتا ہے وہ چیزیں موجد کی مخلوق نہیں ہوتیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ موجد کا کمال ان میں اس ترتیب اور ترکیب کو پیدا کرنا ہے جو ایجاد کا باعث بنتی ہے۔ تو یہ ترتیب و ترکیب کا راز بھی کسی کی تخلیق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی موجد کے ذہن میں اچانک ایک تصور پیدا کرتا ہے اور وہ اچانک کہنے لگتا ہے کہ میں نے پالیا، میں نے پا لیا۔ یعنی وہ راز پالیا جو پہلے سے موجود تھا اور دنیا اس سے بے خبر تھی اور وہ راز بھی تخلیق پر قادر نے موجد کے ذہن میں اتارا ہے اور اگر اس میں موجد کے ذہنی کمال کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے تو تب بھی یہ اس کی ذاتی صفت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہی عطا کردہ نعمت ہے۔ لیکن اس کی قدرت نے دیگر بیشمار چیزوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ موت وحیات کو پیدا کیا ہے۔ جس کے راز کو آج تک کوئی نہ پاسکا اور نہ کوئی پا سکے گا۔ موت کیا چیز ہے اور زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ دنیا بھر کے عقلمند آج تک اس سے بے خبر ہیں جبکہ اس کائنات کا اصل جوہر حیات ہے۔ باقی تمام کمالات اسی کے نتیجے اور اس کے بعد وجود میں آتے ہیں۔

انسانوں کا مقصدِ تخلیق

اس آیتِ کریمہ میں موت وحیات کو جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے اسی طرح اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو کھلنڈرا ہے کہ وہ محض کھیل کیلئے کائنات کو پیدا کرتا اور نہ وہ لاابالی اور بے حکمت ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی ہوتا۔ اس نے انسانوں کو جس طرح زندگی عطا فرمائی اور پھر انہیں جوہر عقل سے نوازا، مزید براں ان پر کتابیں اتاریں، پیغمبر مبعوث کیے۔ یہ سارے کام نہ اتفاقی ہوئے ہیں نہ کھیل کود کے طور پر اور نہ صرف قدرت کے اظہار کیلئے بلکہ اس کے پیچھے ایک حکمت کارفرما ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بے مقصد پیدا نہیں فرمایا۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ تمہیں زندگی اور دیگر کمالات دے کر یہ امتحان کرنا چاہتا ہے کہ تم میں سے کون بہتر سے بہتر عمل سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے۔ اور کون ہے جو اپنے مقصدِ تخلیق سے انحراف کر کے بے مقصد اور سرکش زندگی گزارتا ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں اس نے متعدد حقیقتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ (۱) یہ کہ موت وحیات اسی کے قبضے میں ہیں، کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا اور نہ موت دینے والا۔ مشرکین نے جس طرح بعض شخصیتوں کو ان صفات کا مالک سمجھا ہے وہ گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ (۲) یہ کہ انسان جیسی مخلوق جسے غیر معمولی کمالات دیئے گئے اور نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے اس کی نہ زندگی بے مقصد ہے اور نہ موت، اللہ تعالیٰ نے اسے یہاں امتحان کیلئے پیدا کیا۔ زندگی اس کیلئے امتحان کی مہلت ہے۔ اور موت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے امتحان کا وقت ختم ہوگیا۔ (۳) یہ کہ اس امتحان کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے کہ وہ اپنے کام کے ذریعے اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے اور یہ ثابت کر سکے کہ وہ کیسا انسان ہے۔ (۴) یہ کہ گزشتہ تینوں باتوں سے خود بخود دو باتیں نتیجے کے طور پر وجود میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس خالق نے انسان کو زندگی امتحان کیلئے دی

Marfat.com

ہے وہی یہ بتانے کا حق رکھتا ہے کہ امتحان کن باتوں میں ہوگا۔ اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہوگا۔ کیسے عمل کو کامیابی سمجھا جائے گا اور کسے ناکامی ٹھہرایا جائے گا اور دوسری بات خود بخود اس سے نکلتی ہے کہ جزاء اور سزا کا دارومدار انسان کے عمل پر ہوگا۔ اور جس ذات نے انسانوں پر یہ امتحان نازل کیا ہے وہی اس جزاء وسزا کا دن مقرر کرے گا اور اسی کے ہاتھ میں جزاء اور سزا کی نوعیت کا فیصلہ ہوگا۔

آخر میں فرمایا کہ وہ عزیز ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ سزا کے مستحق ہوں گے ان کو اس کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکتا اور وہ غفور بھی ہے یعنی وہ ظالم اور سخت گیر نہیں بلکہ جو مغفرت کے مستحق ہوں گے ان کو وہ اس سے محروم نہیں فرمائے گا۔ جو اپنی غلطیوں پر نادم ہو کر معافی مانگ لیں گے ان سے وہ درگزر فرمائے گا اور ہر حقدار کو سعی وسفارش کے بغیر ان کا حق عطا فرمائے گا۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝۴

(جس نے بنائے سات آسمان تہ بہ تہ، تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی خلل نہیں پاؤ گے، پس نگاہ دوڑاؤ، کیا تمہیں کہیں کوئی نقص نظر آتا ہے۔ ۳) پھر بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔ ۴)

اللہ تعالیٰ کی قدرت وعظمت کے مظاہر

پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وعظمت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ اس آیت میں اس کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یوں تو کائنات کی ایک ایک چیز حتیٰ کہ خود حضرتِ انسان، اس کا جسم، اس کی جان، اس کے دل ودماغ کی رعنائیاں، اس کی صلاحیتیں کون سی چیز ہے جو اس کی قدرت وعظمت کا شاہکار نہیں۔ ہاتھ کے انگوٹھے کی پور اس پر کھنچے ہوئے باریک باریک خطوط انسان کیلئے آج تک حیرت کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ اس کی بینائی، اس کی سماعت، اس کے احساسات، اس کے انفعالات ایک ایک چیز ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی ہے۔ لیکن انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے دائیں بائیں اور گردوپیش نگاہ نہیں دوڑاتا۔ پیش پا افتادہ حقیقتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اس لئے پروردگار نے آسمانوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ ایک تو وہ اپنے جسم اور حجم میں شاید اس کی کائنات میں سب سے عظیم ہیں، پھر ان کا وجود اس طرح سر پر چھتری بنا ہوا ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔ بارش کی امید میں اسی طرف دیکھتا ہے، روشنی وہیں سے چھن چھن کر آتی ہے، ٹھنڈی اور تنہا راتوں میں چاند کا حُسن اسی طرف سے اپنی حلاوت لٹاتا ہے۔ پھر انسان دیکھتا ہے کہ یہ عجیب چھت ہے جس کا کوئی ستون نہیں، جسے کسی چیز نے تھاما ہوا نہیں، جس کا کوئی اور چھور نہیں، نہ کہیں اس کی ابتداء معلوم ہوتی ہے اور نہ انتہاء، اور پھر ایسے آسمان ایک نہیں تہ بہ تہ سات بنائے گئے ہیں۔ نصوص میں ایک آسمان کا فاصلہ دوسرے آسمان تک پانچ سو سال بتایا گیا ہے۔ اس کی مزید تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں۔ سائنس آج تک اس کا وجود نہ پاسکی، یہ نیلگوں چھت جسے ہماری نگاہیں دیکھتی ہیں اور اسے انسانوں نے ہمیشہ آسمان سمجھا ہے سائنس کی نگاہ میں یہ حدِ نگاہ ہے، لیکن کیا اس کے اوپر بھی آسمان ہے یا نہیں، سائنس اس کا جواب نہیں دے سکی۔ سائنسدان زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم آج تک آسمان کو دیکھ نہیں پائے یا ہمیں اس کا علم حاصل نہیں ہوسکا۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ سرے سے اس کا وجود نہیں۔ اس لئے کہ عدمِ علم، عدمِ وجود کو مستلزم نہیں ہوتا۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان اور اس کی بے مثال صنعت گری اور اس کا کمالِ فن صرف یہ نہیں کہ اس نے تہ بہ تہ سات آسمان پیدا کر دیئے بلکہ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اتنی بڑی مخلوق اور اتنی بڑی صنعت میں ڈھونڈے سے بھی کوئی ناہمواری یا کوئی نقص وخلل نظر نہیں آتا۔ ''تفاوت'' عدمِ تناسب کو کہتے ہیں، یعنی ایک چیز کا دوسرے سے میل نہ کھانا، اَنمل بے جوڑ ہونا۔ ان آسمانوں کو بلکہ ساری کائنات کو دیکھو کہیں بدنظمی، بے ترتیبی اور بے ربطی نظر نہیں آتی۔ اس کے تمام اجزاء باہم مربوط اور ان میں کمال درجے کا تناسب پایا جاتا ہے۔ اس میں ہر طرف نگاہ دوڑا کے دیکھو، کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں ملے گی کہ جس میں کوئی ماہر فن انگلی رکھ کر کہہ سکے کہ اس جگہ کسی جوڑ بند کو ہموار کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔

اگلی آیت میں اتمامِ حجت کیلئے بار بار دیکھنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ شاید اس لئے کہا گیا کہ ایک بہت بڑی صنعت اور حیران کن صنعت گری کو ایک نگاہ یا چند دفعہ دیکھنے سے کوئی رائے قائم کرنا آسان نہیں۔ اس لئے بار بار ناقدانہ نگاہ سے دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ محققین نے کہا ہے کہ یہ پہلی نظر عوام کی ہے جو صرف وجود اور حُسنِ ظاہر دیکھ کر کمالِ صانع کے قائل ہو جاتے ہیں۔ دوسری نظر، اہلِ نظر اور اہلِ حکمت کی ہے جو ہر مخلوق کے مصالح کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ جو نظم تکوینی موجود ہے اس سے بہتر ہونا محال تھا اور اس پر مجالِ حرف گیری نہیں۔

آیت میں ''کرتین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ تثنیہ کا صیغہ ہے، یہاں محض اظہارِ تعدد کیلئے ہے۔ دو کا متعین عدد مراد نہیں۔

والمراد بالتثنية التكرير والتكثير كما فى لبيك وسعديك (بیضاوی)

اس آیت میں لفظ فتور استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں دراڑ، شگاف یا ٹوٹ پھوٹ، کہ تم اسے بار بار دیکھو، تمہیں کہیں نظمِ کائنات کا تسلسل ٹوٹتا ہوا دکھائی نہیں دے گا، کسی جگہ کوئی رخنہ نظر نہیں آئے گا۔ تمہاری نگاہ تھک کر واپس آجائے گی لیکن تم کوئی نقص تلاش کرنے میں ناکام رہو گے۔

جس پروردگار کی یہ بے مثال قدرت وحکمت اور اس کا مرقع ہمارے سروں پر پھیلا ہوا ہے کہ ہم اس کی کی وسعت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہیں اور کہیں اس میں معمولی سا نقص بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ایسی عظیم ذات کیلئے کون سا کام دشوار ہو سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہوگی کہ کوئی شخص ایسی عظیم ذات کے بارے میں یہ تصور کرے کہ جب سب لوگ مر کھپ جائیں گے تو وہ سب کو دوبارہ کیسے زندہ کر سکے گا اور بیشمار لوگوں کے اَن گنت اعمال کی جزاء وسزا کس طرح ممکن ہو سکے گی۔ حتیٰ کہ بعض بے وقوف ایسے ہیں کہ وہ قیامت کے وقوع کو اس لئے ناقابلِ یقین سمجھتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی دفعہ ساری مخلوقات کو تباہ کر دیا جائے اور زمین وآسمان کو توڑ پھوڑ دیا جائے، حالانکہ اب سائنس نے اس بات کو یقینی بنا دیا ہے کہ زمینی زندگی کا دارومدار کششِ ثقل پر ہے اور تمام ستارے اور سیارے اور اجرامِ فلکی اسی قانون کے تحت محوِ پرواز ہیں۔ اور سائنسدانوں کے کہنے کے مطابق یہ کشش روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک روز ایسا آئے گا جب یہ بالکل ختم ہو جائے گی، سورج بے نور ہو جائے گا، تو ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔

Marfat.com

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝

(ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا ہے، اور انہیں شیاطین کو سنگسار کرنے کا ذریعہ بنادیا ہےاوران شیاطین کیلئے ہم نے دوزخ کا عذاب تیار کررکھا ہے۔ ۵)

اللہ تعالیٰ کی ذات جلال و جمال کی جامع ہے

گزشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وعظمت کے اظہار کیلئے سات تہ بہ تہ آسمانوں کی تخلیق کا ذکر فرمایااور پھر اپنی کمالِ صنعت گری کی طرف توجہ دلائی۔اس سے پڑھنے اور سننے والے کے دل پر اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمت کا عکس پڑتا اور ہیبت بیٹھ جاتی ہے جس کے نتیجے میں ایک مومن اپنے اللہ سے ڈرتا اور اس کی ہیبت سے سہارہتا ہے۔پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آسمانِ دنیا کو بڑے بڑے قمقموں سے آراستہ کرنے کا ذکر کرکے شاید یہ تصور دینا مقصود ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات قدرت وجلال کی مالک ہےاور ہر عظمت اس کے سامنے سرنگوں ہےاور ہر مومن کواس کو جلال سے لرزاں اور ترساں رہنا چاہئے۔اسی طرح وہ ذات اپنے اندر کمال درجہ رحمت بھی رکھتی ہے۔اس کا جلال جس طرح دلوں میں ہیبت پیدا کرتا ہے اسی طرح اس کی مخلوقات کا جمال دلوں میں اس کیلئے پیار کی جوت بھی جگاتا ہےاوراپنی ہزار کوتاہیوں کے باوجود بھی وہ بجائے مایوس ہونے کے اپنے اللہ سے امیدیں باندھتا ہے۔ہزار سرکشی کے بعد بھی اسی کے دامن کے نیچے آتا اور اسی کے بابِ رحمت کو کھٹکھٹاتا ہے۔اسلام سے پہلے کے مذاہب نے ہمیشہ پروردگار کی طرف سے آنے والے عذابوں کا ذکر کیااور اس کے جلال کونمایاں کیا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآنِ کریم کا آغاز الحمدللہ رب العالمین سے کیا گیا۔حمد ثنائے جمیل کو کہتے ہیں اور ثنائے جمیل محبت کرنے والے دل سے اٹھتی ہے۔اس طرح قرآنِ کریم نے ایک اعتدال کی تعلیم دی ہے کہ اپنی سرکشی کے انجام سے ڈرو کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی گرفت آسکتی ہے،لیکن اپنے اللہ سے ہمیشہ پیار اور محبت کرو کیونکہ وہ سرتاپا جمال ہے۔سر اٹھا کر آسمانوں کو دیکھو کس طرح انہیں اس نے قمقموں سے روشن کررکھا ہےاور ایسی حُسن آرائی کی ہے کہ جب آسمان بادلوں سے صاف ہواور چودھویں کا چاند نور برسارہا ہواور ستارے زمین پر روشنی بکھیر رہے ہوں اور کہکشاں حُسن کی تصویر بنی جگمگارہی ہو۔تو کھلی فضاء اور کھلے آسمان کے نیچے دیکھنے والا اندازہ کرسکتا ہے کہ کس طرح حُسن اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا ہےاور جمال اس پر قربان ہوتا جارہا ہے۔ایسے میں اللہ تعالیٰ سے پیار ایک مومن کے انگ انگ سے اٹھتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ میں اس ذات کی نافرمانی کروں جس کی رحمت مجھے آغوش میں لینے کیلئے تیار ہے۔

وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ”ستارے تو اللہ تعالیٰ نے آسمانِ دنیا کی جمال آرائی کیلئے قمقموں کی طرح روشن کررکھے ہیں، لیکن ان کا ایک ضمنی فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ شیاطین آسمانوں پر جانے سے قاصر ہوگئے ہیں۔دورِ جاہلیت میں عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ کاہن جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ شیاطین ان کے تابع ہیں یا شیاطین سے ان کا رابطہ ہے۔شیاطین آسمان پر جاکر یا کہیں قریب بیٹھ کر فرشتوں کی باتیں سنتے ہیں اور اس طرح سے مستقبل میں ہونے والے حوادث وواقعات کی انہیں خبر ہوجاتی ہے اور وہ

Marfat.com

آ کر کاہنوں کو بتاتے ہیں اور وہ انہیں باتوں پر غیب دانی کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہاں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ستاروں سے شیاطین کو سنگسار کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ان ستاروں کے اندر اللہ تعالیٰ نے دیدبان (بروج) بنائے ہیں جن میں فرشتے ہروقت پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ اگر شیاطین عالمِ بالا کی سن گن لینے کیلئے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان پر شہابوں کے راکٹ پھینک کر انہیں تباہ کر دیتے ہیں یا آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تاروں سے جو بے حد و بے حساب شہابِ ثاقب نکل کر کائنات میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں اور جن کی بارش زمین پر ہروقت ہوتی رہتی ہے وہ اس امر میں مانع ہے کہ زمین کے شیاطین عالمِ بالا میں جاسکیں۔ بہر حال دونوں باتوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ستارے ان شیاطین پر دے نہیں مارے جاتے بلکہ ان سے شہابِ ثاقب نکلتے ہیں جو شیاطین پر گرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان شہابوں کی حقیقت کیا ہے۔ صاحب تفہیم القرآن کہتے ہیں کہ اس کے بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات جدید ترین دور تک انسان کے علم میں آئے ہیں اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معائنے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں ان کی بناپر سائنسدانوں میں سب سے زیادہ معقول نظریہ یہ ہے کہ یہ شہابیے کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلاء میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آ کر ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ایڈیشن ۱۹۶۷ء، جلد ۱۵) لیکن صاحب تفسیر عزیزی نے لکھا ہے، ممکن ہے کہ ملائکہ اجزائے ہوا اور بخارات کو ستاروں سے روشن کر کے شیطانوں پر مارتے ہوں۔ مقصود اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس شان و اہتمام کے ساتھ پیدا کرنے کے بعد اس کو چھوڑ نہیں دیا کہ شیاطین اس کو بازی گاہ بنالیں بلکہ اس نے اس کی نگرانی کا بھی سامان کیا ہے اور جب وہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو ان کی سرکوبی بھی ہوتی ہے اور قیامت کے دن ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے جہنم کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝٦

(اور ان لوگوں کیلئے جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا، جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ۶)

کفر کا نتیجہ جہنم ہے

سابقہ آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ جو شیاطین حدود سے تجاوز کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے جہنم کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اسی سے گریز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو انسان بھی اپنے رب کا کفر کریں گے یعنی قیامت اور جزاء و سزا کا انکار کریں گے اور اس کے نتیجے میں کفر کی زندگی گزاریں گے تو ان کیلئے بھی جہنم کا عذاب ہے۔ اور یہ جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔ جس بدبخت نے اپنی زندگی کے اعمال کے نتیجے میں اسے اختیار کیا اس نے بہت برا فیصلہ کیا۔

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝٧

(جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی۔ ۷)

Marfat.com

شَہِیق کے مفہوم کی وضاحت

یہ کافر لوگ جو قیامت کا انکار کرتے تھے جب اپنے کفر وشرک کے باعث جہنم میں پھینکے جائیں گے تو انہیں دیکھ کر جہنم دھاڑے گی۔ آیت میں شَھِیْـق کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اہلِ لغت کے نزدیک گدھے کی آواز جیسی آواز کو بھی کہتے ہیں اور شیر کی دھاڑ کو بھی۔ ہماری محاوراتی زبان میں ہیبت کے اظہار کیلئے شیر کی دھاڑ کا ذکر کیا جاتا ہے، گدھے کی آواز کا نہیں۔ گدھے کی آواز کراہت اور شور کا استعارہ ہے۔ لیکن جب کسی آواز سے ڈرانا اور ہیبت دلانا مقصود ہو یا اس کی عظمت اجاگر کرنا پیشِ نظر ہو تو پھر شیر کی دھاڑ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کا شعر ہے:

میں شیر ہوں جو دھاڑتا ہوں کچھار میں
بلی نہیں جو گھر ہی میں کرتی ہو میاؤں میاؤں

اس لئے مفادِ کلام کا تقاضا یہ ہے کہ شَھِیْـق سے شیر کی دھاڑ مراد لی جائے۔ یعنی جہنم انہیں دیکھ کر اس طرح جوش وغضب کا اظہار کرے گی جیسے شیر اپنے شکار کو دیکھ کر دھاڑتا ہے۔ اگلا جملہ اسی کا بیان معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی دھاڑ سن کر محسوس ہوگا کہ جہنم جوش مار رہی ہے اور اس کا جوش وغضب اپنے پورے شباب پر ہے۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۞ ٨ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۞ ٩

(قریب ہے کہ غصے سے پھٹ جائے، جب جب ان کی کوئی بھیڑ اس میں جھونکی جائے گی تو اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا۔ ۸) وہ جواب دیں گے، ہاں! ہمارے پاس ایک خبردار کرنے والا آیا تو سہی مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ ۹)

جہنم کے جوش وغضب کی تعبیر

یہ جہنم کے جوش وغضب کی تعبیر ہے، یعنی اس کے غضب سے معلوم ہوگا کہ وہ غصے سے پھٹی جارہی ہے۔ ہم بھی اپنی زبان میں جب کسی شخص کو بہت غصے کا اظہار کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور یا محسوس ہوتا ہے کہ وہ غصے میں کھول رہا ہے تو ہم اسے اسی طرح تعبیر کرتے ہیں کہ وہ غصے میں پھٹا جارہا ہے۔ جہنم کے غیظ وغضب کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا ہی سزا کیلئے کیا ہے اور سزا بھی ان لوگوں کیلئے جو قیامت کے دن کی پروانہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں زندگی گزار کے آئے ہوں گے اور کسی پیغمبر کی بات پر انہوں نے کان نہ دھرا ہوگا۔ اسی بنیادی صداقت کے اظہار کیلئے جہنم کے داروغے ان شامت زدوں سے پوچھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے اعتراف کیلئے دلائلِ آفاق اور دلائلِ انفس کی کمی نہیں۔ جو شخص بھی کھلی آنکھوں اور کھلے دل سے زندگی گزارے اس کیلئے قیامت کا وقوع انسان کے مقصدِ زندگی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اور جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل پر غور کرتا ہے اس کیلئے قیامت کا انکار اللہ تعالیٰ کے

Marfat.com

عادل ہونے کے انکار کے مترادف ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کا کرم یہ ہے کہ اس نے ان بنیادی صداقتوں کے اعتراف کیلئے انسانی فطرت اور انسانی عقل کو کافی نہیں ٹھہرایا بلکہ انسانوں کے ہر گروہ کی طرف اس کے رسول آئے اور کتابیں نازل ہوئیں۔ اس لئے جہنم کے داروغے انہیں ملامت کرتے ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ ان سے بنیادی حقائق کا اعتراف کراتے ہوئے یہ پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے تم آج کے ہولناک انجام سے بچ جاتے۔ تو وہ اعتراف کرتے ہوئے کہیں گے کہ ڈرانے والا تو آیا تھا اور اس نے ہمیں انذار کرنے میں کوئی کمی بھی نہیں کی۔ لیکن یہ ہماری بدنصیبی تھی کہ ہم سے جس کسی نے بھی یہ خیر خواہی کرنے کی کوشش کی، ہم نے ایسے تمام لوگوں کی تکذیب کی اور ہم نے ان سے صاف کہا کہ تم جو بار بار یہ کہتے ہو کہ یہ دین اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے، یہ شریعت اس کی طرف سے آئی ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ ہم ایک دن ایسا لائیں گے جب تم سے اس بات کا حساب لیا جائے گا کہ تم نے ہمارے احکام کے مطابق زندگی گزاری یا اس کی مخالفت میں۔ تم یہ غلط کہتے ہو، اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بات نازل نہیں کی، اس کی طرف سے نہ کوئی رسول آیا اور نہ کوئی کتاب اتری۔ تم خود ایک بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہو اور ہمیں یہ ڈراوے سنا رہے ہو کہ مر کھپ جانے کے بعد ہم سب از سرِ نو زندہ کئے جائیں گے اور ہمارے ایک ایک قول و فعل کا حساب ہوگا۔

آیت کے آخری جملے میں ''اَنْتُمْ'' کا لفظ آیا ہے جو جمع کی ضمیر ہے۔ حالانکہ جہنم کے داروغے ان سے سوال صرف ایک نذیر کے بارے میں کریں گے جو واحد ہے۔ اس میں دراصل یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے صرف ایک نذیر ہی کو نہیں جھٹلایا بلکہ جس نے بھی ہمیں قیامت کے دن سے خبردار کرنے کی کوشش کی، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہو یا اس کا کوئی ساتھی، ہم نے سب کو گمراہ ٹھہرایا اور ان کی تکذیب کی۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰

(اور وہ کہیں گے، کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں شامل نہ ہوتے۔ ۱۰)

اہلِ جہنم کے اعتراف کی مزید تفصیل

یہ کافروں کے اعتراف کی مزید تفصیل ہے کہ وہ اپنی تکذیب اور سرکشی کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت تأسف سے یہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اپنی طرف آنے والے اللہ تعالیٰ کے نبی کی باتوں اور اس کی تعلیمات پر کان دھرا ہوتا۔ طالبِ حق بن کر ان کی باتوں کو توجہ سے سنا ہوتا یا عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی کہ فی الواقع وہ بات کیا ہے جو ہمارے سامنے کی جا رہی ہے تو آج ہم اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے اور یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہمارا مقدر نہ ہوتی۔

آیتِ کریمہ میں سننے کا ذکر، سمجھنے سے پہلے کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بات کی قبولیت کیلئے لازمی شرط یہ ہے کہ پہلے اسے غور سے سنا جائے اور اگر وہ لکھی ہوئی چیز ہو تو اسے پڑھا جائے۔ اس کے بعد اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ اس پر غور و فکر کی نوبت آئے اور پھر نتیجہ اقرار یا انکار کی صورت میں نکلے۔ لیکن جب کسی بات کو سننے سے ہی انکار کر دیا جائے تو اس کے سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اہلِ مکہ کا حال ایسا ہی تھا اسی لئے قرآنِ کریم جیسی دلوں میں اتر جانے والی کتاب بھی ان پر جلدی اثر انداز نہ ہو سکی ان کا رویہ یہ تھا کہ جب نبی کریم ﷺ انہیں قرآنِ کریم پڑھ کر سناتے تو وہ شور مچاتے اور سننے سے انکار کر دیتے اور لوگوں کو بھی تلقین کرتے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اسے مت سنو، بلکہ شور مچاؤ تاکہ بلا قصد بھی کوئی بات کان میں نہ پڑ جائے۔

Marfat.com

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۱﴾

(اس طرح) وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرلیں گے، پس لعنت ہو ان دوزخ والوں پر۔ ۱۱)

اوپر ان لوگوں کے اعتراف کی تفصیل گزری۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اس طرح وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرلیں گے اور اعتراف کے اہم اجزاء کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اعتراف اس وقت ہوا جب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔ لیکن اس اعتراف سے انہوں نے اس بات کی تصدیق کردی کہ انہیں جہنم میں بھیج کر اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ یہ ان کی اپنی بداعمالیوں اور افکار کی خرابیوں کا نتیجہ تھا۔

ان کے زندگی بھر کے فکری اور عملی گناہوں کو صرف ''ذنب'' کے واحد لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اصل گناہ اور قصور جس کی وجہ سے وہ جہنم کے مستحق ہوئے، رسولوں کا جھٹلانا اور ان کی پیروی سے انکار کرنا ہے باقی سارے گناہ اس کی فرع ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۲﴾

(بیشک جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں یقیناً ان کیلئے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے۔ ۱۲)

اصلاحِ اخلاق کی اصل بنیاد

یہ دین میں اخلاق کی اصل جڑ ہے۔ کسی کا برائی سے اس لئے بچنا کہ اس کی ذاتی رائے میں وہ برائی ہے یا دنیا اسے برا سمجھتی ہے یا اس کے ارتکاب سے دنیا میں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے یا اس پر کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ ہے۔ یہ اخلاق کیلئے ایک بہت ہی ناپائیدار بنیاد ہے۔ آدمی کی ذاتی رائے غلط بھی ہوسکتی ہے۔ وہ اپنے کسی فلسفے کی وجہ سے ایک اچھی چیز کو برا اور ایک بری چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کے معیارِ خیر و شر اول تو یکساں نہیں ہیں پھر وہ وقتاً فوقتاً بدلتے بھی رہتے ہیں، کوئی عالمگیر اور ازلی و ابدی معیار دنیا کے اخلاقی فلسفوں میں نہ آج پایا جاتا ہے نہ کبھی پایا گیا ہے۔ دنیوی نقصان کا اندیشہ بھی اخلاق کیلئے کوئی مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ جو شخص برائی سے اس لئے بچتا ہو کہ وہ دنیا میں اس کی ذات پر مترتب ہونے والے کسی نقصان سے ڈرتا ہے وہ ایسی حالت میں اس کے ارتکاب سے باز نہیں رہ سکتا جبکہ اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ بھی وہ چیز نہیں ہے جو انسان کو ایک شریف انسان بنا سکتی ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی دنیوی طاقت بھی عالم الغیب والشھادۃ نہیں ہے۔ بہت سے جرائم اس کی نگاہ سے بچ کر کئے جاسکتے ہیں اور ہر دنیوی طاقت کی گرفت سے بچنے کی بے شمار تدبیریں ممکن ہیں۔ پھر کسی دنیوی طاقت کے قوانین بھی تمام برائیوں کا احاطہ نہیں کرتے۔ بیشتر برائیاں ایسی ہیں جن پر دنیوی قوانین کوئی گرفت سرے سے کرتے ہی نہیں حالانکہ وہ ان برائیوں سے قبیح تر ہیں جن پر وہ گرفت کرتے ہیں۔ اس لئے دینِ حق نے اخلاق کی پوری عمارت اس بنیاد پر کھڑی کی ہے کہ اس اَن دیکھے خدا سے ڈر کر برائی سے اجتناب کیا جائے جو ہر حال میں انسان کو دیکھ رہا ہے جس کی گرفت سے انسان بچ کر کہیں نہیں جاسکتا جس نے خیر و شر کا ایک ہمہ گیر، عالمگیر اور مستقل معیار انسان

Marfat.com

کو دیا ہے۔ اسی کے ڈر سے بدی کو چھوڑنا اور نیکی کو اختیار کرنا وہ اصل بھلائی ہے جو دین کی نگاہ میں قابلِ قدر ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری وجہ سے اگر کوئی انسان بدی نہیں کرتا یا اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے جو افعال نیکی میں شمار ہوتے ہیں ان کو اختیار کرتا ہے تو آخرت میں اس کے یہ اخلاق کسی قدر اور وزن کے مستحق نہ ہوں گے کیونکہ ان کی مثال اس عمارت کی سی ہے جو ریت پر تعمیر ہوئی ہو۔ (تفہیم القرآن)

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾
اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾

(تم اپنی بات چھپا کے کہو یا علانیہ کہو، وہ تو دلوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔ ۱۳)
کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔ ۱۴)

اللہ تعالیٰ کے علم کی ہمہ گیری

خطاب تمام نوعِ انسانی کو ہے جس میں کافر بھی ہیں اور مومن بھی۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیتیں تہدید کے محل میں بھی ہو سکتی ہیں اور تسلی کے محل میں بھی۔ کافروں کو تہدید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ جس طرح من مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر ہے اور ان کے دلوں کے بھیدوں کو تو بالکل نہیں جانتا۔ تو انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ تم کسی بات کو چھپا کے کہو یا علانیہ کہو، آہستہ کہو یا زور سے کہو۔ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات مخفی نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو وہ ذات ہے جو دلوں میں چھپے ہوئے خیالات کو بھی جانتا ہے۔ جو انسان کے مخفی ارادوں سے بھی باخبر ہے۔ انسان کے ذہن میں جو لہر اٹھتی ہے اسے ارادہ بنتے کچھ دیر لگتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پورے پراسیس سے واقف ہے۔ اس لئے کافروں کو یہ احساس رہنا چاہئے کہ قیامت کے دن انہیں اس ذات سے سابقہ پیش آنے والا ہے جو ان کی ہر طرح کی باتوں، ہر طرح کے ارادوں اور ہر طرح کے اعمال سے باخبر رہا ہے اور آج اسی کے مطابق ان سے معاملہ کرے گا۔

اور مومنوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ تم نے راہِ حق میں جو صعوبتیں اٹھائی ہیں اور اس راستے میں تمہیں جو حوادث پیش آئے ہیں اور جس طرح تمہارا احساس زخمی ہوتا رہا ہے اور جس طرح تمہارے دلوں کی کرچیاں ہوئی ہیں ان میں سے کوئی بات بھی اللہ تعالیٰ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جو مال خرچ کیا اور اس کے دین کی سربلندی کیلئے جس طرح فکرمند رہے، ہر بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے علم کے مطابق تمہاری ایک ایک قربانی کی قدر کرے گا اور تمہارے ایک ایک عمل کی جزاء دے گا۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ کسی کو اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے تمام افکار و اعمال سے کیسے واقف ہو سکتا ہے اور ان کی دماغی کاوشیں اور دل کی امنگیں کس طرح اس کے علم میں آ سکتی ہیں۔ فرمایا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کا خالق ہی نہیں بلکہ اسی نے ان کو دل و دماغ دیئے اور ان کی رعنائیوں اور صلاحیتوں کو بھی اسی نے تخلیق فرمایا۔ انسان کی فطرت بھی اسی نے پیدا کی اور ان کا انگ انگ اور دل و دماغ کا ایک ایک ریشہ اور سانس کی آمد و رفت کا ایک ایک شمہ اور انسان کے اعضاء کا ایک ایک بند اسی کی تخلیق

Marfat.com

اور اسی کی تدبیر سے کام کر رہا ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی بات اس سے مخفی رہے۔ آخر میں فرمایا کہ وہ لطیف بھی ہے اور خبیر بھی۔ وہ باریک بین بھی ہے اور دقیقہ رس بھی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے کام کرتا ہے اور پوشیدہ حقائق سے بھی واقف ہے۔ اس کیلئے خفی اور جلی کی کوئی تقسیم نہیں۔ اس کا علم اور اس کی اطلاع ہر طرح کی ناتمامی اور نارسائی سے پاک ہے۔ اس کا علم ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کا یہ جامع تصور اور اس کے ہمہ وقت خبیر ہونے کا یقین وہ قوت ہے جو انسان کو شرک کی ہر آلودگی سے پاک کر دیتی ہے اور اسی عقیدے میں کمزوری شرک کیلئے بہت سے راستے کھول دیتی ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا
وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ ۖ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ﴿١٥﴾ ءَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ
يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ
أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾ وَلَقَدْ
كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿١٨﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ
فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
بَصِيرٌ ﴿١٩﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ
الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ﴿٢٠﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ
إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَلْ لَجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿٢١﴾ أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا
عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٢٢﴾
قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ
قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ﴿٢٣﴾ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَ

Marfat.com

إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٥﴾
قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿٢٦﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ
زُلْفَةً سِيئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ
بِهِ تَدَّعُونَ ﴿٢٧﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِيَ اللَّهُ وَمَنْ مَعِيَ أَوْ
رَحِمَنَا فَمَنْ يُجِيرُ الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٨﴾ قُلْ هُوَ
الرَّحْمَٰنُ آمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي
ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿٢٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ
يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ ﴿٣٠﴾

رکوع: ۲۔ (وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع بنا رکھا ہے تو تم اس کے کندھوں پر چلو پھرو اور کھاؤ اس کی دی ہوئی روزی، پھر اسی کی طرف اٹھنا ہے۔ ۱۵) کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اور وہ زمین یکا یک لرزنے لگے۔ ۱۶) کیا تم بے خوف ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے، پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا انذار کیسا ہوتا ہے۔ ۱۷) اور ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے، پھر کیسا ہوا میرا انکار۔ ۱۸) کیا انہوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا وہ پروں کو پھیلائے اڑتے ہیں اور ان کو سمیٹ بھی لیتے ہیں، رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو، بیشک وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔ ۱۹) بتاؤ، تمہارے پاس وہ کون سی فوج ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہے، یہ کافر بالکل دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ۲۰) بتاؤ وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے، اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے، دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق بیزاری پر اڑ گئے ہیں۔ ۲۱) بھلا وہ شخص جو اوندھے منہ چل رہا ہے، وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ شخص جو سیدھا ایک سیدھی راہ پر چل رہا ہے۔ ۲۲) اے پیغمبر کہہ دیجئے! وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ۲۳) کہہ دیجئے کہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ۲۴) اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ

Marfat.com

کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۲۵) کہہ دیجئے اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔
۲۶) پس جب اس کو دیکھیں گے قریب آتے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنہوں نے انکار کیا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کا تم تقاضا کرتے تھے۔ ۲۷) ان سے پوچھئے کہ بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کردے یا ہم پر رحم فرمائے، کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا۔ ۲۸) اے پیغمبر کہہ دیجئے! وہ رحمٰن ہے ہم نے اس کو مانا اور اس پر بھروسہ کیا، عنقریب تم جان لوگے کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ ۲۹) اے پیغمبر ان سے پوچھئے! کہ بتاؤ اگر تمہارا پانی نیچے اتر جائے تو تمہارے پاس کون ہے جو صاف اور شفاف پانی لائے۔ ۳۰)

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۗ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾

(وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع بنا رکھا ہے تو تم اس کے کندھوں پر چلو پھرو اور کھاؤ اس کی دی ہوئی روزی، پھر اسی کی طرف اٹھنا ہے۔ ۱۵)

اللہ تعالیٰ کے مزید احسانات کا ذکر

اس سے پہلے سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عجائباتِ قدرت وحکمت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے آسمان کی حیرت انگیز صنعت اور نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے حُسن و جمال کا ذکر کیا تھا۔ اس سے ایک طرف اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال پر استشہاد کیا اور دوسری طرف اپنے احسانات کے حوالے سے اپنی کبریائی اور انسانوں کی بندگی پر استدلال کیا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی سلسلۂ استشہاد و استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے زمین کے حوالے سے اپنے احسانات کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے انسان کے قیام وقرار کیلئے زمین کو "ذلول" بنایا۔ "ذلول" کا معنی ہوتا ہے، پست، نرم، سہل الانقیاد، مطیع اور فرمانبردار۔ زمین اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ باقی کُرّوں کی طرح ایک کُرّہ ہے جو ہر وقت محوِ حرکت ہے اور اس کی اسی حرکت کے باعث انسان کی زندگی اور اس کے معمولات کا سلسلہ قائم ہے۔ جو چیز حرکت میں ہو اور اپنے جسم اور حجم میں نہایت وسعت اور وزن رکھتی ہو اس کا یوں پرسکون رہنا جو انسانوں اور دیگر مخلوقات کیلئے راحت کا باعث ہو، ایک حیران کن بات ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ بالغہ ہے جس نے زمین کو باقی کُرّوں کی طرح تھام کے رکھا ہے اور پھر اسے ایسا پست، نرم اور فرمانبردار بنایا ہے کہ انسان اس پر پیدل چلے، گاڑیاں چلائے، اس پر مکانات کا بوجھ ڈالے، اس کی کھدائی کرے، نہریں کھودے وہ کبھی انکار نہیں کرتی۔ باوجود اس کے کہ اس کا جسم مٹی سے تیار ہوا ہے لیکن اسے اتنا نرم نہیں بنایا گیا کہ چلتے ہوئے انسان کے پاؤں اس میں دھنس جائیں یا وہ مکانوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ جس طرح اس کے میدانی علاقے انسان کی آمد و رفت اور تگ و تاز کیلئے نہایت آرام دہ اور پرسکون ہیں اسی طرح اس کے پہاڑی علاقے بھی اپنے اندر انسانوں کیلئے آنے جانے کے راستے رکھتے ہیں۔ پہاڑوں کی سنگینی کے باوجود وہاں حُسن و جمال کا جابجا ایسا گلشن کھلا دیا ہے، ایسے قد آور درخت اگا دیئے ہیں، ایسی خوبصورت آبشاریں گرا دی ہیں اور ایسے چشمے ابال دیئے ہیں جن میں بہتا ہوا پانی ایسا لگتا ہے جیسے چاندی اور پارہ بہہ رہا ہو، انہیں سنگین پہاڑوں میں ایسے نالے بہتے ہیں جن کا شور آنے جانے والوں کیلئے موسیقی کا کام دیتا ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے پیٹ میں قوتِ روئیدگی رکھی ہے جو انسان کیلئے غلہ اور پھل اگاتی ہے اسی طرح اس کے پیٹ میں عجیب وغریب معدنیات رکھی ہیں جو انسان کی ضرورت بھی ہیں اور قوت کا سامان بھی۔ انسان اس کے پھیلے ہوئے راستوں پر اس طرح سفر کرتا ہے جیسے فرمانبردار اونٹنی کے کندھوں پر سوار سفر کرتا ہے۔ جس طرح فرمانبردار اونٹنی اپنے سوار کو اٹھائے نہایت فرمانبرداری سے چلتی رہتی ہے اسی طرح زمین کے کندھے بھی انسانوں کا بوجھ بھی اٹھاتے ہیں اور ان کیلئے سہولتیں بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں ان دونوں غیر معمولی فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے کندھوں پر چلو پھرو، یعنی اس کے راستوں پر جہاں چاہو آؤ جاؤ اور اس کے پہاڑی راستے تو بالکل اونٹنی کے کندھوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں اور پھر اس بات کا کوئی خطرہ نہیں کہ تم زمین پر سفر کرتے ہوئے کہیں اس کی پہنائیوں میں گم ہو جاؤ گے اور ایسی ناہموار اور خشک زمین میں تمہیں کہیں کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ اسی زمین کے اندر سے رزق کے خزانے جاری کر رکھے ہیں۔ ہموار زمین میں غلہ اگتا ہے، پہاڑوں میں ہماری عمارتوں کیلئے لکڑی، جلانے کیلئے ایندھن اور مختلف خوش ذائقہ اور رسیلے پھلوں سے لدے ہوئے درخت جا بجا مختلف علاقوں میں مختلف خصوصیات لئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتنا بے ذوق ہے وہ دل اور کس قدر اندھی ہے وہ آنکھ اور کس قدر بہرہ ہے وہ کان جو اللہ تعالیٰ کے احسانات کو دیکھے، ان سے فائدہ اٹھائے، لذتِ کام و دہن کا سروسامان کرے اور جا بجا پھیلے ہوئے حُسن اور مہکتے ہوئے پھولوں سے مشامِ جان کو معطر کرے، لیکن ان سب کے خالق کی طرف اس کا دھیان کبھی نہ جائے اور وہ گمان کرے کہ ہمیں شاید اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ ہم بغیر کسی ذمہ داری کے احساس کئے ان انمول نعمتوں سے فائدہ خوب اٹھائیں لیکن یہ کبھی نہ سوچیں کہ جس ذات نے ہمارے لئے یہ خوانِ نعمت بچھایا ہے کبھی اس سے آمنا سامنا بھی ہوگا اور وہ اپنی نعمتوں کے بارے میں ہم سے سوال کرے گا۔ یہ وہ پیش پا افتادہ حقیقت ہے جو قدم قدم پر انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے لیکن اس کا تغافل اتنا شدید ہے کہ پروردگار خود اس کی طرف متوجہ فرما رہا ہے کہ تمہیں ایک دن اس کی طرف لوٹنا ہے اور زندہ ہو کر جانا ہے۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿١٦﴾

(کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اور وہ زمین یکا یک لرزنے لگے۔ ۱۶)

قہر وانتقام سے انسانی ہدایت پر استدلال

اس سے پہلے کی آیات میں پروردگار نے انسانوں کو اپنے احسانات وانعامات کے حوالے سے اپنی ذات اور ان کی بندگی اور احتیاج کی طرف متوجہ فرمایا اور اسی طرح دوبارہ جی اٹھنے پر استدلال کیا۔ اب انسانوں کو راہِ راست کی طرف متوجہ کرنے کیلئے اپنے قہر وانتقام کا حوالہ دے رہا ہے کہ جس پروردگار نے تمہیں ایسی زمین عطا فرمائی ہے کہ وہ تمہارے معمولات اور تگ وتاز کیلئے نہایت پست اور فرمانبردار واقع ہوئی ہے اور اس نے اپنا سر تمہارے سامنے ڈالا ہوا ہے اور تم چاہو اللہ تعالیٰ کے سامنے سرکشی کرو لیکن وہ تمہارے لئے غلہ اگانے سے کبھی سرکشی نہیں کرتی۔ ایمان اور کفر دونوں حالتوں میں تمہارے معمولات میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو ذمہ دار بندہ ثابت کرنے کی کوشش کرے، شترِ بے مہار بن کر زندگی گزارنے پر

Marfat.com

اصرار کرتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگر اس نے انسانوں پر احسانات کئے ہیں اور ربوبیت کے فیضان سے انہیں نوازا ہے تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ انسانوں کے اعمال کی پاداش میں انہیں زمین میں دھنسا دے کہ وہ زمین جوان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور انہیں ہر سہولت مہیا کرنے کیلئے نہایت فرمانبردار ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک دن وہ بوجھ اٹھانے سے انکار کردے اور انسان اس کے اندر دب کر رہ جائے اور یہ محض مفروضہ نہیں، انسانوں نے بارہا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ زمین لرزنے لگتی ہے یعنی زلزلہ آتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بیشار لوگ لقمۂ اجل ہوجاتے ہیں، سربفلک عمارتیں زمین بوس ہوجاتی ہیں، زمین میدانِ حشر کا منظر پیش کرنے لگتی ہے اور یہ سب کچھ زمین کی مرضی سے نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین انسانوں کی خدمت میں لگی ہوئی ہے اور اس کی قوتِ روئیدگی انسانوں کیلئے غذائی ضرورتیں پوری کررہی ہے اور جب اسی مالک کا حکم ہوتا ہے تو یہی فرمانبردار زمین زلزلے کا شکار ہوکر انسانوں کیلئے تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسانوں کے کفر و شرک اور بداعمالیوں کے باعث اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور کسی بھی قوم کو تنبیہ کرنے کا فیصلہ کرلیا جاتا ہے۔ تو بگڑے ہوئے لوگوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ تم اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے جارہے ہو تو کیا تم اس بات سے بے خوف ہوگئے ہو کہ وہ جو زمینوں کی پستیوں کا مالک ہے اور آسمانوں کی بلندیوں کا بھی، کسی وقت بھی تم اس کے قہر و انتقام کا شکار ہوجاؤ۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

آیتِ کریمہ میں ''مَنْ فِی السَّمَآءِ'' کے لفظ سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ اور کسی مکان میں رہنے کی احتیاج سے پاک ہے۔ آسمان اس کے رہنے کی جگہ نہیں بلکہ اس کی مخلوق ہے۔ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کو اسی نے پیدا فرمایا ہے اور ایک وقت ایسا بھی تھا جب نہ زمین تھی نہ آسمان تھا، لیکن پروردگار تو ازل سے ہے۔ اس نے خود اپنے تعارف میں فرمایا فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ''پس تم جدھر بھی رخ کرو اس طرف اللہ کا رخ ہے'' یہ بات انسانی محاورے اور انسانی عادت کے مطابق ارشاد فرمائی گئی ہے کیونکہ انسان جب بھی اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا ہے، تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے، دعا مانگتا ہے تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے۔ جب سب سہارے جواب دے جاتے ہیں تو آسمان کی طرف رخ کرکے اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے، کوئی ناگہانی مصیبت آتی ہے تو کہتا ہے اوپر سے نازل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں کو کتبِ آسمانی یا کتبِ سماوی کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جب وہ خدا کا تصور کرتا ہے تو اس کا ذہن نیچے زمین کی طرف نہیں بلکہ اوپر آسمان کی طرف جاتا ہے۔ اسی انسانی فطرت اور شیوۂ زبان کے مطابق اس آیتِ کریمہ میں ان الفاظ کو استعمال فرمایا گیا ہے۔

آیتِ کریمہ کے آخری لفظ ''تَمُوْرُ'' کا ترجمہ ہم نے یہ کیا ہے وہ لرزنے لگتی ہے یا جھکولے کھانے لگتی ہے، لیکن بعض اہلِ علم نے یہ گمان کیا ہے کہ ''تَمُوْرُ'' مَور سے ہے اور مَور کا اصلی معنی حرکتِ سریع، یعنی تیز رفتاری ہے۔ اس لحاظ سے اس لفظ کا ترجمہ یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اچانک وہ تیز چلنے لگے۔ یہ ترجمہ بھی سیاقِ کلام کے خلاف نہیں، اور دونوں ترجموں میں کوئی ایسا تضاد بھی نہیں۔ یعنی پروردگار کی جانب سے انسانوں کی گرفت کی شکل میں جس طرح زلزلے آتے ہیں اور زمین لرزتی اور کانپتی ہے۔ اسی طرح انسان کی زمینی زندگی کا دارومدار زمین کی دونوں حرکتوں کا اپنی اصل شکل و صورت میں باقی رہنے میں ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی کمی بیشی ہوجائے تو موسموں میں تغیر آجائے۔ دن اور

Marfat.com

رات بہت چھوٹے ہو جائیں یا بہت بڑھ جائیں۔نتیجتاً زمین انجماد کا شکار ہو جائے اور چولھے بجھ جائیں اور اس کا پانی ابلنے لگے اور آتش پذیر ہر چیز جل کر تباہ ہو جائے اور اس طرح انسانی زندگی ہلاکت کا شکار ہو جائے۔قربِ قیامت کی جو علامتیں احادیث میں بیان ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوگا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زمین کی حرکت صرف تیز ہی نہیں ہوگی بلکہ الٹ جائے گی اور یہ بھی ایک علامت بیان کی گئی ہے کہ ایک آگ نکلے گی جو تمام زمین پر تباہی مچادے گی تو شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ گرمیوں کے دن کی طوالت ہر چیز کو بھون ڈالے گی اور آخر آگ کا شکار ہو جائے گی۔ واللہ اعلم واحکم بالصواب

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِ ﴿۱۷﴾

(کیا تم بے خوف ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے، پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا انذار کیسا ہوتا ہے۔ ۱۷)

فضائی عذاب کی دھمکی

گزشتہ آیتِ کریمہ میں زمین میں دھنسانے کا ذکر تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس زمین پر تم رہتے ہو اور وہ تمہارا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ کے عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ یہی زمین اور تمہارے پاؤں کے نیچے کی مٹی تمہارے لئے عذاب کا عنوان بن جائے۔اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح پاؤں کے نیچے سے عذاب آسکتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں کہ تمہارے سر کے اوپر سے عذاب آجائے۔یعنی وہ تم پر ایک ایسی آندھی بھیجے اور ہواؤں کے ایسے جھکڑ چلائے جو تم پر کنکر اور پتھر برسائیں۔ ''حَاصِبٌ'' کنکر پتھر برسا دینے والی طوفانی ہوا کو کہتے ہیں۔قومِ لوط پر عذاب اسی قسم کا بھیجا گیا تھا جس سے ان کی بستیاں تباہ کر دی گئیں۔اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کس قوم پر اس طرح کا عذاب آیا۔مقصد کہنے کا یہ ہے کہ تم جو زمین پر اطمینان سے شب و روز گزار رہے ہو اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہو تو یہ صرف اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کا موقع دے رکھا ہے۔لیکن تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ تم ہر وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی گرفت میں ہو۔تمہاری بقاء اور تمہاری سلامتی صرف اس کے فضل کا نتیجہ ہے۔وہ جب چاہے تمہیں عذاب کا نشانہ بنا سکتا ہے۔اس کے ایک اشارے پر زمین تمہارے لئے قبر کا گڑھا بن سکتی ہے اور ہوا کا طوفان تمہاری بستیوں کو غارت کر سکتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ ''تم عنقریب جان لو گے کہ میرا انذار اور میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے۔'' نذیر یوں تو اسمِ صفت ہے لیکن مصدر کے معنی میں بھی اس کا استعمال معروف ہے۔اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ آج تو تمہیں میرا انذار مذاق معلوم ہوتا ہے لیکن جب وہ سامنے آجائے گا تو تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ جس چیز کا تم مذاق اڑا رہے تھے وہ کتنی ہولناک چیز ہے۔اور اگر نذیر کو اس کے اصلی معنی میں رکھا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اے مکے کے لوگو! آنحضرت ﷺ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نذیر بن کے آئے ہیں آج تم ان کا مذاق اڑاتے اور منہ چڑاتے ہو، جب وہ تمہیں انذار کرتے ہیں یعنی آنے والے عذاب سے تمہیں ڈراتے ہیں تو تم اسے ایک افسانہ سمجھتے ہو، لیکن اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا اور تمہارے

Marfat.com

انکار اور تکذیب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا تو تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ وہ نذیر کیسا تھا۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے کس طرح دکھ اٹھا کر تمہاری بدزبانیوں کو برداشت کر کے اور خونِ جگر پی پی کر تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا، لیکن تم نے ایک بات بھی مان کر نہ دی۔ عذاب آنے پر تمہیں معلوم ہوگا کہ اس نذیر نے تمہارے ساتھ کیسی خیر خواہی اور غمخواری کی تھی اور تم نے کس قدر احسان ناشاسی کا ثبوت دیا تھا۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿١٨﴾

(اور ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے، پھر کیسا ہوا میرا انکار۔ ۱۸)

تاریخ کے حوالے سے قریش کو تہدید

آنحضرت ﷺ کی تبلیغ و دعوت کی صداقت پر سب سے بڑی دلیل تو آنحضرت ﷺ کا بلند کردار تھا اور قریش کی بے پناہ تکلیفوں کے مقابلے میں آپؐ کی ناقابلِ شکست استقامت تھی۔ لیکن جب کفارِ قریش نے اتنے محکم دلائل کی موجودگی میں ان حقائق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو آنحضرت ﷺ ان کے سامنے پیش فرماتے تھے تو اب ان کے سامنے تاریخ کی مُسلمہ حقیقت پیش کی جا رہی ہے جس سے انکار کرنا شاید قریش کیلئے ممکن نہ ہو کہ تمہیں اس بات کا یقین نہیں آ رہا کہ تمہاری تکذیب کے نتیجے میں تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی آ سکتا ہے تو پھر تاریخ کے آئینے میں جھانک کر دیکھو، کہ تم سے پہلے جو قومیں عذاب کا شکار ہوئی ہیں اور اپنے تجارتی اسفار میں تم ان کے کھنڈرات کے قریب سے گزرتے بھی ہو، تاریخ سے پوچھو کہ یہ قومیں عذاب کا نشانہ کیوں بنیں۔ ان کے تباہ شدہ کھنڈرات کا ایک ایک ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ تکذیب کرنے والی قومیں عذاب کا شکار ہوتی رہی ہیں اور ان کا ایک ایک پتھر ان کی بدنصیبی کی داستان بیان کرتا ہے۔ تم نے اگر اپنا رویہ نہ بدلا تو کل کو یہ آبادیاں تمہاری تاریخ کا ایک باب بن جائیں گی جو دوسروں کیلئے عبرت کا سامان ہوگا۔ اس لئے تاریخ سے سبق سیکھو، یہ کوئی عقلمندی نہیں کہ جب تک آدمی خود کسی افتاد میں مبتلا نہ ہو، اس وقت تک وہ سبق سیکھنے سے انکار کرتا رہے۔

نکیر کا معنی جس طرح انکار ہے اسی طرح گرفت اور پھٹکار بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انکار اس کا لفظی معنی ہے اور گرفت اور پھٹکار اس کا نتیجہ ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ان معذب قوموں کی تاریخ دیکھو اور ان کے کھنڈرات کا جائزہ لو تو تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی تکذیب، اللہ تعالیٰ کے عذاب کا انکار کس نتیجے کا حامل ہوتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو اس کی گرفت کتنی شدید ہوتی ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ
اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ﴿١٩﴾

(کیا انہوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا وہ پروں کو پھیلائے اڑتے ہیں اور ان کو سمیٹ بھی لیتے ہیں، رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو، بیشک وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔ ۱۹)

Marfat.com

مخلوق کی بے بسی اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے استشہاد

اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت اور اس کے سامنے ہر مخلوق کی بے بسی ایک مثال کے ذریعے واضح فرمائی جارہی ہے۔قرآن کریم اپنے پڑھنے اور سننے والوں سے مخاطب ہوکر کہہ رہا ہے کہ کیا لوگ اپنے اوپر پرندوں کو ہوا میں اڑتا ہوا نہیں دیکھتے کہ وہ نہایت اطمینان سے فضاء میں کبھی اِدھر،کبھی اُدھر اٹھکیلیاں کرتے پھرتے ہیں حالانکہ ان کا جسم ہَوا سے بھاری ہے۔اپنے وزن کی وجہ سے انہیں زمین پر گر جانا چاہئے۔ زمین کی کششِ ثقل ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہ چھوٹے بڑے جانور اس قانونِ کشش سے آزاد نہیں ہیں اور کوئی اور قوت فضاء میں ان کو تھامنے والی نہیں ہے۔ بایں ہمہ جب تک ایسی تیز ہَوا نہ چلے جو پرندے کی قوتِ مدافعت پر غالب آجائے یا پرندہ بیمار نہ ہوجائے یا ژالہ باری پرندوں کو زخمی نہ کردے،اس وقت تک پرندہ اپنی مرضی کیخلاف زمین پر گرنے نہیں پاتا۔سوال یہ ہے کہ فضاء میں اسے کس نے تھام رکھا ہے، وہ کون ذات ہے جس نے پرندے کو وہ ساخت عطا فرمائی ہے جس سے وہ اڑنے کے قابل ہوا، وہ کون ہے جس نے ہر پرندے کو اڑنے کا طریقہ سکھایا اور پھر وہ کون ذات ہے جس سے ہَوا کو ان قوانین کا پابند کیا جس کی بدولت ہَوا سے زیادہ بھاری جسم رکھنے والی چیزوں کو اس میں اڑنا ممکن ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب ایک ہی ہے کہ وہ ذات، اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔اس نے صرف پرندوں کو ہی نہیں بلکہ ہمارے سروں کے اوپر تنی ہوئی ہر چیز کو تھام رکھا ہے۔آسمان بغیر ستون کے کھڑا ہے، وہ ہمارے سروں پر گر کیوں نہیں جاتا؟ صرف اس لئے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت نے تھام رکھا ہے۔فضائے لامتناہی کے کواکب ونجوم اور اس کے ثوابت اور سیارے اللہ تعالیٰ کے سوا کس نے تھام رکھے ہیں۔ان میں سے کوئی ایک بھی اگر گر جائے تو پورے کُرّہ ارض کو تہہ وبالا کر کے رکھ دے۔یہ صورتحال ہمیں یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ انسان سمیت تمام مخلوقات کتنی بے بس ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کس قدر عظیم قدرتوں کی مالک ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ پرندوں کی مثال سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ صرف پرندوں کو فضاء میں سنبھالے ہوئے ہے اور باقی مخلوقات اپنے بل بوتے پر اپنے فرائض ادا کر رہی ہیں۔فرمایا، ایسا نہیں۔اس خدائے رحمٰن کی یہ رحمت ہے کہ وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔درختوں کے پتوں سے لے کر آسمان کے کواکب ونجوم تک ہر چیز اسی کے سہارے اپنی جگہ پر قائم ہے۔اگر کسی چیز کا کوئی ایک پیچ بھی ذرا سا ڈھیلا پڑ جائے تو نہ جانے تباہی کہاں کہاں تک پھیل جائے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ۚ ﴿۲۰﴾

(بتاؤ،تمہارے پاس وہ کون سی فوج ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہے، یہ کافر بالکل دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ۲۰)

کفار کی خود فریبی پر تنبیہ

نبی کریم ﷺ جب قریشِ مکہ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اور قیامت میں جوابدہی سے ڈراتے تھے تو یہ فکرمند ہونے کی بجائے مذاق اڑاتے تھے، حتیٰ کہ ان کی جرأت یہاں تک بڑھی کہ جب بھی ان کا آنحضرت ﷺ سے سامنا ہوتا تو وہ آپؐ سے عذاب کا مطالبہ کرتے یا قیامت کے جلد وقوع پذیر ہونے پر اصرار کرتے۔اس آیتِ کریمہ میں ان سے کہا جارہا ہے کہ تم جس بے باکی سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے پاس وہ کون سا لشکر ہے جس سے تم اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مقابلہ کروگے۔اگر پروردگار نے تمہاری تباہی کا فیصلہ کر لیا تو

Marfat.com

کیا تم زمین کو پھٹنے یا ہچکولے کھانے سے روک سکتے ہو یا اوپر سے اگر پتھروں کی بارش شروع ہوگئی تو تمہارے پاس کون سی ایسی پناہ گاہ ہے جس میں تم اپنے آپ کو بچا سکو گے۔ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی جب گرفت آتی ہے تو قلعوں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس سے بچ نہیں سکتے۔ جن لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ ہمارے دفاعی حصار ناقابلِ تسخیر ہیں، ان کے حصار بھی مکڑی کے جالے ثابت ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کافر بہت بڑے فریب میں مبتلا ہیں۔ وہ عذاب کی دھمکی کو محض ایک مذاق سمجھتے ہیں اور اسے تسلیم کرنے کیلئے اپنی آنکھوں کے سامنے اس کا وقوع ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھتا ہے کہ عذاب کے نازل ہو جانے کے بعد اسے تسلیم کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾

(بتاؤ وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے، اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے، دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق بیزاری پر اڑ گئے ہیں۔ ۲۱)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں قریش کی ہٹ دھرمی

قریشِ مکہ اور دیگر منکرین سے سوال کیا جا رہا ہے کہ تم جو اللہ تعالیٰ کے دین کی بات سننے کے روادار نہیں ہو اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی دشمنی پر اس لئے تلے ہوئے ہو کہ وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین سے تمہاری یہ سرکشی اور بے نیازی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے خوشحالی عطا فرمائی ہے۔ اس کے گھر کی برکتوں سے تمہارے تجارتی راستے کھلے ہیں۔ عرب کے تمام قبائل راستے مخدوش ہونے کی وجہ سے جن تجارتی منڈیوں تک نہیں پہنچ سکتے، تم صرف اس لئے پہنچ جاتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے گھر کے متولی اور خدمت گزار ہو۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر بجالاتے اور زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے دین کی علمبرداری کرتے۔ لیکن تم نے تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہوئے اس کے پیغمبر کی دشمنی اور اس کے دین کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ جس پروردگار نے تمہیں رزق کے وسائل عطا فرمائے ہیں اگر وہ چاہے تو رزق کے ان سوتوں کو خشک نہیں کر سکتا۔ تمہاری زندگی کے بیشتر معاملات کا دار و مدار نزولِ باراں پر ہے۔ اگر وہ اس کا نزول روک دے تو تم قحط کا شکار ہو جاؤ۔ اسی طرح تمہارے باقی وسائل کے راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کر دے یا تم پر جنگ کے بادل مسلط کر دے، تو بتاؤ تم اللہ تعالیٰ کا کیا بگاڑ سکتے ہو اور اپنی زندگی کی بقاء کا کیا سرو سامان کر سکتے ہو۔ تمہاری احتیاج اور تمہاری بے بسی تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی تمہیں حق کی طرف لانے کی بجائے حق سے دور کیوں لے جا رہی ہے۔ تم اپنی بے بسی اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کو دیکھتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں اس کا دین اختیار کرنے اور اس کے فرمانبردار بندے بننے کیلئے تیار نہیں ہو۔ پھر خود ہی پروردگار نے اس کا سبب بیان فرمایا، کہ بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے اندر ایک سرکشی پیدا ہوگئی ہے اور حق بیزاری تمہارا رویہ بن گیا ہے اور سچائی اور دین کی ہر بات سے تمہیں کد اور ضد ہوگئی ہے۔ تو جس قوم کو یہ بیماریاں لاحق ہو جائیں انہیں کوئی بات سمجھانا ممکن نہیں ہوتا۔ بات اسے سمجھائی جا سکتی ہے جو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو، لیکن جہاں ضد اور ہٹ دھرمی پیدا ہو جائے وہاں بات سمجھانا تو اپنا سر پھوڑنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

Marfat.com

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۲﴾

(بھلا وہ شخص جو اوندھے منہ چل رہا ہے، وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ شخص جو سیدھا ایک سیدھی راہ پر چل رہا ہے۔ ۲۲)

انسان کے بگاڑ کے اصل اسباب

کفار مکہ جو آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت، آپؐ کے پیغام کی فصاحت و بلاغت اور آپؐ کی عظمتِ کردار کے باوجود بھی آپؐ کی دعوت قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے اندر ضد اور ہٹ دھرمی پائی جاتی ہے۔ اور دوسری وجہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کا رویہ اور ان کا طرزِ عمل دو باتوں کی غمازی کرتا ہے اور یہی درحقیقت ان کی دو بیماریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زندگی کے معاملات میں جن کا تعلق بالخصوص اخلاق اور اجتماعی زندگی سے ہے ایک خاص روش رکھتے ہیں اور وہ روش یہ ہے کہ ان معاملات میں وہ غور و فکر، تجربے، عقل و شعور اور صاحب الرائے لوگوں کی رہنمائی لینے کی بجائے جو طریقہ انہیں اپنے آباؤ اجداد اور اپنے ماحول سے ملا ہے اندھوں کی طرح سر جھکائے اسی پر چلنا صحت و صداقت کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ عقل بیشک ان باتوں کو قبول نہ کرے، اخلاق بیشک اس کی مخالفت کریں، لیکن وقت کا چلن اگر اس کی تائید کرتا ہے تو وہ نہ عقل کی بات سنتے ہیں اور نہ اخلاق کی۔ وہ اپنے رسم و رواج کو سب سے بڑی دلیل سمجھتے ہیں اور زندگی کے بارے میں ان کے تصورات ایک جگہ جامد ہو چکے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہوس کی حکمرانی اور اسباب دنیا کی محبت نے انہیں ایسا اندھا کیا ہے کہ اب ان کا چلن کتے کے چلن کے مشابہ ہو کر رہ گیا ہے۔ جس طرح کتا زمین پر چلتا ہوا زمین کو سونگھتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کہیں سے بوئے طعام آ جائے اور میں اسے کھود کر نکال لوں، ممکن ہے کہیں ہڈی چھپی ہوئی ہو۔ خواہش کا غلام بھی خواہشوں کی تکمیل میں سر جھکائے اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتا رہتا ہے۔ ایسا شخص ظاہر ہے کہ کبھی راہِ ہدایت نہیں پا سکتا۔ ہدایت کی راہ اس کو ملتی ہے جو سیدھی راہ پر سر اٹھا کر دائیں بائیں اور آگے پیچھے کا جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے۔ وہ عقل کی بات بھی سنتا ہے اور نصیحت کی بات بھی۔ وہ خواہشوں کو مقاصدِ زندگی میں تبدیل ہونے نہیں دیتا۔ وہ اپنی حیثیت کا تعین کرنے کے بعد بندگی کی شاہراہ پر بندگی ہی کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سیدھا سفر کرتا ہے۔ اس طرح اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ انسانی اور حیوانی زندگی میں یہی بنیادی فرق ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مستوی القامت پیدا فرمایا ہے۔ جانوروں کی طرح زمین کی طرف جھکا ہوا پیدا نہیں کیا گیا۔ یہ سر اٹھا کر اور دائیں بائیں دیکھ کر چلتا ہے۔ اور جانور صرف خواہشِ طعام میں سر جھکا کے چلتا رہتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کا سفر معدے سے شروع ہو کر معدے پر ختم ہوتا ہے، یہی اس کا مطاف ہے۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے بندۂ شکم نہیں، اپنا بندہ بنایا ہے۔ اس لئے اس کی زندگی کی تگ و تاز کا میدان بڑا وسیع ہے۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے! وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ۲۳)

Marfat.com

اپنے من میں ڈوب کر فیصلہ کرنا سیکھئے

اس سے پہلی آیت میں گمراہ اور ہدایت سے محروم شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو اوندھے منہ سر جھکائے جامد تقلید کے بندھنوں میں گرفتار خواہشات کا اسیر اور دنیا کے چلن کا پرستار بن کر سر جھکائے چلتا رہتا ہے اور کبھی غور وفکر نہیں کرتا کہ میرا طرزِ عمل صحیح ہے یا غلط۔ اسے ملامت کرتے ہوئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں انسان بنایا تھا، لیکن تم نے حیوانوں کی روش اختیار کی۔ تمہارا کام یہ نہیں تھا کہ جو گمراہی دنیا میں پھیلی ہوئی ہو اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل پڑو۔ اور کچھ نہ سوچو کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ کان سننے کیلئے دیئے تھے اور آنکھیں دیکھنے کیلئے اور دل و دماغ سوچنے سمجھنے کیلئے۔ لیکن تم زمانے کی روش میں ایسے مبتلا ہوئے کہ نہ تم نے سر اٹھا کے دیکھا کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں وہ صحیح ہے یا نہیں اور میرے گردوپیش میں جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ کس بات کی شہادت دے رہی ہیں۔ اور نہ تم نے کبھی کسی ہمدرد کی بات سننے کی زحمت گوارا کی۔ اور جو غلط سلط باتیں تمہارے دماغ میں پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں انہیں پر اڑے رہے۔ اور نہ تم نے اپنے دل و دماغ سے کبھی سوچنے سمجھنے کا کام لیا بلکہ تم اس طریقے کی پیروی میں لگے رہے جو دنیا میں کبھی کسی نے جاری کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے علم وعقل اور سماعت و بینائی کی یہ نعمتیں تمہیں حق شناسی کیلئے عطا کی تھیں، لیکن تم نے حق شناسی کی بجائے ناشکری کا رویہ اختیار کر لیا۔ خود ہی اپنی اس روش پر غور کرو کہ تمہیں کیا بنایا گیا تھا اور تم کیا بن چکے ہو۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

(کہہ دیجئے کہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ۲۴)

آخرت میں جواب دہی پر ایک عقلی دلیل

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نہایت اعجاز کے ساتھ بعض حقائق کی طرف اشارے فرمائے اور ایک وسیع مضمون کو چند لفظوں میں سمیٹ دیا ہے۔ الفاظ پر غور کرنے سے ایک تمثیل ذہن میں آتی ہے کہ جس طرح ایک کاشتکار زمین میں کاشت کرتا ہے، وقت پر اس کی آبیاری کرتا ہے، چرند و پرند سے اس کی حفاظت کرتا ہے، کھاد کی ضرورت ہو تو کھاد مہیا کرتا ہے۔ تو ہر شخص دیکھنے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ جب یہ فصل تیار ہو جائے گی تو اس کا کاشت کرنے والا اسے کاٹے گا، اس کے دانے اور بھس کو الگ الگ کرے گا اور اس کے کھتے میں جمع کر کے بھس کو جلا دے گا۔ تو کوئی شخص ایسا سمجھنے والے کی تغلیط نہیں کرتا بلکہ ہر شخص تائید کرتا ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسانوں کی فصل کاشت کی ہے۔ کوئی کسان اپنی فصل کی اتنی دیکھ بھال نہیں کرتا جس قدر پروردگار زمین پر پھیلی ہوئی اپنی فصل کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو وہ نگرانی بھی کرتا ہے اور اسے غذا بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو عہد بعہد اور حسبِ ضرورت اس کیلئے امکانات پیدا کرتا ہے اور سامانِ تربیت بہم پہنچاتا اور افزائش کرتا ہے۔ ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی نگاہِ ربوبیت انسان کی نگرانی کرتی اور اس کیلئے ضرورتیں مہیا کرتی ہے۔ جس طرح کاشتکار کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس قدر محنت اٹھانے اور فصل کو پروان چڑھانے کے بعد اسے یونہی چھوڑ دے گا اور وہ فصل ایک دن تباہ ہو جائے گی۔ اسی طرح انسانوں کے بارے میں یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ انسانوں کے قافلے

Marfat.com

یونہی دنیا میں آتے رہیں گے، اپنا سفر ختم کر کے موت کا شکار ہوتے رہیں گے، حتیٰ کہ ایک روز دنیا کی صف لپیٹ دی جائے گی۔ایسے کارِ عبث اور بیکار شغل کا تصور ہم ایک کسان سے تو نہیں کر سکتے تو اللہ تعالیٰ سے کیسے کر سکتے ہیں۔اس سے خود بخود یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس نے یہ فصل پروان چڑھائی ہے وہی ایک دن اس کو سمیٹے گا اور اکٹھا کرے گا۔اس کے دانوں کو بھس سے جدا کرے گا اور اس کے کھتے میں جمع کر کے بھس کو جلا دے گا۔اور چونکہ انسانوں کو عقل و شعور دے کر تکلیفِ شرعی کا بھی پابند کیا گیا ہے۔اس لئے اسے جزاء و سزا سے گزارا جائے گا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٦﴾

(اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۲۵) کہہ دیجئے اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۲۶)

قریش کا لغو معارضہ اور اس کا جواب

گزشتہ آیتِ کریمہ میں وقوعِ قیامت پر عقلی اور واقعاتی دلیل ذکر فرمائی گئی ہے۔قرآنِ کریم نے اور بھی متعدد مواقع پر مختلف حوالوں سے قیامت کے آنے پر دلائل قائم کیے ہیں لیکن منکرینِ قیامت نے ان دلیلوں کے جواب میں یا تو ہٹ دھرمی کا ثبوت دیا یا وقوعِ قیامت کو مستبعد از عقل قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا ہے۔لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دلائل کے سامنے بے بس ہو کر ان کی آخری بات یہ تھی کہ اگر قیامت کا آنا واقعی حقیقت ہے اور تم اس دعوے میں سچے ہو تو پھر بتاؤ وہ قیامت کب آئے گی۔بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات کہنے والے شاید یہ کہنا چاہتے ہوں کہ اگر آپ ہمیں یہ بتا دیں کہ قیامت کے آنے کا وقت فلاں ہے تو ہم اس کو تسلیم کر لیں گے اور آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔انہوں نے درحقیقت انکارِ قیامت کیلئے ایک راستہ نکالا تھا۔انہیں معلوم تھا کہ غیبی حقیقتوں کے بارے میں کبھی متعین وقت نہیں بتایا جاتا۔کیونکہ اگر متعین وقت بتا دیا جائے تو انسانوں کی آزمائش ختم ہو جاتی ہے اور وہ حکمت بھی بیکار ہو جاتی ہے جو ایمان بالغیب میں رکھی گئی ہے۔ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اولاً تو یہ وقت بتایا ہی نہیں جائے گا تو ہمیں انکار کرنے کا ایک جواز مل جائے گا۔اور اگر وقت بتا دیا گیا تو ہم کہیں گے کہ ٹھیک ہے اگر اس وقت پر قیامت آ گئی تو ہمیں اسے مان لیں گے لیکن آج تو اس کا یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ضرور آئے گی۔غور کیجئے ایسی صورتحال میں امرِ واقعہ میں کیا فرق پیدا ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک لغو معارضہ ہے جس میں کوئی معقولیت نہیں۔اس لئے کہ دنیا میں کتنی ایسی صداقتیں ہیں جن کے وقوع کی تاریخ اور وقت کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔لیکن اس صداقت کے بارے میں ہم ہمیشہ بوقتِ ضرورت آگاہی دیتے رہتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم کسی شخص کے بارے میں یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کب مرے گا، کیونکہ موت کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا۔لیکن کسی شخص کی غیر محتاط زندگی اور اس کے نامناسب رویئے کو دیکھ کر ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ تمہیں کچھ احتیاط کرنی چاہئے اور اپنے رویئے کے بارے میں غور کرنا چاہئے کیونکہ ایک دن بہرحال تمہیں بھی موت آئے گی۔اس کے جواب میں کوئی سمجھدار آدمی یہ نہیں کہتا کہ میں تمہاری

Marfat.com

بات کو تب تسلیم کروں گا جب یہ بتاؤ کہ مجھے موت کب آئے گی۔ کیونکہ اگر یہ بات بتا بھی دی جائے اور واقعی اس روز موت آ جائے تو اسے اس کا کیا فائدہ پہنچے گا۔ اس لئے دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ موت کے وقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ میں تو تمہیں صاف صاف خبردار کرنے کیلئے آیا ہوں تاکہ تم اس کیلئے تیاری کر سکو۔ اور مزید یہ کہ قیامت کے آنے پر ایمان لانا چونکہ نفسِ ایمان کا حصہ ہے، اس لئے اگر یہ بتا دیا جائے کہ فلاں روز قیامت آ رہی ہے تو پھر اس پر ایمان لانا کوئی امتحان نہیں رہے گا کیونکہ کوئی چیز جب غیب سے شہود کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کا ماننا یا نہ ماننا برابر ہوتا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾

(پس جب اس کو دیکھیں گے قریب آتے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنہوں نے انکار کیا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کا تم تقاضا کرتے تھے۔ ۲۷)

قیامت کے روز مخالفت کا انجام

جو لوگ منہ پھاڑ پھاڑ کر آنحضرت ﷺ سے عذاب کو دکھانے کا مطالبہ کرتے تھے یا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ اگر قیامت آنے والی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی، آخر وہ کہاں رک گئی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ جب اس عذاب یا روزِ قیامت کو قریب آتا دیکھیں گے، عذاب نظر آئے گا کہ سروں پر پہنچ گیا ہے۔ یعنی زمین پھٹ رہی ہے یا سر پر مہیب گھٹا چھا گئی ہے یا سمندر بے قابو ہو گیا ہے یا آگ برسنے لگی ہے تو یہ لوگ جو بڑھ بڑھ کر مطالبہ کر رہے ہیں ان کے چہرے بگڑ جائیں گے اور ان کی کیفیت ایسی ہو گی جیسے پھانسی کے تختے کی طرف کھینچے جانے والے مجرم کی ہوتی ہے۔ اس وقت ان کی ساری شیخیاں ہوا ہو جائیں گی۔ ان سب کی سٹی گم ہو جائے گی، چیخنا چلانا شروع کر دیں گے۔ تب ان سے کہا جائے گا کہ اب واویلا کیوں مچا رہے ہو اور یہ تمہاری ہوائیاں کیوں اڑنے لگی ہیں۔ یہ تو وہی چیز ہے جس کا تم مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ تمہاری منہ مانگی مراد ہے، اب اس کا مزہ چکھو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

(ان سے پوچھئے کہ بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم فرمائے، کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا۔ ۲۸)

حقیقت پسندی کی دعوت

نبی کریم ﷺ نے جب مکہ معظمہ میں دعوت کا آغاز فرمایا اور آہستہ آہستہ اس کے اثرات پھیلنے لگے تو قریش کے بعض گھرانوں میں بعض لوگ مسلمان ہو گئے، کہیں بیٹا مسلمان ہو گیا، کہیں بیٹی، کہیں بھائی، کہیں چچا، کہیں ماموں، کہیں کوئی کہیں کوئی۔ تو گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے کے باعث، اسلام اور آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ مخالفت سے اس دعوت کے اثرات ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھ رہے ہیں تو پھر انہوں نے نبی کریم ﷺ کیخلاف تعویز گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے شروع کئے۔ آپؐ کیخلاف بددعائیں

Marfat.com

ہونے لگیں حتیٰ کہ آپ ؐ کے قتل کے منصوبے باندھے جانے لگے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کو اسلامی اثرات سے بچانے کیلئے اشرافِ قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ تم اس دعوت کے اثرات سے پریشان نہ ہو یہ عذاب وغیرہ کی دھمکی محض ایک شخص کی خطابت اور شاعری ہے۔ بہت جلد یہ شخص حوادث کی نذر ہو جائے گا۔ اس کی یہ سب باتیں ہوا میں اڑ جائیں گی۔ یہ ہمیں عذاب سے ڈراتا ہے حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ اور اس کے ساتھی گردشِ روزگار سے بچ نہیں سکیں گے۔ قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پر اس مضمون کو بیان فرمایا۔ سورۃ الطور میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ○ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے اور ہم اس کیلئے گردشِ روزگار کا انتظار کر رہے ہیں۔ کہہ دیجئے! تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔''

حق و باطل کی کشمکش میں اہلِ حق کا کردار

یعنی تم اپنے گمان کے مطابق ہمارے لئے گردشِ روزگار کے منتظر ہو اور ہم تمہارے لئے عذاب کے منتظر ہیں۔ لیکن تقدیری معاملات میں اللہ تعالیٰ کے نبی کبھی جھگڑا نہیں کرتے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ ؐ ان سے کہیے کہ تم ہمیں بددعائیں دو یا گردشِ روزگار کا انتظار کرو، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس نے مجھے یا میرے ساتھیوں کو اگر ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تو وہ اس پر قادر ہے یا وہ ہم پر رحم فرمانا چاہتا ہے تو وہ اس کا بھی حق رکھتا ہے۔ لیکن تمہارے سوچنے کی یہ باتیں نہیں کہ ہم ہلاک ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ ہماری ہلاکت سے تمہارا کوئی کام متعلق نہیں۔ تمہارے سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ تم اپنے بارے میں سوچو۔ کہ جس عذاب سے ہم تمہیں ڈرا رہے ہیں اگر وہ عذاب آ گیا اور تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو عذاب ضرور آئے گا تو پھر تم بتاؤ کہ تمہیں اس عذاب سے یا اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب سے کون بچانے والا ہے۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۹﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے! وہ رحمٰن ہے ہم نے اس کو مانا اور اس پر بھروسہ کیا، عنقریب تم جان لوگے کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ ۲۹)

گزشتہ مضمون کی مزید وضاحت

کفارِ قریش چونکہ آنحضرت ﷺ اور آپ ؐ کے صحابہ کے بارے میں خطرناک عزائم بھی رکھتے تھے اور تباہ کن امیدیں بھی۔ اور اسی سے لوگوں کو تسلیاں بھی دیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو اس آیتِ کریمہ میں حکم دیا گیا ہے کہ ان سے کہہ دیجئے کہ جس ذات پر ہم ایمان لائے ہیں وہ رحمٰن اور رحیم و کریم ہے۔ اور ہر معاملے میں ہمارا اسی پر بھروسہ ہے۔ ہم اپنے تئیں نہ امیدیں باندھتے ہیں نہ وساوس کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمیں بھروسہ ہے تو صرف اپنے پروردگار کی رحمت پر۔ وہ اپنے بندوں پر ہمیشہ رحم فرماتا ہے اور یقیناً ہم پر بھی رحم فرمائے گا۔ تم ہمارے بارے میں جو کچھ بھی کہتے ہو ہم اس میں کوئی جھگڑا نہیں کریں گے۔ ہم اپنے ایمان کے تقاضوں کو بروئے کار لائیں گے اور ہر طرح کے حالات میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ کھلی ہوئی گمراہی میں تم تھے یا ہم۔

Marfat.com

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ۝۳۰

(اے پیغمبران سے پوچھئے! کہ بتاؤ اگر تمہارا پانی نیچے اتر جائے تو تمہارے پاس کون ہے جو صاف اور شفاف پانی لائے۔ ۳۰)

کفار کو تنبیہ

سورۃ کی آخری آیت میں کفار کو پھر تنبیہ فرمائی ہے اور ایک طرح سے عذاب کی دھمکی دی ہے کہ انسان کی سب سے بنیادی ضرورت ہوا کے بعد پانی ہے جس کے بغیر زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ ایسی نعمت ہے جس کو حاصل کرنے کیلئے بظاہر انسان کنوئیں کھودتا ہے یا اور مختلف طریقوں سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ یاد نہیں رہتا کہ یہ اس کی ذاتی جاگیر نہیں، صرف اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے کہ اس نے پانی برسایا اور اس پانی کو برف کی شکل میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر جما دیا کہ سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ رہے۔ پھر اس برف کو آہستہ آہستہ پگھلا کر پہاڑوں کی عروق کے ذریعے زمین کے اندر اتار دیا اور بغیر کسی پائپ لائن کے پوری زمین میں اس کا ایسا جال پھیلا دیا کہ جہاں جا ہو زمین کھود کر پانی نکال لو۔ مگر یہ پانی جو اس نے زمین کی اوپر کی سطح پر رکھ دیا ہے جس کو چند فٹ یا چند گز زمین کھود کر نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس پانی کو نیچے کی سطح پر اتار دے جہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہ ہو تو پھر کون سی طاقت ہے جو انسان کو پانی جیسی نعمت عطا کر سکے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ کئی علاقے ایسے ہیں جہاں پانی کی سطح اتنی نیچی ہے کہ وہاں کنوئیں تو درکنار ٹیوب ویل سے بھی پانی حاصل کرنا ایک کارِ عظیم ہے۔

پانی کے نیچے اتر جانے کی ایک اور صورت بھی ممکن ہے کہ بارش نہ ہونے یا کم ہونے کے سبب سے نہروں، چشموں اور ندیوں کا پانی کم ہو کر گدلا ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دونوں ہی مفہوم لینے کی گنجائش ہے۔

کفار چونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو بہت دور کی بات سمجھتے تھے اس لئے ان کو ایک ایسی مثال سے ڈرایا گیا ہے جس کا وقوع ان کے بہت قریب ہے یعنی وہ پانی جو ان کی انتہائی اہم ضرورت ہے اور جسے وہ کنوؤں اور چشموں سے حاصل کرتے ہیں اور یہ دونوں وسائل نزولِ باراں کے محتاج رہتے ہیں کیونکہ اگر بارش نہ برسے تو چشمے بھی خشک ہو جاتے ہیں اور کنوئیں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ کیلئے کنوؤں اور چشموں کا خشک کر دینا اور بارشوں کا روک دینا یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ بارش کے نہ ہونے سے پانی کی سطح پر نیچی ہو جائے گی اور اگر کہیں پانی ہے بھی تو وہ بھی گدلا ہو جائے گا۔ اور یہ وہ خطرہ ہے جو اہلِ عرب کیلئے غیر متوقع نہ تھا۔ اس لئے ایک ایسی چیز سے جو انہیں کسی وقت بھی پیش آ سکتی تھی، انہیں توجہ دلائی گئی ہے کہ اس اللہ سے ڈرو جس کے قبضے میں تمہاری زندگی اور اس کے تمام وسائل ہیں۔

کاش! آج دنیا اس آیتِ کریمہ کو پیشِ نظر رکھے کیونکہ آنے والے چند سالوں میں دنیا کو جو سب سے بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے وہ پانی کی کمیابی ہے۔ پانی کی سطح آہستہ آہستہ نیچی ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے ملک کیلئے یہ خطرہ زیادہ دور نہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْقَلَمِ

(٦٨)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْقَلَمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام ''ن'' بھی ہے اور ''القلم'' بھی۔ یہ دونوں الفاظ سورۃ کے آغاز ہی میں موجود ہیں۔ جمہور اہلِ علم کے نزدیک سورتوں کے نام محض شناخت کیلئے ہیں۔ جس طرح باقی ناموں میں اسم سے مراد اس کا مسمیٰ ہوتا ہے۔ اسی طرح سورۃ کے نام سے لفظ کا مفہوم مراد نہیں بلکہ وہ سورۃ مراد ہے جس کا وہ نام ہے۔ البتہ بعض اہلِ علم نے ان اسماء کے معنی و مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں سے کوئی کوشش بھی نہ حتمی ہے اور نہ مکمل۔ اسی کوشش کے سلسلے کی ایک رائے یہ ہے کہ ایک وقت تھا جب حروف اپنے معنی پر دلیل ہوتے تھے۔ شاید اسی غرض سے اگر کوئی لفظ کسی کا اسم ٹھہرتا تھا تو وہ مسمیٰ کی شکل کے مطابق لکھا جاتا تھا۔ اب حروف کے معنی کا علم باقی نہیں رہا۔ البتہ بعض حروف اب بھی معنی کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس رائے کے حاملین اپنے دعوے کے ثبوت میں بعض اور حروف کے ساتھ حرف ''ن'' کو اپنی تائید کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اب بھی اپنے قدیم معنی (مچھلی) میں مستعمل ہے اور پیشِ نظر سورۃ کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس سورۃ میں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے جنہیں مچھلی نے نگل لیا تھا اور صاحبِ الحوت کے لقب سے ملقب فرمایا گیا اور سورۃ الانبیاء میں حضرت یونس علیہ السلام کو ذوالنون کے لقب سے بھی یاد فرمایا گیا ہے جو صاحبِ الحوت کا ہم معنی ہے۔

زمانۂ نزول:۔ سابق سورۃ اور اس سورۃ کا زمانۂ نزول قریب قریب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس کے لب و لہجہ کی تیزی کو دیکھتے ہوئے یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ سورۃ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں کسی حد تک تیزی آچکی تھی اور قریش نے آپؐ کی دعوت کے اثر کو کم کرنے کیلئے آپؐ کے بارے میں بے سروپا باتیں کہنا اور الزامات کا طوفان اٹھانا ایک معمول بنا لیا تھا۔

موضوع اور مضمون:۔ سورۃ الملک اور اس سورۃ کے مضامین میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ البتہ طرزِ بیان، نہجِ استدلال اور لب و لہجہ میں فرق ہے۔ مضامین مندرجہ ذیل ہیں: (۱) توحید، رسالت اور آخرت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ان الزامات و اتہامات کا نوٹس لیا گیا ہے جو قریش کی طرف سے آپؐ پر لگائے جارہے تھے۔ (۲) قریش اور دیگر اہل مکہ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنا رویہ بدلنے کی کوشش کریں۔ (۳) آنحضرت ﷺ کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انہیں مخاطب کرنے کی بجائے آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے اور دلجوئی کرتے ہوئے مخالفین کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مخالفین جو کچھ کہہ رہے تھے وہ خود بھی جانتے تھے کہ ان کے اعتراضات میں کوئی جان نہیں۔ وہ محض آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے اثر کرنے کیلئے یہ حرکتیں کررہے تھے۔ البتہ ان اوچھی حرکتوں کا چونکہ آنحضرت ﷺ کی طبیعت پر نہایت ناگوار اثر ہورہا تھا اس لئے آپؐ کو خطاب فرما کر دلجوئی فرمائی گئی۔

Marfat.com

الزامات کو دیکھتے ہوئے ایک پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ مخالفین آنحضرت ﷺ کو مجنون قرار دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس الزام کے جواب میں ایک تو اپنے حوالے سے تردید فرمائی اور دوسرا آپ ؐ کے کام کی وسعت اور اس کے بے پناہ اثرات اور آپ ؐ کے اخلاقِ عالیہ کو اس کی تردید میں بطورِ دلیل ذکر فرمایا۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کا الزام صرف آپ ؐ کو جنون لاحق ہونے کا ہی نہیں تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ آپ ؐ ایک شاعر ہیں اور شاعروں کی باتیں وقتی طور پر قبول بھی کی جاتی ہیں اور داد بھی پاتی ہیں، لیکن ایک محدود عرصے میں ان کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے آپ ؐ کی دعوت کے اثرات بھی دیرپا نہیں ہوں گے۔ اور مزید یہ بھی کہتے تھے کہ آپ ؐ کاہنوں کی طرح آنے والے حالات کی پیشگوئی کرتے ہیں۔ تو جو کچھ انجام کاہنوں کی پیشگوئیوں اور ان کے اثرات کا ہوتا ہے، ایسا ہی کچھ انجام اس پیغمبر کی دعوت کا بھی ہوگا۔ ان کی تردید کرتے ہوئے آپ ؐ کے بلند اخلاق کا حوالہ دیا گیا اور مخالفین کو شرم دلائی گئی کہ کاہن اس طرح کے اخلاقِ عالیہ کے حامل ہوتے ہیں کیا؟

مخالفین کے طریقِ مخالفت اور اتہامات کو غلط ثابت کرنے کیلئے ایک طرف سے آنحضرت ﷺ کے بلند اخلاق کا حوالہ دیا اور بلند اخلاق کسی بھی داعی کی عظمت اور اس کی دعوت کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مخالفین کی اصل صورت اور ان کی حقیقی شخصیت لوگوں کے سامنے ان کی ایک ایک خصلت نمایاں کر کے پیش فرمائی۔ اور ہر سننے والے پر اس سوال کا جواب چھوڑ دیا گیا کہ جس دعوت کے مخالفین ان خصائلِ رذیلہ کے حامل اور اس قماش کے لوگ ہوں کیا کسی عظیم داعی اور اس کی دعوت کی حقانیت کو چیلنج کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ کیا وہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی مخالفت کو وزن دیا جائے۔

اشرافِ قریش کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب ان کی دولت مندی کا زعم اور ان کی ناشکری کی عادت تھی۔ ان کا گمان یہ تھا کہ جو لوگ یہاں خوشحال اور آرام و راحت میں ہیں اگر قیامت آ گئی تو وہاں بھی وہ ایسی ہی زندگی سے نوازے جائیں گے اور جب تک وہ دنیا میں ہیں ان کی یہ خوشحالی اور فارغ البالی، ان کی تجارتی کامیابیاں اور ان کا یہ ٹھاٹ باٹھ ہمیشہ اسی طرح رہے گا اور اس پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ انہیں ایک باغ والوں کی مثال دے کر آئینہ دکھایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے اور اپنے خیر خواہوں کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے، ان کا انجام بالآخر کیا ہوتا ہے۔ اور قریش کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم نے بھی اگر باغ والوں جیسا رویہ رکھا تو تمہارا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ اور مزید تنبیہ کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو ایسا بے انصاف کیسے سمجھ لیا ہے کہ وہ نیکوں اور بدوں میں کوئی امتیاز نہیں کرے گا۔ جس نے آخرت پر یقین رکھا اور اس کے مطابق زندگی گزاری اور دوسرا وہ شخص جس نے آخرت کو ماننے سے انکار کر دیا اور زندگی بھر خواہشوں کی تکمیل میں لگا رہا۔ کیا اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ اور پھر انہیں چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی کامیابی و کامرانی کا کوئی عہد لے رکھا ہے یا کسی نے ان کی ضمانت دے رکھی ہے تو اس کو پیش کرو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی تکذیب کے باوجود انہیں جو ڈھیل دی جا رہی ہے اس سے وہ دھوکے میں پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس رسول کو ماننے سے انکار کیا۔ اس کی مخالفت میں ہر طرح کی قرابت اور تعلق کو پامال کر ڈالا۔ حتیٰ کہ شرافت بھی منہ چھپا کے نکل گئی۔ بایں ہمہ ہم پر عذاب نہیں آیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم یقیناً صحیح راستے پر ہیں۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح کی سخن سازیاں کر رہے ہیں آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آئے گی تو تب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو خواب وہ دیکھتے رہے تھے وہ حقیقت سے کتنے دور تھے۔

آخر میں آنحضرت ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آنے تک جو سختیاں بھی تبلیغ دین کی راہ میں پیش آئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کریں اور کبھی بھی آپ ؐ کے اندر وہ عجلت پیدا نہیں ہونی چاہیے جو حضرت یونس علیہ السلام کیلئے ابتلاء کا موجب بنی تھی اور آپ ؐ کو صبر کی تصویر بن کر اپنی کٹھن ذمہ داریوں کو ادا کرتے رہنا چاہیے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۵۲	سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ (۶۸)	رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۱) مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (۲)
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (۳) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۴)
فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ (۵) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (۶) اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ
بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۷) فَلَا تُطِعِ
الْمُكَذِّبِيْنَ (۸) وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۹) وَلَا تُطِعْ كُلَّ
حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (۱۰) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (۱۱) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ
اَثِيْمٍ (۱۲) عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (۱۳) اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ (۱۴)
اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۵) سَنَسِمُهٗ عَلَى
الْخُرْطُوْمِ (۱۶) اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اِذْ اَقْسَمُوْا
لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (۱۷) وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ (۱۸) فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ
مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ (۱۹) فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ (۲۰) فَتَنَادَوْا
مُصْبِحِيْنَ (۲۱) اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ (۲۲)
فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ (۲۳) اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ

Marfat.com

مِّسْكِيْنٌ ﴿٢٤﴾ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا
لَضَآلُّوْنَ ﴿٢٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ
لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾
فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿٣٠﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا
كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿٣١﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا
رٰغِبُوْنَ ﴿٣٢﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾

رکوع: ۱۔ (ن، قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں۔ ۱) اور آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہے۔ ۲) اور یقیناً آپ کیلئے ایک کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ ۳) بیشک آپ اخلاق کے سب سے بڑے مرتبے پر فائز ہیں۔ ۴) پس عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ۵) کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے۔ ۶) بیشک آپ کا رب ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ انہیں بھی جانتا ہے جو راہِ راست پر ہیں۔ ۷) پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں میں ہرگز نہ آیئے۔ ۸) یہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا آپ نرم پڑیں تو یہ بھی نرم پڑ جائیں۔ ۹) اور آپ ہرگز بات نہ سنیں بہت قسمیں کھانے والے ذلیل آدمی کی۔ ۱۰) اشارہ باز چغلیاں کھانے والے، لگائی بجھائی کرنے والے۔ ۱۱) بھلائی سے روکنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے، حق مارنے والے کی۔ ۱۲) بہت سنگدل مزید برآں بد اصل کی۔ ۱۳) اس وجہ سے کہ وہ بہت مال واولاد والا ہے۔ ۱۴) جب ہماری آیات اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے، یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ۱۵) ہم عنقریب اس کی سونڈ پر داغیں گے۔ ۱۶) ہم نے ان کو اس طرح امتحان میں ڈالا ہے جس طرح باغ والوں کو امتحان میں ڈالا جبکہ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح سویرے ضرور ہی اس کے پھل توڑ لیں گے۔ ۱۷) اور کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔ ۱۸) پس پھر گئی اس پر ایک (بلا) پھرنے والی تیرے رب کی طرف سے، اس حال میں کہ وہ سو رہے تھے۔ ۱۹) تو وہ کٹی ہوئی فصل کی مانند ہو کر رہ گیا۔ ۲۰) صبح ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا ۔۲۱) کہ پھل توڑنے

Marfat.com

ہیں تو سویرے اپنے کھیت پر پہنچو۔ ۲۲) پس وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔۲۳) کہ آج باغ میں کوئی مسکین نہ آنے پائے۔ ۲۴) اور سویرے چلے لپکتے ہوئے عزم و حوصلہ کے ساتھ۔ ۲۵) پس جب انہوں نے اس باغ کو دیکھا تو بولے کہ ہم تو راستہ بھول گئے۔ ۲۶) نہیں، بلکہ ہم تو محروم ہو کے رہ گئے۔ ۲۷) (ان میں جو سب سے بہتر آدمی تھا اس نے کہا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ رب کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ ۲۸) وہ پکار اٹھے، پاک ہے ہمارا رب واقعی ہم گنہگار تھے۔ ۲۹) پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ۳۰) انہوں نے کہا ہائے بدبختی بیشک ہم ہی سرکش ہو گئے تھے۔ ۳۱) توقع ہے کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ۳۲) اسی طرح آتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے، کاش یہ لوگ اس کو جانتے۔ ۳۳)

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿۱﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾

(ن، قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں۔ ۱) اور آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہے۔ ۲)

قسم، جوابِ قسم اور قلم سے مراد

ن، حروف مقطعات میں سے ہے اور اس سورۃ کا نام ہے اور ہم سورۃ کے تعارف میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے دو قسمیں کھائی ہیں۔ انسانوں کے عام شیوۂ مخاطبت میں قسم کا مقصد کسی بات کی تاکید ہوتا ہے، لیکن جب قرآنِ کریم میں پروردگار کسی بات کی قسم کھاتے ہیں تو کبھی تو اس کا مقصد تاکید ہی ہوتا ہے، لیکن کبھی وہ جوابِ قسم یا مقسم علیہ پر شہادت اور دلیل ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں قسم تو دو چیزوں کی کھائی گئی ہے لیکن مقسم علیہ کون ہے؟ نظمِ کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے بعد کی آیت ہے جس پر شہادت قائم کرنے یا اس پر دلیل دینے کیلئے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ پہلی چیز جس کی قسم کھائی گئی ہے، وہ قلم ہے۔ سوال یہ ہے کہ قلم سے مراد کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس سے مراد قلمِ تقدیر ہے اور اس قلمِ تقدیر کے بارے میں حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم پیدا فرمایا اور اس کو حکم دیا کہ لکھ۔ قلم نے عرض کیا، کیا لکھوں۔ تو حکم دیا کہ تقدیرِ الٰہی کو لکھ۔ چنانچہ قلم نے حکم کے مطابق ابد تک ہونے والے تمام واقعات اور حالات کو لکھ دیا۔ ایسی ہی اور بعض روایات میں قلمِ تقدیر کی اولیت، فضیلت اور اہمیت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اس لئے اگر اس سے قلمِ تقدیر مراد لیا جائے تو اس سے قلمِ تقدیر کی مزید فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

ابی حاتم البستی کہتے ہیں کہ اس قلم سے مراد عام قلم بھی ہو سکتا ہے جس میں قلمِ تقدیر اور فرشتوں اور انسانوں کے سب قلم جن سے کچھ لکھا جاتا ہے، داخل ہیں۔

امامِ تفسیر مجاہد کہتے ہیں کہ قلم سے مراد وہ قلم ہے جس سے قرآنِ کریم لکھا جا رہا تھا۔ ان تمام اقوال کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ قلم اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے ہے۔ اور سورۃ العلق میں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے احسان کے طور پر ذکر فرمایا ہے اور چونکہ اس کا ذکر آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں آیا ہے اس لئے اس میں یہ اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ امت ایک ایسی امت ہو گی جس کی علم سے وابستگی

Marfat.com

اس کی علامت بن جائے گی اور وہ دنیا میں سب سے زیادہ علم کی خدمت بجالائے گی اور اسلام اپنے علوم سے پہچانا جائے گا اور یہ علوم عرصہ دراز تک دنیا کی قیادت کریں گے۔ اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ قرآن کریم اور اس کے توضیحی علوم جن میں اولیت حدیث اور سنت کو حاصل ہے قلم کے ذریعے محفوظ رکھے جائیں گے۔ کیونکہ مذہب کے ابتدائی دور میں انبیائے کرام کی تعلیم زبانی تعلیم کی شکل میں لوگوں تک پہنچتی رہی ہے۔ پھر ایک دور آیا کہ احکامِ عشرہ تحریری شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کئے گئے، لیکن ان کی حفاظت کا بھی وہ اہتمام نہ ہو سکا جو دائمی حفاظت کی ضمانت بن سکتا۔ یہ اعزاز صرف قرآنِ کریم کو حاصل ہے کہ پہلے دن سے اسے قلم کی رفاقت میسر آئی اور پھر اس کی وسعت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس حوالے سے اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا کہ ان اہلِ علم کی رائے میں بڑا وزن ہے جن کے نزدیک قلم دراصل تعبیر ہے تعلیماتِ الٰہیہ کے اس پورے مدوّن سرمایہ کی جو قلم کے ذریعے محفوظ ہوا۔ یعنی تورات، زبور اور انجیل وغیرہ۔ ان مقدس صحیفوں کی تعلیمات بھی آنحضرت ﷺ کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے اندر آپ ؐ کے ظہور کی ناقابلِ تردید شہادتیں موجود ہیں۔

آنحضرت ﷺ پر الزامات کا رد

وَمَا یَسْطُرُوْنَ ...... ’’قسم ہے اس چیز کی جس سے وہ لکھتے ہیں۔‘‘ قرآنِ کریم کا جو حصہ بھی نازل ہوتا اسے کاتبانِ وحی میں سے کوئی کاتب ضبطِ تحریر میں لے آتے تھے۔ یہ قرینہ ہے اس بات کا کہ یہاں جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے، وہ قرآنِ مجید ہے۔ اس طرح سے قرآنِ مجید کو بطور شاہد اور دلیل کے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ وہ انصاف سے فیصلہ کریں کہ جس ذاتِ عزیز کی زبانِ فیض ترجمان سے قرآنِ کریم جیسی فصیح و بلیغ کتاب جو اپنے الفاظ و معانی، اپنے مضامین، اپنے ربط و ارتباط اور ہر طرح کے اختلاف و انتشار سے محفوظ دستور و نظام اور تاریخ کے ان شعبوں کی اصلاح جس تک انسانی تحقیق کی رسائی ممکن نہیں اور کائنات کے سربستہ رازوں کا انکشاف، عالمِ غیب کی ایسی خبریں جو انسانی دسترس سے ماوراء ہیں اور ایسے اخلاقی مسلمات جس کی حکمت علوم کا سرمایہ ہے اور ایسی محیر العقول پیشگوئیاں جنہیں رفتہ رفتہ حالات نے سچا ثابت کر دکھایا۔ کیا اس طرح کی بیشمار خصوصیات رکھنے والی کتاب کو پیش کرنے والی شخصیت کیا خدانہ کرے مجنون ہو سکتی ہے؟ مزید یہ کہ جس کی صداقت پر گزشتہ آسمانی کتابیں اپنی تمام تحریفات کے باوجود آج بھی گواہ ہوں اور ہر دور کا نبی جس کی اپنی امت کو خبر دیتا رہا ہو اگر کچھ مدعیانِ علم و دانش اس جرم میں اے پیغمبر آپ کو دیوانہ کہہ رہے ہیں کہ آپ انہیں عذاب کی خبر کیوں دے رہے ہیں یا ان کے سامنے زندگی کا وہ نظام کیوں پیش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے انہیں اپنی غلط زندگی سے دستبردار ہونا پڑتا ہے تو آپ اس سے ملول نہ ہوں۔ دنیا کو جب دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے تو انہیں ہمیشہ فرزانے دیوانے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

بلاشبہ ہر دور میں مخالفین نے ہمیشہ انبیائے کرام کو دیوانہ ہی قرار دیا ہے۔ کیونکہ انہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر اس شخص پر آسمانوں سے وحی کیسے اتر سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم سے اس کا رشتہ کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض ایسی باتیں بھی ہیں کہ جب تک کوئی شخص ایمان کی نگاہ سے انہیں نہیں دیکھتا وہ دیوانگی کے وہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً آنحضرت ﷺ جس شدومد اور حزم و یقین کے ساتھ انہیں عذاب سے ڈراتے اور قیامت کی خبر دیتے تھے تو انہیں کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر عذاب کہاں سے آجائے گا اور قیامت کیسے برپا ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ جب دیکھتے کہ آنحضرت ﷺ جب ہمیں اس کی خبر دیتے ہیں تو نہایت محکم انداز میں دیتے ہیں جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر ان کی بے چینی اور بے قراری اس طرح کی ہوتی ہے کہ جیسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم جہنم کی آگ

Marfat.com

میں ڈالے جانے والے ہیں اور عذاب کا کوڑا ہماری پشت پر برسنے ہی والا ہے۔ اور پھر وہ آپ کی دردمندی اور شفقت کو دیکھتے کہ ہم انہیں دکھ پہنچاتے اور تکلیفیں دیتے ہیں لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ ان کی ہمدردی اور دردمندی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ عام آدمی جب اس صورتحال سے متاثر ہونے لگتا تو اشرافِ قریش انہیں یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس شخص کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔ جس طرح مالیخولیا کا مریض جس بات کا شکار ہو جاتا ہے اسے اس کے حتمی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا، چاہے وہ بات کیسی ہی عقل کے خلاف ہو۔ اسے بھی عذاب کا مالیخولیا ہو گیا ہے اور اسے ہر طرف عذاب ہی دکھائی دیتا ہے۔

وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۝۳

(اور یقیناً آپ کیلئے ایک کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ ۳)

غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ...... کا معنی ہے غیر منقطع یعنی ختم نہ ہونے والا۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور پروپیگنڈے کا جواب

ہم سورۃ الملک میں پڑھ چکے ہیں اور ہم سورۃ الطور سے مثال بھی پیش کر چکے ہیں کہ کافروں کا گمان یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ بڑی تندہی سے جس دین کی دعوت میں لگے ہوئے ہیں خطرہ ہے کہیں اس کے اثرات سے انقلاب برپا نہ ہو جائے۔ اس کے اثر سے بچانے کیلئے اشرافِ قریش عوام کو یہ کہہ کر اطمینان دلاتے تھے کہ تم ہرگز اس کی فکر نہ کرو، یہ شاعر آدمی ہے چند دنوں تک اس کے اثرات ہوں گے اس کے بعد یہ سب کچھ ہوا میں اڑ جائے گا اور یہ شخص اپنی دعوت سے جس طرح کے حالات پیدا کر رہا ہے اس سے خود ہی یہ کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ اور اس کے ساتھی گردشِ روزگار کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جائیں گے تو اس کی کہی ہوئی باتیں اور اس کی دعوت کے اثرات سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اے پیغمبر آپ ان کی باتوں سے اثر قبول نہ کریں۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اور جس تندہی، ہمدردی، جانفشانی، غمگساری اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں اس کا اجر کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ ایک اجر کا وہ حصہ ہے جو قیامت کے دن آپ کو ملے گا۔ لواء الحمد آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ شفاعتِ کبریٰ کے مقام پر آپ کھڑے کیے جائیں گے۔ مقامِ محمود آپ کے انتظار میں ہے، جنت کے اعلیٰ ترین حصے میں آپ کا مسکن ہوگا۔ سب سے زیادہ آپ کی امت نجات پائے گی اور جنت میں پہنچے گی۔ اور اجر کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ آپ کا دین تمام دنیا میں پھیل جائے گا، آپ کی امت مختلف وقتوں میں دنیا کی امامت و سیادت کا فرض انجام دے گی اور ایک وقت آئے گا جب اسلام کے سوا دنیا میں اور کوئی مذہب باقی نہیں رہے گا۔ یہ آپ کی کاوشوں کا وہ صلہ ہے جس کا ایک سرا آپ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا قیامت سے بندھا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی مجنون اور دیوانے کی کاوشوں کا یہ نتیجہ آج تک کبھی لوگوں نے دیکھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو سب پاگلوں کو پاگل خانے سے نکال کر دنیا کی رہنمائی کی مسندوں پر بٹھا دینا چاہیے لیکن اس کے بعد جو ہوگا اس کو جاننے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے نہ ختم ہونے والے اجر کے حوالے سے جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی علم و دانش کا سوداگر اس طرح کی بات کہتا ہے جیسے آج کل بعض مستشرقین آنحضرت ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دیتے ہیں اور بعض لوگ آپ کو مالیخولیا کا بیمار بتاتے ہیں۔ اہلِ علم کو چاہیئے کہ ان نام نہاد دانشوروں کے دماغ کا معائنہ

Marfat.com

کرائیں اوران سے اس کا جواب طلب کریں کہ جس نے دنیا کو ایک ایسی امت دی جس کی نظیر تاریخ پیش نہیں کرسکتی، ایک ایسا نظام دیا جس نے جزیرۂ عرب کو جو نفرتوں کا جہنم تھا محبتوں کی جنت میں تبدیل کردیا۔ جس نے ایسے اخلاق دیئے، جس نے بگڑے ہوئے انسانوں کو مکارمِ اخلاق کا معلم بنادیا، جس نے انسانوں کیلئے دل و دماغ میں ایسی تبدیلی پیدا کی کہ دشمنوں نے بھی انہیں اپنا محسن گردانا۔ غرضیکہ وہ دنیا کیلئے رحمت ومروت، ہمدردی وغمگساری اور راحت وآرام کی ایک بہار بن کر چھاگئے۔ تو کیا ایک ایسی امت، ایسے نظام اور ایسے اخلاق پیدا کرنے والے کو مجنون کہا جائے گا یا ان لوگوں کو کہا جائے گا جو اسے مجنون قرار دیتے ہیں۔

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝

(بیشک آپ اخلاق کے سب سے بڑے مرتبے پر فائز ہیں۔ ۴)

خلقِ عظیم کا مفہوم

جنون کوئی ایسا مرض نہیں جو کسی خاص علاقے یا خاص زمانے کے ساتھ مخصوص ہو۔ ہم آج بھی اپنے دائیں بائیں اس بیماری میں مبتلا لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے ہر شخص اس بات کی گواہی دے سکتا ہے کہ جو شخص اختلالِ دماغ کا شکار ہو وہ نہ تو بلند اخلاق کا حامل ہوسکتا ہے اور نہ اس کے مزاج میں اعتدال ہوسکتا ہے اور نہ لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات میں ٹھہراؤ، وقار، تحمل اور بردباری ہوسکتی ہے، لیکن آنحضرت ﷺ میں نہ صرف یہ صفات پائی جاتی تھیں بلکہ آپؐ اس کا مظہرِ اتم تھے۔ قرآنِ کریم میں اوامرونواہی ہیں، مکارمِ اخلاق کی تعلیم ہے، فضائلِ اخلاق کی ترغیب دی گئی ہے، رزائل سے روکا گیا ہے، زندگی کے بلند مقاصد کی خبر دی گئی ہے، ایک نظامِ زندگی دیا گیا ہے جسے برپا کرنے کا پابند بنایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کا حکم دیا گیا ہے چاہے اس کیلئے سر کٹوانا پڑے۔ ایک بالکل نئی زندگی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے دین کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ قرآن کی ان تعلیمات اور اس کی دی ہوئی زندگی کی چھاپ کو اگر چلتے پھرتے، بولتے چالتے اور فعال شکل میں دیکھنا ہو تو وہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ایک قرآنِ ساکت ہے جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں اور ایک متکلم قرآن ہے جو آنحضرت ﷺ ہیں۔ ایک قرآن کا متن ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے اور اس کی شرح آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ قرآن قول ہے اور آپؐ اس کا عمل ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے یہاں خلقِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ارشاد فرمایا کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ ''قرآن آپ کا اخلاق تھا۔''

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ خلقِ عظیم سے مراد دینِ عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دینِ اسلام سے زیادہ کوئی محبوب دین نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آپ کا خلق خود قرآن ہے یعنی قرآن کریم جن اعلیٰ اعمال واخلاق کی تعلیم دیتا ہے آپ ان سب کا عملی نمونہ ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ خلقِ عظیم سے مراد آداب القرآن ہیں یعنی وہ آداب جو قرآن نے سکھائے ہیں۔ حاصل سب کا تقریباً ایک ہی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بعثت لِاُتَمِّمَ مکارم الاخلاق یعنی مجھے اس کام کیلئے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔ (ابوحیان)

Marfat.com

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی۔اس پوری مدت میں جو کام میں نے کیا آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور جو کام نہیں کیا اس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا (حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ دس سال کی مدت میں خدمت کرنے والے کے بہت سے کام خلاف طبع ہوئے ہوں گے۔) (بخاری ومسلم)

اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ کے مکارمِ اخلاق کا یہ حال تھا کہ مدینہ کی کوئی لونڈی باندی بھی آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں لے جانا چاہے لے جاسکتی تھی۔ (رواہ البخاری)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا بجز جہاد فی سبیل اللہ کے کہ اس میں کفار کو مارنا اور قتل کرنا ثابت ہے ورنہ آپ نے نہ کسی خادم کو نہ کسی عورت کو کبھی نہیں مارا، ان میں سے کسی سے خطا ولغزش بھی ہوئی تو اس کا انتقام نہیں لیا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی ہو تو اس پر شرعی سزا جاری فرمائی۔ (رواہ مسلم)

اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ فحش گو تھے نہ فحش کے پاس جاتے تھے۔نہ بازاروں میں شور وشغب کرتے تھے برائی کا بدلہ کبھی برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معافی اور درگزر کا معاملہ فرماتے تھے اور حضرت ابوالدرداؓ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ میزان عمل میں خلق حسن کے برابر کسی عمل کا وزن نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ گالی گلوچ کرنے والے بدزمان سے بغض رکھتے ہیں۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان اپنے حسن خلق کی بدولت اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا اور دن بھر روزہ رکھتا ہو۔ (رواہ ابوداؤد)

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے یمن کا عامل مقرر کر کے بھیجنے کے وقت آخری وصیت جو آپ نے مجھے اس وقت فرمائی جبکہ میں اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا وہ یہ تھی یَامعاذ اَحسِنْ خُلُقَکَ لِلنَّاسِ ''اے معاذ لوگوں سے حُسنِ خلق کا برتاؤ کرو۔'' (رواہ مالک) یہ سب روایات حدیث تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں۔

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝٥ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝٦

(پس عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ۵) کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے۔ ۶)

آنحضرت ﷺ کیلئے تسلی اور مخالفین کیلئے تنبیہ

یہ آنحضرت ﷺ کیلئے تسلی اور مخالفین کیلئے تنبیہ ہے۔آنحضرت ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ اگر یہ لوگ مختلف حربوں سے آپؐ کی دعوت کو بے اثر کرنے کی کوشش میں ہیں اور مختلف طریقوں سے لوگوں کو آپؐ سے بدگمان کرنا چاہتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ شاید یہ اپنے مقصد میں اس طرح سے کامیاب ہوجائیں گے تو آپؐ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔اپنی تبلیغی مساعی کو جاری رکھئے اور ان کی نامناسب

Marfat.com

باتوں پر صبر کیجئے۔ وہ وقت دور نہیں کہ آپ کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ آپ کے سامنے آجائے گا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید مختلف طریقوں سے آپ کی دستگیری کرے گی اور یہ جس طرح رفتہ رفتہ اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں اور تباہی و بربادی ان کا مقدر بننے والی ہے اس کے بھی آثار ان کے سامنے ظاہر ہونے لگیں گے۔ آخر ایک وقت آئے گا کہ ہر دیکھنے والی نگاہ اندازہ کر لینے میں دشواری محسوس نہیں کرے گی کہ کون ہیں وہ لوگ جن کی قیادت ایک صاحب نظر کے ہاتھ میں ہے۔ علم و دانش اس کے ہمرکاب چلتے ہیں اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کا اس پر نزول ہوتا ہے اور وہ کون وہ لوگ ہیں جن کی قیادت کرنے والے حکمت و دانش سے بیگانہ محض چند توہمات اور تعصبات کو سینے سے لگا کر پیغمبر کی تبلیغی کاوشوں کو ناکام کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح سے اپنا اور اپنے پیچھے چلنے والوں کا مستقبل تباہ کرنے کے درپے ہیں۔

یہاں کفار کو جو دھمکی دی جارہی ہے اس کا تعلق دنیا و عقبیٰ دونوں سے ہے۔ آنحضرت ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے دنیا میں بھی سرفراز ہوں گے اور آخرت میں بھی کامیاب و کامران ٹھہریں گے۔ اور یہ مخالفین دنیا میں بھی ناکامی کا زخم اٹھائیں گے اور آخرت میں بدترین عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے چند ہی سال بعد دیکھنے والوں نے ان دونوں باتوں کو بچشم سر دیکھا۔ جزیرۂ عرب مفتوح ہو گیا اور ہر طرف اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا اور کل کے مخالفین اسلام کی آغوش میں آگئے یا اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

بعض اہلِ علم نے مفتون کا معنی مجنون کرنے کی بجائے مفتون ہی کیا ہے یعنی وہ شخص جو دنیا اور شیطان کے چکر میں پھنسا ہوا ہو۔ میرا ناقص گمان یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول کی موجودگی ان کی تبلیغی مساعی اور ہمدردی اور خیرخواہی کے باوجود جو لوگ ایمان کا راستہ اختیار نہیں کرتے وہ یقیناً دنیا کی محبت اور اپنے تعصبات کے فتنے میں مبتلا ہیں۔ شیطان نے ان کے اعمال کو ایسا مزین کر کے ان کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ اس کے سحر سے نجات نہیں پا سکتے۔ یہ کیفیت جس طرح مفتون ہونے پر دلالت کرتی ہے اسی طرح دماغ کی خرابی کی علامت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے پر شیطان کے راستے کو ترجیح دینا، شیطان کا چکر بھی ہے اور دماغ کا پھیر بھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مفتون اور مجنون کو نتیجے کے اعتبار سے یکساں نہ سمجھا جائے۔

اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ ۠ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ⑦

(بیشک آپ کا رب ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ انہیں بھی جانتا ہے جو راہِ راست پر ہیں۔ ۷)

آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی

آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ کافر لوگ اپنے اور آپ کے بارے میں کیسے ہی الٹے سیدھے تصورات رکھیں لیکن اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے کوئی بات مخفی نہیں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ آپ کو ہم نے جو ہدایت دے کے بھیجا ہے اسے قبول کرنے والا، اس کیلئے قربانیاں دینے والا اور اس راستے پر چلنے والا کون ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے قدم قدم پر آپ کی مخالفت اپنا فریضہ سمجھ رکھا ہے اور وہ اسلام کی ناکامی اور شکست کو زندگی کا سب سے بڑا ہدف بنا چکے ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ عادل ہے اور اس کی صفتِ عدل کائنات کے نظام پر اس طرح چھائی ہوئی ہے جیسے زندگی کی سرگرمیوں پر روشنی کا پہرہ ہوتا ہے۔ اس کے عدل کا ادنیٰ تقاضا یہ ہے کہ اس کے راستے پر چلنے والے لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہوں اور آخرت میں بھی سرفراز ٹھہریں اور اس کی مخالفت کرنے والے آخر کار ناکامی سے دوچار ہوں اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بنیں۔ کیونکہ اگر وہ دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھے اور یکساں معاملہ کرے تو یہ عدل نہیں بلکہ ظلم ہے۔ اور اگر وہ اپنے راستے پر چلنے والوں کو ہمیشہ تکلیفوں میں مبتلا رکھے اور نافرمانوں اور باغیوں کو ہمیشہ کھل کھیلنے کا موقع دے تو یہ ظلم سے بڑھ کر ظلم ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا تقاضا اس سے بالکل مختلف ہے۔ آپؐ اطمینان رکھیں، اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ظہور ضرور ہوگا، اس کے راستے پر چلنے والے سرفراز ہوں گے اور مخالفت کرنے والے خائب وخاسر ہوں گے۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

(پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں میں ہرگز نہ آیئے۔ ۸)

تبلیغ ودعوت کے ضمن میں آپ کو ہدایت

معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین نے اسلام کی مخالفت میں خوب دھول اڑا رکھی تھی اور آنحضرت ﷺ کیخلاف ہر طرح کا پروپیگنڈا خوب زور پکڑ چکا تھا اور ایسا ہنگامہ برپا تھا کہ تبلیغ ودعوت میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ ہرگز ان باتوں کا اثر قبول نہ کریں، مخالفین تو اپنی روایت کے مطابق جو ان کا بس چلے گا وہ کریں گے۔ ان کے مقابلے کی صورت یہ ہے کہ آپؐ اپنی تبلیغی مساعی میں کمی نہ آنے دیں۔ لیکن اگر آپؐ ان کی ہنگامہ آرائی اور ژاژخائی سے اثر قبول کرنے لگے تو آپؐ کی ہمت اور توانائی متاثر ہونا شروع ہو جائے گی۔ اطاعت کا معنی جس طرح ماننا اور پیچھے چلنا ہے، اسی طرح اس کا معنی کسی بات کا اثر لینا بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کافروں کی بات ماننے لگیں گے۔ البتہ انسانی فطرت کے تحت اس بات کا اندیشہ تھا کہ ان کی ہنگامہ آرائی سے اثر قبول کرنے لگیں، اس لئے ان کی ہمتوں کو توانا کرنے کیلئے اس سے بھی روک دیا تا کہ ان کے ارادوں کی قوت میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝

(یہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا آپ نرم پڑیں تو یہ بھی نرم پڑ جائیں۔ ۹)

مخالفین کی مخالفت کا اصل سبب

مکذبین کی مخالفت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کے سیاسی لیڈروں کی طرح تمام سیاسی داؤپیچ سے واقف تھے اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کیخلاف سرد جنگ شروع کر رکھی تھی۔ انہوں نے رفتہ رفتہ یہ محسوس کر لیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کو اعلانِ حق سے باز رکھنا توحید کے اظہار اور شرک کی مذمت سے روکنا اور اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت میں کسی تبدیلی کیلئے کہنا تو ممکن نہیں۔ وہ اس کیلئے ہر خطرے کا سامنا کر سکتے ہیں لیکن اس دعوت کو روک نہیں سکتے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ہم الزامات اور مخالفت کا دباؤ بڑھاتے چلے

Marfat.com

جوئیں تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کرلیں اور شرک کی مذمت کی آنچ کو تھوڑا سا دھیما کرلیں اور اگر ممکن ہوسکے تو بعض باتوں میں کمپرومائز کرلیں۔ اس طرح سے ایک دفعہ اگر برف پگھلنا شروع ہوگئی تو ممکن ہے کہ پھر یہ سلسلہ جاری رہے۔ اس صورتحال کی روشنی میں آنحضرت ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ جن باتوں کی دعوت دے رہے ہیں کافروں کو ان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن انہیں تسلیم کرنا ان کی خواہشوں کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے یہ طوفان اٹھا رکھا ہے۔ اس طرح سے وہ آپ پر دباؤ بڑھا کر آپ سے اپنی کچھ باتیں منوانے کے چکر میں ہیں۔ تو آپ کو ان کی طرف سے باخبر بھی رہنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ تبلیغی مساعی اور دعوتی سرگرمیوں میں کسی طرح کی نرمی نہیں آنی چاہیے تاکہ انہیں آگے قدم بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوسکے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فَیُدْھِنُوْنَ، لَوْ کا جواب ہے۔ عربی گرامر کے اعتبار سے اسے فَیُدْھِنُوْا ہونا چاہیے۔ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہاں دراصل مبتدا محذوف ہے۔ اصل میں فَھُمْ یُدْھِنُوْنَ ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝

(اور آپ ہرگز بات نہ سنیں بہت قسمیں کھانے والے ذلیل آدمی کی۔ ۱۰) اشارہ باز چغلیاں کھانے والے، لگائی بجھائی کرنے والے۔ ۱۱) بھلائی سے روکنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے، حق مارنے والے کی۔ ۱۲) بہت سنگدل مزید برآں بداصل کی۔ ۱۳) اس وجہ سے کہ وہ بہت مال واولاد والا ہے۔ ۱۴)

مکذبین کی قیادت کا اصل چہرہ دکھایا گیا ہے

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ...... اس سے پہلے سابقہ سے پیوستہ آیت میں آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ آپ کی تکذیب کررہے ہیں آپ ان کی باتوں کا اثر قبول نہ کریں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے الزامات لگا رہے ہیں اور جو کچھ آپ کے بارے میں کہہ رہے ہیں آپ کی ذات اس سے بہت بلند ہے۔ لیکن یہ سب کچھ دراصل ان کی مخالفانہ حکمتِ عملی کا حصہ ہے۔ وہ درحقیقت آپ کو دباؤ میں لاکر آپ سے کمپرومائز کرنے کی فکر میں ہیں۔ پیشِ نظر آیات میں اب انہیں مکذبین کی قیادت کا اصل چہرہ اور اس کے نمایاں خدوخال، آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے سامنے واشگاف کیے جارہے ہیں تاکہ انہیں بھی اور دوسرے لوگوں کو بھی اس بات کا اندازہ ہوجائے کہ اہلِ مکہ کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور جو اسلامی دعوت کا راستہ روکنے کے درپے ہیں ان کے سیرت وکردار کا عالم کیا ہے۔ ہمارے بعض مفسرین نے اگرچہ اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہاں جن صفاتِ ذمیمہ کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے مراد فلاں فلاں قریش کے سردار ہیں۔ اور پھر ان کے تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ اس سے مراد ولید بن مغیرہ ہے۔ کسی نے اسود بن عبد یغوث کا نام لیا ہے، کسی نے اخنس بن شریق کو اس کا مصداق ٹھہرایا۔ بعض نے کچھ اور لوگوں کے نام لیے ہیں لیکن واضح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ مخالفین کی ساری قیادت ایسی ہی صفاتِ شنیعہ سے متصف تھی۔ کسی میں کوئی وصف نمایاں تھا اور کسی میں کوئی اور وصف۔ کہنا صرف یہ

Marfat.com

ہے کہ جولوگ اس قماش سے تعلق رکھتے ہوں اور جن کے اعمال کا یہ حال ہو اور جن کا کردار اس حد تک بگڑ چکا ہو اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے مین کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی بات کا اثر قبول کیا جائے۔ یہ تو معاشرے کی ابتری اور کردار کا افلاس ہے کہ ایسے لوگوں کو قیادت کے منصب پر فائز ہونے کا موقع مل گیا ہے ورنہ اس قماش کے لوگ کسی دار التعذیب میں ہونے چاہئیں۔ ان کے جن خاص اوصاف کو بیان فرمایا گیا ہے ان میں پہلی بات یہ ہے کہ وہ بہت قسم کھانے والے ہیں۔ حلاّف، حلف سے اسمِ مبالغہ ہے حلف بجائے خود عموماً اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا اور پھر وہ شخص جو بات بات پر حلف اٹھاتا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود اپنے بارے میں یہ یقین رکھتا ہے کہ لوگ مجھے بے اعتبار سمجھتے ہیں، میں جب تک دو چار قسمیں کھا کر بات نہیں کروں گا، لوگ میری بات پر کان نہیں دھریں گے۔ ایسا شخص اپنی نگاہوں میں بھی ذلیل ہوتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اسے ہلکا آدمی سمجھتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ وہ حلاّف بھی ہے اور مھین بھی۔ اور یہ حلاّف ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ مھین حقیر و ذلیل اور گھٹیا آدمی کو کہتے ہیں۔ اور بات بات پر قسم کھانے والا اولاً تو ہوتا ہی گھٹیا آدمی ہے ورنہ اس حرکت سے لوگوں کی نگاہوں سے گر جاتا ہے اور ذلیل ہو جاتا ہے۔

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ...... هَمَّاز، همز سے مبالغہ ہے، جس کے معنی ہیں اشارہ باز، بہت طعنہ دینے والا یا طعن کرنے والا۔ جو لوگ پست فطرت اور معاشرے کی نگاہوں میں گھٹیا قسم کے لوگ ہوتے ہیں ان کی عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو نگاہوں سے گرانے کیلئے کبھی پھبتی کستے ہیں، کبھی ہاتھوں یا آنکھوں سے اشارے کرتے ہیں اور کبھی فقرے بازی سے کام لیتے ہیں۔ قریش کے متکبرین کے پاس سے جب غریب مسلمان گزرتے تھے تو وہ عموماً انہیں فقروں کا ہدف بناتے اور اشاروں اشاروں میں انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کرتے۔ سورۃ الھمزۃ میں ایسے ہی لوگوں کی بربادی کی خبر دی گئی ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جب کسی شخص کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی تو وہ ایسے ہی اوچھے ہتھیاروں سے اہلِ علم کو ہلکا کرنے اور باوقار لوگوں کو بے وقار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ...... نمیمہ اور نمیم، لگائی بجھائی کرنے کو کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کے پسِ پشت ایسی بات کہنا جو اس کی عزت اور شہرت کو نقصان پہنچائے اور اگر اس کے سامنے کہی جائے تو اسے بری لگے، اسے غیبت کہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنا یہ وطیرہ بنا لے کہ کسی شخص کو بدنام کرنے کیلئے مختلف لوگوں کے پاس گھومتا پھرتا، ملتا جلتا بہ ضرورت یا بلاضرورت اس کی برائیاں بیان کرتا پھرے، اسے نمیمہ کہتے ہیں اور اردو زبان میں اسے لگائی بجھائی کرنا کہا جاتا ہے۔ اور مشاءٍ کے لفظ نے اس کے معنی کو مزید کھول دیا ہے کہ ایسے شخص کا چلنا پھرنا، غیبت کرنے، غیبت پھیلانے اور کسی کو رسوا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور ان لوگوں کا کردار ایسا ہی ہے کہ یہ لوگ بظاہر ایک قبیلے سے تعلق رکھتے اور ایک عقیدے اور فکر سے وابستہ لوگ ہیں۔ اور اسلام دشمنی میں سب ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ لیکن آپس کے تعلقات کا حال یہ ہے کہ ایک دوسرے کی برائیاں کرتے پھرتے ہیں اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دشمنی کی وجہ سے انہوں نے اپنا فریضہ سمجھ لیا ہے کہ جہاں بھی جائیں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کریں تاکہ مسلمانوں میں اسلام نے جو رشتۂ اخوت و محبت پیدا کیا ہے اسے مستحکم نہ ہونے دیا جائے۔ اور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی جو مسلمانوں کا مرجع اور مرکز ہے ان کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کی جائیں۔

Marfat.com

مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ...... خیر، عربی زبان میں مال کو بھی کہتے ہیں اور بھلائی کو بھی۔ اگر اس کا معنی مال لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ بہت بخیل لوگ ہیں جو کسی غریب اور مسکین پر پھوٹی کوڑی خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور نہ دوسروں کو خرچ کرتے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم مال وزر کے پجاری ہیں دوسرے بھی اسی طرح خزانے کے سانپ بن کر بیٹھے رہیں۔ اور اگر اس کا معنی بھلائی لیا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ ان مخالفین کی قیادت ہر بھلائی کی کٹر دشمن اور ہر اچھائی کا راستہ روکنے والی ہے۔ خود بھی نیکی اور بھلائی سے دور ہیں اور معاشرے کو بھی اس سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ...... کہ یہ لوگ صرف بخیل ہی نہیں بلکہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی اور تعدی کرنے والے ہیں، یعنی دوسروں کے حقوق چھیننا ان کا دلپسند مشغلہ ہے۔ اور جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں انہیں دبالینا اور ادا نہ کرنا، یہ ان کا عام معمول ہے۔ اعتداء، دوسروں کے حقوق پر دست درازی کو کہتے ہیں۔ اور اثم، دوسروں کی حق تلفی پر بولا جاتا ہے۔ اور ان لوگوں میں یہ دونوں برائیاں پائی جاتی ہیں۔

عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ...... عُتُلٍّ، عربی زبان میں ایسے شخص کیلئے بولا جاتا ہے جو خوب ہٹا کٹا، بہت کھانے پینے والا اور نہایت بدخلق، جھگڑالو، سفاک اور سنگدل ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ مکہ کی قیادت میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس وسائلِ رزق کی فراوانی ہے۔ لحیم وجسیم اور صحت کی دولت سے مالا مال، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نہایت بدخلق اور غریبوں کے معاملے میں نہایت سنگدل ہیں۔ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرنا اور حق تلفیاں کرنا تو ان کا عام معمول ہے۔ لیکن ان کے اس رویئے نے ان سے انسانیت کا جوہر چھین لیا ہے۔ وہ نہ صرف کسی مسکین اور غریب کی مدد کرنے کی زحمت نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ برا رویہ اور سنگدلانہ سلوک روا رکھتے ہیں۔ کوئی دروازے پر آ گیا تو دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مال وزر سے اندھی محبت کرتا اور انتہائی بخیل واقعہ ہوا ہے وہ اپنی ان بری عادات کی وجہ سے دل کی سنگدلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار نے ارشاد فرمایا تھا اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۞ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ”آپ نے دیکھا اس آدمی کو جو روزِ جزاء کو جھٹلاتا ہے اور وہی ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے۔

بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ...... علاوہ ازیں وہ زنیم بھی ہے۔ زَنِيْمٍ، زَنَمَةٌ سے نکلا ہے۔ اس غدود کو کہتے ہیں جو بعض بکریوں کی گردن میں لٹک آتا ہے اور جس کی حیثیت جسم میں ایک بالکل فالتو عضو کی ہوتی ہے۔ اسی معنی کی مناسبت سے اس آدمی پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے جس کا نسب ثابت نہ ہو، یعنی وہ ولد الزنا ہو اور وہ کسی قوم کے نسب میں شریک بن بیٹھے درانحالیکہ وہ ان میں سے نہ ہو اور نہ اہلِ قوم اس کی کچھ ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشرافِ قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جو بے نسب ہونے کے باوجود بعض خاندانوں سے نسبتیں پیدا کر چکے تھے۔ بعض روایات میں اخنس بن شریق کے بارے میں آیا ہے کہ اصلاً وہ ثقیف میں سے تھا لیکن مدعی تھا کہ وہ زہرہ میں سے ہے۔ اسی طرح ولید بن مغیرہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قرشی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا حالانکہ وہ قریش میں سے نہ تھا۔ ایسے لوگ اپنے نسبی کمزوری کو چھپانے کیلئے قومی حمیت وحمایت کی جھوٹی نمائش کرتے ہیں تاکہ قوم کے اندر ان کا بھرم قائم رہے۔ اس طرح کے لوگ قومی تشخص اور قومی شیرازہ بندی کا نام لے کر لوگوں کو آنحضرت ﷺ کیخلاف اکساتے۔ اور قریش کی وحدت وجمعیت کی دُہائی دے کر آنحضرت ﷺ کی دعوت کو انتہائی خطرناک قرار دیتے تھے۔

Marfat.com

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ ...... ان لوگوں میں متذکرہ بالا صفاتِ بداس لئے پیدا ہوئیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے مال کی وسعت اور اولاد کی کثرت کی آزمائش میں ڈالا تھا۔ حالانکہ ان نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار، فرمانبردار اور اس کے نازل کردہ دین کے علمبردار بن کر اٹھتے۔ لیکن جب کوئی شخص دولتِ دنیا کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھنے کی بجائے اپنے دست و بازو کی کمائی اور دوسروں پر برتری کا ذریعہ سمجھنے لگتا ہے تو پھر اس کے اندر یہ خرابیاں آئے بغیر نہیں رہتیں۔ وہ نادار لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ کبھی اسے موت بھی آئے گی۔ اور جو کچھ اس نے مال و اسباب فراہم کر رکھا ہے اور مضبوط محلات اٹھا لئے ہیں، یہ ہمیشہ رہنے والے نہیں۔ یہ تکبر بڑھتے بڑھتے آخر حق کی قبولیت کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اب اس کا ہدف دولتِ دنیا میں اضافے اور اپنے سر پر مصنوعی قلغیاں سجانے کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ حُسنِ کردار سے بھی محروم ہو جاتا ہے، ضمیر کی روشنی سے بھی تہی دامن ہو جاتا ہے اور حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کے وہ تمام سوتے جو ضمیر کی بیداری کی وجہ سے انسان میں کام کرتے ہیں، ایک ایک کر کے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ، ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾

(جب ہماری آیات اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے، یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ۱۵)
ہم عنقریب اس کی سونڈ پر داغیں گے۔ ۱۶)

مال وزر اور اولاد کی فراوانی نے اس کے مالک کے دل و دماغ میں جو غرور اور تکبر پیدا کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب اسے ان قوموں کی سرگزشتیں سنائی جاتی ہیں جو ان ہی کی طرح مال و دولت کی محبت میں اندھے ہو گئے اور اسی کو زندگی کا ہدف بنا کر حق کی ہر بات سے اعراض کرنے لگے۔ آخر ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور وہ قومیں تباہ کر دی گئیں۔ تو ان سے سبق لینے کی بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ تو گزشتہ قوموں کے افسانے ہیں جو تم ہمیں سناتے رہتے ہو۔ ان کا آج کی دنیا سے کیا تعلق۔ کیا اللہ تعالیٰ کے نبی کا کام یہ ہے کہ وہ گزشتہ قوموں کے افسانے سناتا پھرے، ہم ایسے شخص کو نبی ماننے کیلئے تیار نہیں اور نہ ہم ان افسانوں سے کوئی اثر قبول کرتے ہیں۔

اگلی آیت میں فرمایا کہ ان لوگوں نے اپنے تکبر اور غرور کے باعث اپنے مزعومات اور جاہلی خیالات کو چونکہ اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو مال و دولت میں ہمارا ہمسر نہیں اور جسے وہ مقام حاصل نہیں جو ہمارا ہے تو اس کی دعوت قبول کرنے اور اس کی بات کو تسلیم کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمیں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا پڑے گی، اس کی برتری کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا اور یہ ہماری ناک کی بلندی کیخلاف ہے۔ ہم تو اپنی ناک کو کہیں بھی نیچی نہیں ہونے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس آیتِ کریمہ میں فرما رہے ہیں کہ ان لوگوں کے غرور و تکبر نے ان میں سے ہر ایک کی ناک کو اتنا بڑا کر دیا ہے کہ اب وہ ناک نہیں بلکہ سونڈ ہے۔ اس لئے اگر اس کا ترجمہ ناکڑا کیا جائے تو حسبِ حال معلوم ہوتا ہے۔ ایسی بڑھی ہوئی ناک جو اب سونڈ یا ناکڑا بن گئی ہے جو حق کی قبولیت کو بھی اپنی توہین سمجھتی ہے، ہم عنقریب ان کے ناکڑے پر ذلت کا داغ لگائیں گے اور یا ہم ان کی ناک کو داغیں گے۔ یعنی باقاعدہ اسے آگ سے جلایا جائے گا۔ تب انہیں معلوم ہو گا کہ حق کے مقابلے میں استکبار کس قدر خطرناک بات ہے۔

Marfat.com

إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ﴿١٧﴾ وَلَا يَسْتَثْنُونَ ﴿١٨﴾

(ہم نے ان کو اس طرح امتحان میں ڈالا ہے جس طرح باغ والوں کو امتحان میں ڈالا جبکہ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح سویرے ضرور ہی اس کے پھل توڑلیں گے۔ ۱۷) اور کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔ ۱۸)

قریش کے سرداروں کیلئے ایک تمثیل

قریش کو اپنی تجارت کی وسعت، اس سے حاصل ہونے والی دولت اور طائف میں ان کے پھیلے ہوئے باغات نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ہماری یہ دولت وثروت ہمارے برسرِ حق ہونے کی دلیل ہے۔ اگر ہم غلط راستے پر ہوتے تو اللہ تعالیٰ ہمیں یہ خوشحالیاں نصیب نہ کرتا۔ علاوہ ازیں مال و دولت کی کثرت نے ان کے اندر عُجب اور غرور پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر کان دھرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دولت وثروت کی حقیقت کو ظاہر کرنے اور اپنے عذاب سے انذار کیلئے ایک تمثیل بیان فرمائی ہے جس میں ان کو یہ سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے کہ اپنے جس اقتدار پر ان کو اس قدر غرور ہے اس کی بنیاد بالکل ریت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا چشمِ زدن میں اس کو خاک میں ملا دے گا۔ اس کی تمثیل کو دیکھنا چاہیں تو اس واقعہ میں دیکھ لیں کہ باغ کے مالکوں کو کس قدر اپنی دولت پر ناز تھا اور اس دولت نے انہیں کس طرح راہِ ہدایت سے برگشتہ کر رکھا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو سب کچھ تباہ ہو کر رہ گیا۔

سوال یہ ہے کہ اس باغ کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہاں کا واقعہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہ باغ یمن میں تھا۔ اور حضرت سعید بن جبیر کی روایت ہے کہ صنعاء یمن کا مشہور شہر اور دارالسلطنت ہے۔ یہ باغ اس سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اور بعض حضرات نے اس کا محلِ وقوع حبشہ کو بتلایا ہے۔ آیات کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باغ کے اندر یا اس کے ملحق کاشت کی زمینیں بھی تھیں۔ لیکن باغ کی شہرت کی وجہ سے اس واقعہ کو باغ والوں کا واقعہ کہا گیا ہے۔

محمد بن مروان حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ صنعاء یمن کے دو فرسخ کے فاصلے پر ایک باغ تھا جس کو صردان کہا جاتا تھا۔ یہ باغ ایک صالح اور نیک بندے نے لگایا تھا۔ اس کا عمل یہ تھا کہ جب کھیتی کاٹتے تو جو درخت درانتی سے باقی رہ جاتے تھے ان کو فقراء اور مساکین کیلئے چھوڑ دیتا تھا۔ اور یہ لوگ اس سے غلہ حاصل کر کے اور اپنا گزارہ کرتے تھے۔ اسی طرح جب کھیتی کو گاہ کر غلہ نکالتے تو جو دانہ بھوسے کے ساتھ اڑ کر الگ ہو جاتا اس دانے کو بھی فقراء اور مساکین کیلئے چھوڑ دیتا تھا۔ اسی طرح جب باغ کے درختوں سے پھل توڑتے تو توڑنے کے وقت جو پھل نیچے گر جاتا، وہ بھی فقراء کیلئے چھوڑ دیا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کی کھیتی کٹنے یا پھل توڑنے کا وقت آتا تو بہت سے فقراء اور مساکین جمع ہو جاتے تھے۔ اس مردِ صالح کا انتقال ہو گیا۔ اس کے تین بیٹے باغ اور زمین کے وارث ہوئے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ اب ہمارا عیال بڑھ گیا ہے اور پیداوار ان کی ضرورت سے کم ہے۔ اس لئے اب ان فقراء کیلئے اتنا غلہ اور پھل چھوڑ دینا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان لوگوں نے آزاد نوجوانوں کی طرح یہ کہا کہ ہمارا باپ تو بیوقوف تھا اتنی بڑی مقدار غلہ اور پھل کی لوگوں کو لٹا دیتا تھا، اب ہمیں یہ طریقہ بند کرنا چاہیے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اسی واقعہ کو بیان کیا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان

Marfat.com

نوجوانوں نے آپس میں قسم اٹھا کے یہ عہد کیا کہ اب کی مرتبہ ہم صبح سویرے ہی جا کر کھیتی کاٹ لیں گے تاکہ مساکین اور فقراء کو خبر نہ ہو۔ کیونکہ اگر انہیں خبر ہوگئی تو وہ حسب سابق ہم سے غلہ اور پھل کا مطالبہ کریں گے اور انہیں کھیتی کاٹنے کا اس حد تک یقین تھا کہ انہوں نے ان شاء اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی بلکہ تاکید کے انداز میں کہا کہ ہم صبح سویرے جا کر ضرور کھیتی کاٹ لیں گے۔

وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ...... اس کا لفظی ترجمہ تو ہے کہ وہ استثنا نہیں کریں گے لیکن اکثر مفسرین نے اس استثنا سے مراد ان شاء اللہ کہنا لیا ہے، یعنی انہوں نے ان شاء اللہ کہنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ لیکن تفسیر مظہری کے مطابق بعض مفسرین نے اسے لغوی معنی میں ہی لیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم سارا غلہ اور پھل اپنے گھر لے آئیں گے، فقراء اور مساکین کیلئے کچھ نہیں نکالیں گے۔ جس طرح ہمارے والدان کا حصہ چھوڑ دیتے تھے ہم اپنے باغ کی پیداوار میں کوئی استثنا نہیں کریں گے۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿١٩﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿٢٠﴾

(پس پھر گئی اس پر ایک (بلا) پھرنے والی تیرے رب کی طرف سے، اس حال میں کہ وہ سو رہے تھے۔ ۱۹) تو وہ کٹی ہوئی فصل کی مانند ہو کر رہ گیا۔ ۲۰)

باغ کے مالک بڑے عزم و جزم کے ساتھ رات کو فیصلہ کر کے سوئے کہ صبح اٹھ کر فصل کاٹنی ہے لیکن ابھی سوئے ہی پڑے تھے کہ ان کے باغ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گردش یا کوئی بلا آئی جس نے باغ کو تباہ کر دیا اور وہ بالکل ایسے ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہوتی ہے، یعنی یہ تباہی اس خاموشی کے ساتھ آئی کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی اور تباہی ایسی مکمل تھی کہ اس نے چشم زدن میں ہرا بھرا باغ بے نشان کر کے رکھ دیا، لیکن باغ والوں کو کوئی خبر نہیں۔

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿٢١﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿٢٢﴾

(صبح ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا ۔۲۱) کہ پھل توڑنے ہیں تو سویرے اپنے کھیت پر پہنچو۔ ۲۲)

صبح اٹھتے ہی سب جانے والوں نے ہانک پکار مچائی کہ اگر پھل توڑنے کا تمہارا پختہ ارادہ ہے تو پھر تاخیر مت کرو، کیونکہ تاخیر کی صورت میں ہوسکتا ہے مساکین کو خبر ہو جائے اور وہ بھی وہاں پہنچ جائیں۔ یہاں باغ کی بجائے ''حرث'' کا لفظ لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باغ کے اندر مختلف چیزوں کی کاشت کیلئے قطعات بھی رکھے گئے تھے۔ اس لئے اسے باغ بھی کہا جا سکتا تھا اور حرث اور کھیتی بھی۔

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿٢٤﴾ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿٢٥﴾

(پس وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔۲۳) کہ آج باغ میں کوئی مسکین نہ آنے پائے۔ ۲۴) اور سویرے چلے لپکتے ہوئے عزم و حوصلہ کے ساتھ۔ ۲۵)

Marfat.com

یعنی گھر سے نکلے تو چپکے چپکے ایک دوسرے کو ہوشیار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ دیکھنا آج کے دن کوئی فقیر باغ میں گھسنے نہ پائے۔

یعنی یہ ان کے انتہائی بخل کی دلیل تھی جس کا ذکر اشرافِ قریش کی صفاتِ بد میں بھی ہو چکا ہے۔

حرد، کا معنی منع کرنے اور غیظ و غضب دکھانے کے ہیں۔ اس میں تیز گامی اور عزم و حوصلہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں یہ سمجھ کر چلے کہ ہمیں اس پر قدرت ہے کہ ہم کسی فقیر مسکین کو کچھ نہ دیں، کوئی آ بھی جائے تو اس کو دفعہ کر دیں۔ ان کے دل اعتماد اور حوصلے سے مامور تھے کہ باغ اپنا ہے، پھل تیار ہے اب اس کی فصل حاصل کرنے میں کون سی چیز حائل ہو سکتی ہے۔ ہمارے باپ کے زمانے میں غریبوں اور مسکینوں کو جو کچھ ملا کرتا تھا ہم نے اس کا بھی سدِ باب کر دیا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾

(پس جب انہوں نے اس باغ کو دیکھا تو بولے کہ ہم تو راستہ بھول گئے۔ ۲۶) نہیں، بلکہ ہم تو محروم ہو کے رہ گئے۔ ۲۷)

یعنی جب وہ باغ کی جگہ پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ باغ کی بجائے ایک تباہی کا منظر تھا، ایک ویرانہ دکھائی دے رہا تھا، گردشِ آسمانی نے اس طرح اس کا حلیہ بگاڑا تھا کہ اسے پہچان بھی نہ سکے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے معلوم ہوتا ہے ہم تاریکی میں راستہ بھول گئے ہیں، لیکن پھر گرد و پیش میں غور سے دیکھا، کچھ روشنی پھیلی تو انہیں اصل حقیقت کا احساس ہوا کہ ہم راستہ نہیں بھولے بلکہ باغ ہی اجڑ گیا ہے۔ تب نہایت حسرت اور دکھ کے ساتھ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہم تو بالکل محروم ہو کے رہ گئے۔ کہ ہم نہ جانے کیسے کیسے ارمان لے کے یہاں پہنچے تھے اور ہم نے دلوں میں کیسے کیسے حوصلے باندھ رکھے تھے یہاں تو سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾

(ان میں جو سب سے بہتر آدمی تھا اس نے کہا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ رب کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ ۲۸) وہ پکار اٹھے، پاک ہے ہمارا رب واقعی ہم گنہگار تھے۔ ۲۹) پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ۳۰) انہوں نے کہا ہائے بدبختی بیشک ہم ہی سرکش ہو گئے تھے۔ ۳۱) توقع ہے کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ۳۲)

برے سے برے معاشرے میں بھی کوئی نہ کوئی ہوش مند ضرور ہوتا ہے ان ہی میں سے ایک بہتر آدمی نے ان سے کہا کہ میں ہمیشہ تمہاری غفلت اور غلط روی پر ٹوکتا رہتا تھا اور ہمیشہ تمہیں توجہ دلاتا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ تسبیح ایک جامع کلمہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی بندگی کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں تمہیں اللہ تعالیٰ ہی کو یاد کرنے، اس کا شکر بجا لانے اور اس کی فرمانبرداری کی تلقین کیا کرتا تھا لیکن تم نے میری ایک بات سن کے نہ دی، آج اس کا انجام دیکھ لیجئے۔ اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا

Marfat.com

اور اپنی گمراہی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا، کہ ہمارا رب یقیناً ہر طرح کے ظلم سے پاک ہے، اس نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے۔ اپنی خوشحالی کے نشے میں اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا بھول گئے۔ اور عام طور پر مصیبت کے وقت ایسا ہوتا ہے کہ اپنی غلطیوں کے احساس اور اعتراف کے باوجود لوگ ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے لگتے ہیں، یہ بھی ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ لیکن جلد ہی ہوش میں آئے اور کہنے لگے کہ ہم سب ہی سرکشی کے راستے پر جا پڑے تھے اور ہم نے کسی ناصح کی بات پر کان نہیں دھرا۔ اب کسی کو مطعون کرنے کی بجائے اپنی سرکشی کا انجام دیکھتے ہوئے توبہ کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس طرح ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر نظر کرم فرمائے اور جس نعمت سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں محروم کیا ہے ہمیں اس سے بہتر عطا فرمائے۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

(اسی طرح آتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے، کاش یہ لوگ اس کو جانتے۔ ۳۳)

حاصلِ نصیحت اور قریش کو تنبیہ

باغ والے اپنے باغ کی سرسبزی، پھلوں کی شادابی اور دوسری فصلوں کی تیاری کی خوشی میں سرشار اور مست تھے۔ اب صرف ان پھلوں کو توڑنے اور فصل کو کاٹنے کا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ہر طرح کی نعمت کی فراوانی ہو جاتی اور خوشحالی میں مزید اضافہ ہو جاتا انہیں تصورات میں گم غرور و تکبر میں ڈوبے ہوئے اور مستقبل کے خطرات سے بے نیاز صبح صبح اپنے باغ میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ باغ تباہ ہو چکا ہے۔ اور جن نعمتوں کے تصور سے وہ اپنے دلوں میں تکبر کی پرورش کر رہے تھے وہ سب فنا ہو گئی ہیں۔ اب انہوں نے محسوس کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد روئے سخن قریش کی طرف پھیرتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں جب ہمارے پیغمبر عذاب کی دھمکی دیتے ہیں اور نہایت ہمدردی سے تمہیں اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں تو تم کبھی حیرانی اور کبھی برہمی سے پوچھتے ہو کہ عذاب کہاں سے اور کدھر سے آ جائے گا۔ ہماری خوشحالیوں کے امکانات بالکل واضح ہیں۔ ہمارے حالات میں کوئی الجھن نہیں۔ ہم شب و روز شادمانی کے شادیانے بجا رہے ہیں۔ اس میں عذاب کے آنے کی کیا تک ہے۔ ایسی ہی بے سروپا باتوں سے گمان ہوتا ہے کہ تم واقعی مجنون ہو۔ قریش کی اس طرح کی باتوں اور اس طرح کے واہموں کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جس طرح باغ والوں پر اچانک عذاب آیا اور انہیں دور دور تک اس کا کوئی اندیشہ نہ تھا، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تم پر بھی عذاب آئے گا۔ اور جس قوم پر بھی عذاب آیا، اسی طرح آیا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ عذاب آ جانے کے بعد نہ نالہ و شیون کام آتا ہے اور نہ وہ سہارے کام آتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے۔ اور مزید یہ بات بھی یاد رکھو کہ ایمان و عمل کی خرابی اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب کی سزا صرف دنیا میں عذاب سے مکمل نہیں ہو جاتی بلکہ اس سے بھی کہیں بڑا عذاب جس کی ہولناکی کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا وہ آخرت کا عذاب ہے۔ جو لوگ دنیا میں عذاب کی گرفت میں آئے، آخرت کے عذاب میں اس کی وجہ سے ان کی سزا میں کمی نہیں ہو گی بلکہ آخرت کا عذاب اپنی جگہ قائم رہے گا۔ آخر میں فرمایا کہ کاش یہ لوگ اس بات کا یقین رکھتے اور آخرت کو بعید از قیاس نہ سمجھتے تو پھر یہ اندھوں کی طرح زندگی نہ گزارتے اور آخرت کے عذاب سے بچ جاتے۔ لیکن ان کی بدنصیبی اور محرومی نے ان کی دنیا بھی تباہ کی اور آخرت بھی تباہ کر ڈالی۔

Marfat.com

إِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۳۴

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۳۵ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۳۶

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۳۷ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۳۸ اَمْ

لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا

تَحْكُمُوْنَ ۳۹ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۴۰ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ

فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۴۱ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ

سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۴۲ خَاشِعَةً

اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ

وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۴۳ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۴۴ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ

كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۴۵ اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۴۶

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۴۷ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ

لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۴۸ لَوْلَآ اَنْ

تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۴۹

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۵۰ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ

كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ

Marfat.com

إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿٥١﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَٰلَمِينَ ﴿٥٢﴾

رکوع: ۲۔ (بیشک اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے ان کے رب کے پاس نعمت بھری جنتیں ہیں۔ ۳۴) کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کردیں گے۔ ۳۵) تمہیں کیا ہوگیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو۔ ۳۶) کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو۔ ۳۷) اس میں تمہارے لئے وہی کچھ ہے جو تم اپنے لئے پسند کرو گے۔ ۳۸) یا تمہارے لئے روزِ قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم فیصلہ کرو گے۔ ۳۹) ان سے پوچھئے، ان میں سے کون اس کا ضامن بنتا ہے۔ ۴۰) کیا ان کے کچھ شرکاء ہیں تو وہ لائیں اپنے شریکوں کو، اگر وہ سچے ہیں۔ ۴۱) جس دن پنڈلی کھولی جائے گی (سخت وقت آپڑے گا) اور لوگوں کو سجدہ کرنے کیلئے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کرسکیں گے۔ ۴۲) ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ذلت ان پر چھا رہی ہوگی اور یہ سجدے کیلئے اس وقت بھی بلائے جاتے تھے جب وہ صحیح سالم تھے۔ ۴۳) پس اے نبی! اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے، ہم ان کو آہستہ آہستہ لا رہے ہیں، وہاں سے جہاں سے وہ نہیں جانتے۔ ۴۴) میں ان کی رسی دراز کررہا ہوں بیشک میری تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔ ۴۵) کیا آپ ان سے کوئی معاوضہ طلب کررہے ہیں کہ وہ اس چٹی کے بوجھ تلے دبے جارہے ہیں۔ ۴۶) کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے، پس وہ اس کو لکھ رہے ہیں۔ ۴۷) پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کیجئے اور مچھلی والے کی طرح نہ ہوجایئے جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا اور وہ غم سے گھٹے ہوئے تھے۔ ۴۸) اگر ان کے رب کی مہربانی ان کے شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ مذمت کیے ہوئے چٹیل میدان ہی میں پڑے رہتے۔ ۴۹) پس ان کے رب نے ان کو برگزیدہ کیا اور صالح بندوں میں شامل کرلیا۔ ۵۰) اور جب کافر لوگ کلامِ نصیحت (قرآنِ کریم) سنتے ہیں تو اس طرح آپ کو دیکھتے ہیں گویا اپنی نگاہوں کے زور سے آپ کے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے۔ ۵۱) حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کیلئے ایک نصیحت ہے۔ ۵۲)

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّٰتِ النَّعِيمِ ﴿٣٤﴾

(بیشک اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے ان کے رب کے پاس نعمت بھری جنتیں ہیں۔ ۳۴)

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا انجام

گزشتہ آیات میں ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی تکذیب کرتے، قیامت کا انکار کرتے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت اور پیغمبر کے مقابلے میں تکبر اختیار کرتے تھے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان منکرین اور متکبرین کے برعکس زندگی گزارنے والوں یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا انجام بیان ہورہا ہے۔ جن لوگوں نے ایمان و عمل کا راستہ اختیار کیا اور ہر فیصلہ کرنے اور ہر کام سے

Marfat.com

پہلے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کے احکام کو دیکھا اور اس کے مطابق زندگی گزاری اور ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ لیا۔ اور زندگی کا سب سے بڑا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری اور اس کے دین کی سربلندی کو قرار دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں متقی کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہیں قیامت کے دن نعمتوں والے باغوں سے نوازا جائے گا جن میں ان خوش نصیب لوگوں کو ایسی نعمتیں دی جائیں گی جنہیں نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل میں اس کا خیال گزرا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں وہ سب کچھ دیا جائے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔ دنیا میں خواہشوں اور ارمانوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو ناممکن الوجود ہیں لیکن جنت میں چونکہ زندگی کے ضوابط بدل جائیں گے اور امکان وعدم کے پیمانے تبدیل کر دیئے جائیں گے۔ اس لئے وہاں کوئی خواہش بھی ناممکن نہیں ہوگی۔ ادھر کسی جنتی کے دل میں خیال آئے گا، اسے زبان تک آنے میں دیر ہو سکتی ہے لیکن اس کی عطا میں دیر نہیں ہو سکتی۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾

(کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے۔ ۳۵) تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو۔ ۳۶)

اچھوں اور بروں میں فرق عقل اور اخلاق کا تقاضا ہے

متکبرین اور منکرین کیلئے عذاب اور متقین کیلئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے معمور جنتیں، پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس پر عقلی دلیل بیان فرمائی گئی ہے۔ انسانی دنیا میں ہر جگہ اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ اگر چند لوگ کسی منصب اور کسی ڈیوٹی پر فائز کیے جاتے ہیں ان میں کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنے فرائض کو باحسن طریق پورا کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو کام چوری کرتے یا جس ادارے سے تنخواہ لیتے ہیں اس کی اصل حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار بھی کرتے ہیں اور جب بھی کبھی ادارے پر نازک وقت آتا ہے تو اس کی بقا اور تحفظ کیلئے محنت کرنے اور جان لڑانے سے گریز کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا ادارہ ہے جو ان دونوں طرح کے لوگوں کو برابر سمجھتا ہو، ان کی ایک جیسی عزت افزائی کی جاتی ہو، ایک جیسی مراعات دی جاتی ہوں، دونوں کو سزا دی جاتی ہو یا دونوں کو انعام دیا جاتا ہو۔ یقیناً کہیں ایسا نہیں ہوتا۔ جو ادارے کے وفادار اور خدمت گزار ہیں ان کے کام کی قدر کی جاتی ہے، انہیں مراعات دی جاتی ہیں اور انہیں انعام کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اور جو ادارے کے دشمن، غدار، کام چور اور صرف تنخواہ سے غرض رکھنے والے ہیں انہیں نہ صرف انعام کا مستحق نہیں سمجھا جاتا بلکہ انہیں سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک شخص اپنی خواہشات کی تکمیل یا اپنی ذات کی سربلندی کی ہوس میں اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کرتا، حق تلفیاں کرتا اور بعض دفعہ جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اور ایک دوسرا آدمی ہے جو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈر کر حقوق کی پاسداری کرتا ہے، لوگوں سے احسان و مروت سے پیش آتا ہے اور مقاصد کی سربلندی کیلئے جس خدمت اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے وہ کبھی اس سے دریغ نہیں کرتا۔ تو کیا ان دونوں کو عقل، علم اور اخلاق کی نگاہ میں برابر سمجھا جائے گا اور اگر ایسا ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر نیکی کا تصور کیا ہوگا۔ برائی بری کیوں سمجھی جائے گی، ظلم سے کوئی بچنے کی کیوں کوشش کرے گا، مظلومیت مدد کے قابل کیوں ہوگی، قاتل اور مقتول میں کیا کوئی فرق باقی رہ جائے گا، کیا حرمتِ جان، حرمتِ مال اور حرمتِ آبرو کا کوئی تصور کسی سطح پر بھی باقی رہ جائے گا۔ اگر یہ سب باتیں ان دونوں کو برابر سمجھنے کا نتیجہ ہیں تو کیا انسانی زندگی

Marfat.com

کی بقا اور انسان اور حیوان میں فرق باقی رکھنے کیلئے کیا اس بات کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ ہے کہ فرمانبردار، قانون کے پابند، اخلاق کے پیکر اور جرائم پیشہ لوگوں کو برابر نہ سمجھا جائے۔ یہی انسانیت کا سرمایہ ہے اور یہ وہ تعلیم ہے جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں نے دی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر مسلم اور مجرم برابر نہیں اور اچھائی اور برائی یکساں نہیں اور ظلم اور عدل ایک ترازو میں برابر نہیں رکھے جاسکتے، تو پھر اس بات کا ہمارے پاس کیا جواب ہے کہ لوگ قتل ہوتے ہیں لیکن قاتل پکڑے نہیں جاتے یا پکڑے جاتے ہیں تو رشوت یا سفارش کے زور سے چھوٹ جاتے ہیں۔ طاقتور کمزور کو دبا کے رکھتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں، نیکی کمزور ہونے کی وجہ سے منہ چھپائے پھرتی ہے اور بدی سربازار رقص کررہی ہے۔ اچھی باتیں کتابوں میں پڑھی جاتی ہیں لیکن ایوانِ حکومت میں برائی کا دور دورہ ہے۔ اور کسی کے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں جو ہر سطح پر اس صورتحال کو بدل سکے۔ قرآنِ کریم اس کا ایک ہی جواب دیتا ہے کہ جب تک لوگوں کے دلوں میں قیامت کا عقیدہ راسخ نہیں کیا جائے گا اور لوگ اس پر یقین نہیں کریں گے کہ ہمارا ہر عمل محفوظ کیا جارہا ہے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنا پڑے گی۔ وہاں طاقتور بھی پکڑے جائیں گے اور قاتل بھی نہ چھپ سکیں گے اور نہ چھوٹ سکیں گے۔ اس وقت تک انسانی معاملات اور انسانی زندگی کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ بات ہے جو اس آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔

اور دوسری آیت میں اس بات کے ساتھ ساتھ ایک اور بات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ مشرکینِ عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ جو لوگ دنیا میں خوشحال، معزز اور بڑی حیثیت کے مالک ہیں وہی آخرت میں بھی معزز ہوں گے۔ کیونکہ دنیا میں ان کا عزت پانا اور دولت وحشمت سے بہرہ ور ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان کو یہ سب کچھ عطا نہ کرتا۔ تو جو لوگ یہاں مقبول ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قیامت کے دن ان کو مردود ٹھہرایا جائے اور جو لوگ آج نانِ شبینہ کے محتاج اور جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں یہ قیامت کے روز بھی اسی طرح نادار اور قلاش ہوں گے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ہم تمہاری عقل پر یہ فیصلہ چھوڑتے ہیں کہ کیا عقل ایک مجرم اور قانون کے پابند اور اس کے فرمانبردار کو برابر قرار دیتی ہے۔ کیا عقل کی نگاہ میں ظالم اور مظلوم یکساں ہیں۔ کیا عقل یہی سمجھتی ہے کہ اچھائی اور برائی میں کوئی فرق نہیں۔ یقیناً عقل ایسا نہیں سمجھتی۔ وہ ان دونوں کی یکسانی کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ برائی سے نفرت کرتی اور نیکی کو فروغ دیتی ہے۔ اگر امر واقعہ یہ ہے تو پھر تم کیسے سمجھتے ہو کہ تم نے دنیا میں اپنی دنیوی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا، اسے ظلم کا ذریعہ بنایا، شب و روز عیش وعشرت میں گزارے اور عفت وعصمت کے نہ جانے کتنے فانوس گل کئے۔ اور تمہارے مقابلے میں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والے جو کردار کی عظمت اور اخلاق کی دلآویزی رکھتے ہیں۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ وہ پیٹ سے بھوکے بھی ہوں تو صبر کی تصویر ہوتے ہیں۔ دولت ان کے قدموں میں ڈھیر کردی جائے، تب بھی وہ اس کی ہوس میں مبتلا نہیں ہوتے، تو آخر تمہیں اور انہیں قیامت کے دن برابر کیسے سمجھ لیا جائے۔ افسوس ہے تم پر تم کس طرح کے فیصلے کرتے ہو۔

أَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿٣٧﴾ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿٣٨﴾

(کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو۔ ۳۷) اس میں تمہارے لئے وہی کچھ ہے جو تم اپنے لئے پسند کرو گے۔ ۳۸)

Marfat.com

ایک مغالطے کی تردید

گزشتہ آیت کی تشریح میں، میں نے عرض کیا ہے کہ مشرکینِ عرب بالعموم اور قریش بالخصوص یہ سمجھتے تھے کہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے منظورِ نظر ہیں، اس لئے اس نے ہمیں دنیا میں عزت وسیادت عطا کی ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن بھی ہمیں نعمتوں سے نوازے گا اور یہ بات وہ اس مفروضے پر کہتے تھے کہ اولاً تو قیامت آئے گی ہی نہیں اور اگر آ ہی گئی تو ہمیں اس کی کیا فکر ہے ہم چونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب کا رشتہ رکھتے ہیں تو وہ یقیناً ہمیں وہاں بھی نوازے گا۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ کیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کوئی کتاب، کوئی صحیفہ موجود ہے جسے پڑھ کر تم اس طرح کی باتیں کرتے ہو کہ قیامت کے دن تمہاری ساری آرزوئیں پوری ہوں گی۔ تم اگر خود اپنی عقل سے بھی پوچھو جیسے کہ اس سے پہلے کی آیت میں فرمایا گیا ہے تو عقل بھی کبھی اسے تسلیم نہیں کرے گی کہ قیامت کا دن جبکہ جزاء و سزا کا دن ہے اور وہاں حُسنِ عمل پر جزاء ملے گی اور بدکرداری پر سزا ملے گی، تو تم نے اس کیلئے محض عزت و وجاہت کو معیار بنا لیا ہے تو آخر یہ بات تم نے کس کتاب میں پڑھی ہے جو خاص طور پر تم پر اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ اور اگر واقعی کوئی ایسی چیز تمہارے پاس ہے تو اسے پیش کرو۔ لیکن کوئی ایسی چیز ہوتی تو وہ پیش کرتے۔ اس لئے جواب میں خاموشی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اَمۡ لَكُمۡ اَيۡمَانٌ عَلَيۡنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمۡ لَمَا تَحۡكُمُوۡنَ ۚ ﴿۳۹﴾

(یا تمہارے لئے روزِ قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم فیصلہ کرو گے۔ ۳۹)

اگر تمہارے پاس کوئی کتاب نہیں تو پھر یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی عہد و پیمان اللہ تعالیٰ نے تم سے ایسا کر رکھا ہو جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے کہ تم جو چاہو گے ہم تمہارے ساتھ وہی معاملہ کریں گے تو پھر وہ عہد و پیمان پیش کرو۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی جسے وہ پیش کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخرت کی فوز و فلاح کے جو وعدے قوموں سے کئے ہیں وہ ایمان اور عملِ صالح اور اس عہد کی پابندی کے ساتھ مشروط ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے واسطے سے لوگوں سے لئے ہیں۔ غیر مشروط طور پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کسی کی بخشش یا سرفرازی کا کوئی وعدہ نہیں فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جنہیں ابوالانبیاء کہا جاتا ہے، یہودیت، مسیحیت اور اسلام تینوں میں ان کا بڑا احترام ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا: اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ''کہ میں آپ کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں''۔ یعنی اس وقت کی دنیا کی دینی امامت و قیادت آپ کے سپرد کی جا رہی ہے۔ تو آپ نے پوچھا کہ کیا یہ منصب میری اولاد کو بھی ملے گا، تو جواب میں فرمایا گیا کہ ''میرا یہ عہد ان کو شامل نہیں ہے جو آپ کی اولاد میں سے میرے عہد کو توڑ کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ جب بھی کوئی عہد کیا ہے تو اس کی بنیاد ایمان و عمل کو بنایا۔ ظالم اسی کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر، اس کی توحید پر اور آخرت پر عمل کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہو۔ اور آخرت سے انکار کے باعث بے عملی یا بدعملی کی زندگی گزارتا ہو اور احکامِ شریعت کی پروانہ کرتا ہو۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جس خیالِ خام میں قریش مبتلا تھے اسی فریب کا شکار یہود بھی تھے۔ وہ بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے چہیتے قرار دیتے تھے۔ اور اسی لئے اپنے آپ کو ہر مسئولیت سے بالاتر سمجھتے تھے۔

Marfat.com

سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾

(ان سے پوچھئے، ان میں سے کون اس کا ضامن بنتا ہے۔ ۴۰) کیا ان کے کچھ شرکاء ہیں تو وہ لائیں اپنے شریکوں کو، اگر وہ سچے ہیں۔ ۴۱)

گزشتہ آیت میں پوچھا گیا تھا کہ کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مرضی کے مطابق ان سے سلوک کرے گا اور قیامت (اگر آ گئی) تو وہاں بھی یہ لوگ نوازے جائیں گے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ ان سے یہ پوچھئے کہ تم جو عہد و پیمان وغیرہ کی باتیں کرتے ہو، کیا کوئی اس کا ضامن بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نبوت اور فلاح کا غیر مشروط ابدی پروانہ جاری کر رکھا ہے اور اگر کوئی ایسا ضامن نہیں ہے تو شاید ان لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جن قوتوں کو ہم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے وہ یقیناً ان پر اللہ تعالیٰ کو ہاتھ نہیں ڈالنے دیں گے۔ یہ دنیا میں جو کچھ بھی کرتے رہیں ان شریکوں کی انہیں پناہ حاصل ہے، وہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کا عتاب ان پر برسنے نہیں دیں گے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کچھ ایسے شرکاء ہیں اور تم اپنے دعوے میں واقعی سچے ہو تو پھر انہیں پیش کرو۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قریش بت پرستی میں مبتلا تھے۔ فرشتوں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ جنات سے بھی استمداد کرتے تھے اور ان کے نام پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ بایں ہمہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے تحفظ کیلئے کبھی ان کا نام نہیں لیتے تھے۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے مسلسل تنقید سے ان کے اس مشرکانہ کاروبار کی بے حقیقتی مبرہن کر دی تھی اور آج اسی کا اثر ہے کہ ہندو جیسی مشرک قوم بھی کبھی اسے تسلیم نہیں کرتی اور وہ اپنے مشرکانہ رویئے پر تاویلات کے عجیب و غریب پردے تان کر اور جھول ڈال کر رکھتی ہے اور عجیب و غریب فلسفے اس نے ایجاد کر رکھے ہیں۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾

(جس دن پنڈلی کھولی جائے گی (سخت وقت آ پڑے گا) اور لوگوں کو سجدہ کرنے کیلئے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ ۴۲) ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ذلت ان پر چھا رہی ہوگی اور یہ سجدے کیلئے اس وقت بھی بلائے جاتے تھے جب وہ صحیح سالم تھے۔ ۴۳)

Marfat.com

قیامت کے روز مشرکین کی رسوائی

آج مشرکینِ مکہ بالخصوص اشرافِ قریش بتوں کے سامنے جھکتے اور مختلف قوتوں کے سامنے جنہیں ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ لیکن جب صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کیلئے آنحضرت ﷺ دعوت دیتے ہیں تو یہ اکڑ جاتے اور تکبر کا اظہار کرتے ہیں اور زعم ان کا یہ ہے کہ ہم یہاں دنیا میں جس طرح معزز اور دولت وثروت کے مالک ہیں یہی عزت اور یہی ثروت ہمیں قیامت کے دن بھی حاصل ہوگی کیونکہ ہماری خوشحالی اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہے اور ہم اس کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ لوگوں کو قیامت کے دن ذلیل کرے۔ چنانچہ ان کی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کیلئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ قیامت کا دن کیسا ہولناک دن ہوگا۔ اس میں عزت اور سربلندی ان لوگوں کو ملے گی جو دنیا میں اس کی بندگی کرتے اور اس کے دین کی سربلندی کیلئے لڑتے رہے۔ اور جن لوگوں نے دنیا میں اس کے سامنے جھکنے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں تکبر کا رویہ اختیار کیا ان کو سب کے سامنے رسوا کرنے کیلئے حکم دیا جائے گا کہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ چنانچہ جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہوتے تھے وہ تو نہایت نیازمندی سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائیں گے اور یہ جھکنا اس بات کی علامت ہوگی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے مقبول لوگ ہیں، لیکن یہ لوگ جو آج اپنے بارے میں کیسی کیسی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اُس روز اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن ان کی کمریں جھکنے سے انکار کر دیں گی اور اکڑ کر تختہ ہو جائیں گی۔ اس صورتحال کی وجہ سے شرمندگی اور ندامت سے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان کے چہروں پر ذلت چھا چکی ہوگی اور پکارنے والا پکارے گا کہ تمہاری یہ ذلت کا سامان اس لئے ہوا ہے کہ جب تمہیں دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کیلئے بلایا جاتا تھا اور تم سجدہ کیلئے بالکل صحیح سالم تھے تو تم سجدہ کرنے سے انکار کرتے تھے۔ آج سب لوگ تمہاری اس رسوائی کو دیکھ رہے ہیں کہ آج جبکہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکی ہوئی بخشش کی طالب ہے لیکن تم ایسے بدنصیب ہو کہ اس کے سامنے جھکنے سے بھی محروم کر دیئے گئے ہو۔

کشفِ ساق کا مفہوم

یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ "بعض قدیم مفسرین نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ جس دن ساق کی تجلی فرمائی جائے گی اور سجدہ کی طرف لوگوں کو بلایا جائے گا اور ان کا استدلال شیخین کی حدیث سے ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے میدان میں اپنی ساق ظاہر فرمائے گا۔ ساق، پنڈلی کو کہتے ہیں۔ یہ کوئی خاص صفت ہے جس کو کسی مناسبت سے ساق فرمایا گیا ہے لیکن ایسے مفہومات متشابہات کہلاتے ہیں جس کی توجیہ انسانی علم سے ماورا ہے۔ لیکن متعدد آئمہ تفسیر سے ایک اور تفسیر منقول ہے جو موقع کلام سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔ ان آئمہ تفسیر میں حضرت عکرمہ بھی شامل ہیں، وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں ھو یوم القیمۃ یوم کرب وشدۃ "یعنی وہ قیامت کا دن ہے جو انتہائی تکلیف اور شدت کا دن ہے۔" صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت بھی یہی کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق "سخت وقت آپڑنے کو کشف ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔" شعرائے جاہلیت کے کلام سے بھی

Marfat.com

ہمیں اس کی تائید ملتی ہے۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

اخو الحرب ان عضت بہ الحرب عضھا
وان شمرت عن ساقھا الحرب شمرا

ممدوح جنگ کا مردِ میدان ہے، اگر جنگ اس پر حملہ آور ہوتی ہے تو وہ بھی اس سے نبرد آزما ہوتا ہے، اور اگر گھمسان کا رن پڑتا ہے تو وہ اس میں بے خطر کود پڑتا ہے
اس شعر میں گھمان کے رن کیلئے شمرت عن ساقھا الحرب کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے

کشفِ ساق کا تیسرا مفہوم جو حضرت ابن عباسؓ اور ربیع بن انسؓ سے نقل کیا جاتا ہے، اس میں کشفِ ساق سے مراد حقائق پر سے پردہ اٹھانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا دن، ایسا دن ہوگا جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہوجائیں گی اور لوگوں کے اعمال ان کی نیتوں سمیت کھل کر سامنے آجائیں گے۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنی برائیوں پر نیکیوں کا پردہ ڈال رکھا تھا ان کی ایک ایک بات ظاہر ہوجائے گی۔ چنانچہ اسی کشفِ حقائق کے ضمن میں وہ لوگ جو اپنے تئیں بہت معزز سمجھتے تھے اور اسی حوالے سے قیامت میں بھی عزت ملنے کی امید رکھتے تھے، ان کی بھی اصل حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے انہیں سجدے کا حکم دیا جائے گا اور پھر ان کی محرومی کا منظر دنیا دیکھے گی۔

فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاُمْلِیْ لَھُمْ ؕ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۴۵﴾

(پس اے نبی! اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے، ہم ان کو آہستہ آہستہ لا رہے ہیں، وہاں سے جہاں سے وہ نہیں جانتے۔ ۴۴) میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں بیشک میری تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔ ۴۵)

منکرین کو دھمکی اور استدراج کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کے جھٹلانے والوں کو دھمکی بھی ہے اور آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی۔ گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جب انہیں ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں، یعنی قصے کہانیاں ہیں، ان کی کیا اہمیت ہے۔ اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مذاق میں اڑا دیتے تھے۔ ان کے اس رویئے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب پر پھبتیوں کی وجہ سے یقیناً آنحضرت ﷺ کو بے حد تکلیف پہنچتی تھی، لیکن وہ لوگ چونکہ طاقتور تھے، اسلام نے ابھی قوت نہیں پکڑی تھی، دعوت کا عمل دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا، اس لئے انہیں اس طرزِ عمل سے روکا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ایسی بے بسی میں قلبی اذیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوت کی طرف اور آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی بے بسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان بدتمیزوں کا معاملہ درحقیقت آپ کے ساتھ نہیں ہمارے ساتھ ہے۔ ان سے آپ کو نہیں، ہمیں نمٹنا ہے۔ ان کی قوت آپ کیلئے تکلیف دہ ہوسکتی ہے، ہمارے لئے نہیں۔ اس لئے آپ ہر طرح سے دل میں اطمینان رکھئے یہ لوگ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور خود اپنے برے انجام سے بچ نہیں سکیں گے۔ رہی یہ بات کہ بظاہر حالات ان کا کچھ بگاڑا نہیں جاسکتا، لیکن وہ مسلمانوں کو ہر طرح اذیت دینے پر قادر ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ ہمارے

Marfat.com

استدراج کی گرفت میں ہیں۔ استدراج، بے خبری میں کسی کو تباہی کی طرف لے جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی کوئی شخص آہستہ آہستہ اپنی تباہی کی طرف بڑھ رہا ہو، لیکن سمجھ یہ رہا ہو کہ میں اپنی کامیابی کا راستہ طے کر رہا ہوں۔ چنانچہ دوسری آیت میں اس استدراج سے ہلکا سا پردہ اٹھایا گیا ہے کہ اشراف قریش جس قدر اسلام اور مسلمانوں کیخلاف سازشیں کرتے اور طاقت استعمال کر رہے ہیں، ہم ویسے ویسے ان کو ڈھیل دیتے جا رہے ہیں۔ وہ اس ڈھیل کو اپنی کامیابی کی علامت سمجھتے ہیں حالانکہ ہم ان کی رسی دراز کر رہے ہیں۔ لیکن اس رسی دراز کرنے میں یہ اندیشہ ہرگز نہیں کہ وہ ہماری گرفت سے نکل جائیں گے کیونکہ ہماری تدبیر نہایت محکم ہے، اس سے کوئی بچ نکلنے پر قادر نہیں۔ استدراج کی مختلف صورتیں ہمیں قرآنِ کریم میں نظر آتی ہیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ ایک دشمنِ حق اور ظالم کو بجائے سزا دینے کے، نعمتوں سے نوازا جاتا ہے۔ صحت، مال، اولاد اور دنیوی کامیابیاں دی جاتی ہیں۔ جن سے دھوکہ کھا کر وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے اور اس غلط فہمی میں وہ حق دشمنی اور ظلم وطغیان میں غرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہی ڈھیل اس کیلئے ہلاکت کا سامان بن جاتی ہے۔ جس طرح مچھلی کے شکار کیلئے کانٹے میں گوشت کا ٹکڑا لگا کر شکاری دریا میں پھینکتا ہے، مچھلی اسے اپنی خوراک سمجھ کر آگے بڑھ کر اسے کھانے کی کوشش کرتی ہے اور شکاری ڈور کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے، وہ خوش ہوتی ہے کہ میری دعوت کا انتظام کیا گیا ہے اور شکاری انتظار میں ہے کہ کانٹا اس کے حلق میں اتر جائے تو پھر میں رسی کھینچوں۔ اسی کو استدراج کہتے ہیں۔ شاعر نے ٹھیک منظر کشی کی:

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

(کیا آپ ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہیں کہ وہ اس چٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ ۴۶)

مخالفین کی بے حسی پر اظہارِ تعجب

جس شخص کے دل میں احساس کی کوئی رمق بھی باقی ہو وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص نہایت غمگساری اور ہمدردی کے ساتھ مجھے خاص بات کی طرف دعوت دے رہا ہے اور میری زندگی کے چلن پر وہ نہایت محکم اور معقول تنقید کر رہا ہے جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ اور وہ شب وروز اس کام میں مصروف ہے اور اس کا مجھ سے یا دوسرے لوگوں سے کسی معاوضے کا طلبگار نہیں تو وہ کبھی نہ کبھی ضرور سوچتا ہے کہ آخر اس شخص کی جان ماری وسخت کوشی اور ہمدردی اور غمگساری کی کوئی حقیقت تو ہو گی۔ جب وہ مجھ سے کچھ نہیں چاہتا اور خونِ جگر پی پی کر میری اصلاح کی فکر میں ہے تو مجھے کبھی تو اس کی بات پر غور کرنا چاہئے۔ لیکن قریش پر اس رویئے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا اور وہ سوچنے کی زحمت اٹھانے کیلئے بھی تیار نہیں تھے۔ قرآنِ کریم اظہارِ تعجب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم آخر کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ کسی جانور سے بھی اتنی ہمدردی کی جائے تو وہ بھی مانوس ہونے لگتا ہے۔ لیکن تمہارے اندر کسی بات کا کوئی اثر نہیں۔ ہمارے پیغمبر کی بے غرضی بھی تمہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکی تو اس پر تعجب اور دکھ کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ آیت میں خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ سے ہے، لیکن روئے سخن مخالفین کی طرف ہے۔

Marfat.com

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾

(کیاان کے پاس غیب کا علم ہے، پس وہ اس کو لکھ رہے ہیں۔ ۴۷)

گزشتہ مضمون کا تسلسل

اس آیت میں بھی خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن اصل مخاطب مخالفین ہی ہیں۔ان کی بے پروائی اور بے نیازی پر اظہارِ تعجب کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ کیا ان کے پاس علمِ غیب ہے جس کو وہ لکھ رہے ہیں کہ قیامت میں اعلیٰ مدارج انہیں کیلئے ہیں اور نبی کریم ﷺ جو کچھ فرما رہے ہیں، ان کے اس علم کے مطابق بالکل غلط ہے۔نہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور نہ وہ حقائق صحیح ہیں جنہیں وہ بیان کررہے ہیں۔اور اگر ان کے پاس علمِ غیب نہیں (اور فی الواقع نہیں) تو پھر زندگی کے حقائق سے آنکھیں بند کرلینا بلکہ نہایت ڈھٹائی سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو رد کردینا اپنے لئے ابدی ہلاکت کا سامان کرنے کے سوا اور کیا ہے۔سورۃ النجم میں یہی بات جس طرح ارشاد فرمائی گئی ہے اس سے پورا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰىٓ ۝ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝

کیا اس کے پاس علمِ غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے (آخرت میں اپنے مدارج کو)؟ کیا موسیٰ کے صحیفوں میں جو بات بتائی گئی ہے اس کی خبر اس کو نہیں ملی؟ اور اس ابراہیم کی تعلیمات میں بھی جس نے اپنے رب کے ہر حکم کو پورا کیا؟ کہ کوئی جان بھی کسی بھی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾

(پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کیجئے اور مچھلی والے کی طرح نہ ہوجایئے جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا اور وہ غم سے گھٹے ہوئے تھے۔ ۴۸)

آنحضرت ﷺ کو دعوت پر جمے رہنے کی تلقین

مشرکینِ مکہ کی روز بروز بڑھتی ہوئی اذیت رسانیوں سے یقیناً مسلمان متاثر ہوتے تھے اور بعض دفعہ جب تکلیفیں ناقابلِ برداشت ہونے لگتیں تو آنحضرت ﷺ سے التجا کرتے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ان پر عذاب نازل کرے۔ممکن ہے کبھی نبی کریم ﷺ کے قلبِ مبارک میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے تو اس پر آنحضرت ﷺ کو ضبط، برداشت اور استقامت کی نصیحت فرمائی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کے سلسلے میں جو کچھ آپ کے ساتھ پیش آرہا ہے، یہ اس راہ کی لازمی سنتیں ہیں، قوموں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے

Marfat.com

ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کیا ہے۔اور آپؐ کے پیشِ نظر تو سب رسولوں سے زیادہ کٹھن ذمہ داری ہے کیونکہ آپؐ کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا جو آپؐ کے چھوڑے ہوئے کام کو مکمل کر سکے تو اس لئے آپؐ میں کسی طرح کی بھی جلد بازی پیدا نہیں ہونی چاہئے۔اس راستے کے آخری چراغ آپؐ ہیں، اس لئے آپؐ کو ہر صورت جلنا ہے اور روشنی دینی ہے۔رہی یہ بات کہ ان لوگوں پر عذاب کیوں نہیں آ رہا، تو اس کی حکمت کو ہم جانتے ہیں۔انہیں کب تک مہلت دینی ہے اور کب تک ان کی آزمائش جاری رہنی چاہئے، یہ سب باتیں ہماری حکمت سے متعلق ہیں۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ آپؐ کی دعوت کے حتمی نتائج ظاہر ہونے لگیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کی فتح ونصرت اور مخالفین کی شکست کا فیصلہ ہو جائے۔اس لئے ابھی آپؐ کو ان مصائب پر صبر کرنا ہے۔آپؐ حضرت یونس علیہ السلام کی طرح نہ کریں کہ انہوں نے لوگوں کے مطالبے سے تنگ آ کر عذاب کی دعا کر دی اور ان کی طرف سے دعوت کی ناقدری کو دیکھتے ہوئے مرکزِ دعوت کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے اذن کا انتظار کئے بغیر چلے گئے۔اور اسی کے نتیجے میں ان کو وہ آزمائش پیش آئی جس کا ذکر سورۃ یونس اور سورۃ الانبیاء میں گزر چکا ہے۔حضرت یونس علیہ السلام کو صاحبِ الحوت (مچھلی والا) نہایت پیار سے فرمایا گیا ہے اور اس لئے بھی کہ آپؑ کو مچھلی نے نگل لیا تھا اور آپؑ اس امتحان میں مبتلا کر دیئے گئے تھے۔تب آپؑ کو اندازہ ہوا کہ میں نے اپنے مقامِ دعوت کو چھوڑ کر جلد بازی سے کام لیا ہے۔مجھے اللہ تعالیٰ کے اذن کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔چنانچہ نہایت شدید قسم کے غم سے گھٹے ہوئے انہوں نے مچھلی کے پیٹ کے اندر سے اپنے رب سے فریاد کی اور وہ زندۂ جاوید الفاظ ان کی زبان سے نکلے جو آیتِ کریمہ کے نام سے معروف ہیں۔

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾

(اگر ان کے رب کی مہربانی ان کے شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ مذمت کئے ہوئے چٹیل میدان ہی میں پڑے رہتے۔ ۴۹)

نعمت سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ فضل اور اس کی مہربانی ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کو نصیب ہوئی کہ جب انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ کو پکارا، اپنی فروگزاشت کا اعتراف کیا اور اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کی توبہ قبول فرمائی بلکہ فریضۂ رسالت پر از سرِ نو مامور فرمایا۔اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل واحسان نہ ہوتا تو جس طرح ریت پر مچھلی نے ان کو ڈالا تھا اسی پر نہایت مذموم حالت میں پڑے رہ جاتے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے غیر معمولی حالات پیدا فرمائے۔جب وہ مچھلی کے پیٹ سے باہر پھینکے گئے تو سانس کی آمد ورفت کے سوا ان کے اندر کوئی طاقت نہ تھی۔دھوپ سے بچنے کی ان میں سکت نہ تھی۔کس طرح ان پر سایہ کیا گیا، کس طرح ان کی خوراک کا انتظام کیا گیا، کس طرح خاص پودے کا رس ان کے منہ میں نچوڑا گیا اور غیر معمولی طریقے سے ان کو چند دنوں میں صحت دے دی گئی۔یہ سب اللہ تعالیٰ کی عنایات تھیں جو محض اس کے فضل سے ان کو حاصل ہوئیں۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾

(پس ان کے رب نے ان کو برگزیدہ کیا اور صالح بندوں میں شامل کر لیا۔ ۵۰)

Marfat.com

حضرت یونس علیہ السلام کے مقام کی وضاحت

حضرت یونس علیہ السلام اوران کے مقام ومرتبہ کے بارے میں ہرطرح کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ اگرچہ شدتِ تأثر سے مغلوب ہوکر آپؑ سے ایک فروگزاشت ہوگئی، لیکن فوراً ہی توبہ سے انہوں نے اس کی اصلاح کرلی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف توبہ قبول فرمائی بلکہ انہیں برگزیدہ فرمایا اوراس مقام ومرتبہ پر فائز کردیا جوانبیائے کرام میں صالحین کا مقام ہے۔ صالح کا لفظ قرآنِ کریم نے عام نیک بندوں کیلئے بھی استعمال کیا ہےاوران انبیائے کرام کیلئے بھی جنہیں اللہ تعالیٰ نے خصوصی مراتب سے نوازا ہے۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾

(اور جب کافرلوگ کلامِ نصیحت (قرآنِ کریم) سنتے ہیں تواس طرح آپ کو دیکھتے ہیں گویا اپنی نگاہوں کے زور سے آپ کے قدم اکھاڑ دیں گےاور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے۔ ۵۱) حالانکہ یہ توسارے جہان والوں کیلئے ایک نصیحت ہے۔ ۵۲)

لَيُزْلِقُوْنَكَ ......ازلاق سے مشتق ہے جس کے معنی لغزش دینے اور گرادینے کے ہیں۔ (راغب)

کفار کی طرف سے نفسیاتی حربہ

یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کو کھا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اشرافِ قریش جن طریقوں سے نبی کریم ﷺ کی دعوت وتبلیغ کوروکنے کی کوشش کررہے تھے ان میں بعض طریقوں کا تعلق نفسیاتی دباؤ سے بھی تھا۔ یہ بھی نفسیاتی دباؤ کا ایک ذریعہ تھا کہ جب نبی کریم ﷺ ان کے سامنے قرآنِ کریم پڑھتے، ظاہر ہے کہ اسلامی دعوت کا اصل منبع اور سرمایہ یہی تھا اور آنحضرت ﷺ جب بھی کسی کو دعوت دیتے تھے، قرآنِ کریم ہی کا کوئی حصہ پڑھ کرسناتے تھےاور بعض دفعہ قریش کے اجتماع میں بھی آپؐ نے قرآنِ کریم پڑھ کرسنایا اوراس طرح انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ایسے موقعوں پر قریش کے متمردین اور سرکش لوگ آپؐ کے روبرو کھڑے ہوکر تیز نگاہوں سے آپؐ کو گھورتے۔ یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ہمیں جب بھی موقع ملا، ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور جب آنحضرت ﷺ ان کی ان دھمکیوں اور وحشیانہ حرکتوں کا نوٹس لئے بغیر اپنی دعوت کو جاری رکھتے تو وہ زچ ہوکر یہ کہتے کہ یہ شخص یقیناً کوئی دیوانہ ہے۔ ورنہ کوئی عقلمند آدمی اس طرح خطرات سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ چنانچہ پروردگار نے آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آپؐ کو دیوانہ کہنے والے خود دیوانہ ہیں۔ یہ قرآنِ کریم کسی دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ سارے جہاں والوں کیلئے نصیحت ہے۔ اور پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ اس شان اور مرتبے کی کتاب جس کی مثال جن وانس مل کر بھی لانے پر قادر نہیں، کیا کسی دیوانے کی بڑ ہوسکتی ہے؟ انگریزوں میں کوئی شیکسپیئر کا کلام پڑھ کراور اردو خاں طبقے میں کوئی کلامِ اقبال دیکھ کر شیکسپیئر یا اقبال کو دیوانہ کہے حالانکہ ان کے کلام کی نظیر لانا ممکن ہے کیونکہ وہ انسانی کلام ہے، تو دنیا کا کوئی شخص دیوانہ کہنے والے کی تائید تو کیا کرے گا البتہ اس کی دماغی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار ضرور کرے گا۔ آنحضرت ﷺ کے بارے میں ایسی یاوہ گوئی کرنے والے کے بارے میں تواس سے بھی سخت الفاظ کہے جانے چاہئیں۔

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ

(٦٩)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورت کا نام الحاقہ ہے۔ یہ سورۃ کے پہلے ہی لفظ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ زمانۂ نزول کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنا تو مشکل ہے البتہ اس کے اسلوب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں ابھی شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا عمود چونکہ وہی ہے جو سورۃ القلم کا ہے، صرف نہج استدلال میں فرق ہے۔ اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کا زمانۂ نزول القلم کے زمانۂ نزول کے قریب ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت سے یقینی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے ایمان لانے سے کافی عرصہ پہلے یہ سورۃ نازل ہو چکی تھی۔ کیونکہ مسند احمد میں حضرت عمر فاروقؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک روز رسول اللہ ﷺ کو ستانے کیلئے گھر سے نکلا۔ خیال تھا کہ راستے میں اگر آمنا سامنا ہو گیا تو میں آپؐ کو پریشان کروں گا۔ لیکن آنحضرت ﷺ مجھ سے پہلے مسجدِ حرام میں داخل ہو کر نماز شروع کر چکے تھے۔ میں جب قریب پہنچا تو میں نے سنا کہ آپؐ سورۃ الحاقہ پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ میں آپؐ کے قریب کھڑا ہو کر سننے لگا۔ پھر قرآنِ کریم کے الفاظ کی دلآویزی اور اس کے اسلوب کے شان وشکوہ نے مجھے کان لگا کر سننے پر مجبور کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایسا مسجع اور مقفع کلام دروبست کی ایسی پختگی، الفاظ کا ایسا حُسنِ انتخاب، اشعار میں تو ممکن ہے، عام گفتگو میں نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بلند پایہ شاعر ہے۔ ابھی یہ خیال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک آیت پڑھی جس کا معنی یہ تھا ''کہ یہ ایک رسول کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں۔'' میں نے فوراً دل میں سوچا کہ یقیناً یہ شخص کاہن ہے، اسی لئے دل کی باتیں جان لیتا ہے۔ تو آپؐ نے اگلی آیت پڑھی ''کہ یہ کسی کاہن کا قول نہیں، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو، یہ تو رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔'' یہ سن کر اسلام میرے دل میں گہرا اتر گیا۔ اگرچہ اس کے بعد حضرت عمرؓ دیر تک اسلام نہیں لائے۔ لیکن ایسا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جن واقعات نے آپؓ کے دل میں اسلام کی تخم ریزی کی ان میں یہ واقعہ بھی شامل ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب قریش کی مخالفت نے شرافت کی حدود پامال نہیں کی تھیں۔ کچھ نہ کچھ قرابتداری اور لحاظ داری کا پردہ حائل تھا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ گئی رات مسجدِ حرام میں نماز میں قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے تھے اور اشرافِ قریش میں سے بعض لوگ چھپ چھپ کے سنتے تھے۔

Marfat.com

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

قیامِ مکہ میں آنحضرت ﷺ پر جو سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر تین موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ (۱) آخرت اور قیامت کے حوالے سے۔ کیونکہ قریش کا سب سے بڑا مسئلہ دنیا کی دلفریبیوں میں استغراق اور اس کے نتیجے میں دوسری زندگی کا ہر پہلو سے انکار اور تمسخر تھا۔ ایسی صورتحال میں جب تک قریش کو ایک دوسری زندگی کا قائل نہ کیا جائے جس میں اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی، اس وقت تک انہیں زندگی میں تبدیلی کیلئے آمادہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اس موضوع پر سب سے زیادہ زور دیا۔ (۲) نبی کریم ﷺ کے رسول برحق ہونے اور قرآنِ کریم کے منزل من اللہ ہونے پر دلائل۔ کیونکہ قریش کو ان دونوں حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے انکار تھا جبکہ دین کی عمارت ان ہی دونوں ستونوں پر قائم تھی۔ چنانچہ اس سورۃ میں پہلے رکوع کا آغاز قیامت اور آخرت کے برپا ہونے سے کیا گیا اور اس کے پہلے لفظ سے ہی جھنجھوڑتے ہوئے یہ بات کہی گئی ہے کہ قیامت کا آنا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ جن قوموں میں اس سے پہلے اللہ کا عذاب آچکا ہے، ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ آخرت کی منکر تھیں اور اسی وجہ سے ایسی کسی دعوت پر کان دھرنے کیلئے تیار نہ تھیں جو انہیں مرنے کے بعد کی زندگی اور اس میں جوابدہی کے احساس سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کرتی ہو۔

اس کے بعد آیت نمبر ۱۷ تک قیامت کی ہولناکی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح برپا ہوگی اور اس میں لوگوں کا کیا حال ہوگا اور آج کے انکار کرنے والے کس اندوہناک کیفیت سے دوچار ہوں گے۔ پھر آیت ۱۸ سے ۳۷ تک وہ مقصد بیان کیا گیا ہے جس کیلئے اس دنیا کے بعد قیامت کا آنا ضروری ٹھہرایا گیا اور پھر کسی حد تک اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ کس طرح لوگوں کو ان کے نامۂ اعمال دیئے جائیں گے۔ نیک لوگوں کا انجام کیا ہوگا اور برے لوگ کس صورتحال سے دوچار ہوں گے۔ یوں کہہ لیجئے کہ اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کے انجام کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اور پھر دوسرے رکوع میں قرآنِ کریم کی عظمت وصداقت کو نہایت شان سے بیان فرمایا گیا ہے اور قریش کے بے ہودہ تصورات کو رد کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کسی شاعر یا کاہن کا کلام ہے۔ اور اس کلام کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کلام کی عظمت اور حفاظت کا حال یہ ہے کہ جس عظیم ذات پر اسے نازل کیا گیا ہے وہ بھی اس میں ایک لفظ گھٹانے یا بڑھانے کا اختیار نہیں رکھتی اور یہ بات نہایت تیکھے انداز میں کہی گئی ہے کہ یہ تو اللہ رب العالمین کا کلام ہے، اس کی تکذیب کرنے والے خود سوچیں کہ اس تکذیب کا انجام کیا ہوگا۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ٢	سُوْرَةُ الْحَاقَّةِ مَكِّيَّةٌ (٦٩)	اٰيَاتُهَا ٥٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَاقَّةُ ﴿١﴾ مَا الْحَاقَّةُ ﴿٢﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاقَّةُ ﴿٣﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ
وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿٤﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴿٥﴾ وَاَمَّا عَادٌ
فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ﴿٦﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ
وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ
اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴿٧﴾ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿٨﴾ وَجَآءَ
فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ﴿٩﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ
رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿١٠﴾ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ
فِي الْجَارِيَةِ ﴿١١﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿١٢﴾
فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿١٣﴾ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ
الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿١٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١٥﴾
وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿١٦﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰى
اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿١٧﴾
يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ

Marfat.com

بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ﴿۱۹﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ
مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۚ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۙ﴿۲۱﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ﴿۲۲﴾
قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي
الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ
يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۚ﴿۲۶﴾ يٰلَيْتَهَا
كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۚ﴿۲۷﴾ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۚ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّيْ
سُلْطٰنِيَهْ ۚ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۙ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِيْ
سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۭ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ
بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ﴿۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۭ﴿۳۴﴾ فَلَيْسَ
لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۙ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۙ﴿۳۶﴾
لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخٰطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾

رکوع: ۱۔ (وہ ثابت ہو چکنے والی۔ ۱) کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی۔ ۲) کیا جانو کہ کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی۔ ۳) ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والے کو جھٹلایا۔ ۴) سو وہ جو ثمود تھے، تو وہ ایک حد سے بڑھ جانے والی آفت سے ہلاک کر دیئے گئے۔ ۵) رہے عاد، تو وہ ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے۔ ۶) اس کو اللہ نے سات رات اور آٹھ دن ان کی بیخ کنی کیلئے ان پر مسلط رکھا، تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھاڑے پڑے ہیں جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ ۷) تو کیا تم دیکھتے ہو ان میں سے کوئی بچ رہنے والا۔ ۸) اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور الٹی ہوئی بستیوں والوں نے کیا۔ ۹) انہوں نے اپنے رب کے

Marfat.com

رسولوں کی نافرمانی کی، تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔ ۱۰) اور جب پانی حد سے گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کردیا۔ ۱۱) تاکہ ہم اس واقعہ کو تمہارے لئے ایک درسِ موعظت بنادیں اور یادرکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں۔ ۱۲) پس جب ایک ہی دفعہ صور میں پھونک ماری جائے گی۔ ۱۳) اور اٹھائے جائیں گے زمین اور پہاڑ، پھر پاش پاش کردیئے جائیں گے ایک ہی بار۔ ۱۴) اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا۔ ۱۵) اور آسمان پھٹ جائے گا، پس وہ اس دن پھُس پھُسا ہوجائے گا۔ ۱۶) اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے، اور آٹھ فرشتے اس روز آپؐ کے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ ۱۷) اس دن تم پیش کئے جاؤ گے، تمہاری کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہے گی۔ ۱۸) اس وقت جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا، پڑھو میرا اعمال نامہ۔ ۱۹) مجھے یقین تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے۔ ۲۰) پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ ۲۱) ایک بلند و بالا باغ میں۔ ۲۲) اس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ ۲۳) کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کئے۔ ۲۴) اور رہا وہ شخص جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا، کاش میرا اعمال نامہ مجھے دیا ہی نہ گیا ہوتا۔ ۲۵) اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ کیا ہے میرا حساب۔ ۲۶) اے کاش! وہی موت فیصلہ کن ہوئی ہوتی۔ ۲۷) میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ ۲۸) میرا اقتدار مجھ سے چھن گیا۔ ۲۹) اس کو پکڑو، پھر اس کی گردن میں طوق ڈالو۔ ۳۰) پھر اس کو جہنم میں جھونک دو۔ ۳۱) پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر ہاتھ ہے، اس کو جکڑ دو۔ ۳۲) یہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ ۳۳) اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔ ۳۴) پس آج اس کا یہاں کوئی یارِ غمخوار نہیں۔ ۳۵) اور زخم کے غسالہ کے سوا اس کیلئے کوئی کھانا نہیں۔ ۳۶) جسے خطا کاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔ ۳۷)

اَلْحَآقَّةُ ۝۱ مَا الْحَآقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْحَآقَّةُ ۝۳

(وہ ثابت ہو چکنے والی۔ ۱) کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی۔ ۲) کیا جانو کہ کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی۔ ۳)

اَلْحَآقَّةُ کا مفہوم

اَلْحَآقَّةُ ...... اس چیز کو کہتے ہیں جو خود حق اور ثابت ہو اور اسے بھی کہتے ہیں جو دوسری چیزوں کو حق ثابت کرنے والی ہو، ایسی چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا وقوع عقلاً و اخلاقاً لازم ہو، جو بالکل اٹل اور قطعی ہو، یہ ایک ہی لفظ جملہ کے قائم مقام ہے، یہ ایسا مبتداء ہے جسے خبر کی حاجت نہیں کیونکہ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کی توجہ مبتداء پر مرکوز رکھی جائے۔

یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور یہ نام بجائے خود اپنے وجود پر دلیل ہے۔ کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے اسے بہر حال واقع ہو کے رہنا ہے اور انسانی حالات کا مطالعہ اور اس کے نفسیات کی تشخیص یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ قیامت کا آنا اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کے ظہور اور اخلاقی نکتہ نگاہ سے ضروری ہے۔ اور قرآن کریم میں جابجا اس کے دلائل دیئے گئے ہیں۔

Marfat.com

مَا الْحَاۗقَّةُ ...... کیا ہے وہ ہو کے رہنے والی۔ یہ اسلوب بیان قیامت کی عظمت، اہمیت اور وقوع کیلئے دلیلِ قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ اسلوبِ بیان اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب خطاب ایسے لوگوں سے ہو جو سر سے پاؤں تک غفلت میں ڈوبے ہوئے ہوں اور ہزار توجہ دلانے کے باوجود ہوش میں آنے کیلئے تیار نہ ہوں۔ انہیں اس اسلوب سے باور کرایا جاتا ہے کہ تم قیامت کو مانو یا نہ مانو وہ تو آ کے رہنے والی چیز ہے، اس کا وقوع میں آنا حد درجہ یقینی ہے۔ اور پھر اس کی عظمت اور اس کے وقوع کے یقینی ہونے کو مزید نمایاں کرنے کیلئے فرمایا کہ کیا ہے وہ ہو کے رہنے والی؟ یعنی اس کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ ...... اور تم کیا جانو، وہ ہو کے رہنے والی چیز کیا ہے۔ یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہنے والا اپنی شخصیت کی پوری توانائی اور ہمدردی اور خیر خواہی کے تمام جذبات سے کام لیتے ہوئے کسی ایسی بات کی عظمت کو انتہا درجے تک نمایاں کر دینا چاہتا ہے، سننے والے جس سے تکلیف دہ حد تک غفلت کا شکار ہوں اور یہ ہر زبان میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے سننے والا اگر ہوش و خرد سے بالکل تہی دامن نہیں یا عصبیت نے اسے اندھا نہیں کر دیا تو وہ کہنے والے کے دل کے سوز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور کبھی اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ تمہیں جس بات کی طرف بلایا جا رہا ہے وہ تمہاری زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم جن عقلی پیمانوں سے اسے جاننے کی کوشش کر رہے ہو وہ ان پیمانوں سے ماورا چیز ہے۔ اقبال نے ایسے ہی احساسات سے معمور ہو کر یہ بات کہی ہے:

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں آج اس کی دہشت اور اس کی بے پناہی کا اندازہ نہیں۔ لیکن تمہیں کیا خبر کہ اس کے برپا ہو جانے کے بعد انسانوں پر کیا گزرے گی اور جو آج نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کی تکذیب کر رہے ہیں وہ کس اندوہناک صورتحال سے دوچار ہوں گے۔

قرآنِ کریم نے یہ اسلوبِ کلام متعدد جگہ اختیار کیا ہے۔ قیامت ہی کے حوالے سے سورۃ القارعہ اس کی بہترین مثال ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝۴

(ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والے کو جھٹلایا۔ ۴)

اَلْقَارِعَةِ کا مفہوم اور قیامت کے انکار کا اہتمام

سابقہ تین آیات میں قیامت کے یقینی وقوع کا ذکر فرمایا اور اس کے آنے کو عقلاً و اخلاقاً لازمی قرار دیا۔ اب اس پر اضافہ کرتے ہوئے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ قیامت کا آنا تو ایک حقیقت ہے، لیکن اسے تسلیم کرنا یا انکار کر دینا محض علمی مشغلہ نہیں بلکہ انسانوں کی تعمیر کردار اور باہمی معاملات کی بہتری اور دنیا کی مصلحت کیلئے اس کا آنا از بس ضروری ہے۔ جو شخص اس کے وجود سے انکار کرتا ہے وہ درحقیقت انسانی زندگی کی تباہی کیلئے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور جو شخص اس کا اقرار کرتا ہے وہ نہ صرف اپنی زندگی کی تعمیر چاہتا ہے بلکہ انسانوں کی بھلائی، خیر خواہی اور اجتماعی زندگی کی ہمواری کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اس بنیادی حقیقت کو واضح کرنے اور قیامت کے عقیدے کو انسانی زندگی کیلئے ناگزیر قرار دینے

Marfat.com

کیلئے پیشِ نظر آیات میں تاریخ سے استشہاد کیا گیا ہے۔ اور سب سے پہلے ثمود اور عاد کا ذکر کرتے ہوئے ان کے انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ وہ اس انجام کو صرف اس لئے پہنچے تھے کہ انہوں نے القارعہ کا انکار کیا تھا۔ القارعہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ قرع عربی زبان میں ٹھونکنے، کوٹنے، کھڑ کھڑا دینے اور ایک چیز کو دوسری چیز پر مار دینے کیلئے بولا جاتا ہے۔ قیامت کیلئے یہ لفظ شاید اس لئے بولا گیا ہے کہ وہ سب لوگوں کو مضطرب اور بے چین کرنے والی اور تمام آسمان و زمین کے اجسام کو منتشر کرنے والی ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس طرح کوئی اچانک آ کر دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹاتا اور نچنت ہونے والوں کو ہڑبڑا دیتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے آنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ وہ اس طرح اچانک آ دھمکے گی کہ پوری کائنات میں ایک ہلچل برپا کر دے گی۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝۵

(سو وہ جو ثمود تھے، تو وہ ایک حد سے بڑھ جانے والی آفت سے ہلاک کر دیئے گئے۔ ۵)

گزشتہ آیت میں ثمود اور عاد کے بارے میں بیان فرمایا کہ انہوں نے قیامت کا انکار کیا تو پھر یہ نہ سمجھو کہ ان کے اس انکار کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا بلکہ اس انکار کے نتیجے میں وہ ہلاکت کا شکار ہوئے۔ کیونکہ قیامت کا انکار صرف ایک واقعہ کا انکار نہیں بلکہ قوموں کے اخلاق اور ان کے مستقبل سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ قومِ ثمود نے آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کی زندگی کو اپنی اصل زندگی سمجھ کر اپنی منزل قرار دے دیا۔ اور چونکہ انہیں آخرت میں کسی جوابدہی کا اندیشہ نہیں تھا اس لئے وہ سخت اخلاقی بگاڑ کا شکار ہوئے۔ دنیا ہی کو اپنی منزل بنا کر دنیا طلبی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں لگ گئے۔ اس راستے میں اگر اخلاقی قدریں حائل ہوئیں تو انہیں پامال کر دیا گیا۔ انسانی رشتوں نے راستہ روکا تو ان کا خون بہایا گیا، کاروباری مصلحتوں نے اگر کسی چیز کی پابندی کا تقاضا کیا تو اسے فضول بات سمجھ کر رد کر دیا گیا، تو آخر اس قیامت کے انکار کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بگاڑ ان کی تباہی کا باعث بنا اور وہ ایک سخت حادثے سے تباہ کر دیئے گئے۔

الطَّاغِيَةِ ...... طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں۔ طاغیہ کا معنی ہوگا وہ چیز جو اپنی حدود و قیود سے متجاوز ہو جائے۔ قومِ ثمود بھی اللہ تعالیٰ کے خلاف طغیان میں مبتلاء ہوئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر جو آفت مسلط کی، اسے طاغیہ فرمایا گیا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۷۸ میں اس کو الوجفة یعنی زبردست زلزلہ کہا گیا ہے۔ اور سورۃ ہود آیت ۶۷ میں اس کیلئے الصیحة یعنی زور کے دھماکے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تینوں لفظ ایک ہی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔ اس سے مراد ایسی سخت آواز ہے جس کو انسان کا قلب و دماغ برداشت نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے ان پر ایسا زلزلہ آیا جس میں دھماکے تھے۔ اور ہولناک آوازیں تھیں جس سے ان کے دل شق ہو گئے۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان پر بجلیاں بھی کوندی ہوں اور ان کی وجہ سے ان دھماکوں میں مزید اضافہ ہوا ہو۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸

Marfat.com

(رہے عاد، تو وہ ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کردیئے گئے۔ ۶) اس کو اللہ نے سات رات اور آٹھ دن ان کی بیخ کنی کیلئے ان پر مسلط رکھا، تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح بچھاڑے پڑے ہیں جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ ۷) تو کیا تم دیکھتے ہو ان میں سے کوئی بچ رہنے والا۔ ۸)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ رِیْحٍ صَرْصَرٍ ...... اس سخت ہَوا کو کہا جاتا ہے جو بہت زیادہ سرد بھی ہو۔ اردو زبان میں جسے بادِ صرصر بولتے ہیں۔ اس کی تیزی اور ٹھنڈک کو اقبال نے شمشیر کی تیزی قرار دیا ہے۔

حُسُوْمًا ...... حاسم کی جمع ہے۔ استیصال کردینے والی اور فنا کردینے والی چیز کو کہتے ہیں۔

قومِ عاد کا انجام اور عَاتِيَةٍ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں قومِ عاد کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جرم ان کا یہی تھا کہ انہوں نے قیامت کا انکار کیا اور جب جوابدہی کا اندیشہ جاتا رہا تو پھر کسی رسول کو ماننے اور کسی کتاب کو تسلیم کرنے کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ نتیجہ کے طور پر زندگی ہر اخلاقی قدر سے تہی دامن ہو گئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ ان پر سرما کی تیز و تند بادِ صرصر چلی اور اس نے ان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یہاں بادِ صرصر کی صفت کے طور پر عاتیہ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں وہ ہَوا جو سرکش اور بے قابو ہو جائے جسے ہم طوفانی ہَوا کہتے ہیں۔ پھر اس پر مزید اللہ تعالیٰ کا غضب یہ ہوا کہ آٹھ دن اور سات راتیں یہ عذاب ان پر مسلط رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ بدھ کی صبح سے یہ آندھی کا عذاب شروع ہو کر دوسرے بدھ کی شام تک رہا۔ اس طرح دن تو آٹھ ہو گئے اور راتیں سات ہوئیں۔ اور یہ ہَوائیں اس لئے ان پر مسلط کی گئی تھیں تا کہ ان کا استیصال کردیں، یعنی ان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ دنوں میں ہر چیز تباہ ہو گئی۔ ثمود قوم کا کوئی فرد زندہ نہ بچا، عمارتیں زمین بوس کردی گئیں اور ان کی لاشیں زمین پر اس طرح پچھاڑی ہوئی پڑی تھیں جیسے وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں جو ہَوا کے زور سے ادھر ادھر لڑھکتے پھر رہے ہوں۔ تیسری آیت میں مخاطب کی چشمِ تصور کے سامنے یہ پورا منظر لا کر یہ سوال کیا گیا ہے کہ کیا تمہیں ان میں سے کوئی شخص باقی بچا نظر آتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے دور کے سب سے ترقی یافتہ، سب سے زیادہ وسائل پر قابض اور سب سے زیادہ طاقتور قوم سمجھے جاتے تھے۔ اور ثروت و حشمت میں کوئی قوم ان کی ہمسر نہ تھی۔ جب وہ قیامت کے انکار کے باعث اخلاقی بگاڑ کی انتہا کو پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا ایسا ان پر برسا کہ ان کی قوت اور حشمت ان کے کسی کام نہ آئی اور وہ تاریخ میں عبرت کا سامان ہو کے رہ گئے۔

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ﴿۹﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾

(اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور الٹی ہوئی بستیوں والوں نے کیا۔ ۹) انہوں نے اپنے رب کے رسولوں کی نافرمانی کی، تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔ ۱۰)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ مُؤْتَفِكٰتُ ...... کے معنی باہم مختلط اور ملے جلے کے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں کو مُؤْتَفِكٰتُ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سب آپس میں ملی ہوئی بستیاں تھیں۔ اور یا اس لئے کہ عذاب آنے کے وقت جب ان کا تختہ الٹا گیا تو

Marfat.com

سب گڈ مڈ ہو گئیں۔ اور بعض اہلِ لغت کے نزدیک اس کا معنی ہے، الٹی ہوئی۔ قومِ لوط کی بستیاں زلزلہ سے الٹ دی گئی تھیں اور کنکر برسانے والی ہوا نے ان کو ریت اور کنکروں سے ڈھانپ دیا تھا، اس لئے ان کو مُؤْتَفِكٰتُ کہا جاتا ہے۔

فرعون اور قومِ عاد کا انجام

قومِ عاد و ثمود کے انجام کے ذکر کے بعد فرعون اور قومِ لوط وغیرہ کی بستیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ وہ بستیاں ہیں جن کے آثار قریش کے تجارتی اسفار میں جا بجا دکھائی دیتے تھے۔ فرعون اگرچہ مصر میں ہوا اور قریش کا مصر سے کوئی تجارتی تعلق نہ تھا۔ البتہ یہود کی ہمسائیگی کی وجہ سے وہ فرعون کے انجام سے ناواقف نہ تھے۔ اور قومِ عاد کی بستیوں کے کھنڈرات تو ان کے راستے میں پڑتے تھے۔ اس لئے قومِ عاد و ثمود کے بعد ان کا ذکر کر کے قریش اور دیگر اہلِ عرب کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ یہ سب قومیں تکذیبِ قیامت اور تکذیبِ رُسل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ اور آج تم اسی راستے پر چل رہے ہو۔ تمہیں ان قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کر کے اپنا رویہ بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

عذاب کا سبب

اگلی آیتِ کریمہ میں جرم کی نوعیت واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو بے سبب نہیں پکڑا بلکہ ان پر عذاب کا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی نافرمانی کرتے تھے۔ جو رسول بھی ان قوموں کی طرف آیا، اس نے ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تم جو زندگی گزار رہے ہو اس کے ایک ایک لمحے کی کارروائی محفوظ رکھی جا رہی ہے۔ تمہارا ہر عمل محفوظ ہو رہا ہے۔ اس زندگی کے بعد ہمیشہ کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اور زندگی آنے والی ہے جسے قیامت یا آخرت کہتے ہیں۔ اس زندگی میں کئے ہوئے ہر عمل کا حساب وہاں دینا پڑے گا۔ اس لئے اس زندگی کو اس طرح گزارو جس طرح میں تمہیں تعلیم دے رہا ہوں کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس نے اپنا دین مجھ پر اتارا ہے۔ میں وہ ضابطۂ حیات لے کر مبعوث ہوا ہوں جو تمہارے لئے زندگی کا ضابطہ اور قانون ہے اور جس کے مطابق تمہیں زندگی گزارنی ہے اور اسی کے حوالے سے تم سے باز پرس ہوگی۔ میری اطاعت اور میرا اتباع تم پر لازم ہے کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا نمائندہ ہوں۔ اگر تم مجھے تسلیم کرنے سے انکار کرو گے تو تم حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا انکار کرو گے اور تم جانتے ہو یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ لیکن جب انہوں نے بار بار کی تنبیہ کے باوجود اللہ تعالیٰ کے رسول کو ماننے سے انکار کر دیا، نہ صرف اس کی نافرمانی کی بلکہ اس کی زندگی کے درپے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس جرم میں انہیں پکڑا۔ کیونکہ اس کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کیخلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سفیر بن کر آتا ہے۔ اور پھر جب انہیں پکڑا تو ایسا پکڑا جس کی وہ مدافعت کرنے پر قادر نہ تھے۔

اَخْذَةً رَّابِيَةً ، اس سے مراد وہ پکڑ ہے جس کی مدافعت نہ ہو سکے اور جو انسان کیلئے ناقابلِ برداشت ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض دفعہ گرفت صرف تنبیہ اور یاددہانی کیلئے ہوتی ہے۔ ایسی تنبیہ سے آدمی چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی قوم خدا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی ہے تو وہ اس کو ایسی پکڑ پکڑتا ہے جس کی تاب لانا ناممکن ہوتا ہے۔

Marfat.com

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾

(اور جب پانی حد سے گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا۔ ۱۱) تاکہ ہم اس واقعہ کو تمہارے لئے ایک درسِ موعظت بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں۔ ۱۲)

طوفانِ نوح سے بچ جانے والوں کا تذکرہ

قومِ عاد و ثمود اور فرعون اور قومِ لوط کے انجام سے عبرت دلانے کے بعد اب ایسے واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جو متذکرہ بالا قوموں کے واقعات سے بہت پہلے کا ہے، یعنی اس سے مراد طوفانِ نوح اور اس میں پیش آنے والے واقعات ہیں۔ اس طرح سے پروردگار نے رسولوں کی پوری تاریخ کی طرف قریش کی توجہ دلائی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے ان قوموں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو تکذیبِ رُسل کے نتیجے میں بالکل تباہ کر دی گئیں۔ اب طوفانِ نوح کے سلسلے میں ان لوگوں کا ذکر نہیں کیا گیا جو غرق کر دیئے گئے تھے بلکہ ان لوگوں کا ذکر ہے جنہیں سفینۂ نوح میں اللہ تعالیٰ نے سوار ہونے کا موقع دیا۔ پھر انہیں محفوظ مقام پر اتار کر آباد کیا۔ اور آئندہ دنیا میں انہیں کی نسل سے آبادی پھیلی۔ اور قریش بھی انہیں لوگوں کے بقایا ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم اور ان کے ایمان کی وجہ سے نجات عطا فرمائی تھی۔ اس سے قریش کو یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ ایک تو تم اللہ تعالیٰ کا احسان یاد کرو کہ آج تم ان اسلاف کے اخلاف ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے طوفانِ نوح سے بچایا تھا۔ تو تمہیں اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر اللہ تعالیٰ کے آخری رسول پر ایمان لانا چاہئے۔ اور دوسرا اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ تمہارے وہ اسلاف جو طوفانِ نوح سے بچائے گئے ان کے بچنے کا صرف سبب یہ تھا کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لائے، آخرت کو تسلیم کیا اور اپنی زندگی بنانے میں لگ گئے۔ تم اگر ان کے اسوہ کو اپنے سامنے رکھو تو تم بھی ہر طرح کے طوفانوں سے محفوظ رہ سکتے ہو اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یقیناً تمہیں بھی حاصل ہوگا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ تم نے ان لوگوں کا رویہ اختیار کر رکھا ہے جنہیں طوفانِ نوح میں غرق کر دیا گیا تھا اور ان متذکرہ بالا قوموں کے نقوشِ قدم پر چل رہے ہو جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو چکی ہیں۔ حالانکہ طوفانِ نوح سے بچ جانے والوں کا تذکرہ ہم نے بعد کی قوموں میں اس لئے زندہ رکھا تاکہ لوگ اس سے یاد دہانی حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ نے جنہیں سماعِ قبول اور قلبِ سلیم عطا فرمایا ہے وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓی اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾

(پس جب ایک ہی دفعہ صور میں پھونک ماری جائے گی۔ ۱۳) اور اٹھائے جائیں گے زمین اور پہاڑ، پھر پاش پاش کر دیئے جائیں گے ایک ہی بار۔ ۱۴) اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا۔ ۱۵) اور آسمان پھٹ جائے گا، پس وہ اس دن پھُس پھُسا ہو جائے گا۔ ۱۶) اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے، اور آٹھ فرشتے اس روز آپؐ کے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ ۱۷)

Marfat.com

ظہورِ قیامت کی تفصیلات

گزشتہ آیات میں تاریخی واقعات سے یہ بتایا گیا ہے کہ جن قوموں نے قیامت سے انکار کیا اور رسولوں کی تکذیب کی تو وہ بالآخر عذاب کا شکار ہوئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا انکار جس طرح تکذیبِ رُسل کا باعث بنتا ہے، اسی طرح تعمیر کردار کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ گزشتہ قوموں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا تو تباہ ہوگئیں۔ اب قریش کو مختلف حوالوں سے اس انجام سے باخبر کیا جارہا ہے اور ساتھ ہی پیشِ نظر آیات میں ظہورِ قیامت کی تفصیلات بھی بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ ان اشتباہات کا ازالہ ہوسکے جن کی وجہ سے وہ قیامت کے بارے میں یکسو نہیں ہورہے تھے۔ اس میں پہلی بات تو یہ فرمائی گئی ہے کہ قیامت چونکہ کائنات کی تباہی اور پھر از سرِ نو آبادی کا نام ہے اور سننے والوں کو یہ بات بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی جست میں ساری کائنات تباہ کردی جائے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کیلئے دفعتاً چشمِ زدن میں قیامت کا برپا کردینا، کوئی مشکل کام نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت اسرافیل صور میں پھونک ماریں گے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے قیامت کی ہلچل برپا ہوجائے گی۔

ترمذی میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ صور سینگ کی شکل کی کوئی چیز ہے جس میں قیامت کے روز پھونکا جائے گا۔

نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ، اس سے مراد یہ ہے کہ یکبارگی صور سے ایک آواز نکلے گی اور یہ آواز اس وقت تک مسلسل جاری رہے گی جب تک ہر چیز موت کے گھاٹ نہیں اتر جائے گی۔ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا عمل تین مرحلوں میں مکمل ہوگا۔ پہلے مرحلہ کو نفخۂ فزع کہا گیا ہے۔ جس میں تمام دنیا کے لوگ ایک ہولناک آواز سے گھبرا اٹھیں گے اور نظامِ کائنات کی برہمی کو اپنی آنکھوں سے واقع ہوتا ہوا دیکھیں گے۔ سورۃ الحج کی پہلی آیات میں اس مرحلہ کو ایک زلزلۂ عظیم قرار دیا گیا ہے جس میں ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی۔ لوگ مخمور حالت میں بھٹکتے پھریں گے حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، ایک گھبراہٹ ہوگی جس سے ہر شخص حواس باختہ ہوجائے گا۔ اور دوسرا نفخہ وہ ہے جس کو نفخۂ صعق کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اس کے متعلق ارشاد فرمایا گیا فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ''یعنی اس نفخہ سے تمام آسمان والے فرشتے اور زمین پر بسنے والے جن و انس اور تمام جانور بے ہوش ہوجائیں گے۔ (پھر اسی بے ہوشی میں سب کو موت آجائے گی)۔ تیسرے نفخہ کو نفخۂ بعث کہا جاتا ہے۔ اس نفخہ کے ذریعے سب مردے زندہ ہوکر کھڑے ہوجائیں گے۔ قرآنِ کریم میں اس کے متعلق فرمایا گیا ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ''یعنی پھر صور دوبارہ پھونکا جائے گا جس سے اچانک سب کے سب مردے زندہ ہوکر کھڑے ہوجائیں گے اور دیکھنے لگیں گے، لیکن قرآنِ کریم میں تین نفخوں کا نہیں بلکہ دو نفخوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور جس چیز کو ہم نے نفخۂ فزع کے نام سے یاد کیا ہے اور جس کا بعض روایات میں ذکر بھی ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ تمام روایات اور نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا نفخہ ہی ہے، اسی کو ابتداء میں نفخۂ فزع کہا گیا ہے اور انتہا میں وہ نفخۂ صعق ہوجائے گا۔ (مظہری)

قرآنِ کریم کا اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ قیامت کے تینوں مراحل کو کبھی تو الگ الگ بیان کرتا ہے اور کہیں سب کو سمیٹ کر یکجا بیان کر دیتا ہے۔ پیشِ نظر آیات میں سب کو سمیٹ کر ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

وقوعِ قیامت کی شدت اور قریش کی غلط فہمیوں کی تردید

دوسری آیتِ کریمہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ فرمایا گیا ہے۔قریش کا گمان یہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے پہاڑوں جیسی قدآور اور مضبوط مخلوق کو ایک ہی ہلے میں تباہ کر کے رکھ دیا جائے۔تو ان کی غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے فرمایا کہ تمہارے نزدیک زمین اور پہاڑ کیسی ہی مضبوط چیزیں کیوں نہ ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کو انہیں درہم برہم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔وہ ان دونوں کو ایک ساتھ اٹھائے گا۔مثلاً ایک ہاتھ میں زمین اور دوسرے ہاتھ میں پہاڑ۔اور انہیں اس طرح پٹخ کر پاش پاش کردے گا جس طرح شیشے کے دو گلاس ایک ہی دفعہ پھینکنے سے چور چور ہو جاتے ہیں۔پہاڑ اپنے تمام حجم اور بلندی کے باوجود اس طرح ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے، جیسے ریت ہوتی ہے اور اتنے سبک کردیئے جائیں گے کہ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔

گزشتہ آیات میں قیامت کے وقوع کو حتمی اور یقینی ظاہر کرنے کیلئے اسے الحاقہ اور القارعہ کا نام دیا ہے۔اور یہاں اسے ایک تیسرے نام یعنی الواقعہ سے یاد کیا گیا ہے، کہ تم اس کے وقوع کو بیشک بعید از امکان سمجھو، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ایسا یقینی اور واقعی امر ہے جو ہو کے رہنے والا ہے۔

اہلِ عرب جس طرح پہاڑوں کو نہایت محکم اور ناقابلِ انکسار سمجھتے تھے، یہی تصور ان کا آسمانوں کے بارے میں بھی تھا۔وہ دیکھتے تھے کہ یہ سقفِ نیلگوں جو نہایت ٹھوس اور محکم وجود رکھتی ہے اور اس میں کسی نقص کا شائبہ تک نہیں۔کوشش سے بھی کوئی اس میں شگاف تلاش نہیں کیا جاسکتا۔یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے بھی توڑ دیا جائے۔پیشِ نظر تیسری آیتِ کریمہ میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ آسمان بھی پھٹ جائے گا۔اور آج یہ جس قدر محکم نظر آرہا ہے اس دن اسی قدر بودا اور پھُس پھُسا ہو کر روئی کے گالوں اور دھوئیں کی طرح اڑتا پھرے گا۔

آیت ۴ میں فرمایا کہ آسمان کے پھٹ جانے کے بعد فرشتوں کی سراسیمگی کا عالم یہ ہوگا کہ وہ کل تک تو آسمانوں کے انتظام و انصرام میں لگے ہوئے تھے اور آج وہ ان کے پھٹ جانے کے بعد اس کے اطراف اور کناروں پر سمٹے ہوئے کھڑے ہوں گے۔اس سے شاید مشرکین پر یہ تعریض کرنا بھی مقصود ہو کہ تم جن فرشتوں کو اپنے لئے سب سے بڑا سہارا سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے عتاب سے بچالیں گے، وہ بھی اس دن اللہ تعالیٰ کے جلال سے لرزاں اور ترساں ہوں گے۔البتہ وہ حاملینِ عرش جن کی تعداد پہلے چار تھی قیامت کے دن ان کی تعداد کو دوگنا یعنی آٹھ کردیا جائے گا۔اور وہ اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھائے کھڑے ہوں گے۔

عرشِ رحمٰن کی حقیقت

رہی یہ بات کہ عرشِ رحمٰن کی حقیقت اور اس کی حقیقی شکل و صورت کیا ہے اور فرشتوں کا اسے اٹھانا کیا مفہوم رکھتا ہے؟ یہ سب چیزیں وہ ہیں، عقلِ انسانی جن کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ان کا تعلق متشابہات سے ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں، ان میں بیشتر کا تعلق متشابہات سے ہے۔یہ احوال ایک ایسے نادیدہ عالم سے تعلق رکھتے ہیں جو ہماری فہم و فراست کی بساط سے باہر ہے۔اسے قریب الفہم بنانے کیلئے ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن سے فی الجملہ ہمارے ذہن میں ایک تصور قائم ہوسکتا ہے۔لیکن ان کی اصل حقیقت کو جاننا ہمارے لئے ممکن نہیں۔اس لئے قرآن و سنت نے اس بارے میں یہ ہدایت دی ہے کہ

Marfat.com

ایسی باتوں کی حقیقت کیلئے کھوج کرید کرنا گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والی بات ہے۔ جو کچھ فرمایا گیا ہے اس پر یقین رکھا جائے اور اس کی اصل حقیقت کے درپے ہونے سے گریز کیا جائے۔ اور اس کے بارے میں سوالات نہ کئے جائیں۔ قیامت کے دن جب ہمیں نئے حواس، نئی عقل اور نیا ماحول دیا جائے گا تو یہ حقائق ہمارے لئے قابلِ فہم ہو جائیں گے۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہم جن حقائق کے بارے میں بعض دفعہ ارتیاب کا شکار ہوتے تھے وہ ہماری کوتاہیٔ فکر تھی۔ ورنہ ان کے برحق ہونے میں تو کوئی شبہ نہ تھا۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾

(اس دن تم پیش کئے جاؤ گے، تمہاری کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہے گی۔ ۱۸)

اس دن، یعنی قیامت کے دن۔ جب آسمانوں اور زمینوں کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے گی، تم اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش کئے جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کے علم سے تو کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ لیکن اس روز چونکہ ایک نئی زمین وجود میں آئے گی جس کی سطح مستوی ہوگی۔ جس میں نہ کوئی پہاڑ ہوگا اور نہ کوئی غار۔ نہ مکان ہوں گے اور نہ کوئی درخت، جن کے پیچھے کسی چیز کو چھپایا جاسکے۔ ایسی حالت میں تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہارے لئے بالکل اس بات کا امکان نہیں ہوگا کہ تم کسی چیز پر اخفاء کا پردہ ڈال سکو۔ تو سوچ لو، اس وقت تم کیا کرو گے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ﴿۱۹﴾ۚ

(اس وقت جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا، پڑھو میرا اعمال نامہ۔ ۱۹)

جزاء وسزا کی تفصیل

قیامت کے لانے کا مقصد انسانوں کو جزاء وسزا سے گزارنا ہے۔ چنانچہ اس جزاء وسزا کی کسی حد تک تفصیل بیان فرماتے ہوئے سب سے پہلے اہلِ ایمان کا حال بیان کیا ہے، کہ جو شخص ایمان وعمل کا سرمایہ لے کر پہنچے گا، اس کا نامۂ عمل ان کے دہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑے گا اور جس طرح کسی شخص کو ایوارڈ ملے تو وہ اپنے دوستوں کو خوشی اور فخر سے دکھاتا ہے، اسی طرح وہ بھی دوسروں سے کہے گا کہ یہ لو میرا اعمال نامہ پڑھو۔

قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا جب آخری وقت آتا ہے تو وہیں سے مومن اور کافر کی شناخت بھی قائم ہو جاتی ہے اور اسی وقت سے فرشتوں کا دونوں سے سلوک بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ نیک آدمی کی روح کسی اور طرح سے نکالی جاتی ہے اور برے آدمی کی روح کچھ اور طرح سے۔ دونوں کا استقبال کرنے والے فرشتے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ قبر میں بھی دونوں کے ساتھ معاملہ جدا جدا ہوتا ہے۔ نیک انسان کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے جیسے مہمان کے ساتھ کیا جاتا ہے اور برے انسان کے ساتھ اس طرح کا، جیسے حوالاتی مجرم کے ساتھ پولیس کرتی ہے۔ اور پھر میدانِ حشر میں دونوں کو الگ الگ حیثیت سے لے جایا جائے گا۔ نیک آدمی کو پہلے سے اندازہ ہوگا کہ میں کسی سزا کیلئے نہیں بلکہ انعام کیلئے پیش کیا جا رہا ہوں۔ چنانچہ جیسے ہی نامۂ عمل وصول کرنے کا وقت آئے گا تو وہ خوشی سے دایاں ہاتھ آگے بڑھائے گا۔ کیونکہ انعامات ہمیشہ دائیں ہاتھ سے وصول کئے جاتے ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کی وجہ سے بڑے سے بڑا شخص بھی فی الجملہ پریشانی اور بے چینی کا شکار ہوگا۔ لیکن جب اس کی توقع کے مطابق دائیں ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھے گا۔

Marfat.com

ھَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ...... ھَآؤُمُ، اہلِ نحو کے نزدیک خذوا کے معنی میں ہے، جمع کیلئے بولا جاتا ہے۔اس کا معنی ہوتا ہے، لو۔آج کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ ''ھا'' کی حیثیت محض ایک آواز کی ہے۔ جیسے اردو زبان میں اوئے یا اف کہا جاتا ہے۔لیکن یہ اس موقع پر بولتے ہیں جب کہنا ہو، یہ لو۔ ''ھا'' اور ''اقرؤا'' کے بیچ میں ''ؤُمُ'' محض اس خلاء کو بھرنے کیلئے ہے جو دونوں کے بیچ میں ہے۔

كِتٰبِيَهْ، اس کے آخر میں ''ھا'' سکتہ کی ہے، جو محض قافیے کی رعایت کیلئے ہے۔ جیسے بعض دفعہ آخر میں الف، اشباہ کا لگا دیا جاتا ہے۔

اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾

(مجھے یقین تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے۔ ۲۰)

ظن کا مفہوم

عربی زبان میں ''ظن'' جس طرح محض گمان کے معنی میں آتا ہے، اسی طرح غالب گمان اور یقین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں غالب گمان یا یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جس مومن کو اعمال نامہ دہنے ہاتھ میں ملے گا وہ اپنے دوستوں کو دکھاتا ہوا، خوشی اور اعتماد سے یہ بات کہے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ اعزاز حاصل کرنے میں اس لئے کامیاب ہوا ہوں کہ مجھے دنیا میں اس بات کا یقین تھا کہ قیامت کا تصور محض ایک افسانہ نہیں، ایک یقینی عقیدہ ہے۔ ہم یقیناً ایک نہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کئے جائیں گے۔ یہ زندگی اسی روز کی تیاری کیلئے ہمیں دی گئی ہے۔ چنانچہ میں نے اسی یقین سے بہرہ ور ہو کر اس روز کی تیاری جاری رکھی اور آج اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اعمال نامے کا دہنے ہاتھ میں دیا جانا یہ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کرم فرمایا ہے اور مجھے اپنے مقبول بندوں میں شامل فرما لیا ہے۔

فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾ فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾

(پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ ۲۱) ایک بلند و بالا باغ میں۔ ۲۲) اس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ ۲۳)

اعمال نامے کا دائیں ہاتھ میں ملنا گویا جنت میں داخلے کی علامت کہئے یا سرٹیفکیٹ۔ اس کے بعد کے مراحل آسانی سے سر ہو جائیں گے۔ آخر یہ خوش قسمت جنت میں پہنچ جائے گا۔ اس جنت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں انسان کو وہ زندگی، وہ ماحول، وہ سہولت اور وہ نعمتیں میسر آئیں گی جو اس کیلئے دل پسند ہوں گی۔ وہ جس چیز کی خواہش کرے گا چاہے وہ آج کی دنیا میں ناممکنات میں سے ہو، وہ اسے فوراً عطا کر دی جائے گی اور کسی نعمت کے زوال یا خلاف طبیعت کسی امر کے ظہور کا اندیشہ تک نہیں ہوگا۔ ہر خوشی دائمی ہوگی اور ہر مسرت اندیشۂ زوال سے پاک ہوگی۔ یہ وہ زندگی ہے جو بادشاہوں کو بھی دنیا میں نصیب نہیں ہو سکتی۔ لیکن اہلِ جنت میں سے ہر شخص اسی زندگی سے بہرہ ور ہوگا۔

اہلِ جنت کو جن باغوں میں رکھا جائے گا وہ ہر لحاظ سے بلند و بالا ہوں گے۔ اپنی قیمت، اپنی قامت، اپنی وجاہت، اپنی صورت، ہر لحاظ سے ان کی مثال نہیں ہوگی۔

Marfat.com

اس کے پیڑ اور درخت تو یقیناً بلند و بالا ہوں گے لیکن اس کے پھل اور خوشے جو اصل مطلوب ہیں وہ نہایت قریب ہوں گے۔ اہلِ عرب جن باغوں کو بہت بیش قیمت اور بہت خوبصورت سمجھتے تھے ان کے کنارے کنارے کھجوروں کی قطاریں اور بیچ بیچ میں اناروں کے درخت اور انگوروں کی بیلیں ہوتی تھیں۔ شاید اسی ذوق کی تسکین کیلئے عالیہ اور دانیہ دو صفات لائی گئی ہیں۔ اور ویسے بھی کسی بھی باغ کی اس سے زیادہ اور خوبصورتی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ بلندی پر ہو، اس کے پودے سرو قامت ہوں، لیکن اس کے خوشے سروں پر لٹک رہے اور دسترس کے اندر رہوں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾

(کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے۔ ۲۴)

هَـنِيْٓـًٔـا ...... فعیل کے وزن پر صفت ہے۔ اس کے معنی ہیں "راس آنے والی اور مزیدار چیز"۔ بعض اہلِ علم نے اسے حال کے مفہوم میں لیا ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم کے نزدیک اس آیت میں یہ مصدرِ محذوف کی صفت واقع ہے۔ پورا جملہ اس طرح ہے كُلُوْا وَاشْرَبُوْا اَكْلًا وَّ شُرْبًا هَنِيًّا

جنت کی نعمتوں کی خصوصیت اور اہلِ جنت کا اعزاز

اہلِ جنت کو بلند و بالا باغوں میں اتار کر یہ کہا جائے گا کہ تم نہایت اطمینان، خوشدلی اور چاہت سے جنت کی نعمتیں کھاؤ اور پیو۔ یہاں کی نعمتیں تمہارے لئے کسی مشکل کا باعث نہیں ہوں گی۔ دنیا میں انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نعمتیں دے رکھی ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ ہر نعمت ہر کھانے والے کیلئے آسودگی کا باعث ہو۔ بعض چیزیں بعض عوارض کے سبب بعض لوگ نہیں کھا سکتے۔ شوگر کا مریض میٹھی چیزوں سے بچتا ہے اور بلڈ پریشر کا شکار نمک سے پرہیز کرتا ہے، معدے کے امراض میں مبتلا پرہیزی غذا کھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ تو عوارض کی مجبوریاں ہیں لیکن جن لوگوں کو کسی طرح کے عوارض درپیش نہیں ہوتے وہ بھی غذا نہایت احتیاط سے لیتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ سے جسم بھاری ہوسکتا ہے اور کئی عوارض پیدا ہوسکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جنت میں تمہیں جو نعمتیں عطا فرمائے گا ان میں سے ہر نعمت ہر کھانے والے کو آسودگی دے گی۔ کوئی نعمت کسی کھانے والے کیلئے کسی طرح کی مشکل پیدا نہیں کرے گی۔ اس کی کثرت و قلت کسی مسئلے کا باعث نہیں ہوگی۔

نعمتوں کا استعمال جن مسائل کو جنم دیتا ہے ان میں ایک تو وہ مسائل ہیں جو جسم سے تعلق رکھتے ہیں جس کا ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں، لیکن ایک مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق انسان کی روح، اس کے ایمان اور اس کی عاقبت سے ہے۔ یعنی اگر نعمت سے فائدہ اٹھانے والا اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہے اور نعمت دینے والے کا حق پہچانتا ہے تو وہ نعمت اس کیلئے ایمان میں اضافے اور آخرت میں اجر و ثواب کا باعث بنتی ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نعمتوں میں اضافہ بھی فرماتا ہے۔ لیکن اگر وہ شکر بجا نہیں لاتا بلکہ کفرانِ نعمت کرتا ہے اور نعمت دینے والے کا حق نہیں پہچانتا بلکہ اس نعمت کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر من مرضی اختیار کرتا ہے، تو یہی نعمت اس کیلئے وبال کا باعث بن جاتی ہے اور آخرت میں جوابدہی مشکل ہوجائے گی۔ ان دونوں حوالوں سے یہاں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ جنت کی نعمتیں نہ تمہارے لئے جسمانی مسائل پیدا کریں گی اور نہ اس میں کفرانِ نعمت کا کوئی اندیشہ ہوگا۔

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ میں ایک اور بات ارشاد فرمائی گئی ہے جو اہلِ جنت کیلئے سرمایۂ افتخار بھی ہے اور شکر کا موقع بھی۔ وہ بات یہ ہے کہ اہلِ جنت کو جن نعمتوں سے نوازا جائے گا، اسے اپنے فضل کا نتیجہ قرار نہیں دیا حالانکہ اہلِ جنت کا جنت میں دخول اور وہاں نعمتوں کی بارش یقیناً اللہ تعالیٰ کے فضل کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کے احساس کو سرشار کرنے اور ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کرنے کیلئے ارشاد فرمائے گا کہ یہ جو کچھ تمہیں ملا ہے یہ تمہارے اعمال کا صلہ اور تمہارے کارناموں کا نتیجہ ہے۔ جس طرح ایک مزدور اجرت پا کر ایک خاص قسم کے اعتماد سے بہرہ ور ہو کر مسرت اور شادمانی کے جھولے میں جھولنے لگتا ہے یہی کیفیت اہلِ جنت کی بھی ہوگی۔

وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَـقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِىۡ لَمۡ اُوۡتَ كِتٰبِيَهۡ ۚ ﴿۲۵﴾ وَلَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِيَهۡ ۚ ﴿۲۶﴾ يٰلَيۡتَهَا كَانَتِ الۡقَاضِيَةَ ۚ ﴿۲۷﴾

(اور رہا وہ شخص جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا، کاش میرا اعمال نامہ مجھے دیا ہی نہ گیا ہوتا۔ ۲۵) اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ کیا ہے میرا حساب۔ ۲۶) اے کاش! وہی موت فیصلہ کن ہوئی ہوتی۔ ۲۷)

اصحابُ الشمال کا حال

اس سے پہلے ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ اب ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جن کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ سورۃ انشقاق میں فرمایا گیا ہے "کہ بعض لوگوں کے اعمال نامے ان کی پشت کے پیچھے پکڑائے جائیں گے۔" دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی مجرم کو اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے نامۂ اعمال میں کیا ہے۔ تو وہ بددلی سے نامۂ عمل پکڑ تو لے گا لیکن اسے پیٹھ پیچھے چھپالے گا تاکہ لوگ اسے دیکھ نہ پائیں کیونکہ قیامت کے دن جس شخص کے بھی بائیں ہاتھ میں نامۂ عمل ہوگا دیکھنے والے جان لیں گے کہ یہ شخص اپنے جرائم کی پاداش میں پکڑا گیا ہے اور یہ ایک برا شخص تھا، اسی وجہ سے اسے بائیں ہاتھ میں نامۂ عمل دیا گیا ہے۔ تو وہ اپنا اعمال نامہ دیکھتے ہی اپنا سر پیٹ لے گا اور واویلا کرتے ہوئے کہے گا، کاش مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا گیا ہوتا اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ بے خبری بھی آدمی کو کسی حد تک تسکین دیتی ہے اور ممکن ہے اس کا یہ مطلب ہو کہ اگر مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا تو لوگوں کے سامنے میری رسوائی نہ ہوتی اور مجھے بھی خبر نہ ہوتی کہ میں کس قدر جرائم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ اپنے انجام کی ہولناکی کا تصور کرتے ہوئے وہ کہے گا کہ کاش جو موت مجھے آئی تھی وہ فیصلہ کن ہوگئی ہوتی۔ یعنی یہ دوبارہ زندگی ہمیں نہ دی جاتی اور نہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا۔ تیسری آیت میں ضمیر کا مرجع موت ہے جو اگرچہ الفاظ میں موجود نہیں لیکن قرینہ موجود ہونے کے وقت مرجع کے بغیر ضمیر لانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہوتا اور یہاں قرینہ واضح ہے۔

Marfat.com

مَآ اَغْنٰى عَنِّىْ مَالِيَهْ ۚ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّىْ سُلْطٰنِيَهْ ۚ ﴿۲۹﴾

(میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ ۲۸) میرا اقتدار مجھ سے چھن گیا۔ ۲۹)

ہر مجرم نہایت حسرت سے کہے گا کہ جس مال کو میں نے نہایت اہتمام سے جمع کیا اور گن گن کر رکھا اور میرا گمان یہ تھا کہ مال کی قوت سے ہر کام کرایا جاسکتا اور ہر شخص کو خریدا جاسکتا ہے، لیکن آج وہ میرا مال بھی میرے کسی کام نہ آیا۔ اور پھر مجھے اپنے اقتدار پر کس قدر بھروسہ تھا، میں کسی کو خاطر میں لانے کیلئے تیار نہ تھا، میں اپنے لشکر کی قوت کو فیصلہ کن سمجھتا تھا اور اسی اقتدار کے بل بوتے پر اکڑتا پھرتا اور ظلم توڑتا تھا لیکن آج وہ سب کچھ مجھ سے چھن گیا۔ آج صرف اس کا اقتدار ہے جو ہمیں دنیا میں کبھی نظر نہ آیا۔ ہمیں بتانے والے بتاتے رہے کہ اصل مقتدر ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ دنیا میں اس نے اصحابِ اقتدار کو ایک محدود اختیار دے کر آزمائش میں مبتلا کیا اور انہیں اپنے اقتدار و اختیار کا تابع بنایا کہ اگر وہ اپنی حدود سے تجاوز کریں گے تو قیامت کے دن ان سے سخت باز پرس ہوگی لیکن میں نے ان باتوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ادھر مسلسل آواز آرہی ہوگی لمن الملک الیوم ''بتاؤ آج کس کی حکومت ہے۔'' اور یہ سر جھکائے ندامت سے سوچ رہا ہوگا کہ کاش مجھے یہ ندا دنیا میں سنائی دے جاتی۔

سلطان کا لفظ دلیل اور حجت کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مفہوم یہ ہوگا کہ قیامت کے دن ہر مجرم سند اور حجت سے محروم ہو جائے گا۔ یعنی اس کے پاس کوئی ایسی حجت اور سند نہیں ہوگی جس سے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات پا سکے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۙ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِىْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۭ ﴿۳۲﴾

(اس کو پکڑو، پھر اس کی گردن میں طوق ڈالو۔ ۳۰) پھر اس کو جہنم میں جھونک دو۔ ۳۱) پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر ہاتھ ہے، اس کو جکڑ دو۔ ۳۲)

مجرموں کا رونا دھونا اور نالہ وشیون جاری ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آئے گا کہ ان مجرموں میں سے ایک ایک کو پکڑو، یہ اب کسی رعایت کے مستحق نہیں، ان میں سے ہر ایک کی گردن میں طوق ڈال دو۔ پھر ایک ایک مجرم کو جہنم میں جھونک دو۔ پھر ان میں سے ہر مجرم کو ایک ایسی زنجیر میں جکڑ دو جس کا طول ستر ہاتھ ہوگا۔

فَاسْلُكُوْهُ ...... سَلَكَ کا ترجمہ محاورے میں عموماً جکڑنا کر دیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا ترجمہ پرونا ہوتا ہے، جس طرح موتی یا تسبیح کے دانے پروئے جاتے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے مفہوم یہ ہوگا کہ زنجیر ان کے جسموں کے اندر سے گزارو اور پھر اس طرح انہیں جکڑو۔ جسم کے اندر سے زنجیر کے نکالنے کی تائید بعض روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ (از مظہری)

سورۃ ہمزہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جو لوگ دولت گن گن کر جمع کرتے ہیں اور دولت کے سانپ بن کر رہتے ہیں ایسے سرمایہ داروں کو دوزخ میں بھاری زنجیروں میں ستونوں کے ساتھ باندھ دیا جائے گا تاکہ جس دولت پر مارِ گنج بن کر بیٹھے رہے اس کی تپش کا مزہ اچھی طرح چکھیں۔

Marfat.com

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿٣٤﴾

(یہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ ۳۳) اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔ ۳۴)

اصحابُ الشمال کے بنیادی جرائم

جن لوگوں کو یہ سزا دی جائے گی کہ وہ جہنم میں بھی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہوں گے ان کے بنیادی جرائم یہ ہیں کہ ان میں کا ہر شخص نہ تو خدائے بزرگ و برتر پر ایمان رکھتا تھا۔ ایمان کا ایک معنی تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ویسے نہیں مانتا تھا جیسے ماننا چاہئے۔ اس کی ذات اور اس کی صفات میں شریک ٹھہراتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے رسول کو ماننے اور آخرت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا۔ واس سے پہلے کی آیت میں چونکہ خاص طور پر مال کا ذکر آیا ہے تو اس سیاق میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے مال کو اپنی ذاتی کوششوں کا نتیجہ اور اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ اور دوسرا جرم اس کا یہ تھا کہ جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتا تھا اور اس کی حدود کو پامال کرتا تھا، اسی طرح وہ بندوں کے حقوق سے بھی ناآشنا تھا اور مال و دولت کے بارے میں اس کے تصور نے اسے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے محروم کر دیا تھا اور دولت سے بے پناہ عشق کی وجہ سے بخل کا ایسا شکار ہو گیا تھا کہ فقیر اور مسکین کو دھکے دیتا اور کسی غریب کی غربت اس کے دل میں رحم کے جذبات پیدا نہ کر سکتی تھی۔ اور اس کے بخل نے اسے اس نیت سے تنگ دل بنا دیا تھا کہ نہ وہ خود کسی کی مدد کرتا اور نہ کسی کو ترغیب دیتا کہ وہ کسی مسکین کو کھانا کھلائے۔ کھانا کھلانا چونکہ ضروریاتِ زندگی میں سب سے بڑی ضرورت ہے اور نیکی آسان بھی۔ اس لئے اس کا ذکر فرمایا۔ ورنہ مقصود صرف کھانا کھلانا نہیں بلکہ فقراء کی ہر طرح کی مدد اس سے مراد ہے۔ نہ وہ خود کسی غریب کی مدد کرتا تھا اور نہ کسی کو اس کی ترغیب دیتا تھا۔ بخیل لوگوں کا عام حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں بھی یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ حاجت مندوں کی مدد کریں تا کہ ان کے بخل پر پردہ پڑا رہے۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ﴿٣٥﴾ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ﴿٣٦﴾ لَّا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿٣٧﴾

(پس آج اس کا یہاں کوئی یارِ غمخوار نہیں۔ ۳۵) اور زخم کے غسالہ کے سوا اس کیلئے کوئی کھانا نہیں۔ ۳۶) جسے خطا کاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔ ۳۷)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ حَمِيمٌ ...... مخلص اور گہرے دوست کو کہتے ہیں۔

غِسْلِينٍ ...... زخموں کے دھوون یعنی غسالہ کو کہتے ہیں۔

ان جرائم کی سزا ان کو یہ ملے گی کہ قیامت کے دن ان کا کوئی مخلص دوست اور کوئی ہمدرد وغمخوار نہیں ہوگا جو انہیں عذاب سے بچا سکے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی دولت کا مصرف اپنی تن پروری، لذتِ کام ودہن یا دولت میں اضافے کے سوا کوئی اور نہیں سمجھتا تو ایسے شخص کا دنیا میں بھی کوئی ہمدرد وغمگسار نہیں ہوتا، آخرت میں کون ہوگا۔

اور دنیا میں چونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ کوئی بھلا نہیں کیا اور کسی کا حق نہ پہچانا اور کسی کو کبھی کھانا کھلانے کا روادار نہ ہوا تو قیامت کے دن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے کھانے اور پینے کیلئے زخمیوں کے زخموں کا دھوون اور ان کا خون اور پیپ دیا جائے گا۔ یوں تو اہلِ جہنم کو اور طرح کی غذائیں بھی دی جائیں گی جن میں زقوم کا بھی ذکر آیا ہے، لیکن زخموں کا غسالہ صرف ایسے خسیس لوگوں کی خوراک ہوگی جو دنیا میں کسی کو کھانا کھلانے کیلئے تیار نہیں تھے۔

Marfat.com

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا
لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ
قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾
تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ
الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾
فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ
لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

رکوع: ۲۔ (پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو۔ ۳۸) اور ان چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے۔ ۳۹) یہ ایک رسول کریم کا قول ہے۔ ۴۰) اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ ۴۱) اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ ۴۲) یہ خداوندِ عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ ۴۳) اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ ۴۴) تو ہم اس کو دہنے ہاتھ سے پکڑ لیتے۔ ۴۵) پھر ہم اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ ۴۶) پس تم میں سے کوئی بھی اس سے ہم کو روکنے والا نہ ہوتا۔ ۴۷) یہ تو ایک نصیحت ہے خدا سے ڈرنے والوں کیلئے۔ ۴۸) اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے بھی ہیں۔ ۴۹) اور بیشک وہ کافروں پر حسرت کا باعث ہوگا۔ ۵۰) اور بیشک یہ ایک حق یقینی ہے۔ ۵۱) اور آپ اپنے ربِ بزرگ و برتر کے نام کی تسبیح کریں۔ ۵۲)

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ
كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ
قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾

Marfat.com

(پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو۔ ۳۸) اور ان چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے۔ ۳۹)
یہ ایک رسول کریم کا قول ہے۔ ۴۰) اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ ۴۱) اور نہ یہ
کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ ۴۲) یہ خداوندِ عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ ۴۳)

''لا'' کا مفہوم

آیت کے شروع میں ''فَلَآ'' کا لفظ اہلِ علم کے نزدیک مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ بعض اسے زائد قرار دیتے ہیں۔ اس لئے وہ آیت کے ترجمے میں اسے شامل نہیں کرتے۔ لیکن بعض دیگر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ یہ زائد نہیں ہوتا اور نہ قسم کی نفی کیلئے آتا ہے، بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس خیال کی تردید کیلئے آتا ہے جسے رد کرنے کیلئے قسم کھائی گئی ہو۔ ہم اپنی بول چال میں بھی بعض دفعہ قسم کے آغاز میں ''نہیں'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً مخاطب ایک بات کہتا ہے تو ہم اس کی تردید میں قسم کے ساتھ تاکید پیدا کرتے ہوئے جو بات کہتے ہیں اس سے پہلے حرفِ نفی لاتے ہیں۔ مثلاً ہم اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے یہ اسلوب اختیار کرتے ہیں، نہیں، خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے بلکہ بات اس طرح ہے۔ قرآنِ کریم نے بھی اس آیت میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے اور اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ متکلم میری بات کو اس قدر غلط سمجھتا ہے کہ وہ اپنی بات کی تردید میں کچھ کہنے سے پہلے حرفِ نفی لا کر یہ تصور دینا چاہتا ہے کہ تمہاری بات اس قابل نہیں کہ اس پر غور بھی کیا جائے۔

قسم کے بارے میں یہ جان لینا چاہئے کہ قسم کے بعد جو جملہ آتا ہے اسے جوابِ قسم کہتے ہیں اور جوابِ قسم کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے۔ اور قسم بالعموم دعویٰ کی شہادت اور اس کی دلیل کے طور پر کھائی جاتی ہے۔

پیشِ نظر آیتوں میں قسم اور جوابِ قسم کا مفہوم

پیشِ نظر دو آیتوں میں جو قسم کھائی گئی ہے اس کا جوابِ قسم جس کی حیثیت دعویٰ کی ہے وہ، وہ بات ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔ لیکن اس دعوے کی وضاحت میں اہلِ تفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ دعویٰ تو بیشک اگلی آیت ہی ہے لیکن یہ اس دعویٰ کی ظاہری حیثیت ہے۔ اصل دعویٰ وہ ہے جسے سورۃ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے اور وہ اثباتِ جزاء وسزا ہے۔ مخالفین کا اصل انکار اس بات سے تھا کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ قیامت آئے گی اور وہ دن جزاء وسزا کا دن ہوگا۔ ہر شخص اپنے زندگی کے اعمال کے اعتبار سے جوابدہی کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا، نیکیوں پر جزاء ملے گی اور برائیوں پر سزا ملے گی۔ جس کا نتیجہ جنت یا جہنم ہوگا۔ یہ باتیں سراسر افسانہ معلوم ہوتی ہیں جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن وہ اس کے انکار کیلئے ہدف نبی کریم ﷺ کو بناتے تھے کہ تم قیامت کے وجود پر قرآنِ کریم سے آفاق وانفس اور عقل ونقل کے دلائل پیش کرتے ہو اور اس کیلئے بڑا خوبصورت پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہو اور اس کے بارے میں تمہارا دعویٰ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے، ہم اسے ماننے کیلئے تیار نہیں، تم جو کچھ وحیِ الٰہی کی صورت میں پیش کر رہے ہو یہ دراصل ایک شاعر یا کاہن کا کلام ہے۔ اور جنات یا شیاطین تمہارے دل میں اسے القاء کرتے ہیں۔ اس طریقہ سے وہ قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کو بے اعتبار ٹھہرا کر عقیدۂ قیامت کو بے اثر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس عقیدے کے اثبات کیلئے قسم کھا کر اپنے دعوے کو مؤکد کیا ہے۔

Marfat.com

سب سے پہلے حل طلب بات یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔ بات کو اگر لپیٹ کر کہیں تو مطلب بالکل واضح ہے کہ پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ قسم ہے ان تمام چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو یا دیکھ سکتے ہو اور ان تمام چیزوں کی جن کو تم نہ دیکھتے ہو اور نہ دیکھ سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں تمام مخلوقات کا ذکر آ گیا۔ یعنی جہانِ دیدہ بھی اور نادیدہ عالم بھی۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ نہ دیکھنے کی چیزوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات ہے۔ اور دیکھنے کی چیزوں سے مراد، دنیا کی چیزیں ہیں۔ (مظہری)

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس سورۃ میں جزاء وسزا پر جو دلائل قائم کئے گئے ہیں، وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک کا تعلق اِس عالم سے ہے اور دوسرے کا تعلق اُس نادیدہ عالم سے ہے جس کو یہاں آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ پہلی قسم کی دلیل سابقہ قوموں کی تاریخ اور ان کی تباہی کے آثار سے قائم کی گئی ہے اور یہ وہ دلیل ہے جس کو اہلِ عرب دیکھتے تھے اور آج بھی دنیا کے مشاہدے میں آتی ہے۔ اور دوسری قسم کی دلیل آخرت کے وہ احوال ہیں جو اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کو پیش آنے والے ہیں۔ ان کا تعلق آخرت سے ہے اور ظاہر ہے آج انہیں آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس جہان میں پیش آنے والے مکافاتِ عمل کے بعد ان کی حقیقت سے آج پردہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ان دونوں طرح کے دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دونوں طرح کے واقعات کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے ان کو تم آج بھی دیکھ سکتے ہو۔ اس لئے جزاء وسزا پر ان کے دلیل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور جہاں تک عالمِ آخرت کا تعلق ہے انہیں آج تم اپنے سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، لیکن عقل ان کا انکار نہیں کر سکتی، کیونکہ قوموں کی تاریخ اس پر شاہد ہے اور آفاق وانفس کے شواہد اس پر دلیل ہیں۔

جن اہلِ علم نے اگلی آیت کے منطوق ومفہوم کو من وعن جوابِ قسم یعنی دعویٰ ٹھہرایا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ قریشِ مکہ کو اس بات سے انکار تھا کہ قرآنِ کریم نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوتا ہے اور ایک فرشتہ لے کر ان پر اترتا ہے۔ لوگ اس کی فصاحت وبلاغت اور اعجاز آفرینی سے متاثر ہو کر اس کو کلامِ خداوندی سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ کوئی جن یا شیطان ہے جو آنحضرت ﷺ کے دل پر اس کلام کو القاء کرتا ہے۔ اور یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، جنات اور شیاطین ہمیشہ شاعروں اور کاہنوں پر اپنا کلام القاء کرتے رہتے ہیں اور وہ اسی کی مدد سے شعر کہتے اور عالمِ غیب کی خبریں دیتے ہیں، اس لئے آپ درحقیقت ایک شاعر اور کاہن ہیں، اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں جن پر وحی اترا کرتی ہے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے پروردگار نے ان چیزوں کی قسم کھائی ہے جن کو انسانی نگاہیں دیکھتی ہیں اور ان چیزوں کی قسم کھائی ہے جو نگاہوں کی حدود سے ماورا ہیں۔ اس سلسلے میں ان اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ رسول کریم سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سورۃ تکویر آیت ۱۹ میں بالکل انہیں الفاظ میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بعد جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی ہیں، کسی اور کی نہیں۔ لیکن یہاں اس لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد نہیں لئے جا سکتے کہ قریش حضرت جبرائیل علیہ السلام کو شاعر یا کاہن نہیں کہتے تھے اور نہ حضرت جبرائیل کی ذات زیرِ بحث تھی۔ شاعر اور کاہن ہونے کا الزام وہ آنحضرت ﷺ پر لگاتے تھے۔ اس لئے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔

رہی یہ بات کہ قرآن کو آنحضرت ﷺ یا حضرت جبرائیل کا قول کس معنی میں کہا گیا ہے کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ بات یہ ہے کہ قول کا معنی ہمیشہ کلام نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ کسی کا کلام جس شخص کی زبان سے نکلتا ہے اسے اس کا قول قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی

Marfat.com

اسی لئے اس کو آنحضرت ﷺ کا قول کہا گیا ہے کہ لوگ اسے حضورؐ کی زبان سے سنتے تھے۔ اور حضرت جبرائیل کا قول اس معنی میں ہے کہ حضورؐ قرآنِ کریم کو حضرت جبریل سے سنتے تھے لیکن آگے چل کے یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ یہ فی الحقیقت رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ آنحضرتؐ اور حضرت جبریل کی حیثیت بقول شاعر صرف یہ ہے کہ:

میں ان کے مطلب کی کہہ رہا ہے، زبان میری ہے بات ان کی
میں ان کی محفل سجا رہا ہوں، چراغ میرا ہے رات ان کی

اس پر قسم کی صورت میں دو طرح کے دلائل دیئے گئے۔ ایک تو وہ دلائل ہیں جنہیں اہلِ مکہ جانتے اور پہچانتے تھے اور ان کی آنکھیں انہیں دیکھتی تھیں۔ اور دوسرے وہ دلائل ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن دل اس کی گواہی دیتا تھا۔ پہلی قسم کی دلائل میں سے چند ایک کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

1- اس کلام کو "محمدؐ" کے اسمِ گرامی سے پہچانی جانے والی جو ذاتِ عزیز پیش کرتی ہے مکے کا ایک ایک فرد اس کی شرافتِ نفس، اس کی اخلاقی بلندی، اس کی امانت وصداقت اور اس کے حُسنِ کردار کا معترف تھا۔ کبھی کسی نے اس سے جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔ ایسی ذات سے یہ توقع کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ خداوندِ عالم پر جھوٹ باندھے اور غلط بات اس کی طرف منسوب کرے۔

2- ہر سمجھدار آدمی اس بات کو جانتا تھا کہ قرآنِ کریم کو پیش کرنے میں نبی کریم ﷺ کا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قرآنِ کریم کی دعوت کو پیش کرنے کے نتیجہ میں کوئی مفاد تو کیا ہاتھ آتا، زندگی کے لالے ضرور پڑ گئے۔ کوئی دکھ ایسا نہیں جس سے اس راستے میں واسطہ پیش نہ آیا ہو۔ وہ معاشرہ جو آپؐ کو سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا وہ آپؐ کا بدترین دشمن ہوگیا۔ کیا کوئی شخص کسی غلط دعوے کیلئے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی اور مستقبل کو داؤ پر لگا سکتا ہے۔

3- مکے کے لوگ دیکھ رہے تھے کہ جو شخص اس دعوت کو قبول کرتا ہے اور اس کلام پر مبنی نظامِ زندگی کو اپنا رہنما بنالیتا ہے اس کی زندگی میں یک لخت ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ کیا آج تک کسی شاعر یا کاہن کے کلام نے کہیں بھی کوئی صالح تبدیلی پیدا کی اور ایسے لوگ پیدا کیے ہیں جن کے اندر قربانی اور ایثار کی بے پناہ روح پیدا ہوجائے۔ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا اس کلام اور اس کے پیش کرنے والی کی سچائی میں شبہ کی کوئی گنجائش ہوسکتی ہے۔

4- عرب کا ہر ذی فہم آدمی جانتا تھا کہ شعر کی زبان کیا ہوتی ہے اور کاہنوں کا کلام کیسا ہوتا ہے اور وہ شاعروں اور کاہنوں کی سیرت و کردار سے بھی ناواقف نہ تھے۔ تو کیا قرآنِ کریم کی زبان شاعری یا کہانت کی زبان ہے اور کیا اس دعوت کو پیش کرنے والی ذاتِ گرامی شاعروں یا کاہنوں کی کمزوریوں کی حامل ہے؟

5- قرآنِ کریم جس طرح کی دعوت پیش کر رہا تھا، جس طرح کے تاریخی واقعات سے پردہ اٹھا رہا تھا، جس طرح اخلاقی مسلمات پیش کر رہا تھا اور جن علوم اور مضامین پر مشتمل تعلیم پیش کر رہا تھا ان میں سے کوئی بات بھی لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی زبان سے دعویٰ نبوت سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ اور مکے بھر میں ایسے علمی سرمائے سے کوئی معمور نہ تھا جس سے آپؐ کبھی استفادہ کرسکتے۔ اس کے باوجود آپؐ نے ایک ایسا نظامِ زندگی جو ہر طرح کے اختلاف سے پاک، ایک ایسا نظامِ اخلاق جو انسانی آداب وخصائل کی اصلاح کا ضامن، ایک ایسا نظامِ عدالت

Marfat.com

جو زندگی کے ہر معاملے میں عدل واحسان کا مرقع اور ایک ایسا نظامِ عبادت جو شرک کی ہر آلودگی سے پاک اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تصور دلوں میں راسخ کر دینے والا انسانوں کو عطا کیا۔ یہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوا تو اس کا سر چشمہ کہاں ہے۔ یہ تو وہ شواہد تھے جنہیں ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھ سکتی اور ہر سمجھنے والی عقل باور کر سکتی تھی۔ لیکن کچھ حقائق ایسے ہیں جنہیں انسانی نگاہ دیکھ نہیں سکتی۔ مثلاً:

وہ یہ بات نہ دیکھ سکتے تھے اور نہ سمجھنے پر قادر تھے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک اور فرمانبروا ہے۔ کائنات میں سب بندے ہی بندے ہیں، خدا اس کے سوا کوئی نہیں۔ قیامت ضرور برپا ہونے والی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کو واقعی اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔

یہ ہیں وہ دونوں قسم کے حقائق جن کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ رسولِ کریمؐ کا قول ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام جسے ہمارے رسول کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کے بندوں تک پہنچایا ہے اور یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے اور نہ کسی کاہن کا کلام۔

قَلِيْلاً مَّا تُوْمِنُوْنَ اور قَلِيْلاً مَّا تَذَكَّرُوْنَ کا مفہوم

گزشتہ آیات میں سے آیت ۴۱ کے آخر میں فرمایا قَلِيْلاً مَّا تُوْمِنُوْنَ اور آیت ۴۲ کے آخر میں فرمایا قَلِيْلاً مَّا تَذَكَّرُوْنَ ان دونوں جملوں میں قسموں کی صورت میں جو دلائل اور شواہد پیش فرمائے گئے ہیں، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دلائل کی موجودگی میں کوئی آدمی جس کے اندر شعور کی روشنی مری نہیں اور جس کے ضمیر کا نور بجھ نہیں گیا۔ اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا جسے نبی کریم ﷺ لے کر مبعوث ہوئے ہیں اور آپؐ کی رسالت اور قرآنِ کریم کی حقانیت میں کبھی شبہ کا اظہار نہیں کر سکتا، لیکن تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم نے کبھی اپنے اندر ایمان کی خواہش اور بات سمجھنے کی طلب پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ تمہاری طبیعت میں کبھی اس داعیے نے سر نہیں اٹھایا کہ مکے کا سب سے قابلِ فخر انسان جس کے سیرت و کردار کی پاکیزگی کی دشمن بھی گواہی دیتا ہے ایک حقیقت کا علم لے کر اٹھا ہے اور ہماری ہی بھلائی اور خیر خواہی کیلئے ہماری زبانوں کے تیر برداشت کر رہا ہے، ہم کبھی تو اس کی بات سنیں اور کبھی اس کی دعوت پر غور کر کے دیکھیں، یہ ہے اصل وہ بیماری جس نے تمہیں آج تک اسلام سے دور رکھا ہے، ورنہ تمہارے لیڈر اور سردار ایسے بدذوق اور بے دماغ نہیں تھے کہ وہ اگر سننے کی زحمت کرتے اور غور و فکر سے کام لیتے تو وہ اسلام کی حقانیت اور آنحضرت ﷺ کے پیغام کی عظمت کو سمجھنے سے قاصر رہتے۔ کیونکہ قرآنِ کریم جس زبان میں نازل ہوا ہے اور جس شان و شکوہ سے وہ دعوت کو پیش کرتا ہے اور جس بلند مقام سے انسانوں کو خطاب کرتا ہے اور اس کا پیش کرنے والا جس حُسنِ کردار کا حامل ہے اسے دیکھتے ہوئے تو یہ بات ناممکن دکھائی دیتی ہے کہ ایسی دلآویز شخصیت ایسے بلند پایہ کلام کو لوگوں کے سامنے پڑھے اور لوگ اس سے متاثر نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کبھی کسی نے دل کی آمادگی سے اس کو سنا ہے بیشک اس کے اندر کی جاہلی عصبیت اور آباؤ اجداد کے دین کی عظمت اسے اسلام کی طرف نہ آنے دے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ قرآنِ کریم کی عظمت کا قائل نہ ہو۔

حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام لانے سے متعلق مختلف روایات بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمام روایات اپنے اپنے مقام پر صحیح ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ ایک مضبوط شخصیت کے مالک تھے، وہ مختلف وقتوں میں اسلام سے متاثر ہوتے رہے، لیکن آغوشِ اسلام میں آنے کیلئے انہیں بہر حال وقت لگا۔ جن واقعات نے ان کے اندر اسلام کی تخم ریزی کی ان میں سے ایک واقعہ ایسا

Marfat.com

ہے جو پیشِ نظر آیاتِ کریمہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ انہیں گھر سے باہر رات گزارنی پڑی۔ وہ حرم تشریف لائے اور خانہ کعبہ کے پردے میں گھس گئے۔ اس وقت نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور سورۃ الحاقۃ کی تلاوت فرما رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق؄ قرآن سننے لگے اور اس کی تالیف پر حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے جی میں کہا ''خدا کی قسم یہ تو شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔'' لیکن اتنے میں آپ؄ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾

(یہ ایک بزرگ رسول کا قول ہے۔ ۴۰) یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ ۴۱)

حضرت عمر فاروق؄ کہتے ہیں میں نے ...... اپنے جی میں ...... کہا: (اوہو) ''یہ تو کاہن ہے۔'' لیکن اتنے میں آپ؄ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾

(یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں، تم لوگ کم ہی نصیحت قبول کرتے ہو۔ ۴۲) یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ ۴۳)

(اخیر سورۃ تک)

حضرت عمر فاروق؄ کا بیان ہے کہ اس وقت میرے دل میں اسلام جاگزیں ہو گیا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾

(اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ ۴۴) تو ہم اس کو دہنے ہاتھ سے پکڑ لیتے۔ ۴۵) پھر ہم اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ ۴۶) پس تم میں سے کوئی بھی اس سے ہم کو روکنے والا نہ ہوتا۔ ۴۷)

کفار کے الزام کا جواب

کفار کا الزام یہ تھا کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں اور نہ ان پر کلام خداوندی نازل ہوتا ہے بلکہ یہ اپنی طرف سے کچھ باتیں گھڑ لیتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے ہیں۔ اس الزام کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ محمد ﷺ یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ اپنی طرف سے کچھ باتیں گھڑ کر اللہ تعالیٰ کے کلام کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ انتہائی جہالت اور حماقت کی بات ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو اپنا رسول اور سفیر بناتا ہے اور اس پر اپنا کلام اتارتا ہے تو اس کی انتہائی کڑی نگرانی بھی کرتا ہے۔ اس کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس میں کوئی ردوبدل کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام وہ خزانہ ہے جس سے پوری نوع انسانی کی بھلائی وابستہ ہے۔ جس گھر میں یہ خزانہ رکھا گیا ہے، اس گھر کو حفاظت کے بغیر تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو معصوم پیدا فرماتا ہے۔ ان کے دل میں کبھی یہ خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کوئی غلط بات کہیں، لیکن بفرضِ محال یہ تصور کر بھی لیا جائے کہ اس کے رسول نے اپنی طرف سے کوئی بات بنانے کی کوشش کی ہے تو اللہ تعالیٰ کا ضابطہ اس معاملے میں ایسا شدید ہے کہ فوراً اس کی قدرت

Marfat.com

حرکت میں آتی ہے اور اپنے رسول کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اسے گرفتار کرتی ہے اور پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کمی بیشی کرنا اس درجے کا جرم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا رسول بھی اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کی بھی شہ رگ کاٹ دی جائے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول کبھی اس طرح کی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ کفار کے اعتراض کا جواب دینے کیلئے پروردگار نے اپنے کلام کی حفاظت کا جو انتظام کر رکھا ہے نہایت تیکھے لہجے میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔

جس ضابطے کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے اس کا تعلق کسی خاص رسول سے نہیں بلکہ ہر دور میں جب بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول آیا اور اس پر وحیِ الٰہی کا نزول ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسی سخت گیری کے ساتھ اپنے دین کی حفاظت فرمائی ہے۔ اب جبکہ آنحضرت ﷺ پر دینِ اسلام کی تکمیل کی جا رہی ہے اور آپؐ کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپؐ لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے کلامِ خداوندی میں کمی بیشی کرتے یا اپنے کلام کو اللہ تعالیٰ کے کلام کے طور پر پیش کرتے۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو ہم ان کی شہ رگ کاٹ دیتے اور تم میں سے کسی کو بھی ان کو بچانے کی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ وہ نہایت جانفشانی اور اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کا کلام پیش کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولِ برحق ہیں اور وہ جس چیز کو پیش کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔

یاد رہے کہ بعض نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں نے اس آیت کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے سچے نبی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے مطابق ہماری گردن توڑ دیتا۔ لیکن یہ بات ایک سیدھی سادی بات کو الجھا دینے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کا سچا رسول کبھی وحیِ الٰہی میں پیوندکاری نہیں کرتا، اور نہ اپنے کلام کو کلامِ خداوندی کے طور پر پیش کرتا ہے اور اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس کی گردن کاٹ دیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو شخص بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اور خدا پر جھوٹ باندھے تو اس کی گردن توڑ دی جائے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے گزرے ہیں جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے رہے اور ایسے بھی لوگ گزرے جو خدا کو گالیاں دیتے رہے۔ لیکن قدرت نے ہمیشہ ان کو مہلت دی اور سزا کیلئے انہیں آخرت کے حوالے کر دیا۔ لیکن سچے رسول کی صداقت اور حقانیت پر چونکہ نوعِ انسانی کی بھلائی کا دارومدار ہے اور اس کی معمولی بھول چوک بھی فتنے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لئے پروردگار فوراً اس کی اصلاح فرماتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اپنے رسول اور اپنے پیغام کی نگہداشت کرتے ہیں۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٨﴾

(یہ تو ایک نصیحت ہے خدا سے ڈرنے والوں کیلئے۔ ۴۸)

آنحضرت ﷺ کو تسلی ہے

اس میں ایک طرح سے آنحضرت ﷺ کو تسلی ہے اور کفارِ مکہ پر تعریض ہے۔ آنحضرتؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ آپؐ پر ایمان نہیں لا رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی قدر نہیں اور یہ انتہائی محروم اور بدقسمت لوگ ہیں۔ قابلِ قدر چیزیں ہمیشہ ان کے نصیب میں ہوتی ہیں جو قدر و منزلت والے ہوتے ہیں۔ گرے پڑے لوگ نعمت کی قدردانی سے بالعموم محروم رہتے ہیں۔ اس لئے آپؐ پر ہم نے جو نعمت اتاری ہے یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نصیحت ہے لیکن یہ ان لوگوں کے نصیب میں ہو گی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے

Marfat.com

والے ہیں۔تو پریشانی اور فکر ان لوگوں کو ہونی چاہئے جو اسے قبول کرنے سے محروم ہیں کیونکہ ان کی قسمت پھوٹ گئی ہے۔آپ کو اس سے دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ جن کی طبیعتوں میں سلامتی تھی وہ آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں۔اور باقی رفتہ رفتہ ایمان لے آئیں گے۔

وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾

(اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے بھی ہیں۔ ۴۹)

مکذبین کو وعید

گزشتہ آیت کے مضمون کا تسلسل ہے کہ آپؐ ان کے ایمان نہ لانے سے ہرگز پریشان نہ ہوں۔ہم ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں جو آپؐ کی دعوت کو جھٹلانے والے ہیں اور ساتھ ہی مخالفین کو تہدید کے انداز میں فرمایا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم میں سے جو آنحضرت ﷺ کی ذات اور آپؐ کی دعوت کو جھٹلانے والے اور تکذیب کرنے والے ہیں ہم ان سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اس لئے وہ اپنے انجام سے بچ نہیں سکیں گے۔

وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾

(اور بیشک وہ کافروں پر حسرت کا باعث ہوگا۔ ۵۰)

یعنی آج یہ لوگ اپنے رویئے اور آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی مخالفت پر بہت خوش ہیں لیکن وہ وقت دور نہیں۔جب ان کا یہ رویہ ان کیلئے حسرت کا سبب بن جائے گا اور وہ اپنی بدبختی پر ماتم کرتے ہوئے کہیں گے کہ کاش ہم نے اس دین کی تکذیب نہ کی ہوئی ہوتی۔

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾

(اور بیشک یہ ایک حق یقینی ہے۔ ۵۱)

قرآنِ کریم جس روزِ جزاء وسزا سے خبردار کر رہا ہے وہ ایک حقِ یقینی ہے، محض مفروضہ نہیں۔اسے لازماً پیش آنا ہے۔جو آج اسے تسلیم نہیں کرے گا،کل اسے پچھتانا پڑے گا۔یہ تقریباً وہی بات فرمائی گئی ہے جو اس صورت کی ابتدائی تین آیتوں میں فرمائی گئی ہے اور سورۃ کا نام جس پر دلالت کر رہا ہے۔یعنی جس بات سے سورۃ کا آغاز ہوا تھا،اسی پر اس کا اختتام ہو رہا ہے۔اس سے بڑھ کر قرآنِ کریم کے مربوط ہونے کی اور کیا دلیل ہوگی۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

(اور آپ اپنے رب بزرگ و برتر کے نام کی تسبیح کریں۔ ۵۲)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کا زادِ سفر

سورۃ کی آخری آیات میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے۔یہ آخری آیت بھی اسی سلسلے کی ہے۔اور یہ بالکل وہی بات ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ایک دوسری جگہ بھی ہوا ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السَّاجِدِیْنَ ”ہم جانتے ہیں کہ آپؐ ان کفار کی بے ہودہ گفتگو سے دل تنگ ہوتے ہیں۔اس کا علاج یہ ہے کہ آپؐ اپنے رب کی حمد میں مشغول ہو جائیں اور سجدہ گزاروں میں شامل ہو جائیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ جب کسی غم سے دل بوجھل ہوتا ہے تو آدمی اسے یاد کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے جس سے غائت درجہ محبت ہوتی ہے۔اور جب مخالفین کی مخالفت اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کرتی ہے تو آدمی اسے یاد کرتا ہے جو سب سے مضبوط سہارا ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ اپنے مخالفین کی اندھی مخالفت اور جاہلانہ انکار سے ایسے ہی دونوں خیالات سے گراں بار ہوتے تھے۔دل صدموں سے چور چور ہوتا اور مخالفتیں ہمت توڑنے لگتیں،تو اس کا علاج پروردگار کی جانب سے یہ فرمایا گیا کہ آپؐ کی سب سے محبوب ذات اور آپ کا سب سے مضبوط سہارا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔تو جب آپؐ کے دل میں ایسے احساسات پیدا ہوں تو آپؐ اپنے رب کی تسبیح اور اس کی عبادت میں لگ جائیں،یعنی اسے یاد کریں اور اپنے آپ کو اسی کی حفاظت میں دے دیں۔ابوداؤد میں حضرت عقبہ ابن عامر جہنی کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو اپنے رکوع میں رکھو۔اور جب آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی نازل ہوئی تو فرمایا کہ اس کو اپنے سجدہ میں رکھو۔اسی لئے باجماع امت رکوع اور سجدے میں یہ دونوں تسبیحات پڑھی جاتی ہیں۔جمہور کے نزدیک ان کا پڑھنا اور تین مرتبہ تکرار کرنا سنت ہے۔بعض حضرات نے واجب بھی کہا ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْمَعَارِجِ

(۷۰)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْمَعَارِج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورت کا نام اس کی تیسری آیت کے لفظ ذی المعارج سے ماخوذ ہے۔

مقام نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کسی وقت نازل ہوئی۔

زمانۂ نزول:۔ اس سورۃ کے موضوعات اور مضامین سابقہ سورۃ الحاقۃ سے بہت ملتے جلتے ہیں۔دونوں سورتوں کا بنیادی موضوع عذاب اور قیامت کا انذار ہے۔موضوع کے لحاظ سے دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔دونوں کے ظاہری اسلوب میں بھی بہت مشابہت ہے۔سابق سورۃ میں جزاء وسزا کے اثبات پر قسم کھائی گئی ہے۔اسی طرح اس سورۃ میں بھی اسی نوعیت کی قسم موجود ہے۔جس طرح سابق سورۃ میں اشراف قریش اور متمردین مکہ کو بار بار تنبیہ فرمائی گئی تھی کہ تم نے عذاب اور قیامت کا جو استہزاء شروع کر رکھا ہے بلکہ اسے تم اپنا رویہ بنا چکے ہو اور جس طرح ڈھٹائی کے ساتھ تم عذاب اور قیامت کا مطالبہ کرتے ہو یہ رویہ تمہارے لئے تمہاری شامت کا باعث بنے گا اور پھر اس پر نبی کریم ﷺ کو صبر کی تلقین فرمائی گئی۔یہی مضمون اس سورۃ میں بھی نہایت تاکید اور اصرار کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو آنحضرت ﷺ سے بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔اور پھر ان کا یہ مطالبہ استہزاء کی صورت اختیار کر گیا تھا۔انہیں کہا جا رہا ہے کہ جس عذاب یا جس قیامت کا تم مطالبہ کرتے اور مذاق اڑاتے ہو، اس کا آنا تو بہر حال یقینی ہے، لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ وہ تمہارے مانگنے پر نہیں آئے گی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو اس کیلئے وقت مقرر کر رکھا ہے اسی وقت اس کا ظہور ہوگا۔اور جب وہ آئے گی تو کوئی اس کو دفع کرنے والا نہیں ہوگا۔تم دراصل اس لئے جلدی مچاتے اور مذاق اڑاتے ہو کہ تم اپنے پیمانوں سے ناپ رہے ہو کہ آنحضرت ﷺ کو عذاب اور قیامت کی دھمکی دیتے ہوئے کئی سال گزر گئے ہیں۔اگر عذاب یا قیامت کو آنا ہوتا تو اب تک آ چکی ہوتی۔لیکن تمہیں کیا خبر کہ جو کائنات کا خالق و مدبر ہے اس کے یہاں فیصلے ہمارے پیمانوں کے مطابق نہیں ہوتے۔اس کے یہاں ایک دن ایک ہزار سال اور کبھی ۵۰ ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔اس کی بارگاہ اس قدر بلند ہے کہ وہاں تک رسائی کیلئے فرشتوں اور حضرت جبریل امین کو بھی پچاس ہزار سال کے برابر کا ایک دن لگتا ہے۔نبی کریم ﷺ کو نصیحت فرمائی گئی ہے کہ آپ ان کی باتوں پر صبر جمیل اختیار فرمائیں اور یہ اطمینان رکھیں کہ جس دن کو یہ تنگ نظر بہت دور خیال کر رہے ہیں ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد چند آیات میں قیامت کے دن کی تصویر پیش کی گئی ہے تا کہ انہیں اندازہ ہو کہ وہ جس کا تمسخر کے انداز میں مطالبہ کرتے ہیں وہ کوئی ہنسی اور کھیل کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ ایسا ہولناک دن ہوگا کہ اس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کے مانند سرخ اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی مانند پراگندہ ہو جائیں گے۔ وہاں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ وہاں ہر شخص اپنے بچاؤ کی فکر میں ہوگا اور وہ اس کیلئے اپنے عزیز ترین رشتوں کو بھی فدیہ میں دینے کیلئے تیار ہوگا۔ اور دوزخ کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ اس کے شعلوں کی لپٹ ان کی چمڑی ادھیڑ دے گی اور وہ ان سب کو کھینچ بلائے گی جنہوں نے دعوتِ حق سے اعراض کیا اور دولت جمع کرنے اور سینتنے میں لگے رہے۔

اس کے بعد لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اس روز انسانوں کی قسمت کا فیصلہ سراسر ان کے عقیدے اور اخلاق و اعمال کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ جنہوں نے حق سے منہ موڑا اور اور دولت کے پجاری بنے رہے وہ جہنم کے مستحق ہوں گے۔ اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف کیا، آخرت کو مانا، نماز کی پابندی کی، اپنے مال میں سائل اور محتاجوں کا حق سمجھا، اپنی شہوات کو لگام دی، اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھا اور اپنی شہادتوں پر قائم رہے۔ یہ لوگ ہیں جو جنت میں عزت کی جگہ پائیں گے۔

آخر میں مکہ کے ان لوگوں کو جو نبی کریم ﷺ کی زبان سے عذاب قیامت کا ذکر سنتے تو آپؐ کا مذاق اڑانے کیلئے چاروں طرف سے ٹوٹے پڑتے تھے، خبردار کیا ہے۔ اور ان کے زعم کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ ان کو اس دنیا میں جو عیش و آرام حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس سے بڑھ کر وہاں ان کو عیش و آرام حاصل ہوگا۔ یہی وہ زعم ہے جس کے سبب سے ان کے دلوں پر عذاب کی دھمکی اور قیامت کا تصور بہت گراں گزرتا تھا۔ انہیں آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کوشش نہ کریں، اللہ تعالیٰ جو مشرق و مغرب کا رب ہے وہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے اور پھر ان سے جواب طلبی کرنے پر بھی قادر ہے۔

آخر میں نبی کریم ﷺ کو صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے اور یہ نصیحت کی گئی ہے کہ جو لوگ سخن سازیاں کر رہے ہیں ان کو کر لینے دیجئے اور جو تمسخر اڑا رہے ہیں، انہیں تمسخر اڑا لینے دیجئے۔ وہ دن دور نہیں جس دن یہ قبروں سے نہایت تیزی سے نکلیں گے، ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان پر ذلت کی پھٹکار پڑی ہوگی۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۴۴	سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ (۷۰)	رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾
مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ
يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا
جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴿۷﴾ يَوْمَ تَكُوْنُ
السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿۹﴾ وَلَا يَسْـَٔلُ
حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ
عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ
الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾ كَلَّا اِنَّهَا
لَظٰى ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿۱۶﴾ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۷﴾ وَجَمَعَ
فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ
جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ
هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ
مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ

Marfat.com

الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾
إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ
حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ
غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْعَادُونَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٣٢﴾
وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ
يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾

رکوع: ۱۔ (مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے، جوضرور واقع ہونے والا ہے۔ ۱) کافروں کیلئے ہے کوئی اسے دفع
کرنے والانہیں۔ ۲) اس اللہ کی طرف سے جوعروج کے زینوں والا ہے۔ ۳) ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر
جاتے ہیں، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ ۴) پس اے پیغمبر! آپ صبر کریں، شائستہ اور
باوقار صبر۔ ۵) یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں۔ ۶) اور ہم اس کو نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔ ۷) جس دن آسمان
پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہو جائے گا۔ ۸) اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی مانند ہو جائیں گے۔ ۹) اور کوئی جگری دوست
اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا۔ ۱۰) حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے، مجرم تمنا کرے گا کہ کاش اس دن
کے عذاب سے چھوٹنے کیلئے فدیہ میں دے دے اپنی اولاد کو۔ ۱۱) اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو۔ ۱۲) اور اپنے اس
کنبہ کو جو اس کو پناہ دیتا رہا ہے۔ ۱۳) اور روئے زمین کے سب لوگوں کو، پھر اپنے آپ کو بچالے۔ ۱۴) ہرگز نہیں، وہ
تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہے۔ ۱۵) جو چمڑی ادھیڑ ڈالے گی۔ ۱۶) وہ ان سب کو کھینچ بلائے گی، جنہوں نے حق
سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری۔ ۱۷) اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔ ۱۸) انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے۔ ۱۹)
جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ ۲۰) اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ ۲۱)
(مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ ۲۲) جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے
ہیں۔ ۲۳) اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے۔ ۲۴) سائل اور محروم کا۔ ۲۵) اور وہ جو جزاء کے دن کی

Marfat.com

تصدیق کرتے ہیں۔ ۲۶) اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ۲۷) بیشک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے۔ ۲۸) اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ۲۹) بجز اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ عورتوں کے، سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ ۳۰) البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ۳۱) اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھنے والے ہیں۔ ۳۲) اور وہ جو اپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں۔ ۳۳) اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۳۴) یہی لوگ جنتوں میں عزت کے ساتھ رہنے والے ہوں گے۔ ۳۵)

سَأَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝۱ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝۲ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ ۝۳

(مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے، جو ضرور واقع ہونے والا ہے۔ ۱) کافروں کیلئے ہے کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں۔ ۲) اس اللہ کی طرف سے جو عروج کے زینوں والا ہے۔ ۳)

سَأَلَ کا معنی و مراد

آیت کے پہلے لفظ سَأَلَ کا معنی بعض اہلِ تفسیر نے ''پوچھنا'' کیا ہے، یعنی کسی پوچھنے والے نے پوچھا، کہ وہ عذاب جس سے آپؐ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں، وہ کب آئے گا یا وہ قیامت جس کی آپؐ ہمیں بار بار خبر دیتے ہیں وہ کب آئے گی؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان میں سوال جب کسی چیز کی تحقیق کیلئے آتا ہے تو اس کا صلہ حرف ''عن'' استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں صلہ عن استعمال نہیں ہوا بلکہ ''ب'' استعمال ہوا۔ اس صورت میں اس کا معنی مانگنا، طلب کرنا اور درخواست کرنا ہوتا ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ جب صلہ ''ب'' کے ساتھ آئے تو وہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ استعجال یا استہزاء کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ جب لوگوں کو قیامت یا عذاب سے ڈراتے تھے تو بجائے اس سے اثر قبول کرنے کے وہ یہ پوچھنا شروع کر دیتے تھے کہ وہ عذاب کہاں ہے، آتا کیوں نہیں، کہیں راستے میں لنگر انداز ہو گیا ہے کہ اب تک پہنچ نہیں پایا۔ اس طرح تمسخر اڑاتے اور اس کے جلدی لانے کا مطالبہ کرتے۔ اہلِ مکہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ معنی بھی بعید از فہم معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا رویہ آنحضرت ﷺ کو زچ کرنے کیلئے ایسا ہی تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی عذاب مانگنے والے نے آپؐ سے عذاب کا مطالبہ کیا ہے اور پھر اپنے مطالبے کو بار بار دہرایا ہے۔ نسائی نے حضرت ابنِ عباس سے روایت کی ہے کہ نضر بن حارث نے کہا تھا، اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِئْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ ''اے اللہ! اگر یہ قرآن ہی حق ہے اور آپ کی طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دوسرا عذابِ الیم بھیج دے۔'' (مظہری) اللہ تعالیٰ نے اس کو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دیا۔ بلاشبہ نضر بن حارث نے یہ مطالبہ کیا مگر وہ اس میں اکیلا نہ تھا بعض دوسرے متمردین بھی آنحضرت ﷺ کو چڑانے کیلئے بے سوچے سمجھے اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔ اور انہیں میں ایسے بھی تھے جو اس عذاب یا قیامت کا مذاق اڑاتے اور اسے جلدی لانے کا مطالبہ کرتے۔ قرآنِ کریم میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم

Marfat.com

جس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو، یہ عذاب ضرور واقع ہوگا اور تم جس کیلئے جلدی مچا رہے ہو ایک روز تم اس میں پکڑے جاؤ گے۔ لیکن تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ جس عذاب کا تم مطالبہ کر رہے ہو اس کا ہدف کافروں کے سوا اور تو کوئی نہیں ہوگا۔ تو جو مصیبت اپنے منہ سے مانگ رہے ہیں وہ تمہارے ہی سروں پر گرنے والی ہے۔ لیکن ان کی حماقت کا کیا کہنا کہ وہ اپنے انجام سے بے خبر نہایت ڈھٹائی سے اس مصیبت کا مطالبہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مزید فرمایا کہ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوتی۔ اور کسی میں ہمت نہیں کہ اس کا سامنا کر سکے۔ اور انہوں نے اپنے زعم میں جنہیں معبود بنا رکھا ہے وہ بھی اس کے سامنے بالکل بے بس ہیں۔ نہ جانے یہ لوگ آخر کس برتے پر اتنی بڑی بات زبانوں سے نکال رہے ہیں۔

تیسری آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ اس کے آنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہ عذاب اس اللہ کی جانب سے آئے گا جس کا ہر وعدہ سچا اور جس کی ہر تدبیر حتمی ہے۔ اور اس کی عظمت و شان کا حال یہ ہے کہ وہ مدارج اور زینوں کا مالک ہے۔ معارج معرج کی جمع ہے۔ عروج سے مشتق ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔ اور معرج اور معراج اس سیڑھی کو کہا جاتا ہے جس میں نیچے سے اوپر چڑھنے کیلئے بہت سے درجات ہوتے ہیں۔ اللہ ذی معارج ہے، یعنی اللہ تعالیٰ درجاتِ عالیہ والا ہے۔ اور یہ درجاتِ عالیہ اوپر نیچے سات آسمان ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بھی اس کی تائید فرماتے ہیں۔ تو جو ذات درجاتِ عالیہ کی مالک اور بے حد بلند مراتب سے متصف ہو۔ جب وہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر لے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ ﴿۴﴾

(ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ ۴)

عذاب میں تاخیر کے باب میں کوتاہیٔ فکر کی اصلاح

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والا صفات نہایت مراتب و مدارج کی مالک اور انسان کے تصور و خیال سے بھی بالا بلند ہے۔ اس کی طرف سے آنے والا عذاب یقیناً ایسا ہوگا جس کے ٹل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کئی سالوں سے اپنی قوم کو تکذیبِ رسول کے نتیجے میں آنے والے عذاب یا جزاء و سزا کے دن یعنی قیامت سے انذار فرما رہے ہیں، لیکن وہ دن آنے میں نہیں آتا اور نہ قیامت کے وقوع کے آثار دکھائی دیتے ہیں، تو آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ انسان کی کوتاہیٔ فکر کا سبب دراصل یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے پیمانوں سے ناپتا ہے۔ وقت کے بھی اس کے اپنے پیمانے ہیں۔ منٹ سیکنڈ سے لے کر صدیوں تک پھیلے ہوئے وقت کا بھی حساب انسان اپنے پیمانوں اور اپنے کیلنڈر کے مطابق کرتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی آنے والے واقعہ کو چند سال تک وقوع پذیر ہوتے نہیں دیکھتا تو اسے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ واقعہ کبھی ظہور پذیر نہیں ہوگا محض ہمیں ڈرانے کیلئے اس کا تکرار کیا جا رہا ہے۔ تو یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔ اس کے سامنے وسیع کائنات ہے۔ وہ اپنے علم کی وسعت کے مطابق اس کی مختلف سکیموں کے فیصلے فرماتا ہے۔ انسان کو سو پچاس برس کی مدت بھی بہت طویل معلوم ہوتی ہے لیکن کائناتی منصوبے لاکھوں

Marfat.com

کروڑوں سالوں کے بھی ہوتے ہیں۔ایسا ہی ایک منصوبہ وہ ہے جس کے تحت زمین پر نوع انسانی کو پیدا کیا گیا ہے۔اس کی ابتداء اور انتہا اور اس کے کام کرنے کا دورانیہ ہر چیز کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو چکا ہے۔اور یہ بات بھی طے ہو چکی ہے کہ انسانی زندگی اور خیر وشر کی یہ سکیم کب اختتام پذیر ہوگی اور اس کو ختم کرنے کی ساعتِ خاص مقرر ہو چکی ہے۔اور جو قومیں اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں ان کو کتنی مہلتِ عمل دی جائے اور کب ان کا خاتمہ کر دیا جائے، یہ بات بھی طے ہو چکی ہے۔لیکن ان میں سے ہر بات اللہ تعالیٰ کی اپنی وسعتِ علم اور اپنی وسیع تر حکمت کے مطابق ہے۔ہم چونکہ اپنے شب وروز سے اس کا اندازہ کرتے ہیں تو بے صبر ہو جاتے ہیں لیکن یہ تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ شب وروز کے پیمانوں سے چلتے ہیں اور اس کا حال یہ ہے کہ سورۃ الحج کی آیت ۴۷ میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا کہ یہ لوگ تم سے عذاب کیلئے جلدی مچا رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ منکرین کے انکار کا سبب ہماری گزارش کے مطابق ان کی کوتاہی فکر ہے اور ماننے والوں کی بعض دفعہ بے صبری بھی کوتاہی فکر ہی کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فیصلے اس کے اپنے پیمانوں کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔یہ جو کچھ کہا گیا یہ اس صورت میں ہے کہ یوم سے مراد عام یوم لیا جائے۔اور آیت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قدر بلند مراتب کا مالک اور انسانوں سے اس قدر وراء الورا ہے کہ فرشتے اور جبرائیل امین بھی اس راہ کے مراحل طے کرنے کیلئے اس قدر لمبا سفر طے کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر ہم اس سفر کو طے کرنے کی کوشش کریں تو پچاس ہزار سال لگ جائیں۔یہاں روح سے مراد حضرت جبرائیل امین ہیں۔وہ اگرچہ ملائکہ میں شامل ہیں لیکن ملائکہ کے بعد ان کا ذکر عام کے بعد خاص کی نوعیت کا ہے جو ان کی عظمتِ شان پر دلالت کرتا ہے۔

پچاس ہزار سال کا مفہوم

یہ بات یاد رہے کہ پچاس ہزار سال کا ایک دن تو یقیناً ایک حقیقت ہے جس کا انکار کفر ہے لیکن اس حقیقت کے ادراک کی صورت کیا ہے اور ہم اس کو اپنے خانۂ فکر میں کس طرح سجا سکتے ہیں تو یہ بات انسانی عقل اور شعور سے بلند ہے۔اس کا تعلق آیاتِ متشابہات سے ہے جس کا ماننا ضروری ہے لیکن جس کی حقیقت جاننے کے درپے ہونا گمراہی کا راستہ اختیار کرنے کے مترادف ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو ذات مخلوقات کی دسترس سے اس قدر بلند ہے کہ فرشتے اس کی بارگاہ تک پہنچنے کیلئے پچاس ہزار سال سفر کرتے ہیں۔وہ کائنات کے معاملے سے بالکل بے خبر ہے، ایسا ہرگز نہیں۔یہ حقیقت ہے کہ مخلوق اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی، لیکن وہ خود انسانوں کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔وہ ہر ایک کے معاملات کو دیکھتا اور نگرانی کرتا ہے۔فرشتے بھی اس کی نگرانی میں ہیں۔ ہر ایک کی ضروریات نہ صرف اس کی دسترس میں ہیں بلکہ اس کی عطا وبخشش کی صورت بھی اختیار کرتی رہتی ہیں۔اور ہر ایک کے معاملے کے ساتھ ساتھ اس کے اعمال بھی اس کی نگاہوں میں ہیں۔

بعض اہلِ علم نے یوم سے مراد یوم القیامت لیا ہے۔یعنی اس عذاب کا وقوع قیامت کے روز ہوگا اور یہ وقوع یقینی اور حتمی ہے۔اور یہ قیامت کا دن وہ ہے جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس دن

Marfat.com

کے بارے میں پوچھا، تو آپؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ یہ دن مومن پر اتنا ہلکا ہوگا کہ ایک نماز فرض ادا کرنے کے وقت سے بھی کم ہوگا۔ (مظہری) حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت میں یہ وقت ظہر اور عصر کے درمیان کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ ان روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن کا یہ طول کہ یہ پچاس ہزار سال کا ہوگا ایک اضافی عمل ہے۔ کفار کیلئے اتنا ہی دراز ہوگا اور مومنوں کیلئے اتنا ہی مختصر ہوگا۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سورۃ تنزیل السجدہ میں ایک دن کو ہزار سال کا دن قرار دیا گیا ہے۔ اور پیشِ نظر آیت میں پچاس ہزار سال کا۔ دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اس لئے کہ دنوں میں طول کا اختلاف دراصل مختلف گروہوں کے اعتبار سے ہے۔ کسی کیلئے پچاس ہزار سال اور کسی کیلئے ایک ہزار سال اور مومنوں کیلئے ایک نماز کے وقت کے مطابق۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝

(پس اے پیغمبر! آپ صبر کریں، شائستہ اور باوقار صبر۔ ۵)

آنحضرت ﷺ کو صبر کی تلقین

مخالفین جس طرح عذاب کے مطالبے میں جلدی مچا رہے تھے بلکہ انہوں نے اسے تمسخر کا ذریعہ بنا لیا تھا ان کے مقابلے میں آنحضرت ﷺ کو جو رویہ اختیار کرنا چاہئے اس کے بارے میں ہدایت دی گئی ہے کہ آپؐ ان بدبختوں کی جلد بازی اور استہزاء کے مقابلے میں نہایت شائستہ اور باوقار انداز اختیار کریں۔ ان کی شرافت سے گری ہوئی حرکتوں اور ناشائستہ رویئے پر آپؐ برہم ہو کر نہ تو کوئی ایسا اقدام کریں جو آپ کی شان اور بلند مقام کے مطابق نہ ہو۔ اور نہ کسی ایسی کمزوری کا اظہار کریں جو آپ کے عظیم منصب کیلئے نقصان دہ ہو، بلکہ آپ دعوت وتبلیغ کی ذمہ داریوں کو اس طرح انجام دیتے رہیں کہ دیکھنے والا محسوس کرے کہ اس عظیم ذاتِ گرامی کو اپنے موقف کی سچائی پر اس حد تک یقین ہے اور اپنے اللہ پر اس حد تک بھروسہ ہے کہ ان چھوٹے بڑے مخالفین کی اندھی مخالفت کا نوٹس لینا بھی انہیں پسند نہیں، بلکہ وہ اپنی گہری بصیرت کی بنیاد پر وثوق رکھتے ہیں کہ مخالفین کی مخالفت اور ان کی احمقانہ باتیں بالآخر صداقت اور حقانیت کے سامنے سپر انداز ہو جائیں گی۔ بظاہر مخالفین کے پاس قوت کے تمام سروسامان موجود ہیں۔ وہ آپ کو اور آپ کی دعوت کو ہر طرح کا نقصان پہنچانے پر قادر ہیں، لیکن آپ انہیں اسی بلند مقام اور اسی پر اعتماد لہجے میں خطاب فرمائیں جو کائنات کے خالق و مالک کے سفیر اور نمائندہ کی شان کے لائق ہو، تاکہ ان کے اندر اگر کہیں یہ جذبہ موجود ہو کہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قوت کے مقابلے میں آنحضرت ﷺ کوئی کمی بیشی کرنے پر تیار ہو جائیں تو انہیں یقین آ جائے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف بلانے والے کسی کمزوری کا شکار نہیں ہوا کرتے۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيبًا ۝

(یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں۔ ٦) اور ہم اس کو نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔ ۷)

Marfat.com

قیامت یا عذاب کے دور یا قریب ہونے کا مفہوم

آیتِ کریمہ کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ لوگ اس عذاب یا قیامت کو جس سے انہیں ڈرایا جارہا ہے بہت دور خیال کررہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عذاب جس ہمہ گیر تباہی کا نام ہے اور قیامت جس طرح ایک نئی دنیا کے برپا ہونے کا نام ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ جس کی وسعت اور عظمت کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ دنیا کا دستور یہ ہے کہ جب کوئی بڑا واقعہ پیش آنے والا ہو تو کچھ نہ کچھ اس کے آثار پہلے ظاہر ہونے لگتے ہیں، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ عذاب یا قیامت کی کوئی پیشگی علامت دکھائی نہیں دے رہی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر قائم اور ہر عمل اپنے طریقے سے جاری وساری ہے۔ زندگی کی گاڑی نہایت ہمواری سے چل رہی ہے۔ کوئی ایسی چیز محسوس نہیں ہو رہی جس سے اندازہ کیا جاسکے کہ کسی بہت بڑے واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے دن قریب آ گئے ہیں۔ اس لئے وہ یہ کہتے تھے کہ اولاً تو قیامت آئے گی نہیں اور اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اس کا وقوع ضرور ہوگا، جب بھی یہ کسی قریب زمانے کا نہیں، بہت دور زمانے میں پیش آنے والا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ پروردگار نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ لوگ درحقیقت ہر چیز کو اپنی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وہ حقائق جن کا تعلق عالمِ غیب سے ہے لیکن تاریخ نے بار بار ان کے ظہور کی گواہی دی ہے انہیں دیکھنا بصارت سے نہیں، بصیرت سے ممکن ہے۔ اور یہ لوگ صرف بصارت کے عادی ہیں، بصیرت سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس صورتحال میں قیامت کا دکھائی دینا ان کیلئے کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ ان کی بصارت کا تیز ہونا اور انہیں بصیرت کا عطا ہونا ایمان کے نور کے بغیر ممکن نہیں۔ اور یہ لوگ اس سے محروم ہیں اور بغیر بصیرت کے بصارت ان حقائق کا ادراک دنیا میں نہیں، آخرت میں کرے گی جبکہ اس بصارت کو تیز کردیا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا کہ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ”پس آج تو تیری نگاہ بہت تیز ہے۔“ لیکن صاحبِ بصیرت آج بھی اپنی بصیرت سے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روشنی میں وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے دیکھنے کا حکم دیا ہے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

اس لئے فرمایا گیا ہے کہ وہ اس عذاب یا قیامت کو بہت دور دیکھتے ہیں اور ہم اس کو بالکل قریب دیکھتے ہیں۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ آیتِ کریمہ میں قریب و بعید کے جو دو لفظ استعمال ہوئے ہیں یہ مسافت یا زمانے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس سے بعید از امکان یا بعید از وقوع مراد ہے۔ یعنی یہ لوگ تو قیامت کے وقوع بلکہ امکان کو بھی بعید سمجھ رہے ہیں، یعنی ان کی عقل اسے تسلیم نہیں کرتی اور یقین تو بہت دور کی بات ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کا وقوع یقینی ہے۔

یَوْمَ تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُھْلِ ۝۸ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ ۝۹

(جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہوجائے گا۔ ۸) اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی مانند ہوجائیں گے۔ ۹)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ اَلْمُھْل ...... مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ کیا ہے، پگھلا ہوا تانبا۔ اور بعض اسے ”پگھلی ہوئی چاندی“ قرار دیتے ہیں۔ اور بعض اہلِ علم کے نزدیک اس آیتِ کریمہ میں یہ لفظ تیل اور تیل کی تلچھٹ کے معنی میں آیا ہے۔

Marfat.com

عِهْنِ ...... کے معنی اُون کے ہیں۔لیکن سورۃ القارعہ میں پروردگار نے اس میں ایک لفظ کا اضافہ فرمایا ہے۔ اَلْمَنْفُوْش. تو اس صورت میں عِهْنِ سے مراد دھنی ہوئی اُون ہوگی۔

قیامت کی منظر کشی

جولوگ وقوعِ قیامت کو بعید از عقل سمجھتے ہیں اور بصیرت سے محروم ہونے کے باعث دیکھنے پر اصرار کر رہے ہیں اور دکھائی نہ دینے کی صورت میں انکار کرنے پر تل گئے ہیں۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے فیصلے کے تحت یہ تو ممکن نہیں کہ انہیں قیامت دکھا دی جائے۔ البتہ ان کو توجہ دلانے اور فکر مند کرنے کیلئے قیامت کی ایک تصویر کھینچی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقوعِ قیامت کے وقت کیسی ہلچل مچے گی اور کائنات کی بڑی سے بڑی مخلوق پر کس طرح شکست وریخت کا عمل جاری ہوگا۔ آسمان جیسی چیز جس میں کہیں کوئی دراڑ یا شگاف نظر نہیں آتا وہ تباہی کی نذر ہو جائے گا اور شاید جہنم کے شعلوں کے باعث اس کا رنگ سرخ ہو جائے گا۔ اور رنگ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ وہ اس طرح بکھر جائے گا جیسے تیل کی تلچھٹ ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ پہاڑ جنہیں اہلِ عرب لازوال سمجھتے تھے، وہ دھنی ہوئی اُون کی مانند پراگندہ کر دیئے جائیں گے۔ جب قد وقامت اور جسامت میں ایسی عظیم مخلوقات کی تباہی کا عالم یہ ہوگا تو باقی کائنات کے بارے میں تصور کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ ایسی تباہی مچے گی کہ کائنات کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔ آج جو لوگ اپنے قلعوں اور گڑھیوں پر ناز کرتے ہیں اور جنہیں اپنے طاقت کے مختلف مظاہر پر بڑا بھروسہ ہے ان میں سے ہر چیز ایسی تباہی کا شکار ہوگی جس سے دیکھنے والے کا پِتہ پانی ہو جائے گا۔ ہر چیز کی ہلاکت اور بربادی کے بعد ایک بالکل نیا جہان نئے نوامیس وقوانین کے ساتھ ظہور میں آئے گا۔

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ
بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ
يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿۱۶﴾

(اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا۔ ۱۰) حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے، مجرم تمنا کرے گا کہ کاش اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کیلئے فدیہ میں دے دے اپنی اولاد کو۔ ۱۱) اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو۔ ۱۲) اور اپنے اس کنبہ کو جو اس کو پناہ دیتا رہا ہے۔ ۱۳) اور روئے زمین کے سب لوگوں کو، پھر اپنے آپ کو بچا لے۔ ۱۴) ہرگز نہیں، وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپیٹ ہے۔ ۱۵) جو چمڑی ادھیڑ ڈالے گی۔ ۱۶)

قیامت کی مزید تفصیل

احوالِ قیامت کے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ اس دن کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ ہر شخص پر نفسی نفسی کی کیفیت طاری ہوگی۔ جن دو شخصوں میں باہم دیگر محبت واعتماد کا رشتہ تھا اور ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے اور جن کی محبتیں اور نفرتیں مشترک رہیں، اور جن کے دل ہمیشہ ایک ساتھ دھڑکتے رہے، وہ بھی ایک دوسرے سے آنکھیں پھیر لیں گے۔ کوئی دوسرے کا حال پوچھنے کا

Marfat.com

روادار نہ ہوگا۔اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ دوست ایک دوسرے سے دور ہوں اور کوئی بڑی مصیبت آ پکڑے تو بعض دفعہ محبت کی شدت دوسرے کا حال پوچھنے کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔لیکن یہاں تو حال یہ ہوگا کہ دوست دوستوں کو دکھائے جائیں گے، یعنی عذاب میں جلنا تڑپنا اور مصیبت میں بلبلانا ایک دوسرے کے سامنے ہوگا۔لیکن ان کے اندر پھر بھی حمیت و حمایت کا جذبہ بیدار نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت کی ہولنا کی نے سب جذبوں پر غلبہ پالیا ہوگا۔

وہ جرائم پیشہ لوگ کہ جرم جن کے رگ و پے میں اتر جاتا ہے، وہ بڑی سے بڑی تکلیف کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے نہیں۔لیکن قیامت کے روز حال یہ ہوگا کہ بڑے سے بڑا مجرم بھی تمنا کرے گا کہ اے کاش، آج اگر بڑے سے بڑا معاوضہ دے کر بھی اس عذاب سے چھوٹنے کا کوئی امکان ہوتا تو میں اس کیلئے اپنے قریب ترین عزیزوں کو بھی فدیہ میں دینے سے گریز نہ کرتا۔باپ اپنے بیٹوں کو فدیہ میں دینے کی تمنا کرے گا، شوہر اپنی بیوی، بھائی اپنے بھائی اور صاحبِ کنبہ اپنے کنبہ وخاندان کو، بلکہ زمین کی ساری مخلوق کو فدیہ اور معاوضہ میں دے کر اپنی جان بچانے کی تمنا کرے گا۔لیکن یہ تمنا، تمنا ہی رہے گی، کیونکہ اس دن نہ کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا، نہ کوئی فدیہ۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ کسی کے پاس فدیہ دینے کیلئے کچھ نہیں ہوگا۔یعنی نہ فدیہ دینے کا امکان ہوگا اور نہ فدیہ کا سروسامان ہوگا۔ایک اپنی جانِ ناتواں کے سوا، آدمی کے پاس کچھ نہیں ہوگا۔اور اس جان کو اس قیامت کا سامنا ہوگا جس کا تصور بھی دہلا دینے کیلئے کافی ہے۔کیونکہ قیامت کا عذاب ایسا نہیں جس میں قیل وقال اور گفت وشنید کی کوئی گنجائش ہو۔وہ تو ایسی بھڑکتی ہوئی آگ ہے کہ جس مجرم کو اس کی ایک لپٹ بھی چھو جائے اور ایک شعلہ بھی اس تک پہنچ جائے تو وہ اس کی چمڑی ادھیڑ دینے کیلئے کافی ہے۔

اِنَّھَا لَظٰی ...... اِنَّھَا، میں ضمیر کا مرجع وہی عذاب ہے جس کا ذکر ہو رہا ہے اور یہ عذاب چونکہ آگ کے ذریعے ہوگا، اس لئے ضمیر کو مونث لایا گیا ہے۔

لَظٰی ...... کا معنی خالص شعلہ، جو آمیزش کے بغیر ہو۔

شَوٰی ...... شواۃ کی جمع ہے۔جس کے معنی سر کی کھال کے بھی ہیں اور ہاتھ پاؤں کی کھال کے بھی۔اور اسے سر اور اطرافِ بدن کی کھال کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

نَزَّاعَۃ ...... کا معنی ہے کھینچ لینے والی۔مفہوم آیت کا یہ ہے کہ وہ آگ ایسی شدید ہوگی کہ اس آگ کے شعلوں کی لپٹ دور ہی سے مجرموں کی کھلڑی کھینچ لے گی۔

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی ﴿۱۷﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی ﴿۱۸﴾

(وہ ان سب کو کھینچ بلائے گی، جنہوں نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری۔ ۱۷) اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔ ۱۸)

آج بڑے چھوٹے کافروں کا حال یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے پیغمبر، اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دیتے، اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف بلاتے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔لیکن وہ پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں، دعوت کی طرف توجہ دینے کی بھی زحمت نہیں کرتے، پلٹ کر کبھی نہیں پوچھتے کہ آخر تم کہتے کیا ہو۔اور منافقین کا حال یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جب انفاق کی دعوت دی جاتی ہے تو بجائے اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کے، وہ مال کو مزید بڑھانے اور جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ہر غلط سلط

Marfat.com

طریقے سے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتے ہیں اور مال کو سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی مال ہماری اصل قوت ہے اور یہی ہماری عیش و عشرت کی ضمانت ہے۔ اور انہیں یہ بات کسی طرح بھی دماغ میں نہیں آتی کہ مال خرچ کرنے سے بڑھتا ہے اور جمع کرنے سے کم ہوتا ہے۔

راہِ حق سے گریز اور حُبِ مال کو ایک ساتھ ذکر کرنے کا سبب

جو لوگ راہِ حق سے گریز کرتے اور مال کو جمع کرنے اور بڑھانے میں شب و روز محنت کرتے ہیں، ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ کرنے کی شاید وجہ یہ ہے کہ مال سے محبت جو انسان کو بخیل بنا دے اور اسے ضرورت کی بجائے مقصدِ زندگی کی شکل دے دے اور اسے زندگی کا سب سے بڑا ہدف بنا دے، اس طرزِ زندگی کو اختیار کرنے والے لوگ ہی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک سینے میں دو دل پیدا نہیں کیے، اسی طرح ایک دل میں برابر سطح کی دو محبتیں نہیں رہ سکتیں۔ اس بات کا امکان تو ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل کا اصل سرمایہ ہو اور باقی محبتیں اس کے تابع رہ کر اس سے غذا پاتی رہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں اللہ اور غیر اللہ سے برابر محبت رکھتا ہوں۔ چنانچہ جو شخص بھی اس مرض میں مبتلا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف کبھی متوجہ ہونے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ اور اشرافِ قریش کا بھی اصل مرض یہی تھا۔ چنانچہ انہیں توجہ دلاتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ کے دین سے تمہاری روگردانی بے توجہی اور بے نیازی اور مال و دولت سے غائت درجہ التفات تمہارے لئے دولت و ثروت کی علامت بنے ہوئے ہیں، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قیامت کے عذاب کی آگ ان امراض میں مبتلا لوگوں کو دور ہی سے دیکھ کر پہچانے گی اور انہیں اپنی طرف آنے کیلئے پکارے گی اور اس کی پکار اس طرح کی نہیں ہوگی کہ جس سے اعراض کیا جاسکتا ہو، بلکہ اس کی پکار میں ایک گرفت ہوگی کہ ایسے مجرم اس پکار کے ساتھ ہی کھنچتے چلے جائیں گے اور پھر ان پر جو گزرے گی اس کا تصور بھی آج کرنا شاید آسان نہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿١٩﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿٢٠﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿٢١﴾

(انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے۔ ۱۹) جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ ۲۰) اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ ۲۱)

هَلُوْعٌ کا مفہوم

هَلُوْعٌ ...... کے لفظی معنی حریص، بے صبر، کم ہمت اور تھڑدلے کے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آیت میں هَلُوْعٌ سے مراد وہ شخص ہے جو مالِ حرام کی حرص میں مبتلا ہو۔ اور حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد بخیل آدمی ہے۔ اور مقاتلؒ نے کہا کہ تنگ دل، بے صبر آدمی مراد ہے۔ اور یہ سب معانی متقارب ہیں۔ اور هَلُوْعٌ کے مفہوم میں سب داخل ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس کا مفہوم واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ انسان کی کم ہمتی اور بے صبری کا یہ عالم ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجاتی ہے تو صبر سے کام نہیں لیتا۔ اور جب اسے مال و دولت یا آرام و راحت کا کوئی سامان مل جاتا ہے تو اس میں بخل کرتا ہے۔ بے صبری سے مراد تکلیف کا وہ اظہار نہیں جو کم و بیش ہر زبان سے ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ جزع و فزع ہے جو حدودِ شرع سے باہر ہو۔ اور اس طرح بخل سے مراد فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی ہے۔

Marfat.com

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ جن برائیوں، کوتاہیوں کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔ اگر انسان ان برائیوں پر پیدا کیا گیا ہے، یعنی یہ عیب اس کی تخلیق میں رکھے گئے ہیں تو پھر اس میں مبتلا شخص کا کیا قصور ہے کیونکہ وہ اپنے تخلیقی داعیات سے تو انحراف نہیں کر سکتا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد انسانی فطرت اور جبلت میں رکھی گئی استعداد اور مادہ ہے۔ اور استعداد انسان میں صرف برائی اور شر کیلئے نہیں رکھی گئی بلکہ خیر اور صلاح کی بھی رکھی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی اسے حواس اور ہوش وخرد عطا فرما کر قوتِ امتیاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ اور وحی الٰہی کے نزول اور انبیائے کرام کی بعثت نے اس معاملے کو اور آسان کر دیا ہے۔ اگر انسان اس ہدایت اور رہنمائی سے فائدہ اٹھائے تو اس کیلئے خیر وصلاح اور شر وفساد کے مادوں میں اعتدال پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ انسان نے جب بھی کبھی صدقِ دل اور پوری توانائی سے اس راستے پر قدم اٹھایا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اسے کامیابی عطا فرمائی ہے بلکہ اس کا وعدہ تو یہ ہے کہ جو بھی خیر وصلاح کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور ہماری طرف آنا چاہتا ہے تو ہم اپنے راستے اس کیلئے کھول دیتے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے ہر علاقے کا انسان ہر طرح کی برائی میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا تھا اور اپنی بری عادتوں پر اس حد تک جامد اور متصلب تھا کہ دیکھنے والا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان لوگوں میں بھی کبھی تبدیلی کی جوت جگائی جا سکتی ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی مساعی جمیلہ اور آپؐ کی دعوتِ بالغہ نے ان کے اندر جو تبدیلی پیدا فرمائی اور ایمان لانے والوں نے جس طرح خود اپنے اندر انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی، اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی اعتبار سے بالکل مردہ تھے لیکن اس دعوت وتربیت نے ان کو مسیحا بنا دیا۔

إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾

(مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ ۲۲) جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں۔ ۲۳)

زندگی میں بے اعتدالی سے محفوظ لوگ اور ان کی صفات

سابقہ آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہر تکلیف میں بلبلا اٹھتے ہیں اور ہر خوشحالی پر مارِ گنج بن کر بیٹھ جاتے ہیں، ان کی زندگی چونکہ اعتدال کے جوہر سے خالی ہوتی ہے اس لئے ان کا کوئی رویہ پائیدار نہیں ہوتا بلکہ حالات کی تبدیلی سے بدلتا رہتا ہے۔ اب اس آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ زندگی کے اس بہت بڑے عیب اور ناہمواری سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کی صفات آگے آ رہی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے لوگ وہ ہیں جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق میں ایک ایسی مضبوطی اور استقامت پیدا ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے متضاد رویوں میں ٹھیک اس راستے پر چلتے ہیں جو راستہ اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ نماز ان کے اندر چونکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا ایک جذبہ پیدا کر دیتی ہے اور غیر اللہ کے ہر اس راستے سے جو اللہ تعالیٰ کے راستے سے متصادم ہو یکسو کر دیتی ہے۔ اس لئے بے اعتدالی اور ناہمواری ان کی زندگیوں میں داخل نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس مقصد کے حصول کیلئے ایک صفت کا پیدا کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا نمازوں کی مداومت بھی رکھتا ہو۔

Marfat.com

پہلی صفت مداومت کا مفہوم

مداومت کے متعدد مفاہیم ہیں، جن میں سے ایک مفہوم یہ ہے کہ نماز ان لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے تعلق اور زندگی میں اعتدال پیدا کرتی ہے جو ہر قسم کی سستی، آرام طلبی، مصروفیت یا دلچسپی کو بہانہ بنا کر نماز چھوڑنے والے نہ ہوں، بلکہ ان کا حال یہ ہو کہ جب نماز کا وقت آ جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے مالک کی عبادت بجالانے کیلئے کھڑے ہو جاتے ہوں۔ احادیثِ مبارکہ میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں آپ کی ازواجِ مطہرات بیان فرماتی ہیں کہ آپؐ اپنے اہلِ خانہ سے نہایت محبت بھرے انداز میں گفتگو فرمارہے ہوتے کہ اذان کی آواز آ جاتی، تو آپؐ اس طرح نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اہلِ خانہ سے یوں لاتعلق ہو جاتے جیسے وہ کسی کو پہچانتے ہی نہ ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی مداومت کے مفہوم کا معنی ہر چیز پر نماز کے تصور کا غالب آ جانا ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا وہ ہو سکتا ہے جو حضرت عقبہ بن عامرؓ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ پورے سکون اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، کوے کی طرح ٹھونگیں نہیں مارتے اور نماز کے دوران اِدھر اُدھر التفات بھی نہیں کرتے۔

اور تیسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ نہیں ہوتے کہ انہیں عام حالات میں ذکرِ الٰہی یا نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ لیکن ان پر کوئی مصیبت آ جائے تو بڑے نمازی اور بڑی لمبی لمبی دعائیں کرنے والے بن جاتے ہیں۔ کوئی امتحان درپیش ہو تو امتحان میں کامیابی کیلئے نمازوں کی پابندی بھی شروع ہو جاتی ہے اور دعائیں بھی خوب دل لگا کے مانگی جاتی ہیں۔ کاروبار میں کوئی نقصان ہو جائے تو اس کی تلافی کیلئے ان کا خشوع وخضوع دیدنی ہوتا ہے۔ اور جب وہ وقت گزر جائے اور معاملات درست ہو جائیں تو وہ کان جھاڑ کے اس طرح نمازوں سے الگ ہو جاتے ہیں، گویا خدا سے نہ کبھی ان کو کوئی سابقہ پڑا ہے اور نہ آئندہ کبھی پڑنے والا ہے۔ ایسی نماز تو بجائے خود عدمِ توازن کا مظہر ہے۔ وہ زندگی کے عدمِ توازن اور ناہمواری کو کیونکر ختم کر سکتی ہے۔ پروردگار جن نمازوں کو مثمر بناتے ہیں اور آخرت میں جو بہت بڑے اجر وثواب کا باعث ہوں گی وہ، وہ نمازیں ہیں جو پابندی اور تسلسل کے ساتھ پڑھی جائیں۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور آپؐ کے عمل سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس عمل میں برکت ہوتی ہے جو اگرچہ مقدار میں زیادہ نہ ہو لیکن پابندی کے ساتھ ہمیشہ اس کو انجام دیا جائے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آنحضرت ﷺ کے عمل کو جھڑی سے تشبیہ دی ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ آپؐ کا عمل وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتا تھا کہ جس طرح ایک زوردار بارش ہو جائے اور اس کے بعد طویل عرصے کیلئے ابر غائب ہو جائے، تو اس بارش کا فصلوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ فصلیں سوکھ کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس تھوڑی بارش بھی جھڑی کی شکل میں قائم ودائم رہے تو وہ کھیتوں کو شاداب رکھتی اور فصلوں بارآور کرتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾

(اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے۔ ۲۴) سائل اور محروم کا۔ ۲۵)

Marfat.com

دوسری صفت انفاق

ایسے لوگوں کی دوسری صفت ایک ایسی بات کو بیان فرمایا گیا ہے جو دین کے دوسرے بازو کی حیثیت رکھتی ہے۔یعنی دین کا ایک بازو اگر نماز ہے تو دوسرا بازو انفاق ہے۔اوران دونوں کو دین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اور پھر یہی دونوں بنیادی صفات جہاد کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں راست روی اس وقت آتی ہے جب اس کا تعلق ایک طرف اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہو جائے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے بندوں سے۔اور یہی دینِ اسلام کا اصل مطالبہ اور اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔نماز بندے کو خدا سے جوڑتی ہے۔ اور انفاق سے بندے کا تعلق نوعِ انسانی سے صحیح معنی میں پیدا ہوتا ہے۔

آیت میں حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ کے الفاظ آئے ہیں۔یعنی وہ لوگ اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر و متعین حق سمجھتے ہیں۔اس سے بعض اہلِ تفسیر نے یہ سمجھا ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے۔کیونکہ زکوٰۃ ہی ایک ایسا عطیہ ہے جس کا نصاب اور جس کی مقادیر پروردگار نے مقرر فرمائی ہیں۔اصولی طور پر تو یہ بات صحیح ہے لیکن اس آیت میں زکوٰۃ مراد لینا اس لئے صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ زکوٰۃ کا نظام ایک معین شرحِ نصاب کے ساتھ مدنی دور میں نافذ ہوا اور یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے۔البتہ اس سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حصہ طے کر رکھا ہے جسے وہ ان کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔یہی معنی حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ، حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ، مجاہدؒ، شعبیؒ اور ابراہیم نخعیؒ نے بیان کئے ہیں۔

لِلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ...... سائل سے مراد پیشہ ور بھیک مانگنے والا نہیں، بلکہ وہ حاجت مند شخص ہے جو کسی سے مانگے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔البتہ یہ بات جاننا ضروری ہے کہ ہر ہاتھ پھیلانے والا پیشہ ور نہیں ہوتا۔اب چونکہ مانگنے والوں کی کثرت ہوگئی ہے جو امتِ مسلمہ کیلئے نہایت شرمناک بات ہے۔اس لئے مدد دینے والے کو تھوڑا بہت تردد ضرور کرنا چاہئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ حقیقت میں ضرورت مند لوگ رہ جائیں اور پیشہ ور لے جائیں۔لیکن اس میں بہت جستجو کرنا بھی اچھا نہیں۔اور کسی کو جھڑکنا یا ملامت کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔قرآن وسنت نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

محروم سے مراد ایسا شخص ہے جو بیروزگار ہو یا اس کا روزگار اس کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہو۔یا کسی حادثے یا آفت کا شکار ہو کر محتاج ہو گیا ہو۔لیکن وہ سوال کرنے سے گریز کرتا ہو۔اس کی عزتِ نفس ناداری کے باوجود اسے خودداری مجروح کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔خاص طور پر وہ مصیبت زدہ جو پہلے صاحب حیثیت رہ چکا ہو، پھر گردشِ روزگار کے ہاتھوں نانِ شبینہ کا محتاج ہو گیا ہو۔یہ لوگ جن کا ذکر ہو رہا ہے ایسے محروم لوگوں کی آگے بڑھ کر مدد کرتے ہیں، انہیں خود تلاش کرتے ہیں۔وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ وہ ان سے مدد مانگیں بلکہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ ایسے خوددار لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کئے بغیر ان کی مدد کریں۔

وَالَّذِيۡنَ يُصَدِّقُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝۲۶ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّهِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ۝۲۷

(اور وہ جو جزاء کے دن کی تصدیق کرتے ہیں۔ ۲۶) اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ۲۷)

Marfat.com

تیسری صفت روزِ جزاء کا یقین

جولوگ سائلوں اور محروموں کا اپنے مال میں ایک متعین حصہ رکھتے ہیں ان کے اس عمل کا محرک اور سبب یہ ہے کہ وہ روزِ جزاء پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ تصدیق کا تعلق دل کے یقین سے ہوتا ہے۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے۔ اپنے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہے۔ مال کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا کہ تم نے اس کا حق ادا کیا تھا یا نہیں۔ چنانچہ یہ محرک انہیں ہمیشہ سائلوں اور محروموں کیلئے مدد کرنے پر انگیخت کرتا رہتا ہے اور یہ بات بھی ہمیں قرآنِ کریم سے معلوم ہوتی ہے کہ جولوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا یقین نہیں رکھتے اور روزِ جزاء کو محض ایک افسانہ سمجھتے ہیں، وہ کبھی غریبوں اور مسکینوں پر اپنا مال خرچ کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ سورۃ الماعون میں ارشاد فرمایا گیا ہے اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ○ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ○ ''بھلا دیکھا تم نے اس کو جو روزِ جزاء کو جھٹلاتا ہے، وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔''

دوسری آیتِ کریمہ میں تصدیق بِیَوْمِ الدِّیْنِ کا نتیجہ بیان فرمایا ہے۔ چونکہ وہ لوگ روزِ جزاء کا یقین رکھتے ہیں تو اس یقین نے ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف پیدا کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ اگر ہم اپنے مال میں مستحقین کے حقوق ادا کرنے سے قاصر رہے تو اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے اور اس کے عذاب کا کیسے سامنا کر سکیں گے۔ قرآنِ کریم میں سورۃ الدہر کی آیت ۷ تا ۱۰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ (وہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اپنے نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہے اور مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس کی کمیابی یا اس کے ضرورت مند ہونے کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف رضائے الٰہی کیلئے کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکر گزاری کے خواہاں نہیں ہیں۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت منحوس قسم کے دن کا اندیشہ رکھتے ہیں۔)

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۲۸

(بیشک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے۔ ۲۸)

نیک بندوں کے طرزِ فکر کی تعریف

اس آیتِ کریمہ میں ان نیک بندوں کے طرزِ فکر کی تعریف فرمائی گئی ہے، یعنی ان کا اپنے رب کے عذاب سے ڈرنا اور اس سے بچنے کیلئے غریبوں، یتیموں، مسکینوں اور قیدیوں کو کھلانا پلانا اور ان کی مدد کرنا، یہ ان کی اس قابلِ تعریف فکر کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں بے خوف رہا جا سکتا ہو۔ وہ کسی وقت اور کسی حال میں بھی نازل ہو سکتا ہے۔ اور پھر وہ ایسا ہمہ گیر اور شدید عذاب ہے کہ جس سے بچاؤ کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ
غَيْرُمَلُوْمِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿٣١﴾

(اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ۲۹) بجز اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ عورتوں کے، سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ ۳۰) البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ۳۱)

چوتھی صفت کردار کی پاکیزگی

نماز، انفاق اور خشیتِ الٰہی کے بعد اب ان نیک بندوں کی اخلاقی بلندی اور کردار کی پاکیزگی کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ یعنی وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یعنی جسم کے وہ حصے جنہیں چھپانا ضروری ہے۔ انہیں کھولنے اور عریاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ نہ وہ دوسروں کے ستر پر نگاہ ڈالتے ہیں اور نہ اسے برداشت کرتے ہیں کہ کوئی ان کے ستر پر نگاہ ڈالے۔ آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"کوئی شخص مجھے عریاں حالت میں دیکھے یعنی اس کی نظر میرے ستر پر پڑے اس سے بہتر ہے کہ مجھے آسمانوں سے گرا دیا جائے اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں"۔

اور یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مرد کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے اور عورت کا ستر ہاتھ پاؤں اور چہرے کے علاوہ سارا جسم ہے۔ اب اس کی شکایت کس سے کی جائے کہ حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ کی بیٹیاں مختلف کھیلوں میں شریک ہو کر ٹی وی پر اپنے جسم کی نمائش کرتی ہیں اور ڈراموں اور کمرشل میں کام کرنے والی بہو بیٹیاں اپنے ناز و انداز، اپنے جسم کے مختلف زاویے اور اپنی اداؤں سے دنیا کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ ہم کرسٹن کیلر کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں، ہمارا فاطمہ اور عائشہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر تو بعض دفعہ بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔

بانجھ ہو جائیں زمینیں لڑکیاں پیدا نہ ہوں
اے خدا شہناز گل سی بیٹیاں پیدا نہ ہوں
پھول پیدا ہوں مگر شاخوں کی آرائش رہیں
لڑکیاں پیدا ہوں لیکن تتلیاں پیدا نہ ہوں

اور جہاں تک مردوں کا تعلق ہے انہوں نے فری سٹائل کشتیوں، کبڈی اور بعض دوسری کھیلوں سے امتیاز ہی ختم کر ڈالا ہے کہ مرد کا بھی کوئی ستر ہوتا ہے۔

دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ وہ اپنی عصمت و عفت کو محفوظ رکھتے ہیں۔ یعنی صنفی معاملات میں آزادی نہیں برتتے۔ شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اس کے استعمال میں بے لگام نہیں ہوتے۔ وہ ان کو صرف وہیں آزادی دیتے ہیں جہاں اس کا حق ان کو حاصل ہے۔

Marfat.com

اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿٣١﴾

بجز اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ عورتوں کے، سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ ۳۰) البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ۳۱)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

سابقہ آیتِ کریمہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ جو اصحابِ ایمان اور اللہ والے ہوتے ہیں وہ اپنی شرمگاہوں کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ وہ جنسی تعلق کو اپنے لئے ایک عیب سمجھتے ہیں۔ وہ بالکل راہبوں اور جوگیوں کی طرح زندگی بھر نہ شادی کرتے ہیں اور نہ کسی اور طرح اس تعلق کے قریب جاتے ہیں۔ چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ بیویوں اور کنیزوں کے سوا صنفی تعلق کسی اور سے قائم نہیں کرتے۔ وہ چونکہ اپنے اللہ پر ایمان لائے ہیں اس کی شریعت کو انہوں نے اپنا دستور العمل بنایا ہے اور اس کے رسول کو اپنا آئیڈیل اور اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اس لئے جہاں اس کی شریعت کسی چیز کی اجازت دیتی ہے تو وہ اجازت کو اپنے لئے ذریعۂ فلاح سمجھتے ہیں اور جہاں کسی چیز سے روکتی ہے تو اس سے رک جانے کو اللہ کی رضا کا راستہ جانتے ہیں۔ وہ اپنے صنفی تعلقات میں نہ تو بالکل سانڈھ بن جاتے ہیں کہ آبروئیں برباد کرتے پھریں اور انسانی معاشرے کو لاعلاج امراض کا شکار کر دیں اور نہ وہ اپنے اوپر غیر ضروری پابندیاں لگا کر رہبانیت کا راستہ اختیار کر کے فطرت سے جنگ کرتے ہیں۔ اللہ نے انہیں نکاح کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ وہ اپنی بیویوں سے صنفی تعلق قائم کریں۔ اسی طرح لونڈیوں اور کنیزوں سے بھی جنسی تعلق قائم کرنے کی اجازت دی ہے کیونکہ ایک وقت میں یہ بھی اسلامی معاشرے کی بہتری اور اصلاح کیلئے بہت ضروری تھا۔ بیوی سے یہ تعلق اس لئے جائز ہے کہ نکاح کو جائز طریقہ قرار دیا گیا ہے اور لونڈی سے اس تعلق کے جواز کا سبب یہ ہے کہ باقاعدہ قانونی حیثیت سے لونڈی اپنے آقا کی مِلک میں آتی ہے اور وہ مِلک اس کے آقا کو اس سے تمتع کا حق دیتی ہے۔ لیکن اب چونکہ غلامی کا دور گزر گیا ہے اسلام نے اپنی ہمہ گیر کوششوں سے غلامی کو ختم کر ڈالا ہے اس لئے ازسرِ نو ان بحثوں کو زندہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں تو بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں صنفی ضرورت ان کا فطری تقاضا ہے۔ اللہ نے اس تقاضے کو قانونی شکل دے کر نکاح اور مِلک کی صورت میں اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن جو شخص ان دونوں جائز طریقوں سے تجاوز کرتا ہوا کوئی اور راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں شمار ہوگا اور اسلامی شریعت میں حد سے تجاوز کو زنا کہا گیا ہے جس پر حدِ زنا جاری کی جاتی ہے۔

Marfat.com

متعہ کا رد

بعض علما نے انہیں آیات سے متعہ کی حرمت کو ثابت کیا ہے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ ایک مومن کیلئے صنفی خواہشات کی تکمیل کے دو ہی طریقے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے جائز ٹھہرایا ہے۔ایک ہے''منکوحہ بیوی'' اور دوسری ہے''مملوکہ لونڈی''۔اس کے علاوہ تیسری ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں صنفی تعلق پیدا کیا جاسکے۔جو شخص کسی عورت سے متعہ کرتا ہے تو یہ ممنوعہ عورت نہ تو بیوی کے حکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حکم میں۔لونڈی تو ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہے اور جہاں تک بیوی ہونے کا تعلق ہے اسے بیوی بھی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ زوجیت کے لئے جتنے قانونی احکام ہیں ان میں سے کسی کا بھی اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔نہ وہ مرد کی وارث ہوتی ہے، نہ مرد اس کا وارث ہوتا ہے۔نہ اس کے لئے عدت ہے، نہ طلاق۔نہ نفقہ، نہ ایلاء اور ظہار اور لعان وغیرہ۔بلکہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی وہ مستثنیٰ ہے۔پس جب وہ بیوی اور لونڈی دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ان کے علاوہ کچھ اور میں شمار ہو گی۔جس کے طالب کو قرآن حد سے گزرنے والا قرار دیتا ہے۔ علامہ شبلی نے اپنی کتاب ''المامون'' میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ خلیفہ مامون اہلِ تشیع کے دلائل سے متاثر ہو کر متعہ کے جواز کا قائل ہو گیا اور اس نے شہر میں متعہ کے جواز کا اعلان کرنے کا حکم دیا۔جب شیخ الاسلام کو علم ہوا تو وہ خلیفہ کے پاس آئے اور اس سے آ کر بات کی اور انہیں آیات سے استدلال کیا اور مامون سے پوچھا کہ ممتوعہ عورت لونڈی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔تو کیا بیوی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔تو شیخ الاسلام نے کہا کہ اس کے علاوہ تو ہر تعلق قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے کو حد سے تجاوز کرنے والا قرار دیا ہے۔مامون کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا تو دوبارہ شہر میں متعہ کے حرام ہونے کا اعلان کرایا گیا۔

اہلِ تشیع کی جسارت

اہلِ تشیع متعہ کو مباح ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے فضائل بیان کرنے میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔پیشِ نظر آیات کی موجودگی میں میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سے دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔لیکن دلائل سے قطع نظر ایک بات نہایت حیران کن ہے کہ جس کام کو وہ فضیلت اور ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور لوگوں کو اس کی ترغیب بھی دیتے ہیں اسی کام کو وہ اپنی بچیوں اور اپنی بہنوں کیلئے کبھی سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بازاری عورتوں کا ایک بازار لگا رہے؟ یا طبقۂ امرا کے لوگ غریب بچیوں سے متعہ کے نام پر عیاشی کرتے رہیں؟ اگر ایک فعل ایک خاندان کیلئے باعثِ ننگ و عار ہے تو دوسرے کسی خاندان کیلئے باعثِ عز و وقار کیسے ہوسکتا ہے؟

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾

(اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھنے والے ہیں۔ ۳۲)

Marfat.com

پانچویں اور چھٹی صفت امانتوں اور عہد کی پاسداری

اہلِ ایمان کی پانچویں اور چھٹی صفت کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔ پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ اپنی امانتوں کا پاس رکھنے والے ہیں۔ امانت کا لفظ بڑا وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو صلاحیتیں اور قوتیں عطا فرمائی ہیں یہ اس کی انسانوں کے پاس امانتیں ہیں۔ زندگی سب سے بڑی امانت ہے۔ جوانی زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن اپنی اہمیت کے پیشِ نظر الگ سے اسے امانت کا درجہ دیا گیا ہے۔ مال و دولت بھی اللہ کی امانت ہے اور مال و دولت کے حصول کی صلاحیت بھی اللہ کی امانت ہے۔ ذہنی صلاحیتیں حصولِ علم کے ذرائع اور پھر اسے عام کرنے کی کوششیں بھی اللہ کی امانت ہیں۔ ان سب کے بارے میں الگ الگ پوچھا جائے گا کہ تم نے ان امانتوں کا حق کیسے ادا کیا؟ کیا یہ امانتیں، امانتیں رکھنے والے کی ہدایت کے مطابق صحیح مصرف میں صرف کی گئیں یا ان میں خیانت کی گئی؟ اسی طرح اولاد بھی اللہ کی امانت ہے۔ عہدہ و منصب بھی اللہ کی دین ہے۔ وجاہت اور شخصیت بھی اللہ کا عطیہ ہے۔ ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اسی طرح انسان جو ایک دوسرے کے پاس امانتیں رکھواتے ہیں یا دوسروں کے جو حقوق کسی شخص کے ذمہ عائد ہوتے ہیں یہ بھی امانت کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ اہلِ ایمان ان تمام امانتوں کو اللہ کا حق جان کر ادا کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی ایک اور صفت

اصحابِ ایمان کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ عہد کا پاس کرنے والے ہوتے ہیں۔ عہد میں وہ تمام عہد و میثاق شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت سے عالمِ غیب میں لئے ہیں یا اپنے نبیوں کے واسطے سے اپنی شریعت کی شکل میں اس دنیا میں لئے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام عہد و میثاق بھی اس میں شامل ہیں جو ہم نے ایمان کی صورت میں اپنے اللہ سے کئے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام معاہدات اور تمام قول و قرار جو ہم نے مختلف قوموں اور مختلف افراد سے کئے ہیں، خواہ وہ تحریری شکل میں ہوں یا زبانی حد تک یا معاشرے کے معروف کی صورت میں ہم اسے قبول کر چکے ہیں یہ تمام بھی عہد و میثاق میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ایسی تمام امانتوں اور تمام عہد و میثاق کی پاس داری کا حکم دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا شاید ہی کوئی خطبہ ایسا ہوگا جس میں آپ نے یہ ارشاد نہ فرمایا ہو: **لا ایمان لمن لا امانة له** ''اس آدمی کا ایمان نہیں جس میں امانت کی پابندی نہیں''۔ اور **لا دین لمن لا عهد له** ''اور اس آدمی کا کوئی دین نہیں جس میں عہد کی پاسداری نہیں''۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے منافق کی علامتیں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ چار خصلتیں ہیں کہ جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس میں کوئی ایک پائی جائے اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے۔ جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ۱:۔ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ ۲:۔ جب بولے تو جھوٹ بولے۔ ۳:۔ جب عہد کرے تو توڑ دے۔ ۴:۔ اور جب کسی سے جھگڑے تو اخلاق و دیانت کی ساری حدیں پھلانگ جائے۔ وہ اصحابِ ایمان جنہیں اللہ نے کامیابی سے نوازا ہے وہ امانتوں کی بھی پاسداری کرتے ہیں اور عہد و میثاق کا بھی پاس کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

(اور وہ جو اپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں۔ ۳۳)

Marfat.com

ساتویں صفت ادائے شہادت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں جس طرح امانت اور عہد کے الفاظ وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں اس طرح لفظ شہادت اس آیت میں وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ شہادت کی جمع ہے۔ شہادت کا معنی گواہی ہوتا ہے۔ یہاں نیک بندوں کی ایک صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں شہادت کے ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی جس شہادت کا ذمہ انہوں نے اپنے سر لیا ہے اور جس شہادت کا وہ وعدہ کر چکے ہیں چاہے وہ شہادتِ کبریٰ ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم ذمہ داری کے طور پر اس امت پر فرض کی ہے، جسے عام الفاظ میں شہادتِ حق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمایا گیا ہے لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ''تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول کریم ﷺ تم پر گواہ بنیں'' اسی طرح ہر سچی بات کی گواہی یا ہر ایسی گواہی جس کی ذمہ داری ایک مومن قبول کر لے یا کوئی ایسا واقعہ جو اس کی نظروں کے سامنے ہوا اور کوئی اور اسے دیکھنے والا نہ ہو یا گواہی دینے والا نہ ہو۔ اور اسے اس کی گواہی کیلئے طلب کیا جائے، اس کا حق ادا کرنا اس کیلئے لازم ہو جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے خطرے کا سامنا کرتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾

(اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۳۴)

آٹھویں صفت نماز کی محافظت

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ ایمان کی ایک اور صفت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ ان صفات کا ذکر نماز ہی سے شروع ہوا تھا اور نماز ہی پر ختم کیا جا رہا ہے۔ البتہ! فرق یہ ہے کہ پہلے نماز کی روح یعنی نماز کے اندر خشوع کا ذکر کیا گیا تھا اور اب نماز کی محافظت یعنی اس کی دیکھ بھال اور اس کے اہتمام کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہاں نماز کو اگرچہ واحد لایا گیا ہے لیکن اس سے جنس صلوٰۃ مراد ہے جس کا اطلاق واحد جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ نماز جہاں بھی ہو اور جب بھی ہو اگر اس میں خشوع نہیں تو وہ روح سے خالی نماز ہے۔ جس سے نماز کی صورت تو وجود میں آسکتی ہے نماز کی حقیقت نہیں اور صرف کسی چیز کی صورت حقیقت کے بغیر دیر تک باقی نہیں رہا کرتی۔ اور یہ صورت سے حقیقت کا سفر تب ممکن ہوتا ہے جب صورت اور سیرت دونوں کی محافظت کی جائے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ جیسے جیسے صورت بہتر ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے حقیقت کی طرف دھیان بڑھتا جاتا ہے اور جیسے جیسے حقیقت کی طرف دھیان بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے صورت کے اہتمام میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اصل اہتمام اور توجہ سب سے پہلے صورت پر ہوتی ہے جس کے اندر سے حقیقت وجود میں آتی ہے۔ اس لئے اہلِ ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی کہ وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں یعنی اس کے ایک ایک پہلو کی نگہداشت کرتے ہیں۔ وہ اوقاتِ نماز، آدابِ نماز، اور ارکان و اجزاءِ نماز، غرض نماز سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی پوری طرح نگہداشت کرتے ہیں۔ نماز کی تیاری کیلئے صاف کپڑوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ جسم کی پاکیزگی کا خیال کرتے ہیں۔ وضو، سنن اور مستحبات اور آداب کے

Marfat.com

اہتمام کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔نماز کبھی وقت ٹال کر نہیں پڑھتے۔جب تک ایک رکن کی ادائیگی نہیں ہو جاتی دوسرے رکن کی طرف انتقال نہیں کرتے۔یعنی تعدیلِ ارکان کا اہتمام رکھتے ہیں۔نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں۔اس کے معنی اور مفہوم پر توجہ دیتے اور اپنے دل میں اسے اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔حتی الامکان نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔وقت سے پہلے مسجد میں پہنچتے ہیں اور نہایت اطمینان سے نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے نکلتے ہیں۔دل ان کا مسجد میں اٹکا رہتا ہے۔جب تک نماز میں رہتے ہیں یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے سامنے ہیں۔ان کے دل پگھلتے اور آنکھوں سے آنسو برستے ہیں۔اس طرح سے خشوع کی طرف ان کا سفر جاری رہتا ہے اور یہ سب کچھ وہ اس لئے کرتے ہیں،وہ جانتے ہیں کہ نماز باغِ جنت کا پودا ہے اس کی طرف سے ذرا سی غفلت اور ناقدری اس کے بے ثمر ہونے کا باعث بن سکتی ہے۔اگر اسے پورے اہتمام سے قائم رکھا گیا تو دین کا ایک ایک ستون باقی رہے گا اور اگر اس کی طرف سے لاپرواہی برتی گئی تو دین کی عمارت کو کسی وقت بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ مَنْ اَقَامَھَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنِ وَمَنْ ھَدَمَھَا فَقَدْ ھَدَ مَ الدِّیْنِ

''نماز دین کا ستون ہے جس نے اسے قائم رکھا اس نے دین کو قائم رکھا اور جس نے اسے گرا دیا اس نے دین کو ڈھا دیا''۔

اُولٰٓئِکَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّکْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾

(یہی لوگ جنتوں میں عزت کے ساتھ رہنے والے ہوں گے۔ ۳۵)

مذکورہ اوصاف کے حاملین کا انعام

یہ لوگ جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہوں گے،اس قابل ہیں کہ انہیں جنتوں میں نہایت عزت واحترام سے رکھا جائے۔اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لا چکے تھے اور ان میں سے ہر ایک ان ہی صفات کا پیکر تھا۔البتہ ان میں سے ہر ایک غربت کی تصویر بھی تھا۔کیونکہ اولاً تو نبوت کی روایت کے مطابق ہر نبی پر وہ لوگ ایمان لانے میں پہل کرتے ہیں جو اس دور کے ستائے ہوئے اور مفلوک الحال لوگ ہوتے ہیں۔انہیں جب معاشرے کے مظالم سے نکلنے کا ایک راستہ نظر آتا ہے اور اپنی محرومیوں کی تلافی کی ایک صورت نظر آتی ہے،تو وہ آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا دین قبول کر لیتے ہیں۔چنانچہ یہی حال صحابہ کرام ؓ کا بھی تھا۔ان میں بڑی تعداد ایسے ہی غریب لوگوں کی تھی۔ثانیاً وہ لوگ جو ایمان لانے سے پہلے خوشحال اور بڑے کاروباری لوگ تھے۔اسلام قبول کرنے سے نہ ان کی تجارت باقی رہی اور نہ پہلی سی خوشحالی۔جو کچھ پاس تھا وہ غلاموں کو آزاد کرانے اور غریبوں کی مدد کرنے پر خرچ ہو گیا۔اور اہلِ شہر کی بہیمانہ مخالفت سے ہر طرح کا کاروبار تباہ ہو کر رہ گیا،تو وہ بھی غریب ہو کر رہ گئے۔چنانچہ قریش جب ان لوگوں کو دیکھتے تو مذاق اڑاتے،کہ یہ لوگ اپنے آپ کو جنت کا وارث اور خلافتِ ارضی کا مستحق سمجھتے ہیں۔اور حال یہ ہے کہ نہ پیٹ بھرنے کو نانِ جویں میسر ہیں اور نہ تن پوشی کا مناسب لباس۔جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں،لیکن دعوے بہت بلند ہیں۔ان کے مقابلے میں ہم لوگ دنیا میں بھی آسودہ حال اور مدارج عالیہ پر فائز ہیں۔یقیناً قیامت میں بھی ہمیں ایسے ہی انعامات سے نوازا جائے گا اور جنت کے وارث بھی ہم ہی ٹھہریں گے۔ان پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جنت کوئی وراثت میں ملنے والی چیز نہیں،یہ تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور ہر صاحبِ ایمان کے کردار واعمال کا نتیجہ ہے۔جو لوگ یہ کردار اپنائیں گے انہیں اللہ تعالیٰ کی

Marfat.com

طرف سے جنت ملے گی، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ اور جو اس کردار سے محروم رہیں گے وہ جنت کی کبھی بو بھی نہ سونگھ سکیں گے۔ قیامت میں سب کو ایک سوال کا سامنا کرنا پڑے گا اور اسی کے مناسب جواب پر جنت اور جہنم کا دارومدار ہوگا۔ وہ سوال یہ ہے کہ:

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل، کوئی اگر دفتر میں ہے

فَمَالِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿٣٦﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿٣٧﴾
اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿٣٨﴾ كَلَّا ۭ
اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٩﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ
اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿٤٠﴾ عَلٰٓي اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ
بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿٤١﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ
الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿٤٢﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا
كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿٤٣﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ
ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿٤٤﴾

رکوع: ۲۔ (تو ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ آپ کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ ۳۶) دہنے اور بائیں سے گروہ در گروہ۔ ۳۷) کیا ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ ۳۸) ہرگز نہیں، ہم نے جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اسے یہ خود جانتے ہیں۔ ۳۹) پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی، بیشک ہم قادر ہیں۔ ۴۰) اس بات پر کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم اس سے عاجز رہنے والے نہیں ہیں۔ ۴۱) پس ان کو چھوڑ دو، یہ اپنی بے ہودہ باتوں اور کھیل میں لگے رہیں یہاں تک

Marfat.com

کہ اپنے اس دن کو پہنچ جائیں جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے (جس کی ان کو دھمکی دی جارہی ہے)۔ ۴۲) جس دن یہ اپنی قبروں سے نکلیں گے سرعت کے ساتھ، گویا کہ وہ اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ ۴۳) ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ذلت ان پر چھا رہی ہوگی، وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے۔ ۴۴)

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾

(تو ان کافروں کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ آپ کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ۳۶) دہنے اور بائیں سے گروہ در گروہ۔ ۳۷)

مشکل الفاظ:۔ مُهْطِعِيْنَ ...... اہطاع مصدر ہے، اس کے معنی ہیں کسی طرف تیزی سے بڑھنا اور لپکنا۔

عِزِيْنَ ...... عِزَةٌ کی جمع ہے، اس کے معنی گروہ کے ہیں۔

قرآن کی دعوت اور تلاوت کے وقت کفار کا طرز عمل

نبی کریم ﷺ جب لوگوں کے سامنے قرآن کی دعوت پیش کرتے اور پیغمبرانہ لب ولہجہ میں قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے تو چونکہ اس کلام کی تاثیر اور تسخیر بے پناہ تھی تو قریش کے وہ لوگ جو اس دعوت کو روکنے میں زیادہ حساس اور فعال تھے وہ آنحضرت ﷺ کی طرف دوڑ پڑتے اور اس طرح ہجوم کرتے گویا آپؐ پر حملہ کردیں گے۔ مقصود ان کا یہ ہوتا کہ آپؐ قرآنِ کریم سنانا بند کردیں۔ تاکہ لوگ قرآنِ پاک کے اثر سے محفوظ رہیں۔ شاید یہ اسی صورتحال کی ترجمانی ہے جس کا ذکر ایک اور جگہ کیا گیا ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ "کافروں نے کہا اس قرآن کو نہ سنو اور اس کی تلاوت کے دوران شور مچاؤ شاید تم غالب رہو۔"

دوسرا مطلب اس آیت کا یہ ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب قرآنِ پاک کی یہ آیات پڑھ کر سناتے جن میں مسلمانوں کو جنت کا مکین اور وارث قرار دیا گیا ہے اور کافروں کو جہنم کے بدترین عذاب کا سزاوار ٹھہرایا گیا ہے تو کافروں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ ان کیلئے یہ بات نہایت ناگوار، توہین آمیز اور تکلیف دہ تھی کہ یہ نادار اور مفلوک الحال مسلمان تو جنت میں جائیں اور تمام عزتوں اور عظمتوں کے وارث اور مورث سادات قریش دوزخ کے ایندھن بنیں۔ اس غصہ میں وہ ٹولیاں بنا بنا کر آنحضرت ﷺ کی تردید اور توہین کیلئے دہنے بائیں سے آپ کی طرف تیزی سے بڑھتے۔ پیش نظر آیتوں میں اس صورتحال کی تصویر کشی کی گئی ہے اور مغروروں کے مغلوب الغضب ہونے پر اظہار تعجب کیا گیا ہے کہ ذرا ان احمقوں کا حال دیکھو کہ انہوں نے اپنے تئیں کچھ باتیں فرض کر رکھی ہیں اور جب ان حماقتوں کے مقابلے میں حقائق کا اظہار کیا جاتا ہے تو ان کیلئے ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔ یہ اپنی دولت وثروت کو یہ سمجھتے ہیں کہ جنت بھی اسی کے زور سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر حماقت کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

(کیا ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کردیا جائے گا۔ ۳۸) ہرگز نہیں، ہم نے جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اسے یہ خود جانتے ہیں۔ ۳۹)

Marfat.com

کفار کی اس حماقت پر تنقید

کافروں کی اس حماقت اور غلط فہمی کا ذکر قرآنِ کریم نے کئی جگہ کیا ہے۔اور اس پر حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جو کچھ یہ اپنے پاس رکھتے ہیں اس سے دنیا کی چیزیں تو خریدی جاسکتی ہیں لیکن جنت کیلئے تو ایمان وعمل چاہئے اور ایسا کردار چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل ہو۔اور ایسی زندگی چاہئے جس کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے احساس سے گراں بار رہا ہو۔لیکن ان کی حماقت کا کیا کہنا کہ جس پروردگار کی جنت میں جانے کا دعویٰ ہے اس کے رسول، اس کی نازل کردہ کتاب اور اس کے احکام ماننے سے انکار ہے۔اور اس زندگی سے کوئی سروکار نہیں جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے تو پھر ان کا جنت سے کیا تعلق۔ یہی بات سورۃ القلم میں بھی ایسے ہی لوگوں کی تردید میں فرمائی گئی۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۞ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۞ ''کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح بنا دیں گے، تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔'' یعنی جو مقام مسلمانوں کا ہے اگر وہی مجرموں کو بھی دے دیا جائے تو پھر مجرم اور مسلم میں کیا فرق رہ جائے گا۔ یعنی چور اور سعد برابر ہو جائیں گے، اچھائی اور برائی کی تمیز مٹ جائے گی۔

کفار کی نوعی حقیقت سے استدلال

كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ''ہرگز نہیں، ہم نے جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اسے یہ خود جانتے ہیں۔'' سابقہ آیت کے مضمون کو مزید سہل بناتے ہوئے فرمایا کہ ان متکبرین کو یہ بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہونی چاہئے کہ کسی بھی اعزاز کیلئے دو باتیں دیکھی جاتی ہیں۔ایک تو یہ بات کہ جس کو یہ اعزاز دیا جانے والا ہے اس کی اصل کیا ہے یعنی اصل اور حقیقت کو اس کی بنیاد بنایا جائے۔اور دوسری یہ بات کہ اس کی صلاحیت اور قابلیت کیا ہے۔ جنت ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔اگر یہ اصل اور حقیقت کی بنیاد پر دیا جائے تو پھر تو تمام مخلوقات کی اصل مادہ ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اصل سے جو فرع بھی پھوٹی ہے اسے جنت میں داخل کر دیا جائے۔تو نتیجہ اس کا یہ نکلے گا کہ کتنی ناپاک مخلوقات بھی جنت میں پہنچ جائیں گی۔

اور اگر اس سے صرف انسان مراد لئے جائیں تو پھر اس کی اصل پانی، کیچڑ، مٹی اور زمین کے بعض دیگر اجزاء ہیں۔تو پھر اس میں قریش کی کیا خصوصیت ہے۔ مجرد خلقت کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں۔تو پھر مسلمانوں کی غربت کی وجہ سے ان کے جنت میں جانے پر انہیں اعتراض کیوں ہے۔اور دوسری چیز کسی اعزاز کی بنیاد بننے کیلئے صلاحیت اور قابلیت ہے۔اور وہ ظاہر ہے شرافتِ حسب ونسب کا غرور نہیں بلکہ ایمان، اخلاق اور کردار کی عظمت ہے۔اور وہ چونکہ مسلمانوں کو حاصل ہے اس حوالے سے صرف وہی ہیں جنہیں جنت میں جانے کا حق پہنچتا ہے۔

اور انسان کی اجزائے خلقت کے اعتبار سے جو حیثیت ہے سورۃ النجم میں اسے مزید واضح فرمایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناپاک سے ناپاک حیوانات بھی اجزائے خلقت کے اعتبار سے اس کے مساوی ہیں۔سورۃ النجم آیت ۵۳ میں ارشاد ہے۔ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۚ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۞ ''وہ تم کو خوب جانتا ہے جبکہ اس نے زمین سے تم کو پیدا کیا اور جبکہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بشکلِ جنین رہے تو اپنے آپ کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ، وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی۔''

Marfat.com

اسے آسان زبان میں ایک تمثیل کی شکل میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک متمول اور متکبر آدمی کا راہ چلتے ہوئے ایک درویش اور فقیر آدمی سے کندھا ٹکرا گیا تو متکبر آدمی نے خشمگیں نگاہوں سے اس فقیر کو دیکھا اور کہا کہ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں؟ وہ فقیر بھی ایسا ستم ظریف تھا کہ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہاں، جناب میں آپ کو خوب جانتا ہوں، آپ کی تخلیق پانی کے گندے قطرے سے ہوئی، پھر ماں کے پیٹ میں گندہ خون آپ کی غذا بنا رہا، پھر آپ گندگیوں میں لپٹے ہوئے باہر تشریف لائے، بچپن آپ کا ایسے گزرا کہ کبھی پیشاب میں پڑے ہیں اور کبھی گندگی میں لتھڑے ہوئے اور اب بھی آپ کا حال یہ ہے کہ آپ پاکیزہ، طیب اور خوشبودار نعمتوں سے محظوظ ہوتے ہیں لیکن زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ وہی خوشبودار نعمتیں آپ کے پیٹ س بدبودار ہو کے باہر نکلتی ہیں یعنی جو چیز آپ کے اندر چلی جاتی ہے وہ بگڑ جاتی اور سڑاند مار دینے لگتی ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب آپ قبر کی نذر کر دیئے جائیں گے اور وہاں ایک مختصر عرصے کے بعد آپ کے جسم سے بدبو کے بھبھوکے اٹھیں گے اور آپ کا جسم کیڑوں کی غذا بن جائے گا۔ یہ ہے آپ کی حیثیت، آپ کی ابتداء اور آپ کا انجام۔ اس کے علاوہ اگر آپ کچھ ہیں تو فرمایئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حقیقت اس سے مختلف نہیں۔ اگر وہ اپنی خلقت پر غور کرے تو اسے کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو کہ وہ اپنی اس حیثیت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی گرفت سے باہر نکل سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾

عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾

(پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی، بیشک ہم قادر ہیں۔ ۴۰) اس بات پر کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم اس سے عاجز رہنے والے نہیں ہیں۔ ۴۱)

مشارق و مغارب کی قسم اور مفہوم

اس سے پہلے ''لا'' کی وضاحت گزشتہ سورۃ میں گزر چکی ہے اور وہیں ہم قسم اور جوابِ قسم کا مفہوم بھی بیان کر چکے ہیں۔ یہاں بھی ''لا'' حرفِ زائد کے طور پر نہیں آیا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو بات تم کہہ رہے ہو وہ صحیح نہیں۔ بلکہ حقیقت وہ ہے جو ہم آگے بیان کرنے والے ہیں۔ اس آیت میں پروردگار نے مشرقوں اور مغربوں کا رب کہہ کر درحقیقت اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔ قرآنِ کریم میں مشرق اور مغرب کا لفظ واحد، تثنیہ اور جمع تینوں صورتوں میں آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب معنوی اعتبار سے ایک بھی ہیں، دو اور تین بھی۔ اور قرآنِ کریم نے تینوں طرح سے اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً کہیں فرمایا رب المشرق والمغرب، اس کا مطلب یہ ہے کہ شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جہت مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب۔ یہاں یہ دونوں جہتیں مراد ہیں۔ اور کہیں فرمایا رب المشرقین و رب المغربین یہاں دو مشرقوں اور دو مغربوں کا ذکر فرمایا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب زمین کے ایک نصف کُرّے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے پر طلوع ہوتا ہے تو اس لحاظ سے زمین کے ایک کُرّے کا مشرق اور مغرب اور ہے اور دوسرے کُرّے کا مشرق اور مغرب اور۔ البتہ عربی زبان میں بعض دفعہ تثنیٰ کسی شے کے دونوں اطراف کی طرف اشارہ کیلئے بھی آتا ہے۔ جس طرح سورۃ الکھف میں بین الصدفین آیا ہے۔

Marfat.com

بعض دفعہ قرآنِ کریم میں پیشِ نظر آیتِ کریمہ کی طرح رب المشارق والمغارب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویئے سے طلوع اور نئے زاویئے پر غروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں میں سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہے بلکہ بہت سے ہیں۔ البتہ بعض اوقات جمع محض کسی شے کی وسعتِ اطراف کو ظاہر کرنے کیلئے آتی ہے۔ بہرحال اس لفظ کے استعمال کے یہ مختلف محل اور مختلف وجوہ ہیں۔ لیکن یہاں مراد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے۔ اس لحاظ سے ساری زمین اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس غیر محدود قدرت کی مالک ذات سے بچ نکلنا اور اس کی قدرت کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کرنا یا اس کو محدود سمجھنا حماقت اور نارسائیِ فکر کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی قدرت کی بے پناہی کا عالم ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کرتے ہیں کہ سورج، چاند اور کروڑوں اربوں کواکب ونجوم اس کے حکم سے طلوع اور غروب ہوتے ہیں اور کسی کو آج تک اس کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں ہوئی۔ تو کیا ایسی قادر وقیوم ذات کیلئے یہ مشکل ہے کہ وہ مخلوقات کو مرکھپ جانے کے بعد از سرِ نو زندہ کردے۔ بلکہ اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے فرمایا کہ ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمہیں مٹا دیں اور تمہاری جگہ تم سے بہتر مخلوق لائیں جو اللہ تعالیٰ کے دین کی ماننے والی ہو۔ جمہور نے اس آیت کا یہی مطلب لیا ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ البتہ الفاظ میں گنجائش اس مفہوم کی بھی ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمہیں دوبارہ اس صورت سے بہتر صورت میں پیدا کردیں۔ دونوں مفہوموں کا انجام ایک ہی ہے کہ جو ہمہ مقتدر ذات تمہیں مٹا کر نئی مخلوق کو پیدا کرنے یا تمہیں بہتر شکل میں پیدا کرنے پر قادر ہے وہ تمہارے مرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿۴۲﴾

(پس ان کو چھوڑ دو، یہ اپنی بےہودہ باتوں اور کھیل میں لگے رہیں یہاں تک کہ اپنے اس دن کو پہنچ جائیں جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے (جس کی ان کو دھمکی دی جارہی ہے)۔ ۴۲)

ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اگر نہایت سہل لیکن محکم دلائل کو سن کر بھی قیامت پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بات طے کرچکے ہیں اس کیخلاف کسی بات کو بھی سنجیدگی سے سننے اور ماننے کیلئے آمادہ نہیں، تو ایسے ہٹ دھرم لوگوں سے سر کھپانا سر پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں۔ آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ یہ جن فضول باتوں اور کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں، لگے رہیں۔ یہاں تک کہ اپنی یاوہ گوئیوں اور غیر سنجیدہ حرکتوں سے اس دن کو پہنچ جائیں جن کا ہر پیغمبر کے ذریعے ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور اس دن سے انہیں ڈرایا گیا۔ لیکن یہ ایسے کج بحث اور ضدی واقع ہوئے ہیں کہ ان کی بےنیازی اور لاپرواہی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

Marfat.com

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

(جس دن یہ اپنی قبروں سے نکلیں گے سرعت کے ساتھ، گویا کہ وہ اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ ۴۳)
ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ذلت ان پر چھا رہی ہوگی، وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ۴۴)

نُصُب کا مفہوم

نُصُب ...... نصیب کی جمع ہے، اس کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے اس سے بتوں کے استھان مراد لئے ہیں۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آج تو ان کا حال یہ ہے کہ یہ قیامت کے تصور سے بھی گریزاں ہیں اور محکم سے محکم دلیل بھی انہیں متوجہ کرنے پر قادر نہیں۔ البتہ ان کی قلبی وابستگیاں بتوں اور ان کے استھانوں سے ہیں۔ یہ جب ایسی جگہوں پر جاتے ہیں تو لپکتے ہوئے اور دل کی آمادگی کے ساتھ تیزی سے قدم بڑھاتے ہیں۔ لیکن قیامت کے دن ان کی یہ تمام وابستگیاں دھری رہ جائیں گی۔ جیسے ہی صور پھونکا جائے گا تو یہ قبروں سے تیزی سے نکل کر میدانِ حشر کی طرف دوڑتے ہوئے بڑھیں گے۔ سورۃ طٰہٰ میں اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے یومیذیتبعون الداعی لاعوج له ''جس دن وہ داعی کی پکار کی پیروی بغیر کسی کجی کے کریں گے۔'' یعنی جس طرح تیر سیدھا اپنے متعین ہدف کی طرف جاتا ہے اسی طرح یہ داعی کی طرف لپکیں گے۔

بعض دیگر اہلِ علم نے نصیب کے معنی نشان اور علم کے کئے ہیں جو دوڑ وغیرہ کے مقابلہ کیلئے نشان کے طور پر گاڑ دیئے جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور ضحاکؒ یہی معنی مراد لیتے ہیں۔ ابوالعالیہ اور یحییٰ بن کثیر بھی قریب قریب یہی مفہوم مراد لیتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آج تو یہ متمردین اور متکبرین اللہ تعالیٰ کے داعی سے اکڑتے اور اس کی بتائی ہوئی راہ سے منحرف ہو کر دوسری راہوں پر چل رہے ہیں لیکن وہ دن بھی آنے والا ہے جب صور پھونکنے والا صور پھونکے گا اور یہ قبروں سے نکل کر اس طرح تیزی سے میدانِ حشر کی طرف لپکیں گے گویا کہ وہ دوڑ کے معین نشانوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

آج جبکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے سامنے ان کی گردنیں تنی ہوئی رہتی ہیں اور تکبر اور تمرد کا اظہار کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ پر جھپٹنے کیلئے آگے بڑھتے ہیں لیکن اس دن ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ بجائے آنکھیں چار کرنے کے آنکھیں اٹھانے کی ہمت بھی نہیں کرسکیں گے اور ان کے چہروں پر ندامت اور حسرت سے ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ''پروردگار فرماتے ہیں یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا یا جس کی انہیں دھمکی دی جاتی تھی۔ اور آج اس دن کے آتے ہی ان کے سارے کس بل نکل چکے ہیں اور ندامت سے ان کی نگاہی جھکی ہوئی اور ذلت چہروں پر برس رہی ہے۔ لیکن اب بعد از وقت پچھتائے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

یاد کیجئے اس سورۃ کا آغاز قیامت کے عذاب کے ذکر سے ہوا تھا اور اختتام بھی اسی کے ذکر پر ہو رہا ہے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ قرآنِ کریم میں کس حد تک غیر معمولی ربط پایا جاتا ہے۔

Marfat.com

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰهِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوۡرَۃُ نُوۡحٍ

(۷۱)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ نُوْحٍ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام نوح ہے۔ یہ بھی باقی سورتوں کی طرح اس سورۃ کا عنوان نہیں بلکہ نام اور شناخت ہے۔ لیکن اس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جس طرح اپنی قوم کو انذار کیا اور قوم نے جو رویہ اختیار کیا، حضرت نوح علیہ السلام نے اتمامِ حجت کے بعد جس طرح بددعا کی، وہ تمام تفصیلات اس سورۃ میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے اس نام کو اس کا عنوان بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حتمی طور پر اسے اس کا عنوان قرار دینا اس لئے مشکل ہے کہ اس میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت، قوم کے ردِعمل اور حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے ان پر اتمامِ حجت اور پھر مایوس ہو جانے پر بددعا، یہ تمام چیزیں آپؑ کی دعوت کے احوال میں سے تو ہیں لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے ذاتی حالات کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے ایک ایسی سورۃ جس کا نام ایک عظیم پیغمبر کے نام پر ہو لیکن اس پیغمبر کے ذاتی حالات کو زیرِ بحث نہ لایا گیا ہو اور صرف اس کی دعوتی مساعی کی حد تک گفتگو کو محدود رکھا گیا ہو تو اسے عنوان کہنا بہ ہمہ وجوہ شاید صحیح نہ ہو۔

زمانۂ نزول:۔ اس سورۃ کے مندرجات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب آنحضرت ﷺ کو دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے ہوئے ایک معتد بہ زمانہ گزر چکا تھا، اور کفارِ مکہ کی طرف سے مخالفت و مزاحمت میں شدت آ چکی تھی۔ اس لحاظ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مکی دور کا متوسط زمانہ ہو گا۔

گزشتہ سورۃ سے ربط:۔ سابق سورۃ المعارج میں ہم نے پڑھا ہے کہ جو لوگ عذاب کیلئے جلدی مچا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ قسم قسم کے اعتراضات بھی اٹھا رہے تھے انہیں جواب دیا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ کو ان کی یاوہ گوئی اور مخالفت کے مقابلے میں صبر اور انتظار کی تلقین کی گئی ہے۔ اس سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے مراحل ان کے طویل صبر و انتظار اور بالآخر ان کی قوم کے مبتلائے عذاب ہونے کی سرگزشت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان فرمائی گئی ہے جس میں ایک طرف کفارِ مکہ کو آئینہ دکھایا گیا ہے کہ قومِ نوح نے بھی تمہاری طرح عذاب کو ایک مذاق سمجھا اور بجائے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرنے کے اس کا راستہ روکنے کیلئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا۔ نتیجہ کیا ہوا کہ اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں پکڑے گئے۔ جس عذاب کا مذاق اڑاتے تھے اسی عذاب نے ان کی جڑیں اکھاڑ ڈالیں۔ اور آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ پہلا واقعہ نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام ایسے ہی زہرہ گداز مراحل سے گزرے ہیں لیکن آپؑ نے صبر اور انتظار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، آخر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے نوازے گئے۔ اس لئے آپؐ کو بھی اس صورتحال پر صبر اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا انتظار کرنا چاہیے۔

Marfat.com

مضمون:۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت اور آپؑ کے نذیرِ عریاں ہونے کی حیثیت کو نمایاں کیا گیا، پھر آپؑ کی دعوت کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے سامنے جو دعوت پیش کی اس کے تین بنیادی نکات تھے۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی۔ (۲) اس کے احکام کی نافرمانی کی صورت میں برے انجام کا اندیشہ۔ (۳) حضرت نوح علیہ السلام کی بحیثیت رسول اطاعت۔ اس سے یہ بات واضح کرنا بھی مقصود ہے کہ تین باتیں جو حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا خلاصہ ہیں، انہیں تین باتوں کی دعوت آنحضرت ﷺ بھی دے رہے ہیں۔ پھر اس کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم ان تین باتوں کو قبول کر لیتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور وہ عذاب جو تمہاری بداعمالیوں کے نتیجے میں تمہارے سر پر تلا کھڑا ہے وہ اجلِ مسمّٰی تک مؤخر ہو جائے گا۔

پھر مدت ہائے دراز تک دعوت وتبلیغ کی زحمتیں اٹھانے کے بعد جو روداد حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور پیش کی اسے نہایت مؤثر انداز میں بقدرِ کفایت بیان فرمایا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنا درد کھول کر رکھ دیا ہے کہ انہوں نے کس طرح اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیں اور قوم نے ان کا مقابلہ کس ہٹ دھرمی سے کیا۔

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے ان کی گمراہی اور بگاڑ کے اسباب بیان فرماتے ہوئے ان کی ہدایت سے مایوسی کا اظہار کیا۔ اور یہ مایوسی کسی بے صبری کا مظاہرہ نہیں بلکہ صدیوں تک انتہائی صبر آزما حالات میں تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے بعد جب انہوں نے اپنی قوم میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی تو انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ اب اس قوم کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فراست سے اندازہ لگا چکے تھے کہ میں صدیوں تک ان پر اتمامِ حجت کر چکا ہوں، اب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کسی طرح بچ نہیں سکتے۔

آخری آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ دعا ذکر فرمائی گئی ہے جو انہوں نے عین نزولِ عذاب کے وقت اپنے رب سے مانگی تھی۔ اس میں وہ اپنے اور سب اہلِ ایمان کیلئے مغفرت طلب کرتے ہیں اور اپنی قوم کے کافروں کے بارے میں اپنے نو صدیوں پر محیط تجربے کی بنیاد پر عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ان میں کسی کو زمین پر بسنے کیلئے زندہ نہ چھوڑا جائے کیونکہ ان کے اندر اب کوئی خیر باقی نہیں رہا۔ ان کی نسل سے جو بھی اٹھے گا، کافر اور فاجر ہی اٹھے گا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٢٨	سُوْرَةُ نُوْحٍ مَكِّيَّةٌ (٧١)	رُكُوْعَاتُهَا ٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوْحًا إِلٰى قَوْمِهٖٓ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ
أَنْ يَّأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ إِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢﴾
أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿٣﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ
لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ﴿٥﴾
فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ إِلَّا فِرَارًا ﴿٦﴾ وَإِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ
جَعَلُوْٓا أَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوْا
وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿٧﴾ ثُمَّ إِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴿٨﴾ ثُمَّ إِنِّيْٓ
أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ﴿٩﴾ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۗ
إِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿١١﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ
بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهٰرًا ﴿١٢﴾
مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿١٣﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿١٤﴾ أَلَمْ

Marfat.com

تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝١٥ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ
فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝١٦ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ
الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝١٧ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝١٨ وَاللّٰهُ
جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝١٩ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝٢٠ ع

رکوع: ا۔ (ہم نے نوح (علیہ السلام کو) ان کی قوم کی طرف رسول بنا کے بھیجا، کہ اپنی قوم کو خبردار کردیں قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔ ۱) انہوں نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لئے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۲) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۳) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقتِ مقرر تک مہلت دے گا، بیشک اللہ کی مقرر کی ہوئی مدت جب آجائے گی تو وہ ٹالے نہیں ٹلے گی، کاش تم اس کو سمجھو۔ ۴) حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی، اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا۔ ۵) مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ ۶) میں نے جب بھی ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کردے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں۔ اپنی چادریں اپنے اوپر لپیٹ لیں، اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ ۷) پھر میں نے ان کو بلایا برملا۔ ۸) پھر میں نے ان کو کھلم کھلا بھی سمجھایا اور چھپ کر چپکے چپکے بھی۔ ۹) پھر میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو، بیشک وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ ۱۰) وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ ۱۱) اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کرے گا، تمہارے لئے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کردے گا۔ ۱۲) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے بڑائی کی امید نہیں رکھتے۔ ۱۳) حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ ۱۴) کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے۔ ۱۵) اور چاند کو ان کے اندر روشنی بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔ ۱۶) اور اللہ ہی نے تم کو زمین سے خاص اہتمام سے اگایا۔ ۱۷) پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ ۱۸) اور اللہ ہی نے تمہارے لئے زمین کو فرش کی طرح بچھا دیا۔ ۱۹) تاکہ تم اس کی کھلی راہوں میں چلو۔ ۲۰)

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١

(ہم نے نوح (علیہ السلام کو) ان کی قوم کی طرف رسول بنا کے بھیجا، کہ اپنی قوم کو خبردار کردیں قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔ ۱)

Marfat.com

پیغمبر کی بعثت کا مقصد

حضرت نوح علیہ السلام بعض روایات کے مطابق اولادِ آدم کی اصلاح کیلئے مبعوث ہونے والے پہلے صاحب شریعت رسول ہیں۔ دنیا کی اکثر قومیں ان کے نام سے واقف ہیں۔ دنیا پر طوفانِ نوح کے نام سے جو تباہی آئی اس کا تذکرہ بھی تمام قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اہلِ مکہ بھی آپؑ کو رسول کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اس لئے ان کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت ایک رسول کی حیثیت سے بیان فرمائی گئی ہے تا کہ اس سرگزشت کے آئینہ میں وہ اگر جاننے کی کوشش کریں تو وہ جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ کا رسول جب کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے تو اس کی بعثت کی غرض وغائت کیا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے اس کا مقام اور کام کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم نے حضرت نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا یعنی ہم نے ان کو رسالت کے منصب پر فائز کیا تھا اور ان کی یہ ذمہ داری ٹھہرائی گئی تھی کہ آپؑ کی قوم جو فسادِ عقیدہ، فسادِ عمل اور زندگی کے تمام معاملات میں فسادِ عمومی کے اعتبار سے اس حالت کو پہنچ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کے سروں پر تلا کھڑا ہے کیونکہ سیرت وکردار کی ایسی عمومی خرابی کے ظہور کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آجایا کرتا ہے۔ لیکن ہمارا قانون یہ ہے کہ جب پہلے آنے والے رسولوں کی دعوت واصلاح کے اثرات دھیمے پڑ جاتے ہیں اور قوم مجموعی طور پر ہمہ جہت فساد کا شکار ہوجاتی ہے تو ہم اس پر عذاب بھیجنے سے پہلے اسے خبردار کرنے کیلئے اپنا رسول بھیجتے ہیں تا کہ وہ انہیں آنے والے خطرے سے اچھی طرح باخبر کردے۔ اور اپنی تبلیغی مساعی سے ایک ایک پر حجت تمام کردے تا کہ کل کو جب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوں تو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں کسی نے انذار نہیں کیا تھا ورنہ ہم اپنی اصلاح کر لیتے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت حضرت نوح علیہ السلام کو ہم نے انذار کرنے کیلئے بھیجا تھا تا کہ ان کی قوم بے خبری میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار نہ ہوجائے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۳﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾

(انہوں نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لئے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۲) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۳) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقتِ مقرر تک مہلت دے گا، بیشک اللہ کی مقرر کی ہوئی مدت جب آجائے گی تو وہ ٹالے نہیں ٹلے گی، کاش تم اس کو سمجھو۔ ۴)

حضرت نوح علیہ السلام کی حیثیت اور ذمہ داری

حضرت نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنی قوم کے سامنے اپنی اس ذمہ داری کا ذکر فرمایا جس پر انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے فائز کیا گیا تھا۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں تمہارے لئے کھلا کھلا ڈرانے والا بن کے آیا ہوں۔ عرب میں طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی بڑے خطرے سے اچانک آگاہ ہوتا، مثلاً وہ دیکھتا کہ اس کے قبیلے پر کوئی دوسرا قبیلہ شب خون مارنے والا ہے یا اس کی قوم پر کوئی بڑا لشکر حملہ کرنے والا ہے تو وہ تیزی سے اپنی قوم کی طرف اپنی سواری کو تیز دوڑاتے ہوئے لپکتا، اور آبادی کے قریب پہنچ کر اپنے کپڑے پھاڑ دیتا اور بالکل برہنہ

Marfat.com

ہوکر چیخنے لگتا کہ لوگو، ہوشیار ہوجاؤ خطرہ تمہارے سر پر پہنچ گیا ہے، اپنے بچاؤ کا سامان کرلو۔ ایسے شخص کو نذیر عریان کہا جاتا ہے جس کا لفظی معنی ہے ننگا ہوکر ڈرانے والا۔ قوم جب کسی شخص کو برہنہ حالت میں اس طرح چیختے ہوئے سنتی تو وہ غضبناک ہوکر باہر نکل آتی اور ایک ایک فرد کو یقین ہوجاتا کہ ہم ایک بڑے طوفان کا سامنا کرنے والے ہیں۔ قرآنِ کریم چونکہ بہت سنجیدہ اور بہت باوقار حیثیت کی کتاب ہے اس لئے اس نے اس لفظ کو اختیار کرنے کی بجائے نذیر مبین کا لفظ اختیار کیا، یعنی کھلا کھلا ڈرانے والا۔ مقصود یہی تھا کہ میں تمہیں ایک بہت بڑی تباہی اور ایک بڑے خطرے سے ڈرانے اور خبردار کرنے کیلئے آیا ہوں، وہ خطرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دھرتی کا مالک ہے۔ وہ دھرتی پر رہنے والوں کو جب دیکھتا ہے کہ اس کی نافرمانی میں شب و روز زندگی بسر کررہے ہیں تو وہ انہیں سمجھانے اور خبردار کرنے کیلئے اپنا رسول بھیجتا ہے۔ رسول انہیں آکر خبردار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی دھرتی پر بہت دیر تک نافرمانی برداشت نہیں کرتا۔ میں اس کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے کیلئے آیا ہوں کہ تم جس طرح کی زندگی گزار رہے ہو اور جس طرح تمہاری زندگی کا کوئی شعبہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے خالی نہیں بلکہ تم نے اپنے طور اطوار سے ثابت کردیا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی صورت میں ظاہر ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اگر تم نے اس کے تدارک کیلئے اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے۔

عذاب سے بچنے کیلئے تین ہدایات

دوسری آیت میں حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کیلئے تین بنیادی باتیں ارشاد فرمائیں اور یہ کہا کہ اگر تم ان تین بنیادی باتوں کو قبول کرلیتے ہو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤ گے۔ پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے معبود تراش رکھے ہیں اور تم ان کی عبادت کرتے ہو اور بعض انسانوں کو تم نے طاغوت بنا کر اپنی زندگی کے معاملات ان کے سپرد کر رکھے ہیں اور انہیں تم نے وہ تمام اختیارات دے رکھے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ تم ان آستانوں سے سر اٹھالو اور تمام طاغوتی قوتوں کا انکار کردو اور صرف ایک اللہ کے سامنے جھکو اور اسی کی غیر مشروط عبادت کا عہد کرو۔

اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے جو حدود و قیود تمہاری زندگی کی رہنمائی کیلئے مقرر کی ہیں ان کی پابندی کرو، یعنی ان کاموں سے پرہیز کرو جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کے غضب کے موجب ہیں اور اپنی زندگی میں وہ روش اختیار کرو جو خدا ترس لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے۔

اور تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ میری اطاعت کرو، یعنی ان احکام کی اطاعت کرو جو اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کی حیثیت سے میں تمہیں دیتا ہوں اور ان مفسد لیڈروں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی اطاعت کو تم نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے یہ تین بنیادی ارکان ہیں۔ توحید، شریعتِ الٰہی کی پابندی اور رسول کی اطاعت۔ اور یہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کی خصوصیت نہیں بلکہ جو رسول بھی دنیا میں تشریف لائے سب کی دعوت کے یہی تین بنیادی ارکان تھے۔ یہی تین بنیادی ارکان اس نظامِ حیات کی اساس بنتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں انسانوں کو دیا ہے۔ کیونکہ ہر دین کا اصل ہدف انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنا ہے اور اس کا دارومدار قلب و نگاہ میں اس تصور کو راسخ کرلینا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی ذات ہے جس کی ذات، صفات اور حقوق میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ ہر لحاظ سے وحدہ لاشریک ہے۔ چونکہ وہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے اس لئے بجا طور پر اس کو یہ حق پہنچتا ہے

Marfat.com

کہ وہ بندوں پر اپنے احکام نافذ کرے اور ان پر یہ بات واضح کردے کہ مجھ پر ایمان اور ان احکام پر عمل تمہاری دنیوی اور اخروی فلاح کا ضامن ہے۔ اور ان احکام سے سرتابی، نافرمانی یا سرکشی تباہی کا باعث ہے اور رسول کی زندگی چونکہ ہر لحاظ سے اسوۂ حسنہ ہے اور وہی دنیا میں بندوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ ہے اس لئے اس کی اطاعت، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اور اس کی پیروی اللہ تعالیٰ کی رضا کی ضامن ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی قوم اس جادۂ مستقیم پر قائم رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی دنیوی اور اخروی نعمتیں اس کا استحقاق ٹھہرتی ہیں اور جب وہ اس جادۂ مستقیم سے ہٹ جاتی ہے تو وہ آخرکار اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آجاتی ہے۔

ان ہدایات کو مان لینے کا پہلا انعام

اگلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اگر تم نے میری یہ تینوں باتیں مان لیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہ معاف فرمادے گا، بجز ان گناہوں کے جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے، کیونکہ حقوق العباد کی معافی کیلئے ایمان لانے کے بعد بھی یہ شرط ہے کہ جو حقوق ادائیگی کے قابل ہیں ان کو ادا کیا جائے، جیسے مالی واجبات۔ اور جو ادائیگی کے قابل نہیں جیسے زبان یا ہاتھ سے کسی کو ایذا پہنچائی تو اس سے معاف کرایا جائے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ میں مِنْ تبعیض کیلئے ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس کے ساتھ ماتقدم کی قید لگائی ہے کیونکہ اسلام لانے کے بعد وہی گناہ معاف ہوسکتے ہیں جو کفر کی حالت میں کئے گئے ہیں۔ رہے وہ گناہ جو اسلام لانے کے بعد سرزد ہوئے ہیں تو ان کیلئے الگ ضابطہ ہے جسے توبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ قید اس لئے غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ الفتح میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ یہاں مِنْ کا ذکر مَاتَقَدَّمَ اور مَاتَاَخَّرَ دونوں کے ساتھ آیا ہے۔ اسی آیت سے مِنْ کے زائد ہونے کی بحث بھی کسی حد تک حل ہوجاتی ہے۔

دوسرا انعام

وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى "اور تمہیں ایک وقتِ مقرر تک مہلت دے گا۔" حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم لوگوں نے میری یہ تینوں باتیں مان لیں تو اللہ تعالیٰ دوسرا انعام تم پر یہ فرمائے گا کہ جو عذاب تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور جس عذاب سے میں تمہیں ڈرا رہا ہوں، اللہ تعالیٰ اس عذاب کو تم سے ٹال دے گا اور ایک معین مدت تک تمہیں دنیا میں خیریت وعافیت سے رہنے کی مہلت دے دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہاں کوئی شخص غیر معین مدت تک زندہ نہیں رہتا بلکہ جو اس کی عمر مقرر ہے اس کے پورا ہو جانے کے بعد اس کی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح قومیں بھی ہمیشہ ایک جیسی زندگی نہیں گزارتیں بلکہ ان کی مہلتِ حیات کا دارومدار ان کے ایمان، تقویٰ اور اطاعتِ رسول پر ہوتا ہے۔ جب تک وہ ان بنیادی صفات کو اپنے اندر باقی رکھتی ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں عزت کی زندگی سے بہرہ مند رکھتا ہے لیکن جب وہ ان بنیادی صفات سے محروم ہوجاتی ہیں اور بنیادی اقدار سے منحرف ہوجاتی ہیں تو ان پر زوال کے آثار طاری ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کا اخلاقی زوال اس نقطہ پر پہنچ جاتا ہے جو آخری ہے تو اس کی اجلِ مسمّیٰ پوری ہوجاتی ہے اور قومی حیثیت سے ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک شخص کی زندگی کیلئے ایک اجلِ مسمّیٰ یعنی ایک وقتِ مقرر کا فیصلہ ہوچکا ہے اور اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اسی طرح قوموں کی بھی اجلِ مسمّیٰ کا فیصلہ ہوچکا ہے اور اس کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے سوا

Marfat.com

کسی اور کو نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب کسی شخص کو جسمانی عوارض لاحق ہو جاتے ہیں تو ہر دیکھنے والا اور خود وہ شخص بھی یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی زوال کا شکار ہوگئی ہے اور اگر میں عوارض پر قابو نہ پاسکا تو میں موت سے بچ نہیں سکوں گا۔ اسی طرح جب قومیں سیرت و کردار کی خرابی کا شکار ہوتی ہیں اور ان کے معاملات دیانت و امانت سے محروم ہو جاتے ہیں اور وہ بنیادی قومی اور ملی اوصاف سے منحرف ہو جاتی ہیں اور جس نظریئے کی بنیاد پر انہیں قومی تشخص ملا تھا اسے نظرانداز کر دیتی ہیں تو یہ در اصل ان کے وہ عوارض ہیں جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب یہ قوم زوال کا شکار ہوگئی ہے اور اگر اس زوال کے سفر کو روکا نہ گیا تو اس کی تباہی کو ٹالا نہیں جاسکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ تمہاری زندگیوں کے مجموعی اعمال تمہارے سامنے ہیں جن کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں۔ تم بڑی تیزی سے قومی اور ملی ہلاکت کی طرف بڑھ رہے ہو۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کا عذاب قوموں کو مٹا دیا کرتا ہے۔ لیکن میں تمہارے پاس جو نسخۂ شفاء لے کر آیا ہوں اگر تم اسے قبول کر لو تو پھر جو تمہارے لئے ایک وقت مقرر ہو چکا ہے اسی وقت پر تمہاری زندگیوں کا سفر ختم ہوگا، اس سے پہلے خدا کا عذاب تمہاری تباہی کا باعث نہیں بنے گا۔ اس وقتِ مقرر کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں۔ لیکن قوم کے مجموعی اوصاف اس کی نشاندہی کرنے کیلئے کافی ہیں۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ جس طرح ہر مخلوق کا ایک معین وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے طے ہو چکا ہے اسی طرح اس مجموعی دنیا کے خاتمے کا معین اور مقرر وقت ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا جب اس دارالامتحان کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ایک نیا عالم نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ظہور میں آئے گا جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں۔

مزید فرمایا کہ اگر تم نے میری ان تین بنیادی باتوں کو تسلیم نہ کیا تو پھر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب کا بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس طرح ہر شخص کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے یعنی نزولِ عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ ٹالے سے بھی ٹل نہیں سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے جاننے اور یقین کرنے پر افراد اور قوموں کی سیرت و کردار کی درستی کا دار و مدار ہے۔ اس لئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ کاش تم اس حقیقت کو جان لیتے کہ اس دنیا کی ہر فرصت بہرحال محدود اور فانی ہے۔ جو شخص یہاں کی مہلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا وہی دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوگا۔ اور جو لوگ اس حقیقت کو نظرانداز کر دیں گے ان کیلئے یہ دنیا سرتاسر وبال اور خسران ہوگی۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۝٥ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝٦

(حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی، اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا۔ ۵
مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ ۶)

حضرت نوح علیہ السلام کی عرضداشت

سابقہ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ایک حصہ نقل کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے بنیادی ارکان کیا تھے۔ اور آپ نے کس حکمت، محنت اور ہمدردی اور خیر خواہی سے اس کام کو آگے بڑھایا اور مسلسل سالہا سال تک اسی دھن میں لگے رہے جس کا مجموعی دورانیہ تقریباً ۹۰۰ سال ہے۔ لیکن قوم نے اس کے جواب میں جو کچھ کیا اور جس طرح آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اس کا ذکر کرنے کی بجائے آپ نے زندگی کے آخری دنوں میں ایک عرضداشت پیش کی ہے جس کا ان آیات میں

Marfat.com

ذکر کیا جارہا ہے۔اس میں نہ کسی مبالغے کا دخل ہے، نہ داستان سرائی کا۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول اپنی قوم کیلئے عدالت بن کر آتے ہیں۔ان کی زبان سے کبھی کوئی ایسی مبالغہ آمیز بات نہیں نکلتی جس کے ڈانڈے جھوٹ سے ملتے ہوں۔یوں تو ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو سمجھانے اور دین کی دعوت پیش کرنے میں شب و روز محنت کی۔اور کہیں بھی کسی کمزوری کو پیدا نہیں ہونے دیا۔لیکن حضرت نوح علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپؑ نے جتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو جھنجھوڑا اور جگایا اس کی مثال کہیں اور ملنا ممکن نہیں۔لیکن قوم نے اس بے مزد محنت اور نہایت مخلصانہ جانثاری کی قدر کرنے کی بجائے ایسا برا رد عمل دکھایا کہ حضرت نوح علیہ السلام یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا، مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔یعنی جتنا ہی زیادہ میں نے ان کو پکارا وہ اتنا ہی زیادہ مجھ سے بھاگے۔بظاہر سننے والا یہ سمجھتا ہے کہ آپ کی دعوت میں یقیناً کوئی بات عقل و فطرت کے خلاف ہوگی یا وہ لوگ آپ کے خلوص اور راست بازی سے شاکی ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغمبر بھی دنیا میں ایسا نہیں آیا کہ جس کی قوم نے اس کی دعوت یا اس کے خلوص پر کبھی شبے کا اظہار کیا ہو۔ان کی دعوت کی معقولیت ہر شخص کو تسلیم تھی اور ہر شخص ان کے کردار کی عظمت کا اعتراف کرتا تھا۔ان کے ردعمل کی نامعقولیت اور ان کے ظالمانہ گریز کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اس دعوت کے قبول کرنے سے قوم کے سربرآوردہ لوگوں کی خودساختہ طبقاتی مراعات پر چوٹ پڑتی تھی۔وہ دیکھتے تھے کہ اس دعوت کے نتیجے میں انسانی مساوات کے جس اصول پر زور دیا جارہا ہے اس سے ہماری قوم کا ایک عام آدمی ہمارے برابر ہو جائے گا۔اس سے ان کے استکبار پر ایک ایسی ضرب پڑتی تھی جو ان کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔پھر وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ ان کی نفسانی خواہشوں کے بروئے کار آنے کے اس میں کوئی امکانات نہیں۔اس لئے عافیت اسی میں ہے آپ کی دعوت سے گریز کا راستہ اختیار کیا جائے۔

وَاِنِّیْ کُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ
وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوا اسْتِکْبَارًا ﴿۷﴾

(میں نے جب بھی ان کو بلایا تا کہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں۔
اپنی چادریں اپنے اوپر لپیٹ لیں، اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ ۷)

مستکبرین کے استکبار کی تصویر

یہ اس قوم کے مستکبرین کے گریز و استکبار کی تصویر ہے۔حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے جب بھی ان کو پکارا تا کہ تو انہیں بخش دے۔اس جملے کا اسلوب خود بتا رہا ہے کہ یہاں ایک لفظ محذوف ہے جس پر قرینہ دلالت کر رہا ہے کیونکہ جب ایک گناہگار شخص کو دعوت دی جاتی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف آؤ تا کہ تمہارا خدا تمہیں بخش دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹو اور توبہ کرو۔اپنی خطاؤں کا اقرار کرو، غلط خیالات کو رد کر دو اور اعتراف و اقرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری بخشش فرما دے گا۔لیکن ان بدنصیبوں کا حال یہ تھا کہ میں نے جب بھی ان کی عاقبت سنوارنے کیلئے انہیں توبہ اور استغفار کی دعوت دی تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور انہوں نے میری بات سننے سے انکار کر دیا اور اپنی چادریں اپنے اوپر لپیٹ لیں۔یعنی بات سننا تو درکنار انہوں نے نہایت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اپنی اوپر اپنی چادر لپیٹی اور وہاں سے چل دیئے۔اس طرح سے انہوں نے اپنے

Marfat.com

خیالات اور اپنے رویئے پر اصرار جاری رکھا اور اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور اس پر قائم کئے جانے والے دلائل کا کوئی جواب نہ دے پائے اور یہ دیکھا کہ حضرت نوح علیہ السلام نہایت مخلصانہ طریقے سے ہر موقع پر ہمیں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم کسی قیمت پر اسے سننے کے روادار نہیں تو بچنے کی یہی ایک صورت ہے کہ چادر لپیٹ کر اور چھپ کر ان کے پاس سے گزرا جائے تا کہ وہ عدم معرفت کے باعث بات کرنے پر قادر نہ ہو سکیں۔ اس طرح سے وہ اپنی بات پر اڑے رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں اپنی بات کی صداقت پر یقین تھا بلکہ ان کے اڑنے کا سبب ان کا استکبار تھا۔ کیونکہ وہ تکبر کے مریض تھے۔ حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کر لینے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی شیطان کو اپنا رہبر بنا لیتا ہے وہ اس کے اندر اپنے اخلاق پیدا کر دیتا ہے اور ابلیس کا اصل امتیاز حق کے مقابلے میں سرکشی اور پھر اس پر اڑ جانا ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی روش میں اسی راستے پر چل رہے تھے۔

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴿۸﴾ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ﴿۹﴾

(پھر میں نے ان کو بلایا برملا۔ ۸) پھر میں نے ان کو کھلم کھلا بھی سمجھایا اور چھپ کر چپکے چپکے بھی۔ ۹)

سابقہ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے مخالفانہ رویئے اور آپ کی دعوت کے جواب میں انتہائی تکبر وغرور کا اظہار دیکھ کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے انہیں دعوت دینا بند کر دیا ہوگا۔ اور آپ اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ سر کھپانا، سر پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسا حوصلہ عطا فرمایا تھا کہ ایسی حوصلہ شکن صورتحال میں بھی آپ مایوس ہونے کی بجائے ولولۂ تازہ لے کر اٹھتے ہیں اور ان کے رویئے سے شاکی ہونے کی بجائے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ میری دعوتی مساعی اور تبلیغی کاوشوں کیلئے دراصل ایک چیلنج ہے۔ اس لئے بجائے اپنے اوپر اضمحلال طاری کرنے کے آپ نے اپنے دعوت کے لب ولہجہ کو تیز تر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

نوا را تیز تر می کن، چوں اثرِ نغمہ کمیابی

رہی ان کی مزاحمت اور مخالفت، ان کا گریز اور ان کا استکبار، تو یہ بھی میرے حوصلے کو بلند کرنے اور کوششوں کو تیز کرنے کی دعوت ہے۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

فریضۂ رسالت پر پیغمبر کی استقامت

حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں، ایسے مخالفانہ ماحول میں بھی میں نے ہمت ہارنے کی بجائے ہر طرح کے حالات میں بات کی۔ کہیں ڈنکے کی چوٹ بات کہنے کی ضرورت ہوئی تو وہاں میں نے بے دریغ ڈنکے کی چوٹ بات کہی تا کہ ہر طرح کے لوگ میری بات سن سکیں اور جہاں میں نے محسوس کیا کہ ان کے اندر اتر کر اور اعتماد میں لے کر بات سمجھانے کی ضرورت ہے تو وہاں میں نے یہ طریقہ بھی آزمایا۔ پیش نظر دراصل یہ تھا کہ وہ کسی طرح ہدایت کے راستے پر آ جائیں اور اپنے انجام کو بہتر بنا لیں۔

Marfat.com

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾
وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾

(پھر میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو، بیشک وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ ۱۰) وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ ۱۱) اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کرے گا، تمہارے لئے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کر دے گا۔ ۱۲)

نرمی اور حکمت سے دعوت کی مثال

یہ دلوں میں اتر کر اور نہایت اعتماد میں لے کر بات کہنے کی مثال ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ تم آج کل اپنے حالات کی گرفت میں ہو، تمہارے کاروبار مندے کا شکار ہیں، تمہاری زراعت اجڑتی جا رہی ہے، بارشیں ہیں کہ وقت پر ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ تم اگر اپنے حالات بدلنا چاہتے ہو تو اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، یعنی ایمان لاؤ، میری پیروی کرو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاؤ۔ وہ بہت بخشنے والا ہے۔ تمہارے زندگی بھر کے گناہ معاف کر دے گا۔ تم پر مسلسل موسلا دھار بارشیں نازل فرمائے گا، اس کی مہربانیوں کی کوئی انتہا نہیں، وہ تمہیں مال و دولت سے بھی نوازے گا اور تمہاری اولاد میں بھی برکت دے گا، تمہارے باغ بھی پھلیں پھولیں گے اور تمہارے لئے نہریں رواں کر دے گا۔ اس طرح سے ان کو سرسبزی و شادابی اور خوشحالی و فارغ البالی کا راستہ بھی دکھایا تا کہ وہ اگر عذاب سے ڈر کر راہِ راست پر آنے کیلئے تیار نہیں تو اپنی زندگی بہتر بنانے کیلئے ہی اللہ تعالیٰ کے آستانے پر جھک جائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے دعوتی کلمات سے دو حقیقتوں کی طرف رہنمائی ملتی ہے اور قرآن کریم میں کئی مقامات پر اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے کہ خدا سے بغاوت کی روش صرف آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی انسان کی زندگی کو تنگ کر دیتی ہے اور ایمان و تقویٰ اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا طریقہ صرف آخرت ہی میں نافع نہیں بلکہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا سزاوار بناتا ہے۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ میں قرآنِ کریم کے حوالے سے فرمایا گیا ہے کہ جو شخص میرے ذکر (قرآنِ کریم) سے منہ موڑے گا اس کیلئے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ اسی طرح قرآنِ کریم کی کئی آیات میں تورات، انجیل اور دوسری آسمانی کتابوں کو قائم کرنے پر دنیا میں رزق کے برسنے اور نیچے سے ابلنے کا مژدہ سنایا گیا ہے اور کہیں فرمایا گیا ہے کہ اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کے لوگوں سے فرمایا کہ میں یہ ایک کلمہ لے کر آیا ہوں، اگر تم اسے مان لو تو اس سے تم عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم پر حکمرانی کرو گے۔

دوسری بات ہمیں اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ بارشیں گناہوں کی کثرت سے رکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ لوگ گناہ چھوڑ دیں اور استغفار کریں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اسی بات کو سمجھتے ہوئے ایک مرتبہ نمازِ استسقاء میں صرف استغفار پر کفایت فرمائی۔ لوگوں نے عرض کیا، امیر المومنین آپ نے بارش کیلئے تو دعا کی ہی نہیں، فرمایا: میں نے آسمان کے ان دروازوں کو کھٹکھٹا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے اور پھر سورۃ نوح کی یہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں۔ (ابنِ جریر و ابنِ کثیر) اس سے معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے کہ خدا کی رحمت کی کلید استغفار ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت حسن بصری کی مجلس میں ایک شخص نے خشک سالی کی شکایت کی۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو۔ دوسرے شخص نے تنگدستی کی شکایت کی، تیسرے نے کہا میرے یہاں اولاد نہیں ہوتی، چوتھے نے کہا میری زمین کی پیداوار کم ہو رہی ہے۔ ہر ایک کو وہ یہی جواب دیتے چلے گئے کہ استغفار کرو۔ لوگوں نے کہا یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ سب کو مختلف شکایتوں کا ایک ہی علاج بتا رہے ہو۔ انہوں نے جواب میں سورۃ نوح کی یہ آیت سنا دی۔ (کشاف)

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾

(تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے بڑائی کی امید نہیں رکھتے۔ ۱۳)

قوم کی بے التفاتی اور بے نیازی کو دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ میں تمہارے سامنے مختلف طریقوں سے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کیلئے طریقے طریقے سے تمہیں استغفار کی دعوت دے رہا ہوں، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم میری بات سن کے بھی نہیں دیتے ہو۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور سرداروں کے بارے میں تو تم یہ سمجھتے ہو کہ ان کے وقار کے خلاف کوئی حرکت کرنا خطرناک ہے، لیکن جس رب نے تمہیں یہ سب کچھ دے رکھا ہے تمہارا کیا خیال ہے کہ اس کا جلال تمہاری بدمستیوں کے باوجود کبھی ظہور میں نہیں آئے گا۔ تم اپنے گردو پیش میں اللہ تعالیٰ کی بیشمار نعمتوں کو دیکھتے ہو اور جن لوگوں کو فراوانی سے یہ نعمتیں میسر ہیں انہیں بھی دیکھتے ہو کہ وہ شب و روز اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے کسی کی پکڑ نہیں ہو رہی۔ اس سے تم نے یہ سمجھا ہے کہ دنیا میں جو دھاندلی چاہے ہوتی رہے اللہ تعالیٰ کی غیرت و حمیت کبھی جوش میں نہیں آتی۔ لیکن یہ تمہاری بھول ہے کیونکہ وہ سب سے بڑی ذات ہے اور بے پناہ قدرتوں کی مالک ہے اس لئے مواخذے میں جلدی نہیں کرتی۔ لیکن جب وہ پکڑنے پر آتی ہے تو پھر اس کی پکڑ بہت شدید ہوتی ہے۔

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾

(حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ ۱۴)

تخلیق کے مختلف مراحل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی گرفت سے انسان کی بے نیازی اور لاپرواہی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے انسان کی اپنی تخلیق کے مختلف مراحل میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا جس طرح ظہور ہوتا ہے اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ تم خدا کی عظمت کے ظہور کو بہت مستبعد سمجھتے ہو اور اس کی گرفت سے بالکل نچنت ہو گئے ہو حالانکہ تم اپنی ذات کے حوالے سے ہی غور کرو تو تمہیں اپنی تخلیق کے ہر مرحلے پر اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت کا بھی احساس ہوگا اور یہ بھی اندازہ ہوگا کہ تم اس کی قدرت کے ہاتھوں میں کس قدر بے بس ہو۔ وہ تمہیں جیسا بنانا چاہتا ہے بناتا ہے اور

Marfat.com

اگر ختم کرنا چاہے یا بگاڑنا چاہے تو اس کی قدرت کے سامنے کوئی مانع نہیں۔ ذرا غور کرو کہ تم ماں اور باپ کی صلب میں الگ الگ نطفوں کی شکل میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت ہی سے یہ دونوں نطفے باہم ملے اور تمہارا استقرارِ حمل ہوا، پھر نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں بتدریج نشوونما دے کر تمہیں پوری انسانی شکل عطا کی اور تمہارے اندر وہ تمام قوتیں پیدا کیں جو دنیا میں انسان کی حیثیت سے کام کرنے کیلئے تمہیں درکار تھیں، پھر ایک زندہ بچے کی صورت میں تم بطنِ مادر سے باہر آئے اور ہر آن تمہیں ایک حالت سے دوسری حالت تک ترقی دی جاتی رہی یہاں تک کہ تم جوانی اور کہولت کی عمر کو پہنچے۔ ان میں سے ایک ایک مرحلے پر غور کرو، تم کس طرح اللہ تعالیٰ کی گرفت میں تھے اور اس کی قدرت کے سامنے کتنے بےبس تھے۔ وہ جس مرحلے میں چاہتا تمہارا وجود بننے سے روک دیتا یا تمہیں انسان کی بجائے کچھ اور بنا دیتا یا تمہیں معذور پیدا کر دیتا یا تمہاری عقل میں فتور رکھ دیتا۔ تو جو انسان پیدا ہونے کے بعد مختلف حیثیتوں سے نمایاں ہوتا اور اپنے آپ کو منواتا ہے وہ کاش کبھی ان مراحل کو بھی یاد کرے جن سے گزر کر وہ اس سطح پر پہنچا ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھے کہ آج بھی اگر میرے جسم کو مفلوج کر دیا جائے یا میرے ذہن میں اختلال پیدا کر دیا جائے تو میرا سب کچھ ختم ہو سکتا ہے۔ میں کس طرح اپنے پیدا کرنے والے کے ہاتھوں میں بےبس ہوں۔ تو جس خالق و مالک اور پروردگار کی قدرت کا یہ عالم ہے اور جس کے ہاتھوں میں تم اتنے بےبس ہو، اس کے بارے میں تم نے یہ کیسے گمان کر رکھا ہے کہ اس کی شان میں ہر گستاخی کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہر طرح کی نمک حرامی اور احسان فراموشی کا ارتکاب کیا جا سکتا ہے۔

انسان کی خلقت کے حوالے سے ہی اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت اور وقوعِ قیامت پر استدلال کیا ہے کہ وہ پروردگار جس کی قدرت کی شانیں تم اپنی وجود میں دیکھتے ہو، اس کیلئے کیا مشکل ہے کہ تمہارے مر کھپ جانے کے بعد از سرِنو تمہیں اٹھا کھڑا کرے اور تم اپنے ایک ایک عمل کو وہاں موجود پاؤ اور اس حوالے سے تمہیں جوابدہی کے مراحل سے گزرنا پڑے۔ قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پر مختلف اسالیب میں اس دلیل کا ذکر فرمایا ہے، ہم صرف ایک مقام کا حوالہ دیتے ہیں۔ سورۃ الحج میں ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ لِّنُبَیِّنَ لَکُمْ ط وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُکُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّکُمْ ج وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا ط وَتَرَی الْاَرْضَ ھَامِدَۃً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ کُلِّ زَوْجٍۭ بَھِیْجٍ ۰ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ وَاَنَّہٗ یُحْیِ الْمَوْتٰی وَاَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۵ (الحج. ۲۲ : ۵.۶) ''اے لوگو! اگر تم مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے بارے میں شک میں ہو تو سوچو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کی پھٹکی سے، پھر مضغۂ گوشت سے، کوئی کامل، کوئی ادھورا، ہم نے اپنی یہ شانیں اس لئے دکھائیں کہ تم پر اپنی قدرت واضح کر دیں۔ اور رحموں میں ہم ٹھہراتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک معین مدت تک۔ پھر ہم تم کو ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، پھر ہم تم کو مہلت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں کچھ پہلے ہی مر جاتے ہیں، اور تم میں سے بعض ارذلِ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے اور تم زمین کو دیکھتے ہو کہ وہ بالکل خشک ہوتی ہے تو جب ہم اس پر برساتے ہیں بارش تو وہ لہریں لینے لگتی اور پھول جاتی ہے اور نوع بنوع کی خوش منظر چیزیں اگاتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی کارسازِ حقیقی ہے۔ اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ہمہ گیری جسے ہماری ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی لیکن میڈیکل سائنس کی کارکردگی نے ہمارے لئے اسے آسان کردیا ہے۔ میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ انسانی جسم کے ترکیبی اجزاء کو خلیہ (سیل) کہتے ہیں۔ ایک اوسط درجے کا جسم اندازاً 26 ارب ملین خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ورزش، محنت اور مطالعہ سے یہ خلیے ٹوٹتے اور ان کی جگہ نئے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ ماہرینِ ابدان کا اندازہ یہ ہے کہ ہر سات سال کے بعد جسم کی مکمل تجدید ہوجاتی ہے۔ پرانے خلیے مرجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے لے لیتے ہیں۔ جو شخص یہاں عمر کے ستر سال گزارتا ہے وہ گویا دس مرتبہ مرچکا ہوتا ہے۔ لیکن موت کے ان مسلسل حملوں کے باوجود وہ زندہ رہتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ موت کے آخری حملے کے بعد بھی وہ زندہ رہے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿١٥﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ
سِرَاجًا ﴿١٦﴾ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿١٧﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿١٨﴾
وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿١٩﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿٢٠﴾

(کیاتم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے۔ ۱۵) اور چاند کو ان کے اندر روشنی بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔ ۱۶) اور اللہ ہی نے تم کو زمین سے خاص اہتمام سے اگایا۔ ۱۷) پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ ۱۸) اور اللہ ہی نے تمہارے لئے زمین کو فرش کی طرح بچھادیا۔ ۱۹) تاکہ تم اس کی کھلی راہوں میں چلو۔ ۲۰)

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ہمہ گیری

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ہمہ گیری اور اس کی عظمت کو دلوں میں اتارنے کیلئے ان چھ آیتوں میں مختلف مخلوقات کی پیدائش کا ذکر فرمایا ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ چھ آیتیں حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر کا حصہ ہیں۔ لیکن بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ ممکن ہے کہ یہ آیتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ تضمین تقریر کی تکمیل کیلئے شامل کی گئی ہوں۔ وہ دلیل کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ ان آیتوں کے تضمین ہونے پر ایک قرینہ موجود ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر مسلسل جاری ہے لیکن ان آیتوں کے اختتام پر قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ آیات حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر کا حصہ ہوتیں تو اس جملے کا اعادہ نہ کیا جاتا۔ دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی اختیار کرلی جائے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اظہار کیلئے بعض نشانیوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں نشانی سات آسمانوں کا تہ بہ تہ پیدا کیا جانا ہے۔ آسمان کے وسیع حجم، اس کی حیران کن بلندی، اس کا حیرت میں ڈال دینے والا

Marfat.com

استحکام، امتدادِ زمانہ کے باوجود کہیں اس میں کسی دراڑ کا پیدا نہ ہونا ان میں سے ایک ایک بات اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بے پناہی اور انسان کو ششدر کر دینے والی ہے۔ قرآنِ کریم میں اور بھی کئی جگہ اس دلیل کو بیان کر کے سوال کیا ہے کہ کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کو بنانا۔ جو آسمان کو بنانے پر قادر ہے وہ تمہیں ازسرِ نو زندہ کر دینے پر قادر کیوں نہیں۔

طِبَاقًا ...... تہ بہ تہ۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ کپڑے کی تہوں کی طرح آسمان کی بھی سات تہیں ہیں بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات جہان پیدا کیے ہیں اور ان کے الگ الگ سات آسمان ہیں، لیکن ہم ان چیزوں کی حقیقت سے واقف نہیں۔ قرآن نے انہیں صرف اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت کا ایک اجمالی تصور دینے کیلئے بیان کیا ہے۔ اس لئے ان پر اجمالی ایمان ہی کافی ہے۔ اس کی صحیح حقیقت سے پردہ قیامت کے دن اٹھے گا۔ سائنس اس کے بارے میں اپنی نارسائی کے اعتراف کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔ حقیقت کا انکشاف ابھی اس کے بس میں نہیں۔

آسمانوں کا ذکر کرنے کے بعد چاند اور سورج جیسی دو عظیم نشانیوں کا ذکر فرمایا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا اظہار صرف آسمانوں کی تخلیق ہی میں نہیں بلکہ اس کی حکمت اور عالمگیر ربوبیت میں بھی ہے۔ اس کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان جہانوں کو عالمِ ظلمات نہ بنایا جائے۔ اس لئے ان میں چاند کا دِیا اور سورج کا چراغ روشن کیا گیا۔

آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد زمین کی نشانی کی طرف توجہ دلائی۔ زمین پر چونکہ سب سے اشرف مخلوق انسان ہے اس لئے انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا، لیکن اس کی تخلیق کو جن الفاظ سے تعبیر کیا ہے اس سے خود بخود ایک دلیل پیدا ہوگئی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح زمین سے سبزہ اگتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین سے اگایا اور جس طرح زمین سے اگنے والی چیزیں فنا ہو کر زمین میں مل جاتی ہیں اسی طرح تم بھی مر کر زمین میں مٹی بن جاتے ہو، پھر جس طرح تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے فنا شدہ سبزوں کو ازسرِ نو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح جب چاہے گا تمہیں بھی بغیر کسی زحمت کے اٹھا کھڑا کرے گا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ زمین سے اگنے والے سبزے کے بارے میں تمام تبدیلیاں ہمارے سامنے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمیں ان میں کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ لیکن انسانوں کا معاملہ چونکہ ہماری آنکھوں سے ابھی دور ہے حالانکہ عقل اسے بھی قبول کرتی ہے تو ہمارے عقل کے پرستار بجائے عقل کی بات ماننے کے حواس کے قفس میں بند ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس کے بعد خود زمین کی نشانی کی طرف توجہ دلائی گئی جس سے اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و حکمت کا تو اظہار ہوتا ہی ہے اس کی بے نہایت رحمت و عنایت کا بھی اظہار ہو رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو خالی پیدا ہی نہیں کیا بلکہ اسے تمہارے لئے بچھونا بنایا اور فرش کی طرح بچھا دیا۔ اس میں نہ ایسی سختی رکھی کہ تم اس پر بیٹھ یا لیٹ نہ سکو اور نہ اتنی نرمی رکھی کہ پاؤں دھنس جائیں اور بارش برسنے سے دلدل بن جائے، پھر اسے متوازن رکھنے کیلئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور پہاڑوں کو باہم پیوست نہیں رکھا کہ تم دوسرے علاقوں سے کٹ کر رہ جاؤ بلکہ ان کے اندر درے اور راستے نکال دیئے تاکہ تم ایک سے دوسرے علاقوں میں جانے کیلئے کوئی دشواری محسوس نہ کرو۔

Marfat.com

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَ
وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ
اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ وَّ لَا یَغُوْثَ وَ یَعُوْقَ وَ
نَسْرًا ﴿۲۳﴾ وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا ۚ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾
مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾ وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ
مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ
لَا یَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ
لِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا
تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

رکوع: ۲۔ (حضرت نوح علیہ السلام نے کہا اے میرے رب، انہوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی پیروی کی جن کے مال اور جن کی اولاد نے ان کے خسارے ہی میں اضافہ کیا۔ ۲۱) اور انہوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ ۲۲) اور کہا ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور ہرگز نہ چھوڑو ودکو اور سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نہ نسر کو۔ ۲۳) انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرڈالا ہے اور اب تو ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔ ۲۴) وہ اپنی خطاؤں کی بنا پر غرق کیے گئے، پھر آگ میں جھونک دیئے گئے، پس اللہ کے مقابل میں انہوں نے کسی کو اپنا مددگار نہیں پایا۔ ۲۵) حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی، اے میرے رب! تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک متنفس کو بھی نہ چھوڑ۔ ۲۶) اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نابکاروں اور کافروں کو ہی جنم دیں گے۔ ۲۷) اے میرے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور ہر اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرمادے اور کافروں کی ہلاکت ہی میں اضافہ فرما۔ ۲۸)

Marfat.com

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾

(حضرت نوح علیہ السلام نے کہا اے میرے رب، انہوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی پیروی کی جن کے مال اور جن کی اولاد نے ان کے خسارے ہی میں اضافہ کیا۔ ۲۱)

قوم کی سنگدلی

حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت اور بے پناہ گرفت کا تصور دے کر بدلنے کی کوشش کی۔ دلائلِ انفس اور دلائلِ آفاق سے اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر قدرت کو مبرہن کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کی رحمت وعنایت کا حوالہ دے کر ان کی طبیعتوں میں میلان کی جوت جگانا چاہی۔ لیکن یہ ایسے سنگدل لوگ تھے کہ کسی بات نے ان پر اثر نہ کیا۔ آخر زندگی اور دعوت کے آخری مرحلے میں جب وہ اتمامِ حجت کر چکے تھے، اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ الٰہی میں نے سارے جتن کر کے دیکھ لئے لیکن وہ میری کسی بات کا اثر قبول کر کے نہیں دیتے۔ وہ ان لیڈروں کی پیروی کرتے ہیں جنہیں اپنے مال واولاد کی کثرت پر ناز ہے اور اسی کثرت نے انہیں استکبار کا مریض بنا دیا ہے۔ وہ اپنے غرور وتکبر کے باعث میری باتوں کو گئے وقتوں کے افسانے سمجھتے ہیں اور میری قوم ایسے ہی لوگوں کے پیچھے چلنے اور پیروی کرنے میں عافیت محسوس کرتی ہے۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾

(اور انہوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ ۲۲)

بگاڑ کا سبب متکبرین ہیں

كُبَّارً ...... کبیر سے مبالغہ ہے۔ کہ ان سرداروں اور پیشواؤں نے اپنی قوم کو حضرت نوح علیہ السلام سے برگشتہ کرنے اور ان کی تعلیمات سے بہکانے کیلئے بڑی بڑی چالیں چلیں، بڑے بڑے فریب دیئے، عجیب وغریب اعتراضات اٹھائے۔ یہاں ان چالوں کی اگرچہ تفصیل بیان نہیں کی گئی لیکن قرآنِ کریم نے مختلف انبیائے کرام کے حوالے سے ان کی قوموں کے متکبرین کے جو حالات بیان کئے ہیں انہیں دیکھ کر ان چالوں کی تفصیل جاننا کوئی مشکل نہیں۔ وہ یقیناً اپنی قوم سے کہتے ہوں گے کہ نوح (علیہ السلام) بھی تم ہی جیسا ایک آدمی ہے، اسے پیغمبر کیسے مان لیا جائے۔ اس کی بات میں اگر کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اکابر اس پر ایمان لاتے۔ یہ چھوٹے درجے کے لوگ ان کا کسی پر ایمان لانا کیا معنی رکھتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہوگا کہ خدا کو اگر کسی کو پیغمبر بنا کے بھیجنا ہی ہوتا تو وہ کسی فرشتے کو بھیجتا۔ اور اگر کسی انسان کو بھی بھیجا جاتا تو اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہوتا جو لوگوں کو دھمکاتا اور پھر وہ نبی بننے والا شخص خزانوں کا مالک ہوتا۔ ایسی بہت سی باتیں جو مختلف مواقع پر قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی ہیں وہ لوگوں کو مشتعل کرنے کیلئے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ یہ شخص دراصل تم پر اپنی برتری قائم کرنا چاہتا ہے، اس نے اس کیلئے نبوت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ جب وہ عالمِ غیب کی خبریں دیتا تو کہتے اس پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ بہر حال ان کی مختلف چالیں، ان کے قسم قسم کے چرتر، ان کے مختلف فریب، قوم کو حضرت نوح علیہ السلام سے برگشتہ کرنے کیلئے استعمال کئے جاتے تھے۔

Marfat.com

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾

(اور کہا ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور ہرگز نہ چھوڑو ود کو اور سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نہ نسر کو۔ ۲۳)

لیڈروں کی قوم کو بت پرستی پر جمے رہنے کی تلقین

اور قوم کے لیڈروں نے مختلف تدبیریں کیں اور بڑی بڑی چالیں چلیں، ان میں سے ایک چال قوم کو اپنے عقائد پر جمے رہنے کی تلقین تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام تمہیں توحید کا درس دیتے ہیں، ایک اللہ کے سوا سب کی پوجا سے روکتے ہیں لیکن تم اس شخص کے کہنے سے اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو۔ اور پھر ان کے معبودوں کے نام لئے گئے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہی بت ہیں جنہیں بعد میں اہلِ عرب نے بھی پوجنا شروع کر دیا اور آغازِ اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ ان کے مندر بنے ہوئے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح نے کسی کافر اور مشرک کو زندہ نہیں چھوڑا، بتوں سمیت ہر چیز تباہ ہوگئی اور جو لوگ زندہ بچے وہ توحید کے پرستار تھے، تو بعد میں ان بتوں کا تصور اور ان کے نام تک لوگوں میں کیسے پھیل گئے اور ان کی پوجا کیسے شروع ہوگئی؟ گمان کیا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح سے جو لوگ بچ گئے تھے وہ اپنی اولاد کو اپنی تباہ ہونے والی قوم کے طور اطوار کے حوالے سے کبھی قصے کہانیاں سنایا کرتے ہوں گے انہیں میں ان بتوں کا ذکر بھی آتا ہوگا۔ چنانچہ امتدادِ زمانہ کے بعد جب بعد کی نسلوں میں جاہلیت پھیلی تو ان سنی ہوئی کہانیوں میں سے بتوں کے نام ان کے ذہنوں میں محفوظ تھے، دوبارہ پھر ان ناموں کے بت تراشے اور ان کو پوجنا شروع کر دیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جب کبھی طوفانِ نوح سے بچ جانے والوں کی نسلوں میں شیطان کی کوششوں سے جاہلیت پھیلی اور شرک کی وباء نے سر اٹھانا شروع کیا تو شیطان نے اپنے چیلوں کی مدد سے ان بتوں کے نام سکھائے ہوں۔ اور ان کی نام نہاد کرامتوں کا ذکر کر کے لوگوں کو ان کی پوجا پر لگا دیا ہو۔

صاحبِ تفہیم القرآن نے کسی حد تک ان بتوں کی تفصیل بیان کی ہے جس کی پرستش عرب میں رائج ہوگئی تھی۔

وَدّ قبیلۂ قضاعہ کی شاخ بنی کلب بن وَبرَہ کا معبود تھا جس کا استھان انہوں نے دُومۃُ الجَندَل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام وَدَّم اَبَم (ود باپو) لکھا ہوا ملتا ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ اس کا بت ایک نہایت عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں وُدّ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبدِ وُدّ ہے۔

سُواع قبیلۂ ہذیل کی دیوی تھی اور اس کا بت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ ینبوع کے قریب رہاط کے مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

یغوث قبیلۂ طے کی شاخ انعم اور قبیلۂ مذحج کی بعض شاخوں کا معبود تھا۔ مذحج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان جرش کے مقام پر اس کا بت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عبد یغوث ملتا ہے۔

یعوق یمن کے علاقہ ہمدان میں قبیلۂ ہمدان کی شاخ خیوان کا معبود تھا اور اس کا بت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

نسر حمیر کے علاقے میں قبیلۂ حمیر کی شاخ آلِ ذوالکلاع کا معبود تھا اور بلخع کے مقام پر اس کا بت نصب تھا جس کی شکل گدھ کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نسور لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ بیت نسور اور اس کے پجاریوں کو اہلِ نسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے متصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

Marfat.com

وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾

(انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرڈالا ہے اوراب توان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔ ۲۴)

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لیڈروں کی روش سے مایوسی

حضرت نوح علیہ السلام قوم کے لیڈروں کی روش سے انتہائی دلبرداشتہ ہیں۔ اس پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان بدبختوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرڈالا ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے جس مال ومنال اور اثر ورسوخ سے بہرہ ور کیا تھا اسے اللہ تعالیٰ کے شکر میں استعمال کرنے کی بجائے کفر پھیلانے میں استعمال کیا ہے۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے برگشتہ کرنا ان کا ہدف بن کر رہ گیا ہے۔ ایسے لوگ کسی رحم کے قابل نہیں۔ قبولیتِ حق کی صلاحیت ان کے اندر دم توڑ چکی ہے۔ تجربے نے ثابت کیا ہے کہ بھلائی کی کسی بات کو سن کے دینا ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ الٰہی! ان کے رویئے کے پیشِ نظر میری عاجزانہ گزارش ہے کہ اب ان کی ضلالت اور گمراہی میں اضافہ فرما، تاکہ گمراہی کے نتیجے میں جو عذاب ان کا مقدر بننے والا ہے اس کی طرف ان کی تیز روی میں اضافہ ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی یہ زمین جو ان کے بوجھ سے گراں بار ہوگئی ہے اس سے اسے نجات ملے۔

اللہ تعالیٰ کے رسول ایک ایک شخص کی ہدایت کیلئے کوشاں رہتے ہیں اور ہر ایک کی ہدایت کیلئے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دستِ دعا پھیلائے رہتے ہیں، لیکن جب انہیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رہنمائی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اب ان کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی، تو جس طرح دانوں کو الگ کرکے بھس کو جلا دیا جاتا ہے اسی طرح وہ بھی پھر اس بھس سے نجات پانے کیلئے دعا کرتے ہیں۔ سورۃ ہود کی آیت ۳۶ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتا دیا گیا تھا کہ جو لوگ اب تک ایمان نہیں لائے اب ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ایمان لانے والا ہو۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ آپؑ کی یہ دعا منشائے خداوندی کے بالکل مطابق تھی۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾

(وہ اپنی خطاؤں کی بنا پر غرق کئے گئے، پھر آگ میں جھونک دیئے گئے، پس اللہ کے مقابل میں انہوں نے کسی کو اپنا مددگار نہیں پایا۔ ۲۵)

دعا کی قبولیت

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے نکلنے والی دعا کیلئے درِ اجابت فوراً کھل گیا، کیونکہ یہ دعا اس وقت کی گئی جب آپؑ اپنی قوم پر اتمامِ حجت کرچکے تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کی ہمدردی اور غمخواری اور تبلیغی مساعی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انہیں ان کے جرائم کی پاداش میں غرق کردیا گیا، لیکن غرق ہونے پر ان کا قصہ تمام نہیں ہوگیا بلکہ مرنے کے بعد فوراً ہی ان کی روحیں آگ کے عذاب میں مبتلا کردی گئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب اظہار ہے کہ وہ لوگ پانی میں ڈوبے اور آگ میں نکلے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جہنم کی

Marfat.com

آگ مراد نہیں۔ اگرچہ بعض اہلِ علم نے اس سے جہنم کی آگ مراد لی ہے۔ کیونکہ جہنم میں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا اور آیتِ کریمہ میں اُغْرِقُوْا اور پھر فَاُدْخِلُوْا ایک ہی ساعت اور ایک ہی پیرائے میں ذکر کئے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برزخی آگ ہے جس میں داخل ہونے کی قرآنِ کریم نے خبر دی ہے۔ اور یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں۔ اس سے پہلے فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ بھی پروردگار ایسا ہی سلوک فرما چکے ہیں۔ انہیں دریا میں غرق کیا گیا اور پھر برزخی عذاب کے حوالے کر دیا گیا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عالمِ برزخ یعنی قبر میں رہنے کے زمانے میں بھی مردوں پر عذاب ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قبر میں بدعمل کو عذاب ہوگا تو نیک عمل والوں کو ثواب اور نعمت بھی ملے گی۔ احادیثِ صحیحہ متواترہ میں بھی قبر کے اندر عذاب وثواب ہونے کا بیان اس کثرت اور وضاحت سے آیا ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس پر امت کا اجماع اور اس کا اقرار اہلِ سنت والجماعت کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنی زندگی میں جن معبودوں کو اپنا حامی و مددگار سمجھتے تھے اور نہایت تکبر سے کہا کرتے تھے کہ قیامت محض ایک افسانہ ہے لیکن اگر بفرضِ محال قیامت آ ہی گئی تو ہمیں اس کی کیا فکر ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے معبود ہمیں قیامت کے عذاب سے بچا لیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو پھر انہیں بچانے کیلئے کوئی نہ آیا۔ اہلِ مکہ کو بھی یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ تم بھی اگر خدا کے عذاب میں مبتلا ہو گئے تو تمہارے یہ معبود جن پر تم بھروسہ کئے بیٹھے ہو تمہارے کسی کام نہ آئیں گے۔

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾

(حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی، اے میرے رب! تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک متنفس کو بھی نہ چھوڑ۔ ۲۶
اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نابکاروں اور کافروں کو ہی جنم دیں گے۔ ۲۷)

اتمامِ حجت کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کافروں سے بیزاری

حضرت نوح علیہ السلام چونکہ منشائے ایزدی کو پا چکے تھے کہ اب ان لوگوں میں کسی کو بھی ایمان نصیب ہونے والا نہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان پر اتمامِ حجت ہو چکا ہے۔ تو اب یہ لوگ دھرتی کا بوجھ تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے لوگوں کے بگاڑنے میں سخت جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ایسے لوگوں سے نفرت پیغمبر کی فطرت میں داخل ہوتی ہے۔ اس لئے آپؑ نے نہایت دلسوزی سے دعا کی کہ یا اللہ! اب ان میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑنا۔ اور چونکہ غلط زمین اور غلط ماحول ہمیشہ برائی کو جنم دیتے ہیں، یہ بھی سوائے فسق وفجور اور کفر کے پتلوں کے کسی اور کو وجود دینے کا باعث نہیں بنیں گے۔ یہ نہ خود اس قابل ہیں کہ زمین ان کا بوجھ اٹھائے اور نہ انہیں مزید کفر کو پھیلانے کی اجازت ہونی چاہئے۔

Marfat.com

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

(اے میرے رب! مجھے اور میرے والدین کو اور ہر اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرمادے اور کافروں کی ہلاکت ہی میں اضافہ فرما۔ ۲۸)

اس آیت کو پڑھتے ہوئے سب سے پہلی بات جس کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دعا کرنے والے حضرت نوح علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بے نیازی کا کیا کہنا کہ وہ سب سے پہلے اپنی مغفرت کی دعا کرتے ہیں حالانکہ ان کی مغفرت میں کیا شبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ کا جتنا قرب حاصل ہے وہ اتنا ہی اس کی بارگاہ میں عاجز اور سرفگندہ ہے۔

دوسری بات جس کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے والدین اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے تھے لیکن آپؑ کو ان کے حقوق کی ادائیگی کی فکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹا پیغمبر بھی ہو، اپنے والدین کے حقوق سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفانِ نوح کے آغاز سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اصحابِ ایمان کو حکم دے دیا تھا کہ وہ آپؑ کے گھر میں سکونت پذیر ہو جائیں اور پھر ان کے تکمیلِ ایمان اور قبولیتِ ایمان کیلئے دعا فرما رہے ہیں۔ اس لئے کہ ایمان اور قبولیت کے درمیان ایک فاصلہ ہے جس کا سر رشتہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کو توفیق کہتے ہیں۔ اسے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہنا اہلِ ایمان کا شیوہ ہے۔ اور آخر میں کافروں کیلئے پھر وہی دعا فرمائی ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی زمین ایسے جھاڑ جھنکار کیلئے نہیں بنائی گئی، یہ زمین اس قابل ہے کہ اس میں ایمان کے پھول کھلیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْجِنِّ

(۷۲)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْجِنِّ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ باقی سورتوں کے ناموں کی طرح ''الجن'' اس سورۃ کا نام ہے۔لیکن حُسنِ اتفاق یہ ہے کہ اس سورۃ کے بیشتر مضامین جنوں کے ایک واقعہ اوران کے تاثرات سے متعلق ہیں۔اس لحاظ سے یہ نام صرف شناخت ہی کا کام نہیں دیتا بلکہ کسی حد تک مضامین میں مرکزی کردار بھی ادا کرتا ہے۔

زمانۂ نزول:۔ قرآنِ کریم نے جنات کے قرآنِ کریم سننے اور اس سے متاثر ہو کر ایمان لانے اور پھر حق کی علمبرداری کرتے ہوئے اپنی قوم کو دعوت دینے کے واقعات دو جگہ بیان کئے ہیں۔ایک تو اس سورۃ میں جو اس وقت ہمارے سامنے ہے اور دوسری سورۃ احقاف آیات ۲۹ تا ۳۲ میں ہمارے بعض مفسرینِ کرام کو ان دونوں واقعات میں التباس ہو گیا ہے اور اسی التباس کے نتیجے میں سورۃ الجن کے زمانہ نزول سے متعلق اختلاف واقع ہوا ہے۔اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے دونوں واقعات کو بیان کر دیں۔

بخاری اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے چند صحابہ کے ساتھ بازار عکاظ تشریف لے جارہے تھے کہ راستے میں نخلہ کے مقام پر آپؐ نے صبح کی نماز پڑھائی۔اس وقت جنوں کا ایک گروہ ادھر سے گزر رہا تھا۔تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔شدید متاثر ہونے کی وجہ سے اسلام لے آیا۔لیکن اس کی ملاقات آنحضرت ﷺ سے نہیں ہوئی۔وہ لوگ اپنے طور پر ایمان لائے اور پھر اپنی قوم میں جا کر اس واقعہ کے حوالے سے انہوں نے ایمان کی دعوت دی۔اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جب جنات نے محسوس کیا کہ ان کی بعض آزادیوں پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔پہلے جنات کا معمول یہ تھا کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کرتے اور کوشش کرتے تھے کہ عالمِ بالا کی خبریں معلوم کریں۔فرشتوں کی باہم گفتگو سے کسی بات کی خبر ہو جاتی تو وہ اضافوں کے ساتھ کاہنوں کو بتاتے تھے اور ان اطلاعات پر کاہنوں کا کاروبار چلتا تھا۔اچانک انہیں محسوس ہوا کہ ہر طرف فرشتوں کے سخت پہرے لگ گئے ہیں اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے۔وہ اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں تو فرشتوں کے پہروں کی وجہ سے اوپر جانے سے روک دیئے جاتے ہیں اور اگر چوری چھپے کسی طرف سے نکلنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان پر شہابیے برستے ہیں۔اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ زمین میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کیلئے یہ سخت انتظامات کئے گئے ہیں۔چنانچہ اس کی تحقیق کیلئے زمین کے مشرق اور مغرب اور ہر طرف جنات کے وفود بھیجے گئے کہ وہ حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔اسی کوشش میں وہ مقامِ نخلہ پر بھی پہنچے اور وہاں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہؓ کرام کے ساتھ صبح کی نماز جماعت سے ادا کر رہے تھے۔جنات کے اس وفد نے جب قرآنِ کریم سنا تو قسمیں کھا کر کہنے لگے کہ واللہ یہی کلام ہے جو ہماری اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل اور مانع بنا ہے۔

Marfat.com

دوسرا واقعہ جو قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد جب قریش کی طرف سے اذیتوں اور مخالفتوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا اور آپؐ کی تبلیغی مساعی تقریباً رک کر رہ گئیں تو آپؐ نے طائف کا سفر کیا کہ ممکن ہے کہ طائف میں قبیلہ بنو ثقیف سے کوئی حوصلہ افزا جواب ملے اور اس سے اسلام کی تبلیغ ودعوت کو نئی قوت نصیب ہو۔ لیکن طائف کے تینوں سرداروں (جو آپس میں بھائی تھے) نے نہایت غیر شریفانہ جواب دیا اور پھر شہر کے اوباشوں کو آپؐ کو ستانے اور مذاق اڑانے پر لگا دیا۔ تاریخ ان واقعات سے معمور ہے۔ آپؐ ان لوگوں کی چیرہ دستیوں اور ایذا رسانیوں سے بچنے کیلئے ایک باغ میں پناہ گزین ہوئے جو عتبہ اور شیبہ کا باغ تھا۔ وہاں قدرے ستانے کے بعد آپؐ نے اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں دعا مانگی۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ''اے اللہ! میں آپ سے شکایت کرتا ہوں، اپنی قوت کے ضعف اور کمی اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی خفت اور بے توقیری کی، آپ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں اور آپ کمزوروں کی پرورش فرمانے والے ہیں، آپ ہی میرے رب ہیں، آپ مجھے کس کے سپرد کرتے ہیں، کیا ایک غیر آدمی کے جو مجھ پر حملہ کرے؟ یا کسی دشمن کے جس کو آپ نے میرے معاملہ کا مالک بنا دیا ہے، اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے ان سب چیزوں کی بھی پرواہ نہیں، آپ کی عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے، میں آپ کی ذاتِ مبارک کے نور کی پناہ لیتا ہوں جس سے تمام اندھیریاں روشن ہو جاتی ہیں، دنیا وآخرت کے سب کام درست ہو جاتے ہیں، اس بات سے کہ مجھ پر تو اپنا غضب نازل فرمائے، ہمارا کام ہی یہ ہے کہ آپ کو راضی کرنے اور منانے میں لگے رہیں جب تک کہ آپ راضی نہ ہو جائیں اور ہم تو کسی برائی سے بچ سکتے نہیں، نہ کسی بھلائی کو حاصل کر سکتے ہیں بجز آپ کی مدد کے۔'' اس کے بعد رسول اللہ ﷺ طائف سے مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ گئے جبکہ ثقیف کی ہر خیر سے مایوس ہو گئے۔ واپسی پر آپؐ نے مقامِ نخلہ پر قیام فرمایا اور آخری شب میں نماز تہجد پڑھنے لگے تو ملک یمن نصیبین کے جنات کا یہ وفد بھی وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس نے قرآن سنا اور سن کر ایمان لے آئے اور اپنی قوم کی طرف واپس جا کر یہ واقعہ بیان کیا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحقاف میں کیا ہے۔

طائف میں پیش آنے والا واقعہ بالاتفاق دس نبوی کو پیش آیا۔ جن لوگوں نے دونوں واقعات کو ایک سمجھا ہے وہ اسے دس نبوی کا واقعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ قیاس متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جن جنات کا سورۃ الاحقاف میں ذکر ہوا ہے ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ پہلے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور سابقہ کتب آسمانی پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے برعکس سورۃ الجن میں جن جنات کا ذکر ہے اس کے بارے میں ان آیات میں وضاحت موجود ہے کہ وہ مشرک تھے اور رسالت اور آخرت کے منکر تھے۔

یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ طائف کے سفر میں حضرت زید بن حارثہؓ کے سوا اور کوئی آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہ تھا۔ بخلاف دوسرے واقعہ کے اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ چند صحابہ کرامؓ آپ کے ساتھ تھے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ طائف سے مکہ واپس تشریف لاتے ہوئے جب آپؐ وادیِ نخلہ میں ٹھہرے تھے اس وقت تہجد کی نماز میں جنات نے قرآنِ کریم سنا اور ایمان لائے۔ یعنی یہ واقعہ نخلہ میں پیش آیا۔ لیکن دوسرے واقعہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آپؐ چند صحابہ کرامؓ کے ساتھ عکاظ تشریف لے جا رہے تھے۔ ان وجوہ سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ الاحقاف اور سورۃ الجن میں ایک ہی واقعہ کا ذکر نہیں بلکہ یہ دو الگ الگ واقعات تھے جو دو مختلف سفروں میں پیش آئے تھے۔

Marfat.com

سورۃ الجن میں ذکر کیا جانے والا واقعہ دس سن نبوی کو پیش آنے والے واقعہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ وہ واقعہ ہے جو عکاظ سے متعلق ہے اور یہ اس وقت پیش آیا جب آسمان پر کی جانے والی حفاظتی تدابیر کے اسباب معلوم کرنے کیلئے جنات کے بہت سے گروہ زمین کے مختلف علاقوں کا سفر کررہے تھے۔ان ہی میں سے ایک گروہ نے عکاظ میں آنحضرت ﷺ سے قرآنِ کریم سنا۔یہ واقعہ یقیناً نبوت کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سورۃ الجن نبوت کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی۔

ان دونوں واقعات میں ہم نے صراحت کی ہے کہ جنات کی آنحضرت ﷺ سے ملاقات نہیں ہوئی۔اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اپنی روایت میں اسے بتصریح بیان کیا ہے، لیکن روایاتِ حدیث میں لیلۃ الجن کا جو واقعہ مذکور ہے اس میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔اس سے واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ آپؐ جنات کو تبلیغ و دعوت کیلئے مکہ مکرمہ کے قریب ایک جنگل میں تشریف لے گئے تھے اور انہیں آپؐ نے قرآنِ کریم پڑھ کر سنایا تھا اور ان کے سوالات کے جواب بھی دیئے تھے۔

علامہ خفاجی کہتے ہیں احادیثِ معتبرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنات کے وفود نبی کریم ﷺ کی خدمت میں چھ مرتبہ حاضر ہوئے۔یقیناً جنات سے آپؐ کی گفتگو بھی ہوئی اور آپؐ نے انہیں قرآنِ کریم بھی سنایا۔

جن کی حقیقت

جن مخلوقاتِ الٰہیہ میں ایک ایسی مخلوق کا نام ہے جو ذی اجسام بھی ہے اور ذی روح بھی۔اور انسان کی طرح عقل و شعور والے بھی۔ مگر لوگوں کی نظروں سے مخفی ہیں۔اس لئے ان کا نام جن رکھا گیا ہے، کہ جن کے لفظی معنی مخفی کے ہیں۔ان کی تخلیق کا غالب مادہ آگ ہے۔ جیسے انسان کی تخلیق کا غالب مادہ مٹی ہے۔اس نوع میں انسان کی طرح نر و مادہ، یعنی مرد و عورت ہیں۔اور انسان کی ہی طرح ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ بھی ہے۔اور ظاہر یہ ہے کہ قرآن میں جن کو شیاطین کہا گیا ہے وہ بھی جنات ہی میں سے شریر لوگوں کا نام ہے۔جنات اور فرشتوں کا وجود قرآن و سنت کے قطعی دلائل سے ثابت ہے جس کا انکار کفر ہے۔ (تفسیر مظہری)

موجودہ زمانے کے بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پرانے زمانے کے اوہام و خرافات میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔یہ رائے انہوں نے کچھ اس بنا پر قائم نہیں کی ہے کہ کائنات کی ساری حقیقتوں کو وہ جان چکے ہیں اور انہیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ جن کہیں موجود نہیں ہیں۔ایسے علم کا دعویٰ وہ خود بھی نہیں کرسکتے۔مگر انہوں نے بلا دلیل یہ فرض کرلیا ہے کہ کائنات میں بس وہی کچھ موجود ہے جو ان کو محسوس ہوتا ہے حالانکہ انسان کے محسوسات کا دائرہ اس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں قطرے کی نسبت ہے۔یہاں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ محسوس نہیں ہے وہ موجود نہیں ہے، اور جو موجود ہے اسے لازماً محسوس ہونا چاہیئے۔وہ دراصل خود اپنے ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے۔یہ طرزِ فکر اختیار کرلیا جائے تو ایک جن ہی کیا، انسان کسی ایسی حقیقت کو بھی نہیں مان سکتا جو براہِ راست اس کے تجربے اور مشاہدے میں نہ آتی ہو اور اس کیلئے خدا تک کا وجود قابلِ تسلیم نہیں ہے کجا کہ وہ کسی اور غیر محسوس حقیقت کو تسلیم کرے۔

Marfat.com

مسلمانوں میں سے جو لوگ اس طرزِ فکر سے متاثر ہیں مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے انہوں نے جن اور ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی بہیمی قوتیں ہیں جنہیں شیطان کہا گیا ہے، اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے۔ لیکن قرآنِ مجید کے ارشادات اس معاملہ میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ ان تاویلات کیلئے ان کے اندر کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں ہے۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ وہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ اعراف، آیت ۳۸۔ ہود، ۱۱۹۔ حٰم السجدہ، آیات ۲۵۔۲۹۔ الاحقاف، ۱۸۔ الذاریات، ۵۶۔ الناس، ۶ اور سورۂ رحمٰن تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جنوں کو انسان کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی۔

سورۂ اعراف، آیت ۱۲۔ سورۂ حجر، آیات ۲۶۔۲۷، اور سورۂ رحمٰن آیات ۱۴۔۱۵ میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ انسان کا مادۂ تخلیق مٹی ہے اور جنوں کا مادۂ تخلیق آگ۔

سورۂ حجر آیت ۲۷ میں صراحت کی گئی ہے کہ جن انسان سے پہلے پیدا کئے گئے تھے۔ اسی بات پر قصۂ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ نیز سورۂ کہف آیت ۵۰ میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔

سورۂ اعراف آیت ۲۷ میں بالفاظِ صریح یہ کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان ان کو نہیں دیکھتے۔

سورۂ حجر آیات ۱۶۔۱۸، سورۂ صافات آیات ۶۔۱۰، اور سورۂ ملک آیت ۵ میں بتایا گیا ہے کہ جن اگرچہ عالمِ بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاءِ اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ چوری چھپے سن گن لیں تو شہابِ ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں۔ اس سے مشرکینِ عرب کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں یا خدائی کے اسرار تک انہیں کوئی رسائی حاصل ہے۔ اسی غلط خیال کی تردید سورۂ سبا آیت ۱۴ میں بھی کی گئی ہے۔

سورۂ بقرہ آیات ۳۰۔۳۴ اور سورۂ کہف آیت ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہیں۔ اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں جن کی ایک مثال ہمیں سورۂ نمل آیت ۷ میں ملتی ہے، لیکن اسی طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں، اور وہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔

Marfat.com

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک بااختیار مخلوق ہے اور اس کو طاعت و معصیت اور کفر و ایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ اس پر ابلیس کا قصہ اور سورۂ احقاف اور سورۂ جن میں بعض جنوں کے ایمان لانے کا واقعہ صریح دلالت کرتا ہے۔

قرآن میں بیسیوں مقامات پر یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس نے تخلیق آدم کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اسی وقت سے شیاطین جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں، مگر وہ اس پر مسلط ہو کر زبردستی اس سے کوئی کام کرا لینے کی طاقت نہیں رکھتے بلکہ وہ اس کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں، اس کو بہکاتے ہیں، وہ بدی و گمراہی کو اس کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔ النساء ۱۱۷ تا ۱۲۰۔ الاعراف ۱۱ تا ۱۷۔ ابراہیم ۲۲۔ الحجر ۳۰ تا ۴۲۔ النحل ۹۸ تا ۱۰۰۔ بنی اسرائیل ۶۱ تا ۶۵۔

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشرکین عرب زمانہ جاہلیت میں جنوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے، ان کی عبادت کرتے تھے اور ان کا نسب خدا سے ملاتے تھے۔ ملاحظہ ہو الانعام آیت ۱۰۰۔ سبا آیت ۴۰۔۴۱۔ الصٰفٰت ۱۵۸۔

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن اپنا ایک مستقل خارجی وجود رکھتے ہیں اور وہ انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں۔ ان کی پراسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کی ہستی اور ان کی طاقتوں کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصورات قائم کر رکھے ہیں حتیٰ کہ ان کی پرستش تک کر ڈالی گئی ہے مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔

سابق سورۃ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ

سابق سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے غرور و تکبر اور ضد و مکابرت کو بیان کرتے ہوئے ان کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کس طرح انہوں نے پیغمبر کی دعوت سے اپنے کان بند کر لئے اور حضرت نوح علیہ السلام کی صدیوں پر محیط نہایت ہمدردی و غمگساری سے کی جانے والی تبلیغ و مساعی کو اس طرح انکار کی نذر کیا اور تمسخر کا نشانہ بنایا اور پھر جو انجام ان کا ہوا اس کی عبرت انگیز تصویر قریش کے لیڈروں کے سامنے پیش کی گئی ہے تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اور جس طرح وہ حضورؐ کی بات سننے کی بجائے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے اور منہ نوچ لینے کو جھپٹتے ہیں، قومِ نوح کی تاریخ کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کریں کیونکہ تم بھی اسی انجام کی طرف بڑھ رہے ہو جس سے قومِ نوح دوچار ہوئی۔

اس پیشِ نظر سورۃ میں قریش کو ایک اور تصویر دکھائی جا رہی ہے کہ جنات گزرتے ہوئے اتفاق سے آنحضرت ﷺ کے داعیانہ لب و لہجہ میں قرآنِ پاک کی تلاوت کو سن لیتے ہیں۔ صرف سن کر اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ تڑپ اٹھتے ہیں اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اپنی قوم میں اس کی دعوت پھیلانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ایک تم ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے رسول اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے اولین اور براہِ راست مخاطب ہو۔ اور تمہاری ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کے رسول نے دن رات خونِ جگر نچوڑا ہے، لیکن تمہاری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اس کی کسی بات کا تمہارے دلوں میں اترنا تو درکنار، تم اس پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کے جانی دشمن بن گئے ہو۔

Marfat.com

اس سورۃ کے نزول سے نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا بھی مقصود ہے کہ اگر آپ ؐ کی قوم کے اشرار اس قرآن کی ناقدری کر رہے ہیں تو آپ ؐ اس سے آزردہ خاطر نہ ہوں۔ جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں وہ اس سے فیضاب نہیں ہوں گے، خواہ آپ کتنے ہی جتن کریں۔ البتہ جن کے اندر کوئی صلاحیت ہوگی ان کے کانوں میں اتفاق سے بھی اس کے کچھ کلمات پڑ جائیں گے تو وہ اس سے ضرور اثر پذیر ہوں گے۔ تو یہ لوگ اگر آپ کی دشمنی پر تلے ہوئے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نہ قرآنِ کریم کی تاثیر میں کمی ہے اور نہ آپ ؐ کی دعوتی مساعی میں، ان کی اپنی بدنصیبی اور محرومی ان کے راستے کا پتھر بن گئی ہے۔

کفارِ مکہ کو ملامت کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا رسول انہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دیتا ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ رسول بے یارومددگار ہے، اس کی مدد کیلئے کوئی نہیں آئے گا، لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ اصل بے یارومددگار کون ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب حقیقت ان کے سامنے کھل کر آ جائے گی۔ وہ وقت دور ہے یا قریب، رسول کو اس کا علم نہیں دیا گیا۔ لیکن اس وقت کو آنا بہر حال ضرور ہے۔ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، رسول کو صرف وہ علم حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسے دینا چاہتا ہے۔ اور یہ علم ان امور سے متعلق ہوتا ہے جو فرائضِ رسالت کی انجام دہی کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ اور یہ علم ایسے محفوظ طریقہ سے دیا جاتا ہے جس میں کسی بیرونی مداخلت کا امکان نہیں ہوتا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٢٨	سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ (٧٢)	رُكُوْعَاتُهَا ٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا
قُرْاٰنًا عَجَبًا ﴿١﴾ یَّهْدِیْۤ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ
اَحَدًا ۙ﴿٢﴾ وَّاَنَّهُ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۙ﴿٣﴾
وَّاَنَّهُ كَانَ یَقُوْلُ سَفِیْهُنَا عَلَی اللّٰهِ شَطَطًا ۙ﴿٤﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ
تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۙ﴿٥﴾ وَّاَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ
الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۙ﴿٦﴾ وَّاَنَّهُمْ
ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۙ﴿٧﴾ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ
فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّشُهُبًا ۙ﴿٨﴾ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ
مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴿٩﴾
وَّاَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ
رَبُّهُمْ رَشَدًا ۙ﴿١٠﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا
طَرَآئِقَ قِدَدًا ۙ﴿١١﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ
نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۙ﴿١٢﴾ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ

Marfat.com

بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿١٣﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا
الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰۗىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿١٤﴾ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ
فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿١٥﴾ وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَي الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ
مَّاۗءً غَدَقًا ﴿١٦﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ
عَذَابًا صَعَدًا ﴿١٧﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿١٨﴾
وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾ ع

رکوع: ۱۔ (اے پیغمبر، کہہ دیجئے مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے (قرآن کو) سنا، پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے) کہا کہ ہم نے بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے۔ ۱) جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے، تو ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ ۲) اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت ارفع و اعلیٰ ہے، اس نے اپنے لئے نہ کوئی بیوی بنائی ہے اور نہ کوئی اولاد۔ ۳) اور یہ کہ ہمارے بے وقوف لوگ اللہ کے بارے میں حق سے بالکل ہٹی ہوئی باتیں کہتے رہے۔ ۴) اور یہ کہ ہم نے گمان کیا کہ انسان اور جن خدا پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھ سکتے۔ ۵) اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ پس انہوں نے جنوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا۔ ۶) اور یہ کہ انہوں نے بھی تمہاری ہی طرح یہ گمان کیا کہ اللہ ہرگز کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔ ۷) اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو ہم نے اسے پایا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور شہابوں (انگاروں) سے بھر دیا گیا ہے۔ ۸) اور یہ کہ ہم بعض ٹھکانوں میں کچھ سننے کیلئے بیٹھا کرتے تھے، پس اب جو سننے کیلئے بیٹھے گا وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔ ۹) اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کیلئے بھلائی چاہی ہے۔ ۱۰) اور یہ کہ ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں، ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ۱۱) اور یہ کہ ہم نے مان لیا کہ نہ زمین میں چھپ کر ہم اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہم عاجز کر سکتے ہیں۔ ۱۲) اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے، پس جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا تو اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہو گا نہ

Marfat.com

کسی زیادتی کا۔ ۱۳) اور یہ کہ ہم میں سے کچھ فرمانبردار ہیں اور کچھ بے انصاف ہیں، تو جنہوں نے فرمانبرداری کی روش اختیار کی ہے انہوں نے ہدایت کی راہ ڈھونڈ لی۔ ۱۴) اور جو بے انصاف ہوئے تو وہ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ ۱۵) اور مجھے وحی آئی ہے کہ اگر یہ (قریش) راہِ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے۔ ۱۶) تاکہ ہم اس میں ان کو آزمائیں اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا تو وہ اس کو چڑھتے عذاب میں داخل کرے گا۔ ۱۷) اور یہ کہ مسجدیں اللہ کیلئے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ ۱۸) اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو لوگوں کا اس پر ٹھٹھ بندھنے لگتا ہے۔ ۱۹)

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱
یَّهْدِیْۤ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۝۲

(اے پیغمبر، کہہ دیجئے مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے (قرآن کو) سنا، پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے) کہا کہ ہم نے بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے۔ ۱) جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے، تو ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اوا اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ ۲)

پہلی آیتِ کریمہ کے پہلے لفظ سے یہ بات واضح ہے کہ جنوں کے جو تأثرات اس سورۃ میں بیان کئے گئے ہیں وہ نبی کریم ﷺ نے براہِ راست جنوں کی زبانی نہیں سنے تھے بلکہ وحیِ الٰہی کے ذریعے معلوم ہوئے تھے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جو روایت بیان کی ہے اس میں صراحت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنوں کے سامنے قرآن نہیں پڑھا تھا اور نہ آپؐ نے ان کو دیکھا تھا۔ سورۃ کے تعارف میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ آگے چل کر بعض مواقع پر آنحضرت ﷺ نے جنات کو قرآنِ کریم سنایا اور ان سے ملاقات فرمائی۔

نَفَرٌ کا مفہوم

آیتِ کریمہ میں نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ کے الفاظ آئے۔ نَفَرٌ تین سے دس تک کے عدد کیلئے بولا جاتا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جنات کا یہاں ذکر ہے یہ نو حضرات تھے جو نصیبین کے رہنے والے تھے۔

آیت کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن جنات نے آنحضرت ﷺ سے قرآنِ کریم سنا وہ نہ صرف عربی زبان جاننے والے تھے بلکہ عربی کے ماہر معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے صرف قرآنِ کریم کا مفہوم نہیں سمجھا بلکہ اس کلام کی بے مثل بلاغت کو بھی محسوس کیا اور اس کے مضامین کی بلندی کا بھی ادراک کرنے میں کامیاب رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات جن علاقوں میں رہتے ہیں عموماً اس علاقے میں بولی جانے والی زبان سے واقف ہوتے ہیں۔ ممکن ہے زبان دانی کی صلاحیت قدرت نے ان کے اندر غیر معمولی حد تک رکھی ہو۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ نماز میں قرآنِ کریم پڑھ رہے تھے کہ ان جنات کا وہاں سے گزر ہوا۔ آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت اور دل میں اتر جانے والی آواز سنی تو رک گئے۔ قرآنِ کریم کے معجزانہ صفات کے حامل چند بول کانوں میں پڑے تو اس کے سحر میں ڈوب گئے۔ استماع، غور سے سننے کو کہتے ہیں۔ اب جو غور سے سنا تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ جو کلام پڑھا جا رہا ہے یہ تو غیر معمولی شان کا مالک ہے۔ چنانچہ وہ انہیں تأثرات کو لئے ہوئے جب اپنی قوم میں پہنچے تو ان کو دعوت دیتے ہوئے انہوں نے اس قرآن کو قُرْاٰنًا عَجَبًا سے تعبیر کیا۔ عَجَبٌ مصدر ہے۔ اس وجہ سے عجیب کے مقابل میں اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اردو زبان میں یہ لفظ صرف کسی شے کے انوکھے پن کے اظہار کیلئے بولا جاتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں صرف اس کا یہی معنی نہیں ہوتا بلکہ کسی چیز کی دلپذیری اور اثر انگیزی جو حیرت انگیزی کی حد تک پہنچی ہوئی ہو، اس پر بھی بولا جاتا ہے۔ جنات نے اپنی گفتگو میں اس لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے کہ ہم نے جو کلام سنا ہے وہ اپنی اثر انگیزی میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ وہ تو ہمارے دلوں میں اترتا چلا گیا۔ اس کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ وہ رُشد کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے سورۃ الاحقاف میں حق اور صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رُشد ایک وسیع المعنی لفظ ہے۔ یہ ان تمام صداقتوں اور حقیقتوں پر بولا جاتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ انسان اپنے اختیار کے سوءِ استعمال سے اپنی فطرت کو بگاڑ لے تو اور بات ہے ورنہ جب تک اس کی فطرت سلامت ہے وہ ہر صحیح بات، ہر صحیح تصور اور ہر نیکی کی طرف مائل کر دینے والی چیز ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی تعلیمات وہ عقائد سے متعلق ہوں یا اخلاق سے، وہ احکام پر مشتمل ہوں یا آداب پر، ان میں سے ہر چیز فطرت کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسی صفات کا حامل کلام جب ہم نے سنا تو ہم اس پر ایمان لے آئے، کیونکہ فطری دعوت کا انکار فطرت کے بس کی بات نہیں۔ فطری عقائد میں چونکہ سب سے بلند مقام توحید کا ہے اور باقی تمام عقائد و اعمال کا منبع وہی ہے تو فطرت کی تطہیر کے بعد یہ ممکن نہ رہا کہ ہم شرک کی آلودگیوں میں مبتلا رہیں۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم آئندہ کسی کو بھی اپنے رب کے ساتھ شریک نہیں کریں گے۔ نہ اس کی ذات میں، نہ صفات میں اور نہ اس کے حقوق میں۔

آیت کے الفاظ سے منترع ہونے والے بعض نکات

آیت کے الفاظ میں غور کرنے سے کئی باتوں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن جنات نے قرآنِ کریم سن کر گہرے تأثر کا اظہار کیا وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رب ہونے کے قائل تھے۔ البتہ بعض دوسری قوتوں کو وہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبوت اور کتبِ آسمانی کے نزول کا سلسلہ جنات میں کبھی نہیں رہا بلکہ ان میں سے جو جن بھی ایمان لاتے ہیں وہ انسانوں میں آنے والے انبیاء اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر ہی ایمان لاتے ہیں۔ چوتھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو رسول انسانوں کی طرف مبعوث ہوتے ہیں ان کی دعوت صرف انسانوں کیلئے نہیں بلکہ جنات کیلئے بھی ہوتی ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں بار بار انسانوں اور جنوں کو خطاب کیا گیا ہے، جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مخاطب انسان اور جن دونوں ہیں۔

Marfat.com

لفظِ قرآن کا مفہوم

آیتِ کریمہ میں قرآن کا لفظ آیا ہے، یعنی جنات نے جو کچھ سنا تھا اسے انہوں نے قرآن قرار دیا جبکہ انہوں نے قرآنِ کریم کی چند آیات سنی تھیں، انہیں ہرگز یہ معلوم نہیں تھا کہ جس کتاب کی یہ آیات ہیں اس کتاب کا نام کیا ہے۔ تو ان کا اسے قرآن قرار دینا ممکن ہے لغوی معنی میں ہو۔ لغت میں ہر پڑھی جانے والی بات کو قرآن کہتے ہیں۔ یا ممکن ہے انہوں نے قرآنِ کریم کی وہ آیات سنی ہوں جن میں آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والے کلامِ خداوندی کو قرآنِ کریم سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس سے انہیں معلوم ہوا کہ اس کتاب کا نام قرآنِ کریم ہے۔

قُلْ سے آغاز کا سبب

اس سورۃ کا آغاز لفظ قُلْ سے ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو پروردگار نے حکم دیا تھا کہ یہ سورۃ قریشِ مکہ کو پڑھ کر سنائیں تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ جس کتاب کی ہم شب و روز مخالفت میں لگے ہوئے ہیں اور ہم اس کے سننے کے بھی روادار نہیں، اس کتاب کی عظمت کا حال یہ ہے کہ حُسنِ اتفاق سے جنات کو اسے سننے کا موقع مل گیا تو اس سے گہرے تاثر کے باعث وہ ایمان لے آئے۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی قوم میں داعی کی حیثیت سے پہنچے اور اپنے ایمان کو چھپانے کی بجائے کھلم کھلا اس کا اظہار کیا اور قوم کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ تم اپنا اور ان کا مقابلہ کر کے دیکھو۔ اور اگر تم میں تھوڑی بہت بھی حمیت باقی ہے تو تمہیں غیرت آنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ رسول جو براہِ راست تمہاری طرف مبعوث ہوا ہے اور شب و روز تمہاری ہدایت کیلئے کوشاں ہے تم اس کی دعوت کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو اور جنات نے صرف اس کو سن کر کیسی دولت پائی ہے۔

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ﴿۳﴾

(اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت ارفع و اعلیٰ ہے، اس نے اپنے لئے نہ کوئی بیوی بنائی ہے اور نہ کوئی اولاد۔ ۳)

جَدّ ...... کے معنی عظمت، شان اور رتبہ کے ہیں۔

جنات کی شرک سے توبہ

گزشتہ آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ جن جنات نے قرآنِ کریم سنا تھا وہ شرک میں مبتلا تھے اور انہوں نے قرآنِ کریم سننے کے بعد اپنے شرک سے توبہ کا اعلان کیا تھا۔ اس آیتِ کریمہ میں اس شرک کی وضاحت ہے جس کا وہ شکار تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بیوی ہے اور اس کی اولاد بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنات عیسائی تھے اور عیسائیوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے بے ہودہ خیالات رکھتے تھے۔ اور یا ممکن ہے کہ ان کا کوئی اور مذہب ہو جس میں اللہ تعالیٰ کو بیوی بچوں والا سمجھا جاتا ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز میں قرآنِ کریم پڑھتے ہوئے سنا تو آپؐ وہ آیات پڑھ رہے تھے جن میں اس عقیدے کی تردید کی گئی تھی، اس سے جنات

Marfat.com

کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو اس سے بہت بلند و برتر ہے کہ اس کی طرف بیوی بچوں کو منسوب کیا جائے۔ کیونکہ بیوی بچوں کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو ان کی احتیاج رکھتا ہو، اور جسے اپنے نام اور اپنی نسل کی بقاء کیلئے اولاد کی چاہت ہو اور جو تمنار رکھتا ہو کہ بڑھاپے میں کسی کو میرا سہارا ہونا چاہئے اور جس پر کبھی ایسے ماؤف لمحات بھی آتے ہوں جن میں وہ بیوی کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ تو ایسے تمام کمزوریوں سے پاک اور اس کی شان اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ تو ایسی بلند و بالا شان والے کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا نہایت گری ہوئی حرکت اور اپنے سوءِ فہم کی دلیل ہے۔

وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝۴

(اور یہ کہ ہمارے بے وقوف لوگ اللہ کے بارے میں حق سے بالکل ہٹی ہوئی باتیں کہتے رہے۔ ۴)

سَفِیْہ کا مفہوم

سَفِيْهُنَا ...... سَفِیْہ، بے وقوف کو کہتے ہیں۔ یہ ایک فرد کیلئے بھی بولا جا سکتا ہے اور ایک گروہ کیلئے بھی۔ اگر اسے ایک فرد کے معنی میں لیا جائے تو مراد ابلیس ہوگا۔ اور اگر ایک گروہ کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ بہت سے احمق اور بے عقل لوگ ہمارے اندر ایسی باتیں کہتے تھے۔ بعض اہلِ علم نے یہ کہا ہے کہ جنوں نے یہ لفظ اپنے سردار کیلئے استعمال کیا ہے اور یہ تأثر دیا ہے کہ قرآنِ کریم نے ہماری آنکھوں کھول دی ہیں، ہم اپنے سردار کو بہت سمجھدار سمجھتے تھے، وہ تو پرلے درجے کا بے وقوف آدمی ہے جو اس طرح کی سفاہت پر مبنی باتیں کرتا تھا۔

شَطَطًا ...... شطط، حق و عدل سے نہایت دور ہٹی ہوئی بات کو کہتے ہیں۔ بعید از عقل اور ظلم و جبر پر بھی بولا جاتا ہے۔

جنات نے اب تک اپنے شرک و کفر میں مبتلا رہنے کا عذر بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم آج تک اس توحید سے دور رہے اور اللہ کریم کی شان میں شرک کی جسارت کرتے رہے، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے ہمیشہ اپنے سردار کی پیروی کی، اسے عقلِ کل سمجھا۔ اس نے ہمیشہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی بیوی بھی ہے اور اولاد بھی۔ فلاں فلاں اس کے بیٹے ہیں اور فلاں اور فلاں اس کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ لیکن اب قرآنِ کریم سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے احمق سردار کی یہ باتیں بالکل بے بنیاد تھیں۔ چنانچہ ہم نے ان خرافات سے توبہ کر لی۔ اور ہم قوم کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی اس طرح کی باتوں سے توبہ کرے۔

اور اگر سَفِیْہ کو جمع کے معنی میں لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں مشرکانہ خیالات پھیل چکے تھے۔ جو مشرکانہ باتیں عام لوگوں نے اختیار کر رکھی تھیں، وہی ہم نے بھی اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ تو اب قرآنِ کریم کی ہدایت سے معلوم ہوا کہ ہم سب سفاہت میں مبتلا تھے۔ اس لئے اب ہم سب کو اس شرک سے توبہ کر لینی چاہئے۔

وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵

(اور یہ کہ ہم نے گمان کیا کہ انسان اور جن خدا پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھ سکتے۔ ۵)

Marfat.com

عذرِ سابق کی وضاحت

سابقہ آیت میں جنات نے جو اپنا عذر بیان کیا ہے یہ اس کی وضاحت ہے۔ کہ ہم نے جن وانس کو جب شرک میں مبتلا دیکھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف مشرکانہ تصورات منسوب کرتے سنا۔ تو ہم نے یہ گمان کیا کہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ انسان اور جن دونوں اور وہ بھی ایک بڑی تعداد میں اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے خیالات منسوب کریں جو سراسر جھوٹ پر مبنی ہوں۔ یقیناً ان کی باتوں میں کوئی سچائی ہوگی، لیکن اب قرآنِ کریم کی عطا کردہ روشنی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سراسر جھوٹ کا کاروبار تھا۔ کسی نے غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ کا مقام کتنا ارفع واعلیٰ ہے اور ہم اس کی طرف کیسی چھوٹی باتوں کو منسوب کررہے ہیں۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝ ۶

(اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ پس انہوں نے جنوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا۔ ۶)

جنات اپنے مشرکانہ اوہام وخیالات کے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسانوں میں ایسے بھی لوگ تھے جو جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی اس کمزوری سے جنات کے دماغ اور چڑھ گئے اور وہ اپنے آپ کو یہ سمجھنے لگے کہ ہم انسان سے افضل ہیں کیونکہ انسان بھی ہماری پناہ لیتا ہے۔ اس بات نے جنات کی گمراہی میں اور اضافہ کردیا۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب کسی سنسان وادی میں رات گزارتے تھے تو پکار کر کہتے کہ ہم اس وادی کے مالک جن کی پناہ مانگتے ہیں۔ تفسیر مظہری میں حضرت رافع بن عمیرؓ کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا گیا ہے جس سے اس حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ مظہری کے مصنف لکھتے ہیں کہ ہواتف الجن میں سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیرؓ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ رافع بن عمیرؓ صحابی نے اپنے اسلام قبول کرنے کا ایک واقعہ یہ بتلایا ہے کہ میں ایک رات ایک ریگستان میں سفر کررہا تھا۔ اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا۔ میں اپنی اونٹنی سے اترا اور سوگیا۔ اور سونے سے پہلے میں نے اپنی قوم کی عادت کے مطابق یہ الفاظ کہہ لئے انی اعوذ بعظیم هذالوادی من الجن ''یعنی میں پناہ لیتا ہوں اس جنگل کے جنات کے سردار کی۔'' میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کے ہاتھ میں ایک ہتھیار ہے، اس کو میری ناقہ کے سینہ پر رکھنا چاہتا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھا۔ دائیں بائیں دیکھا، کچھ نہ پایا۔ تو میں نے دل میں کہا کہ یہ شیطانی خیال ہے، اصلی خواب نہیں، اور پھر سوگیا۔ تو پھر وہی خواب دیکھا، پھر میں اٹھا اور اپنی ناقہ کے چاروں طرف پھرا اور کچھ نہ پایا۔ مگر ناقہ کو دیکھا وہ کانپ رہی ہے۔ میں پھر جا کر اپنی جگہ سوگیا۔ تو پھر وہی خواب دیکھا۔ میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ میری ناقہ تڑپ رہی ہے اور پھر دیکھا ایک نوجوان ہے جس کے ہاتھ میں حربہ ہے۔ یہ وہی شخص تھا جس کو خواب میں ناقہ پر حملہ کرتے دیکھا تھا اور ساتھ یہ دیکھا کہ ایک بوڑھے آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے جو ناقہ پر حملہ کرنے سے اس کو روک رہا ہے۔ اسی عرصہ میں تین گورخر سامنے آگئے تو بوڑھے نے اس نوجوان سے کہا کہ ان تینوں میں سے جس کو تو پسند کرے وہ لے لے اور اس انسان کے ناقہ کو چھوڑ دے۔ وہ جوان ایک گورخر لے کر رخصت ہوگیا۔ پھر اس بوڑھے نے میری طرف دیکھ کر کہا کہ اے بے وقوف جب تو کسی جنگل میں ٹھہرے اور وہاں کے جنات و شیاطین سے خطرہ ہو تو یہ کہا کر اعوذ بالله رب محمد من هول هذا الوادی ''یعنی میں پناہ پکڑتا ہوں رب محمد ﷺ کی، اس جنگل کے

Marfat.com

خوف اور شر سے۔'' اور کسی جن سے پناہ نہ مانگا کر کیونکہ وہ زمانہ چلا گیا جب انسان جنوں کی پناہ لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہیں۔ اس نے کہا یہ نبی عربی ہیں۔ نہ شرقی نہ غربی۔ پیر کے روز یہ مبعوث ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کہاں رہتے ہیں تو اس نے بتایا کہ وہ یثرب میں رہتے ہیں جو کھجوروں کی بستی ہے۔ میں نے صبح ہوتے ہی مدینہ کا راستہ لیا اور سواری کو تیز چلایا۔ یہاں تک کہ مدینہ طیبہ پہنچ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دیکھا تو میرا سارا واقعہ مجھے سنا دیا، اس سے پہلے کہ میں آپؐ سے کچھ ذکر کروں اور مجھے اسلام کی دعوت دی۔ میں مسلمان ہو گیا۔ سعید ابن جبیر اس واقعہ کو نقل کر کے فرماتے تھے کہ ہمارے نزدیک اسی معاملہ کے متعلق قرآنِ کریم میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی ہے۔

جنات کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب زمین کے خلیفہ انسان نے الٹا ہم سے ڈرنا شروع کر دیا اور خدا کو چھوڑ کر وہ ہم سے پناہ مانگنے لگا تو ہماری قوم کے لوگوں کا دماغ اور زیادہ خراب ہو گیا۔ ان کا کبر و غرور اور کفر و ظلم اور زیادہ بڑھ گیا اور وہ گمراہی میں زیادہ جری ہو گئے۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝٧

(اور یہ کہ انہوں نے بھی تمہاری ہی طرح یہ گمان کیا کہ اللہ ہرگز کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔ ۷)

اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا کا مفہوم

اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ...... اس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا، اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے گا۔ آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کیلئے گنجائش موجود ہے، لیکن اگلی آیت کے مضمون کو دیکھتے ہوئے پہلا مفہوم اس کے زیادہ موافق معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات آسمانوں کے قریب جہاں سے انہیں ملاء اعلیٰ میں ہونے والے فیصلوں کی سن گن مل سکتی تھی پہنچ جایا کرتے تھے۔ لیکن اب وہاں فرشتوں کے پہرے لگا دیئے گئے تھے اور شہابِ ثاقب کی بارش ہونے لگی تھی۔ اس کا سبب معلوم کرنے کیلئے جب وہ تلاش میں نکلے تو انہیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین کیلئے ایک رسول کو مبعوث کیا ہے اور یہ وحیِ الٰہی کو شیاطین کے شر سے محفوظ رکھنے کیلئے سارے انتظامات کئے گئے ہیں۔ اس مناسبت سے پہلا ترجمہ قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم نے یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے اولین مخاطبوں میں خواہ بنی اسماعیل ہوں یا بنی اسرائیل، ایک رسول کی بعثت کا انتظار تھا۔ بنی اسرائیل کے علماء یہ بات کہتے تھے کہ نبی آخرالزمان آنے والے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی یقین تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہوں گے۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ بنی اسماعیل میں تشریف لے آئے تو ان کیلئے نسلی تعصب کے باعث آنحضرت ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن اس سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ نبی آخرالزمان کے انتظار میں تھے۔ اسی طرح مدینے کے قحطانی عرب بھی ایک آنے والے کے منتظر تھے اور یہود سے کہا کرتے تھے کہ ہم اس پر ایمان لا کر تمہیں تمہارے مظالم کی سزا دیں گے۔ اور یہود اسی پیغمبر کے حوالے سے انہیں ڈرایا کرتے تھے۔ البتہ یہ بات کہنا مشکل ہے کہ قریش کا نئی بعثت کے بارے میں کیا تصور تھا۔ لیکن صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ نئی بعثت کے منکر نہیں تھے البتہ نبی کے بارے میں ان کے تصورات عجیب و غریب تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہدایت کی ضرورت کے تحت ان میں سے کوئی گروہ بھی نبی کی بعثت کا منتظر نہ تھا۔ اس لئے اگر یہ معنی لیا جائے جو آنے والی آیات سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے تو حقیقت سے دور نہیں۔

Marfat.com

جہاں تک دوسرے معنی کا تعلق ہے بلاشبہ قریش جن کی طرف حضورؐ بلاواسطہ مبعوث ہوئے ہیں وہ بعث بعدالموت کے منکر تھے۔اور اہلِ کتاب کی عملی حالت اسی بات پر دلالت کرتی تھی کہ انہیں بھی قیامت یا آخرت کا کوئی کھٹکا نہیں تھا۔جنات میں بھی یقیناً دونوں طرح کے لوگ ہوں گے۔پیشِ نظر سورۃ میں جن جنات کا تذکرہ ہورہا ہے ممکن ہے وہ قریش کے ہم خیال ہوں۔اور جن جنات کا ذکر سورۃ الاحقاف میں ہوا ہے ہوسکتا ہے ان کا تعلق اہلِ کتاب سے ہو۔رہیں وہ آیات جو آگے آرہی ہیں تو بعث بعدالموت کے ذکر اور ان آیات کے مندرجات میں کوئی تضاد نہیں۔اس لئے کہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جنات صرف یہ بات اپنی قوم سے کہہ رہے ہیں کہ جیسے تمہیں بعث بعدالموت سے انکار ہے،اسی طرح مکہ کے لوگوں کو بھی ہے یعنی شرک کے ساتھ ساتھ یہ گمراہی بھی انسانوں اور جنوں دونوں میں پائی جاتی ہے اور جس طرح شرک کی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ کے رسول تشریف لاتے ہیں اسی طرح اس بنیادی عقیدے کی اصلاح کیلئے بھی اللہ تعالیٰ کے رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں۔چنانچہ ان تمام گمراہیوں کی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا ہے اور جس پر نازل ہونے والی کتاب کو ہم نے سنا اور ہم اس پر ایمان لائے۔اور ہمیں اس کی بعثت کا خیال اس بات سے ہوا جس کا ذکر اگلی آیات میں آرہا ہے۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ۝٨ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝٩ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝١٠

(اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو ہم نے اسے پایا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور شہابوں (انگاروں) سے بھر دیا گیا ہے۔ ۸) اور یہ کہ ہم بعض ٹھکانوں میں کچھ سننے کیلئے بیٹھا کرتے تھے،پس اب جو سننے کیلئے بیٹھے گا وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔ ۹) اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کیلئے بھلائی چاہی ہے۔ ۱۰)

جنات کو آسمانی تغیرات کا سبب جاننے کی جستجو

جنات کو اللہ تعالیٰ نے بعض غیر معمولی قوتیں عطا کر رکھی ہیں جن میں انہیں فرشتوں کے ساتھ بہت مناسبت ہے۔ان کے طبعی میلانات،ان کے جبلی تقاضے اور ان کے فطری رجحانات میں تو ملکوتی صفات نہیں پائی جاتیں،اس لحاظ سے فرشتوں اور ان میں بہت دوری ہے۔لیکن بعض دیگر صفات اور خصوصیات میں فرشتوں سے بہت مناسبت ہے۔جس طرح فرشتے آسمانوں پر جاتے ہیں،ان میں بھی یہ قوت رکھی گئی ہے کہ یہ آسمانوں کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔اور بعض دفعہ فرشتوں سے ملاقات بھی ہوجاتی ہے۔اس لئے ان میں بعض شیاطین جنوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے آسمانوں کے قریب اپنی پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں اور وہاں بیٹھ کر وہ کوشش کرتے تھے کہ عالمِ بالا میں جو کچھ ہورہا ہے اس کی سن گن لینے میں کامیاب ہوجائیں۔چنانچہ جیسے ہی انہیں کسی بات کا علم ہوتا،اسے اضافوں کے ساتھ کاہنوں تک پہنچاتے اور اسی کی بنیاد پر عربوں میں کہانت کا ایک ایسا جال پھیلا ہوا تھا جس نے عربوں کے اعتقادات بگاڑنے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔لیکن

Marfat.com

اب یکا یک انہوں نے دیکھا کہ آسمانِ زیریں پہرہ داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں عالمِ بالا کے اسرار کی کچھ سن گن لینے کیلئے بیٹھا کرتے تھے تو اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اب اگر کوئی اس کی کوشش کرے گا تو ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔ اس کا سبب معلوم کرنے کیلئے جب وہ نکلے اور ان کے مختلف وفود زمین کے مختلف اطراف میں گئے تو انہیں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ وہ حیران تھے کہ آخر اتنا بڑا انقلاب بے سبب تو نہیں ہوسکتا۔ ایسے غیر معمولی انتظامات دو ہی حالتوں میں کئے جاتے تھے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین پر کوئی عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور منشاء الٰہی یہ ہو کہ اس کے نزول سے پہلے جن اس کی بھنک پا کر اپنے دوست انسانوں کو خبردار نہ کر دیں۔ اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں کسی رسول کو مبعوث فرمایا ہو اور تحفظ کے ان انتظامات سے مقصود یہ ہو کہ رسول کی طرف جو پیغامات بھیجے جا رہے ہیں ان میں نہ تو شیاطین کسی قسم کی خلل اندازی کر سکیں اور نہ قبل از وقت یہ معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی انہوں نے آنحضرت ﷺ سے قرآنِ کریم کو سنا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت اور قرآنِ کریم کا نزول ہی ان تمام تغیرات کا حقیقی سبب ہے۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِکَ ؕ کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۙ﴿۱۱﴾

(اور یہ کہ ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں، ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ۱۱)

یعنی جس طرح ہمارے عقائد میں یکسانی نہیں بلکہ ہم میں بیشتر لوگ شرک سے آلودہ ہیں۔ اسی طرح اخلاقی حیثیت سے بھی ہم میں اچھے اور برے دونوں طرح کے جن پائے جاتے ہیں اور فکری نظام یکساں نہ ہونے کی وجہ سے ہم مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ہم راہِ راست معلوم کرنے کے یقیناً محتاج ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرح سے روشنی کی کوئی کرن پھوٹتی ہے تو ہمیں اس کی طرف سبقت کرنی چاہئے۔

طَرَآئِقَ ...... کے معنی راستے اور مسلک و مذہب کے ہیں۔

قِدَدًا ...... کے معنی متفرق کے ہیں۔

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۙ﴿۱۲﴾

(اور یہ کہ ہم نے مان لیا کہ نہ زمین میں چھپ کر ہم اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہم عاجز کر سکتے ہیں۔ ۱۲)

ہدایت کی طرف میلان

ہمیں جب اپنی گمراہیوں، کوتاہیوں اور کج رویوں کا یقین ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی بلند و بالا شان کا بھی احساس ہو گیا تو ہم سمجھ گئے کہ ہماری بھلائی اللہ تعالیٰ کے احکام ماننے میں ہے، اس سے بے خوف ہونے میں نہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے اس کی نافرمانی کی تو اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ نہ ہمیں زمین پناہ دے سکتی ہے اور نہ آسمان۔ اب ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اس کی ہدایت کو قبول کریں۔

Marfat.com

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ۙ﴿۱۳﴾

(اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے، پس جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا تو اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی زیادتی کا۔ ۱۳)

اعترافِ حق

چنانچہ جیسے ہی ہم نے ہدایت کی بات سنی یعنی ہمیں قرآنِ کریم سننے کا موقع ملا جو اللہ تعالیٰ کی طرف راہِ راست بتاتا ہے تو ہم فوراً اس پر ایمان لے آئے۔ کیونکہ انسانیت کا ادنیٰ تقاضا یہ ہے کہ جب وہ اپنی گم گشتہ متاع پالے تو اس کی طرف ہاتھ بڑھانے میں تامل نہ کرے۔ گویا وہ اپنی قوم کو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تمہیں بھی یہی روش اختیار کرنی چاہئے۔

بَخس کے معنی کمی کرنے اور رَھَق کے معنی زیادتی کرنے کے ہیں۔ کمی کرنے کو ہی حق تلفی کہتے ہیں۔ یعنی کوئی شخص اپنی نیکی پر جتنے اجر کا مستحق ہے اسے اس سے کم دیا جائے اور ظلم یہ ہے کہ اسے نیکی کا کوئی اجر نہ دیا جائے اور جو قصور اس سے سرزد ہوں اس کی زیادہ سزا دے ڈالی جائے یا بلا قصور ہی کسی کو عذاب دے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایمان لانے والے کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی حق تلفی ہوگی یا اس کے ساتھ زیادتی کی جائے گی۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾
وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ﴿۱۵﴾

(اور یہ کہ ہم میں سے کچھ فرمانبردار ہیں اور کچھ بے انصاف ہیں، تو جنہوں نے فرمانبرداری کی روش اختیار کی ہے انہوں نے ہدایت کی راہ ڈھونڈ لی۔ ۱۴) اور جو بے انصاف ہوئے تو وہ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ ۱۵)

ایک اور فکری کوتاہی کی اصلاح

اس سے پہلے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ انسانوں میں عقیدہ وعمل کے اعتبار سے لوگ یکساں نہیں ہیں۔ اور وحدتِ فکر کے مفقود ہونے کے باعث لوگوں نے الگ الگ مسالک بنا رکھے ہیں۔ ضروری تھا کہ ان کی رہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ ایک کتاب نازل فرماتا اور ایک رسول کی بعثت ہوتی۔ چنانچہ جیسے ہی ہمیں یہ نعمتِ غیر مترقبہ میسر آئی تو ہم نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ایک اور پہلو سے بھی ہم میں یکسانی معدوم ہے۔ وہ یہ کہ کوئی تو یہ سمجھتا ہے کہ خیر اور شر یکساں نہیں۔ اچھائی اور برائی الگ الگ نتائج رکھتی ہیں۔ جس نے نیکی سے رشتہ جوڑا اس کا انجام اور ہوگا اور جس نے برائی سے تعلق پیدا کیا اس کا مآل اور ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس بعض لوگ ایسے ہیں جو لطف ولذت کے فلسفے میں مقید ہیں۔ انہیں خواہش اور مفاد کے سوا کسی اور حقیقت سے تعلق نہیں۔ اچھائی اور برائی ان کے یہاں بے معنی

Marfat.com

چیزیں ہیں۔ اخلاقی باتیں سراسر جذباتی باتیں ہیں۔ عقل کا کام خواہشِ نفس کے راستے تلاش کرنا ہے، اچھائی اور برائی کے پیمانے تلاش کرنا نہیں جبکہ امرِ واقعی کی حیثیت سے ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ انسانوں میں اچھے اور برے کی ایک واضح تقسیم موجود ہے اور دنیا میں ان کے اعمال کے نتائج بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ کیا جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ عادل نہیں، اس کے یہاں نیکی اور بدی دونوں برابر ہیں، یہ دنیا ایک اندھیر نگری کے سوا کچھ نہیں۔ جس شخص کی عقل میں سلامتی اور فطرت میں راستی ہے وہ اس صورتحال کو قبول نہیں کر سکتا۔ تو ہم نے بھی اسی حقیقت کے پیشِ نظر اور صورتِ واقعی کے نتائج کو سمجھ کر اس حقیقت کو پہچانا کہ ہم میں سے جو شخص آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی دعوت کو قبول کر کے اسلام کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ دراصل ہدایت اور نجات کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ لیکن جو خیر و شر کے امتیاز کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں، انہیں لازماً جہنم کا ایندھن بننا ہوگا، یہی عدل کا تقاضا اور یہی سلامتی کا راستہ ہے۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَی الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾

(اور مجھے وحی آئی ہے کہ اگر یہ (قریش) راہِ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے۔ ۱۶)

روئے سخن قریش کی طرف

اوپر جنوں کے تأثرات ختم ہو گئے، اب کلام کا رخ براہِ راست قریش کی طرف مڑ گیا ہے۔ سورۃ کا آغاز لفظ "قُلْ" سے ہوا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ جنات نے جس طرح قرآنِ کریم کو سنا اور پھر انہوں نے جس طرح اپنے تأثرات کا اظہار کیا اور پھر جس طرح ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے اور پھر اپنی قوم میں داعی کی حیثیت سے پہنچے۔ یہ سب باتیں آپؐ قریش کو سنائیں تاکہ ان ناقدروں اور مغروروں کو اندازہ ہو کہ ہم قرآنِ کریم جیسی نعمت کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں اور جنات نے صرف اسے ایک دفعہ سن کر کیسی سعادت پائی ہے۔ اس کے بعد اب آنحضرت ﷺ پر جو وحی نازل کی گئی ہے اس میں براہِ راست قریش کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لاتے اور صراطِ مستقیم پر قائم اور استوار رہتے تو جس دنیا کی محبت نے انہیں اندھا کر رکھا ہے، یہ دنیا کی نعمتیں بھی انہیں میسر آتیں اور اخروی نعمتوں سے بھی بہرہ ور ہوتے۔

مَّـآءً غَدَقً ...... کا لغوی معنی تو وافر پانی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے کئی جگہ یہ تعبیر رزق و فضل کی بہتات کیلئے اختیار کی ہے، یعنی پانی کی کثرت کو نعمتوں کی کثرت کیلئے بطور کنایہ استعمال کیا ہے۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو پانی ہی ہر چیز کا مادۂ تخلیق ہے اور پانی ہی پر آبادی کا انحصار ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں سے اسے سب سے اہم حیثیت حاصل ہے، کوئی بستی اس کے بغیر بس ہی نہیں سکتی اور کوئی صنعت بھی اس کو نظرانداز کر کے چل نہیں سکتی۔ ہم اس سے پہلے سورۃ نوح میں اس کی مثال پڑھ چکے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ تم اپنے رب سے مغفرت مانگو تو وہ تم پر اپنے ابرِ کرم کے ڈونگرے برسائے گا یعنی موسلا دھار بارشیں کرے گا۔ اس سے مراد بھی صرف بارش ہی نہیں بلکہ وہ نعمتیں ہیں جو بارش کے نتیجے میں انسانوں کو نصیب ہوتی ہیں۔

Marfat.com

لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾

(تا کہ ہم اس میں ان کو آزمائیں اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا تو وہ اس کو چڑھتے عذاب میں داخل کرے گا۔ ۱۷)

کثرتِ مال و دولت ایک آزمائش ہے

قریش کو رزق کی فراوانی کی امید دلا کر ساتھ ہی تنبیہ فرمائی کہ ہم جسے رزق کی فراوانی سے بہرہ ور کرتے ہیں اسے دراصل آزمائش میں ڈالتے ہیں کہ وہ کثرتِ مال و دولت سے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا ناشکری کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح انسان کا جسم اور اس کی قوتیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں اور انہیں پر تکالیفِ شرعی کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس طرح سے ان کی آزمائش کی گئی ہے، اسی طرح دولت بھی اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور اس کی دین ہے۔ یہ بھی جس کسی کو ملتی ہے عیش و عشرت کیلئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کیلئے ملتی ہے۔ انسان بالعموم خوشحالی اور فارغ البالی میں اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے اور اپنی خوشحالی کو اپنی محنت کا نتیجہ اور اپنے مال و دولت کو اپنی ملکیت سمجھنے لگتا ہے۔ اور یہیں سے اس کے انجام کی خرابی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ جو شخص بھی اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرتا ہے یا کرے گا، ذکر سے مراد عبادت، نصیحت اور یاد دہانی بھی ہے لیکن سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں اس سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں موضوعِ بحث قرآنِ کریم ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ذکر قرآنِ کریم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کی رہنمائی سے اعراض کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں من مانی کرنے لگتا ہے اور اگر اس کو وسیع معنی میں لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تعلیمات کو نظر انداز کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ ایک ایسے عذاب میں داخل کرے گا جو ہر حال میں چڑھتا جائے گا۔ یعنی وہ ایک ایسا عذاب ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ اس کی کمیت میں کمی آئے گی اور نہ کیفیت میں۔ یعنی عذاب کا دورانیہ اور سزا کی مدت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائے گی اور اس کی شدت میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾

(اور یہ کہ مسجدیں اللہ کیلئے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ ۱۸)

اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض چونکہ عذاب کا سبب ہے اور اس کے ذکر کے مراکز مسجدیں ہیں جن کی تعمیر ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے کی جاتی ہے۔ تو اس لحاظ سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ کیونکہ شرک اللہ تعالیٰ کے ذکر کی سب سے بڑی نقیض ہے۔ یوں تو ذکر سے اعراض کے کئی محمل ہو سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک یہ سب سے بڑا جرم ہے۔ اور مساجد میں کسی اور کو پکارنا شرک کی بدترین قسم ہے۔ یہ تو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کرنے والی بات ہے کہ دیکھ تیرے گھر کو بھی ہم نے اپنے معبودوں کے حوالے کر دیا ہے۔ یہاں ان کے بت پڑے ہیں، ان کی تصویریں لگی ہیں، ان کی یاد کی جاتی ہے، ان سے مرادیں مانگی جاتی ہیں جبکہ یہ مساجد اللہ تعالیٰ کے نام سے بنائی جاتی ہیں۔

Marfat.com

مساجد اگرچہ مسجد کی جمع ہے لیکن یہاں خطاب قریش سے ہونے کی وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس کا مصداقِ اول بیت اللہ ہے۔ اس کو جمع کے لفظ سے تعبیر کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہی تمام مساجد کا قبلہ اور ان کا شیرازہ ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جمع سے تعبیر کرنے کے سبب سے یہ حکم سب مساجد کیلئے عام ہو گیا ہے۔

حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ زمین پوری کی پوری عبادت گاہ ہے اور آیت کا منشاء یہ ہے کہ خدا کی زمین پر کہیں بھی شرک نہ کیا جائے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی زمین کو شرک سے پاک کرنا ہی خلافتِ آدم کا حقیقی مقصد ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے مساجد سے مراد وہ اعضاء لئے ہیں جن پر آدمی سجدہ کرتا ہے۔ یعنی ہاتھ، گھٹنے، قدم اور پیشانی۔ اس تفسیر کی رو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعضاء اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کیلئے سجدہ نہ کیا جائے۔

بعض اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ مساجد، مسجد بفتح الجیم کی جمع ہے جو مصدر میمی بمعنی سجدہ آتا ہے۔ تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ سب سجدے صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص ہیں۔ اور جو شخص غیر اللہ کو اعانت کیلئے پکارتا ہے گویا وہ اس کو سجدہ کرتا ہے۔ امت کا اجماع ہے کہ غیر اللہ کیلئے سجدہ حرام ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک کفر ہے۔

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُاللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ؕ﴿۱۹﴾

(اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو لوگوں کا اس پر ٹھٹھ بندھنے لگتا ہے۔ ۱۹)

لِبَدًا ...... جمع ہے لِبْدَۃٌ کی۔ جس کے معنی کسی تہ بہ تہ اور گتھم گتھا شے کے ہیں۔ اس لئے ہم نے ترجمے میں ٹھٹھ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ ٹھٹھ انسانوں کے اس ہجوم کو کہتے ہیں جب آدمی آدمی پر گرا پڑ رہا ہو۔

برعکس صورتحال

ابھی ہم نے مساجد کے بارے میں پڑھا ہے کہ ان کی تعمیر ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے ہوتی ہے، وہاں کسی اور کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ پکارنا اور اس کا شریک بنانا بہت بڑا جرم ہے۔ اس بنیادی تعلیم کو قبول کرنے کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے کہ بیت اللہ میں خاص طور پر غیر اللہ کا نام بھی نہ سنا جا سکتا ہو۔ لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا بندہ یعنی رسول اللہ ﷺ اپنے رب کی عبادت کیلئے کھڑے ہوتے ہیں اور نماز میں ان آیات کی تلاوت کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کی گئی ہے تو کس قدر دکھ اور حیرانی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس گھر میں لوگ ان پر حملہ کیلئے پل پڑتے ہیں۔ اور آپؐ کی توہین کرنے اور ایذا پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ توحیدِ خالص کی آواز کس قدر نامانوس بنا دی گئی ہے کہ جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعمیر کی گئی تھی، اسی میں اس کا ذکر کرنا قابلِ برداشت ہو کر رہ گیا ہے۔

Marfat.com

قُلْ إِنَّمَآ أَدْعُوا رَبِّي وَلَآ أُشْرِكُ بِهٖٓ أَحَدًا ﴿٢٠﴾ قُلْ إِنِّي لَآ أَمْلِكُ
لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ إِنِّي لَنْ يُّجِيرَنِي مِنَ اللّٰهِ أَحَدٌ ۙ
وَّلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾ إِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَإِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ فِيهَآ
أَبَدًا ﴿٢٣﴾ حَتّٰٓى إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ أَضْعَفُ
نَاصِرًا وَّأَقَلُّ عَدَدًا ﴿٢٤﴾ قُلْ إِنْ أَدْرِيٓ أَقَرِيبٌ مَّا تُوعَدُونَ أَمْ
يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيٓ أَمَدًا ﴿٢٥﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ
أَحَدًا ﴿٢٦﴾ إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُولٍ فَإِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ
يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿٢٧﴾ لِّيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ
وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

رکوع: ۲۔ (اے پیغمبر! کہہ دیجئے، کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ۲۰) کہہ دیجئے! میں تم لوگوں کیلئے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ ۲۱) کہہ دیجئے! مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ ۲۲) میرا کام صرف اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچانا ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اس کیلئے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ ۲۳) حتیٰ کہ جب وہ دیکھ لیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ مددگاروں کے اعتبار سے سب سے زیادہ کمزور اور تعداد کے لحاظ سے سب سے حقیر کون ہے۔ ۲۴) کہہ دیجئے! میں نہیں جانتا جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب ابھی اس کو کچھ مدت اور ٹالنے والا ہے۔ ۲۵) عالم الغیب وہی ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ ۲۶) مگر جو پسند کر لیا کسی رسول کو تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا

Marfat.com

ہے۔ ۲۷) تا کہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور وہ ان کے گردوپیش کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔ ۲۸)

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِکُ بِہٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾

(اے پیغمبر! کہہ دیجئے، کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ۲۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استقامت حکم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ قریش کیلئے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر کیسا ہی ناگوار کیوں نہ ہو، وہ کتنا ہی اس کو برا مانیں اور آپؐ کو بالجبر روکنے کی کیسی ہی کوشش کریں، آپؐ صاف اعلان کر دیجئے کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکاروں گا، میں کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراؤں گا۔ تم نے اگر جہالت اور نادانی سے حقائق کو تبدیل کر ڈالا ہے اور تم صحیح اور غلط میں تمیز کھو بیٹھے ہو تو میں تمام مشکلات کے باوجود تمہاری اس روش کی تائید نہیں کر سکتا۔ میں تو ہر صورت اور ہر حال میں اپنے رب ہی کو پکاروں گا اور اس پکار اور اس عبادت میں کسی اور کی شرکت کبھی گوارہ نہیں کروں گا۔

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾

(کہہ دیجئے! میں تم لوگوں کیلئے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ ۲۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کی وضاحت

اپنے مؤقف پر استقامت اور استقلال کے اعلان کے بعد اپنی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ ہوں۔ اس کی بندگی اور عبادت اور اس کے تفویض کردہ فرائض میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف داعی بنا کے بھیجا ہے، داروغہ مقرر نہیں کیا۔ نہ تمہارا نفع وضرر میرے اختیار میں ہے اور نہ تمہاری ہدایت وضلالت۔

عربی زبان کے اسالیب کے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک لفظ کا مقابل جو سیاقِ کلام سے واضح ہو حذف کر دیا جاتا ہے۔ اسے بلاغت کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں اس آیت میں بھی ضرر کے بعد نفعًا اور رُشْدًا کے بعد غیًّا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ہر ایک کا تقابل خود اس پر دلیل ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ میں تمہارے نفع وضرر اور ہدایت وضلالت کا مالک نہیں ہوں۔ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کے پیغامات تمہیں پہنچانے کیلئے مبعوث ہوا ہوں۔ کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا تو درکنار مجھے خود اپنے نفع نقصان کا اختیار بھی حاصل نہیں۔ مجھے صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل ہے اور وہی میرا ماویٰ وملجا ہے۔

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾

(کہہ دیجئے! مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ ۲۲)

Marfat.com

مزید وضاحت

گزشتہ آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ اس کی مزید وضاحت ہے۔ قریشِ مکہ سے مخاطب ہو کر آنحضرت ﷺ فرمارہے ہیں کہ اگر میں تمہاری خاطر یا تم سے خوف کھا کر کسی کو خدا کا شریک مان لوں تو یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا سے مجھے کوئی دوسرا نہیں بچا سکے گا۔ اور میں اللہ تعالیٰ کے مقابل میں اگر کسی اور جائے پناہ کو تلاش کروں تو مجھے کوئی ٹھکانہ نہیں مل سکے گا اور کوئی جائے پناہ میسر نہ آئے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے ہر شخص بے بس ہے۔ جو شخص سرافراز اور مقاماتِ بلند پر فائز ہے وہ سراسر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہے۔ اگر اس کی نظر عنایت پھر جائے تو مقامات چھن جانے میں ایک پل نہیں لگتا۔

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۚ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾

(میرا کام صرف اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچانا ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اس کیلئے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ ۲۳)

میری حیثیت صرف یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے پیغامات اور اس کے ارشادات بے کم و کاست تمہیں پہنچا دوں۔ تم پر عذاب لانا یا تمہارے دلوں میں ہدایت اتار دینا یہ میرے بس میں نہیں۔ اگر میں نے ابلاغ کا حق ادا کر دیا تو میں اپنی ذمہ داری سے بری ہوگیا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر اڑا رہے گا تو اس کیلئے جہنم کی آگ ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

یاد رہے کہ ہر گناہ اور معصیت کی سزا ابدی جہنم نہیں بلکہ اس سے مراد آنحضرت ﷺ کی رسالت کی تکذیب اور توحید کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار ہے۔ کیونکہ یہیں سے دین کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾

(حتیٰ کہ جب وہ دیکھ لیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ مددگاروں کے اعتبار سے سب سے زیادہ کمزور اور تعداد کے لحاظ سے سب سے حقیر کون ہے۔ ۲۴)

قریش کے زعمِ باطل کا رد

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جب قریش کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کرتے اور قرآنِ کریم پڑھ کر سناتے تو وہ آپؐ پر ٹوٹ پڑتے اور کوشش کرتے کہ آپؐ کی تبلیغ و دعوت کا راستہ روک دیں۔ اور زعم انہیں یہ تھا کہ ان کا جتھہ زبردست ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چند مٹھی بھر آدمی ہیں اس لئے وہ آپؐ کو باآسانی دبالیں گے۔ اس پر فرمایا جارہا ہے کہ آج یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو بے یار و مددگار اور اپنے آپ کو کثیر التعداد دیکھ کر حق کی آواز کو دبانے کیلئے بڑے دلیر ہو رہے ہیں۔ مگر جب وہ وقت آئے گا جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے یا انہیں ڈرایا جارہا ہے یعنی عذاب یا قیامت تو اس وقت انہیں اندازہ ہوگا کہ قوت اور جمعیت کے اعتبار سے کمزور و ناتواں کون ہے۔

Marfat.com

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾

(کہہ دیجئے! میں نہیں جانتا جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب ابھی اس کو کچھ مدت اور ٹالنے والا ہے۔ ۲۵)

مخالفین کے طنز کا جواب

ہم قرآنِ کریم میں مختلف مواقع پر پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب کفار کو عذاب یا قیامت سے ڈراتے تھے تو وہ بار بار پوچھتے تھے کہ آخر وہ عذاب کہاں رک کررہ گیا ہے، آتا کیوں نہیں؟ جیسے جیسے عذاب آنے میں تاخیر ہورہی تھی ان کے طنز اور مذاق کے نشتر تیز ہوتے جارہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کا جواب دینے کا حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان لوگوں سے کہئے کہ عذاب یا قیامت کا آنا یقینی ہے مگر اس کے آنے کی تاریخ مجھے نہیں بتائی گئی۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے آنے کا وقت قریب ہے یا دور۔ ممکن ہے وہ بالکل قریب آلگا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ میرا رب کچھ مدت کیلئے اس کو ابھی اور ٹالے کیونکہ اس کا ہر کام اس کی حکمت کے تابع ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

(عالم الغیب وہی ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ ۲۶)

قیامت کے وقتِ معین سے میری بے خبری عالم الغیب نہ ہونے کے سبب سے ہے

یعنی عذاب یا قیامت کے وقتِ معین سے متعلق میری بے خبری اس لئے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں۔ عالم الغیب ہونا صرف اللہ رب العالمین کی خصوصی صفت ہے۔ وہ اپنے غیب پر کسی کو غالب و قادر نہیں بناتا، کہ جب کوئی چاہے اور جس بات کو چاہے اسے معلوم کرلے۔ یہاں عالم الغیب میں الغیب کا الف لام استغراقِ جنس کیلئے ہے۔ یعنی عالم ہر فردِ غیب اور جنسِ غیب کا، اور عَلٰی غَیْبِهٖٓ میں غیب کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے سے اسی استغراق اور جامعیت کا اظہار مقصود ہے۔ یعنی ہر فرد و جنسِ غیب کا علم جو اللہ رب العالمین کا مخصوص وصف ہے اس پر وہ کسی کو قادر و غالب نہیں کرتا کہ کوئی جس غیب کو چاہے معلوم کرلے۔ مقصود اس کلام سے علمِ غیب کلی ہے جس سے جہان کا کوئی ذرہ مخفی نہ ہو، اس کی غیر اللہ سے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے اثبات ہے۔ لیکن کسی بے وقوف کو اس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کو کسی بھی غیب کی چیز کی خبر نہیں، تو پھر وہ رسول کیا ہوئے۔ کیونکہ رسول کے پاس تو اللہ تعالیٰ ہزاروں غیب کی خبریں بذریعہ وحی بھیجتے ہیں اور جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحی نہ آئے وہ نبی اور رسول نہیں کہلاسکتا۔ اس لئے اگلی آیت میں ایک استثنیٰ کا ذکر فرمایا۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

(مگر جو پسند کرلیا کسی رسول کو تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔ ۲۷) تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور وہ ان کے گرد و پیش کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔ ۲۸)

Marfat.com

استثناء کا مفہوم

حاصل استثناء کا اس سفیہانہ شبہ کا یہ جواب ہے کہ علمِ غیب کلی کی نفی سے ہر غیب کی نفی مطلقاً مراد نہیں بلکہ منصبِ رسالت کیلئے جس قدر علم غیب کی خبروں اور غیب کی چیزوں کا علم کسی رسول کو دینا ضروری ہے وہ ان کو منجانب اللہ بذریعہ وحی دے دیا جاتا ہے اور وہ ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وحی نازل ہوتی ہے تو اس کے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ شیاطین اس میں کوئی مداخلت نہ کرسکیں۔ اس میں اول تو لفظِ رسول سے اس غیب کی نوعیت متعین کردی گئی ہے جس کا علم رسول و نبی کو دیا جاتا ہے اور وہ ظاہر ہے علم شرائع واحکام بتمامہ اور غیب کی خبریں بقدرِ ضرورتِ وقت۔ اس کے بعد جو علمِ غیب رسول و نبی کو دیا جاتا ہے اس کی نوعیت اگلے جملے سے یوں بھی متعین کردی کہ وہ بذریعہ فرشتوں کے بھیجا جاتا ہے اور وحی لانے والے فرشتے کے گرد دوسرے فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس استثناء سے جس علمِ غیب کا نبی و رسول کیلئے اثبات ہے وہ بعض اور مخصوص علمِ غیب ہے۔ جس کی ضرورت منصب رسالت کیلئے درپیش ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استثناء اصطلاحی لفظوں میں استثناء منقطع ہے یعنی جس علمِ غیبِ کلی کی اصل کلام میں غیر اللہ سے نفی کی گئی تھی مستثنیٰ میں اس کا اثبات نہیں بلکہ مخصوص علومِ غیبیہ کا اثبات ہے۔ جس کو قرآنِ کریم میں جابجا انباء الغیب کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے تلک من انباء الغیب نوحیھا الیک۔

بعض ناواقف غیب اور انباء الغیب میں فرق نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ انبیاء اور خصوصاً خاتم الانبیاء ﷺ کیلئے علمِ غیب کلی ثابت کرتے ہیں اور آپ ؐ کو بالکل اللہ تعالیٰ کی طرح عالم الغیب ہر ہر ذرہ کائنات کا علم رکھنے والا کہنے لگتے ہیں جو کھلا ہوا شرک اور رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے، نعوذ باللہ منہ۔ اگر کوئی شخص اپنا خفیہ راز کسی اپنے دوست کو بتلا دے جو اور کسی کے علم میں نہ ہو تو اس سے دنیا میں کوئی بھی اس دوست کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو ہزاروں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلا دینا ان کو عالم غیب نہیں بنا دیتا خوب سمجھ لیا جائے۔

جاہل عوام جو ان دونوں باتوں میں فرق نہیں کرتے جب ان کے سامنے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب نہیں، وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپ ؐ کو معاذ اللہ کسی غیب کی چیز کی خبر نہیں جس کا دنیا میں کوئی قائل نہیں اور نہ ہوسکتا ہے کیونکہ ایسا ہونے سے تو خود نبوت و رسالت کی نفی ہوجاتی ہے جس کا کسی مومن سے امکان نہیں۔

آخر سورۃ میں فرمایا وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات خاص ہے جس کے علم میں ہر چیز کے اعداد و شمار ہیں۔ اس کو پہاڑوں کے اندر جتنے ذرے ہیں ان کا بھی عدد معلوم ہے، ساری دنیا کے دریاؤں میں جتنے قطرے ہیں ان کا شمار اس کے علم میں ہے۔ ہر بارش کے قطروں اور تمام دنیا کے درختوں کے پتوں کے اعداد و شمار کا اسی کو علم ہے۔ اس میں پھر علم غیب کلی کا ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا واضح کردیا کہ کسی کو مذکورہ استثناء سے غلط فہمی نہ ہوجائے۔

مسئلہ علمِ غیب کے معنیٰ اور اس کے احکام سورۃ النمل کی آیت قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ کے تحت پوری تحقیق و تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن)

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْمُزَّمِّلِ

(۷۳)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْمُزَّمِّل ہے۔یہ اس سورۃ کے پہلے لفظ سے ماخوذ ہے۔یہ صرف نام ہے جس سے اس سورۃ کی شناخت ہوتی ہے،اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نزول:۔ اس سورۃ کا زمانہ نزول ایک نہیں،اس کے دو رکوع ہیں اور دونوں الگ الگ زمانوں میں نازل ہوئے۔ پہلا رکوع بالاتفاق مکی ہے کیونکہ اس کے مضامین اور اس سلسلے میں روایت ہونے والی احادیث سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔البتہ یہ معلوم کرنا کہ یہ مکی زندگی کے کس دور میں نازل ہوا ہے،اس کا متعین جواب ہمیں روایات سے تو نہیں ملتا۔البتہ پہلے رکوع کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اور اس کے بعد آنے والی سورۃ المدثر قریب قریب زمانے میں نازل ہوئی ہیں اور ان کا زمانہ آپؐ کی بعثت سے دور کا زمانہ معلوم نہیں ہوتا۔اس پر آیات کی جو اندرونی شہادتیں یا قرائن دلالت کرتے ہیں جس سے کسی حد تک زمانہ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ اس سورۃ کا نام جو درحقیقت آنحضرت ﷺ کا خطاب ہے وہ بجائے خود اس بات پر دلیل ہے کہ یہ سورۃ بالکل ابتدائی دور میں نہ سہی لیکن فترتِ وحی کے زمانے میں نازل ہوئی ہے۔بخاری اور مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے غارِ حرا میں نبی کریم ﷺ پر حضرت جبرائیل امین سورۃ العلق کی ابتدائی آیتیں لے کر نازل ہوئے۔فرشتے کے نزول کا چونکہ پہلا تجربہ تھا اس لئے طبعی طور پر اس کا اثر یہ ہوا کہ حضورؐ غار سے نکل کر گھر تشریف لائے تو سخت سردی محسوس کر رہے تھے۔حضرت خدیجہؓ سے فرمایا،زملونی زملونی "مجھے ڈھانپو، مجھے ڈھانپو" اس کے بعد کچھ دنوں تک وحی کا یہ سلسلہ بند رہا۔اسے زمانہ فترت الوحی کہا جاتا ہے۔آپؐ نے اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک روز میں ایک محلے میں چل رہا تھا کہ اچانک میں نے آواز سنی،تو نظر آسمان کی طرف اٹھائی،کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان اور زمین کے درمیان ایک معلق کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔مجھے اس کو اس ہیئت میں دیکھ کر پھر وہی رعب و ہیبت کی کیفیت طاری ہوگئی جو پہلی ملاقات کے وقت ہو چکی تھی۔واپس اپنے گھر چلا آیا اور گھر والوں سے کہا مجھے ڈھانپو۔یعنی مجھے کوئی کپڑا اڑھاؤ۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔اس روایت میں یاایھا المدثر کا ذکر ہے۔ہوسکتا ہے کہ اسی حالت کو بیان کرنے کیلئے یاایھا المزمل کا خطاب بھی آیا ہو۔بہرحال اہلِ تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ دونوں سورتیں قریب قریب زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ المزمل کا نزول نبوت کے ابتدائی دور میں ہوا ہے۔

Marfat.com

بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ مزمل کا معنی ہے ''چادراوڑھ کر لیٹ جانے والا'' عرب کے رہنے والے لوگ چادر کو اپنے لباس کا ایک لازمی حصہ سمجھتے تھے اور آنحضرت ﷺ بھی ہمیشہ چادر اوڑھتے تھے۔ انسان جب کبھی ناموافق حالات سے دوچار ہوتا ہے اور کسی عظیم کام کی انجام دہی میں غیر معمولی رکاوٹوں سے واسطہ پڑتا ہے اور پیش آنے والے موانع ہمت کیلئے چیلنج بن جاتے ہیں اور ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا، تو اس صورتحال سے قدرتاً انسان پر خلوت پسندی اور خلق سے بے تعلقی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی چادر ہی کو اپنا ہمدرد و غمگسار سمجھتا ہے۔ اسی میں لپٹ کر بیٹھتا ہے اور اسی میں گوشہ گیر ہو کر لیٹتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو جب لوگوں کے سامنے علی الاعلان اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کرنے کا حکم ملا اور لوگ جو آپؐ کا انتہائی درجہ احترام کرتے اور الصادق اور الامین کہہ کر پکارتے تھے انہوں نے بھی نہ صرف آپؐ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ آپؐ کیخلاف بدگوئی کرنے لگے، زبانیں آپؐ کیخلاف دراز ہونے لگیں اور اذیت رسانی کا آغاز ہو گیا تو آپؐ غم میں ڈوب کر اپنی چادر میں لپٹ کر لیٹ گئے تاکہ حالات پر غور وفکر کر سکیں، تو یہ سورۃ نازل ہوئی۔

۲۔ آپؐ کو جس عظیم منصب کیلئے اٹھایا گیا اور جس کارِ عظیم یعنی انذار کی ادائیگی کا حکم دیا گیا، اس بارِ عظیم کا بوجھ اٹھانے اور اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے کی قوت پیدا کرنے کیلئے آپؐ کو راتوں کو اٹھ کر عبادت کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ عبادت کے ذریعے براہِ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رہے اور اس کے نتیجے میں وحیِ الٰہی کا تحمل اور مخالفین کی مخالفت برداشت کرنا آپؐ کیلئے آسان ہو جائے۔ ان دونوں باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی کیونکہ اسی دور میں ان دونوں باتوں کی شدید ضرورت تھی۔

۳۔ اس سورۃ میں آپؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ نمازِ تہجد میں آدھی رات یا اس سے کچھ کم وبیش قرآنِ مجید کی تلاوت کی جائے۔ یہ ارشاد خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت قرآنِ مجید کا کم از کم اتنا حصہ نازل ہو چکا تھا کہ اس کی طویل قرأت کی جا سکے۔

۴۔ پہلے رکوع میں مخالفین کی زیادتیوں پر صبر کی تلقین کی گئی ہے اور کفارِ مکہ کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رکوع اس زمانے میں نازل ہوا ہے جب رسول اللہ ﷺ اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کر چکے تھے اور مکہ میں اس کی مخالفت زور پکڑ چکی تھی۔

یہ چار قرائن سامنے رکھے جائیں تو اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ یہ سورۃ بالکل ابتدائی زمانے میں نازل تو نہیں ہوئی لیکن فترتِ وحی کا زمانہ گزرنے کے بعد علانیہ تبلیغ و دعوت کے ابتدائی دور میں اس کا نزول ہوا ہے۔

دوسرے رکوع کے متعلق اگرچہ بعض اہلِ تفسیر کا یہ خیال ہے کہ وہ بھی مکہ معظمہ ہی میں نازل ہوا ہے لیکن اس رکوع کے مضامین سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ رکوع مکہ معظمہ میں نہیں بلکہ ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اس لئے یہ مدنی ہے۔

اس میں قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ مکی زندگی میں اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس میں فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ زکوٰۃ ایک مخصوص شرح اور نصاب کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔

Marfat.com

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

آیت ایک سے چودہ تک آنحضرت ﷺ کو بتایا گیا ہے کہ آپؐ پر ایک قولِ ثقیل ڈالا جانے والا ہے۔اس کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ شب میں قیامِ لیل کا اہتمام کریں، قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں تا کہ دل کو ثبات اور دماغ کو بصیرت حاصل ہو۔ مزید فرمایا گیا کہ مشرق اور مغرب کا خدا ایک اللہ ہے، آپؐ اپنے معاملات اس کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائیں اور مخالفین جو یاوہ گوئی کرتے پھر رہے ہیں، انہیں صبر کے ساتھ نظر انداز کر دیں اور ان کا معاملہ ہم پر چھوڑ دیں، ہم ان سے نمٹنے کیلئے تنہا کافی ہیں۔

آیت ۱۵ سے ۱۹ تک قریش کے لیڈروں کو تہدید و وعید کی گئی ہے کہ جس طرح ہم نے اپنے دین کی گواہی دینے کیلئے فرعون کی طرف اپنا رسول بھیجا، اسی طرح تمہاری طرف بھی ہم نے اپنا رسول بھیجا ہے۔ پھر دیکھ لو کہ جب فرعون نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی بات نہ مانی تو وہ کس انجام سے دوچار ہوا۔ اگر تم نے اس کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام اس سے مختلف ہو۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمہاری اس دنیا میں گرفت نہ کرے لیکن تمہیں اس دن کو یاد رکھنا چاہئے جس کا ہول بچوں کو بوڑھا بنا دے گا اور جس کے بوجھ سے آسمان پھٹا پڑ رہا ہے۔

آیت ۲۰ جسے اکثر آئمہ تفسیر نے مدنی قرار دیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر کی روایت کے مطابق یہ پہلے رکوع سے دس سال بعد نازل ہوئی ہے۔ اور دوسرا رکوع اسی ایک آیت پر مشتمل ہے۔ اس میں نمازِ تہجد کے متعلق اس ابتدائی حکم کے اندر تخفیف کر دی گئی جو پہلے رکوع کے آغاز میں دیا گیا تھا۔ اب یہ حکم دیا گیا کہ جہاں تک تہجد کی نماز کا تعلق ہے وہ تو جتنی با آسانی پڑھی جا سکے پڑھ لیا کرو، لیکن مسلمانوں کو اہتمام جس چیز کا کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ پنج وقتہ فرض نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھیں، فریضہ زکوٰۃ ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں اور اطمینان دلایا گیا ہے کہ تم جو بھی بھلائی کے کام دنیا میں انجام دو گے وہ ضائع نہیں جائیں گے۔ قیامت کے دن تم اپنے ہر عمل کو وہاں موجود پاؤ گے اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ تم نے جو عمل اخلاص کے ساتھ کیا تھا وہاں اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے برگ و بار دیئے ہیں۔ تمہیں ہر صورت میں اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتے رہنا چاہئے، وہ ذات نہایت غفور ہے رحیم ہے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٢٠	سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ (٧٣)	رُكُوْعَاتُهَا ٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ ﴿١﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ ﴿٢﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ
مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿٣﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ ﴿٤﴾ اِنَّا سَنُلْقِيْ
عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿٥﴾ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْـًٔا وَّاَقْوَمُ
قِيْلًا ۭ ﴿٦﴾ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ ﴿٧﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ
تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۭ ﴿٨﴾ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿٩﴾ وَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا
جَمِيْلًا ﴿١٠﴾ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿١١﴾
اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۙ ﴿١٢﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۤ ﴿١٣﴾
يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿١٤﴾
اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ڏ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى
فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۭ ﴿١٥﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا
وَّبِيْلًا ﴿١٦﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ

Marfat.com

شِيبًا ﴿١٧﴾ السَّمَآءُ مُنفَطِرٌۢ بِهٖ ۚ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿١٨﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿١٩﴾

رکوع: ا۔ (اے چادر میں لپٹنے والے!۔ ۱) رات کو نماز میں کھڑا رہا کیجئے، مگر تھوڑا حصہ۔ ۲) آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجئے۔ ۳) یا اس پر کچھ زیادہ کر لیجئے، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھئے۔ ۴) ہم آپؐ پر عنقریب ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ ۵) بیشک رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے اور قرآن ٹھیک پڑھنے کیلئے نہایت خوب ہے۔ ۶) بیشک آپ کیلئے دن کے وقت بہت مصروفیات ہیں۔ ۷) اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ ۸) وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔ ۹) اور لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کیجئے اور ان کو خوبصورتی سے نظرانداز کر دیجئے۔ ۱۰) اور ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں کا معاملہ آپؐ مجھ پر چھوڑ دیجئے اور ان کو کچھ دیر اور مہلت دیجئے۔ ۱۱) بیشک ہمارے پاس (ان کیلئے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ ۱۲) اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور نہایت دردناک عذاب۔ ۱۳) جس دن زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑ بھربھرے ٹیلے بن جائیں گے۔ ۱۴) ہم نے تم لوگوں کی طرف ایک رسول بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ ۱۵) تو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی، تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ ۱۶) تو اگر تم نے ماننے سے انکار کیا تو اس دن کے عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ ۱۷) آسمان اس سے پھٹا پڑ رہا ہے، اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہنا ہے۔ ۱۸) یہ ایک نصیحت ہے تو جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ ۱۹)

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿١﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٢﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴿٣﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿٤﴾

(اے چادر میں لپٹنے والے!۔ ۱) رات کو نماز میں کھڑا رہا کیجئے، مگر تھوڑا حصہ۔ ۲) آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجئے۔ ۳) یا اس پر کچھ زیادہ کر لیجئے، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھئے۔ ۴)

پہلی آیت میں پروردگار نے نبی کریم ﷺ کو ایک ایسے لفظ سے مخاطب فرمایا ہے جس سے آپؐ کی ایک خاص کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اس خطاب میں انتہائی دلنوازی اور محبت پائی جاتی ہے۔

Marfat.com

مُزَّمِّل کا مفہوم

مزمل دراصل متزمل ہے۔ باب تفعل میں ادغام کے قاعدے کے مطابق ت حرف ز میں مدغم ہوگئی ہے۔ بعض آئمہ تفسیر کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ پر پہلی دفعہ نزول وحی کے بعد اور پھر دوسری دفعہ فترتِ وحی کے بعد آسمان اور زمین کے درمیان ایک معلق کرسی پر حضرت جبرائیل امین کو دیکھ کر آپؐ پر ایک مرعوبیت کی کیفیت طاری ہوئی جس کی وجہ سے جسم میں لرزہ طاری ہوگیا۔ آپؐ گھر میں کانپتے ہوئے پہنچے اور فرمایا زملونی زملونی ''مجھے ڈھانپ دو، مجھے ڈھانپ دو۔'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس وحی کے ذریعے آپؐ کو توجہ دلائی گئی کہ آپؐ پر جو وحی کا نزول شروع ہوا ہے اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے جلال سے طبیعت پر مرعوبیت کا طاری ہو جانا یا حضرت جبرائیل امین کے غیر معمولی قد و قامت اور خدوخال کو دیکھ کر پریشان ہو جانا، یہ طبیعت کا تقاضا ہے۔ اب آپ کو ان تجربات کا اپنے اندر تحمل پیدا کرنا ہوگا۔ اس کا طریقہ وہ ہے جو اگلی آیات میں بیان فرمایا گیا ہے۔

بعض اہلِ تفسیر کی رائے یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ آرام فرما رہے تھے۔ اس حالت میں آپؐ پر وحی نازل ہوئی اور آپ سے کہا گیا کہ اے چادر اوڑھ کر سونے والے اب سونے کا زمانہ گزر گیا، آپؐ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے جس پر بھی وہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس کی نیند اڑ جاتی ہے اور آرام اس کیلئے خواب و خیال ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپؐ پر ایک بارِ عظیم ڈالا جا رہا ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری کیجئے۔

بعض اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ مزمل یا مدثر کے لفظ سے درحقیقت نہایت پیار بھرے انداز میں آنحضرت ﷺ کی ایک کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر آنحضرت کو اس کیفیت سے نکلنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ بھی دیگر اہلِ عرب کی طرح چادر کو اپنے لباس کے لازمی حصے کے طور پر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور اہلِ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب انہیں کبھی غیر معمولی حالات سے واسطہ پڑتا، پریشانیاں گھمبیر ہو جاتیں، حالات نامساعد ہو جاتے، اچانک مخالفتیں سر اٹھانے لگتیں اور وہ کوئی رفیق و غمگسار، ہمدردی و خیر خواہی کیلئے اپنے پاس موجود نہ پاتے تو ان کی تسلی اور دلجوئی کیلئے سب سے بڑی رفیق ان کی چادر ہوتی تھی۔ وہ چادر میں لپٹ کر بیٹھتے اور چادر ہی میں لپٹ کر لیٹتے۔ اس طرح سے اہلِ دنیا سے بالکل کٹ کر تنہائی میں ڈوب جاتے اور اپنے حالات میں کوئی بہتری کا راستہ نکالنے کیلئے غور و فکر کرتے۔ آنحضرت ﷺ بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار کر دیئے گئے تھے۔ جیسے ہی آپؐ نے علانیہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ان کے اخلاق و اعمال پر ان ہی کی بھلائی کی خاطر تنقید فرمائی تو وہ قوم جو ہمیشہ آپؐ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی اور سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی اور جن کی زبانیں الصادق اور الامین کہتے ہوئے خشک نہیں ہوتی تھیں، یک لخت ان کی زبانیں شعلے اگلنے لگیں، ان کی آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے، کل کے دوست آج کے دشمن ہو گئے۔ نیا سفر ابھی ہمراہی بہت کم ہیں۔ ایسی حالت میں جب پریشانیاں ہجوم کر آئیں تو آپؐ چادر میں لپٹ کر کسی کونے میں لیٹ گئے اور حالات پر غور و فکر کرنے لگے۔ چنانچہ آپؐ کو اس کیفیت سے نکالنے کیلئے اس وحی کا نزول ہوا۔ آپؐ کو نہایت محبت بھرے انداز میں فرمایا گیا ہے کہ پریشانیوں سے گھبرا کر اور مخالفتوں سے تنگ آ کر مضمحل اور منفعل ہو کر چادر لپیٹ کے لیٹ جانا یہ تو کمزور لوگوں کا کام ہے جن کا سارا دار و مدار صرف اپنے غور و فکر، اپنی تدابیر اور اپنے وسائل پر ہوتا ہے۔ آپؐ کے سر پر پروردگار

Marfat.com

کا سایہ ہے۔ آپؐ کی پشت پناہی وہ ذات کر رہی ہے جس کی قدرتوں کی کوئی انتہا نہیں آپؐ بجائے پریشان ہونے کے اس پروردگارِ عالم سے رجوع کریں جو اپنے کمزور بندوں کی مدد کرتا ہے اور انتہائی ناموافق حالات میں بھی ان کا سہارا بن جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی طرف رجوع کرنے کا یہ طریقہ بتایا کہ رات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑے رہیے، یعنی قیام اللیل کیجئے، تہجد کی نماز بھی اسے کہا گیا ہے۔ اس سے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو مدد پہنچے گی۔ آپؐ ہر پریشانی پر غالب آنے کی ہمت پائیں گے۔ امام بغوی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ وغیرھا کی احادیث کی بنا پر یہ فرمایا ہے کہ اس آیت کی رو سے قیام اللیل یعنی رات کی نماز رسول اللہ ﷺ اور تمام امت پر فرض تھی۔ اور یہ اس وقت کا واقعہ جب پانچ نمازیں فرض نہیں تھیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس آیت میں قیام اللیل یعنی تہجد کی نماز کو فرض ہی نہیں کیا گیا بلکہ رات کے ایک معتدبہ حصے میں عبادت میں مشغول رہنے کو فرض قرار دیا گیا ہے۔

قِیَامُ الَّیْل کی مقدار

دوسری اور تیسری آیت میں اس مقدار کی وضاحت کی گئی جس قدر عبادت میں کھڑا ہونا ضروری تھا۔ اللیل پر الف لام ہے اس سے مراد پوری رات ہے، لیکن آپؐ پر اور آپؐ کی امت پر ساری رات کیلئے عبادت لازم نہیں کی گئی بلکہ یہ فرمایا کہ رات کے نصفِ آخر میں آپؐ تہجد کیلئے اٹھیں، کیونکہ آگے نَاشِئَةَ الَّیْلِ سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ نصف سے رات کا نصفِ آخر مراد ہے۔ ویسے بھی تہجد سو کر اٹھنے کے بعد والی نماز کو کہتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے عمل سے بھی یہی ثابت ہے۔ اور اصل مقصد کے اعتبار سے بھی اسی کو مناسبت بھی ہے اور اثرات کیلئے لحاظ سے یہی وقت بابرکت بھی ہے۔ یہ وقت رات کے نصف کے بقدر بھی ہو سکتا ہے، اس سے کچھ کم بھی ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں چونکہ دیر سویر ہو جانے کا امکان ہے کیونکہ رات کے پچھلے پہر اٹھنا ایک مشکل کام ہے، اس لئے وقت کے معاملے میں وسعت رکھی گئی کہ ہمت ساتھ دے اور مصروفیات مانع نہ ہوں تو نصف رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزرنی چاہئے، لیکن اگر اس میں کمی بیشی ہو جائے تو الفاظ میں اس کی گنجائش موجود ہے۔

تَرْتِیْل کا مفہوم

مزید فرمایا کہ اس نماز میں قرآن کو ٹھہر ٹھہر کے پڑھو۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کا ایک مومن کے عقیدہ و عمل کی اصلاح میں سب سے مؤثر کردار ہے۔ یہ تجدیدِ عہد بھی ہے، عہد کا اعلان بھی ہے اور ایفائے عہد کی قوت کو بڑھانے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک ایسا واسطہ ہے جس سے قرب کے نہایت مضبوط رشتے وجود میں آتے ہیں اور نمازِ تہجد ان تمام حوالوں سے سب سے زیادہ اہم ہے۔ انتہائی جانگسل مراحل، ناموافق حالات اور حوصلہ شکن مزاحمت میں اللہ تعالیٰ کی مدد کو دعوت دینے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس لئے بطورِ خاص ارشاد فرمایا گیا کہ اس نماز میں قرآنِ کریم کو جو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی صفت ہے کو ٹھہر ٹھہر کے پڑھو۔ یعنی اسے تیز اور رواں دواں پڑھنے سے منع فرمایا۔ اور اس طرح پڑھنے کی ترغیب دی کہ جس میں ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح نمایاں ہو کر زبان سے نکلے۔ ایک ایک آیت پر ٹھہرو تا کہ ذہن پوری طرح کلامِ الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھنے پر قادر ہو سکے۔ جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا ذکر آئے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو جانی چاہئے اور جہاں رحمت کا بیان ہو تو دل جذباتِ تشکر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں اس کے غضب اور عذاب کا ذکر آئے

Marfat.com

تو دل کی دھڑکن اس کے خوف سے تیز ہو جائے، اوامر و نواہی آئیں تو دل تعمیل کیلئے لپکتا جائے۔ غرضیکہ نماز پوری توجہ، انہاک، خشوع و خضوع، مطلوبہ کیفیات سے سرشار اور ہر طرح کے پسندیدہ جذبات سے مامور ہو۔ آنحضرت ﷺ کی نماز کا جو طریقہ روایت کیا گیا ہے وہ ایسی ہی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ آپ نماز میں قرآن کریم کو کیسے پڑھتے تھے تو انہوں نے کہا آپ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ آپؐ، اللہ، رحمٰن اور رحیم کو مد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ قرآن لحن اور لے سے پڑھتے، آیت آیت پر وقف فرماتے، کبھی ایک ہی آیت شدتِ تاثر میں بار بار دہراتے، کوئی آیت قہر و غضب کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگتے اور جو آیت رحمت کی ہوتی اس پر ادائے شکر فرماتے۔ قرآنِ کریم کو ان آداب کے ساتھ پڑھنا اسی کو ترتیل کہا گیا ہے۔

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝

(ہم آپؐ پر عنقریب ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ ۵)

قِیَامُ الَّیْلِ کا سبب

رات کو نماز کا جو حکم دیا گیا اور پھر اس میں قرآنِ کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے کی تلقین کی گئی، پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ ہم آپؐ پر ایک قولِ ثقیل یعنی بھاری کلام ڈالنے والے یعنی نازل کرنے والے ہیں۔ اس کے تحمل اور اس مقصدِ عظیم کی ادائیگی کیلئے ایک پیشگی ریاضت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ آپؐ کے اندر وہ قوت پیدا ہو جائے جس سے آپؐ قولِ ثقیل کا حق ادا کر سکیں۔

قولِ ثقیل سے مراد

سوال یہ ہے کہ قولِ ثقیل کیا ہے؟ اکثر اہلِ تفسیر نے اس سے قرآنِ کریم مراد لیا ہے اور اسے قولِ ثقیل اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا، اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا، اس کے بیان کردہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود کی دائمی پابندی کرنا، اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا اور اس کے مطابق عقائد و افکار، اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کر دینا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی بھاری کام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری وجہ قرآنِ کریم کے بھاری کلام ہونے کی یہ ہے کہ جب قرآنِ کریم نازل ہوتا تھا تو اس کے نزول کا تحمل آنحضرت ﷺ کیلئے بڑا دشوار تھا۔ حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں، ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ پر اس حالت میں وحی کا نزول شروع ہو گیا کہ اتفاق سے آپؐ کا زانو میرے زانو پر تھا۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا بوجھ پڑا معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں سخت سردی کے زمانے میں حضورؐ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے۔ آپؐ کی پیشانی سے اس وقت پسینہ ٹپکنے لگتا تھا۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب کبھی آپؐ پر اس حالت میں وحی نازل ہوئی کہ آپؐ اونٹنی پر سوار تھے تو اونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اس وقت تک حرکت نہ کر سکتی تھی جب تک نزولِ وحی کا سلسلہ جاری رہتا۔

Marfat.com

بعض اہلِ علم کے نزدیک قولِ ثقیل سے مراد انذارِ عام ہے جس کا حکم سورۃ المدثر کی دوسری آیت میں دیا گیا ہے۔ یہ انذارِ عام ہی آنحضرت ﷺ کا حقیقی منصب ہے۔ اسی میں آپ ؐ کو براءت، ہجرت اور اعلانِ جنگ کے سخت ترین مراحل سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ ان مراحل سے گزرنے کیلئے جس جہادِ عظیم کی ضرورت تھی اسی کیلئے آپ ؐ کو کم وبیش نصف رات تک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑے رہنے اور ترتیل کے ساتھ قرآنِ کریم پڑھنے اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں اپنے آپ کو فنا کردینے کی تربیت دی گئی تاکہ آپ ؐ میں اور مسلمانوں میں وہ قوت پیدا ہو جائے جو اقامتِ دین کی جدوجہد کیلئے ضروری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انجام کے اعتبار سے ان دونوں آراء میں کوئی فرق نہیں۔ قولِ ثقیل سے مراد قرآنِ کریم لیا جائے تو تب بھی قرآنِ کریم کے ذریعے انذارِ عام اور اقامتِ دین ہی ہدف رہتا ہے۔ اور اگر اس سے مراد انذارِ عام لیا جائے تو ظاہر ہے اس کا ذریعہ قرآنِ کریم ہی تو ہے۔ صرف الفاظ کا فرق ہے، حقیقت کا نہیں۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ؕ ۝٦

(بیشک رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے اور قرآن ٹھیک پڑھنے کیلئے نہایت خوب ہے۔ ٦)

نَاشِئَةَ الَّيْلِ کا مفہوم اور اس کی حکمت

نَاشِئَةً ...... عَاقِبَةٌ اور عَافِيَةٌ کے وزن پر مصدر یا حاصل مصدر ہے۔ یہ نشأ سے ہے۔ اس کے معنی اٹھنے کے ہیں۔ نَاشِئَةَ الَّيْلِ کے معنی رات کی نماز کیلئے اٹھنا ہے جسے قیام اللیل یا شب خیزی کہا جاسکتا ہے۔ اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ تہجد کا وقت درحقیقت شب میں سو کر اٹھنے کے بعد یعنی پچھلے پہر کا ہے۔ اکثر آئمہ لغت وتفسیر کے نزدیک نَاشِئَةَ الَّيْلِ رات کے قیام کو کہتے ہیں، چاہے وہ سونے کے بعد اور عشاء کی نماز کے بعد رات کے کسی حصے میں بھی ہو۔ لیکن آنحضرت ﷺ اور جمہور صحابہ اور تابعین اور صلحائے امت کے عمل نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ شب کی اس نماز کو قیام الیل یا نمازِ تہجد کہا جاتا ہے جو رات کے نصفِ آخر میں پڑھی جائے چاہے اس میں وقت کم وبیش ہو جائے۔ اس وقت چونکہ نیند بڑی گہری ہوتی ہے اس لئے اس وقت نیند سے اٹھنا ایک مشکل کام ہے، لیکن پروردگار نے عبادات کے ذریعے انسان کو اپنی عادات اور طبیعت کے تقاضوں پر قابو پانے کی تلقین کی ہے۔ روزہ، غذا اور آرام وراحت کی طلب اور جنسی ضرورت پر قابو پانے کا نام ہے۔ یہی تین انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں لیکن اگر حد سے بڑھ جائیں تو انسانی اقدار کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ ان تینوں خصائل کو اپنی حدود میں رکھنا اور ان پر قابو پانا روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔ یہی حال باقی عبادات کا بھی ہے۔ نمازِ تہجد بھی نیند کی حد سے بڑھی ہوئی رغبت اور محبت اور نفس کی خواہش پر قابو پانے کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ جو شخص خواہشِ نفس، جسم کے تقاضوں اور عادات کی ناہمواری پر قابو پالیتا ہے، یوں سمجھئے کہ وہ ایک ایسا شہ سوار ہے جسے اپنے گھوڑے پر قابو حاصل ہے۔ وہ جہاں چاہتا ہے اپنی مرضی سے اس سے کام لیتا ہے۔ اس کا جسم، اس کا نفس، اس کی صلاحیتیں اور خواہشیں اس کا مرکب ہیں اور یہ ان سب کا راکب ہے۔ اگر یہ ان پر قابو پالیتا ہے تو پھر اس کیلئے زندگی کے مقاصد کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ اور وہ زندگی اس طرح گزارتا ہے جیسے شہ سوار اپنے گھوڑے سے کام لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ ان پر قابو پانے کی بجائے خود ان کے پیچھے چلنے لگتا ہے تو یہ ایسے ہے جیسے کوئی سوار اپنے گھوڑے کے قابو آجائے۔ ایسا گھوڑا اپنے سوار کو کسی بھی کھائی میں گرا کر مارتا ہے۔ ایسے ہی مقاصد کیلئے نمازِ تہجد کے

Marfat.com

ذریعے نفس پر قابو پانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جو کچھ عرض کیا گیا یہ اس صورت میں ہے کہ "وَطْأً" کو مشہور قرأت کے مطابق ضَرْبٌ کے وزن پر پڑھا جائے۔ لیکن ایک اور قرأت بھی ہے جس میں اسے وِطَـاءً بھی پڑھا گیا ہے۔ واؤ کے کسرے اور الف ممدودہ کے ساتھ کتاب کے وزن پر۔ اس صورت میں یہ مواطاۃ بمعنی موافقت کا مصدر ہے۔ آئمہ تفسیر میں سے حضرت ابن عباسؓ اور ابن زیدؒ سے یہی معنی منقول ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ رات کے وقت نماز کیلئے اٹھنا، قلب، نگاہ، کان اور زبان سب میں باہمی موافقت پیدا کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ رات کے ان اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان چونکہ کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دل اور زبان میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زبان اس وقت جو کچھ کہتی ہے وہی کان سنتے ہیں۔ تو آدمی پوری طرح ایک ہی کیفیت کی گرفت میں ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے سے تعبیر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں، وہی ہے جو پہلے عرض کیا گیا ہے۔

وَاَقْوَمُ قِيْلاً کا مفہوم

وَاَقْوَمُ قِيْلاً...... اَقْوَمُ کے معنی زیادہ مستقیم اور درست اور زیادہ ثابت کے ہیں۔ اور قِيْلاً قول کے معنی میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ رات کے وقت تلاوتِ قرآن زیادہ درست جماؤ اور ثبات کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مختلف قسم کی آوازوں اور شور و شغب سے دل و دماغ منتشر نہیں ہوتے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شب خیزی، یعنی صبح کے وقت اٹھنا جبکہ نیند کی گرفت اور طبیعت کے اضمحلال کی وجہ سے اٹھنا آسان نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ کوئی شخص اگر اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی کتاب سمجھنے کیلئے اس سے زیادہ بابرکت وقت اور کوئی نہیں ہے۔ ایسے شخص کو اپنے نفس کی خواہشوں پر غلبہ پانے کی ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو اس کیلئے اصلاحِ نفس کی راہ میں فتوحات کے بیشمار دروازے کھول دیتی ہے۔ جب آدمی اس وقت بستر سے اٹھ کر وضو کر کے نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کے قدم خوب جمتے ہیں، دل و دماغ میں ہم آہنگی اور یکسانی پیدا ہوتی ہے، نہایت دلجمعی کی کیفیت ہوتی ہے، ظاہر اور باطن میں سازگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی کیفیات کی موجودگی میں جو نماز پڑھی جائے گی اور جو دعا کی جائے گی اس کے اثر اور تاثر کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اہل اللہ انہی کیفیات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کامیابی کی کلید سمجھتے ہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

عطار ہو رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہِ سحر گاہی

اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلاً ﴿۷﴾

(بیشک آپ کیلئے دن کے وقت بہت مصروفیات ہیں۔ ۷)

سَبْـح ...... کے لفظی معنی جاری ہونے اور گھومنے پھرنے کے ہیں۔ اسی سے پانی میں تیرنے کو بھی سَبْـح اور سیاحت کہا جاتا ہے۔ کیونکہ پانی میں بغیر کسی رکاوٹ کے گھومنا پھرنا تیراکی کے ساتھ آسان ہے۔

Marfat.com

قِیَامُ الَّیلِ کی ایک اور حکمت

اس آیتِ کریمہ میں قیام اللیل کی تیسری حکمت اور مصلحت بیان کی گئی ہے کہ رات کو نصفِ شب یا اس سے کچھ کم یا زیادہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں کھڑے رہنے اور عبادت کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور رات کو بطورِ خاص اس کیلئے مقرر فرمایا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دن میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو بہت سے مشاغل سے واسطہ رہتا ہے جس میں گھریلو مصروفیات بھی ہیں، معاشرتی تعلقات بھی ہیں، کاروبار کی مشغولیت بھی ہے اور اس سے بڑھ کر تبلیغ و دعوت کی جانگسل ذمہ داری کی ادائیگی ہے۔ ان مصروفیات میں عبادت اور قیام کیلئے طویل وقت نکالنا ممکن نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق، اس کی مدد، دل کی آسودگی، اطمینان اور قوت کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری ضروری ہے۔ جس طرح آدمی تھکاوٹ کے بعد آرام کرنا چاہتا ہے، بھوک کے بعد غذا کی ضرورت محسوس کرتا ہے، دل اداس ہو تو کسی دوست کو ڈھونڈتا ہے، پریشانی ہو تو مددگار کو تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک مؤمن ہر طرح کی احتیاجات اور پریشانیوں میں صرف اپنے اللہ کو یاد کرتا ہے، اسی کی یاد سے اپنی بیٹری کو چارج کرتا ہے، وہیں سے اسے اعتماد اور توکل کی دولت ملتی ہے۔ چنانچہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے دن کی بجائے رات کے قیام کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ دن کی مصروفیات میں اس کیلئے گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔

بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ رات کو قیام اور عبادت کا حکم صرف اس لئے نہیں دیا گیا کہ دن میں آدمی کے سامنے بہت سی مصروفیات ہوتی ہیں اور رات فرصت کا وقت ہے بلکہ قرآنِ کریم کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے سامنے جو عظیم مقصد درپیش ہے رات کے نصفِ آخر کا وقت اپنے مزاج و کیفیات کے اعتبار سے اس کیلئے سب سے زیادہ سازگار ہے ورنہ امکان تو اس بات کا بھی ہے کہ رات کو بھی مصروفیات پیدا ہو جائیں جیسا کہ آج کے دور میں صورتحال یکسر بدل گئی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے آیت کے اسلوب کے حوالے سے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سبح کو مصروفیت کے معنوں میں لینا کچھ زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا، اگرچہ الفاظ میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ اس لئے ان کے خیال میں آیت میں سبح کا معنی مصروفیت کی بجائے تسبیح کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ رات اگرچہ قیام اور عبادت کیلئے موزوں ترین ہے لیکن دن کو بھی تسبیح کے بہت مواقع موجود ہیں۔ اس لئے دن کو بھی برابر اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں لگے رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام رکھتے تھے۔ ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ آیتِ کریمہ کے الفاظ میں دونوں تاویلات کیلئے گنجائش موجود ہے، لیکن رات کا اہتمام جن مقاصد و حکم کے تحت کیا گیا ہے، دن کے اوقات میں یقیناً ان کا بروئے کار آنا ممکن نہ تھا، اور اس کی وجہ دن کی سرگرمیاں اور ہر شخص کی مصروفیات ہیں۔ جہاں تک تسبیحات کا تعلق ہے بلاشبہ آنحضرت ﷺ کبھی بھی اس سے غافل نہیں ہوتے تھے اور اگلی آیات میں اس کا ذکر بھی کیا جا رہا ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝٨

(اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ ۸)

Marfat.com

ذِکْرُاللّٰہَ اور تَبَتُّل کاحکم اور مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلی بات یہ کہ آپؐ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے ذکر پر مداومت ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا تصور ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ آپؐ بالکل ذکر نہ کرتے۔ اس میں صرف یہ تاکید کی گئی ہے کہ نینداور عبادت کی مصروفیات کے علاوہ کوئی وقت بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے فارغ نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ جس طرح انسان کی مادی زندگی کیلئے سانس ضروری ہے، اسی طرح اس کی روحانی زندگی کیلئے اللہ تعالیٰ کی یاد ضروری ہے۔ سانس رک جائے تو جسم مردہ ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے غفلت ہوجائے تو روح پژمردہ ہوجاتی ہے۔

ذکراللہ سے مراد عام ہے، خواہ زبان سے ہو یا قلب سے۔ یا اعضاء وجوارح کو اللہ تعالیٰ کے احکام میں مشغول رکھنے سے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ حَیْنٍ ''رسول اللہ ﷺ ہروقت اللہ تعالیٰ کا ذکر فرماتے تھے۔'' حالانکہ بیت الخلاء وغیرہ میں آپؐ کا ذکر لسانی نہ کرنا روایاتِ حدیث سے ثابت ہے۔ اس لئے یہ کہنا پڑے گا کہ یہاں ذکر سے مراد ذکرِ قلبی ہے جو ہروقت جاری رہ سکتا ہے۔ اسی طرح آیاتِ آفاق وانفس میں تدبر وتفکر بھی ذکر ہی میں شامل ہے۔ اور یہ ایک ایسی عبادت اور ایک ایسی یاد ہے جو نہ دن کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ رات کے ساتھ۔ بلکہ ہروقت جاری رہ سکتی ہے۔ اس آیت میں جو دوسرا حکم دیا گیا ہے وہ تبتـل ہے۔ تبتـل اور تبتیـل کے معنی انقطاع الی اللہ کے ہیں۔ یعنی خلق سے کٹ کر رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہوجانا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کی حق بیزاری اور دلآزاری سے دل آزردہ ہوتو ان ناقدروں سے کٹ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت میں پناہ گیر ہوجایا کریں۔ اس کی بارگاہ کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ جب انسان اپنے دل آپؐ کی طرف سے بند کرلیں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ تو آپؐ بجائے ادھر دیکھنے کے اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت میں داخل ہوجائیں۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ انسانوں کے دلوں کے فیصلے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔ آپؐ جب اس سے مدد چاہیں گے تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کے مخالفین کو ہدایت کی طرف متوجہ کردے۔

حضرت ابن زید نے فرمایا کہ تبتـل کے معنی یہ ہیں کہ تمام دنیا و مافیھا کو چھوڑیں اور صرف اس چیز کی طرف متوجہ رہیں جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ (مظہری) لیکن جس تبتل اور مخلوق سے قطع تعلق کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے وہ اس ترکِ تعلقات اور ترکِ دنیا سے بالکل مختلف ہے جس کو قرآن پاک میں رہبانیت کہا گیا ہے اور اس کی مذمت کی طرف اشارہ کیا ہے ورھبـانیۃ ابتـدعـوھـا اور جس کے متعلق حدیث میں ہے لا رھبانیۃ فی الاسلام ۔ کیونکہ رہبانیت اصطلاح شرح میں اس ترکِ دنیا اور ترکِ تعلقات کا نام ہے جس میں تمام لذائذ اور حلال طیب اشیاء کو بہ نیت عبادت چھوڑ دیا جائے۔ یعنی یہ اعتقاد ہو کہ ان حلال چیزوں کو چھوڑے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہاں جس تَبَتُّل اور ترکِ تعلق کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق پر کسی دوسری مخلوق کا تعلق غالب نہ آنے پائے، خواہ اعتقاداً ہو یا عملاً۔ اور ایسا ترکِ تعلق تمام دنیوی معاملات ازدواج ونکاح اور تعلقاتِ رشتہ داری وغیرہ کے منافی نہیں بلکہ ان سب کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا ۝

(وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔ ۹)

Marfat.com

وَکِیۡل کا مفہوم

وکیل لغت میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کرنے پر آپؐ کیخلاف جو مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے اور جو مشکلات آپؐ کے راستے میں حائل کر دی گئی ہیں ان پر کوئی پریشانی آپؐ کو لاحق نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ آپؐ کا رب وہ ہے جو مشرق و مغرب یعنی ساری کائنات کا مالک ہے، جس کے سوا خدائی کے اختیارات کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ آپؐ اپنا معاملہ اس کے حوالے کر دیجئے۔ اسی کو اصطلاح میں توکل کہتے ہیں۔ اس سورۃ میں نبی کریم ﷺ کو جو احکام دیئے گئے ہیں، یہ اس سلسلے کا پانچواں حکم ہے۔ (۱) رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے خلوت، (۲) قرآنِ کریم میں اشتغال، (۳) ذکر اللہ پر دوام، (۴) ماسوی اللہ سے اعراض و ترکِ تعلق، (۵) اللہ تعالیٰ پر توکل۔ توکل کا حکم دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی شان بیان فرمائی گئی کہ وہ کائنات کا مالک اور رب ہے، ساری جہانوں کو پالنے والا ہے اور سب کی ضرورتوں کا متکفل ہے۔ اس لئے اس کے سوا کون ذات ہے جس پر توکل اور بھروسہ کیا جاسکے۔ تو جس نے اس پر بھروسہ کر لیا، اس کیلئے وہ کافی ہو جاتا ہے۔

توکل کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ کسبِ معاش اور مشکلات دور کرنے کے جو اسباب و آلات اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں ان کو معطل کر کے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے بیٹھ جایا جائے۔ بلکہ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے مقاصد کیلئے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت و توانائی اور جو اسباب میسر ہیں ان سب کو بروئے کار لایا جائے۔ مگر اسبابِ مادیہ میں غلو اور انہاک بڑھنے نہ پائے۔ اعمالِ اختیاریہ کو عمل میں لانے کے بعد نتیجہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا جائے اور بھروسہ تمام تر اسی پر ہو۔ شاعر نے ٹھیک کہا:

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر اس خنجر کی تیزی کو مقدر کے حوالے کر

وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ﴿۱۰﴾

(اور لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کیجئے اور ان کو خوبصورتی سے نظر انداز کر دیجئے۔ ۱۰)

مخالفین کی یاوہ گوئی پر صبرِ جمیل کا حکم

اس سورۃ میں آنحضرت ﷺ کو جو احکام دیئے گئے ہیں یہ ان میں سے چھٹا حکم ہے۔ یعنی لوگوں کی ایذاؤں اور گالیوں پر صبرِ جمیل۔ یہ عجیب معاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول جن لوگوں کی طرف مبعوث ہوتے ہیں وہ ان کی ہدایت کیلئے نہایت حریص اور ان کی بہتری کیلئے نہایت شفیق ہوتے ہیں۔ کوئی باپ اپنے بچوں کیلئے شاید اس قدر ہمدرد و غمگسار نہ ہو جتنا پیغمبر ان لوگوں کیلئے ہوتا ہے، لیکن لوگ ان کی تمام تر خیر خواہیوں اور ہمدردیوں کے جواب میں وہ کچھ کر گزرتے ہیں جو ایک شریف آدمی شاید اپنے دشمن کے ساتھ کرنا بھی پسند نہ کرے۔ ان کی زبانیں زہر اگلنے لگتی ہیں، ان کی نگاہوں سے نفرت کے شرارے پھوٹتے ہیں۔ زندگی کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو ان لوگوں کے ہاتھوں سے ان محسنوں کو نہیں پہنچایا جاتا۔ کسی نے ٹھیک کہا:

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

Marfat.com

چنانچہ ایسی صورتحال میں نبی کریم ﷺ کو ہدایت کی جارہی ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں آپؐ ان پر صبر کیجئے، اپنے مؤقف پر ڈٹے رہیئے۔ ان کی باتوں کا برا ماننے کی بجائے انہیں معذور سمجھ کر ان کیلئے دعا کیجئے۔ جس طرح ایک مریض کڑوی دوا پلانے والے تیماردار پر برہمی کا اظہار کرتا ہے لیکن تیماردار اس کا برا نہیں مانتا۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کی بھلائی کیلئے اسے کڑوی دوا پلا رہا ہوں۔ رہا اس کا رویہ تو ایک بیمار سے بہتر رویئے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

بعض دفعہ مخالفین کا عناد اور بغض اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کیلئے اپنی تبلیغی مساعی کو انجام دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی بدزبانی اور ان کی ایذا رسانی ناگواری کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں نصیحت اور خیر خواہی کرنے والے کا حوصلہ بھی جواب دینے لگتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ آپؐ انہیں چھوڑ دیجئے، لیکن ایک قید کے ساتھ۔ ھَجو کے لفظی معنی کسی چیز کو رنج وملال اور بیزاری کے ساتھ چھوڑنے کے آتے ہیں۔ لیکن یہاں قید یہ لگائی گئی کہ آپؐ انہیں بیزاری کے ساتھ نہ چھوڑیں، ان کی بدتمیزیوں اور بے ہودگیوں کا جواب نہ دیں۔ آپؐ کی طرف سے کسی غم اور غصے اور جھنجھلاہٹ کا اظہار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ایسا چھوڑنا عام دنیاداروں کا شیوہ ہے۔ آپؐ تو ان لوگوں کی اصلاح کیلئے مبعوث ہوئے ہیں۔ آپؐ یہ سب کچھ کسی ذاتی منفعت کیلئے نہیں کر رہے ہیں، آپؐ کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا ہونی چاہئے۔ آپؐ کا چھوڑنا ھجر جمیل کی تصویر ہو۔ جس طرح ایک شریف آدمی کسی بازاری آدمی کی گالی سن کر اسے نظرانداز کر دیتا ہے اور دل پر میل تک نہیں آنے دیتا، آپؐ کا طرزِ عمل اس سے بھی بہتر ہونا چاہئے۔ آپؐ انہیں اس طرح چھوڑیئے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویئے پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ زبان خاموش رہتی ہے لیکن دل سے بیٹے کیلئے دعائیں اٹھتی رہتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ ایسے ہی حُسنِ اخلاق کے پیکر تھے۔ مخالفین کی مخالفت کا مقابلہ آپؐ نے اسی ھجر جمیل سے کیا۔ اور اسی حُسنِ اخلاق نے بہت سے لوگوں کو اپنے رویئے پر غور و فکر کرنے پر آمادہ کر دیا۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ⑪

(اور ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں کا معاملہ آپؐ مجھ پر چھوڑ دیجئے اور ان کو کچھ دیر اور مہلت دیجئے۔ ۱۱)

أُولِي النَّعْمَةِ ...... نَعمت کے معنی تنعم یعنی عیش وعشرت اور مال واولاد کی بہتات کے ہیں۔ اسی کو رفاہیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تکذیب کرنے والوں کو سخت دھمکی

اس آیتِ کریمہ میں مخالفین کیلئے سخت دھمکی ہے کہ تم لوگ ہمارے رسول کی مخالفت میں حد سے بڑھتے جارہے ہو، لیکن تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے رسول سے نہیں بلکہ ہم سے ہے۔ اور جب ہماری پکڑ آتی ہے تو پھر نہ افراد بچتے ہیں، نہ حکومتیں باقی رہتی ہیں۔ سوچ لو، تمہارا انجام کس قدر ہولناک ہوگا۔ ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کو ایک آگاہی بھی ہے کہ مخالفین کی ایذارسانیاں اگرچہ انتہا کو چھونے لگی ہیں، لیکن آپؐ اطمینان رکھیں اب ان کی مہلت ختم ہونے والی ہے۔ ابھی کچھ وقت لگے گا اس لئے آپؐ ابھی ان کو کچھ اور مہلت دے دیجئے۔ بہت جلد ان کا معاملہ انجام کو پہنچنے والا ہے۔

Marfat.com

اور تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی مخالفت کبھی بھی عوام اور چھوٹے لوگوں کی طرف سے نہیں ہوئی کیونکہ ان کی قیادت ہمیشہ طبقۂ امراء کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں دولت ورفاہیت اس لئے دیتا ہے تاکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائیں لیکن وہی دولت ان کیلئے آزمائش بن جاتی ہے۔ ایک طرف تو ان مالداروں کو توجہ دلائی جارہی ہے اور ان کی ناشکری پر ملامت کی جارہی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ یہی دولت ورفاہیت عنقریب ان کیلئے تباہی کا باعث بننے والی ہے تو تم ان کی ہدایت کیلئے دعا کرو، لیکن ان کی دولت کو رشک کی نگاہ سے کبھی نہ دیکھنا۔

اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳﴾
يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾

(بیشک ہمارے پاس (ان کیلئے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ ۱۲) اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور نہایت دردناک عذاب۔ ۱۳) جس دن زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑ بھربھرے ٹیلے بن جائیں گے۔ ۱۴)

اَنْكَالًا ...... نِكل کی جمع ہے۔ اس کے معنی بیڑی کے بھی ہیں اور آہنی لگام کے بھی۔ بعض دفعہ قید و بند پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

ذَا غُصَّةٍ ...... غُصَّةٍ کا لفظی معنی گلے میں لگ جانے والے پھندے کے ہیں کہ کوئی لقمہ گلے میں اس طرح پھنس جائے کہ نہ نگلا جاسکے اور نہ باہر اگلا جاسکے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری بخشی ہوئی دولت ورفاہیت سے ان کے دماغ ایسے خراب ہوئے کہ رسول کی تکذیب پر تل گئے اور اس کی دعوت وتبلیغ کو اپنے غرور وتکبر کیلئے چیلنج سمجھنے لگے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دنیا ہمیشہ نہیں رہے گی، قیامت کا دن آ کے رہے گا۔ اس روز ہمارے پاس ان کیلئے بیڑیاں ہوں گی اور بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی۔ یعنی بیڑیوں اور زنجیروں کے اندر جکڑ کر اس بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کردیئے جائیں گے۔

دنیا میں ہم نے انہیں کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا، کیسے کیسے ترنوالے انہیں عطا کئے اور کیسے رسیلے پھل ان کے کام ودہن کی لذت کیلئے پیدا کئے گئے۔ لیکن انہوں نے کسی نعمت کا حق نہ پہچانا تو آخرت میں ان کو ان ترنوالوں کے بدلے میں وہ کھانا دیا جائے گا جو ان کے حلق میں پھنس کررہ جائے گا۔ اور آج جس عیش میں زندگی بسر کررہے ہیں اس کی جگہ انہیں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اور یہ سب کچھ ان کے ساتھ اس دن ہوگا جس دن یہ زمین اور پہاڑ سب لرز اٹھیں گے۔ آج ان کے امراء اپنے محلات کو ناقابلِ تسخیر قلعے سمجھتے ہیں، لیکن جو دن ان کا منتظر ہے اس دن ان کے ایوان ومحل تو درکنار پہاڑوں کا بھی یہ حال ہوگا کہ وہ بھربھرے ریت کے تودوں کی مانند ہوجائیں گے۔ پہاڑ دیکھنے کو کس قدر مضبوط، ٹھوس اور محکم وجود رکھتے ہیں لیکن قیامت کے دن وہ باریک بھربھری ریت کے ٹیلے بن جائیں گے۔ پھر جو زلزلہ زمین کو ہلا رہا ہوگا اس کی وجہ سے یہ ریت بکھر جائے گی اور ساری زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔

Marfat.com

اِنَّـآ اَرْسَلْنَـآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلاً ۙ شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَـآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلاً ۝۱۵
فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلاً ۝۱۶

(ہم نے تم لوگوں کی طرف ایک رسول بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ ۱۵
تو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی، تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ ۱۶)

قریش کو براہِ راست تنبیہ

اب قریشِ مکہ کو براہِ راست پروردگار خطاب فرما رہے ہیں کہ تم نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کو قرار واقعی مقام نہ دینے کی وجہ سے ایک مذاق بنا لیا ہے حالانکہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کسی رسول کا کسی قوم کی طرف مبعوث ہونا کوئی کھیل نہیں بلکہ اس قوم کیلئے اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کا احسان ہے تو دوسری طرف اس قوم کیلئے بہت بڑی ابتلاء بھی ہے۔ اب ان کی حیات و بقاء اس فیصلے پر آ ٹھہرتی ہے کہ وہ مبعوث ہونے والے رسول کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں کہ ہم نے تمہاری طرف رسول بھیجا۔ ہم نے ہر دور میں انسانوں کی ہدایت کیلئے رسول بھیجے ہیں اور پھر اس میں قوموں کی تخصیص بھی نہیں بلکہ انسانوں کی ہر قابلِ ذکر آبادی میں اللہ تعالیٰ کے رسول تشریف لاتے رہے۔ پھر ان کی تبلیغ و دعوت کا ہدف جس طرح عام انسانی آبادی رہی ہے اسی طرح بڑے بڑے حکمران جو خدائی کے دعویدار تھے ان کی طرف بھی اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی بعثت ہوتی رہی۔ چنانچہ جس طرح اے قریش کے لوگو! تمہاری طرف ہمارے رسول آئے ہیں اسی طرح ہم نے فرعون کی ہدایت کیلئے بھی اپنے ایک عظیم رسول کو بھیجا تھا۔

رسول کی حیثیت و عظمت

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ کہی گئی ہے کہ تمہیں رسول کی حیثیت اور اس کی عظمت کا ادراک ہونا چاہیے۔ کسی رسول کا کسی قوم کی طرف مبعوث ہونا اس طرح نہیں کہ وہ کوئی واعظ یا مبلغ یا سائل بن کر کسی بستی میں اترا ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی بات سن لی جائے گی تو وہ شکر گزار ہوگا ورنہ وہ شب بسری کے بعد اگلی آبادی کا رخ کرے گا۔ پیغمبر جس قوم میں بھیجا جاتا ہے اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے گواہ کی ہوتی ہے۔ وہ حق کی گواہی دینے کیلئے آتا ہے، اسی کے ذریعے حق و باطل کا فیصلہ ہوتا ہے اور جب اس شاہد کی گواہی کو قبول نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی تکذیب کر دی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس تکذیب کے جرم میں اپنا عذاب نازل کر دیتا ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب فرعون نے کی اور ان کی ہر بات کا مذاق اڑایا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اسے انتہائی سخت پکڑا۔ اس کا سارا شاہی جاہ و جلال، اس کا کروفر، اس کی بیشمار فوجیں اور اس کے بیشمار وسائل، اس کے ربوبیت کے دعوے سب دھرے رہ گئے۔ بحرِ قلزم کی چند موجیں اٹھیں اور وہ معافیاں ہی مانگتا رہ گیا لیکن موجوں کے تھپیڑوں نے اس کا بند بند توڑ ڈالا اور وہ موت کی نذر ہو گیا۔ اور پھر قیامت کے دن موسیٰ علیہ السلام کی گواہی پر اسے جہنم رسید کیا جائے گا۔ اور عالمِ برزخ میں اللہ تعالیٰ کی سخت پکڑ کا عالم یہ ہے کہ ہر روز اس پر جہنم کا عذاب پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تمہاری طرف ہم نے سید الرسل کو بھیجا ہے۔ تم نے اگر قومِ فرعون کی طرح اپنی سرکشی کو جاری رکھا اور رسول کی حقیقی قدر و منزلت کو پہچاننے سے انکار کر دیا تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو قومِ فرعون کا ہوا۔

Marfat.com

شاہد کا مفہوم

رسول کے شاہد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے قول وعمل سے لوگوں کے سامنے حق کی شہادت دیتا ہے۔حق کی بالادستی اور اس کی حکمرانی کیلئے ایک ایک ادارے کو وجود دیتا اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مکمل طور پر حق کی حاکمیت کو قائم کر دیتا ہے اور آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا ہوگی تو اس وقت بھی وہ اپنی امتِ بعثت اور امتِ اجابت کے سامنے حق کی گواہی دے گا کہ میں نے ان تک اللہ تعالیٰ کا دین پہنچایا تھا اور انہوں نے میری دعوت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔اور پھر اس کی گواہی پر لوگوں کے ساتھ جزاء وسزا کا معاملہ ہوگا۔

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۞ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۞

(تو اگر تم نے ماننے سے انکار کیا تو اس دن کے عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ ۱۷)

آسمان اس سے پھٹا پڑ رہا ہے، اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہنا ہے۔ ۱۸)

قیامت کی ہولناکی سے تنبیہ

گزشتہ آیتوں میں فرعون کا حوالہ دے کر قریش کو متنبہ کیا ہے کہ جس طرح دنیا ہی میں فرعون اپنی سرکشی کی پاداش میں پکڑا گیا اور بدترین عذاب کا شکار ہوا،تمہیں بھی لرزاں اور ترساں رہنا چاہئے اس تصور سے کہ تمہارا انجام بھی فرعون جیسا نہ ہو۔اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ فرض کرو کہ تم پر دنیا میں کوئی عذاب نہیں بھیجا جاتا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم قیامت کے عذاب سے بھی بچ جاؤ گے۔ یہاں اگر گرفت نہیں ہوتی تو آخرت میں گرفت یقینی ہے اور آخرت کی گرفت اور آخرت کا عذاب اللہ تعالیٰ کی پناہ،اس کا تصور بھی دہلا دینے کیلئے کافی ہے۔اسی حوالے سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم نے انکار کا رویہ جاری رکھا اور فرعون کی طرح نافرمان بنے رہے تو قیامت کے ہول اور اس کی وحشت سے تم کیسے بچ سکو گے جبکہ اس کی شدت اور ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ اس کے خوف اور ہیبت کی وجہ سے بچے بھی بوڑھے ہو جائیں گے۔کسی ہول کی شدت اور کسی سزا کی بے پناہی جب ایسی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے کہ آدمی حواس کھو بیٹھتا ہے تو بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یک لخت سر کے بال سفید ہو جاتے ہیں یا جھڑ جاتے ہیں اور قویٰ مضمحل ہو کر جوانی میں بڑھاپے کی تصویر بن جاتے ہیں۔ایک بہت معتبر راوی نے مجھے افغان مجاہدین کے حوالے سے بتایا کہ وہاں ایک شخص کو جو جہادی خدمات میں پیش پیش تھا بالکل سفید بالوں کے ساتھ میں نے دیکھا عمر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان صاحب کی عمر صرف چھبیس ستائیس سال ہے۔تو ان کے دوستوں نے اس کے بالوں کی سفیدی کی وجہ یہ بتائی کہ اس جہاد میں اس کا پورا خاندان ایک ہی دفعہ گولہ پھٹنے سے شہید ہو گیا۔ان کی لاشوں کو دیکھ کر اس پر ایک ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ یک لخت بال سفید ہو گئے۔دیکھنے والا اسے بوڑھا آدمی سمجھتا تھا لیکن وہ اپنی عمر کے اعتبار سے بھرپور جوان تھا۔اور جہاں تک آخرت کی ہیبت کا تعلق ہے دنیا میں بڑے سے بڑا حادثہ بھی اس کی مثال کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

اگر اسے امرِ واقعی کی تعبیر کی بجائے محض ایک محاورے کا استعمال کہا جائے جب بھی اس سے مراد ہول کی شدت اور بے پناہی ہے۔ ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ فلاں صدمے نے مجھے بوڑھا کر دیا، یعنی وہ صدمہ بہت شدید تھا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے شَيَّبَتْنِي هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا ''مجھے سورۃ ہود اور اس کی ہم جنس سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔''

دوسری آیت میں فرمایا کہ قیامت کے دن کی ہولناکی کا عالم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اس دن آسمان پھٹ جائے گا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تم قیامت کو کوئی انہونی بات خیال نہ کرو، کوئی دیکھنے والی نگاہ ہو تو وہ دیکھ سکتی ہے کہ اب بھی آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پھٹ پڑے اور قیامت اس کے اندر سے نمودار ہو جائے اور تم اسی غفلت میں مارے جاؤ۔ کیونکہ قیامت کا آنا جس طرح یقینی ہے اسی طرح ناگہانی بھی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ''آسمان و زمین دونوں اس کے بوجھ سے بوجھل ہیں۔ وہ تمہارے اوپر اچانک ہی آ دھمکے گی۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿١٩﴾

(یہ ایک نصیحت ہے تو جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ ۱۹)

هٰذِهٖ سے اشارہ قرآنِ کریم کی ان آیات کی طرف ہے جو قریش کو آخرت کی یاددہانی کیلئے سنائی گئیں۔ مقصود تذکیر و تنبیہ کرنا تھا تاکہ ہر سننے والا غفلت سے نکل کر آخرت کی تیاری کی فکر کرے۔ اسی مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیج کر حجت تمام کر دی۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے جس کا جی چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کر کے اس کی رحمت و رضوان کا مستحق بن جائے اور جس کا جی چاہے اپنی گمراہی پر اڑا رہے اور اپنے انجام کو پہنچے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ کوئی شخص کون سا راستہ اختیار کرتا ہے اور کس انجام کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ البتہ لوگوں پر آخرت کا راستہ کھولنا اور اس کیلئے رہنمائی مہیا کرنا یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور اسی غرض کیلئے وہ اپنے رسول مبعوث کرتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ

اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ
مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ط عَلِمَ اَنْ لَّنْ
تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ط عَلِمَ
اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى لا وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ لا وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ

Marfat.com

اللّٰهِ ۚ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ
خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا
اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾

(اے پیغمبر! آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ شب میں دو تہائی رات کے قریب یا نصف یا تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہیں اور ایک گروہ آپ کے ساتھیوں میں سے بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ ٹھہراتا ہے، اس نے جانا کہ تم اس کو نبھا نہ سکو گے، تو اس نے تم پر عنایت کی نظر کی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو، اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جو اللہ کے فضل کی طلب میں سفر کریں گے، اور دوسرے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے اٹھیں گے، بس جتنا قرآن با آسانی پڑھا جاسکے، پڑھ لیا کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، اور اللہ کو قرض دیتے رہو اچھا قرض، جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس اس سے بہتر اور اجر میں برتر پاؤ گے، اور اللہ سے مغفرت مانگتے رہو بیشک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ ۲۰)

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾

(اے پیغمبر! آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ شب میں دو تہائی رات کے قریب یا نصف یا تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہیں اور ایک گروہ آپ کے ساتھیوں میں سے بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ ٹھہراتا ہے، اس نے جانا کہ تم اس کو نبھا نہ سکو گے، تو اس نے تم پر عنایت کی نظر کی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو، اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جو اللہ کے فضل کی طلب میں سفر کریں گے، اور دوسرے ایسے

Marfat.com

لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے اٹھیں گے، بس جتنا قرآن با آسانی پڑھا جاسکے، پڑھ لیا کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، اور اللہ کو قرض دیتے رہو اچھا قرض، جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس اس سے بہتر اور اجر میں برتر پاؤ گے، اور اللہ سے مغفرت مانگتے رہو بیشک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ ۲۰)

قِیَامُ الَّیْل یا تہجد کی وضاحت، حکم میں تخفیف

شروع سورۃ میں قُمِ الَّیْلَ سے رسول اللہ ﷺ پر قیام الیل کو فرض قرار دیا گیا تھا اور اس قیام کے طویل ہونے کو بھی لازم ٹھہرایا تھا۔ البتہ اس کے طول میں اختیار دیا گیا تھا کہ آدھی رات سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور کم سے کم ایک تہائی رات تک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا رہنا ضروری ہے۔ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم تو صرف نبی کریم ﷺ کیلئے تھا۔ کیونکہ آیت میں صراحتاً خطاب آپ کو ہے، لیکن مسلمانوں میں اس وقت حضور کے اتباع اور نیکیاں کمانے کا جو غیر معمولی جذبہ پایا جاتا تھا اور مزید یہ بات کہ بجز ان احکام کے جو آنحضرت ﷺ کیلئے خصوصی حیثیت رکھتے ہیں، مسلمانوں پر آپ کا اتباع لازم ٹھہرایا گیا تھا۔ اب بنا پر اکثر صحابہ کرامؓ بھی اس نماز کا اہتمام کرتے تھے۔ اور حکم کے مطابق اکثر عزیمت پر عمل فرماتے ہوئے زیادہ سے زیادہ رات کا وقت اس نماز میں گزارتے تھے۔ جس کی وجہ سے بعض دفعہ صحابہ کرامؓ کے پاؤں متورم ہو جاتے اور پھٹ جاتے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں قیام اللیل کے اس حکم میں جسے تہجد سے تعبیر کیا جاتا ہے، تخفیف کی گئی ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ سورۃ المزمل کا پہلا رکوع مضمون کے اعتبار سے صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکہ معظمہ میں نازل ہوا ہے۔ اور وہاں بھی اس کا نزول ابتدائی زمانے کی بات ہے جبکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت پر کم و بیش تین چار سال گزرے ہوں گے۔ اس زمانے میں چونکہ آنحضرت ﷺ کو وحیِ الٰہی کے تحمل اور بگڑے ہوئے انسانوں کو انذار جیسے کٹھن فریضے کو انجام دینے کیلئے تیار کیا جا رہا تھا اس لئے طویل قیام اللیل کی مشقت آپؐ پر ڈالی گئی تھی، تاکہ ایک طرف آپؐ کٹھن مشقت کو برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں اور دوسری طرف طویل عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے آپؐ کا رابطہ اور قرب بیش از بیش ہو جائے۔ اور جہاں تک دوسرے رکوع کا تعلق ہے اس کے مضامین شہادت دے رہے ہیں کہ وہ مدینہ منورہ کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے جب مسلمانوں پر زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم نازل ہو چکا تھا اور قتال فی سبیل اللہ کے معرکوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مکی زندگی سے جہاد و قتال کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے وہ حکم جو ایک خاص مقصد کے حصول کیلئے یعنی طویل قیام اللیل کا آنحضرت ﷺ کو مکی زندگی میں دیا گیا تھا تاکہ آپؐ قولِ ثقیل کا تحمل کر سکیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی کے مطابق وہ مقصد پورا ہو گیا تو مدنی زندگی میں پیشِ نظر آیتِ کریمہ طویل قیام اللیل میں تخفیف کے حکم کے ساتھ نازل ہوئی۔ اگرچہ اس بارے میں روایات میں اختلاف ہے کہ تخفیف کا حکم قیام اللیل کے حکم کے کتنا عرصہ بعد نازل ہوا۔ مسند احمد، مسلم اور ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ یہ دوسرا حکم پہلے حکم کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ اور دوسری روایت جسے ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم نے حضرت عائشہؓ ہی سے نقل کیا ہے اس میں دونوں حکموں کے درمیان آٹھ مہینے کا فاصلہ بتایا گیا ہے۔ اور ایک تیسری روایت میں سولہ مہینے بیان کئے گئے ہیں۔ اگر ان روایات کو سامنے رکھا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسرا رکوع مدینہ منورہ میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں نازل ہوا ہے۔ جبکہ اس رکوع کے مضامین اس کی

Marfat.com

شہادت نہیں دیتے۔اس مشکل کا ایک حل حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق یہ ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں جس تخفیف کا ذکر ہے اس کا تعلق نمازِ تہجد کی فرضیت میں تخفیف سے نہیں بلکہ طولِ قیام سے ہے۔نمازِ تہجد اس حکم کے بعد بھی فرض رہی۔البتہ اس کی فرضیت اس وقت ختم ہوئی جب پانچ نمازیں فرض کر دی گئیں۔اور دوسری تاویل یہ ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ کی بات کو قبول کر لیا جائے۔ابنِ جریر اور ابنِ حاتم کی روایت کے مطابق حضرت سعید بن جبیرؒ کا بیان یہ ہے کہ اس دوسرے رکوع کا نزول پہلے رکوع کے دس سال بعد ہوا ہے۔اس سے ان دونوں مدتوں میں تطبیق ہو جاتی ہے کہ پہلا رکوع اگر چار سن نبوی کو نازل ہوا ہو تو دوسرا رکوع ہجرت کے بعد پہلے سال کے آخر میں نازل ہوا ہوگا۔حاصل کلام یہ ہے کہ قیام اللیل کے حکم میں تخفیف کرتے ہوئے دو رعایتیں دی گئی ہیں۔ایک تو یہ کہ اب طویل قیام کی بجائے جتنا آپؐ آسانی سے قرآنِ کریم پڑھ سکیں،بس وہ کافی ہے۔دوسری رعایت یہ دی گئی ہے کہ اب قیام اللیل فرض نہیں سنت یا مستحب ہے۔قرآنِ کریم کا ذکر دو وجہ سے کیا گیا ہے۔ایک تو اس لئے کہ نماز کی طوالت کا تعلق رکوع،سجود اور قعود سے نہیں،قرآنِ پاک کی تلاوت سے ہے۔قرآنِ پاک جتنا زیادہ پڑھا جائے گا،اتنی نماز لمبی ہوگی۔جب قرآنِ کریم کی قرأت میں آسانی کو معیار بنا دیا گیا تو ہر شخص کی اپنی ہمت کے مطابق نماز مختصر ہوگئی۔اور دوسرا اس وجہ سے قرآنِ کریم کی تلاوت کا ذکر کیا گیا ہے کہ نماز میں جس طرح رکوع،سجود فرض ہے اسی طرح قرآنِ کریم کی قرأت بھی فرض ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دوسرے مقامات پر رکوع یا سجود کے الفاظ استعمال کر کے نماز مراد لی ہے،اسی طرح یہاں قرآن کی قرأت سے نماز میں قرآن پڑھنا مراد ہے۔اور اسی لئے اس کو رکوع سجود کی طرح فرض ٹھہرایا گیا ہے۔

تخفیف کی علت اور احصاء کی وضاحت

تخفیف کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ ''اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ تم اس کا احصاء نہ کر سکو گے''۔بعض مفسرینِ کرام نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ قیام اللیل میں اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مقدارِ وقت کی پوری تعیین نہیں فرمائی بلکہ ایک تہائی رات سے دو تہائی رات کے درمیان کا وقت مقرر فرمایا۔مگر صحابہ کرام جب اس نماز میں مشغول ہوتے تو اشتغالِ نماز کے ساتھ یہ معلوم ہونا دشوار تھا کہ رات آدھی ہوئی یا کم وبیش،کیونکہ اوقات معلوم کرنے کے ایسے آلات اس زمانے میں موجود نہ تھے اور ہوتے بھی تب بھی شغلِ نماز کے ساتھ بار بار گھڑیوں کو دیکھتے رہنا ان حضرات کے حالات اور ان کے خشوع وخضوع کے ساتھ آسان نہ تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی اس کمزوری کا لحاظ فرمایا۔

بعض حضراتِ مفسرین نے یہاں احصاء سے مراد عملِ احصاء یعنی اس طویل وقت اور نیند کے وقت کی نماز پر مداومت نہ کر سکنا مراد لیا ہے۔لفظِ احصاء اس معنی کیلئے بھی مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ناموں کے بارے میں آیا ہے من احصاها دخل الجنة اس میں لفظِ احصاء کا مفہوم بہت سے علماء نے عملِ احصاء لیا ہے۔یعنی اسمائے الٰہیہ کے مقتضیٰ پر پورا عمل کرنا۔اس صورت میں آیت کے اس حصے کا مفہوم یہ ہوگا کہ رات اور دن کو مقدر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔وہی اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں اور زندگی کے کن کن پہلوؤں سے یہ اثر انداز ہوتے ہیں۔انسان ان میں سے کس حد تک محتاج ہے اور اس کو کن حالات ومشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔اپنے اس علم کی روشنی میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نصف شب یا ثلث یا دو ثلث شب کے قیام کی پابندی کا اہتمام نہ کر سکو گے،تو جتنا بھی ممکن ہو سکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو۔

Marfat.com

عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی ۔ آیت کے اس حصے میں ان امکانات کی طرف اشارہ ہے جو پیش آ سکتے ہیں اور جو اس تخفیف کے متقاضی ہوئے ہیں۔ مثلاً تم میں مریض ہوں گے۔ کبھی کچھ لوگ دینی اور دنیوی ضروریات کیلئے عازمِ سفر بھی ہوں گے اور کبھی کچھ تم میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیلئے نکلیں گے۔ ایسی مصروفیت میں لمبی نماز کیلئے نہ گنجائش ہو سکتی ہے اور نہ اس کا تحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن قیام اللیل ایک ایسی سعادت ہے، جسے چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ اس لئے جتنا وقت بھی میسر آئے اور جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔

یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ "اور کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کریں گے۔" اس سے مراد ہر وہ سفر ہے جو کسی نیک اور اعلیٰ مقصد کیلئے کیا جائے، عام اس سے وہ طلبِ علم کیلئے ہو یا حج کیلئے یا تجارت کیلئے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تجارتی سفر یا حصولِ رزق کیلئے یہ الفاظ قرآنِ کریم میں جابجا آئے ہیں۔ اور یہاں تو ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہاں اس کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ آیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں جائز طریقوں سے روزی کمانے کی کتنی بڑی فضیلت ہے۔ حدیث میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مامن جالبٍ یجلبُ طعامًا الٰی بلدٍ من بلد ان المسلمین فیبیعه لِسعْرِیومِہٖ الا کانت منزلتهٗ عنداللّٰه ثم قرأ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم واخرون یضربون فی الارض "جو شخص مسلمانوں کے کسی شہر میں غلہ لے کر آیا اور اس روز کے بھاؤ پر اسے بیچ دیا اس کو اللہ کا قرب نصیب ہوگا، پھر رسول اللہ ﷺ نے یہی آیت پڑھی۔" (ابن مردویہ) حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ فرمایا مامن حال یاتینی علیه الموت بعدالجهاد فی سبیل اللّٰه احبّ الی من ان یاتینی وانا بین شِعبتی جبل التمس من فضل اللّٰه وقرأ هٰذه الاٰیة "جہاد فی سبیل اللہ کے بعد اگر کسی حالت میں جان دینا مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو وہ یہ حالت ہے کہ میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہوئے کسی پہاڑی درے سے گزر رہا ہوں اور وہاں مجھ کو موت آ جائے، پھر انہوں نے یہی آیت پڑھی۔" (بیہقی فی شعب الایمان)۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ قیام اللیل میں تخفیف کے بعد اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم شاید اس لئے دیا جا رہا ہے کہ قیامِ اللیل میں تخفیف یا کبھی سفر کی مصروفیات میں موقع نہ ملنے کی صورت میں جو روحانی نقصان ہو سکتا ہے اس کسر کا جبر اس طرح ممکن ہے کہ امکان کی حد تک پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور ہر ممکن طریقے سے اپنے رب کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو اس عنوان سے تعبیر کیا ہے کہ گویا یہ خرچ کرنے والا اللہ کو قرض دے رہا ہے اس میں اس کے حال پر لطف و کرم کی طرف اشارہ بھی ہے اور اس کا بیان بھی کہ اللہ تعالیٰ غنی الاغنیاء ہے۔ اس کو دیا ہوا قرض کبھی مارا نہیں جا سکتا ضرور وصول ہوگا اور چونکہ زکوٰۃ فرض کا حکم اس سے پہلے آ چکا ہے اس لئے اَقْرِضُوا اللّٰہَ میں جس خیرات اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ذکر ہے اس کو اکثر حضرات نے صدقات نافلہ اور تبرعات پر محمول کیا ہے جیسے اپنے اقارب و اعزاء کو کچھ دینا یا مہمان کی مہمانی پر خرچ کرنا یا علماء و صلحا کی خدمت کرنا وغیرہ اور بعض حضرات نے اس کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے مالی واجبات انسان پر عائد ہوتے ہیں جیسے ماں باپ، بیوی، اولاد کا نفقہ واجبہ یا دوسرے واجبات شرعیہ تو اٰتُوا الزَّکٰوۃَ میں ادائے زکوٰۃ کا حکم دینے کے بعد دوسرے واجبات کا ذکر اقرضوا اللہ سے کر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ الآیۃ، مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ جو نیک کام اپنی زندگی میں کر گزرو وہ بہتر ہے اس سے کہ مرنے کے وقت وصیت کرو۔ اس میں مالی عبادت، صدقہ وخیرات بھی داخل ہے اور نماز روزہ وغیرہ بھی جو کسی کے ذمہ قضا ہوا پنے ہاتھ سے اپنے سامنے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اس سے سبکدوشی بہتر ہے بعد میں تو وارثوں کے اختیار میں بات رہتی ہے وہ کریں یا نہ کریں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے سوال کیا کہ تم میں ایسا کون ہے جو اپنے وارث کے مال سے بہ نسبت اپنے مال کے زیادہ محبت رکھتا ہو، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنے وارث کے مال کی محبت خود اپنے مال سے زیادہ رکھے۔ آپ نے فرمایا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمیں تو اس کے سوا کوئی دوسری صورت معلوم نہیں، آپ نے فرمایا (جب یہ بات ہے تو سمجھ لو کہ) تمہارا مال وہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور جو رہ گیا وہ تمہارا مال نہیں بلکہ تمہارے وارث کا مال ہے
(ذکرہ ابن کثیر باسناد ابی یعلی الموصلی ثم قال و رواہ البخاری من حدیث حفص بن غیاث ......الخ)

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ

(۷۴)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْمُدَّثِّرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْمُدَّثِّر ہے۔ یہ سورۃ کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی صرف نام ہے، مضامین کا عنوان نہیں۔

زمانۂ نزول:۔ نزول کے اعتبار سے اس سورۃ کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ سات آیات پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ باقی آیاتِ سورۃ پر۔ سورۃ کا پہلا حصہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے۔ بعض روایات جو حضرت جابر بن عبداللہ سے بخاری، مسلم، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں منقول ہیں ان میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ نزول کے اعتبار سے یہ قرآنِ کریم کی اولین آیات ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات غلط فہمی پر مبنی ہے غالباً کہا یہ گیا ہوگا کہ فترۃ الوحی کے بعد نازل ہونے والی یہ اولین آیات ہیں ورنہ اس بات پر قریب قریب امت میں اتفاق ہے کہ پہلی وحی جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی وہ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات تھیں۔ اس وحی کے بعد آنحضرت ﷺ پر ایک مدت تک وحی کا نزول رکا رہا۔ یہی زمانہ ہے جسے فترۃ الوحی کا زمانہ کہتے ہیں۔ اس وقفہ کے گزرنے کے بعد جب از سرِ نو وحی کا نزول شروع ہوا تو اس کا آغاز سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات سے ہوا۔ امام زہری جو حدیث کے امام ہیں، وہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ایک مدت تک رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول بند رہا۔ اس زمانہ میں آپؐ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی ہے کہ بعض اوقات آپؐ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کیلئے آمادہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کبھی آپؐ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے، حضرت جبرائیل علیہ السلام نمودار ہو کر آپؐ سے کہتے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، اس سے آپؐ کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا اور وہ اضطراب کی کیفیت دور ہو جاتی تھی۔" (ابنِ جریر)

اس کے بعد امام زہری خود حضرت جابر بن عبداللہ ہی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے فترۃ الوحی کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا کہ یکا یک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کہا، مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف اڑھا دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا۔" (بخاری، مسلم، مسند احمد، ابنِ جریر)

جہاں تک سورۃ کے دوسرے حصے کا جو آٹھویں آیت سے لے کر آخر تک چلتا ہے کے زمانہ نزول کا تعلق ہے۔ سورۃ کے مضامین اور سیرت ابن ہشام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا نزول تقریباً پہلی آیات سے ایک سال بعد ہوا ہے۔

Marfat.com

سیرت ابن ہشام کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سورۃ المدثر میں انذار کا حکم نازل ہو جانے کے بعد جب اہلِ مکہ میں تبلیغ ودعوت کا کام شروع کیا اور قرآنِ مجید کی دلآویز اور پرشکوہ آیات لوگوں کو سنانا شروع کیں تو مکہ میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کا نفوذ بڑھ رہا اور کلامِ خداوندی کے اثرات روز بروز پھیلتے جارہے ہیں۔ جو سنتا ہے دل تھام کے رہ جاتا ہے۔ اگرچہ آبائی دین کے تعصبات اور بت پرستی کی زنجیر ان کا راستہ روکنے کیلئے کافی تھی اور وہ بری طرح اس میں جکڑے ہوئے تھے، لیکن قرآنِ کریم کا اعجاز اور آنحضرت ﷺ کی دلسوزی اپنا رنگ دکھانے لگی تھی۔ غریب طبقہ جو بگڑے ہوئے معاشرے کے ظلم کا ستایا ہوا ہوتا ہے وہ آگے بڑھ کر اسلام کی دعوت کو قبول کرنے لگا تو اشرافِ قریش کو فکر دامن گیر ہوئی۔ اور بڑی بڑی بارگاہوں میں زلزلہ سا محسوس کیا جانے لگا۔ اور ان کی سطوتوں اور مصنوعی عظمتوں کے محل لرزتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ایسی صورتحال میں طبقۂ امراء اور متکبرین کا گروہ کس طرح خاموش رہ سکتا تھا، وہ مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تبلیغ ودعوت کے اثرات کو روکنے کیلئے منصوبے باندھنے لگے۔ چند مہینے اس حال پر گزرے تھے کہ حج کا موسم آ گیا تو مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد (ﷺ) نے ان قافلوں میں جا کر اپنی دعوت پیش کرنا اور قرآنِ کریم سنانا شروع کر دیا تو یہ ناممکن ہے کہ ایسا بےنظیر اور مؤثر کلام اپنے اثرات نہ دکھائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ عرب کے گوشے گوشے میں ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر قبیلے میں مخلص صاحبِ ایمان لوگوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد وجود میں آ جائے۔ چنانچہ ان اندیشہ ہائے دور دراز کو محسوس کرتے ہوئے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس بلائی تاکہ اس خطرے کو روکنے کیلئے کوئی لائحہ عمل طے کیا جائے۔ اس پر تو سب نے اتفاق کیا کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت واقعی ہمارے لئے قومی خطرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں لوگوں کے پاس جا کر اس خطرے کا ازالہ کرنا چاہیے۔ لیکن ولید بن مغیرہ نے یہ کہہ کر سب کے سامنے ایک سوال رکھ دیا کہ آپ لوگ جب قبائل کے پاس جائیں گے تو آنحضرت ﷺ کے حوالے سے کیا کہیں گے؟ اگر آپ نے مختلف باتیں کہیں تو آپ سب کا اعتبار جاتا رہے گا جس سے محمد (ﷺ) کی دعوت کو تقویت ملے گی۔ بہتر ہے کہ ایک بات طے کر لی جائے، اور جو بھی قبائل کے پاس جائے اسی بات کا اعادہ کرے۔ اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم یہ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) کاہن ہیں۔ ولید نے کہا نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو ان سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں۔ کچھ اور لوگوں نے کہا، کہ بہتر ہے انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا کہ وہ مجنون بھی نہیں ہیں۔ ان میں دیوانگی اور پاگل پن کی کوئی بات نہیں۔ فاترالعقل آدمی جس طرح کی بہکی بہکی باتیں کہتا اور الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے، وہ سب جانتے ہیں۔ محمد (ﷺ) میں ایسی کوئی بات نہیں۔ کچھ لوگ بولے کہ چلیئے ہم انہیں شاعر کہیں گے، تاکہ قرآنِ کریم کی تاثیر کا علاج ہو سکے۔ ولید نے کہا وہ شاعر بھی نہیں، ہم شعر کی تمام اصناف سے واقف ہیں۔ وہ جو کلام پیش کرتے ہیں اس پر شاعری کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ لوگوں نے کہا کہ ان کی قوتِ تسخیر وتاثیر کے پیشِ نظر انہیں ساحر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ولید نے کہا وہ ساحر بھی نہیں۔ جادوگروں کو ہم جانتے ہیں وہ جیسے طریقے اختیار کرتے ہیں اس سے بھی سب واقف ہیں۔ اور جس قماش کے وہ لوگ ہوتے ہیں وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس لئے یہ بات بھی محمد (ﷺ) پر چسپاں نہیں ہوتی۔ ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کہو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے۔ اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں عکرمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمد (ﷺ) کے بارے میں کوئی جامع بات نہ کہو۔ ولید نے کہا مجھے سوچ لینے دو۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد بولا کہ قریب ترین جو

Marfat.com

بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ محمد (ﷺ) جادوگر ہیں۔ وہ ایسا کلام پیش کررہے ہیں جو آدمی کو اس کے باپ، ماں، بھائی، بیوی، بچوں اور سارے خاندان سے جدا کردیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کرلیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اس سے بچنے کی کوشش کرنا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کردیا۔ (سیرت ابن ہشام جلد اول، ص ۲۸۸)

اس واقعہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس سورۃ کی ابتدائی سات آیات فترۃ الوحی کے فوراً بعد نازل ہوئیں اور سورۃ کا دوسرا حصہ اس وقت نازل ہوا جب فترۃ الوحی کے بعد حج کا زمانہ آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حصوں میں کوئی سال بھر کا فرق ہوگا۔

موضوع اور مضمون

پہلی وحی نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا۔ یہ ایک ابتدائی تعارف تھا اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپؐ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں اور آگے آپؐ کو کیا کچھ کرنا ہے۔ لیکن سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیتوں میں پہلی مرتبہ آپؐ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپؐ اٹھیں اور خلقِ خدا کو اس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے۔ اپنے رب کی عظمت و کبریائی کا اعلان کریں۔ آپؐ کو چونکہ ہر لحاظ سے دنیا کیلئے نمونہ بننا ہے اس لئے آپؐ کی زندگی ہر لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہونی چاہئے، آپؐ اپنے دامنِ دل کو ہر قسم کے غبار سے پاک رکھیں، شرک کی ہر چھوت سے دور رہیں، تمام دنیوی فائدوں سے قطع نظر کرکے کامل اخلاص کے ساتھ خلقِ خدا کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں، اپنی جدوجہد برابر جاری رکھیں اور اپنے رب کی خاطر تمام مخالفتوں کے باوجود حق پر ڈٹے رہیں، اللہ تعالیٰ آپؐ کی مساعی کو برومند کرے گا۔

آیت آٹھ سے دس تک منکرینِ قیامت اور مخالفین کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ہزار قیامت کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کریں قیامت بہرحال آکر رہے گی۔ قیامت کا دن ان کیلئے بہت شدید اور ہولناک دن ہوگا۔ آج کے کیے کی سزا بہت برے طریقے سے انہیں وہاں بھگتنا پڑے گی۔

آیت گیارہ سے چھبیس تک ولید بن مغیرہ کا نام لئے بغیر اس کے اعمال وافعال اور حق دشمنی کے سلسلے میں اس کے رویے پر تنقید کی گئی ہے۔ لیکن یہ تنقید اس کی ذات تک محدود نہیں بلکہ اس کا مورد ہر وہ شخص ہے جو اپنے مال وجاہ کے غرور میں مست اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہے کہ جو کچھ اسے دنیا میں حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس میں بھی اسے حاصل رہے گا بلکہ اسے اس سے بھی زیادہ نوازا جائے گا۔ پھر ولید بن مغیرہ کی ذہنی کشمکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے اور یہ تصویر بھی ہر اس شخص کی ہے جو اپنی قیادت وسیادت کی حفاظت کیلئے صداقت کا راستہ روکنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ولید بھی اپنے دل میں آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی صداقت کا قائل ہوچکا تھا، لیکن اپنی قوم میں جو اسے مقام ومرتبہ حاصل تھا اور ریاست ووجاہت کے جس منصب پر فائز تھا وہ اسے خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کا راستہ روکنے کیلئے کوئی کارگر تدبیر بتاؤ تو وہ عجیب مخمصے میں مبتلا ہوگیا۔ ایک طرف اس کی اپنی ذات اور اپنے مفادات اور دوسری طرف اس کے ضمیر کی خلش۔ دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد نہایت فلسفیانہ انداز میں اپنے تدبر کا رعب جماتے ہوئے یہ کہا کہ خلقِ خدا

Marfat.com

کو اس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کیلئے آنحضرت ﷺ کو جادوگر قرار دینا چاہئے۔ اس کی اس صریح بدباطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اپنے اس کرتوت کے بعد بھی یہ شخص چاہتا ہے کہ اسے مزید انعامات سے نوازا جائے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تو وہ اپنی ماں کے پیٹ سے تنہا اس دنیا میں آیا۔ مال وجاہ میں سے کوئی چیز بھی اس کے ساتھ نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے اسبابِ معیشت اور امکانات کی دنیا کھول دی۔ پھر اسے مال واولاد سے نوازا اور گوناگوں کامیابیوں کے راستے کھولے، لیکن وہ اپنے رب کا شکر گزار ہونے کی بجائے اس رعونت میں مبتلا ہو گیا کہ جو کچھ اسے حاصل ہے وہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ اور آخرت میں بھی یہ سب کچھ اسے ملے گا۔ اسے اور اس جیسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص بھی یہ راستہ اختیار کرے گا اسے اس کی پاداش میں ایک بڑی ہی سخت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

اس کے بعد آیت ستائیس سے اڑتالیس تک دوزخ کی ہولناکیوں کا ذکر کیا گیا۔ اسی طرح ان کے بعض متکبرین جنہیں ہمہ دانی کا دعویٰ تھا دوزخ کا احوال بیان کرتے ہوئے بعض ایسی باتیں ذکر کی گئی ہیں جو ان کے احاطۂ علم سے ماورا ہیں۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ان باتوں کو مذاق بنالیں گے، لیکن انہیں کیا معلوم کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ خاص حکمت سے بیان فرمارہا ہے جن کے اندر صلاحیت اور علم کی طلب ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن جو جہل کے باوجود غرورِ ہمہ دانی میں مبتلا ہیں وہ ان باتوں کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہوں گے اور اپنی عاقبت برباد کرلیں گے۔

اس کے بعد قیامت کی ایک آفاقی دلیل بیان کی گئی ہے اور قیامت کی تکذیب کرنے والوں کی جہالت پر اظہارِ تعجب کیا گیا ہے۔ اور انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنے اعمال کا رہین ہوگا۔ اس کا عمل ہی اسے چھڑائے گا، عمل ہی جہنم میں لے جائے گا۔ کوئی سعی وسفارش کسی کے کام نہ آسکے گی۔ اس روز صرف اصحاب الیمین سرخرو ہوں گے۔ انہیں جنت میں عزت کا مقام حاصل ہوگا۔ ان کی شان یہ ہوگی کہ وہ جنت ہی میں بیٹھے بیٹھے دوزخ والوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں دوزخ میں کیوں ڈالا گیا ہے تو وہ جواب میں برملا اپنے جرائم کا اعتراف کریں گے جو ان کے جہنم میں جانے کا سبب ہوئے۔

آیت انچاس سے باون تک کفار کے اصل مرض کی خبر دی گئی ہے، جس کی وجہ سے وہ قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی دعوت سے بدکتے ہیں۔ ان کا اصل مرض یہ ہے کہ وہ آخرت سے بے خوف اور اسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ قرآنِ کریم چونکہ دنیا کی زندگی کو آخرت کی تیاری کا وقت قرار دیتا ہے جس کے نتیجے میں دنیا کی زندگی ذمہ داریوں سے گراں بار ہو جاتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں مزے اڑانے والا شخص ذمہ داری کے نام سے بھاگتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ قرآنِ کریم سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے شیر سے ڈر کر جنگلی گدھے بھاگتے ہیں۔

آخر میں صاف صاف آنحضرت ﷺ سے فرمادیا گیا ہے کہ آپؐ ان لوگوں کی پرواہ نہ کریں، آپؐ کا کام صرف یاددہانی ہے جو قرآنِ کریم کی شکل میں آپؐ ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ جو لوگ یاددہانی سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے وہ اپنا حشر خود دیکھیں گے۔ اور جو اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے کمربستہ ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی یہ شان ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ اور خداترسی کا رویہ اختیار کرے اسے وہ معاف کر دیتا ہے، خواہ وہ پہلے کتنی ہی نافرمانیاں کر چکا ہو اور جو شخص اس کے راستے کی طرف آنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ بیزاری کی روش اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۵۶	سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ (۷۴)	رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۪ۙ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۪ۙ﴿۳﴾ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۪ۙ﴿۴﴾
وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۪ۙ﴿۵﴾ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۪ۙ﴿۶﴾ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ؕ﴿۷﴾
فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۙ﴿۸﴾ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۙ﴿۹﴾ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿۱۰﴾ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ
لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ﴿۱۲﴾ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۙ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۙ﴿۱۴﴾
ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۙ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ؕ﴿۱۶﴾ سَاُرْهِقُهٗ
صَعُوْدًا ؕ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۙ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ
كَيْفَ قَدَّرَ ۙ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ۙ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۙ﴿۲۳﴾
فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۙ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ؕ﴿۲۵﴾ سَاُصْلِيْهِ
سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ؕ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۚ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۚۖ﴿۲۹﴾
عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ؕ﴿۳۰﴾ وَمَا جَعَلْنَاۤ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ
وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ

Marfat.com

اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ
مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ
وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾

رکوع: ا۔ (اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے۔ ۱) اٹھئے اور لوگوں کو ڈرایئے۔ ۲) اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کیجئے۔ ۳) اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ ۴) اور گندگی سے دور رہو۔ ۵) اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کیلئے۔ ۶) اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔ ۷) پس جب صور پھونکا جائے گا۔ ۸) تو وہ بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ ۹) کافروں پر آسان نہ ہوگا۔ ۱۰) چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔ ۱۱) اور اس کو بخشا میں نے مال فراواں۔ ۱۲) اور بیٹے دیئے حاضر رہنے والے۔ ۱۳) اور تیاری کر دی اس کیلئے خوب تیاری۔ ۱۴) پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ۱۵) ہرگز نہیں، وہ ہماری آیات سے عناد رکھنے والا ہے۔ ۱۶) میں اس کو عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔ ۱۷) اس نے سوچا اور ایک بات بنائی۔ ۱۸) تو خدا کی مار ہو اس پر اس نے کیسی بات بنائی۔ ۱۹) پھر خدا کی مار ہو اس پر اس نے کیسی بات بنائی۔ ۲۰) پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ ۲۱) پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا۔ ۲۲) پھر پیٹھ پھیری اور تکبر میں پڑ گیا۔ ۲۳) پھر بولا یہ تو محض ایک جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ ۲۴) یہ تو محض انسانی کلام ہے۔ ۲۵) میں عنقریب اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ ۲۶) اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ۔ ۲۷) نہ ترس کھائے اور نہ چھوڑے۔ ۲۸) کھال جھلس دینے والی۔ ۲۹) اس پر انیس فرشتے مقرر ہوں گے۔ ۳۰) ہم نے دوزخ پر نگران فرشتوں کو ہی بنایا ہے اور ہم نے ان کی یہ تعداد نہیں بیان کی، مگر اس لئے کہ یہ آزمائش بنیں ان لوگوں کیلئے جنہوں نے کفر کیا، تاکہ اہلِ کتاب کو یقین آ جائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے اور اہلِ کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں اور تاکہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ اور کفر کرنے والے کہیں کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے۔ اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راہ یاب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کیلئے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو۔ ۳۱)

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢

(اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے۔ ۱) اٹھئے اور لوگوں کو ڈرایئے۔ ۲)

مُدَّثِّر اور مُزَّمِّل کا مفہوم اور مراد

مُدَّثِّرُ ، دِثَارٌ سے ہے۔ اس چادر کو کہتے ہیں جو سونے والا اپنے اوپر لے لیا کرتا ہے۔ ہم سورۃ کے تعارف میں حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ذکر کر چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اچانک حضرت جبرائیل علیہ السلام کو آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے دیکھا تو آپؐ ہیبت زدہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا کہ مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ۔ چنانچہ آپؐ کو لحاف یا چادر اڑھا دی گئی اور آپؐ اسے اوڑھ لپیٹ کر لیٹ گئے۔ چنانچہ اسی حالت میں آپؐ پر وحی کا نزول ہوا اور آپؐ کی اس کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ یا، يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ کہنے کی بجائے يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ کے دلنواز خطاب سے پکارا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اے میرے پیارے بندے تم اوڑھ لپیٹ کر لیٹ کہاں گئے ہو۔ تم پر تو ایک کارِ عظیم کا بار ڈالا گیا ہے جسے انجام دینے کیلئے تمہیں کمرِ ہمت باندھ کر اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

ہم نے سورۃ المزمل کے آغاز میں مزمل کا مفہوم بیان کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ چادر لپیٹے رکھنا اور چادر لپیٹ کر لیٹنا یہ آدمی کی فکرمندی کی علامت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ابتدائے بعثت میں جو مشاہدات اور تجربات ہوئے وہ بجائے خود گراں بار کرنے والے تھے اور پھر مزید یہ ہوا کہ غارِ حرا میں آنے والی وحی کا سلسلہ ایک عرصے تک رکا رہا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی شخصیت اور کلامِ خداوندی کی ہیبت و سطوت کے ساتھ ساتھ بے پناہ کشش اور دلآویزی نے آپؐ کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی جیسے کسی عاشقِ صادق کے اندر اچانک محبوب کے غائب ہو جانے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ جب آپؐ نے اپنے مشاہدات اور اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کا تذکرہ اپنے قریبی عزیزوں کے سامنے کیا تو ان کے شدید ردِ عمل اور ان کے مذاق و استہزاء کے انداز نے آپؐ کے اندر نہایت فکرمندی کا احساس پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان تمام اسباب نے مل کر آپؐ کے اندر وہ کیفیت پیدا کی جس نے آپؐ کو چادر لپیٹ کر سونے یا لیٹنے پر مائل کر دیا۔ اچانک آپؐ کی کیفیت کے مطابق نازل ہونے والی وحی میں جب مدثر کے لفظ سے آپؐ کو خطاب کیا گیا تو اس لفظ کی معنویت میں مزید گہرائی پیدا ہو گئی کیونکہ اس سے خودبخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ آپؐ جس ذاتِ کبریا کی طرف سے ایک کارِ عظیم انجام دینے کیلئے اٹھائے جا رہے ہیں، آپؐ ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہیں، وہ آپؐ کی ہر حالت کو جانتا ہے اور آپؐ کے دل کی کیفیات سے آگاہ ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کمزوروں اور بے نواؤں کو سب سے زیادہ سہارا ملتا ہے۔ اور دوسری بات جو مدثر کے خطاب سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت دلنواز خطاب ہے جس میں محبت چھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار نے آپؐ پر اتنی بڑی ذمہ داری عائد کی ہے وہ صرف آپؐ کے حال سے آگاہ ہی نہیں بلکہ آپؐ پر حد درجہ مہربان بھی ہے۔ وہی قدم قدم پر آپؐ کی دستگیری کرے گا اور ہر مشکل وقت میں آپؐ کو سہارا دے گا۔

Marfat.com

انذار کا حکم

دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپؐ کمرِ ہمت باندھ کر اٹھیں اور پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی قوم کو انذار کریں۔ اور یہ وہ چیز ہے کہ ہر پیغمبر کو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جس کا حکم دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے رسول ہیں انہیں بھی نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے حکم دیا گیا اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ''اپنی قوم کو ڈراؤ، اس سے پہلے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آ جائے۔'' پیغمبر دنیا میں اس وقت مبعوث ہوتے ہیں جب لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول کر خوابِ غفلت کے مزے لوٹنے لگتے ہیں۔ ان کے اندر یہ احساس بالکل مر جاتا ہے کہ زندگی کا کسی کو حساب بھی دینا ہے اور وہ خواہشِ نفس کی پیروی میں ہر وہ کام کر گزرتے ہیں جس کا حکم ان کا نفس دیتا ہے۔ پیغمبر آ کر لوگوں کو اس روش کے انجام سے ڈراتے اور انذار کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو بھی اسی منصب پر فائز کیا گیا کہ آپؐ لوگوں کو خبردار کر دیں کہ وہ کسی اندھیر نگری کے رہنے والے نہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی باز پرس نہ ہو اور نہ یہ دنیا کھیل تماشا ہے کہ لوگ اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلتے بنیں۔ اور نہ انسان جیسی مخلوق خودرو پودوں کی حیثیت رکھتی ہے کہ مل دَل کر ختم ہو جائے۔ اسے مکلّف، صاحبِ عقل و خرد مخلوق بنایا گیا ہے۔ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ اس کیلئے وضع کیا گیا ہے۔ اسے چند بنیادی عقائد دیئے گئے ہیں جن سے دنیا اور آخرت کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ چنانچہ ان ہی حقیقتوں کو واضح کرنے اور غفلت کی زندگی گزارنے والوں کو انذار کرنے کیلئے حضور نبی کریم ﷺ کو بھیجا گیا۔

وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ ﴿۳﴾

(اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کیجئے۔ ۳)

انذار کا پہلا حکم سب سے بڑے بگاڑ کی اصلاح ہے

دنیا میں بگاڑ کے اسباب بہت سے ہیں لیکن جس سبب نے انسانوں کے بگاڑ میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ یا اس کی شراکت میں دوسری بہت سی قوتوں کی بڑائی کو تسلیم کرنا ہے۔ انسان کبھی کسی کو غیر مشروط اطاعت کا حق دے دیتا ہے تو اس کیلئے اس کی بے پایاں عظمت کو تسلیم کرنے لگتا ہے۔ وہ عظمت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی ہر بات اور ہر اشارے کو حکم کا درجہ دے، چاہے وہ عظمت اقتدار کی بے پناہی سے پھوٹی ہو یا دولت کے انباروں سے، یا مشیخیت و تقدس کے دعویداروں کی نام نہاد کرامتوں اور شعبدہ بازیوں سے، یا جنگ کے نتیجے میں یا ظلماً ہاتھ آ جانے والوں کی غلامی سے۔ چنانچہ ایسی تمام قوتوں کو اسلام طاغوت قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ ہر طاغوت کی اطاعت اور بندگی سے بغاوت و براءت کا اعلان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

Marfat.com

حضرت ربعی بن عامرؓ جب رستم کے دربار میں مسلمانوں کے سفیر بن کے گئے تو رستم نے پوچھا آپ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو، تو آپؓ نے ایسی ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دیں۔ تم نے اقتدار کی قوت سے اپنے آپ کو خدا بنا رکھا ہے اور اپنے جیسے انسانوں کو غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے پر مجبور کر رکھا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم تمہیں اس غلط مذہب سے نجات دے دیں جس نے انسانوں کو تقدس اور مشیخیت کی آڑ میں انسانوں کے سامنے جھکنے پر مجبور کر رکھا ہے اور کچھ لوگوں نے محض شعبدہ بازیوں سے دوسروں کے دلوں میں یہ بات ڈال رکھی ہے کہ انہیں کوئی غیر معمولی قوتیں حاصل ہیں۔ اور تیسرا مقصد یہ ہے کہ انسان ہوسِ زر میں اندھا ہو کر ایسی ہر چوکھٹ پر ضمیر کو جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے جس سے اس کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ دنیا اپنی تنگی کے باوجود وسیع کر دی گئی ہے اور آخرت اپنی وسعت کے باوجود واہمہ بنا دی گئی ہے۔ ہم انسانوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی فراخی میں داخل کرنے کیلئے آئے ہیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آستانے کے سوا ہر آستانہ توڑ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ کے سوا ہر چوکھٹ اکھاڑ دی جائے۔ تخت و تاج اچھال دیئے جائیں، انسانوں کے نام نہاد اختیارات ختم کر دیئے جائیں، غیر مشروط قانون سازی کا حق انسان سے چھین لیا جائے، کردار کا بول بالا ہو، نسبتیں مفلوج ہو جائیں، کبریائی، بڑائی اور عظمت صرف اللہ تعالیٰ کی مانی جائے، اس کے سوا نہ کسی کا خوف دامن گیر ہو اور نہ کسی کی چاہت دلگرفتگی کا باعث بنے۔ یہ ہے وہ اعلان جو ہر پیغمبر دنیا میں کرنے کیلئے آیا اور آنحضرت ﷺ کو بھی زیادہ وسیع سطح پر اسی کام کرنے کا حکم دیا گیا۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

انسان کی اصلاح اور تعمیر انسانیت کیلئے یہ چونکہ پہلا نکتہ ہے جسے نظر انداز کر کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اس لئے ضروری تھا کہ اسے ہر مومن کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں کلمۂ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اذان جو رات کی تاریکی اور سناٹے میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان ہے اور پھر دن کی ہمہمی اور مصروفیات میں اسی کی یاد دہانی ہے۔ اور پھر سونے سے پہلے رات کی نماز میں اسی کو حرز جان بنانے کی نصیحت ہے، اس کا آغاز بھی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتا ہے۔ نماز عہدِ وفا کی مشق اور بندگیٔ رب کی تعبیر ہے۔ اس میں ایک مسلمان اللہ اکبر کہہ کر داخل ہوتا ہے پھر اٹھتا بیٹھتا اللہ اکبر کا اعادہ کرتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی اللہ اکبر کہے بغیر چلائی نہیں جا سکتی اور آج مسلمانوں کا سب سے بڑا امتیازی شعار اللہ اکبر ہی ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی عظمت اور عزت و حرمت کا دارومدار اسی بنیادی تصور پر ہے۔ جب تک مسلمان اس تصور کی پاسداری کریں گے اللہ تعالیٰ ان کے حقوق کی پاسداری کرے گا اور جب خدا کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا ڈنکا بجنے کی بجائے غیر اللہ کی کبریائی کا ڈنکا بجے گا اور مسلمان اس پر خاموش رہیں گے تو یہ خود ذلیل ہو جائیں گے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝

(اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ ۴)

Marfat.com

ثیاب کا مفہوم

یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ صاحب تفہیم القرآن نے اس پر ایک جامع نوٹ لکھا ہے ہم سب سے پہلے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان الفاظ کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو کیونکہ جسم ولباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ ﷺ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لئے آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوعِ انسانی کو طہارتِ جسم ولباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو ''طہارت'' کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے۔ جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اجلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کیلئے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہئے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو۔ تمہارا لباس ستھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو مگر اس میں فخر وغرور، ریاء نمائش، ٹھاٹھ باٹھ اور شان وشوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہئے۔ لباس وہ اولین چیز ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقوارہ اور آوارہ منش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے

Marfat.com

مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرۃً مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہئے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہئے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شائستہ انسان ہے جو نفس کی کسی برائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ابن عباس، ابراہیم نخعی، شعبی، عطاء، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، حسن بصری اور دوسرے اکابرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فلان طاهر الثياب و فلان طاهر الذيل ''فلاں شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے۔'' اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں فلانٌ دَنِس الثياب ''اس شخص کے کپڑے گندے ہیں۔'' اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

اس آیت کا ایک مفہوم شعراء جاہلیت کے اشعار سے استشہاد کرتے ہوئے صاحبِ تدبرِ قرآن نے لکھا ہے اس مفہوم میں بھی ایک اپیل اور وزن ہے۔ اگرچہ مآل کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسے بھی دیکھ لینا چاہئے۔

لفظ ثِيَابٌ جمع ہے ثَوْبٌ کی جس کے معنی کپڑے کے ہیں لیکن اس کے معنی دامن کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ کلامِ عرب کے شواہد سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مفہوم میں بھی آتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ''دامنِ دل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ امرءالقیس کا شعر ہے ۔

وان تک قد ساءتک منی خليقة
فسلي ثيابي من ثيابک تنسل

اسی شعر میں شارحین نے ''ثیاب'' کو دل ہی کے معنی میں لیا ہے اور یہ معنی اسی صورت میں لئے جا سکتے ہیں جب اس کو بطریق استعارہ دامنِ دل کے مفہوم میں سمجھا جائے۔ امرءالقیس ہی کا مصرعہ ہے۔

ثياب بني عوف طهاري نقية

لفظ ثیاب کے اس مفہوم کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم بالکل بے خوف ہو کر اپنے رب کی کبریائی اور وحدت کی منادی کرو۔ مخالفین خواہ کتنی خاک بازی کریں اور کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے دامن دل پر نجاست شرک کا کوئی چھینٹا نہ آنے دو۔ یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں مشرکوں کو نجس اور شرک کو نجاست سے تعبیر فرمایا ہے۔

یہ ہدایت آپ کو اس لئے فرمائی گئی کہ بعد کے مراحل میں قریش کے لیڈروں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ آپ کی سب باتیں مان لیں گے بشرطیکہ آپ بھی ان کے معبودوں کا کوئی مقام تسلیم کرنے پر راضی ہو جائیں لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کی یہ بات نہایت سختی سے رد فرما دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ کو نہایت تاکید کے ساتھ یہی

Marfat.com

ہدایت ہوئی کہ توحید بنیادِ دین ہے، اس باب میں آپ کوئی لچک ہرگز قبول نہ کریں۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم۔۹:۶۸) ''وہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرم پڑو تو وہ بھی کچھ نرم ہو جائیں'' اور اسی مضمون کی ایک سے زیادہ آیتوں میں اس صورتحال کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح کی ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ پیغمبرؐ کو خطاب کر کے مشرکین پر گویا یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ شرک ایک ایسی نجاست ہے جس کا کوئی چھینٹا بھی اللہ کا رسول اپنے دامن پر گوارا کرنے والا نہیں ہے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝٥

(اور گندگی سے دور رہو۔ ۵)

رُجز کا تلفظ اور مفہوم

رُجز، رِجز اور رِجس سب قریب المخرج اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ گندگی کے معنی میں مستعمل ہیں۔

یہاں گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے۔ مثلاً عقائد کی گندگی، جیسے شرک اور ریا وغیرہ۔ اور خیالات کی گندگی، مثلاً جنسی خیالات، سفلی تصورات، متکبرانہ خیالات وغیرہ۔ اخلاق و اعمال کی گندگی، مثلاً حسد و بغض، ہوسِ زر، شہرت کی طلب، دوسروں کو نقصان پہنچانے کی فکر وغیرہ۔ جسم اور لباس کی گندگی جس سے سب واقف ہیں۔ اسی طرح رہن سہن میں گری ہوئی حرکتیں اور نامناسب طرزِ عمل یہ وہ تمام گندگیاں ہیں جن سے انسانی زندگی آلودہ ہو جاتی ہے۔ آیتِ کریمہ میں جس گندگی سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے اس سے یہ تمام گندگیاں مراد ہیں۔ ایسی تمام نجاستوں، غلاظتوں اور آلودگیوں سے محفوظ رہنے کے نتیجے میں وہ شائستہ اور پاکیزہ زندگی وجود میں آتی ہے جو نوعِ انسانی کیلئے نمونہ بن سکتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی کو چونکہ تمام انسانوں کیلئے اسوۂ حسنہ بنایا گیا تھا اس لئے یہ بات ازبس ضروری تھی کہ آپؐ کا دامن ایسی ہر آلودگی سے محفوظ رہتا تاکہ کل کو کوئی شخص حرف گیری نہ کر سکتا۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝٦

(اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کیلئے۔ ۶)

مَن اور اِستِکثار کا مفہوم

وَلَا تَمْنُنْ، مَنٌّ سے ہے۔ اس کا ایک معنی ہے احسان کرنا۔ اور اس معنی میں یہ لفظ عربی زبان میں عام استعمال ہوتا ہے۔

تَسْتَكْثِرُ، استکثار سے ہے۔ اس کا ایک معنی ہے، کسی چیز کا زیادہ چاہنا۔ مثلاً سورۃ الاعراف آیت ۱۸۸ میں ہے وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ''اگر میں غیب جانتا تو میں بہت ساری بھلائیاں اکٹھی کر لیتا۔'' اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آپ کسی پر احسان اس نیت سے نہ کریں کہ جو کچھ اس کو دیا ہے اس سے زیادہ وصول ہو جائے گا یعنی آپ کا احسان بے غرضانہ ہونا

Marfat.com

چاہیے۔ آپ کی عطا اور بخشش، سخاوت اور حُسنِ سلوک محض اللہ تعالیٰ کیلئے ہو۔ اس میں اس بات کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ احسان کے بدلے میں آپ کو کوئی دنیوی فائدہ حاصل ہوگا۔ یہ وہ اعلیٰ تعلیم ہے جو نبی کریم ﷺ کو دی جارہی ہے۔ حالانکہ فطری طور پر احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔ جب اس بات کا علم ہو کہ میں جس پر احسان کررہا ہوں وہ میرے ساتھ کبھی احسان کا معاملہ کرنے والا نہیں تو انسان کا بڑھتا ہوا قدم خود بخود رک جاتا ہے۔ جو شخص کبھی تحفہ کے جواب میں تحفہ نہیں دیتا اسے تحفہ دینے والا آخر ہاتھ روک لیتا ہے۔ اور اسے عام اخلاقی زندگی میں معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو چونکہ انسانیت کیلئے نمونہ بننا تھا اس لئے جس خدا نے انہیں یہ تعلیم دی کہ جو شخص آپؐ سے تعلق توڑے آپؐ اس سے تعلق جوڑیں۔ اور جو قطع رحمی کرے آپؐ اس کے ساتھ صلہ رحمی کریں۔ آپؐ بدزبانی کے جواب میں عفوودرگزر سے کام لیں۔ اسی پروردگار نے آپؐ کو ایسے ہی بے غرضانہ احسان کی تعلیم دی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات سیاقِ کلام سے نہ صرف ہٹی ہوئی محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان اعلیٰ اخلاقیات میں سے ایک اہم ترین نصیحت ہے جس سے دشمن بھی اللہ تعالیٰ کے رسول کے قریب آجاتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ کی زندگی کے واقعات میں جابجا ہمیں اس کی تائید ملتی ہے۔

مَــنٌّ کا دوسرا معنی کسی چیز کو منقطع کردینا، روک دینا اور کاٹ دینا بھی ہے۔ سورۃ القلم کی آیت ۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ "بیشک آپ کیلئے ایک کبھی نہ ختم ہونے والا اور نہ منقطع ہونے والا صلہ ہے۔"

اِسْتِکْثَارٌ کا دوسرا معنی اہلِ لغت کے نزدیک اِسْتَکْثَرَ الشَّیْئَ رَاٰهُ کَثِیْرًا وَعَدَّهٗ کَثِیْرًا "کسی چیز کو زیادہ خیال کیا یا شمار کیا۔" صاحب اقرب الموارد نے اسی معنی کو پہلے ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انذار و تبلیغ کے جس منصب پر فائز کیا ہے اسے برابر جاری رکھئے اور یہ انذار اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک اتمامِ حجت نہ ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم نہ آجائے۔ چاہے اس پر کتنا طویل زمانہ گزر جائے اور یہ کبھی خیال نہ کیجئے کہ اب انذار بہت ہوچکا، مزید کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے اب میں اسے روک دیتا ہوں، ایسا کبھی نہ کیجئے۔

حضرت یونس علیہ السلام سے یہی اجتہادی فروگزشت ہوئی کہ جس قوم کی طرف آپ مبعوث ہوئے تھے ان کو طویل عرصہ تک انذار کیا، اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر آپ ان کی ہدایت سے مایوس ہوگئے اور ان کو ناقابلِ اصلاح سمجھ کر وہاں سے نکل گئے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت تنبیہ فرمائی اور ایک سخت امتحان سے گزارنے کے بعد ان کو پھر قوم کے پاس انذار کیلئے واپس بھیجا اور اس دوبارہ انذار سے اللہ تعالیٰ نے ان کی پوری قوم کو ایمان کی توفیق بخشی۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں ہر طرح کے حالات میں نہایت استقامت کے ساتھ انذار کو جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دوسرا مفہوم جو ہم نے بیان کیا ہے بعض اہلِ علم نے اس کو ترجیح دی ہے اور آیت کے الفاظ میں یقیناً اس کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر آئمہ تفسیر نے پہلا ہی مفہوم مراد لیا ہے اور وہی سیاقِ کلام سے زیادہ میل کھاتا محسوس ہوتا ہے۔ رہی وہ بات جو اس دوسرے مفہوم میں نمایاں کی گئی ہے اگلی آیت اسی دوسرے مفہوم کو متضمن معلوم ہوتی ہے۔

وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ ۝۷

(اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔ ۷)

Marfat.com

صبر کا مفہوم

آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ انذار کا جو عظیم کام آپؐ کے سپرد کیا گیا ہے یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ جیسے جیسے آپؐ کی دعوت آگے بڑھے گی آپؐ کی مخالفت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ آپؐ کے مصائب اور مشکلات بڑھتی جائیں گی، آپؐ کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا ہے جو اپنے عقائد اور رسم و رواج میں نہایت سخت اور جامد واقع ہوئی ہے۔ ان کے بنیادی تصورات کی سب سے بڑی اساس آباؤ اجداد کی تقلید ہے۔ وہ اپنے آباء کے بارے میں یہ تصور قبول نہیں کر سکتے کہ وہ بھی غلط ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جب آپؐ کی تعلیم اور دعوت ان جاہلانہ خیالات اور تصورات سے متصادم ہوگی تو قوم سے آپؐ کا تصادم بڑھے گا۔ اور وہ لوگ اپنے آبائی ورثے کی حفاظت کیلئے مرنے مارنے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ ایک دن آئے گا جب سارا عرب آپؐ کیخلاف صف آراء ہو جائے گا۔ اس لئے آپؐ کو اس کام کے آغاز ہی میں یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ حالات کیسے ہی منہ زور ہو جائیں اور مخالفین کسی طریقے سے بھی آپؐ کی دعوت کو روکنے کی کوشش کریں آپؐ نے اس کا ہرگز اثر قبول نہیں کرنا ہوگا، بلکہ نہایت ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتے رہنا ہوگا اور اسی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یہ فرض اس وقت تک انجام دینا ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کا دین اللہ تعالیٰ کی دھرتی پر غالب نہ آجائے۔ اور یا اس قوم پر اتمامِ حجت کے بعد ان پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

یہ ہیں وہ چھ بنیادی ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس وقت دی تھیں جب آپؐ کو نبوت عطا کی گئی اور لوگوں کی اصلاح کے منصب پر فائز کیا گیا۔ ان ہدایات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں کی اصلاح کا کام کس قدر عظیم اور کٹھن ہے اور انسانوں کی اصلاح کیلئے جو اللہ تعالیٰ کے رسول آتے ہیں وہ کس قدر اعلیٰ صفات سے متصف ہوتے ہیں۔ اور دعوت اور رہنمائی کے حوالے سے اس سے بہتر اوصاف اور ہدایات کا تصور بھی انسانی دماغ میں نہیں آسکتا۔ اور اگر یہ باتیں آنحضرت ﷺ پر نازل نہ کی گئی ہوتیں تو انسانی دماغ کی پرواز کبھی ان تک رسائی حاصل نہ کر سکتی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اگر انسانوں میں اسی قسم کی زندگی پیدا کرنا مطلوب ہو اور وہی انقلاب برپا کرنا مقصود ہو جو آنحضرت ﷺ نے کیا تو اس راستے میں کام کرنے والوں کو انہی اوصاف سے اپنے آپ کو بقدرِ ہمت متصف کرنا ہوگا، ورنہ کامیابی کی امید خواب وخیال سے زیادہ کچھ نہیں۔

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ ﴿۸﴾ فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ ﴿۹﴾ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ ﴿۱۰﴾

(پس جب صور پھونکا جائے گا۔ ۸) تو وہ بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ ۹) کافروں پر آسان نہ ہوگا۔ ۱۰)

انذار کا اصل موضوع

نَاقُوْر کے معنی صور کے ہیں۔ اور نَقْر سے مراد صور میں پھونک مارنا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو انذار کا حکم دیا گیا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کو خوابِ غفلت سے چونکا دیں۔ اس کی اہم ترین صورت یہ ہے کہ ہر شخص کی موت پھر مجموعی طور پر انسانی زندگی کا خاتمہ، کائنات کی بساط کا لپیٹ دیا جانا، نئی زندگی کا آغاز ہونا اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر دینا میں گزاری ہوئی زندگی کے لمحے لمحے اور ایک ایک عمل کا حساب دینا اس پورے پراسس کا نام قیامت اور آخرت ہے۔ اس کو انسانوں کے دل و

Marfat.com

دماغ میں اتارا جائے، یہ انذار کا پہلا مرحلہ ہے۔ یہیں سے انسانی زندگی میں تبدیلی کا آغاز ہوتا ہے۔ انسان کے بگاڑ کا اصل سبب ہی یہ ہے کہ وہ اسی زندگی کو حقیقی زندگی سمجھتا ہے اور موت کو اس زندگی کا خاتمہ گردانتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہمیشہ کیلئے فنا ہے جس میں کسی جوابدہی کا کوئی تصور نہیں۔ اس زندگی میں جیسے کیسے کسی نے مال و دولت جمع کر لیا ہے، عیش و عشرت کے سامان فراہم کر لئے، دوسروں کے کھنڈرات پر محلات اٹھا لئے، دوسروں کی محرومیوں پر اپنی مسرتوں کے آشیانے بنا لئے۔ یہ وہ زندگی ہے جسے کامیاب زندگی سمجھا جاتا ہے۔ پیغمبر اسی غلط تصور کو ختم کرنے کیلئے تشریف لاتے ہیں۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ قریشِ مکہ سے یہ کہیں کہ آج تو تم دنیوی زندگی پر انحصار کر کے نچنت ہو کر زندگی گزار رہے ہو۔ لیکن اس وقت تم کیا کرو گے جب صور پھونکا جائے گا اور قیامت برپا ہو جائے گی۔ وہ دن نہایت سخت دن ہوگا۔ ہر شخص کو زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اولاً تو قیامت آئے گی ہی نہیں اور اگر آ ہی گئی تو اس وقت دیکھ لیا جائے گا۔ تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ کافروں کیلئے وہ دن آسان نہیں ہوگا۔ البتہ صاحبِ ایمان لوگوں کیلئے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ وہ دن ان کیلئے ایسے گزر جائے گا جس طرح ایک نماز پڑھی جاتی ہے۔ لیکن تم سوچ لو تمہارا کیا بنے گا۔

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾
وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ﴿۱۵﴾

(چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔ ۱۱) اور اس کو بخشا میں نے مال فراواں۔ ۱۲) اور بیٹے دیئے حاضر رہنے والے۔ ۱۳) اور تیاری کر دی اس کیلئے خوب تیاری۔ ۱۴) پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ۱۵)

مکے اور طائف کے متکبرین کو سخت تنبیہ

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ ان آیات میں مکے اور طائف کے ان متکبرین کو سخت تنبیہ ہے جو اپنی خوشحالی اور رفاہیت کو اپنے عقیدہ وعمل کی صحت اور خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔ لیکن تفسیری روایات میں چونکہ نہایت تکرار کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ آیات ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ان اہلِ علم کا خیال ہے کہ ولید بن مغیرہ ان کا مصداق تو ہو سکتا ہے لیکن آیات کا نزول ان تمام بڑے بڑے کفار کے لیڈروں کیلئے ہوا ہے جو اپنے مال و دولت پر انحصار کرتے ہوئے آخرت کو بھی اپنے لئے خاص سمجھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تفسیری روایات کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ آیات تو ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جیسا کہ ہم سورۃ کے تعارف میں اس کی تفصیل عرض کر چکے ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تنبیہ کا محل اور مورد صرف ولید بن مغیرہ نہیں بلکہ وہ تمام لوگ ہیں جن میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے، خاص محل کا نہیں ہوتا۔

آیت کے شروع میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مجھے چھوڑ دو اور اس شخص کو جس میں یہ یہ خرابیاں پائی جاتی ہیں اور مراد ولید بن مغیرہ ہے۔ یہ دراصل ایک اسلوبِ کلام ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ولید یا اس قماش کے لوگوں کی حرکتوں کی پرواہ نہ کریں۔ ان کی مخالفت دراصل اللہ تعالیٰ کے دین کی مخالفت ہے۔ ان کا معاملہ ہم پر چھوڑ دیجئے۔ ممکن ہے دنیا ہی میں وہ گرفت میں آ جائیں

Marfat.com

ورنہ قیامت میں تو یقیناً اپنے انجام سے دوچار ہوں گے۔ چنانچہ یہ بات کہنے کے بعد ان احسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ولید پر فرمائے تھے لیکن اس نے شکر ادا کرنے کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ کہ جب آنحضرت ﷺ کی نبوت کے ایک سال کے بعد حج کا موسم آیا تو قریش نے مشاورت طلب کی۔ اس کی تفصیل تعارف میں گزر چکی ہے۔ آغاز میں تو ولید نے ان تمام اعتراضات کا دفاع کیا جو قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ پر کئے جا رہے تھے اور قرآنِ کریم کی عظمت کی تعریف کی۔ لیکن جب ابوجہل اس کے سر ہو گیا کہ تم بتاؤ ہم کس طرح محمد (ﷺ) کی دعوت کا راستہ روک سکتے ہیں۔ تو پھر اس نے جو کچھ کہا اگلی آیات میں اس کا ذکر آ رہا ہے۔ اس شخص کی حرکتوں کا ذکر کرنے سے پہلے پروردگار نے اپنے احسانات کا تذکرہ فرمایا کہ ذرا اس شخص کو دیکھو آج یہ جس مال و دولت کا مالک ہے اور جس وجاہت و ریاست پر ناز کر رہا ہے کیا جب میں نے اسے پیدا کیا تھا تو اس وقت ان میں سے کوئی چیز اس کے ساتھ آئی تھی۔ یہ بالکل بے بسی اور بے کسی کی تصویر اکیلا اس دنیا میں آیا تھا۔ اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ آج جن خداؤں کی خدائی کو قائم رکھنے کیلئے یہ آنحضرت ﷺ کی دعوتِ توحید کی مخالفت میں اس قدر سرگرم ہے کیا اس کی پیدائش میں ان کا بھی کوئی عمل دخل تھا۔ اس کو تو صرف میں نے پیدا کیا تھا اور یہ میرے ہی خلاف معاندانہ حرکتیں سرانجام دینے میں لگا ہوا ہے۔

مزید فرمایا کہ میں نے اس کو مال ممدود عطا فرمایا۔ ممدود کا ایک معنی کثیر اور بہت سا ہوتا ہے اور دوسرا معنی ہے پھیلا ہوا۔ یعنی ہم نے اسے وسیع کاروبار دیا، باغات دیئے، کوٹھیاں اور بنگلے دیئے، جانوروں کے غلے اور ریوڑ دیئے، مختلف جگہ کاروباری مراکز دیئے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی زمین، جائیداد اور باغات مکہ سے طائف تک پھیلے ہوئے تھے۔ بقول ثوری اس کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ دینار تھی۔ جس طرح آج کا سرمایہ دار ہر ملک کے بینکوں میں اپنا حساب کھولتا ہے اور ہر ملک کی کمپنیوں میں اپنا سرمایہ لگاتا اور ہر ملک میں اپنی کوٹھیاں اور بنگلے بناتا ہے اور بعض زرعی ممالک میں بڑے بڑے قطعاتِ زمین خریدتا ہے۔ ایسے ہی مالِ ممدود کا ولید بھی مالک تھا۔

مزید فرمایا کہ ہم نے اسے کئی بیٹے عطا کئے جن میں سے حضرت خالد بن ولید تو مسلمانوں میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان بیٹوں کیلئے شہود کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے کئی معانی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو کہیں اپنی روزی کیلئے دوڑ دھوپ اور سفر کرنے کی حاجت پیش نہیں آتی۔ ان کے گھر کھانے کو اتنا موجود ہے کہ ہر وقت باپ کے پاس موجود اور اس کی مدد کیلئے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر مجلس، ہر مقام اور ہر محاذ پر اس کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور اس کے پھیلے ہوئے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے والے اور مدافعت اور مقابلہ کی نوبت آ جائے تو نہایت دلیر اور بہادر ہیں۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اس مرتبے کے لوگ ہیں کہ معاملات میں ان کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔

مزید فرمایا کہ ہم نے اسے مال و دولت عطا کیا، قابل اولاد بخشی، عزت و وقار دیا، جس کے نتیجے میں اس کی امارت اور سیادت کیلئے ہم نے راہ ہموار کر دی۔ اور آج وہ اپنی قوم کا سردار سمجھا جاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی بے پایاں نعمتوں پر وہ انتہا درجہ شکر گزار ہوتا، وہ آگے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کی دعوت کا ستون بنتا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اختیار کرتا۔ لیکن بجائے یہ راستہ اختیار کرنے کے اس کی حرص میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اتنا کچھ پانے کے بعد بھی اسی فکر میں لگا ہوا ہے کہ اسے دنیا بھر کی نعمتیں عطا کر دی جائیں۔

كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿١٦﴾ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿١٧﴾

(ہرگز نہیں، وہ ہماری آیات سے عناد رکھنے والا ہے۔ ۱۶) میں اس کو عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔ ۱۷)

Marfat.com

احسان ناشناسی کی سزا

یعنی وہ جو توقع رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتیں اسے میسر آئیں گی اور قیامت کے دن بھی دنیا ہی کی طرح اسے نوازا جائے گا، فرمایا ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس کا یہ خواب ہرگز پورا ہونے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو بھی نعمتیں دیتا ہے وہ اس کے حق کی حیثیت سے نہیں دیتا بلکہ ان کیلئے آزمائش بناتا ہے کہ وہ یہ نعمتیں پاکر شکر گزار اور فرمانبردار رہتے ہیں یا خود سر مغرور یا خدا کے باغی بن جاتے ہیں۔ یہاں آیات سے مراد یا تو مجموعی طور پر قرآنِ کریم کی آیات ہیں اور یا بطورِ خاص وہ آیتیں ہیں جو عذابِ دنیا اور عذاب آخرت سے ڈرانے والی ہیں۔

اس شخص کو اب مزید نعمتوں کی توقع کی بجائے اس سزا کا انتظار کرنا چاہئے جس سے وہ عنقریب دوچار ہونے والا ہے۔ وہ سزا دنیا میں بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اصل سزا کا محل آخرت ہے جس کا آنا یقینی اور حتمی ہے وہ انسانوں کیلئے چاہے کتنی دور ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق نہایت قریب ہے۔ ویسے بھی جب ایک شخص کو موت آجاتی ہے تو اب اس کے اور قیامت کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہتی۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ جسے موت آگئی اس کی قیامت قائم ہوگئی۔ قیامت میں اسے کیسے کیسے جانگسل مراحل سے گزرنا پڑے گا وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾
ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾
اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾

(اس نے سوچا اور ایک بات بنائی۔ ۱۸) تو خدا کی مار ہو اس پر اس نے کیسی بات بنائی۔ ۱۹) پھر خدا کی مار ہو اس پر اس نے کیسی بات بنائی۔ ۲۰) پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ ۲۱) پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا۔ ۲۲) پھر پیٹھ پھیری اور تکبر میں پڑ گیا۔ ۲۳) پھر بولا یہ تو محض ایک جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ ۲۴) یہ تو محض انسانی کلام ہے۔ ۲۵)

معاندین کے عناد کی تصویر

آیت سولہ میں فرمایا ہے کہ وہ ہماری آیات کا شدید معاند ہے۔ یہ اسی عناد کی تصویر کھینچی گئی ہے اور غور سے دیکھئے کیسی مکمل تصویر کھینچی گئی ہے۔ ہم تعارف میں تفصیلات عرض کر چکے ہیں کہ یہ شخص دل میں قرآنِ کریم کے کلامِ الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا۔ پہلے اس نے مشاورت میں ان تمام الزامات کو رد کیا جو قریش کے سردار رسول اللہ ﷺ پر لگا رہے تھے، تو اسے مجبور کیا گیا کہ وہ ایسا الزام تراشے جسے عرب کے لوگوں میں پھیلا کر آنحضرت ﷺ کو بدنام کیا جا سکتا ہو۔ چنانچہ اس موقع پر جس طرح اس کی ذہنی خلش نے اس کا راستہ روکا، لیکن مفادات کی ہوس اس پر غالب آئی اور جس کیفیت سے وہ دوچار رہا اس کی تصویر کھینچتے ہوئے فرمایا کہ پہلے اس نے غور و فکر کیا۔ فوری طور پر کوئی ردعمل ظاہر کرنے کی بجائے سوچتا رہا۔ پھر غور و فکر کے بعد جو رائے اس کے ذہن میں آئی اس کو اس نے اپنے ذہن میں اچھی طرح تولا کہ وہ

Marfat.com

ایسی بات کہے جو دلوں میں اتر جائے۔ اس پر خدا کی مار ہو کہ اس نے قرآنِ کریم کا کتنا غلط اندازہ لگایا۔ خدا اسے غارت کرے اس نے کیسی بے ہودہ رائے قائم کی۔ دو دفعہ اس پر لعنت اس لئے فرمائی گئی تا کہ اس کی رائے کی شناعت اچھی طرح ظاہر ہو جائے۔ اس کے بعد بجائے ہوائے نفس کے غلبے کو پہچاننے اور حقیقت کا گلا گھونٹنے جیسے جرم کے ارتکاب سے بچنے کے اسے تکبر کا دورہ پڑا۔ نہایت تکبر سے لوگوں کی طرف دیکھا، گویا وہ عقلِ کل ہے جس کے بغیر الجھی ہوئی گتھیاں سلجھنا مشکل ہیں۔ پھر اس نے پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا، پھر وہ پیچھے ہٹا اور تکبر کی سراپا تصویر بن کر بولا اس کلام کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں ایک تاثیر ہے۔ وہ دلوں کو مسخر بھی کرتا ہے، لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں، پہلے بھی ایسے زبان آور خطباء گزرے ہیں جن کا بیان جادو کی طرح پر تاثیر ہوتا تھا۔ اور ان کا کلام لوگوں میں نقل بھی کیا جاتا ہے، ایسا ہی یہ بھی ایک کلام ہے۔ آپ کلام کے اعتبار سے اس کی جتنی چاہیں تعریف کر لیں لیکن اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک انسان کا کلام ہے۔ اسے بلاوجہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اور اس کا کلام کہنا سراسر زیادتی ہے۔

قریش دراصل قرآنِ کریم کی تاثیر و تسخیر اور اس کی معجزانہ شان کو دیکھتے ہوئے اس کی تعریف پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔ اب ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ خدائی کلام کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں پر جو اس کا رعب بیٹھتا جا رہا تھا اس کو روکنے کی یہی ایک صورت تھی کہ اسے انسانی کلام کی ایک بہترین مثال سمجھیں، لیکن کلامِ خداوندی ہونے کا انکار کریں۔

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾

(میں عنقریب اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ ۲۶) اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ۔ ۲۷) نہ ترس کھائے اور نہ چھوڑے۔ ۲۸) کھال جھلس دینے والی۔ ۲۹)

معاندین کا انجام

ولید بن مغیرہ کی معاندانہ سرکشی اور اس کے الزام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ میں اسے عنقریب دوزخ میں جھونک دوں گا یعنی قیامت کے روز اسے جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا۔ اور اہل مکہ چونکہ دوزخ اور جہنم کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ انہیں قیامت کے برپا ہونے کا یقین نہیں تھا، اس لئے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے اور توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ اے مخاطب تو کیا جانے وہ دوزخ کیا ہے۔ وہ صرف ایک آتش کدہ نہیں بلکہ اس کی آگ کا حال یہ ہے کہ نہ تو وہ کسی پر رحم کھاتی ہے، ابقیٰ علیه کے معنی ہوتے ہیں، اس نے اس پر ترس کھایا اور رحم کیا۔ اس آیت میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے کہ دوزخ ایسی ظالم چیز ہوگی جو کسی پر ترس کھانا نہیں جانتی۔ اور ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی اس سے بچ نکلے۔ دوسرا ترجمہ اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ نہ وہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو شخص بھی اس میں ڈالا جائے گا وہ جلا کر خاک کر دے گی، مگر مر کر بھی اس کا پیچھا نہ چھوٹے گا بلکہ وہ پھر زندہ کیا جائے گا اور پھر جلایا جائے گا۔ اور یہی عمل مسلسل جاری رہے گا۔ سورۃ الاعلیٰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی ''وہ نہ اس میں مرے گا نہ جیئے گا۔'' اس سے زیادہ سخت عذاب کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ ایک شخص جل کر بھسم ہو جائے لیکن اس کی جان نہ نکلے، اس کی کھال جھڑ جائے تو نئی کھال پہنا دی جائے۔

Marfat.com

مزید فرمایا اس آگ کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ دور ہی سے مجرموں کی کھالوں کو جھلس دے گی۔ بشر جسم کی کھال کو کہتے ہیں، یعنی وہ مجرم کو پہچانے گی اور اس کے شعلوں کی لپٹ مجرم کے مقامِ عذاب تک پہنچنے سے پہلے ہی اس تک پہنچ چکی ہوگی۔ اندازہ کیجئے جس عذاب کی ابتداء یہ ہوگی اس کی انتہاء کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔

عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾

(اس پر انیس فرشتے مقرر ہوں گے۔ ۳۰)

یعنی دوزخ کے انتظام وانصرام مجرموں کی گرفت اور ان کو عذاب دینے کیلئے انیس کارکن مقرر کئے گئے ہیں۔ اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب فرشتے ہیں۔ اس لئے کسی کو یہ بڑ ہانکنے کی ضرورت نہیں کہ انیس کو تو ہمارا ایک پہلوان سنبھال سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں اور فرشتوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو غیر معمولی قوتیں دے رکھی ہیں۔ وہ آسمانوں کی بے کراں پہنائیوں میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں اور انہیں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ وہ آسمان کی بلندی سے لحوں میں زمین پر اترتے ہیں۔ زمین کے تمام معاملات کی دیکھ بھال اور فیصلوں کا نفاذ ان کی ڈیوٹی میں شامل ہے اور کہیں اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اب رہی یہ بات کہ انیس کے عدد اور اس کے ذکر میں کیا حکمت ہے اگلی آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۙ لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِیْمَانًا وَّلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْکٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِیَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾

(ہم نے دوزخ پر نگران فرشتوں کو ہی بنایا ہے اور ہم نے ان کی یہ تعداد نہیں بیان کی، مگر اس لئے کہ یہ آزمائش بنیں ان لوگوں کیلئے جنہوں نے کفر کیا، تاکہ اہلِ کتاب کو یقین آجائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے اور اہلِ کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں اور تاکہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ اور کفر کرنے والے کہیں کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے۔ اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راہ یاب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کیلئے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو۔ ۳۱)

Marfat.com

متشابہات کے ذکر سے مومنوں کی ذہنی تربیت ہوتی ہے

قرآنِ کریم نے ایک سے زیادہ مقامات پر اس مضمون کو بیان کیا ہے کہ قرآنِ کریم میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک وہ آیات ہیں جنہیں محکمات کہا گیا ہے ان کا معنی اور مراد واضح ہے اور انہیں پر ہدایت واحکام کا دارومدار ہے۔ دوسری وہ آیات ہیں جنہیں متشابہات کہا گیا ہے۔ ان میں ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کیلئے ہماری زبان میں مناسب الفاظ نہیں ہیں کیونکہ عالمِ غیب کے حقائق عالمِ وجود کی زبان میں سما نہیں سکتے۔ اسے اس طرح بیان کر دیا جاتا ہے جس سے وہ ہمارے فہم وادراک کے کسی حد تک قریب آ جاتے ہیں لیکن ان کا مکمل ادراک ممکن نہیں۔ قیامت کے دن ان کی حقیقت ہم پر کھل جائے گی۔ انیس کا عدد بھی اس آیت میں متشابہات سے تعلق رکھتا ہے۔

قرآنِ کریم کے اللہ تعالیٰ کے کلام اور ہماری زندگی کا دستور العمل ہونے پر بے شمار دلائل قرآنِ کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں فطری شواہد بھی موجود ہیں، دلائلِ انفس اور دلائلِ آفاق بھی اور سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق اور تائید بھی۔ جو شخص ان دلائل کو غور سے دیکھے گا وہ قرآنِ کریم کی حقانیت پر ایمان لے آئے گا۔ رہی وہ باتیں جو قرآن میں متشابہات کے طور پر بیان کی گئی ہیں تو جو شخص قرآنِ کریم کے اللہ تعالیٰ کے کلام ہونے پر یقین رکھتا ہے ایسی باتوں کی وجہ سے اس کے یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ یہ اس رب کا کلام ہے جس کے علم کی حدود ہمارے فہم وادراک سے بالا ہیں۔ وہ کبھی ہمارا امتحان لینے کیلئے اور کافروں کیلئے فتنے کے طور پر ایسے الفاظ کا ذکر کر دیتا ہے تا کہ ہمارے یقین وایمان کی تربیت ہو اور کافر مزید فتنے کا شکار ہو کر ہدایت سے اور دور ہو جائیں۔ کیونکہ جس شخص کے دل میں قرآنِ کریم کی طرف سے شک وارتیاب پایا جاتا ہے اور یا وہ قرآنِ کریم کے کلام اللہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتا ایسے حقائق ایسے شخص کے انکار اور شک وارتیاب میں زیادتی کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن وہ سچے اہلِ کتاب جو آسمانی کتابوں کی حقیقت کو جانتے ہیں اور اس طرح وہ صاحبِ ایمان لوگ جو قرآنِ کریم کی حقانیت کو تسلیم کر چکے ہیں ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی چیزیں ان کیلئے ہدایت میں افزونی کا باعث ہوتی ہیں اور کافر اور منافق کیلئے کفر ونفاق میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے ایمان مانگتا ہے اور ایمان کے راستے پر چلتا ہے وہ اسے ایمان سے نوازتا ہے اور جو کفر اور نفاق پر اصرار جاری رکھتا ہے اس کے کفر اور نفاق میں ترقی ہو جاتی ہے۔

کفار کا یہ کہنا کہ انیس فرشتے بے شمار مخلوق کو جہنم میں کس طرح قابو کر لیں گے، ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے یہ انیس کو تو ان کے سردار ہیں ان کے ماتحت کتنی فورس اور کتنی بڑی فوج ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں کا شمار کوئی نہیں جانتا۔ یہ بتلانا مقصود نہیں کہ کتنے فرشتے اس کے انتظام وانصرام میں لگے ہوئے ہیں بلکہ صرف یہ توجہ دلانا اور یاد دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتیں بے پناہ ہیں۔ اس کی گرفت سے ہر وقت پناہ مانگو اور وہ جو بات اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے اسے یقین کی قوت سے تھام لو۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾

Marfat.com

وَالصُّبْحِ إِذَآ أَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ
شَآءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿۳۷﴾ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿۳۸﴾
إِلَّآ أَصْحٰبَ الْيَمِينِ ﴿۳۹﴾ فِي جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۴۱﴾
مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ
نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ
بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿۴۶﴾ حَتّٰى أَتٰىنَا الْيَقِينُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ
الشّٰفِعِينَ ﴿۴۸﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿۴۹﴾ كَأَنَّهُمْ
حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ
مِّنْهُمْ أَن يُؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ كَلَّا بَل لَّا يَخَافُونَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾
كَلَّآ إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُ ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّآ أَن
يَشَآءَ اللّٰهُ هُوَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

رکوع: ۲۔ (ہرگزنہیں، قسم ہے چاند کی۔ ۳۲) اور قسم ہے رات کی جب وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے۔ ۳۳) اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جاتی ہے۔ ۳۴) بیشک وہ قیامت بڑے حوادث میں سے ایک ہے۔ ۳۵) جو انسان کیلئے نذیر ہے۔ ۳۶) اس کیلئے جو تم میں سے آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے ہٹنا چاہے۔ ۳۷) (ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں رہن ہے۔ ۳۸) مگر داہنی طرف والے۔ ۳۹) وہ باغوں میں ہوں گے، پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے۔ ۴۰)، مجرموں کے حال کے بارے میں۔ ۴۱) (سوال کریں گے) تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی۔ ۴۲) وہ

Marfat.com

جواب دیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ۴۳) اور نہ غریبوں کو کھلاتے ہی تھے۔ ۴۴) اور کٹ حجتیاں کرتے تھے، کٹ حجتیاں کرنے والے کے ساتھ۔ ۴۵) اور ہم جزاء وسزا کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ ۴۶) حتیٰ کہ آ پہنچی ہم پر وہ یقینی بات۔ ۴۷) تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی۔ ۴۸) (پس ان کو کیا ہوا ہے کہ وہ نصیحت سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔ ۴۹) (گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہوں۔ ۵۰) جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔ ۵۱) (بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیئے جائیں۔ ۵۲) ہرگز نہیں، بلکہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ۵۳) ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاد دہانی ہے۔ ۵۴) تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔ ۵۵) اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے، وہی ہے جس سے ڈرنا چاہئے اور وہی ہے بخشنے کے لائق۔ ۵۶)

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾

(ہرگز نہیں، قسم ہے چاند کی۔ ۳۲) اور قسم ہے رات کی جب وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے۔ ۳۳) اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جاتی ہے۔ ۳۴) بیشک وہ قیامت بڑے حوادث میں سے ایک ہے۔ ۳۵) جو انسان کیلئے نذیر ہے۔ ۳۶) اس کیلئے جو تم میں سے آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے ہٹنا چاہے۔ ۳۷)

دلائلِ آفاق سے اثباتِ قیامت اور قسموں کی وضاحت

اثباتِ قیامت کا مضمون جاری ہے اور اشرافِ قریش کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے آفاق کی چند نشانیوں کی قسم کھا کر اور انہیں شواہد کے طور پر پیش کر کے لوگوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ قیامت اس کائنات کے حوادث میں سے ایک عظیم حادثہ ہے جس کا ظہور قطعی اور حتمی ہے۔ اب ہم ان قسموں کی کسی حد تک تشریح کرتے ہیں تاکہ ان دلائل کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

اس سے پہلے بعض سورتوں میں قسم سے پہلے حرفِ نفی کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ وہاں عرض کیا جا چکا ہے کہ قسم سے پہلے حرفِ نفی زائد نہیں ہوتا۔ اور یہاں بھی كَلَّا وہی مفہوم ادا کر رہا ہے۔ اس کا بھی حرفِ نفی کی طرح قسم کی معنویت میں ایک کردار ہے۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ کہنے والا ایک غلط بات کہتا ہے، سننے والا اس کی تردید کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ تردید میں کوئی دلیل پیش کرے حرفِ نفی یا كَلَّا لا کر دلیل سے پہلے کہنے والے کی بات کی تردید کر دیتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک بات کا بطلان اس قدر واضح ہے اور اس کے اندر کہی گئی بات کے حوالے سے اس قدر شدید نفرت پائی جاتی ہے کہ یہ اس کا انتظار نہیں کرتا کہ میں دلیل سے اس کا رد کروں بلکہ دلیل سے پہلے نہایت محکم انداز میں کہتا ہے ہرگز نہیں، جو بات تم کہتے ہو، وہ یکسر غلط ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی بات دلیل کے ساتھ کہنا شروع کرتا ہے۔

Marfat.com

اس سے پہلے ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم قسم کی صورت میں دلیل پیش کرتا ہے اور یہ اسلوب قرآنِ کریم کے ساتھ خاص نہیں۔عربی ادیبوں کے یہاں بھی یہ شائع وذائع ہے۔قسمیہ جملے میں قسم کی حیثیت دلیل کی ہوتی ہے اور مقسم علیہ یعنی جس پر قسم کھائی جاتی ہے اس کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے۔دعویٰ بعد میں پیش کیا جاتا ہے اور قسم یعنی دلیل پہلے پیش کی جاتی ہے تاکہ جس بات کو ثابت کرنا مقصود ہو، دل ودماغ کو اس کیلئے ہموار کر دیا جائے۔ان آیات میں تین باتوں کی قسم کھائی گئی ہے۔چاند کی قسم، رات کی قسم جب وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے اور صبح کی قسم جب وہ روشن ہو جاتی ہے۔اور مقسم علیہ آیت ۳۵ میں ذکر کیا گیا ہے یعنی قیامت۔کہنا یہ ہے کہ جو لوگ قیامت کا انکار کرنے والے ہیں ان کے شبے کی بنیاد یہ ہے کہ قیامت کو اگر آنا ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی۔ہر پیغمبر نے لوگوں کو اس سے ڈرایا اور اس کے آنے کی خبر دی۔صدیاں گزر گئیں اگر اسے آنا ہوتا تو اب تک آ چکی ہوتی۔معلوم ہوتا ہے یہ محض ڈراوا ہے۔اس کے جواب میں کَلَّا کہہ کر سختی سے اس شبے کا رد کیا۔اور پھر تین قسمیں تین دلائل کے طور پر کھائی گئیں۔جن کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے چاند کو نکلتا، چاندنی لٹاتا، دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتا اور روشنی بکھیرتا ہوا دیکھتے ہیں۔وہ باریک دھاگے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، پھر بڑھتے بڑھتے بدرِ کامل بن جاتا ہے، پھر کم ہونا شروع کرتا ہے اور آخر میں باریک دھاگے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔چاند کا عروج وزوال اور اس کا کسر وکمال ایک بات کی خبر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔وہ ان منزلوں سے گزرتا ہوا کمال کو پہنچتا ہے اور انہیں منزلوں سے اترتا ہوا زوال کا شکار ہوتا ہے۔گویا اس کے عروج وزوال میں ایک تدریج ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق روبہ عمل آتی ہے۔اسی طرح رات کی تاریکی میں صبح کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا۔رات کی گہری تاریکی کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص جسے رات کے چھا جانے اور صبح کے طلوع ہو جانے کا تجربہ نہیں، سوچ بھی نہیں سکتا کہ رات کی تاریکی میں سے صبح طلوع ہوگی۔اور اگر اسے بتایا جائے کہ صبح آ کے رہے گی تو جیسے جیسے رات گہری ہوتی جائے گی، ویسے ویسے اس کے اندر شک وارتیاب کے کانٹے اگتے جائیں گے۔اس طرح جب صبح نمودار ہو جاتی ہے اور دن کی روشنی پھیلتی چلی جاتی ہے اور تاریکی کا کہیں نشان تک نہیں رہتا تو کوئی شخص کبھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہو سکتا کہ رات آنے والی ہے۔لیکن چاند کے عروج وزوال کا سفر، رات کا آہستہ آہستہ پیٹھ پھیرنا اور پھر صبح کا آہستہ آہستہ رات کی طرف بڑھنا ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے قانونِ تدریج کی منہ بولتی شہادت ہے کہ یہاں کوئی بھی تغیر یک لخت نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے ایک قانون مقرر ہے جس کے مطابق وہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔کسی کی طلب وتمنا نہ اس کے سفر کو تیز کر سکتی ہے اور نہ کم کر سکتی ہے۔چاند اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق عروج ومحاق کی منزلیں طے کرتا ہے اور صبح وشام اللہ تعالیٰ ہی کے معین پروگرام کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔یہی حال قیامت کا بھی ہے۔اس نے انسانی سفر کی بھی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔عروج وزوال کا سفر جاری رہتا ہے، نشیب وفراز کا سیل بہتا رہتا ہے، قومیں اخلاق کی منزلیں کبھی چڑھتی اور کبھی ان سے پھسلتی ہیں۔اور یہ سفر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان مختلف اطوار ومراحل سے گزرتے ہوئے اس مقام تک نہیں پہنچ جاتا جہاں اللہ تعالیٰ کے علم میں قیامت کا ظہور ہونے والا ہے۔اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا اور یہ انتظار اسی قانون کا حصہ ہے جسے ہم نظامِ کائنات میں قانونِ تدریج کے نام سے جانتے ہیں۔لیکن مظاہر قدرت اور انسانی تجربات میں چونکہ اس قانون کی کارفرمائی روز ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اس لئے ہم اس میں جلد بازی نہیں کرتے اور نہ بے صبری کا اظہار کرتے ہیں۔لیکن نہ جانے کیوں قیامت کے بارے میں یہ پیمانہ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔چنانچہ اسی قانون اور اسی پیمانے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم چاند، رات اور صبح کو دیکھو کو کس طرح ایک تدریج کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے

Marfat.com

اور اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ جیسے ان کا ظہور کائنات کے عظیم احوال وحوادث کا ایک حصہ ہے یہی حال قیامت کا ہے۔ وہ بھی ایک بہت بڑا واقعہ ہے جسے بیان اس لئے کیا جاتا ہے تا کہ وہ انسان کیلئے نذیر ثابت ہو۔ اور اس کی ہولناکی کو دیکھتے ہوئے اس سے پہلے کہ اس سے سابقہ پیش آئے انسان اس کیلئے تیاری کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعہ سے اور اپنا رسول مبعوث فرما کر اس آنے والے عظیم واقعہ کی انسانوں کو قبل از وقت اطلاع دے دی۔ اب اس کا قبول کرنا یا رد کرنا یہ انسان کا اپنا کام ہے۔ جو اپنی عاقبت کی خیر چاہے گا وہ اس کو قبول کرنے کیلئے آگے بڑھے گا اور جس کی شامت آئی ہوئی ہوگی وہ اعراض واستکبار کی روش اختیار کرے گا اور پیچھے ہٹ جائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

(ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں رہن ہے۔ ۳۸) مگر داہنی طرف والے۔ ۳۹) وہ باغوں میں ہوں گے، پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے۔ ۴۰) ، مجرموں کے حال کے بارے میں۔ ۴۱)

اعمال پر کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ ہر شخص کی قدر وقیمت اور اس کے اچھے برے انجام کا دارومدار اس کے اعمال پر ہے۔ بظاہر انسان اپنی شکل وصورت، اپنے رنگ وروپ، اپنے قبیلے، اپنی نسل، اپنے خاندان اور اپنے جغرافیے سے پہچانا جاتا اور مختلف مقامات سے گزارا جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے قانون میں ان چیزوں کی حیثیت شناخت کی ہے۔ حقیقی مقام کا تعلق انسان کے اعمال سے ہے۔ جس طرح ایک صحیح نظام میں انسان کی صلاحیت وقابلیت اور اس کی محنت وریاضت اس کا مقام متعین کرتی ہے، اسی طرح آخرت میں بھی انسان کی خیر وفلاح کا تعلق اس کے اعمال کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہاں نہ نام ونسب کام آئے گا نہ نسبتیں کام آئیں گی نہ کوئی اور سہارا کام آئے گا۔ اعمال کی گرفت سے صرف وہ لوگ نکل سکیں گے جو اصحاب الیمین ہوں گے۔ یعنی جن لوگوں نے دنیا میں فرض اور قرض کی ذمہ داریاں ادا کی ہوں گی وہ پہلے ہی مرحلے میں اپنے لئے آزادی محسوس کریں گے۔ انہیں جنت کے باغوں میں پہنچا دیا جائے گا۔ ان لوگوں کو اصحاب الیمین اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ وہ خوش نصیب ہیں جو اپنے ایمان اور حُسنِ عمل کے باعث اس قابل سمجھے جائیں گے کہ ان کے نامۂ اعمال ان کے دہنے ہاتھ میں دیئے جائیں۔ اس لئے انہیں دایاں بازو والے قرار دیا گیا۔ ان کی شان جنت کے باغوں میں یہ ہوگی کہ یہ لوگ آپس میں بیٹھ کر ان لوگوں کا تذکرہ کریں گے جو دنیا میں قیامت کے بارے میں ان کے ساتھ بحث کیا کرتے تھے۔ اسلام کا مذاق اڑاتے اور آخرت کے تصور کو محض ایک واہمہ کہتے۔ اور ان کی زندگی مجرموں کی زندگی تھی۔ یہ ایک دوسرے سے ان لوگوں کا نام لے لے کر کہیں گے کہ کاش معلوم ہوتا کہ آج وہ کس حال میں ہیں، کہ اچانک جنت اور جہنم کے درمیان ہزاروں میل کے فاصلے کے باوجود پردے ہٹا دیئے جائیں گے اور وہ ان لوگوں کو جہنم کے عذاب میں مبتلا دیکھیں گے۔ قرآنِ کریم میں سورۃ صافات میں اس مکالمے کا ذکر کیا ہے جس کی طرف یہاں اشارہ کیا جا رہا ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ○ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ○ ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ○ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ○ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ○ (الصّٰفّٰت۔

Marfat.com

۳۷: ۵۰۔۵۵) ”پس اہل جنت ایک دوسرے کی طرف سوال وجواب کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ان میں سے ایک کہے گا، دنیا میں میرا ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو! بھلا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا جزاء اور سزا کیلئے اٹھائے جائیں گے! کہیں گے، بھلا جھانک کر دیکھو تو سہی! تو وہ جھانک کر دیکھے گا تو اس مجرم کو دوزخ کے بیچ میں دیکھے گا۔“

مَاسَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾ حَتّٰى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾

(سوال کریں گے) تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی۔ ۴۲) وہ جواب دیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ۴۳) اور نہ غریبوں کو کھلاتے ہی تھے۔ ۴۴) اور کٹ حجتیاں کرتے تھے، کٹ حجتیاں کرنے والے کے ساتھ۔ ۴۵) اور ہم جزاء وسزا کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ ۴۶) حتیٰ کہ آ پہنچی ہم پر وہ یقینی بات۔ ۴۷) تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی۔ ۴۸)

اہلِ جنت کا سوال اور اہلِ جہنم کا اعتراف

اہل جنت اہلِ جہنم میں سے اپنے جاننے والوں سے جو دنیا میں ان کے ساتھ بحث کیا کرتے تھے پوچھیں گے کہ تمہیں تو دوزخ کے وجود ہی سے انکار تھا اور اگر تم ایک مفروضے کے طور پر اسے مانتے بھی تھے تو تمہارا زعم یہ تھا کہ جس پروردگار نے تمہیں دنیا میں نعمتوں سے نوازا ہے وہی تمہیں آخرت میں بھی بہتر سے بہتر نعمتوں سے نوازے گا۔ اور اگر اس نے ہم پر ہاتھ ڈالا بھی تو ہم جن قوتوں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ ہمیں اس سے بچالیں گی۔ پھر آج کیا ہوا کہ تم دوزخ میں پڑے ہوئے ہو، آخر کیا چیز تمہیں دوزخ میں لے گئی ہے۔ تو اہلِ دوزخ اس کے جواب میں اعتراف کریں گے کہ ہمارے اعمال ہی ہمارے یہاں آنے کا سبب ہوئے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا رہا کہ انسان کے انجام کا دارومدار اس کے اعمال پر ہے۔ ہر شخص اپنے اعمال کا رہین ہے، لیکن ہم نے اس کا ہمیشہ مذاق اڑایا، لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے وہ غلط تھا، ہماری غلط سوچ اور ہماری بداعمالیاں ہماری سزا اور رسوائی کا باعث ہوئیں۔

جرائم کا اعتراف کرتے ہوئے وہ سب سے پہلے نماز نہ پڑھنے کا اعتراف کریں گے، یعنی انہیں اس بات کا احساس ہوگا کہ جس طرح عقائد میں توحید کو سب پر تقدم حاصل ہے اسی طرح نماز کو باقی ارکان پر تقدم اور برتری حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص ایمان لاتا ہے تو سب سے پہلے جو فرض اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ فریضۂ نماز ہے۔ کیونکہ نماز ہی دراصل ایمان کی عملی صورت ہے اور اللہ تعالیٰ سے عہدِ وفا کی ایک جامع تعبیر بھی ہے اور اس کی ایک مشق بھی۔ اس لئے ہر پیغمبر نے اپنی اپنی امت کو سب سے پہلے نماز ہی کا حکم دیا۔ اور قرآن کریم میں بتایا گیا کہ بنی اسرائیل جب گمراہ ہوئے تو ان کی گمراہی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا۔ وہ نماز کو ضائع کر بیٹھے اور شہوات کے تابع ہو گئے۔

Marfat.com

دوسرے جس جرم کا وہ اعتراف کریں گے وہ یہ ہوگا کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح ان کا تعلق ترکِ نماز کی وجہ سے اپنے اللہ سے ٹوٹ چکا تھا اسی طرح عدمِ انفاق کی وجہ سے بندوں سے بھی اپنا تعلق توڑ چکے تھے کیونکہ نماز بندے کا اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے ضرورت مند بندوں پر خرچ کرنا انسانی تعلقات کی استواری کا باعث بنتا ہے۔ اور انہیں دو تعلقات کی استواری پر ہر مومن کے دین کی استواری کا انحصار ہے۔

تیسرا جرم جس کا وہ اعتراف کریں گے وہ یہ ہے کہ قیامت و جزاء وسزا کے بارے میں دوسرے لوگ جس طرح کی نکتہ چینیاں اور موشگافیاں کیا کرتے تھے، اسی طرح کی موشگافیوں میں ہم بھی لگے رہتے تھے۔ قیامت کے تصور کا مذاق اڑانا، اعمال کے جزاء وسزا کو واہمہ قرار دینا اور ایک دفعہ تمام کائنات کی تباہی اور پھر از سرِ نو آبادی کا ناممکن قرار دے کر تمسخر اڑانا اور قیامت کے بارے میں قرآنِ کریم کی بیان کردہ بعض تفصیلات کا مذاق اڑانا جس کی مثال اسی سورۃ میں گزری ہے کہ جب انہیں بتایا گیا کہ جہنم پر انیس داروغے ہوں گے تو انہوں نے اس پر عجیب وغریب پھبتیاں کسیں اور وہ وہ بے پَر کی اڑائیں کہ الامان والحفیظ۔

خوض فی الحدیث کے معنی ہیں، کسی بات میں مین میکھ نکالتے نکالتے کہیں سے کہیں جانکلنا، اور اس کو فتنہ اور حق سے انحراف کیلئے بہانہ بنالینا۔ یہ تھا وہ جرم جس کا یہ اہلِ دوزخ اعتراف کریں گے۔

اور چوتھا جرم جس کا وہ اعتراف کریں گے وہ یہ ہے کہ ہم قیامت اور آخرت کے دن کو ماننے سے انکار کرتے اور اس کی تکذیب کرتے تھے۔ ہمارا یہی حال تھا کہ وہ یقینی بات آ گئی جسے ہم بھولے ہوئے تھے۔ اس یقینی بات سے مراد موت بھی ہوسکتی ہے اور آخرت بھی۔ موت کو یہاں یقین سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ موت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا آنا یقینی اور حتمی ہے اور کسی شخص کو اس سے انکار نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا استحضار کسی قسمت والے کو ہوتا ہے، ورنہ جب تک زندگی سے مایوسی نہیں ہوجاتی موت کا یقین پیدا نہیں ہوتا۔ اور دوسری وجہ اسے یقین قرار دینے کی شاید یہ ہے کہ جب آدمی پر سکرات الموت طاری ہوتے ہیں تو تمام مابعد الموت حقائق آدمی پر روشن ہوجاتے ہیں اور وہ ان کے یقین پر مجبور ہوجاتا ہے۔

یہ ہیں وہ جرائم جو ان کے جہنم میں لے جانے کا سبب ہوئے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ ان جرائم سے ان کا مجموعہ مراد ہے، یعنی جس شخص میں بیک وقت یہ چاروں جرائم پائے جائیں گے وہ یقیناً جہنمی ہے اور اسے شفاعت بھی کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ البتہ جہاں تک ان میں سے ایک ایک جرم کا تعلق ہے ان میں قیامت کی تکذیب تو بجائے خود کفر ہے۔ کیونکہ اولاً تو جس کے اندر یہ جرم پایا جائے گا اس میں باقی جرائم بھی پائے جائیں گے لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ کوئی شخص ایسا بھی ہے جو نماز اور زکوٰۃ پر عامل تو ہے لیکن تکذیب یوم الدین کا ارتکاب کرتا ہے تو نماز اور زکوٰۃ کی موجودگی بھی اسے جہنم سے نہیں بچاسکے گی۔ یہ جرم خود جہنم میں لے جانے کیلئے کافی ہے۔

بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ ایک شخص اگر آخرت کو مانتا ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا یا زکوٰۃ نہیں دیتا تو تب بھی وہ جہنم میں جائے گا۔ کیونکہ نماز اور زکوٰۃ اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایسی عبادات ہیں کہ جن کا ترک جہنم میں جانے کا باعث بنے گا۔ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تارکِ صلوٰۃ اور تارکِ زکوٰۃ یقیناً جہنم میں جائیں گے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے ایسے لوگ جہنم سے نجات پا جائیں گے۔ جہنم ان کیلئے ابدی سزا نہیں ہوگی۔ اور یہی صحیح نقطہ نگاہ ہے۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾

Marfat.com

شفاعتِ باطلہ کی نفی

اس کے بعد فرمایا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کو نفع نہیں دے گی۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کرنے والے ہوں گے لیکن ان کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔ اگر اس تعبیر کو قبول کرلیا جائے تو پھر ان تمام تفصیلات کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے جن کا ذکر قرآنِ کریم میں جا بجا ہوا ہے کہ کون شفاعت کرے گا، کس کیلئے کرے گا، اپنے طور پر کرے گا یا اللہ تعالیٰ کی اجازت سے کرے گا، کون سے گناہ ہیں جو شفاعت سے بخشے جائیں گے اور کون سے گناہ ہیں جن میں شفاعت قبول نہیں کی جائے گی؟ لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ کلام عربیت کے اسلوب پر ہے جس کو نفی الشی بنفی لازمہ کہا جاتا ہے، یہاں اگرچہ شفاعت کرنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ایسے گناہوں پر چونکہ شفاعت قبول نہیں کی جاتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کوئی شفاعت کرنے والا موجود نہیں ہوگا۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾

(پس ان کو کیا ہوا ہے کہ وہ نصیحت سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔ ۴۹)

اعراض کرنے والوں کے حال پر تعجب

آنحضرت ﷺ کی دعوت جو آپؐ قریش اور اہلِ مکہ کے سامنے پیش فرما رہے تھے اور وہ یاددہانی جس کا تذکرہ بار بار ان کے سامنے کرتے تھے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ نہ اس دعوت پر کان دھرتے ہیں اور نہ اس یاددہانی کو قابلِ توجہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے ان حقائق کے اثبات کیلئے بار بار دلائل پیش کئے۔ اور آنحضرت ﷺ اپنی دلآویز شخصیت اور ہمدردی اور غمگساری سے بار بار اس کیلئے انہیں اپیل کر رہے ہیں لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ محمد کریم (ﷺ) جیسے رسول کی بعثت اور قرآنِ کریم جیسی کتاب کے نزول کے بعد وہ اس دعوت کے علمبردار بن کر اٹھتے۔ اس یاددہانی سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور لوگوں کو بھی اس کی طرف مائل کرتے۔ لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے وہ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾

(گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہوں۔ ۵۰) جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔ ۵۱)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں کفار کے اعراض پر اظہارِ تعجب کیا گیا ہے، لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا کہ وہ صرف آپؐ کی اور قرآنِ کریم کی دعوت سے اعراض ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے اندر اس دعوت سے متعلق ایک وحشت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اس کا نام سنتے اور اس کی آواز کانوں میں پڑتے ہی بے ساختہ بھاگ اٹھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا کوئی بول ان کے کانوں میں پڑنے نہ پائے۔ درحقیقت انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جب وہ کسی چیز کو اس لئے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو کہ وہ زندگی میں انقلاب کی داعی اور

Marfat.com

برے اخلاق کو چھوڑنے کی متقاضی ہے۔ لیکن اس کے اندر دلائل کی ایسی قوت اور حقیقت کی ایسی اپیل پائی جاتی ہو کہ انکار کرتے بھی نہ بنتی ہو۔ تو پھر انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے سننا ہی گوارا نہیں کرتا۔ اس کا سامنا کرنا اس کیلئے موت سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے یا کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا۔ ان کی اس وحشت زدگی کو قرآنِ کریم نے ایک مثال سے واضح کیا ہے کہ ان کا حاصل ایسا ہے جیسے بِدکے ہوئے جنگلی گدھے جو شیر کی آواز سن کر یا کسی شکاری کی آہٹ پا کر اس بری طرح سے دوڑتے ہیں کہ دائیں بائیں اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

حُمُرٌ، حِمَارٌ کی جمع ہے، گدھے کو کہتے ہیں۔

مُسْتَنْفِرَةٌ بِدکے اور ڈرے ہوئے۔

قَسْوَرَةٍ کے معنی شیر کے بھی آتے ہیں اور تیر انداز شکاری کے بھی۔ صحابہ کرامؓ سے دونوں منقول ہیں۔

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾

(بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیئے جائیں۔ ۵۲)

اعراض کا بہانہ

گزشتہ دو آیتوں میں مخالفین کے اعراض بلکہ وحشت زدگی کو بیان کرنے کے بعد اس آیت میں فرمایا کہ انہوں نے اپنے اعراض اور وحشت پر پردہ ڈالنے کیلئے بات کو الجھانے کی کوشش کی کہ جس طرح محمد (ﷺ) پر قرآنِ کریم مختلف صحیفوں یعنی سورتوں کی شکل میں نازل ہو رہا ہے، اسی طرح ہم پر بھی کھلے صحیفے نازل کئے جائیں۔ انہیں دیکھ کر ہم اندازہ کر سکیں گے کہ آنحضرت ﷺ کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ اور ایک مفہوم اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر سردار کے نام ایک کھلا خط اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنا چاہئے جس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ ہم نے محمد (ﷺ) کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور یہ کتاب اس پر اتاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات پہلی دفعہ مشرکینِ مکہ نے نہیں کہی بلکہ اہلِ کتاب کے بارے میں قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر ایسی باتیں ارشاد فرمائی ہیں کہ کبھی وہ یہ کہتے کہ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو اپنی کھلی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، ہم ایمان نہیں لائیں گے۔ اور کبھی کہتے کہ ایک لکھی ہوئی کتاب مجلد شکل میں پیغمبر پر اترنی چاہئے۔ اسی سے ملتی جلتی باتیں قریش نے بھی شاید اہلِ کتاب سے سیکھ لی تھیں۔ انہیں میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ "اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہمیں بھی اسی جیسی نہ ملے جیسی اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو ملی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت سے کس کو سرفراز کرے۔"

كَلَّا ۗ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾

(ہرگز نہیں، بلکہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ۵۳)

Marfat.com

مشرکین کا اصل مرض

گزشتہ آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی نبوت اور قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے کیلئے شرط رکھی کہ جس طرح کی آیات اور سورتیں آنحضرت ﷺ پر نازل ہو رہی ہیں جب تک ہم پر نازل نہ کی جائیں ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کے مطالبے کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ جو کچھ وہ مطالبہ کر رہے ہیں اسے کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ ان کے انکار کی اصل علت نہیں۔ یہ تو محض ایک بہانہ ہے۔ ان کا ایک مطالبہ تسلیم کر لیا جائے تو دوسرا پیش کر دیا جائے گا۔ پھر دوسرے کے بعد تیسرا۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ ان کے انکار کا سبب درحقیقت یہ ہے کہ وہ آخرت کے آنے کی امید نہیں رکھتے۔ "یخافون" یرجون کے معنی میں قرآنِ کریم میں متعدد مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ ممکن ہے یہاں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہو۔ یعنی ان کے ایمان نہ لانے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ قیامت اور آخرت کے آنے کی امید نہیں رکھتے۔ اور اگر یخافون کو خوف کے معنی میں لیا جائے جب بھی صحیح ہے کہ وہ ایمان اس لئے نہیں لاتے کہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ قیامت کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ تو پھر اس سے ڈر کا کیا مطلب۔ یہ درحقیقت ان کے بگاڑ اور ایمان نہ لانے کا اصل سبب ہے۔ اسی تصور نے ان کی زندگی کو غیر سنجیدہ بنا رکھا ہے۔ وہ جزاء وسزا کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے سوچنا گوارا نہیں کرتے۔ جس آدمی کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ موت دنیوی زندگی کے خاتمے کا نام ہے، اس کے بعد دوسری کوئی زندگی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کیلئے حاضری محض ایک افسانہ ہے۔ انسان کی کامیابیاں اور ناکامیاں دنیوی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جو یہاں کامیاب ہے، وہی کامیاب ہے۔ جو یہاں ناکام ہے، وہی حقیقت میں ناکام ہے۔ ایسے شخص کو حقوق وفرائض کے حوالے سے، نیک وبد کے تصور سے، جوابدہی کے احساس سے، اعمال کی جزاء وسزا سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ دنیا میں نچنت ہو کر زندگی گزارتا ہے اور اسی طرح دنیا سے چلا جانا چاہتا ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ انسانی زندگی میں تبدیلی آئے، انسان دوسروں کیلئے ہمدرد وغمگسار بنے، حقوق وفرائض کا احساس اس کے اندر پیدا ہو، ہر عمل سے پہلے جزاء وسزا کی فکر کرے۔ اس کیلئے لازمی ہے کہ اس کے دل ودماغ میں آخرت کا خوف اتارا جائے۔ اس کے سوا انسانی اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اور یہ لوگ چونکہ آخرت کے تصور کو رد کر چکے ہیں اس لئے وہ ایسے نبی اور ایسی کتاب پر کیسے ایمان لانے کی زحمت کر سکتے ہیں جو انہیں ذمہ داریوں سے گراں بار کرتی اور جزاء وسزا کے تصور سے زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیتی ہے۔

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾

(ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ ۵۴) تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔ ۵۵)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو تسلی

یہ مخالفین سے اظہارِ بے نیازی اور نبی کریم ﷺ کیلئے تسلی ہے کہ آپ ان لوگوں کی ہرگز پرواہ نہ کریں، یہ اگر ایمان نہیں لاتے تو زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایک یاددہانی اور نصیحت ہے جس سے انہیں آگاہ کردیا گیا ہے۔ ان میں سے جو چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور سیدھی راہ اختیار کرے۔ اور اگر وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو خود اس کا انجام بھگتیں گے۔ آپ کا کام انہیں نصیحت کرنا اور ان کے انجام سے انہیں باخبر کرنا ہے تاکہ جب یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں تو یہ عذر نہ کرسکیں کہ ہمارے پاس کوئی منذر نہیں پہنچا۔ یہ فرض آپ ادا کرچکے، اب اس کے ردوقبول کی ذمہ داری ان پر ہے۔

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

(اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے، وہی ہے جس سے ڈرنا چاہئے اور وہی ہے بخشنے کے لائق۔ ۵۶)

ہدایت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت وضلالت کے باب میں اس نے پسند فرمائی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کا نصیحت حاصل کرنا سراسر اس کی اپنی مشیت پر موقوف نہیں، بلکہ اسے نصیحت اس وقت نصیب ہوتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہ ہو کہ وہ اسے نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ اور اللہ تعالیٰ ہدایت انہی کو بخشتا ہے جو اپنے سمع وبصر اور فواد کی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں جو فطرت کے نور کی قدر کرتے ہیں، آفاق وانفس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔ اور ہر اس بات کو سننے اور سمجھنے کیلئے اپنے کان کھلے رکھتے ہیں جو معقول ہو۔ اگرچہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے کتنے ہی خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ہر مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے، وہ انہیں کو ہدایت بخشتا ہے جو ہدایت کی قدر کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو اس کی قدر نہیں کرتے، ان کو ہدایت دینا تو درکنار، اللہ تعالیٰ ان کی وہ صلاحیت بھی سلب کرلیتا ہے جو فطرت کی راہ سے ان کو حاصل ہوئی ہوتی ہیں۔

وہی اہلِ تقویٰ ہے اور وہی اہلِ مغفرت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس کی نافرمانی سے بچا جائے۔ اور وہی ایسی ذات ہے جو بڑے سے بڑے مجرم گناہگار کو اس کے سب گناہ جب چاہتی ہے بخش دیتی ہے۔ یعنی اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ کسی نے خواہ اس کی کتنی ہی نافرمانیاں کیں، جس وقت بھی وہ اپنی اس روش سے باز آجائے، اللہ تعالیٰ اپنا دامنِ رحمت اس کیلئے کشادہ کردیتا ہے۔ اپنے بندوں کیلئے کوئی جذبۂ انتقام وہ اپنے اندر نہیں رکھتا۔

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃِ

(۷۵)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْقِيٰـمَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْقِيٰـمَةِ ہے۔ یہ نام اس سورۃ کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس سورۃ کا عنوان بھی ہے۔ کیونکہ اس میں قیامت ہی پر بحث کی گئی ہے۔

زمانۂ نزول:۔ سورۃ کے مندرجات اور ذخیرۂ احادیث سے ایسی کوئی واضح بات نہیں ملتی جس سے اس سورۃ کا زمانۂ نزول متعین کیا جاسکے۔ البتہ اس سورۃ کے مضمون میں ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سورتوں میں سے ہے جو آنحضرت ﷺ کی نبوت کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئیں۔ وہ داخلی شہادت یہ ہے کہ اس سورۃ میں قیامت کا ذکر جاری ہے کہ آیت پندرہ کے بعد سلسلۂ کلام کو روک کر جملۂ معترضہ کے طور پر چار آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو کچھ ہدایات دی گئی ہیں جن کا تعلق اخذ واستماعِ وحی سے ہے۔ آپؐ کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جس وقت آپ پر قرآنِ کریم کا نزول ہو رہا ہو تو آپ اس خیال سے ساتھ ساتھ جلدی جلدی پڑھنے کی کوشش نہ کریں کہ کہیں قرآنِ کریم کی کوئی آیت میرے حافظہ سے رہ نہ جائے۔ قرآنِ کریم کو جمع کرنا، اسے پڑھانا اور پھر اسے بیان کرنا یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ خاموشی سے سنتے رہیں، کوئی لفظ آپ سے چھوٹنے نہیں پائے گا اور نہ اس کے سمجھنے میں آپ کو کوئی دشواری پیش آئے گی۔ اس ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب آنحضرت ﷺ کو نزولِ وحی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا تھا اور ابھی آپ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اچھی طرح نہیں پڑی تھی۔ تو یہ ہدایت گویا قرینہ ہے اس بات کا کہ یہ سورۃ ان سورتوں میں سے ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

(آیت ایک سے چھ تک) قسموں کی صورت میں وقوعِ قیامت پر دلائل قائم کئے گئے ہیں۔ اور نفسِ لوامہ کو داخلی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مشرکین کا یہ اعتراض کہ جب ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں گی تو از سرِ نو زندہ کیا جانا کیسے ممکن ہوگا، اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کی بھی خبر دی گئی ہے کہ قیامت کے منکرین کا اصل مرض کیا ہے۔

(آیت سات سے پندرہ تک) قیامت کیلئے جلدی مچانے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب قیامت کی ہولناک صورتحال پیدا ہوگی اور ہر چیز تہ و بالا ہو جائے گی تو ہر انسان چیخے گا اور بھاگا پھرے گا لیکن کوئی جائے پناہ نہ پاسکے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے سوا کوئی اور ٹھکانہ نہ ہوگا۔ ہر شخص سے ایک ایک عمل کی پرسش کی جائے گی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ ان کا ضمیر خود ان پر گواہی دے رہا ہے۔ وہ اپنے رویئے کیلئے ہزار عذر تراشیں لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ حقیقت کیا ہے۔

Marfat.com

(آیت سولہ سے انیس تک) آنحضرت ﷺ کو اخذِ وحی کی ہدایات دی گئیں اور آپ جس اندیشے سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش فرماتے تھے اس اندیشے سے آپ کو اطمینان دلایا گیا۔ اور قرآنِ کریم کی جمع وترتیب، حفاظت وصیانت اور اس کی توضیح وتبیین کی ذمہ داری اپنے سر لے کر آپ کو یکسو کر دیا گیا ہے۔

(آیت بیس سے پچیس تک) منکرینِ قیامت کے اصل مرض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ آخرت کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اس دن کی کیفیت کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ بہت سے چہرے شاداب اور اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے۔ اور بہتوں کے چہرے بگڑے ہوئے اور یہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔

(آیت چھبیس سے چالیس تک) قیامت کے منکرین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہیں دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ موت ہر ایک کے تعاقب میں ہے۔ سب کو جانکنی سے سابقہ پیش آنا ہے۔ نہایت بے بسی کے عالم میں اپنے رب کے حضور حاضر ہونا ہے۔ حقیقی بدقسمت وہ شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور نہ نماز پڑھی۔ بلکہ جب اس کو یاددہانی کی گئی تو نہایت رعونت سے منہ موڑ کر اپنے لوگوں میں چل دیا۔ انسان کے تمرد اور رعونت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جس پروردگار نے انسان کو منی کے ایک قطرہ سے وجود بخشا اور اس کا تسویہ کر کے گوناگوں صفات سے اس کو آراستہ کیا۔ اس کے مرکھپ جانے کے بعد از سر نو اٹھا کھڑا کرنا اللہ تعالیٰ کیلئے کیا مشکل ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ۲	سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ (۷۵)	اٰيَاتُهَا ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴿۱﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿۲﴾ اَيَحْسَبُ
الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ
بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ
الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿۷﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿۸﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ
وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾
اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ
وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى
مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ
وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾
كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ
نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ
اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ
رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى

Marfat.com

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ ع

رکوع: ۱۔ (نہیں، میں قسم کھاتا ہوں، قیامت کے دن کی۔ ۱) اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ ۲) کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے۔ ۳) کیوں نہیں، ہم اس کے پور پور کو ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ ۴) بلکہ انسان چاہتا ہے کہ وہ آئندہ بھی فسق و فجور کرتا رہے۔ ۵) وہ پوچھتا ہے آخر قیامت کا دن کب ہوگا؟ ۶) پس جب نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ ۷) اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ ۸) اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔ ۹) تو اس وقت انسان کہے گا کہاں بھاگ کر جاؤں۔ ۱۰) ہرگز نہیں، کوئی پناہ نہیں۔ ۱۱) اس دن تیرے رب ہی کی طرف ٹھکانہ ہوگا۔ ۱۲) اس دن انسان کو بتا دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا ہے اور جو پیچھے چھوڑا ہے۔ ۱۳) بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے۔ ۱۴) اگرچہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔ ۱۵) اے نبی، اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کیلئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے۔ ۱۶) ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو پڑھوا دینا۔ ۱۷) تو جب ہم اس کو پڑھ چکیں تو آپ اس کی پیروی کریں۔ ۱۸) پھر اس کی وضاحت کر دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ ۱۹) ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو۔ ۲۰) اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔ ۲۱) کتنے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ ۲۲) اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ ۲۳) اور کتنے چہرے اس دن اداس ہوں گے۔ ۲۴) اور گمان کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے۔ ۲۵) ہرگز نہیں جبکہ جان ہنسلی میں آ پھنسے گی۔ ۲۶) اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا۔ ۲۷) اور آدمی سمجھ لے گا کہ یہ دنیا سے جدائی کا وقت ہے۔ ۲۸) اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ ۲۹) اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہوگا۔ ۳۰)

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰـمَةِ ﴿۱﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿۲﴾

(نہیں، میں قسم کھاتا ہوں، قیامت کے دن کی۔ ۱) اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ ۲)

قسم سے پہلے ''لا'' کا استعمال

قسم سے پہلے ''لا'' کا استعمال ایک خاص اسلوب ہے جس کی ہم اس سے پہلے متعدد مقامات پر وضاحت کر چکے ہیں۔ ''لا'' نہ یہاں زائد ہے اور نہ فعلِ قسم کا حصہ ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے سے ایک بات چل رہی ہے۔ متکلم اس کی تردید دلیل کے ساتھ کرنا چاہتا ہے لیکن دلیل دینے سے پہلے وہ ''لا'' کے استعمال سے اس بات کی نفی کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کی بات اس حد

Marfat.com

تک غلط ہے کہ وہ دلیل پیش کرنے سے پہلے اس کی تردید ضروری سمجھتا ہے اور بعد میں دلیل دے کر اپنی بات کو مستحکم کرتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ آپ جس کسی شخص کی بات کی فوری تردید چاہتے ہیں تو کہتے ہیں نہیں۔ خدا کی قسم اصل حقیقت اس طرح ہے۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کی بات کی لغویت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کے سامنے اسلام کے بنیادی حقائق اور عقائد کو واضح کرتے ہوئے قیامت پر یقین کو لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ لیکن مخالفین کی جانب سے نہ صرف اسے قبول کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے بلکہ مذاق اڑایا جا رہا ہے اور نہایت غیر معقول قرار دیتے ہوئے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ ان کی اس روش کی تردید کیلئے قرآنِ کریم کی یہ سورۃ نازل ہوتی ہے جس میں ''لا'' لا کر سب سے پہلے ان کی روش اور ان کے طرزِ عمل کی تردید کی گئی ہے کہ تم نے قیامت کے انکار کو جس طرح اپنا طرزِ عمل بنالیا ہے یہ بات سراسر غلط اور لغو ہے۔ اس کے بعد قسم کھا کر قیامت کی قطعیت کو واضح کیا گیا ہے۔

مقسم علیہ کے ذکر نہ کرنے کی وجہ

ہم اس سے پہلے بھی یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ عربی زبان میں قسم بعض دفعہ دلیل کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور جوابِ قسم کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے جسے مقسم علیہ بھی کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے قیامت کی قسم کھائی گئی ہے لیکن مقسم علیہ کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ یہاں قسم خود مقسم علیہ پر دلیل ہے۔ قرآنِ کریم میں اور بھی متعدد مواقع پر قسموں کے ساتھ مقسم علیہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ مثلاً ص والقرآن ذی الذکر اور ق والقرآن المجید ان دونوں قسموں میں مقسم علیہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس سے مقصود مخاطب پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ جس چیز کی تردید یا تکذیب کر رہا ہے وہ خود اپنی صداقت پر ایسی شاہد ہے کہ اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں بھی یومِ قیامت کی قسم کھا کر یہ تصور دینا مقصود ہے کہ قیامت کی قطعیت اور اس کی عظمت بجائے خود ایک محکم اور واضح دلیل ہے کیونکہ کائنات کا نظام اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔ اس کے تغیرات اور اس کے نظام کی نوعیت خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ یوں تو انسان کی عقل کبھی بھی اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ وہ اس کائنات کو قدیم اور غیر فانی سمجھے۔ لیکن سائنس کی ترقی نے رفتہ رفتہ اس بات کو ایک امر واقعی بنا دیا ہے کہ اس ہنگامۂ ہست و بود کی ایک ابتداء ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ کائنات کے وہ کرّے اور وہ مظاہرِ قدرت جسے انسان نے ہمیشہ بہت مستحکم سمجھا ہے سائنسدان آہستہ آہستہ ان کے زوال پذیر ہونے کا یقین پیدا کر رہے ہیں۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر قیامت ہی کی قسم کھائی ہے۔ اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکی انسان کو جو اپنے موجود ہونے پر ہی شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمہاری جان کی قسم تم موجود ہو۔ یعنی تمہارا وجود خود تمہارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ...... قیامت کی قسم سے صرف اتنی بات واضح ہوتی ہے کہ یہ نظامِ کائنات ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس کے درہم برہم ہو جانے کے بعد پھر کیا ہوگا اور کیا واقعی انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کے اعمال کا حساب ہوگا۔ اور انسان جزاء و سزا کے مرحلے سے گزرے گا۔ اس کیلئے نفسِ لوامہ کی قسم کھائی گئی ہے۔

Marfat.com

قرآن کریم نے نفسِ انسانی کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ نفس جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے اس کا نام نفسِ امارہ ہے۔ دوسرا وہ نفس جو غلط کام کرنے، غلط سوچنے یا بری نیت پر نادم ہوتا ہے۔ اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ لوامہ ہے۔ تیسرا وہ نفس جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے پر اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔

نفسِ لوامہ کی قسم کا بھی مقسم علیہ مذکور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقسم علیہ خود قسم کے اندر ہی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر نفسِ لوامہ کا وجود شاہد ہے کہ قیامت حق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نفسِ لوامہ کی حقیقت کیا ہے۔ صاحب تدبر قرآن نے اس پر جو نوٹ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس سے استفادہ کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

نفسِ لوامہ کی حقیقت

نفسِ لوامہ سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفسِ انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تخلیق اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت فرمایا ہے اور اس کی سعادت و شقاوت کے لئے ضابطہ یہ ٹھہرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہوگا۔ سورۃ شمس میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس ۹۱: ۷-۱۰) "اور شاہد ہے نفس اور اس کی تخلیق، پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا وہ نامراد ہوا۔"

اپنی تخلیق کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفسِ امارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نفس کے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ فرمایا:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ (یوسف ۱۲: ۵۳) "اور میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا بے شک نفس تو بدی کی راہ سجھانے والا ہے۔"

لیکن یہ نفس نیکی کا شعور بھی رکھتا ہے اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اس وقت تک وہ اپنے کو بھی اگر اس سے کوئی برائی صادر ہو جاتی ہے، ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفسِ لوامہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توازن کو قائم رکھنے کی تدبیر

نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روزِ جزا و سزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اس کی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپر انداز ہو جائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفسِ لوامہ اس کو فوراً ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ

Marfat.com

انابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفسِ مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تربیتِ نفس کا سب سے اونچا مرتبہ یہی ہے جس کو حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعہ سے جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اسی نفس کو آخرت میں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کا مقام حاصل ہوگا جو نفسِ انسانی کی معراج ہے۔

بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر روزِ اول سے ودیعت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے حسد سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل تو کر دیا لیکن قتل کر دینے کے بعد اس کی لاش کو چھپانے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش ظاہر ہے کہ اسی وجہ سے اسے کرنی پڑی کہ اس کے گناہ ہونے کا اسے احساس ہوا۔ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو اس کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر ہی کرتا ہے۔ اگر اس گناہ کے معاملے میں وہ اپنے نفس کو الاؤنس بھی دیتا ہے تو یہ بھی اپنی فطرت کے خلاف دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو برائی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ بروں کے ضمیر کو ٹٹولئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر بھی احترام اور عزت نیکی ہی کیلئے ہے۔ اگرچہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ انسان نے جب سے معاشرتی و اجتماعی زندگی کی کوئی شکل اختیار کی ہے اس کے اندر اس نے حق و انصاف کے قیام کیلئے لازماً ایک نظام بھی قائم کیا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض برائیوں نے معاشرے پر ایسا غلبہ پا لیا ہے کہ نیکیاں ان کے نیچے دب گئی ہیں، لیکن معاشرے کا مجموعی ضمیر اس پر کبھی راضی نہیں ہوا بلکہ اس کے اندر ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے معاشرے کے اندر وہی فریضہ انجام دیا ہے جو صحیح الفطرت انسان کے اندر اس کا نفسِ لوامہ انجام دیتا ہے۔ اگر معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے یعنی نیکی کی کوئی رمق سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے تو قانونِ قدرت نے اس معاشرے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔

چند سوال اور ان کے جواب

اب سوال یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے صادر ہو جانے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے، تو اس کیلئے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شترِ بے مہار ہے، جس طرح کی زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگران کی مخالفت کرے لیکن کوئی اس سے باز پرس کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ اگر انسان شترِ بے مہار ہے تو یہ نفسِ لوامہ اس کے اندر کہاں سے آگھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کیلئے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے

Marfat.com

عالم کیلئے وہ ایک ایسی عدالت کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمالِ خیر وشر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزاء وسزا دے؟ ان سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا۔ وہ ان کا یہی جواب دے گا کہ بے شک انسان کا اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر وشر کے شعور کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ وہ شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کیلئے لازماً ایک پرسش کا دن آنے والا ہے جس میں اس کو اس کی بدیوں کی سزا ملے گی اگر اس نے یہ بدیاں کمائی ہوں گی اور نیکیوں کا صلہ ملے گا اگر اس نے نیکیاں کی ہوں گی۔ اسی دن کی یاددہانی ہی کیلئے خالق نے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تاکہ انسان اس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک کر اس کی تصویر دیکھ لے۔ یہی حقیقت حکماء اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر اس عالم اکبر کا پورا عکس موجود ہے، اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت سب کو پہچان لیتا ہے۔ سقراط کا مقولہ مشہور ہے کہ ''اے انسان! تو اپنے کو پہچان!''

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝۳ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝۴

(کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے۔ ۳) کیوں نہیں، ہم اس کے پور پور کو ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ ۴)

منکرین کا اعتراض اور اس کا جواب

سابقہ دو آیتوں میں قسموں کی صورت میں جو دو دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان سے صرف دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ دنیا کا خاتمہ ایک یقینی امر ہے اور یہ قیامت کا پہلا مرحلہ ہے۔ اور دوسرا یہ کہ انسان چونکہ ایک اخلاقی وجود رکھتا ہے اس کا منطقی اور فطری تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن ضرور آئے جہاں نیک اعمال کی جزاء ملے اور برے اعمال پر سزا ملے۔ کیونکہ یہ انسان کے ضمیر کی آواز اور اخلاق کا تقاضا ہونے کی وجہ سے عدل کی پکار ہے۔ اب اس تیسری آیتِ کریمہ سے منکرینِ قیامت جو وقوعِ قیامت کو خلافِ عقل سمجھتے تھے ان کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ موت ہمیشہ کی زندگی کا نام نہیں بلکہ اس کے بعد بھی زندگی ممکن ہے۔ اور تم اس پر جو اعتراضات کرتے ہو ان میں کوئی معقولیت نہیں۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انسانی آبادی پر ہزاروں سال گزر چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں سال سے انسان موت کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان ہزاروں سالوں میں مرنے والے کہاں کہاں دفن ہوئے اور کس کس طرح موت کا شکار ہوئے، جل کر، سمندر میں غرق ہو کر یا درندوں کی چیرہ دستی کے نتیجے میں انہیں قبر بھی نصیب ہوئی یا نہیں۔ اور اگر وہ کہیں دفن ہوئے تو یقیناً ان کے اجسام کا ذرہ ذرہ خاک میں مل کر پراگندا ہو چکا اور ہڈیاں بوسیدہ ہو کر نہ جانے کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سب ایک دن زندہ کئے جائیں گے اور وہ اپنے جسموں کے ساتھ ایک ایسی عدالت میں پیش ہوں گے جہاں ایک ایک عمل کا حساب ہوگا۔ اندازہ کیجئے عقل کے اعتبار سے یہ بات کیونکر ممکن ہو سکتی ہے؟

Marfat.com

اس مختصر سے جملے میں پروردگار نے ان کے اس اعتراض کا نہایت زوردار جواب دیا ہے کہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے۔ غور کرو کہ اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمہارے منتشر اجزائے جسم یا مٹی کی صورت اختیار کر جانے والے اجسام خود بخود جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اس جسم کے ساتھ جی اٹھو گے تو بلاشبہ تمہارا اس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو یہ بات کہی گئی ہے کہ تمہارا خالق و مالک جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہ ہزاروں سال کے بعد تمہیں از سر نو زندہ کرے گا تو تمہیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ پروردگار جو اس کائنات کا خالق ہے اور تمہارا بھی خالق ہے وہ اس کام سے عاجز ہے تو سوال یہ ہے کہ تمہیں اس نے کیسے تخلیق کر دیا، کائنات کیسے بنا دی، سورج چاند کیسے پیدا کر دیئے، زمین و آسمان کو وجود کیسے دے دیا، پانی کے ایک حقیر قطرے سے تمہیں کس نے پیدا کیا پھر پیٹ میں خون پی کر کیسے زندہ رہے ہو، کس نے تمہیں ایک خوبصورت شکل دے کر دنیا میں آنے کے قابل بنایا، پھر مہد سے لحد تک تمہاری زندگی کو حواس اور عقل کس نے عطا کئے، تمہارے اندر تجسس، تخلیق اور ایجاد کی قوت کس نے پیدا کی، تمہارے چند فٹ کے جسم میں وہ صلاحیت کس نے رکھ دی جس کے سامنے پہاڑ بھی جھک جاتے، دریاؤں کے رخ تبدیل ہو جاتے اور ناممکنات ممکن شکل اختیار کر لیتے ہیں؟ اگر یہ سب کچھ تمہیں اسی خالق و مالک نے دیا ہے تو آخر وہ تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر کیوں قادر نہیں۔

مزید فرمایا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم تمہاری ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکیں گے حالانکہ ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمہارے نازک ترین اجزائے جسم حتیٰ کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں تک کو بھی ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ پہلے تھیں۔ پوروں کا ذکر شاید ان کی نزاکت کی وجہ سے کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انگوٹھے کی پور پر کھینچے گئے خط اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حیرت انگیز شاہکار ہیں۔ ماہرین یہ کہتے ہیں کہ اربوں کھربوں انسان پیدا ہو چکے لیکن کسی انسان کے انگوٹھے کے خطوط دوسرے انسان سے نہیں ملتے۔ اسی لئے دستاویزی ثبوت میں آج تک ان کا استعمال مروج ہے۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۚ ۝۵

(بلکہ انسان چاہتا ہے کہ وہ آئندہ بھی فسق و فجور کرتا رہے۔ ۵)

منکرینِ قیامت کا اصل مرض

منکرینِ قیامت کی طرف سے وقوعِ قیامت پر اعتراض کرنا اور اسے بعید از امکان قرار دینا محض اس بنا پر کہ ہزاروں سال میں مرنے والے لوگوں کی ہڈیاں جمع کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے، اس کا جواب دینے کے بعد فرمایا کہ منکرین کے اس طرح کے اعتراضات درحقیقت سخن سازی کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ ان سخن سازیوں کے پردے میں اپنا اصل مرض چھپانا چاہتے ہیں۔ وہ دراصل اپنی خواہشوں کے غلام بن چکے ہیں اور آخرت کے ماننے کی صورت میں وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کچھ اخلاقی پابندیاں قبول کرنا پڑیں گی اور یہ ان کی متداول زندگی میں ممکن نہیں۔ وہ جس فسق و فجور کے عادی ہو گئے ہیں اس میں اخلاقی پابندیوں کا قبول کرنا ان کیلئے ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ فسق و فجور کو آزادی اس وقت تک ممکن ہے جب تک انسان یہ سمجھتا رہے کہ مجھے شتر بے مہار کی طرح زمین پر بھیجا گیا ہے جو میرے جی میں آئے اور جو میری ہوائے نفس چاہے میں اسے کرنے میں آزاد ہوں۔ کوئی مجھ سے پوچھنے والا نہیں۔ اس نفس کی آزادی میں اس وقت تک زندگی گزرتی رہے گی جب تک کہ موت اس کا خاتمہ نہ کر دے۔ اگر وہ آخرت کو قبول کر لیتے ہیں تو زندگی کے بارے میں ان کے تصورات اپنی موت آپ مر جاتے ہیں جبکہ وہ اپنا

Marfat.com

رو یہ بدلنے پر کسی طرح بھی تیار نہیں۔ چنانچہ جب بھی ان کے سامنے آخرت کی بات آتی ہے تو وہ اس کا انکار اس لئے نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک اس کا وقوع ممکن نہیں بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اپنے فسق و فجور اور بدکرداریوں کی آزادی کو کھونا نہیں چاہتے۔

جو کچھ کہا گیا ہے یہ اس صورت میں ہے کہ اگر اَمَامَهٗ کا ترجمہ آگے کی زندگی اور آئندہ کی زندگی کیا جائے۔ لیکن بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ کیا ہے، اپنے نفسِ لوامہ کے سامنے، یا اپنے ضمیر کے روبرو۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر اس کا ترجمہ آئندہ زندگی کیا جائے تو نفسِ لوامہ کی شہادت سے اس کا تعلق واضح نہیں ہوتا۔ جبکہ قیامت کی سب سے بڑی شہادت انسان کے اندر نفسِ لوامہ کا ہونا ہے۔ تو جو شخص فسق و فجور کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ دراصل اپنے ضمیر یا اپنے نفس لوامہ کی تردید و تکذیب کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ان اہلِ علم نے قیامت اور نفسِ لوامہ کو وقوعِ قیامت پر دلائل قرار دے کر اَمَامَهٗ کا تعلق اسی سے جوڑا ہے جبکہ جمہور اہلِ علم کا کہنا یہ ہے کہ قیامت کی قسم سے قیامت کا پہلا مرحلہ ثابت کرنا مقصود ہے۔ اور نفسِ لوامہ کی قسم سے دوسری زندگی پر شہادت قائم کی گئی ہے کیونکہ نفسِ لوامہ کے وجود سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں بلکہ اپنا ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے۔ اس کا لازمی فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جہاں تمام اعمال کا حساب کتاب ہو اور ان پر جزاء و سزا کا ترتب ہو۔ تیسری آیت کا تعلق نفسِ لوامہ سے نہیں بلکہ منکرینِ قیامت کے اعتراض سے ہے جس کی بنیاد یہ ہے کہ ہزاروں سالوں میں مرنے والے لوگوں کے اجزائے جسم کیسے جمع کئے جا سکتے ہیں؟ اور جب جمع نہیں ہو سکتے تو انہیں زندہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس لحاظ سے قیامت کا وجود سراسر خلافِ عقل اور بعید از امکان ہے۔ اسی سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ درحقیقت یہ معترضین خود بھی سمجھتے ہیں کہ ان کے اعتراضوں میں کوئی جان نہیں۔ لیکن وہ اس سخن سازی کے پیچھے اپنا اصل مرض چھپانا چاہتے ہیں اور ان کا اصل مرض یہ ہے کہ وہ ہوائے نفس کے تابع ہو چکے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ شترِ بے مہار کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس وضاحت کو اگر سامنے رکھا جائے تو پھر اَمَامَهٗ کا ترجمہ ''آئندہ زندگی'' زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ۝٦

(وہ پوچھتا ہے آخر قیامت کا دن کب ہوگا؟ ٦)

وہ اپنا اصل مرض چھپانے کیلئے طریقِ اعتراض کو چھوڑ کر استہزاء کے طریقے کو اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جو آپ ہمیں قیامت کے آنے کی خبر دیتے رہتے ہیں تو آخر وہ کب آئے گی؟ اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی۔ ہم اس کے ڈراوے سنتے سنتے تو تھک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا اور نہ آئی۔ اب ہم ان ڈراووں سے مرعوب ہونے والے نہیں۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝٧ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝٨ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝٩
یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝١٠

(پس جب نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ ٧) اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ ٨) اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔ ٩) تو اس وقت انسان کہے گا کہاں بھاگ کر جاؤں۔ ١٠)

Marfat.com

قیامت کا منظر نامہ

منکرینِ قیامت کا یہ مطالبہ کہ قیامت کب آئے گی، چونکہ سراسر ایک احمقانہ مطالبہ تھا اس لئے اس سے تعرض نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اگر یہ بتا دیا جاتا کہ قیامت کے آنے میں ابھی صدیاں باقی ہیں تو کوئی اس کی تیاری کیلئے فکرمند نہ ہوتا۔ اور اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ اتنے عرصے کے بعد آرہی ہے تو اس کے امتحان ہونے کی کیفیت ختم ہو جاتی۔ جن چیزوں کو امتحان بنایا گیا ہے ان کے متعین وقت نہ بتائے جانے کی یہی حکمت ہے کہ انسانوں کے دلوں کی کیفیت آزمائی جائے اور لوگوں میں فکرمندی کا احساس پیدا کیا جائے۔ چنانچہ وقت بتائے بغیر یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ اگر تمہیں یقین ہے قیامت کے آنے کا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ آج آتی ہے یا صدیوں بعد۔ کیونکہ جب بھی آئے گی تمہاری تمام زندگی کا ایک ایک عمل اس دن حساب کے ترازو میں رکھا جائے گا۔ اور موت کے بعد کی زندگی تمہارے لئے بالکل ایسی ہوگی جیسے آدمی اپنے معمول کی نیند سے اٹھتا ہے۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ جلدی آتی ہے یا دیر سے آتی ہے۔ اصل بات جو جاننے کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ جب آئے گی تو اس کی ہولناکی کا عالم کیا ہوگا۔ چنانچہ اسی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس دن نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تیز روشنی کی وجہ سے آنکھیں کھل نہیں پائیں گی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس دن کی ہیبت، ہولناکی اور وحشت کا عالم یہ ہوگا کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی، دیدے پتھرا جائیں گے، ہر شخص پھٹی پھٹی نگاہوں سے ٹک ٹک ہو کر ایک ہی طرف دیکھتا چلا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْاَبْصَارُ ''اللہ تعالیٰ انہیں ٹال رہا ہے اس دن کیلئے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔'' چاند گہنا جائے گا، یعنی بالکل بے نور ہو جائے گا۔ سورج اور چاند ایک ہی محور اور مدار میں جا پڑیں گے۔ یعنی صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہیں ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے بلکہ خود سورج بھی تاریک ہو جائے گا۔ ممکن ہے زمین کو الٹا چلا دیا جائے اور چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طلوع ہوتے دکھائی دیں۔ ان باتوں کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس لئے یقین سے کوئی ایک مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا۔ آج کے باتیں بنانے والے اس دن خوفزدگی کے عالم میں پناہ ڈھونڈتے پھریں گے اور کوئی پناہ نہیں ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیامت کے پہلے مرحلے کا بیان ہے جس میں نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور ایسی ہلچل مچے گی کہ کوئی کرّہ اپنی جگہ ٹھہر نہیں سکے گا۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ ان اعتراض کرنے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم میں اگر عقل کا کوئی شائبہ بھی ہے تو اس سے پناہ مانگو، اور بجائے مذاق اڑانے کے اس کی آفتوں اور مصائب سے بچنے کی کوئی سبیل پیدا کرو۔

كَلَّا لَا وَزَرَ ⑪ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨ الْمُسْتَقَرُّ ⑫

(ہرگز نہیں، کوئی پناہ نہیں۔ ۱۱) اس دن تیرے رب ہی کی طرف ٹھکانہ ہوگا۔ ۱۲)

گزشتہ آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے پہلے مرحلے میں جب ہر چیز درہم برہم ہو جائے گی تو پریشانی کا عالم یہ ہوگا کہ انسان بھاگے پھریں گے اور چیختے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ اب بھاگ کر کہاں جائیں۔ کوئی جائے پناہ معلوم ہو تو ہمیں بھی اس کی خبر دو۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہرگز نہیں، اب کہیں کوئی جائے پناہ نہیں۔ اب تو تمہارا ٹھکانہ صرف تمہارے رب کے پاس ہے۔ اور تم اپنے رب کو اپنے کرتوتوں سے ناراض کر چکے ہو۔ تمہیں آج کے دن کا ویسے ہی انکار تھا۔ سمجھانے والے نے خونِ جگر پی پی کر تمہیں سمجھایا۔ تمہاری بدزبانیوں کے زخم سہے، اس کی غمگساری میں کبھی کمی نہ آئی۔ لیکن تمہاری سنگدلی کی یہ انتہا تھی کہ تم نے اس کی ہر بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تو آج تمہیں جائے پناہ کہاں سے ملے۔

Marfat.com

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾

(اس دن انسان کو بتا دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا ہے اور جو پیچھے چھوڑا ہے۔ ۱۳)

قیامت کا مقصد

اس جامع فقرے میں قیامت کے آنے کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کا آنا کوئی رسمی کارروائی نہیں بلکہ انسان کی اخلاقی زندگی کا تقاضا اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا اظہارِ کامل ہے۔ یوں تو اس فقرے کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں لیکن جو بات خود بخود اس جملے سے نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان کے اعمال جو اس نے زندگی میں انجام دیئے وہ ان کے نتائج سمیت اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔ اس نے جو نیکیاں کیں وہ بھی اس کے سامنے آجائیں گی اور جو برائیاں کیں اس کی تفصیل بھی اس کے سامنے رکھ دی جائے گی۔ اور جن نیکیوں سے منہ موڑا ان کے نتائج بھی واشگاف کر دیئے جائیں گے۔ اور جن نیکیوں کے انجام دینے کی کوشش کی لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا اس کا نتیجہ بھی کھول دیا جائے گا۔ اور جن برائیوں کے ارتکاب کے اسباب فراہم کیے لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت نے راستہ روک دیا اور وہ برائیاں وجود پذیر نہ ہو سکیں ان کے اثرات بھی واضح کر دیئے جائیں گے۔ جب اس طرح زندگی بھر کا روزنامچہ اپنے نتائج سمیت سامنے آجائے گا تو کافر کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اس کا ایک ایک دن کفر کی تاریکی سے تاریک اور شرک کی آلودگیوں سے آلودہ ہے۔ اس میں نہ کہیں توحید کا نور جھلکے گا اور نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طلبگاری جو قیامت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے اپنا اظہار کرے گی۔ تو کافر یہ صورتحال کا دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیں گے کہ کاش ہم نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی بات مانی ہوتی اور آج کے دن سے انحراف نہ کیا ہوتا تو آج ہم اس تباہ کن صورتحال سے دوچار نہ ہوتے۔

قَدَّمَ وَاَخَّرَ کا مفہوم بھی بالکل واضح ہے کیونکہ انسان کو آخرت میں کامیابی کیلئے بہت سے نیک اعمال سرانجام دینے پڑتے ہیں اور بہت سے برے اعمال چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اور یہی وہ سرمایہ ہے جو انسان کیلئے زادِرہ بنتا ہے اور انسان اسے آگے بھیجتا ہے۔ لیکن جو شخص آخرت سے منحرف اور دنیا ہی کو اپنی منزل سمجھتا ہے وہ کرنے والے کاموں کے تو کبھی قریب نہیں جاتا۔ البتہ جو کام آخرت میں تباہی کا باعث بننے والے ہیں انہیں کا ذخیرہ جمع کرنے میں زندگی گزار دیتا ہے اور انہیں کو وہ حاصلِ زندگی سمجھتا ہے۔ یہ ہیں وہ اعمال جو وہ پیچھے چھوڑ کے جاتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں طرح کے اعمال کو قیامت کے دن نتائج سمیت اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جن کاموں کا اس نے ارتکاب کیا وہ تو اعمال کی صورت میں اس کے سامنے ہوں گے لیکن جن برائیوں کا وہ ارتکاب کرنا چاہتا تھا حالات کی نامساعدت نے اسے سرانجام دینے کے قابل نہ بنایا، وہ بھی گناہوں کی خواہش کی شکل میں اس کے سامنے ہوں گے۔ اس لئے کوئی شخص قیامت کے دن شوخی سے یہ نہیں کہہ سکے گا:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

نہ اس طرح کی شوخیوں کو وہاں بار مل سکے گا:

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

Marfat.com

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾

(بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے۔ ۱۴) اگرچہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔ ۱۵)

مشکل الفاظ:۔

عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ کا معنی ہے شَاهِدٌ عَلٰى نَفْسِهٖ ''وہ اپنے اوپر خود گواہ ہے۔''

مَعَاذِيْرَ جمع ہے مَعْذِرَةٍ کی۔ یہ دراصل مَعَاذِرُ ہے۔ اس میں مناکیر کی طرح ''ی'' زیادہ ہوگئی ہے۔ اس کے معنی ہیں جھوٹے عذرات اور فضول بہانے۔ بعض لوگوں نے اس کو معذار کی جمع بتایا ہے، جس کے معنی اہلِ یمن کی زبان میں پردہ کے ہیں۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ قرآنِ کریم قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے، اہلِ یمن کی بولی میں نہیں۔

ایک اشتباہ کا جواب

یہ بھی اشتباہ کا جواب ہے۔ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کی تفصیلی خبر شاید اس لئے دی جائے گی تاکہ اسے معلوم ہوجائے کہ وہ ایک مجرم ہے اور یہ اس کے جرائم کی تفصیل ہے۔ چنانچہ اس اشتباہ اور خیال کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کے تمام اعمال کی خبر جرم بتانے کیلئے نہیں دی جائے گی بلکہ انصاف کے تقاضے پورا کرنے کیلئے یہ کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ کیونکہ برسرِ عدالت جرم کا ثبوت پیش کئے بغیر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انسان کو اپنے مجرم ہونے کا یقین ہوجائے، اس کیلئے جرائم کی تفصیل بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ ہر انسان اپنے بارے میں کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ جانتا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ میں نے زندگی کس طرح گزاری۔ زندگی ایک خالی سلیٹ کی طرح ہے۔ انسان اپنے اعمال کی تحریر اس پر خود لکھتا ہے۔ اور جس طرح ایک خط لکھنے والا جانتا ہے کہ میں نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے، اسی طرح اپنی زندگی کی تحریر لکھنے والا بھی ہر دوسرے شخص سے زیادہ جانتا ہے کہ میری زندگی کن کاموں میں گزری ہے۔

نویسندہ داند کہ درنامہ چیست

ایک جھوٹا، فریبی، مکار، خائن، شعبدہ باز دوسروں کو تو دھوکہ دے سکتا ہے اور اپنے جرائم کو چھپا سکتا ہے لیکن خود اسے خوب معلوم ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسی طرح آخرت میں پیش ہونے والے ہر کافر، ہر منافق اور ہر فاسق و فاجر اور مجرم کو خوب معلوم ہے کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتا رہا ہے اور آج وہ کس حیثیت سے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنے آپ کو خوب جانتا ہے اور وہی اپنے اوپر سب سے بڑا گواہ ہے۔ دوسروں کے سامنے وہ جھوٹے بہانے بھی کرسکتا ہے اور غلط عذر بھی پیش کرسکتا ہے لیکن خود اپنی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ بعض جرائم پیشہ لوگوں پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب ان کا ضمیر اس حد تک مرجاتا ہے کہ وہ یہ بتانا چھوڑ دیتا ہے کہ کیا چیز بری اور کیا چیز اچھی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ناخوب، خوب بن جاتا ہے اور خوب، ناخوب ٹھہرتا ہے۔

Marfat.com

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

ایسے شخص کیلئے یہ کہنا کہ وہ اپنے نفس پر سب سے بڑا گواہ ہے، کس حد تک درست ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ممکن ہے دنیا میں انسان پر کبھی ایسا وقت بھی آتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اسے خیروشر کے احساس سے محروم کر دیتے ہوں۔ لیکن صبحِ قیامت کے طلوع ہوتے ہی انسان کی حقیقی فطرت اس کی طرف عود کر آئے گی۔ کل تک وہ جن باتوں کا انکار کرتا تھا آج اقرار کرے گا۔ اور جو حقائق اس کیلئے مفروضوں اور افسانوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے تھے آج اس کیلئے واقعی حقیقت بن جائیں گے۔ تو اس دن ہر شخص کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر گواہ ہے اور اسے دنیا میں گزارا ہوا ایک ایک لمحہ اپنی آنکھوں کے سامنے گھومتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾

(اے نبی، اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کیلئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے۔ ۱۶) ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو پڑھوا دینا۔ ۱۷) تو جب ہم اس کو پڑھ چکیں تو آپ اس کی پیروی کریں۔ ۱۸) پھر اس کی وضاحت کر دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ ۱۹)

ان آیات کا پس منظر

بعض لوگوں نے ان چار آیات کے حوالے سے اعتراض کیا ہے کہ یہ سیاق وسباق سے بالکل ہٹی ہوئی اور غیر متعلق ہیں کیونکہ قیامت پر کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا جا رہا تھا اسی ضمن میں قیامت کے کچھ احوال بیان کئے گئے اور مخالفین کے بارے میں یہ واضح کیا گیا کہ ان کا انکارِ قیامت کا سبب یہ بات نہیں کہ وہ قیامت کے وقوع کو خلافِ عقل یا بعید از امکان سمجھتے ہیں بلکہ ان کے انکار کا سبب کچھ اور ہے۔ یہی بیان جاری تھا کہ ان چار آیات نے سلسلۂ بیان بدل ڈالا۔ اور ان چار کے بعد پھر وہی مضمون شروع ہو گیا۔ اس لحاظ سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان چار آیات کا سیاق وسباق سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ایسی چار آیات کا در آنا جو سیاق وسباق سے غیر متعلق ہوں مناسب بات معلوم نہیں ہوتی۔

یہ اعتراض صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو ان چار آیات کے پس منظر سے واقف نہ ہو لیکن جس کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل باتیں ہوں اسے یہ خیال کبھی بھی دامن گیر نہیں ہو سکتا۔ وہ باتیں یہ ہیں:

ا۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام پرشوکت اور پرہیبت ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام صفاتِ مَلَکی اور غیر معمولی وجاہت کے باعث حیران کن شخصیت کے مالک ہیں۔ چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کا کلام لے کر نازل ہونا اپنے اندر جو تمکنت، ہیبت، عظمت، رعب اور شوکت رکھتا تھا اس سے آنحضرت ﷺ کے قلب ونگاہ کا متاثر ہونا عقل اور فطرت کا تقاضا تھا۔ چنانچہ اس شدید تاثر کے باعث آپ کیلئے وحیِ الٰہی کا تحمل ایک ایسا غیر معمولی بار تھا جس نے آپ کی انتہائی باوقار اور عظیم مقام ومرتبہ کی حامل شخصیت کو بھی شدید متاثر کیا۔

Marfat.com

۲۔ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔اور آپؐ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں۔ قیامت تک کیلئے انسانوں کی ہدایت آپ کے دامن سے وابستہ ہے۔انسانی بھلائی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول آپ کے دم قدم اور آپ کی تبلیغ وکاوش کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ بنابریں آپ کو اپنی اس ذمہ داری کا شدید احساس تھا۔اس لئے جب حضرت جبرائیل علیہ السلام وحیِ الٰہی لے کر نازل ہوتے تو آپ قرآنِ کریم کی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتے تا کہ کوئی لفظ حافظے میں محفوظ ہونے سے نہ رہ جائے۔اور انسانیت اس سے محروم نہ رہ جائے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ سے بے پناہ محبت اور اس کے کلام سے بے پناہ شغف کے باعث آپ بے تابانہ اللہ کے کلام کو سنتے۔اور اس نامۂ محبوب کے ایک ایک جملے کو نہایت بے قراری کے ساتھ زبان سے دہرانے اور دل ودماغ میں اتارنے کی کوشش کرتے۔

ایسے ہی احساسات اور تاثرات نے آپ کے اندر وہ کیفیت پیدا کر دی تھی جسے قرآنِ کریم نے عجلت کا نام دیا ہے۔سورۃ القیمۃ کے نزول کے وقت آپ کی اسی کیفیت اور بے تابی نے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ سلسلۂ کلام کو توڑ کر آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ وحی کے الفاظ دہرانے کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں۔اسے یاد کرا دینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک اسے آپ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔آپ مطمئن رہیں کہ اس کلام کا ایک لفظ بھی آپ نہ بھولیں گے اور نہ کبھی اسے ادا کرنے میں غلطی کر سکیں گے۔یہ ہدایت فرمانے کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام شروع کر دیا گیا۔اس لحاظ سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کے بیچ میں لایا گیا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی رواں دواں لیکچر میں بعض دفعہ کسی ذہین اور پرشوق طالب علم کی بے تابی اسے کوئی سوال کرنے پر مجبور کر دیتی ہے،تو استاد لیکچر روک کر یہ فرماتے ہیں کہ میری بات کو سنتے رہیے، ہر بات واضح ہو جائے گی،اور پھر اپنا لیکچر شروع کر دیتے ہیں۔تو کوئی شخص بھی جس کے سامنے پوری صورتحال ہو وہ اس جملۂ معترضہ کو غیر متعلقہ بات نہیں کہہ سکتا جبکہ قرآنِ کریم کو سننے اور سمجھنے کے آداب میں یہ باتیں ہمیشہ کیلئے شامل ہیں۔

اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ کا مفہوم

ان آیات میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اپنے تئیں بالکل واضح ہیں۔البتہ ان میں جو چوتھی آیت ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اس قرآن کا بیان کرنا اور اس کی ایک ایک بات کا واضح کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔اس سلسلے میں صاحبِ تفہیم القرآن نے جو نوٹ لکھا ہے قابلِ استفادہ ہے،ہم اس کو نقل کر رہے ہیں۔

> یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو ان گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔
>
> اولاً،اس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔اس لئے کہ قرآن کے احکام وفرامین،اس کے اشارات،اس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم ومدعا حضورؐ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی

Marfat.com

ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالبِ قرآن کی تفہیم وتشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہر حال الفاظِ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحی خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔(قرآن مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحات ۹۴۔۹۵اور صفحات ۱۱۸تا۱۲۵پیش کر دیئے ہیں)۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم ومدعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو بتائی گئی تھی آخر اسی لئے تو بتائی گئی تھی کہ آپ اپنے قول اور عمل سے اس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔اگر یہ اس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپ کو صرف اس لئے بتائی گئی تھی کہ آپ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ بیکار کام تھا، کیونکہ فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔اس لئے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ''اور اے نبی، یہ ذکر ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جو ان کیلئے اتاری گئی ہے۔'' تشریح کیلئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰۔اور قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔(البقرۃ، آیات ۱۲۹و ۱۵۱۔آل عمران ۱۶۴۔الجمعہ ۲۔ان سب آیات کی تشریح ہم ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحہ ۷۴ سے ۷۷ تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول وعمل سے فرما دی ہے کیونکہ وہ آپ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔اس کو چھوڑ کر یا اس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحبِ ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثالثاً، قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک عربی داں آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مدعا کیا ہے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے۔مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہی کو لے لیجئے۔قرآن مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعین نہیں کر سکتا۔قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی داں یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا، تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں

Marfat.com

کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکم صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا اور اسی مطلب کی تعلیم آپ ان سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنہوں نے قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور آپ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً، قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسول کو بتائی اور رسول نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم امت کو دی اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا جس کی تفصیلات معتبر روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں اور بعد کی نسلوں نے اگلی نسلوں میں اس پر عملدرآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اس ذریعۂ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا کیونکہ یہ ذمہ داری محض رسولؐ کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کیلئے نہیں لی گئی تھی بلکہ اس غرض کیلئے لی گئی تھی کہ رسولؐ کے ذریعے سے امت کو کتاب الٰہی کا مطلب سمجھایا جائے اور حدیث و سنت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذالک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں اس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری امت رسول اللہ ﷺ کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جعلساز لوگ وہی سکے تو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس امت نے اول روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذات پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے۔ اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اس ذاتؐ کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا اتنا ہی اس امت کے خیر خواہ اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے ممیّز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکائے میں آ کر حدیث و سنت کو ناقابلِ اعتبار ٹھہراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

Marfat.com

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾

(ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو۔ ۲۰) اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔ ۲۱)

اخذ واستماعِ وحی سے متعلق جملہ معترضہ کی شکل میں آنحضرت ﷺ کو ہدایات دینے کے بعد سلسلۂ کلام پھر اصل مضمون سے جوڑ دیا گیا ہے۔ قریش اور دیگر اہلِ مکہ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جو قیامت کا انکار کرتے ہو کہ ہزاروں سال میں مرنے والے لوگوں کے اجزائے جسم کیسے اکٹھے کئے جاسکتے ہیں اور بوسیدہ اور از کار رفتہ ہڈیوں میں کیسے دوبارہ جان ڈالی جاسکتی ہے۔ گویا یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو سراسر خلافِ عقل اور بعید از وقوع ہے حالانکہ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کوئی چیز بھی ناممکن نہیں۔ کوئی دعویٰ انسانی امکان سے تو ماوراء ہوسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت میں تمہاری وقوعِ قیامت سے انکار کی یہ وجہ نہیں بلکہ دو وجوہ ہیں جن میں پہلی وجہ آیت نمبر پانچ میں بیان کی گئی ہے کہ انسان چونکہ فسق و فجور کی کھلی چھوٹ چاہتا ہے، اس کی آزاد طبیعت کو اخلاقی پابندیاں گوارا نہیں اور آخرت کو ماننے کی صورت میں یقیناً کچھ اخلاقی پابندیاں قبول کرنا پڑتی ہیں۔ ان پابندیوں سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ آخرت کا انکار کر دیا جائے۔ اب اگر فسق و فجور کے حوالے سے انکار کیا جائے تو ہر شخص اسے گری ہوئی بات سمجھے گا۔ اس لئے آخرت کا انکار کرنے والا اپنی اس گراوٹ کو چھپانے کیلئے عقلی دلیلیں بگھارتا ہے۔ اور انکارِ آخرت کو معقول ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

تکذیبِ قیامت کی اصل علت

دوسری وجہ اب اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہے کہ تم آخرت کا انکار اس لئے کر رہے ہو کہ تم دنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کرتے ہو۔ دنیا سے محبت کا مفہوم یہ ہے کہ تم نفعِ عاجل کے متمنی ہو جبکہ آخرت کیلئے نفعِ اٰجل کا یقین کرنا پڑتا ہے اور نفعِ عاجل کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اس کیلئے چونکہ بڑی وسعتِ نظر، بڑی حوصلہ مندی اور بڑی فکری بلوغت چاہئے۔ تو جن لوگوں کی نظریں کوتاہ اور خواہشات توانا ہیں وہ کبھی بھی دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا حوصلہ نہیں کرسکتے۔ ایک شخص دیکھتا ہے کہ حرام ذرائع سے چند دنوں میں دولت کی ریل پیل ہوسکتی ہے۔ حق کے مقابلے میں باطل کی بندگی اور خدمت مالی فوائد کے انبار لگاسکتی ہے۔ ملک سے وفاداری کی بجائے ملک و ملت کے مفادات کو دشمن کے ہاتھ بیچنے سے ایسے فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں، عام حالات میں جن کی امید بھی نہیں کی جاسکتی تو جو شخص حُبِ دنیا میں ڈوبا ہوا ہے وہ اس صورتحال کو کیسے نظر انداز کرسکتا ہے۔ اسی طرح اگر حرام کے وسائل میسر ہوں اور پھر بھی محض اس لئے حلال پر اکتفا کیا جائے کہ اس سے آخرت کی نعمتیں میسر آسکتی ہیں۔ ملک و ملت سے وفاداری جس قربانی کا تقاضا کرتی ہے وہ اگرچہ بظاہر نقصان کا سودا ہے لیکن آخرت میں اسی سے کامیابی کا راستہ ہموار ہوسکتا ہے تو عموماً خواہشِ نفس کے مارے ہوئے لوگ اور حُبِ دنیا کے اسیر اس راستے پر چلنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ دنیا کے فوائد سامنے نظر آنے والے ہیں اور ان کے ملنے کی فوری امید ہے۔ اور آخرت کے پیچھے اگرچہ عقلی اور اخلاقی دلائل ہیں لیکن اس کے فوائد آخرت میں ملیں گے۔ جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تو یہ دیکھ کر ایک کوتاہ نظر اور حُبِ دنیا میں ڈوبا ہوا شخص دنیا کے فوائد کے بارے میں سوچے گا اور آخرت کا انکار کر دے گا۔ یہ ہے وہ اصل مرض جس میں قریش اور دیگر اہلِ مکہ مبتلا تھے۔ اور آج کا انسان بھی اسی میں مبتلا ہے۔

Marfat.com

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾
تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾

(کتنے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ ۲۲) اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ ۲۳) اور کتنے چہرے اس دن اداس ہوں گے۔ ۲۴) اور گمان کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے۔ ۲۵)

قیامت کے دن اقرار اور انکار کرنے والوں کی کیفیت

روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم قیامت کا اقرار کرو یا انکار، لیکن وہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے جس کا اپنے متعین وقت پر ظہور ہو کے رہے گا۔ آج جو اس کا اقرار کر رہے ہیں وہ بھی اس روز موجود ہوں گے اور جو انکار کر رہے ہیں وہ بھی سامنے ہوں گے۔ لیکن جن لوگوں نے آج اس پر ایمان اور اقرار کی دولت پائی ہے اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزاری ہے ان کے چہرے اس دن تروتازہ اور شاداب ہوں گے۔ اس خوشی سے ان کے چہرے تمتمار ہے ہوں گے کہ ہم نے آخرت پر ایمان لاکر جو ایک صالح زندگی اختیار کی اور خواہشاتِ نفس کو چھوڑا، آج وہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے ثمرات سے ہم بہرہ ور ہونے والے ہیں۔

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ...... بعض اہلِ علم نے اس کا یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ جو لوگ قیامت پر ایمان سے بہرہ ور ہوئے وہ قیامت کے دن اپنے رب کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہوں گے۔ نَظَرَ کے بعد جب اِلٰى کا صلہ آتا ہے تو جس طرح اس کا معنی کسی طرف دیکھنا ہوتا ہے، اسی طرح کسی کی رحمت و عنایت کا منتظر اور متوقع ہونا بھی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے وہ یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے برپا ہونے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی ان عنایات کے منتظر ہوں گے جن کا دنیا میں ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن دیگر اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ نَظَرَ کا یہ مفہوم یقیناً صحیح ہے۔ لیکن اس آیت کی جو تفسیر بکثرت احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو اپنے رب کا دیدار نصیب ہوگا۔ اس کی تائید میں بہت سی روایات منقول ہیں جن کا بخاری اور مسلم نے بھی ذکر کیا ہے۔ اکثر محدثین نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ اہلِ جنت میں کم سے کم درجے کا جو آدمی ہوگا وہ اپنی سلطنت کی وسعت دو ہزار سال کی مسافت تک دیکھے گا اور ان میں سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے لوگ ہر روز دو مرتبہ اپنے رب کو دیکھیں گے، پھر حضورؐ نے یہی آیت پڑھی کہ اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اور کچھ چہرے ایسے ہوں گے جن پر اداسی اور وحشت برس رہی ہوگی۔ وہ میدانِ حشر میں پہنچتے ہی وہاں علامات و آثار سے اندازہ کرلیں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے۔ یعنی انہیں ایسی سزا ملنے والی ہے جس کی شدت ان کی کمر توڑ کے رکھ دے گی۔

Marfat.com

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾
وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾

(ہرگز نہیں جبکہ جان ہنسلی میں آ پھنسے گی۔ ۲۶) اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا۔ ۲۷)
اور آدمی سمجھ لے گا کہ یہ دنیا سے جدائی کا وقت ہے۔ ۲۸) اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ ۲۹) اس
دن تیرے رب کی طرف جانا ہوگا۔ ۳۰)

جان کنی کی کیفیت کو یاد رکھو

وہ لوگ جنہیں عیشِ دنیا نے آخرت کے یقین سے دور رکھا ہے انہیں ایک ایسے منظر کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے جس کا زندگی میں ہر آدمی کو تجربہ ہوتا ہے۔ یہ جان کنی کا منظر ہے۔ جس سے ہر شخص کو واسطہ پڑے گا اور زندگی میں وہ دوسروں پر یہ منظر گزرتا ہوا دیکھتا ہے کہ اس وقت دنیا سے جانے والا اور اس کے تیماردار کس قدر مایوسی اور بے بسی کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر ضمیر نام کی کوئی چیز آدمی کے اندر موجود ہے تو وہ ضرور اسے اپنے مستقبل پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے اور آخرت کی یاد دلاتی ہے۔ چنانچہ اسی کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ عیشِ دنیا کے متوالو! اس منظر کو ذہن میں لاؤ جب جسم کی صلاحیتیں نچڑ جائیں گی۔ طبیب اور معالج مایوسی کا اظہار کرنے لگیں گے۔ جان ہنسلی میں آ پھنسے گی۔ طبیبوں کی بے بسی دیکھ کر تیمارداروں میں سے کوئی کہے گا کہ علاج کرنے والے تو جواب دے گئے اب کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلاؤ، ممکن ہے اس کے جھاڑ پھونک سے اس شخص کی جان بچ جائے۔

رَاقٍ ...... یہ رقیہ سے بھی ماخوذ ہوسکتا ہے جس کے معنی تعویز گنڈے اور جھاڑ پھونک کے ہیں اور رُقی سے بھی جس کے معنی چڑھنے کے ہیں۔ پہلی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ جب مریض کے تیماردار علاج معالجے سے مایوس ہو جائیں گے تو وہ جھاڑ پھونک کرنے والے کی تلاش کریں گے کہ شاید اسی سے اس کی جان بچ جائے۔ اور دوسری صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس وقت فرشتے کہیں گے اس کی روح کون لے کر جائے گا ملائکۂ عذاب یا ملائکۂ رحمت۔ اگر یہ شخص نیک ہوگا تو ملائکۂ رحمت اسے لے جائیں گے اور اگر یہ شخص برا ہوگا تو عذاب کے فرشتے اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ...... ''اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی چل نہ سکے گا۔ شدتِ ضعف اور بے بسی کے سبب سے حال یہ ہوگا کہ ہر میدان میں جولانیاں دکھانے والا شخص موت کے قریب پہنچ کر اتنا کمزور ہو جائے گا کہ ایسا معلوم ہوگا کہ اس کی پنڈلیاں باہم دِگر لپٹ گئی ہیں۔ عجیب بے بسی کا وقت ہوگا۔ معالج جواب دے دیں گے، اعضاء قابو سے باہر ہو جائیں گے، سہارا دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ تو ایک بھاری بوجھ کے ساتھ اپنے رب کی طرف جانا ہوگا۔ اندازہ کیجئے کہ اس وقت جانے والے کی حالت کیا ہوگی۔ کاش دنیا کی محبت میں اسیر شخص اگر بہت دور تک نہیں تو موت تک کے سفر کا اندازہ کر لے۔ قیامت کا انکار کرنے والا موت کے بعد ہمیشہ کی خاموشی دیکھتا ہے۔ لیکن قیامت کا اقرار ہمیں یہ تصور دیتا ہے کہ موت دراصل قیامت کے سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور یہ سفر قیامت پر رکے گا جہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری ہوگی۔

Marfat.com

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ
كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾
ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾
اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ
فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ
ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

رکوع: ۲۔ (پس اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی۔ ۳۱) بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا۔ ۳۲) پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔ ۳۳) افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے۔ ۳۴) پھر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے۔ ۳۵) کیا انسان یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ ۳۶) کیا وہ ایک حقیر پانی کی بوند نہ تھا جو (رحمِ مادر) میں ٹپکایا جاتا ہے۔ ۳۷) پھر وہ خون کی ایک پھٹکی بنا اور اللہ نے اس کا جسم بنایا، پھر اس کے اعضاء درست کیے۔ ۳۸) پھر بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ۔ ۳۹) کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے۔ ۴۰)

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾
اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾

(پس اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی۔ ۳۱) بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا۔ ۳۲) پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔ ۳۳) افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے۔ ۳۴) پھر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے۔ ۳۵)

منکرینِ آخرت کی کیفیت اور انجام

آخرت کا منکر ایسا سنگدل ہو جاتا ہے کہ نہ اس پر دلائل اثر انداز ہوتے ہیں نہ قیامت کی ہولناکی اس کی سنگدلی میں کمی کرتی ہے۔ نہ موت کا اندوہناک منظر اس کی بے حسی اور غفلت کو توڑتا ہے۔ چنانچہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان غفلت کے ماتوں اور بے حسوں نے سب کچھ سنا لیکن وہ پھر بھی اپنے انکار پر اڑے رہے۔ نہ انہیں ایمان کی توفیق ہوئی اور نہ ایسا ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک جاتے۔ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور اس کی کتاب کی تصدیق کے بعد اس کے تقاضے کے طور پر جس چیز کا سب سے پہلے ذکر فرمایا وہ نماز ہے۔

Marfat.com

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامی کے احکام میں سے جو حکم سب سے پہلے دائرۂ ایمان میں داخل ہونے والے کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ نماز ہے۔اور یہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بھی سب احکام پر مقدم ہے۔نماز ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو شخص زبان سے اللہ تعالیٰ کے دین کا اقرار کر رہا ہے اس کا دل بھی اس کے ساتھ شامل ہے یا نہیں۔

مزید فرمایا کہ تصدیق اور نماز تو ایک طرف رہی آخرت کا انکار کرنے والا مسلسل اپنے انکار پر اڑا رہا اور یہ آیات سننے کے بعد وہ اکڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔یوں تو اس میں تمام منکرینِ آخرت کی تصویر ہے لیکن مجاہد، قتادہ اور ابنِ زید کہتے ہیں کہ یہ شخص ابوجہل تھا۔آیت کے الفاظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایک شخص تھا جس نے سورۃ القیٰمۃ کی مذکورہ بالا آیات سننے کے بعد یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ...... اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں اور مفسرین نے دونوں مراد لئے ہیں۔ایک تو یہ کہ ایسے شخص پر ہلاکت اور بربادی کی پھٹکار ماری گئی ہے کہ تف ہے تجھ پر، ہلاکت ہے تیرے لئے، خرابی یا تباہی یا کمبختی ہے تیرے لئے۔دوسرا مفہوم جو حافظ ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تو اپنے خالق سے کفر کرنے کی جرأت کر چکا ہے تو پھر تجھ جیسے آدمی کو یہی چال زیب دیتی ہے جو تو چل رہا ہے اور یہ اسی طرح کا طنزیہ کلام ہے جس کی مثالیں قرآنِ کریم میں اور بھی موجود ہیں۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾

(کیا انسان یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ ٣٦)

عربی زبان میں اِبِلٌ سُدًى اس اونٹ کو کہتے ہیں جسے آزاد پھرنے کیلئے چھوڑ دیا جائے، جدھر چاہے چرتا پھرے، نہ اس سے کوئی کام لیا جائے اور نہ اس کی کوئی نگرانی کرنے والا ہو۔اردو زبان میں عام طور پر شترِ بے مہار کا لفظ اسی معنی میں بولتے ہیں۔

انسان کی گمراہی اور اس کا رد

اس سورۃ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ قیامت اور آخرت کو مختلف دلائل سے ثابت کیا جا رہا ہے اور اسی ضمن میں قریش کی جانب سے جو اعتراضات اور اشتباہات اٹھائے جاتے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ان میں ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کرسکیں گے۔چنانچہ اس کا جواب اور اس کی وضاحت کے بعد اب اسی سلسلۂ مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنے بارے میں یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے خالق نے اس کو پیدا کر کے چھوڑ دیا ہے اور کسی طرح کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں کی گئی۔گویا کہ وہ ایک شترِ بے مہار ہے۔جس کی زندگی کے نہ تو کوئی فرائض ہیں اور نہ اس کی زندگی کے اعمال کو محفوظ کیا جا رہا ہے اور نہ کبھی ایسا ہوگا کہ اس کی بازپرس کی جائے۔وہ دنیا میں آتا ہے اسباب کے ماتحت، اپنے مرضی کی زندگی گزارتا ہے، اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں شب و روز لگا رہتا ہے حتیٰ کہ موت اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیتی ہے اور اس طرح سے اس کی زندگی کا سفر تمام ہوجاتا ہے۔اسی بات کو قرآنِ مجید نے دوسرے لفظوں میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں جانا ہے۔“ دونوں آیتوں میں انسان کے سامنے ایک سوال رکھ دیا گیا ہے کہ تمہاری زندگی کا طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ تم اپنے آپ کو شترِ بے مہار کی طرح ایک ایسا حیوان سمجھتے ہو جس پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی

Marfat.com

گئی۔ بعض جانور بار برداری کیلئے استعمال ہوتے ہیں اور بعض جانور سواری کیلئے۔ لیکن تم اپنے آپ کو وہ جانور سمجھتے ہو جو ہر طرح کی ذمہ داریوں سے فارغ کر کے گھومنے پھرنے اور کھانے پینے کیلئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تم خود فیصلہ کرو کیا تم واقعی ایسے ہی حیوان ہو، کیا تمہیں خود میں اور جانور میں کوئی فرق نظر نہیں آتا جبکہ جانور بے اختیار ہے اور تم بااختیار ہو۔ وہ جبلی تقاضوں کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور تمہیں عقل اور امتیاز دے کر فی الجملہ ایک آزادی دی گئی ہے۔ حیوان کے افعال میں اخلاقی حُسن و قبح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ تم اپنی ایک اخلاقی حیثیت اور ذمہ داری رکھتے ہو اور مزید یہ کہ حیوان تو جبلت کے لگے بندھے تقاضوں کے مطابق زندگی گزار کے دنیا سے چلا جاتا ہے اور کوئی ایسا کام سرانجام نہیں دیتا جس کے بارے میں اس سے بازپرس کی جائے۔ اسے چونکہ عقل نہیں دی گئی اس لئے وہ اپنے طور پر زندگی کے نئے راستے نکالنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ اس کے یہاں زندگی کا کوئی فلسفہ نہیں، اس نے کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، اس نے کوئی ایسا طریقہ یا ایسا ازم نہیں نکالا جس نے لوگوں کو کسی خاص ڈگر پر ڈالا ہو، جس سے لوگوں کے حقوق متاثر ہوئے ہوں اور نسلوں تک جس کے اثرات پھیلتے چلے گئے ہوں۔ اس لئے یہ نہایت پر از حکمت بات ہے کہ حیوان کو دوبارہ زندہ کر کے بازپرس کیلئے بلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے طبعی زندگی کو اس کی مکمل زندگی بنا دیا گیا۔ لیکن انسان کا معاملہ ایسا نہیں۔ اس کی دنیا احساسات، انفعالات، اخلاق، فرائض اور حقوق کی دنیا ہے۔ اس کے اندر تأثر کی کیفیت بھی ہے اور اثر انداز ہونے کی بھی۔ اس میں ہمدردی اور غمگساری بھی ہے، ظلم اور چیرہ دستی بھی، ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنا خون اور اپنا پسینہ حق کی آبیاری کیلئے استعمال کیا اور زندگی بھر حق کی سربلندی کیلئے جان لڑاتے رہے۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے حق کے راستے میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کیں اور ایسے طریقے نکالے جس سے انسانی زندگی کی منزل کھوٹی ہو کے رہ گئی۔ کیا ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان ایک مہمل حیوان ہے جس کی نہ کوئی ذمہ داری ہے اور نہ کبھی اسے بازپرس کیلئے اٹھایا جانا ہے۔ انسان کی اپنی حیثیت بجائے خود بولتی ہے کہ اسے عقل و شعور دے کر ذمہ داریوں سے گراں بار کیا گیا ہے اور ایک دن ایسا آنا چاہئے جب ان ذمہ داریوں کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے اور زندگی کے ایک ایک لمحے کا اس سے حساب لیا جائے۔

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

(کیا وہ ایک حقیر پانی کی بوند نہ تھا جو (رحمِ مادر) میں ٹپکایا جاتا ہے۔ ۳۷) پھر وہ خون کی ایک پھٹکی بنا اور اللہ نے اس کا جسم بنایا، پھر اس کے اعضاء درست کیے۔ ۳۸) پھر بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ۔ ۳۹) کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے۔ ۴۰)

امکانِ قیامت کے دلائل

اوپر کی آیتِ کریمہ کا حاصل یہ تھا کہ انسان کوئی شتر بے مہار نہیں بلکہ وہ ایک ذمہ دار، صاحبِ عقل اور صاحبِ اخلاق انسان ہے۔ اس کی زندگی کے رویئے، معمولات اور اہداف کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک دن ایسا آنا چاہئے جب اس کو از سرِ نو اٹھایا جائے اور اس کی زندگی کے ایک ایک عمل کا حساب لیا جائے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کی ضرورت بجا لیکن کیا اس بات کا امکان بھی ہے کہ قیامت واقعی برپا ہو سکے۔ پوری

Marfat.com

کائنات کا تباہ ہو جانا پھر از سرنو اس کا بسایا جانا، ہزاروں سالوں کے مردہ جسموں کے اجزاء کو جن کا نام ونشان تک مٹ چکا ہے از سرنو فراہم کرنا اور سب کے اعمال کا شمار ہونا اور حساب لیا جانا۔ ان میں سے کوئی بات بھی عقل قبول کرنے کیلئے آسانی سے آمادہ ہو سکتی ہے؟ چنانچہ ان اعتراضات کیلئے ازالے کیلئے پیش نظر آیات کریمہ میں چند ایسے دلائل دیئے گئے ہیں جن کا تعلق مفروضوں سے نہیں بلکہ ایسے حقائق سے ہے جن پر انسانی تاریخ گواہ ہے اور جن کا کسی طور انکار کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی کہ تمہیں قیامت کا وقوع اس لئے مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ قیامت جن اجزاء سے مکمل ہوتی ہے ان میں سے ایک ایک جز انسانی بساط سے بہت باہر کی چیز ہے۔ اور یہ وہ بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے انسان قیامت کا انکار کرتا چلا آیا ہے لیکن اگر اتنی سے بات سمجھ لی جائے کہ سوال انسان کی قدرت وبساط کا نہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ہے۔ اور تمہیں بار بار اس کی قدرت کا تجربہ ہو چکا ہے کہ انسان کا وجود جس مادۂ منویہ سے آغاز پاتا ہے وہ منی کا ایک حقیر قطرہ ہے جسے ٹپکانے والا بیوی کے رحم میں ٹپکا کر خود بھول جاتا ہے۔ پھر وہ کس طرح رحم کا حصہ بنتا ہے، کیسے وہ خون کی پھٹکی میں تبدیل ہوتا ہے، پھر وہ کس طرح گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے، پھر کن طریقوں سے اس میں تخلیق کا عمل جاری ہوتا ہے، ایک خاکہ بنتا، ایک جسم وجود میں آتا، ایک شکل تیار ہوتی اور پھر اس کی نوک پلک درست کی جاتی ہے۔ ان تمام مراحل میں قدرت کا موقلم ہی اس پر سارے تصرفات کرتا ہے اور کسی اور کا ہاتھ اس میں شریک نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں ایسے ہٹ دھرم بھی موجود ہیں جو اس صریح حکیمانہ فعل کو اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب ممکن نہیں کہ اگر تمہاری اس انتہائی غلط بات کو قبول بھی کر لیا جائے تو یہ جو آغازِ آفرینش سے آج تک دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم میں ایک ہی نوعیت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اس تناسب سے ہوتی چلی جارہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آئندہ اس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ کیا یہ بھی اتفاقاً ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس کا دنیا کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے باز نہ آئے تو اس کا تو کوئی علاج نہیں۔ اور یہ بات بھی ڈھٹائی سے کم نہیں کہ وہ اس بات کا اقرار تو کبھی نہ کرے کہ لندن اور نیویارک، ماسکو اور پیکنگ ممکن ہے اتفاق سے خود وجود میں آگئے ہوں لیکن یہ کہتے ہوئے کبھی نہ شرمائے کہ انسان آپ سے آپ وجود میں آیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ جس پروردگار کی یہ قدرتیں ہیں اور جس کی ایک ادنیٰ قدرت کا شاہکار خود تم ہو کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ وہ دوبارہ اسی انسان کو وجود میں لے آئے۔

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اس آیت کو پڑھتے تھے تو اللہ تعالیٰ کے اس سوال کے جواب میں کبھی بَلٰی (کیوں نہیں)، کبھی سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ فَبَلٰی (پاک ہے تیری ذات، خداوندا، کیوں نہیں) اور کبھی سُبْحَانَکَ فَبَلٰی یا سُبْحَانَکَ وَبَلٰی فرمایا کرتے تھے۔ (ابنِ جریر، ابنِ ابی حاتم، ابوداؤد)۔ ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جب تم سورۃ تین میں آیت اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ (کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟) پڑھو تو کہو بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشّٰاھِدِیْنَ (کیوں نہیں، میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں)۔ اور جب سورۃ قیامہ کی یہ آیت پڑھو تو کہو بَلٰی۔ اور جب سورۃ مرسلات کی آیت فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ (اس قرآن کے بعد یہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟) پڑھو تو کہو اٰمَنَّا بِاللّٰہِ (ہم اللہ پر ایمان لائے)۔ اسی مضمون کی روایات امام احمد، ترمذی، ابن امنذر، ابنِ مردویہ، بیہقی اور حاکم نے بھی نقل کی ہیں۔ (تفہیم القرآن)

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الدَّهْرِ

(٧٦)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الدَّھْرِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ یہ سورۃ تین ناموں سے موسوم ہے۔ الدھر، الانسان اور الابرار۔ پہلے دونوں نام اس سورۃ کی پہلی آیت سے ماخوذ ہیں اور تیسرا نام آیت پانچ سے لیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول:۔ جمہور مفسرین کے نزدیک علامہ آلوسی کی صراحت کے مطابق یہ سورۃ مکی ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی دو رائے ہیں۔ ایک رائے میں تو پوری سورۃ کو مدنی کہا گیا ہے، لیکن دوسری رائے میں سورۃ کو تو مکی قرار دیا گیا ہے لیکن آیات آٹھ تا دس کو مدنی ٹھہرایا ہے۔

احادیث مبارکہ سے اس کے زمانۂ نزول کی وضاحت نہیں ملتی۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارے لئے یقینی اور حتمی اطلاع ہوتی جس سے انحراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن کسی صحیح حدیث کی عدم موجودگی میں ہمارے پاس ایک ہی ذریعہ رہ جاتا ہے کہ سورۃ کے مطالب اور مضامین دیکھے جائیں۔ یہی ایسی کسوٹی ہے جس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے یا مدنی۔ کیونکہ مکی سورتوں کی خصوصیات مدنی سورتوں کی خصوصیات سے الگ ہیں۔ جب ہم اس حوالے سے اس سورۃ کے مضامین پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ نہ صرف مکی ہے بلکہ مکہ معظمہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ اور جن آیات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مدنی ہیں اور مضمون کی مناسبت سے انہیں اس سورۃ میں شامل کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ سورۃ کے سلسلۂ بیان میں اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں سورۃ کے اندر بعد میں شامل کیا گیا ہے۔ مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ اس سورۃ یا سورۃ کی چند آیات میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے جس سے ان کے مدنی ہونے کا گمان ہو سکے۔

سوال یہ ہے کہ جب کوئی ایسی شہادت موجود نہیں تو پھر بعض مفسرین نے اس سورۃ کے یا اس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا گمان کیسے کر لیا۔ اس سلسلے میں صاحبِ تفہیم القرآن نے جو وضاحتی نوٹ لکھا ہے وہ قابلِ مطالعہ ہے۔

> دراصل جس بنا پر اسی سورۃ کے، یا اس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا خیال پیدا ہوا ہے وہ ایک روایت ہے جو عطاء نے ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ اور بہت سے صحابہؓ ان کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ بعض صحابہؓ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ آپ دونوں بچوں کی شفا کیلئے اللہ تعالیٰ سے کوئی نذر مانیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی خادمہ فضہؓ نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے دونوں بچوں کو شفا عطا فرما دی تو یہ سب شکرانے کے طور پر تین دن کے روزے رکھیں گے۔ اللہ کا فضل ہوا کہ دونوں

Marfat.com

تندرست ہوگئے اور تینوں صاحبوں نے نذر کے روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ حضرت علیؓ کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ انہوں نے تین صاع جو قرض لئے (اور ایک روایت میں ہے کہ محنت مزدوری کر کے حاصل کئے) پہلا روزہ کھول کر جب کھانے کیلئے بیٹھے تو ایک مسکین نے کھانا مانگا۔ گھر والوں نے سارا کھانا اسے دے دیا اور خود پانی پی کر سو رہے۔ دوسرے دن پھر افطار کے بعد کھانے کیلئے بیٹھے تو ایک یتیم آ گیا اور اس نے سوال کیا۔ اس روز بھی سارا کھانا انہوں نے اس کو دے دیا اور پانی پی کر سو رہے۔ تیسرے دن روزہ کھول کر ابھی کھانے کیلئے بیٹھے ہی تھے کہ ایک قیدی نے آ کر وہی سوال کر دیا اور اس روز کا بھی پورا کھانا اسے دے دیا گیا۔ چوتھے روز حضرت علیؓ دونوں بچوں کو لئے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے دیکھا کہ بھوک کی شدت سے تینوں باپ بیٹوں کا برا حال ہو رہا ہے۔ آپؐ اٹھ کر ان کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی ایک کونے میں بھوک سے نڈھال پڑی ہیں۔ یہ حال دیکھ کر حضورؐ پر رقت طاری ہوگئی۔ اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ لیجئے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اہلِ بیت کے معاملہ میں آپؐ کو مبارکباد دی ہے۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں یہ پوری سورۃ آپ کو پڑھ کر سنائی۔ (ابن مہران کی روایت میں ہے کہ آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ سے لے کر آخر تک کی آیات سنائیں۔ مگر ابن مردویہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ ...... حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس قصے کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے)۔ یہ پورا قصہ علی بن احمد الواحدی نے اپنی تفسیر البسیط میں بیان کیا ہے اور غالباً اسی سے زمخشری، رازی اور نیشاپوری وغیرہم نے اسے نقل کیا ہے۔

یہ روایت اول تو سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے۔ پھر درایت کے لحاظ سے دیکھئے تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی اگر آ کر کھانا مانگتا ہے تو گھر کے پانچوں افراد کا پورا کھانا اس کو دے دینے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک آدمی کا کھانا اس کو دے کر گھر کے پانچ افراد چار آدمیوں کے کھانے پر اکتفا کر سکتے تھے۔ پھر یہ بھی باور کرنا مشکل ہے کہ دو بچے جو ابھی بیماری سے اٹھے تھے اور کمزوری کی حالت میں تھے، انہیں تین دن بھوکا رکھنے کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ جیسی کامل فہم دین رکھنے والی ہستیوں نے نیکی کا کام سمجھا ہوگا۔ اس کے علاوہ قیدیوں کے معاملہ میں یہ طریقہ اسلامی حکومت کے دور میں کبھی نہیں رہا کہ انہیں بھیک مانگنے کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ وہ اگر حکومت کی قید میں ہوتے تو حکومت ان کی خوراک اور لباس کا انتظام کرتی تھی، اور کسی شخص کے سپرد کئے جاتے تو وہ شخص انہیں کھلانے پلانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس لئے مدینہ طیبہ میں یہ بات ممکن نہ تھی کہ کوئی قیدی بھیک مانگنے کیلئے نکلتا۔ تاہم ان تمام نقلی اور عقلی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اگر اس قصے کو بالکل صحیح بھی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب آلِ محمد ﷺ سے اس نیک عمل کا صدور ہوا تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے آ کر حضورؐ کو خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کے اہلِ بیت کا یہ فعل بہت مقبول ہوا ہے کیونکہ انہوں نے ٹھیک

Marfat.com

وہی پسندیدہ کام کیا ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے سورۂ دہر کی ان آیات میں فرمائی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ آیات نازل بھی اسی موقع پر ہوئی تھیں۔ شانِ نزول کے بارے میں بہت سی روایات کا حال یہی ہے کہ کسی آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو دراصل اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اس واقعہ پر ٹھیک چسپاں ہوتی ہے۔ امام سیوطی نے اتقان میں حافظ ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "راوی جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہی معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے، اور کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے اگرچہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ ہو۔" آگے چل کر وہ امام بدرالدین زرکشی کا قول ان کی کتاب البرہان فی علوم القرآن سے نقل کرتے ہیں کہ "صحابہؓ اور تابعین کی یہ عادت معروف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص جب یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا حکم اس معاملہ پر چسپاں ہوتا ہے، نہ یہ کہ وہی اس واقعہ کے نزول کا سبب ہے۔ پس دراصل اس کی نوعیت آیت کے حکم سے استدلال کی ہوتی ہے نہ کہ بیانِ واقعہ کی۔" (الاتقان فی علوم القرآن، جلد اول، صفحہ ۳۱، طبع ۱۹۲۹ء)

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورۃ کا بنیادی مضمون اور موضوع انسان کو دنیا میں اس کی حقیقی حیثیت سے آگاہ کرنا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا ہے کہ اگر وہ اپنی حیثیت کو سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رویہ ٹھیک کر لے جسے شکر گزاری کا رویہ کہا گیا ہے تو اس کا انجام کیا ہوگا اور اگر وہ اپنی حیثیت کو نظرانداز کر کے کفر کا راستہ اختیار کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے پہلی تین آیتوں میں انسان کی اصل حیثیت واضح کرتے ہوئے اسے یاد دلایا گیا کہ اس پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر ہستی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو عدم کی ظلمت سے نکالا اور وجود کی روشنی بخشی۔ پھر اس کی تخلیق کا سلسلہ ایک مخلوط نطفے سے اس طرح کیا کہ اس کے والدین کو کوئی خبر نہ تھی کہ اس کے وجود کی بناء پڑ گئی ہے اور کوئی اس خوردبینی وجود کو دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ہے وہ انسان جو آگے چل کر اس زمین پر اشرف المخلوقات بننے والا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزار کر اس درجہ تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ سننے سمجھنے والی ہستی بن جاتا ہے۔ اسے حواس کی دولت اور عقل کا جوہر عطا کیا جاتا ہے تا کہ وہ جابجا قدرت کی نشانیوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے وجود کا ادراک کر سکے۔ پھر مزید یہ کرم فرمایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر خیر و شر کے دونوں راستے کھول دیتا ہے۔ اس طرح سے اس کی زندگی کو امتحان گاہ بنا دیا جاتا ہے۔

آیت چار میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اس امتحان سے کافر بن کر نکلیں گے ان کا آخرت میں کیا انجام ہوگا۔

اس کے بعد آیت پانچ سے بائیس تک مسلسل ان انعامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے وہ لوگ نوازے جائیں گے جنہوں نے دنیا کو اب امتحان گاہ سمجھ کر امتحان کی تیاری کی ہوگی۔ مزید یہ کرم فرمایا گیا ہے کہ مختصراً ان اعمال کی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے جن کی بنا پر وہ ان انعامات کے مستحق ٹھہریں گے۔ مکی سورتوں میں اگرچہ احکام بیان نہیں ہوئے لیکن وہ اخلاقی اوصاف اور نیک اعمال بیان کر دیئے گئے ہیں جو

Marfat.com

اسلامی تربیت کیلئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔اور جن کی وجہ سے بدترین دشمنوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے شیرازے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔اس لئے مسلمانوں کو بار بار بتایا گیا ہے کہ تم اپنی موجودہ ناگفتہ بہ حالت کے باوجود اگر یہ عمدہ اخلاق اپنے اندر پیدا کرلو گے تو آخرت میں اس کا کیا کیا صلہ ملنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کیسی تمہیں سرفرازی نصیب ہونے والی ہے۔

آیت تیئس سے اٹھائیس تک آنحضرت ﷺ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کفار کا یہ اعتراض کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کرکے کیوں نازل ہو رہا ہے، اس کی طرف دھیان نہ دیجئے۔اس کو تھوڑا تھوڑا نازل کرنے والے ہم ہیں اور اس میں کیا حکمتیں مضمر ہیں وہ ہم جانتے ہیں۔لیکن بالواسطہ کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ جب اس قرآن کو نازل کرنے والے ہم ہیں تو ہم اپنی حکمت کے اقتضاء سے ایسا کرتے ہیں۔نبی کریم ﷺ اس کتاب کے لکھنے والے اور اس کلام کے گھڑنے والے نہیں ہیں۔پھر دشمن کے مقابلے میں استعانت کیلئے نماز اور ذکرِ الٰہی کی تاکید کی گئی ہے۔اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کفار کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ دنیا کے نقدِ عاجل کو آخرت کے نسیہ پر قربان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔اس بیماری پر، پردہ ڈالنے کیلئے وہ قیامت کے خلاف طرح طرح کے شبہات گھڑ رہے ہیں حالانکہ ان پر یہ بات واضح ہے کہ آپ جس چیز سے ان کو ڈرا رہے ہیں وہ ایک حقیقت ہے۔اور ہمارے لئے یہ ذرا مشکل نہیں ہے کہ جس طرح ہم نے ان کو پہلے پیدا کیا اور یہ چوڑے چکلے سینے اور مضبوط ہاتھ پاؤں انہیں دیئے، انہیں دوبارہ ان کے جوڑ بند ٹھیک کرکے اٹھا کھڑا کریں۔

آیت انتیس سے اکتیس تک مخالفین پر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ قرآنِ کریم ایک کلمۂ نصیحت ہے۔اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرکے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔اللہ تعالیٰ کے رسول کا کام صرف لوگوں کو آگاہ کردینا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے۔اللہ تعالیٰ کے رسول یاددہانی کے بعد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے اور یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ ہدایت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہدایت کے مستحق وہی لوگ ٹھہریں گے جو اس سنت کے تحت اس کے سزاوار ہوں گے، اور جسے وہ ہدایت کے قابل نہیں سمجھے گا اور یا وہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کیلئے کوشش نہیں کرے گا تو وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ۲	سُوْرَةُ الدَّهْرِ مَدَنِيَّةٌ (۷۶)	اٰيَاتُهَا ۳۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْــًٔا مَّذْكُوْرًا ۝۱
اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا
بَصِيْرًا ۝۲ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳ اِنَّآ اَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝۴ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ
كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝۵ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا
تَفْجِيْرًا ۝۶ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝۷
وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸ اِنَّمَا
نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹ اِنَّا نَخَافُ
مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ
وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝۱۱ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝۱۲
مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝۱۳
وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝۱۴ وَيُطَافُ
عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۟ ۝۱۵ قَوَارِيْرَا۟

Marfat.com

مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا
زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ
مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ
رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ
اِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا
طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

رکوع: ۱۔ (کیا گزرا ہے انسان پر کوئی وقت لامتناہی زمانے میں جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ ۱) ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا، اس کو الٹتے پلٹتے رہے یہاں تک کہ ہم نے اس کو دیکھنے سننے والا بنا دیا۔ ۲) ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ ۳) کفر کرنے والوں کیلئے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ۴) بیشک نیک لوگ ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہوگی۔ ۵) اس چشمہ سے اللہ کے خاص بندے پیئیں گے اور جہاں چاہیں گے اس کی شاخیں نکال لیں گے۔ ۶) وہ لوگ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہوگی۔ ۷) اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ۸) بلاشبہ ہم تمہیں صرف اللہ کی خوشنودی کیلئے کھلا رہے ہیں، نہ تم سے کسی بدلے کے طالب ہیں اور نہ شکریہ کے۔ ۹) ہم ڈرتے ہیں اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے جو نہایت عبوس اور سخت ترش رو ہوگا۔ ۱۰) پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچا لے گا اور انہیں تازگی اور سرور سے نوازے گا۔ ۱۱) اور ان کے صبر کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے گا۔ ۱۲) وہ اس میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، نہ اس میں گرمی کے آزار سے دوچار ہوں گے، نہ سردی کے۔ ۱۳) باغِ جنت کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے اور پست کر دیئے گئے ہوں گے لٹکا کر اس کے خوشے۔ ۱۴) اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ ۱۵) شیشے چاندی کے ہوں گے اور انہوں نے اس کو ماپ رکھا ہوگا ٹھیک اندازے سے۔ ۱۶) اور جنت میں انہیں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جن میں ملونی چشمۂ زنجبیل کی ہوگی۔

Marfat.com

۱۷) یہ اس میں ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۸) اور ان اہلِ جنت کی خدمت میں ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کو بکھرے ہوئے موتی گمان کرو گے۔ ۱۹) جب تم دیکھو گے وہاں تو دیکھو گے عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی۔ ۲۰) ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے اور وہ چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ ۲۱) بیشک یہ ہے تمہارے عمل کا صلہ، اور تمہاری کارگزاری مقبول ٹھہری ہے۔ ۲۲)

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝١

(کیا گزرا ہے انسان پر کوئی وقت لامتناہی زمانے میں جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ ۱)

هَلْ کا مفہوم

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ ...... آیت کے اس پہلے فقرے میں '' هَلْ '' کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ '' هَلْ'' قد کے معنی میں ہے جس سے جملے کے معنی میں تاکید پیدا کرنا مقصود ہے۔ لیکن بیشتر اہلِ علم اس کو استفہام ہی کے معنی میں لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ '' هَلْ '' کبھی بھی قد کے معنی میں نہیں ہوتا۔ جہاں اس کا شبہ ہوتا ہے تو وہ قلتِ فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ استفہام ہر حال میں سوال ہی کے معنی میں نہیں ہوتا، بلکہ ہماری زبان کی طرح عربی زبان میں بھی مختلف معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی تو استفہام کسی بات کو پوچھنے کیلئے آتا ہے کہ فلاں واقعہ ہوا ہے یا نہیں۔ اور کبھی انکار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی سوال اس غرض کیلئے کیا جاتا ہے کہ مقصود مخاطب کے ذہن کو کسی بات پر سوچنے کیلئے مجبور کرنا ہوتا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس مختلف اغراض اور متفرق معانی کیلئے اس کا استعمال ہوتا ہے جس کا تعین سیاق و سباق سے کیا جاتا ہے۔

آیت زیرِ بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل صرف سوال کیلئے استعمال نہیں ہوا بلکہ مخاطب کو سوچنے پر مجبور کرنے کیلئے ہے کہ جس پروردگار نے اس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر حالت سے کر کے اسے پورا انسان بنا کھڑا کیا، وہ آخر اسے دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز ہوگا۔

دَھْر سے مراد

حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ ...... دَھْر سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتداء انسان کو معلوم ہے اور نہ انتہاء۔ اور حِیْنٌ سے مراد اس لامتناہی زمانے کے اندر ایک خاص زمانہ مراد ہے جس میں کوئی ایسی کام وجود میں آیا ہو جو گفتگو کرتے ہوئے متکلم کے پیشِ نظر ہو۔ اس لحاظ سے اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ ایک ایسا زمانہ جو ازل اور ابد کی شان رکھتا ہے اس کے ایک مخصوص زمانے میں انسان کی تخلیق کا فیصلہ ہوا اور اسے عدم سے وجود میں لانے کا آغاز ہوا۔ اس سے مراد وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب حضرت آدم علیہ السلام کو وجود دیا گیا۔ اور اگر سائنس کی تشریح کو پیشِ نظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ وقت ہے جب وہ ایک جرثومے کی شکل میں وجود میں آیا اور پانی، کیچڑ، مٹی کے اندر رینگنے والی

Marfat.com

ایک حقیر مخلوق کی حیثیت اختیار کی۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے اور اکثر اہلِ علم نے اسی کو مراد لیا ہے کہ اس سے مراد وہ وقت ہے جب میاں بیوی کے اتصال سے ایک نئے انسان کی تخلیق کا آغاز ہوا۔

لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ...... جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تخلیق کا آغاز تو ہو گیا تھا لیکن ابھی وہ ایسے مرحلے میں تھا کہ انسان کی حیثیت وعظمت کو دیکھ کر اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، جس کی تفصیل بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ ہے کہ میاں بیوی کے اتصال سے پہلے باپ کے نطفے میں پیدا ہونے والے بچے کا ایک حصہ خوردبینی کیڑے کی شکل میں موجود ہوتا ہے اور دوسرا حصہ ماں کے نطفے میں ایک خوردبینی بیضے کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ یہ تجزیہ آج کا انسان تو کرسکتا ہے لیکن بہت مدت نہیں گزری جب انسان یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ باپ کے نطفے کے کیڑے اور ماں کے نطفے کے بیضے کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ اب طاقتور خوردبینوں سے ان دونوں کو دیکھ تو لیا گیا ہے لیکن اب بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنا انسان باپ کے اس کیڑے میں اور کتنا انسان ماں کے اس بیضے میں موجود ہوتا ہے۔ پھر استقرارِ حمل کے وقت ان دونوں کے ملنے سے جو ابتدائی خلیہ (Cell) وجود میں آتا ہے۔ ایک ایسا ذرۂ بے مقدار ہوتا ہے کہ بہت طاقتور خوردبین ہی سے نظر آسکتا ہے اور اسے دیکھ کر بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی انسان بن رہا ہے یا کچھ اور۔ اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس حقیر سی ابتداء سے نشو ونما پا کر کوئی انسان اگر بنے گا بھی تو وہ کس قد وقامت، کس شکل وصورت، کس قابلیت اور شخصیت کا انسان ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جس پروردگار نے ایک ناقابلِ ذکر چیز کو مختلف مراحل سے گزار کر ایک ایسے انسان کی شکل میں پیدا کیا جو کائنات کا گلِ سرسبد اور اشرف المخلوقات ہے کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ تمام کائنات کو تباہ کرنے کے بعد نئی تخلیق سے ہر چیز کو بروئے کار لائے اور انسانوں کو میدانِ حشر میں جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٢﴾

(ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا، اس کو الٹتے پلٹتے رہے یہاں تک کہ ہم نے اس کو دیکھنے سننے والا بنا دیا۔ ۲)

انسان کو مزید غور کی دعوت

انسان کو ناقابلِ ذکر حالت اور بے قدر وقیمت حیثیت سے نکال کر جن مراحل سے گزارتے ہوئے ایک بالا قامت شخصیت کی حیثیت سے پیدا کیا، اس آیتِ کریمہ میں ان میں سے چند مراحل کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور امشاج سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ امشاج، مشج اور مشیج کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ملی جلی اور مخلوط چیز۔ یہ اگرچہ جمع ہے لیکن ان الفاظ میں سے ہے جو جمع ہونے کے باوصف مفرد الفاظ کی صفت کے طور پر آتے ہیں۔ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ انسان کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا گیا ہے، لیکن وہ بھی اس طرح نہیں کہ یہ تخلیق صرف باپ کے نطفے سے ہوئی ہو، بلکہ انسان کی پیدائش باپ اور ماں کے مخلوط نطفے سے ہوئی ہے۔ باپ کے نطفے سے ایک خوردبینی کیڑا ماں کے نطفے کے ایک خوردبینی بیضے میں داخل ہوتا ہے تو تب استقرارِ حمل ہوتا ہے۔ یہ مخلوط نطفہ ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اور یا نطفہ کے مخلوط ہونے سے مراد اس کا مختلف قویٰ وعناصر سے مرکب ہونا ہے۔

Marfat.com

نَبْتَلِيْهِ ...... مفسرین نے اس کی دوطرح سے تاویل کی ہے۔بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ بیانِ علت کے مفہوم میں ہے اور اس سے پہلے لام علت محذوف ہے۔اور لام علت کے بغیر کسی فعل کا علت کے مفہوم میں استعمال عربی زبان میں عام شائع وذائع ہے۔ اسے قابلِ اعتراض نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے جس بالا قامت حیثیت سے پیدا کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مقصد تخلیق باقی مخلوقات سے بالکل الگ اور بلند ہے۔اس کی سطح درختوں اور جانوروں جیسی نہیں کہ اس کا مقصدِ تخلیق یہیں پورا ہوجائے اور وہ قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدت تک اپنے حصے کا کام کرکے یہیں مرکر فنا ہوجائے۔اور نہ اس کیلئے اس دنیا کو دارالعذاب ٹھہرایا گیا ہے جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں۔اور نہ دارالجزاء ہے جس طرح ہندوؤں کو غلط فہمی ہوئی اور وہ تناسخ کے چکر میں پڑ گئے۔اور نہ یہ دنیا عشرت کدہ، چراگاہ اور تفریح گاہ ہے جیسا کہ مادہ پرست سمجھتے ہیں کہ یہاں دنیا میں انسان دادِعیش دینے کیلئے آیا ہے اس کے سوا اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔اور نہ یہ دنیا رزم گاہ ہے جیسا کہ ڈارون اور مارکس کے پیرو سمجھتے ہیں، بلکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے امتحان گاہ بنائی ہے۔ نَبْتَلِيْهِ سے اسی کو واضح کیا گیا ہے۔انسان کی عمر امتحان کا وقت ہے اور اس کو دی جانے والی قوتیں اور صلاحیتیں اور مختلف اشیاء پر تصرف کے مواقع وہ سب اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں اور زندگی کی آخری سانس تک اس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک نَبْتَلِيْهِ ابتلاء سے ہے۔لغت میں اس کا معنی جانچنا اور پرکھنا ہے۔آدمی جب کسی چیز کو جانچتا ہے تو اس کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ کر اور ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔یہیں سے اس کے اندر الٹنے پلٹنے اور ایک مرحلے سے گزار کر دوسرے مرحلے میں لے جانے کا مفہوم بھی پیدا ہوگیا۔چنانچہ اس آیت میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ اسے بیانِ علت کے مفہوم میں نہیں بلکہ حال کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس طرح پیدا کیا کہ درجہ بدرجہ اس کو مختلف اطوار ومراحل سے گزارتے ہوئے ایک سمیع وبصیر مخلوق کے درجے تک پہنچادیا۔

سمیع اور بصیر کا لفظی معنی تو سننے والا اور دیکھنے والا ہے، لیکن حیوان کیلئے یہ دونوں لفظ کبھی استعمال نہیں ہوتے، حالانکہ وہ انسان سے زیادہ سنتا اور دیکھتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد سماعت اور بینائی کی قوتیں نہیں ہیں بلکہ وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانچ حواس دوسرے لفظوں میں علم کے پانچ ذرائع دیئے ہیں، لیکن ان میں سے سماعت اور بصارت کے ذکر پر اکتفا کرنا دراصل ان کی اہمیت کی وجہ سے ہے ورنہ اس سے مراد تمام حواس ہیں۔اور مزید برآں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ قرآنِ کریم میں کئی جگہ سمع اور بصر کے ساتھ فؤاد کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے مراد عقل ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے ہر حاسہ کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ بھی موجود ہے جو حواس کے ذریعہ سے آنے والی معلومات کو جمع کرکے اور ان کے ترتیب دے کر ان کے نتائج نکالتا، رائے قائم کرتا اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر ان کا رویۂ زندگی مبنی ہوتا ہے۔حاصل کلام یہ کہ سمیع بصیر درحقیقت انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔انہی صفات کے فیض سے انسان کے اندر خیر وشر میں امتیاز کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس کو امتحان کا مکلف بنائے۔

إِنَّا هَدَيْنَٰهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴿٣﴾

(ہم نے اس کو راستہ دکھادیا چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ ۳)

Marfat.com

انسان کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت

انسان کو زندگی گزارنے اور دنیا و عقبیٰ کے بارے میں صحیح فیصلے کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ محسوسات سے فائدہ اٹھانے کیلئے حواس عطا کیے، اور حواس سے نتائج اخذ کرنے اور استنباط اور استنتاج کی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے جوہرِ عقل سے نوازا۔ لیکن انسان کی کتنی ضرورتیں ایسی ہیں جو حواس اور عقل سے پوری نہیں ہوتیں۔ عقل سے انسان یہ تو جان سکتا ہے کہ میرا کوئی نہ کوئی خالق ہے، اس کائنات کو بھی کسی نے پیدا کیا ہے۔ لیکن اس خالق کی صفات کیا ہیں، بندوں اور اس کے درمیان رشتہ کیا ہے، کائنات سے انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے، زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے، موت کے بعد کیا کیفیت پیش آنے والی ہے، عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کیا ہے، زندگی کے اخلاقی مسلمات کیا ہیں، فضائل اور رذائل میں حدِ فاصل کیا ہے؟ اسی طرح کے اور بھی بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب عقل کے پاس نہیں۔ بالخصوص خیر و شر کا امتیاز، اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان رشتہ، عالمِ آخرت، انسانی تعلقات کی نوعیت، نیکی اور برائی کا حقیقی تصور۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن پر دنیا و عقبیٰ کی کامرانی کا دارومدار ہے اور اس میں صحیح راستے کا پالینا اور حقیقت کے رشتے کو تھام لینا انسانی حواس اور عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے حواس اور عقل کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت میں تقویٰ اور فجور کا الہام کیا۔ انسان کے اندر اخلاقی حس رکھی گئی۔ نفسِ لوامہ یا ضمیر کی شکل میں اس کے اندر ایک چوکیدار بٹھایا گیا۔ امتوں کے تاریخی واقعات کو بہت سے حقائق کا شاہد بنایا گیا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ وحیِ الٰہی کے ذریعے ہر مشکل کی عقدہ کشائی کی گئی۔ اسی چیز کو راستہ دکھانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اسی کو ہدایت کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کیلئے صراطِ مستقیم کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ حاصل سب کا ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور اس کی کتابوں نے انسانوں پر یہ حقیقت واشگاف کردی کہ دنیا نے بے شمار غلط اور الٹے سیدھے راستے نکالے ہیں، ان میں سیدھا راستہ وہ ہے جو پیغمبر لے کے آئے، جسے فطرت قبول کرتی، عقل تسلیم کرتی اور ضمیر اس کی گواہی دیتا ہے۔

پھر اس راستے پر چلنے کیلئے کسی پر جبر نہیں کیا گیا بلکہ نیکی اور بدی کا امتیاز دے کر انسان کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہے تو نیکی کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو بدی کی راہ چلے۔ نیکی کی راہ کو شکر کا راستہ کہا گیا ہے اور برائی کے راستے پر چلنے کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ جو شخص نیکی کی راہ اختیار کرے گا وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنے گا۔ اور جو برائی کا راستہ اختیار کرے گا وہ ناشکرا بنے گا اور اس کی سزا بھگتے گا۔

اِنَّـآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ④

(کفر کرنے والوں کیلئے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ۴)

غلط انتخاب کا نتیجہ

گزشتہ آیت میں فرمایا گیا کہ ہم نے انسانوں کو خیر و شر کی تمیز دینے کے بعد صحیح راستے کی ہدایت دے دی۔ اپنے پیغمبروں اور اپنی کتابوں کے ذریعے ان پر پوری طرح یہ حقیقت واشگاف کردی کہ صحیح راستہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے اور غلط راستہ کفر کرنا ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے کہ دونوں راستوں میں جو چاہو اختیار کرلو۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ چونکہ دونوں راستے یکساں نہیں ہیں، ایک صحیح ہے اور دوسرا

Marfat.com

غلط۔تو یہ نہیں ہوسکتا کہ دونوں راستوں پر چلنے والے یکساں ہوں اور ان کا انجام بھی ایک جیسا ہو۔صحیح راستے پر چلنے والے یقیناً انعام کے مستحق ہوں گے۔اور غلط راستوں پر چلنے والے سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔بنابریں پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اعلان کر دیا گیا کہ جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہم انہیں بتائے دیتے ہیں کہ قیامت کے دن انہیں زنجیریں پہنائی جائیں گی، ان کے گلوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور پھر انہیں بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴿٥﴾
عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ﴿٦﴾

(بیشک نیک لوگ ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہوگی۔ ۵) اس چشمہ سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور جہاں چاہیں گے اس کی شاخیں نکال لیں گے۔ ۶)

شکر گزاروں کا انعام

گزشتہ آیت میں کافروں کی سزا کو ذکر کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندوں پر انعامات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔اور شکر گزار بندوں کو ابرار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ابرار سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ایمان کی صورت میں جو عہد و پیمان کر چکے ہیں اس کے ادا کرنے والے ہیں۔اور اس عہد و پیمان کے تقاضوں کی صورت میں جن اوامر و نواہی سے انہیں سابقہ پیش آتا ہے ان کی تعمیل کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں کیونکہ ''بِر'' کی اصل روح یہی ایفائے عہد ہے۔جو شکر گزاری کا حاصل بھی ہے اور ایمان کی علامت بھی۔ان کے انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ساغر پئیں گے،ساغر ظرف ہے،لیکن بعض دفعہ ظرف مظروف کے معنی میں یا دونوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اس لئے یہاں'' کاس '' سے مراد شراب کے جام یا ساغر ہیں۔

مزاج کے معنی ملونی کے ہیں۔کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اوقات لذت یا خوشبو کیلئے استعمال کے وقت بعض چیزیں ملائی جاتی ہیں۔عرب بھی اس طرح کی ملونیوں کے عادی تھے اور ان کے شعراء اپنے اشعار میں بھی برملا اس کا تذکرہ کرتے تھے۔اہلِ جنت کو جو شراب دی جائے گی وہ چشمۂ کافور کے آبِ زُلال کو ملونی کے طور پر استعمال کریں گے۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک کافور جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے۔ان کا خیال ہے کہ شراب میں لذت و کیف بڑھانے کیلئے اس چشمہ کا پانی شامل کیا جائے گا۔دوسری آیت میں عَیْنًا ترکیب نحوی میں کافور کا بدل بھی ہوسکتا ہے۔اس صورت میں یہ متعین ہو جاتا ہے کہ آیتِ مذکورہ میں کافور سے مراد چشمۂ جنت ہے۔یعنی کافور ایک چشمے کا نام ہے۔اس کے کنارے بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے خاص بندے شراب نوش کریں گے۔رہی یہ بات کہ اس کا نام کافور کیوں رکھا گیا ہے،اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کیونکہ اس کا تعلق متشابہات سے ہے۔

یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ...... اور اس کی شاخیں جدھر چاہیں گے نکال لیں گے۔ تَفْجِیْر کے معنی کسی چشمہ کی بہت سی شاخیں نکال کر جال بچھا دینا ہے۔مطلب یہ ہے کہ چشمہ تو ایک جگہ ہوگا لیکن اس کی شاخیں جنت میں ہر اس جگہ پہنچ چکی ہوں گی جہاں اہلِ جنت چاہیں گے۔گویا کہ انہیں اس چشمے تک پہنچنے کیلئے چل کے جانا نہیں پڑے گا، بلکہ چشمہ خود چل کر ان تک پہنچے گا اور وہ اس کی لذتوں اور اس کی سیر سے بغیر کسی زحمتِ سفر سے خوش وقت اور شاد کام ہوں گے۔

Marfat.com

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ⑦

(وہ لوگ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہوگی۔ ۷)

ابرار کی پاکیزہ فطرت اوران کی صفات

کسی نیک کام کرنے کا عہد کرلینا اور اسے اپنے اوپر لازم کرلینا اسے نذر کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے جنہیں ابرار کے نام سے یاد کیا گیا ہے جن کی فطرت اور سرشت میں ایفائے عہد کی روح کارفرما ہے۔ وہ جب کسی نیک کام کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے اپنے اوپر لازم کرلیتے ہیں تو پھراسے پورا کرنا ازبس ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی اس خوبی کو اس سیاق وسباق میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جن نیک بندوں کا حال یہ ہے کہ وہ خود جس نیکی کے کام کو اپنے اوپر لازم کرلیں تو اس کی مخالفت کرنے کا تصور نہیں کرسکتے تو ان کے بارے میں یہ کیسے سوچا جاسکتا ہے کہ جو کام اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم کر رکھے ہیں جو ان کے فرائض اور واجبات میں شامل ہیں اور جنہیں بجالانے کا انہوں نے عہد کررکھا ہے وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ تو کہنا صرف یہ ہے کہ ابرار کی اصل علامت اور پہچان یہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اور ساری زندگی بقدرِ ہمت اللہ تعالیٰ کے وفادار، اس کے شریعت کے پابند اور اس کے رسول کی سنت کے اتباع کرنے والے ہیں۔

نذر کی حقیقت کو جاننے کیلئے تو جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ کافی ہے۔ البتہ اس کی تفصیلات کیلئے فقہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑے گی اور یہ اوراق اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ البتہ بہت اختصار کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن طبیعتوں میں نیکی کا جذبہ ہوتا ہے وہ بعض دفعہ اس جذبے کے ہاتھوں مجبور ہوکر بعض ایسے نیکی کے کام اپنے اوپر لازم کرلیتے ہیں جسے مذہب نے لازم نہیں کیا ہوتا۔ اس لحاظ سے نذر کا تصور اسلام کا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کی اہمیت سابق ادیان میں بھی رہی ہے۔ وہ لوگ بھی جب کوئی نیکی کا کام کرنا چاہتے تو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، نذر مان لیتے تھے۔ اسلام نے اس تصور کی تہذیب کرتے ہوئے اس کے بارے میں تفصیلی احکام دیئے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر فقہاء نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرے کہ وہ اس کی رضا کی خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میری فلاں حاجت پوری کردی تو میں شکرانے میں فلاں نیک کام کروں گا۔ یہ دونوں قسم کی نذریں فقہاء کی نگاہ میں بالکل صحیح ہیں اور اس پر اتفاق ہے کہ انہیں پورا کرنا واجب ہے۔ اور ان دونوں قسموں کی نذروں کو فقہاء کی اصطلاح میں نـذرِ تبرّر کہا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ آدمی کسی ناجائز کام کو کرنے یا کسی واجب کام کے نہ کرنے کا عہد کرے۔ چوتھے یہ کہ آدمی مباح کام کرنے کو اپنے اوپر لازم کرلے یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا یا کوئی خلافِ اولیٰ کام کرنے کا عہد کرلے۔ ان میں سے تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی۔ اور چوتھی قسم کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اسے پورا کرنا چاہئے، بعض کہتے ہیں کہ قسم توڑنے کا کفارہ ادا کردینا چاہئے اور بعض کہتے ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے خواہ نذر پوری کرے یا کفارہ ادا کرے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں اس اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن پہلی تینوں قسم کی نذروں کے بارے میں فقہاء کی آرا بالکل واضح ہیں اور وہی ہماری رہنمائی کیلئے کافی ہیں۔

Marfat.com

وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ...... مُسْتَطِير، کا معنی عام اور ہمہ گیر ہے۔اسے ابرار کی نئی صفت بھی کہا جا سکتا ہے اور ایفائے نذر کی علت بھی۔ اگر نئی صفت قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے جنہیں ابرار کہا گیا ہے وہ ہمیشہ اندیشۂ آخرت سے گراں بار رہتے ہیں۔ان کا ہر فرد چاہے وہ کیسی ہی ذاتی حیثیت کا مالک ہو، آخرت کی ہولناکی سے لرزاں و ترساں رہتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس دن کی ہولناکی اس قدر ہمہ گیر اور عام ہوگی کہ کوئی شخص بھی اس کی دست برد سے بچا ہوا نہیں ہوگا۔ وہی لوگ اس سے محفوظ رہیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے گا۔

اور اگر اسے ایفائے نذر کی علت قرار دیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر تو ہر وقت کاربند رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے سرتابی کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ بلکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے زائد بھی کسی نیکی کی نذر مان لیتے ہیں تو اس کا بھی ایفاء کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ایک ایسے دن سے واسطہ پڑنے والا ہے جس کی آفت نہایت عام اور ہمہ گیر ہوگی۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴿۸﴾

(اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ۸)

ابرار کی ایک اور صفت

ابرار کی ایک اور صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ مسکینوں یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ عَلٰى حُبِّهٖ سے اس کی علت بیان کی گئی ہے۔ مفسرین میں اس کی ضمیر کے مرجع سے متعلق اختلاف ہوا ہے۔ بعض مفسرین ضمیر کا مرجع طعام کو قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ خود طعام کے محتاج ہوتے ہیں اور ان کے گھر میں کھانے کا سامان اتنا ہی ہوتا ہے جس سے وہ اپنے بچوں کا اور اپنا پیٹ بھر سکیں، لیکن جب کوئی مسکین، یتیم یا قیدی ان سے کھانے کی درخواست کرتا ہے تو وہ اپنے اوپر اسے ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اس کی تائید میں اس ارشادِ خداوندی سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا درجہ حاصل کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ آدمی ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے جس کا وہ خود حاجت مند ہو اور جو چیزیں اس کو محبوب ہوں۔ اسی طرح قرآنِ کریم نے ان لوگوں کی فضیلت بیان کی ہے کہ وہ ضرورت مندوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں چاہے وہ خود بھوکے ہوں۔

دیگر مفسرین نے عَلٰى حُبِّهٖ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو اس لئے کھانا کھلاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ ادا بہت پسند ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اس کی محبت میں ضرورت مندوں کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس بات پر دلیل قائم کرتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد کی آیت میں صاف کہا گیا ہے کہ ہم جو تمہیں کھانا کھلا رہے ہیں تو لِوَجْهِ اللّٰهِ کھلا رہے ہیں، یعنی اللہ کی محبت میں کھلا رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مفسرین کی آرا میں جس اختلاف کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ محض لفظی اختلاف ہے۔ کیونکہ اگر عَلٰى حُبِّهٖ کی ضمیر کا مرجع طعام کو قرار دیا جائے تو جب بھی اس کا مفہوم اس سے مختلف نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس کے کہ انہیں خود طعام کی سخت ضرورت تھی لیکن اپنی ضرورت پر انہوں نے دیگر ضرورتمندوں کو ترجیح دی۔ تو اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب ہیں اور انہوں نے

Marfat.com

یہ قربانی محض اللہ تعالیٰ کی محبت میں دی ہے۔ اور اگر اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دیا جائے تو جب بھی مفہوم یہی رہتا ہے کہ انہوں نے اپنی ضرورت کے کھانے کو دوسروں کو کھلا کر جو قربانی دی ہے تو اس کی وجہ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت ہے۔

آیت میں لفظِ اطعام یعنی کھانا کھلانا محدود معنی میں نہیں۔ زندگی کی دیگر ناگزیر ضروریات بھی اس میں شامل ہیں۔ قرآنِ کریم میں اور بھی کئی مواقع پر اس لفظ کو وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی اس فضیلت کا تعلق صرف کھانا کھلانے سے نہیں بلکہ زندگی کی ہر ضرورت پورا کرنے سے ہے۔ اگر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے اور مریض کا علاج کرایا جائے اور موسم کی شدت میں مبتلا شخص کو گھر کا حصار مہیا کیا جائے تو سب باتیں بھی اس کے مصداق میں شامل ہیں۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝٩

اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝١٠

(بلاشبہ ہم تمہیں صرف اللہ کی خوشنودی کیلئے کھلا رہے ہیں، نہ تم سے کسی بدلے کے طالب ہیں اور نہ شکریہ کے۔ ۹)

ہم ڈرتے ہیں اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے جو نہایت عبوس اور سخت ترش رو ہوگا۔ ۱۰)

ابرار ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب

آیت کے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جب کسی کو کھانا کھلاتے ہیں یعنی کسی ضرورت میں اس کی مدد کرتے ہیں تو اسے کہہ دیتے ہیں کہ ہم محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے ایسا کر رہے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکریئے کا مطالبہ نہیں کرتے۔ اگر اس کا یہ ظاہری معنی مراد لیا جائے تو جب بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ جب کوئی شخص کسی پر کوئی احسان کرتا ہے تو احسان لینے والا برابر اس خیال کی گرفت میں رہتا ہے کہ یہ شخص کبھی نہ کبھی اپنا احسان جتلا کر مجھے شرمندہ کرے گا، یا وہ اس تصور سے پریشان ہوتا رہتا ہے کہ میں کس طرح اس کے احسان کا بدلہ اتار سکوں گا۔ اس لئے ایسے موقع پر اگر یہ وضاحت کر دی جائے کہ میں محض اللہ تعالیٰ کیلئے یہ احسان کر رہا ہوں تو اس سے ممنونِ احسان آدمی کی عزتِ نفس کو بہت تقویت ملے گی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا یہ مفہوم لیا جائے کہ دینے والا زبان سے تو کچھ نہ کہے، لیکن اس کے دل میں یہ احساس ہونا چاہئے کہ میں جس شخص پر احسان کر رہا ہوں میں کبھی بھی اس سے اس کے بدلے یا شکر گزاری کا تقاضا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ کام میں نے سراسر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے کیا ہے تو میرے اس احساس میں کوئی دوسرا احساس شامل نہیں ہونا چاہئے۔

يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ...... عَبُوْس کے معنی ترش رو اور روکھے پھیکے کے ہیں۔ قَمْطَرِيْر کا معنی ہے، اکھڑ، اکل کھرا اور ترش مزاج۔ یہ دونوں لفظ یوم کی صفت کے طور پر آئے ہیں۔ اور یوم سے مراد یوم آخرت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے یہ سوچ کر ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا سہارا لیتے ہیں کہ ہمیں قیامت میں ایک ایسے دن سے واسطہ پڑنے والا ہے جو ایسا روکھا پھیکا، اکل کھرا اور ترش مزاج ہوگا کہ اس میں کوئی بھی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن سابقہ ہر ایک کو اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت صرف انہیں لوگوں پر مہربان ہوگی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں ناداروں اور ضرورتمندوں کی سرپرستی کی ہوگی اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دی ہوگی۔

Marfat.com

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴿۱۱﴾

(پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور سرور سے نوازے گا۔ ۱۱)

ابرار پر اللہ تعالیٰ کا انعام

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے چونکہ دنیا میں آخرت کے اس دن سے بچنے کیلئے جو نہایت ترشرو، روکھا پھیکا اور اکھڑ ہوگا دوسروں پر اپنی ضرورتوں کا ایثار کرتے رہے اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کو مقصود بنایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو قیامت میں یہ صلہ عطا فرمائے گا کہ اس عبوس اور قمطریر دن میں ان کے دلوں کو تازگی بخشے گا اور ان کے سینوں کو سرور سے بھر دے گا۔ یعنی قیامت کے دن کی ساری سختیاں اور ہولناکیاں صرف کفار اور مجرمین کیلئے ہوں گی۔ ان سب کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک بندے نہایت ہشاش بشاش خوش وخرم ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے بعض دوسرے مواقع پر بیان کیا ہے کہ قیامت کی انتہائی گھبراہٹ کا وقت بھی انہیں پریشان نہیں کرے گا۔ ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾

(اور ان کے صبر کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے گا۔ ۱۲)

صبر کی صفت کا صلہ

جنت سے مراد جنت کی ساری نعمتیں اور وہ عیشِ دوام ہے جس سے اہلِ جنت بہرہ مند ہوں گے اور حریر سے مراد بیش قیمت لباس، اعلیٰ رہائش گاہیں اور وہ بڑے بڑے مناصب ہیں جن سے اہلِ جنت کی عزت افزائی کی جائے گی اور یہ سب کچھ انہیں اس لئے ملے گا کہ انہوں نے دنیا میں صبر دکھایا۔ ایمان لانے کے بعد ہر طرح کی مخالفتوں سے واسطہ پڑا۔ کبھی ڈرایا گیا، کبھی بہکایا گیا، لیکن ان کے ضبط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ دنیوی معاملات میں ناجائز خواہشوں کو دبا کر رکھا، اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کی پابندی کی، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے زندگی کا ہر اثاثہ قربان کر دیا، نہ کبھی ترغیب کی گرفت میں آئے نہ ترہیب سے ہراساں ہوئے۔ صراطِ مستقیم پر اس طرح چلتے رہے کہ دنیا کی کوئی آلودگی ان کے دامن کو گندہ نہ کر سکی۔ یہ وہ صبر ہے جس کے ساتھ انہوں نے زندگی گزاری، یعنی مخالفتوں کے مقابلے میں صبر، اطاعتوں کی پابندی میں صبر اور خواہشات کے مقابلے میں صبر۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت اور حریر سے بہرہ ور فرمائے گا۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾

(وہ اس میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، نہ اس میں گرمی کے آزار سے دوچار ہوں گے، نہ سردی کے۔ ۱۳)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ ابرار کو جنت میں ایسی شان وشوکت عطا فرمائے گا کہ وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے اور گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے بالکل محفوظ ہوں گے۔ سورج سے مراد سورج کی گرمی اور تپش ہے اور زَمْهَرِيْر سے مراد سخت سردی کی اذیت ہے۔ وہاں سورج کی روشنی اور اس کی قوت بخشی تو ہوگی مگر اس میں حدت وتمازت نہ ہوگی۔ جنت کے موسم ہمیشہ خوشگوار، معتدل اور پُر بہار رہیں گے۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿١٤﴾

(باغ جنت کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے اور پست کردیئے گئے ہوں گے لٹکا کر اس کے خوشے۔ ۱۴)

موسم کی لذت اور سایوں کی برودت سے اہلِ جنت اس طرح مسرور ہو رہے ہوں گے کہ وہ سائے ان کے سروں پر پھیلے ہوئے ہوں گے۔ اور پھلوں کے خوشے اس طرح ان کے سروں پر لٹک رہے ہوں گے کہ بالکل ان کی دسترس کے اندر ہوں گے۔ کسی چیز کے حاصل کرنے کیلئے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی پڑے گی۔

خوش ذوق لوگ جانتے ہیں کہ پھلوں کے ڈھیر سے اچھے سے اچھا پھل اٹھا کے کھانا اور درخت سے توڑ کر پھل کھانے میں کیا فرق ہے۔ اور اگر وہ پھل انسان کی دسترس میں ہو تو توڑنے والے کو پہلے اس کی خوشبو شاد کام کرتی ہے اور پھر اس کی لذت کام ودہن کا سامان بنتی ہے۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ﴿١٥﴾
قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿١٦﴾

(اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ ۱۵
شیشے چاندی کے ہوں گے اور انہوں نے اس کو ماپ رکھا ہوگا ٹھیک اندازے سے۔ ۱۶)

اہلِ جنت کی خوش عیشی کا عالم یہ ہوگا کہ چاندی کے ظروف اور شیشے کے پیالے ان کے سامنے گردش میں رکھے جائیں گے۔ یہ شیشہ دیکھنے میں شیشہ ہوگا حقیقت میں یہ پیالے بھی چاندی کے ہوں گے جو شیشے کی طرح شفاف ہوں گے۔ البتہ دنیا میں ایسی شفاف چاندی کا وجود نہیں پایا جاتا۔ ایسی چاندی کے برتن صرف جنت میں پائے جاتے ہیں۔

سورۃ زخرف آیت ۷۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ "اہلِ جنت کے سامنے سونے کے برتن گردش میں ہوں گے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کی ضیافتِ طبع کیلئے کبھی سونے کے برتن استعمال ہوں گے اور کبھی چاندی کے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں طرح کے برتن ملے جلے ہوں۔ کیونکہ آج بھی دنیا میں مختلف دھاتوں سے بنے ہوئے اور مختلف قسم کے ظروف ایک ہی ٹیبل پر استعمال کرنے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ اہلِ جنت اپنے ذوق کے مطابق کبھی سونے کے برتن استعمال کریں اور کبھی چاندی کے۔ کیونکہ ہر نعمت کیلئے ظرف بھی مخصوص ہوتا ہے۔ بڑے لوگوں کے یہاں بعض کھانے ایک طرح کے برتنوں میں پیش کئے جاتے ہیں اور بعض کھانے دوسری طرح کے برتنوں میں۔

Marfat.com

تقدیر کا مفہوم

قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ...... بعض اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ یہ ظروف اور پیالے مختلف شکلوں اور مختلف پیمانوں کے بنے ہوں گے اور خدام نے ان کو نہایت قرینہ اور حُسنِ سلیقہ سے الگ الگ خانوں میں سجا کر رکھا ہوگا تا کہ حالات، وقت، ضرورت اور مطلوب شے کی مناسبت سے جس قسم کے ظروف کی ضرورت ہو پیش کیے جا سکیں۔

بعض دیگر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کیلئے اس کی خواہش کے ٹھیک اندازے کے مطابق ساغر بھر بھر کے دیئے جائیں گے۔ وہ ایسے ساقی ہوں گے جو پینے والوں کے ذوق کو پہچانتے ہوں گے۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾

(اور جنت میں انہیں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جن میں ملونی چشمۂ زنجبیل کی ہوگی۔ ۱۷

یہ اس میں ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۸)

زنجبیل اور سلسبیل کا مفہوم

اس سے پہلے ایک اور شراب کا ذکر کیا گیا تھا جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہوگی۔ پیشِ نظر آیت میں اب ایک اور شراب کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اہلِ جنت کو پلائی جائے گی جس میں چشمۂ زنجبیل کی ملونی ہوگی۔ یہ بھی جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ ہے۔ جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ زنجبیل کا معنی سونٹھ ہے۔ اہلِ عرب چونکہ شراب کے ساتھ سونٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے اس لئے فرمایا گیا کہ وہاں ان کو وہ شراب پلائی جائے گی جس میں سونٹھ کی آمیزش اور ملونی ہوگی، لیکن اس کی آمیزش کی صورت یہ نہ ہوگی کہ اس کے اندر سونٹھ ملا کر پانی ڈالا جائے بلکہ یہ قدرتی چشمہ ہوگا جس میں سونٹھ کی خوشبو تو ہوگی مگر اس کی تلخی نہ ہوگی۔

زنجبیل کے مشہور معنی سونٹھ کے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت کیا ہے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اسی طرح سلسبیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایسا پانی ہے جو میٹھا ہلکا اور خوشذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے بسہولت گزر جائے۔ زجاج کے نزدیک اس کے معنی رواں دواں کے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بعض ناموں سے آگاہ کر دیا۔ قیامت آئے گی تو اس کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾

(اور ان اہلِ جنت کی خدمت میں ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کو بکھرے ہوئے موتی گمان کرو گے۔ ۱۹)

Marfat.com

اہلِ جنت کے خدام

اہلِ جنت کی خدمت کیلئے جن خدام کو لگایا جائے گا وہ بڑی عمر کے لوگ نہیں بلکہ نوخیز لڑکے ہوں گے جنہیں قرآنِ کریم میں غلمان کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اپنی عمر کے اعتبار سے وہ یقیناً نہایت چاک و چوبند، چست اور سرگرم ہوں گے جو خدمت کر کے لطف اٹھائیں گے اور اہلِ جنت ان کی خدمت کے انداز سے محظوظ ہوں گے۔ مزید فرمایا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ نوجوان ہی رہیں گے۔ ان کے سن و سال میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جس کی وجہ سے ان کی مستعدی برابر قائم رہے گی اور مسلسل خدمت کا فرض انجام دینے کی وجہ سے ان کے اندر مخدوموں کا مزاج، عادت اور ذوق پہچاننے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے گی۔

دنیا میں بعض ایسی کمزوریاں ہیں جن کا تدارک ممکن نہیں۔ نوجوانی میں مستعدی، سرگرمی اور جوش پایا جاتا ہے لیکن تجربے میں کمی کے باعث مختلف مزاجوں کو سمجھنے کی صلاحیت میں کمی رہتی ہے اور جن لوگوں میں مسلسل تجربے کے باعث صلاحیت توانا ہو جاتی ہے وہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ چستی اور سرگرمی سے محروم ہو جاتے ہیں جبکہ خدمت کیلئے ان دونوں کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان خدام کو ان دونوں جوہروں سے مالا مال رکھیں گے تاکہ اہلِ جنت کی خدمت میں کبھی کمی نہ رہے۔

اِذَا رَاَیْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ...... احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے والا ہر شخص جوانِ رعنا ہوگا، حُسنِ صورت میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اس کی شخصیت خوشیوں کا مرقع اور مسرتوں کی خوشبو بکھیرنے والی ہوگی۔ اس کا ذوق نہایت پاکیزہ، نہایت بلند اور نہایت نازک ہوگا۔ ایسے لوگوں کی خدمت کیلئے یہ کیسے ممکن تھا کہ سلوٹوں سے اٹے ہوئے چہرے، میلے کچیلے ہاتھ اور بے ذوقی کے پتلے ان کے گرد جمع کر دیئے جاتے جو انہیں بجائے خوشیاں دینے کے تکدر کا ذریعہ بنتے۔ جنت چونکہ خوشیوں کا مرکز اور ہر طرح کے آزار سے پاک جگہ کا نام ہے اس لئے جس چیز سے تکدر کا شبہ بھی ہوتا ہو اس کے وہاں داخلے کی بھی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس لئے خدام ایسے رکھے گئے جن کے جمال، جن کی نظافت، جن کی خوش ادائی اور جن کی خوش لباسی کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوگا جیسے یہ انسانی شکلوں میں چمکتے ہوئے موتی ہیں جو اہلِ جنت میں خدمت کی غرض سے بکھیر دیئے گئے ہیں۔

وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْكًا كَبِیْرًا ﴿۲۰﴾

(جب تم دیکھو گے وہاں تو دیکھو گے عظیم نعمت اور عظیم پادشاہی۔ ۲۰)

جنت کی حیرت انگیز تصویر

جنت کی اس سے بہتر تصویر کشی نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی مسکن کے بارے میں خوبصورت سے خوبصورت تصور اس سے زیادہ نہیں باندھا جا سکتا کہ وہاں زندگی کی ہر نعمت میسر ہو اور آدمی اپنے آپ کو یوں محسوس کرے کہ یہاں کی ہر چیز میرے تابع اور میری محکوم ہے اور میں ہر چیز پر حکمرانی کر رہا ہوں۔ جنت کی یہی تصویر دکھائی گئی ہے کہ جنت میں داخل ہونے والا چاہے کتنا بھی معمولی آدمی ہو اور دنیا میں اس نے کیسی بھی دکھ بھری اور فاقوں کی زندگی گزاری ہو وہ جنت میں یوں محسوس کرے گا کہ میں جس نعمت کا تصور کرتا ہوں اس سے بڑھ

Marfat.com

کر نعمتیں میرے سامنے موجود ہوتی ہیں۔ میرا تصور شکست کھا جاتا ہے لیکن نعمتیں شکست نہیں کھاتیں۔ اسی طرح ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی بھی اپنے آپ کو بہت بڑی سلطنت کا مالک دیکھے گا۔ جہاں تک وہ تصور کر سکتا ہے وہیں تک اس کی حکومت پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس سے بڑھ کر بڑی سے بڑی قربانی کے بھی صلے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿٢١﴾

(ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے اور وہ چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ ۲۱)

بعض اہلِ علم نے عٰلِيَهُمْ کو حال قرار دے کر آیت کا مفہوم یہ مراد لیا ہے کہ ان کے بالائی جامے سبز سندس اور استبرق کے ہوں گے جبکہ یہی مضمون سورۃ کہف میں ان الفاظ میں آیا ہے وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ وہ یعنی اہلِ جنت باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنے ہوں گے۔ اونچی مسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے۔ اس آیتِ کریمہ میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ جنت سبز ریشمی لباس پہنیں گے۔ بالائی چیزیں یعنی عبا اور قبا وغیرہ لباس کے اوپر اوڑھنے کی چیزیں ہیں پہننے کی نہیں۔ اس لحاظ سے سورۃ الکہف کی آیت سے اہلِ جنت کا ریشم کا لباس پہننا متعین ہو جاتا ہے۔ رہیں ان کی قبائیں تو وہ اس آیت کا مدلول نہیں۔ البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پیشِ نظر آیت میں بالائی لباس کا ذکر ہے اور سورۃ الکہف میں لباس کا۔

اہلِ جنت کے لباس میں جو سندس اور استبرق کا ذکر کیا گیا ہے یقیناً ان کا تعلق جنت سے ہے جس کا دنیا میں مصداق ڈھونڈنا نامناسب ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جب اہلِ عرب کے سامنے یہ باتیں کہی جارہی تھیں تو وہ یقیناً اس کا ایک معنی اور مفہوم سمجھتے تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جنت میں اہلِ جنت کو جو لباس ملے گا وہ دنیا کے ریشمی لباس سے شکل میں ملتا جلتا ہوگا لیکن حقیقت میں اس سے بہت بلند ہوگا۔ اس لحاظ سے یہ ریشمی کپڑے اپنی کیا شکل و صورت رکھتے تھے اور ایرانی اس سے کیا مراد لیتے تھے۔ اس کی تحقیق یقیناً ایرانی لباس کی روایت کو دیکھ کر کی جاسکتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس روایت کو سامنے رکھ کر سندس اور استبرق میں فرق قرار دیتا ہے تو اس کا تعلق اہلِ جنت کے لباس سے نہیں بلکہ ایرانیوں کے لباس سے ہے۔ اور یہ کسی طرح بھی نامناسب نہیں۔ ہاں اگر ایران میں اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جاتا ہو، محض اپنی طرف سے یہ فرق قرار دے لیا جائے تو پھر یقیناً قابلِ اعتراض ہے۔

یہ آیتِ کریمہ میں دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اہلِ جنت کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے جبکہ سورۃ کہف، سورۃ حج اور سورۃ فاطر میں سونے کے کنگن پہنائے جانے کا ذکر ہے۔ تو ان سب آیتوں کو جمع کرنے سے جو صورتحال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ جنت کو دونوں طرح کے کنگن مہیا کیے جائیں گے، لیکن وہ اپنے مذاق کے اعتبار سے کبھی چاندی کے کنگن پہنیں گے اور کبھی سونے کے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دونوں ملا کر پہنیں۔ کیونکہ بعض دفعہ دونوں ملا دینے سے حُسن آرائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اہلِ جنت کو ایک ہی طرح کا زیور نہیں دیا جائے گا بلکہ اس میں تنوع ہوگا۔ اختلافِ مذاق کے تحت ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان زیورات سے فائدہ اٹھائے گا۔

Marfat.com

تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اہلِ جنت کو ان کا رب شراب طہور پلائے گا جبکہ اس سے پہلے ایسی دو شرابوں کا ذکر گزر چکا ہے جن میں سے ایک میں چشمۂ کافور کی ملونی ہوگی اور دوسری میں چشمۂ زنجبیل کی۔ اور پیشِ نظر آیت میں شرابِ طہور پلانے کا ذکر کیا جارہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابرار ایک مرتبہ و مقام کے لوگ نہیں ہوں گے، فرقِ مراتب کے لحاظ سے ان کے مشروبات میں بھی فرق ہوگا اور اس بات میں بھی فرق ہوگا کہ کبھی ان کو بالواسطہ شراب ملے گی اور کبھی براہِ راست پروردگار کی عنایت سے۔ اور یعنی خود ربِ کریم ان کو شرابِ طہور کا جام پلائے گا۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

(بیشک یہ ہے تمہارے عمل کا صلہ، اور تمہاری کارگزاری مقبول ٹھہری ہے۔ ۲۲)

اہلِ جنت کا ایک خاص اعزاز

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ جنت پر انعامات کا ذکر فرمانے کے بعد انہیں ایک خاص اعزاز سے نوازا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ بلاشبہ تمہارا جنت کیلئے سزاوار ہونا اور تمہیں جنت کی نعمتوں سے نوازا جانا اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک بہت بڑا احسان اور اس کے عظیم فضل و کرم کا مظہر ہے۔ کیونکہ اس کے فضل و کرم کے بغیر نہ کسی عمل کی توفیق ملتی ہے اور نہ کوئی عمل باریاب ہوتا ہے۔ اور نہ کسی عمل کرنے والے کی قسمت اپنی معراج کو پہنچتی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود تمہارے لئے ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ تمہارے اعمال کے صلہ کے طور پر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہاری سعی یعنی تمہاری زندگی بھر کی اطاعت، بندگی، جانثاری، سرفروشی قابلِ قدر اور مشکور ٹھہری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمات کو قبول فرمایا ہے۔ اور اتنے بڑے انعامات کیلئے تمہیں کسی دوسرے کی سعی اور سفارش کا ممنونِ احسان نہیں ہونا پڑا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ
لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾
وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ
الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ
شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ
تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ

Marfat.com

اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

رکوع: ۲۔ (اے پیغمبر ہم نے ہی آپ پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔ ۲۳) آپ اپنے رب کے حکم پر صبر کریں اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کی بات پر دھیان نہ دیں۔ ۲۴) اور صبح و شام اپنے رب کا نام یاد کرو۔ ۲۵) اور رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔ ۲۶) بیشک یہ لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ۲۷) ہم ہی نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں اور ہم جب چاہیں گے ٹھیک ان ہی کی مانند بدل دیں گے۔ ۲۸) یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ ۲۹) اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا علیم و حکیم ہے۔ ۳۰) اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے داخل کرتا ہے اور ظالموں کیلئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۳۱)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾

(اے پیغمبر ہم نے ہی آپ پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔ ۲۳) آپ اپنے رب کے حکم پر صبر کریں اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کی بات پر دھیان نہ دیں۔ ۲۴)

آنحضرت ﷺ کو صبر اور انتظار کی تلقین

گزشتہ آیات میں منکرین کا انجام بھی بیان ہوا ہے اور مومنین کا بھی۔ ان دونوں کے درمیان چونکہ حدِ فاصل اور قولِ فیصل قرآن کریم اور اس کی لائی ہوئی تعلیم ہے اور اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کو منکرین نے مخالفتوں کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ اسی قرآنِ کریم کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کو خطاب کر کے قریش کو سنایا جا رہا ہے کہ ہم نے آپ پر جو قرآنِ کریم اتارا نہ آپ نے اس کی خواہش کی، نہ اس کیلئے دعا مانگی۔ قریش کا یہ کہنا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ قرآنِ کریم اتارا گیا ہوتا تو ایک ہی دفعہ نازل کیا جاتا۔ اسے سوچ سوچ کر تھوڑا تھوڑا تیار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا ایک ہی دفعہ نازل نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ خود اسے سوچ سوچ کے بناتے ہیں اور جتنا تیار کر لیتے ہیں اتنا لوگوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ چنانچہ قریش کی اس ژاژ خائی کو ختم کرنے اور ان کے اعتراضات کو دور کرنے کیلئے فرمایا کہ ہم نے اس قرآنِ کریم کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔ ایسا کیوں کیا ہے، یہ ہماری حکمت کا تقاضا ہے۔ اس سے پہلے مختلف مواقع پر اس کے فوائد اور منافع بھی ذکر کئے جا چکے ہیں۔

Marfat.com

آیت کے الفاظ میں ایک تحکم اور جلال پایا جاتا ہے تاکہ قریش کو اس کا اندازہ ہو کہ ہم جو الٹی سیدھی مخالفت کر رہے ہیں ہمیں اس کے نتائج کا اندازہ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا ہدف ذات محمد ﷺ ہے۔ حالانکہ اس کا ہدف وہ ہے جس نے اسے نازل کیا ہے۔ اور جس نے بھی اس کو ہدف بنا کر الٹی سیدھی حرکتیں کی ہیں اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کتنے بڑے خطرے کو انگیخت کر رہا ہے۔

دوسری آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یعنی آپ کو آپ کے رب نے جس کارِ عظیم پر مامور کیا ہے اس کی مشکلات یقیناً بہت زیادہ ہیں۔ آپ کو آئے دن قسم قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ نہایت پامردی سے اسے برداشت کرتے جائیں اور اپنے فرض کی انجام دہی میں کبھی کمزوری نہ آنے دیں۔ یہ لوگ یقیناً کوشش کریں گے کہ آپ کو کسی ترمیم و تغیر پر آمادہ کریں۔ اس کیلئے کبھی طاقت استعمال کریں گے اور کبھی طمع و لالچ کا راستہ اختیار کریں گے۔ آپ ان میں سے کسی بات کی طرف توجہ نہ دیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص اللہ تعالیٰ کا نافرمان اور بندوں کے حقوق تلف کرنے والا ہے۔ وہ کوئی بھی راستہ نکالنے کیلئے آپ سے معاملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ آپ کسی بات کو بھی صراحت سے بیان کرنے میں تأمل نہ کریں۔ اور ان کی خاطر سے کسی بات میں بھی نرمی پیدا کرنے کیلئے تیار نہ ہوں۔ آپ نہایت صبر کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھئے اور اپنے رب کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنے پایۂ استقلال میں کبھی نرمی کبھی کمزوری نہ آنے دیجئے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلاً ﴿٢٥﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلاً طَوِيْلاً ﴿٢٦﴾

(اور صبح و شام اپنے رب کا نام یاد کرو۔ ۲۵) اور رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔ ۲۶)

ذکر اور نماز سے توفیق ملتی ہے

پروردگار کی سنت یہ ہے کہ جب بھی وہ اپنے پیغمبر کو صبر کی تلقین فرماتا ہے تو اس کے معاً بعد اپنے ذکر اور نماز کا حکم دیتا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دینِ حق کی راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ اسی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا بھی ہو سکتا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ کی یاد کا حکم اوقات کے تعین کے ساتھ کیا جائے تو پھر اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔ اور رات کے طویل وقتوں میں تسبیح کے حکم سے تہجد کی نماز کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اور سورۃ مزمل میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلاً ﴿٢٧﴾

(بیشک یہ لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ۲۷)

Marfat.com

مخالفین کی اصل بیماری

آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے مخالفین کی اصل بیماری کی خبر دی گئی ہے کہ یہ لوگ آپ پر قسم قسم کے اعتراضات کرتے ہیں اور کبھی قرآنِ کریم کے حوالے سے مختلف شبہات اٹھاتے ہیں حالانکہ ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ دنیا کی لذتِ عاجل کے پرستار ہیں اور آخرت کی خاطر وہ اس نقد کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ خواہ آخرت کا دن کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو، اپنی اس دنیا پرستی کو چھپانے کیلئے وہ قیامت پر عجیب وغریب شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آخرت کو تسلیم کر لینے کے بعد دنیا کی بہت سی باتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے جو دنیا کی لذت پرستی کے باعث ان کیلئے آسان نہیں۔ بجائے اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کے اعتراضات کے ذریعے پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کا جو نتیجہ نکلنے والا ہے اس کا انہیں اندازہ نہیں۔

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾

(ہم ہی نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں اور ہم جب چاہیں گے ٹھیک ٹھیک ان ہی کی مانند بدل دیں گے۔ ۲۸)

مخالفین کو دھمکی اور ایک شبہ کا جواب

قریش اور دیگر اہلِ مکہ دنیا کی محبت میں اندھے ہو کر عقل اور نصیحت کی کوئی بات قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ آخرت کے بارے میں قرآنِ کریم کی تنبیہات بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو رہیں کیونکہ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے دل و دماغ میں دنیا طلبی کے سوا اور کوئی خیال نفوذ اختیار نہیں کرتا۔ چنانچہ اپنے اس اندھے پن کے باعث قیامت اور آخرت کے وقوع میں قسم قسم کے اشتباہات پیدا کرتے ہیں جس میں سب سے بڑا اعتراض ان کا یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں سالوں میں جو لوگ لقمۂ اجل بن چکے ہیں اور آج ان کا نام ونشان بھی کہیں موجود نہیں، آخر انہیں ازسرِنو کیسے جسم وجان کے ساتھ اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا محال امر ہے جس کے وقوع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کاش یہ اعتراض کرنے والے کبھی سوچیں کہ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ہم ہی نے ان کے جوڑ بند مضبوط کئے کہ آج ان میں سے کسی کو اپنی جسمانی قوت پر فخر ہے اور کسی کو اپنی طلاقتِ لسانی پر، کسی کو اپنی شہ سواری پر ناز ہے اور کسی کو اپنی چابکدستی پر، لیکن وہ اس بات پر غور کرنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتے کہ جس پروردگار نے انہیں پہلے تخلیق فرمایا اور پھر انہیں جسم کی مختلف رعنائیوں سے نوازا، اب کیا اس کی قدرت بانجھ ہو گئی ہے کہ وہ دوبارہ انسانوں کو پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کے رگ پٹھے اور جوڑ بند کا ذکر شاید اس لئے فرمایا گیا ہے کہ یہ جسم کے نازک ترین حصے ہیں لیکن ان پر پورے جسم کا بوجھ ڈالا گیا ہے، مجال کیا ہے کہ وہ کہولت کی عمر سے پہلے کبھی کام کرنے میں کمی بیشی کریں۔ ہاتھ پاؤں اور انگلیوں کے بعض ریشے اور جوڑوں میں استعمال ہونے والے اعصاب اس قدر نازک ہیں کہ چھو جانے سے بھی ان کا ٹوٹ جانے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کثرتِ استعمال کے باوجود وقت سے پہلے کبھی کسر وانکسار سے دوچار نہیں ہوتے۔

Marfat.com

وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلاً ...... اس فقرے کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ وہ جب چاہے فنا و زوال کے ہزاروں مراحل کے بعد بھی ایسے ہی نازک لیکن مضبوط جوڑ بند کے انسان وجود میں لا سکتا ہے کیونکہ اس کیلئے کوئی چیز محال نہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ پروردگار جب چاہے ان سرکشی کرنے والوں کو ہلاک کر کے انہی کی جنس کے دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ لے آئے جو اپنے کردار میں ان سے مختلف ہوں اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ معنی مراد لیا جائے کہ پروردگار جب چاہے ان کی شکلیں بدل ڈالے۔ کسی کو مفلوج کر دے، کسی کا چہرہ مسخ کر دے، کسی کو بیماری کا شکار کر دے۔ جس پروردگار کی قدرت میں یہ سب کچھ ہو لیکن وہ اپنے بندوں پر ہمیشہ رحم کرے بجائے اس کے کہ اس کی قدرت کو چیلنج کیا جائے اس کی رحمت کا طلبگار ہونا چاہئے۔

شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ...... شَدَّ اَسْرًا کے معنی ہڈیوں اور اعصاب کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جوڑنے کے ہیں۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلاً ﴿۲۹﴾

(یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ ۲۹)

بے نیازی کا اظہار

قریش اور اہلِ مکہ کو دلائل سے سمجھانے، تنبیہات کرنے اور اتمامِ حجت کے بعد نہایت بے نیازی سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ ایک نصیحت ہے جو محض انسانوں کی بھلائی کیلئے کی جا رہی ہے۔ اس میں نہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع ہے اور نہ اس کے رسول ﷺ کی کوئی ذاتی غرض اس میں مضمر ہے۔ جس کا جی چاہے اسے قبول کر کے اپنے رب کی راہ اختیار کرے اور اپنی دنیا و عقبیٰ کو سنوار لے۔ اور جس کا جی چاہے اس سے اعراض کر کے اپنی عاقبت برباد کر لے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ ۖ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

(اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا علیم و حکیم ہے۔ ۳۰) اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے داخل کرتا ہے اور ظالموں کیلئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۳۱)

توفیق کیلئے اللہ تعالیٰ کی سنت

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو کتابِ نصیحت و ہدایت بنایا اور نبی کریم ﷺ کو ہادی بنا کر بھیجا اور اس ہدایت کو قبول کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور شعور بخشا اس کی فطرت کو فجور اور تقویٰ کا الہام کیا۔ اور نفسِ لوامہ سے کسی حد تک اس کی مدد فرمائی۔ بایں ہمہ انسان کی ہدایت کو اپنی سنت اور قانون کا پابند ٹھہرایا۔ وہ یہ کہ کسی شخص کا نصیحت حاصل کرنا سراسر اس کی اپنی مشیت پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ اس کو نصیحت اس وقت نصیب ہوتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہو کہ وہ اسے نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔

Marfat.com

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ بندے کا کوئی فعل بھی تنہا بندے کی اپنی مشیت سے ظہور میں نہیں آتا بلکہ ہر فعل اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی مشیت بندے کی مشیت سے مل جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیت بندے کی مشیت سے اس وقت ملتی ہے جب وہ اپنے سمع و بصر سے کام لے اور خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی اس صلاحیت کی قدر کرے جو اس نے اس کے اندر ودیعت فرمائی ہے اور برابر اللہ تعالیٰ سے توفیق کی التجا کرتا رہے۔ مگر جو شخص اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان صلاحیتوں سے کام لینے کی بجائے حُبِ دنیا کا اسیر ہو کر عیش و عشرت کو ہی اپنا مقصدِ زندگی بنا لے اور کسی کلمۂ نصیحت کو سننے کا روادار نہ ہو، ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی ہدایت سے محروم رہتا ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کیلئے اللہ تعالیٰ نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور ان کا یہ انجام صرف اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں سے کام لینے کی بجائے ناشکری کا راستہ اختیار کر کے اپنے اوپر ظلم کیا اور بجائے اپنے آپ کو رحمت کا مستحق بنانے کے جہنم کا مستحق بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ بندوں کے حالات سے بخوبی واقف ہے اس لئے وہ اپنے علم و حکمت کی بنیاد پر بندوں کے بارے میں فیصلے فرماتا ہے اور ایسے لوگ ہمیشہ محرومی کے فیصلے کی زد میں آجاتے ہیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

(۷۷)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْمُرْسَلٰتِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْمُرْسَلٰتِ ہے۔اس سورۃ کے پہلے لفظ کو ہی اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے اور ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ معظّمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئیں۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم منیٰ کے ایک غار میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ موجود تھے جب آپؐ پر اس سورۃ کا نزول ہوا۔آپؐ اس سورۃ کو پڑھتے جاتے تھے اور ہم اس سورۃ کے حُسنِ کلام کی لذت سے مسرور ہو رہے تھے کہ اتنے میں ایک سانپ نے ہم پر حملہ کر دیا۔آنحضرت ﷺ نے ہمیں اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ہم جب اس کی طرف لپکے تو وہ ہم سے بچ کر بھاگ نکلا۔ہم نے اس کا تعاقب کرنا چاہا تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، اسے جانے دو، جیسے اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے شر سے محفوظ رکھا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے محفوظ رکھا۔

اس کے پہلے کی دو سورتیں سورۃ القیٰمۃ اور سورۃ الدھر اور اس کے بعد کی دو سورتیں سورۃ النباء اور سورۃ النازعات اگر ملا کر پڑھی جائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دور کی نازل شدہ ہیں اور ایک ہی مضمون ہے جسے ان سورتوں میں مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

پہلی سات آیتوں میں ہَواؤں کے عجائب اور تصرفات کی قسمیں کھائی گئی ہیں اور ہم اس سے پہلے سابقہ سورتوں میں وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں بالعموم قسم کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔بعد کا آنے والا جملہ جوابِ قسم یا مُقسم علیہ کہلاتا ہے جس کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے اور قسموں سے اس پر دلائل قائم کئے جاتے ہیں۔یہاں بھی ان قسموں کو بطور دلیل پیش کر کے قیامت کے آنے پر ثبوت مہیا کیا گیا۔استدلال دو طرح سے کیا گیا ہے۔ایک تو یہ کہ عذاب اور قیامت کا وقوع کوئی انہونی بات نہیں، معذب قوموں کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ نے چاہا اپنی ہَواؤں اور بادلوں کے ذریعے سے عذاب اور قیامت کا انکار کرنے والوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔لوگوں نے ہَواؤں اور بادلوں کی آمد کو اپنے لئے رحمت جانا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو عذاب کا پیش خیمہ بن کے آئی ہیں۔پس قریش اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نقمت کے آثار جو اپنے آگے پیچھے دیکھ رہے ہیں ان سے سبق حاصل کریں۔یہی آثار ان کیلئے کسی وقت عذاب کی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں اور انہیں کے الٹ ڈالنے سے قیامت برپا ہو سکتی ہے۔

Marfat.com

استدلال کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب قادرِ مطلق نے زمین پر یہ حیرت انگیز انتظام قائم کیا ہے کہ وہ جب چاہتا ہے ہَوا کو مسرت اور شادمانی کا جھونکا بنا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے اسی کو تباہی کا پیغام بنا دیتا ہے۔ اس کی قدرت قیامت برپا کرنے سے کیسے عاجز ہو سکتی ہے اور مزید یہ بات بھی کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم کا کوئی فعل عبث اور بے مقصد نہیں ہوتا اور آخرت نہ ہونے کی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کارخانۂ ہستی سراسر فضول ہے کیونکہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔

آیت آٹھ سے پندرہ تک قیامت کی اجمالی تصویر دکھا کر بتایا گیا ہے کہ اس آسمان و زمین کی بڑی سے بڑی چیز کو بھی غیر فانی اور اٹل نہ سمجھو۔ نہ کوئی شے بذاتِ خود قائم ہے اور نہ خود مختار، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم اور اسی کے اِذن سے حرکت وعمل کرتی ہے۔ قیامت کا برپا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار اللہ تعالیٰ کی صفتِ حکمت وعدل کا انکار ہے۔ اس کے وقوع کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس میں تمام نوعِ انسانی اور اس کے تمام افراد کے معاملات کا فیصلہ ہوگا۔ اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ وہ کوئی غیر سنجیدہ عمل نہیں کہ جب بھی کوئی مسخرا اس کا مطالبہ کرے تو اسے لا کھڑا کیا جائے۔ اس دن زمین وآسمان کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا جائے گا۔ رسولوں کی شہادت پر قوموں کے فیصلے ہوں گے۔ آج رسولوں کی دعوت کا جس طرح مذاق اڑایا جا رہا ہے، قیامت کے دن پتہ چلے گا کہ رسولوں اور ان کی دعوت کی تکذیب کا نتیجہ کیا ہوگا۔

آیت سولہ سے اٹھائیس تک قیامت اور آخرت کے وقوع اور وجود کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ قریش کے سامنے ماضی کی تاریخ کو سوال کے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے اگلی قوموں کو ہلاک کیا اور بعد میں آنے والی قوموں میں سے بھی جنہوں نے ان کی روشِ بد کی تقلید کی ان کو بھی انہیں کے پیچھے چلتا کیا۔ اگر یہ واقعہ ہے اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تو آخر آج کے مجرموں کے معاملے میں ہماری یہ سنتِ متواتر کیوں بدل جائے گی۔ نیز انسان کی اپنی تاریخ، اس کی اپنی پیدائش اور جس زمین پر وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس کی اپنی ساخت اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ قیامت کا آنا اور عالمِ آخرت کا برپا ہونا ممکن بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا بھی۔

اس بات کو بھی بطور دلیل پیش کیا گیا ہے کہ کائنات کی سلطنت میں صرف قوانینِ طبیعی ہی کارفرما نہیں ہیں بلکہ قانونِ اخلاقی بھی کام کر رہا ہے جس کے تحت خود اس دنیا میں بھی مکافاتِ عمل کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن دنیا کی موجودہ زندگی میں یہ مکافات چونکہ اپنی کامل ومکمل صورت میں ظہور پذیر نہیں ہو رہی، کتنے لوگ ہیں جن کے ساتھ زیادتیاں اور بے انصافیاں ہوتی ہیں لیکن کوشش کے باوجود بھی نہ انہیں ان کا حق ملتا ہے، نہ ان کا دامن رفو ہوتا ہے اور نہ زیادتی کرنے والے کو سزا ملتی ہے۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر کائنات کا اخلاقی قانون لازمی یہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے جب یہ بھرپور طریقے سے واقع ہو اور ان تمام بھلائیوں اور برائیوں کی پوری جزاء وسزا دی جائے۔ جو یہاں جزاء سے محروم رہ گئی ہوں یا سزا سے بچ نکلی ہوں۔ اس کیلئے ناگزیر ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہو۔

انسان کا وجود اور اس کا طریقِ پیدائش بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ جس خدا نے ایک حقیر نطفہ سے ابتدا کر کے اسے پورا آدمی بنایا ہے اس کیلئے اسی آدمی کو دوبارہ پیدا کر دینا یقیناً ناممکن نہیں۔ اس زمین پر جو انسان جیتے اور مرتے ہیں مرنے کے بعد ان کے اجزائے جسم کہیں غائب نہیں ہو جاتے، اسی زمین پر ان کا ایک ایک ذرہ موجود رہتا ہے۔ جس خدا نے انسان کو پہلے زمین کے خزانوں سے نکالا تھا وہی ان میں جمع ہو جانے کے بعد پھر ان سے نکال لا سکتا ہے۔ اس میں استبعاد کی کوئی بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص خدا کے احاطۂ قدرت

Marfat.com

سے باہر نہیں، اور نہ اس کی پرورش سے کوئی شخص مستغنی ہے۔ وہ چونکہ قادر ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی ہے اس لئے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کو زمین پر پیدا کرنے کے بعد اس نے جو اختیارات عطا کئے ان کے صحیح اور غلط استعمال کا حساب لینا یقیناً اس کی حکمت کا تقاضا ہے اور بلا حساب چھوڑ دینا سراسر حکمت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد آیات آٹھائیس سے چالیس تک آخرت کے منکرین کا اور اکتالیس سے پینتالیس تک ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اس پر ایمان لا کر دنیا میں اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کی، اور عقائد و افکار، اخلاق و اعمال اور سیرت و کردار کی ان برائیوں سے اجتناب کیا جو آخرت کو تباہ کر دینے والی ہیں۔

انتیس سے چونتیس تک اس عذاب کی تصویر کھینچی گئی ہے جس سے ان مکذبین کو آخرت میں سابقہ پیش آنے والا ہے۔

پینتیس سے چالیس تک مکذبین کی بے بسی اور بے کسی کو نمایاں کیا گیا ہے۔

اکتالیس سے پینتالیس تک اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کی فائز المرامی کو بیان کیا گیا ہے۔

چھیالیس سے پچاس تک قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس قرآن سے ہدایت نہیں پائے گا اسے دنیا میں کوئی چیز ہدایت نہیں دے سکتی۔ گویا ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار کیا گیا ہے۔

Marfat.com

اٰیَاتُهَا ۵۰	سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّیَّةٌ (۷۷)	رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ﴿۳﴾
فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِیٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ﴿۶﴾ اِنَّمَا
تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ﴿۸﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ﴿۹﴾
وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ﴿۱۰﴾ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ؕ﴿۱۱﴾ لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ؕ﴿۱۲﴾
لِیَوْمِ الْفَصْلِ ۚ﴿۱۳﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ ؕ﴿۱۴﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ ؕ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ
الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۙ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ
قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۙ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖۗ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾
وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ﴿۲۵﴾
اَحْیَآءً وَّاَمْوَاتًا ۙ﴿۲۶﴾ وَّجَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَیْنٰكُمْ
مَّآءً فُرَاتًا ؕ﴿۲۷﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى

Marfat.com

مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ
شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ
كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۳۴﴾
هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾
وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ
وَالْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَیْدٌ فَكِیْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ
لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۴۰﴾

رکوع: ۱۔ (قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں۔ ۱) پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھادھند۔ ۲) اور قسم ہے ان ہواؤں کی جو پھیلانے والی ہیں (بادلوں کو)۔ ۳) پھر (ان کو) پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ ۴) پھر ڈالتی ہیں یاددہانی۔ ۵) اتمامِ حجت کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر۔ ۶) جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔ ۷) پس جب ستارے مٹادیئے جائیں گے۔ ۸) اور جب آسمان پھاڑ دیا جائے گا۔ ۹) اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے۔ ۱۰) اور جب رسولوں کا وقت مقرر کردیا جائے گا۔ ۱۱) کس روز کیلئے یہ کام اٹھا رکھا گیا۔ ۱۲) فیصلے کے دن کیلئے۔ ۱۳) اور تم کیا جانو کہ کیا ہے فیصلے کا دن۔ ۱۴) تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۱۵) کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ ۱۶) پھر ان کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں گے۔ ۱۷) ہم مجرموں کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں۔ ۱۸) خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔ ۱۹) کیا ہم نے تم کو ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا۔ ۲۰) پھر ہم نے اس کو رکھا ایک محفوظ جگہ میں۔ ۲۱) ایک معین مدت تک۔ ۲۲) پس ہم نے اس کو ٹھہرایا، ہم کیا ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔ ۲۳) خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۲۴) کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا۔ ۲۵) زندوں کیلئے بھی اور مردوں کیلئے بھی۔ ۲۶) اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے اور تمہیں خوشگوار پانی پلایا۔ ۲۷) تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۲۸) چلو اس چیز کی طرف جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ ۲۹) چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ ۳۰) نہ ٹھنڈک

Marfat.com

پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپٹ سے بچانے والا۔ ۳۱) بیشک وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی۔ ۳۲)
گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں۔ ۳۳) اس دن خرابی ہے جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۳۴) یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ
بولیں گے۔ ۳۵) اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی کہ کوئی عذر پیش کر سکیں۔ ۳۶) اس دن جھٹلانے والوں کیلئے
تباہی ہے۔ ۳۷) یہ ہے فیصلہ کا دن، ہم نے تم کو بھی جمع کیا اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بھی۔ ۳۸) اب
اگر تمہارے پاس کوئی داؤ ہے تو میرے مقابلے میں کر دیکھو۔ ۳۹) اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے۔ ۴۰)

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ﴿۳﴾
فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِیٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾

(قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں۔ ۱) پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھا دھند۔ ۲) اور قسم ہے ان ہواؤں
کی جو پھیلانے والی ہیں (بادلوں کو)۔ ۳) پھر (ان کو) پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ ۴) پھر ڈالتی ہیں یاددہانی۔ ۵)

وقوعِ قیامت پر پانچ قسموں کا مفہوم اور تعین

ان آیات میں پروردگار نے پانچ قسمیں کھائی ہیں اور ہم اس سے پہلے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں بالعموم قسموں کی حیثیت دلائل اور شواہد کی ہوتی ہے۔ اور بعد میں آنے والا جملہ مقسم علیہ یا دعویٰ کہلاتا ہے۔ دعویٰ کے ثبوت کیلئے قسموں کی صورت میں دلائل مہیا کئے جاتے ہیں۔ پیشِ نظر آیات میں وقوعِ قیامت پر پانچ قسموں کی صورت میں دلائل دیئے گئے ہیں۔

ان آیات میں جن چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان کا نام نہیں لیا گیا۔ البتہ موصوف کے ذکر کے بغیر صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے موصوف کے تعین میں صحابہ اور تابعین میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض حضرات نے ان پانچوں صفات کا موصوف فرشتوں کو قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے ہواؤں کو اور بعض حضرات کے نزدیک خود انبیاء اور رُسل اس کے موصوف ہیں۔ ابنِ جریر طبری نے اس معاملے میں توقف اور سکوت کو اسلم قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک فرشتے اور ہوائیں دونوں کو موصوف قرار دینے کا امکان ہے لیکن ہم اپنی طرف سے کسی کو متعین نہیں کرتے۔ اور ابنِ کثیر نے پہلی تین صفات کا موصوف ہواؤں کو قرار دیا ہے اور باقی دو صفات کا موصوف ان کے نزدیک فرشتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اس طرح سے کسی قسم کی تاویل کرنے ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن بعض دیگر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ جب ایک ہی سلسلۂ کلام میں پانچ صفات کا مسلسل ذکر کیا گیا ہے اور کوئی علامت بیچ میں ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ کہاں تک ایک چیز کی صفات کا ذکر ہے اور کہاں سے دوسری چیز کی صفات کا ذکر شروع ہوا۔ تو یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ محض کسی بے بنیاد قیاس کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کریں کہ یہاں دو یا تین مختلف چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں، بلکہ اس صورت میں نظمِ کلام خود اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پوری عبارت کو کسی ایک ہی چیز کی صفات سے متعلق مانا جائے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان قسموں سے جس بات پر استدلال کیا جا رہا ہے ان دونوں کے درمیان گہری مناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان آیات میں جو قسمیں صفات کی صورت میں آئی ہیں وہ ہواؤں کی صفات ہیں اور ان سے ملائکہ مراد لینا دلیل کی قوت کو کمزور کرنے کے مترادف ہوگا، کیونکہ جس طرح قیامت کا

Marfat.com

وقوع غیر محسوس ہے ملائکہ بھی اسی طرح غیر محسوس ہیں۔اور غیر محسوس سے ایک غیر محسوس کا اثبات کیا اہمیت رکھتا ہے۔اب ہم ان قسموں کی کسی حد تک تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ...... مُرْسَلٰتِ کے معنی ہیں چھوڑی ہوئی،اوراس پرواؤ قسم کیلئے ہے۔یہ لفظ یہاں ہواؤں کیلئے استعمال ہوا ہے۔عُرْفًا کا ایک معنی کیا جاتا ہے، پے در پے۔اور دوسرا معنی ہوتا ہے،گھوڑے کی ایال کے بال جو پیشانی پر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔گھوڑے کا سوار جب گھوڑے کی ایال کو پکڑ کر کھینچتا ہے تو گھوڑا رک جاتا ہے۔اور جب اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ سرپٹ بھاگنے لگتا ہے۔یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ ہوائیں بے پناہ زور اور قوت کے باوجود اس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کے قابو میں ہیں جس طرح گھوڑا اپنے سوار کے قابو میں ہوتا ہے۔ان کی ایال کے بال بھی اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں۔یعنی ان کی پیشانی خدا کی مٹھی میں ہے۔جب وہ چاہتا ہے ان کو روک لیتا ہے، جب چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔

فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ...... عاصفات، عصف سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ہوا کے تیز چلنے کے ہیں۔یہ ہواؤں کا دوسرا مرحلہ ہے، جبکہ انہیں بگٹٹ چھوڑ دیا جاتا ہے تو اندھا دھند چلنے لگتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ طوفان اور عذاب بن جاتی ہیں۔اور یہی وہ طوفانی ہوائیں ہیں جو بعض قوموں کی تباہی کا سبب ہوئی ہیں اور انہیں عذاب کے طور پر ان قوموں پر مسلط کیا گیا ہے۔

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ...... اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بارش ختم ہونے کے بعد بادل کو پھاڑ کر منتشر کر دیتی ہیں۔پہلی دو آیتوں میں جو قسم کھائی گئی ہے وہ ان طوفانی ہواؤں کی ہے جو بعض دفعہ عذاب کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔اور یہ قسم ابرِ رحمت والی ہواؤں کی ہے جن پر زندگی کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ...... یہ وہ ہوائیں ہیں جو بادلوں میں فرق و امتیاز کرنے والی ہیں۔کبھی بادلوں کو ہانک کر لاتی ہیں اور کبھی اڑا کر لے جاتی ہیں۔کسی ایک علاقہ کو نہال کر جاتی ہیں اور دوسرے کو تشنہ چھوڑ جاتی ہیں۔اگر یہ ہوائیں خود مختار ہوتیں اور اپنی مرضی کی آپ مالک ہوتیں تو ایسا کبھی نہ ہوتا کہ کہیں جل تھل ایک ہو جائے اور کہیں تشنگی برستی رہے۔بلکہ وہ ایک بالاتر قوت کے تابع فرمان ہیں۔

فَالْمُلْقِیٰتِ ذِكْرًا ...... پھر لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی یاد یا اس کا خوف ڈالنے والی ہیں۔یعنی ان ہواؤں سے جہاں زمین میں زندگی پیدا ہوتی اور زمین کی نباتات سرشار ہو جاتی ہے، اسی طرح ان ہواؤں سے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہوتی، اور اس کے خوف کے سائے دماغوں میں لہرانے لگتے ہیں۔زمین جل رہی ہوتی ہے کہ آسمان و زمین میں توافق کی حکمت حرکت میں آتی ہے اور آسمان سے حیات بخش بارش برسنے لگتی ہے اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت دلوں میں تازہ ہو جاتی ہے کہ اگر کائنات کا خدا ایک نہ ہوتا تو یہ دو متضاد مخلوقات میں توافق کیسے پیدا ہو جاتا۔

زمین مردہ نباتات کو اگاتی اور از سرِ نو زندگی کا پیغام سنانے لگتی ہے۔جا بجا لہراتی ہوئی فصلیں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی شان یاد دلاتی ہیں۔اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال تازہ ہونے لگتا ہے کہ جو پروردگار مردہ زمین کو زندہ کر سکتا ہے وہ بعث بعد الموت اور حشر و نشر پر بھی قادر ہے۔

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾

(اتمامِ حجت کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر۔ ۶) جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔ ۷)

Marfat.com

ہواؤں کے تصرفات سے جو حیرت انگیز چیزیں سامنے آتی ہیں، یہ ان کا مقصد بیان ہوا ہے۔ یعنی جو کچھ ہمیں دکھایا جارہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں پر اتمامِ حجت ہے یا انہیں بیدار کرنے کا ذریعہ ہے۔ یعنی جو لوگ اتنی بڑی نشانیوں سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتے اور غفلت کی سرمستی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں، ان لوگوں پر حجت تمام ہوجاتی ہے۔ اور جو یاددہانی حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان لوگوں کو یاددہانی حاصل ہوتی ہے۔ ہواؤں کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نیرنگی کا اظہار اور اس کی بے پایاں حکمت کی نمود اور اس کے نتیجے میں حیرت میں ڈالنے والے آثار ونتائج، یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ انتظام ایک غالب قدرت کا انتظام ہے جس کیلئے نہ زندگی کو وجود میں لانا خارج از امکان ہوسکتا ہے اور نہ اسے مٹا دینا۔ اور نہ مٹا کر دوبارہ وجود میں لے آنا۔ اس کی قدرت سے یہ بات کوئی بعید نہیں کہ وہ ایک دن قیامت کو برپا کردے جس کی پیدا کردہ ہواؤں کے جھونکے زندگی کا سامان بھی ہیں اور تباہی کا پیغام بھی۔ کیا ان سے یہ بات اخذ کرنا مشکل ہے کہ اس کائنات پر ایک زبردست اقتدار کارفرما ہے جو زندگی کے سب سے بڑے ذریعہ کو جب چاہے اس کیلئے رحمت اور جب چاہے ہلاکت کا سبب بنا سکتا ہے اور انسان اس کے کسی فیصلے کو بھی روک دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ...... گزشتہ آیات میں جو قسمیں مذکور ہیں یہ ان کا مقسم علیہ ہے۔ قیامت کے منکرین کو ہواؤں کے تصرفات کی طرف توجہ دلا کر یہ فرمایا گیا ہے کہ ان ہواؤں کے تصرفات کو غور سے دیکھو، ان کی طاقت کا اندازہ کرو، صرف ان کے افادی پہلو کو دیکھ کر نہ رہ جاؤ، ان کے تباہ کن اثرات کو بھی ذہن میں لاؤ اور پھر معذب قوموں کی تاریخ میں ہمیں جن ہولناک عذابوں کا ذکر ملتا ہے ان میں کتنے عذاب ہیں جو ہواؤں کے ذریعے سے بھیجے گئے ہیں، انہیں بھی حافظے میں تازہ کرو اور پھر اپنی قوت وسطوت کی حدود کو بھی پہچاننے کی کوشش کرو تو تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ تمہیں جس چیز سے ڈرایا جارہا ہے اور جس چیز کا وعدہ کیا جارہا ہے اسے برپا کرنے کیلئے پروردگار کو کسی بڑے اہتمام کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ ان ہواؤں کے پیچ ذرا ڈھیلے چھوڑ دے تو جن ہواؤں کو تم زندگی کی راحتوں کا سامان سمجھتے ہو وہ چشمِ زدن میں تمہاری بستیوں کو الٹنے اور تمہارا نام ونشان مٹانے پر قادر ہیں۔ اس کے باوجود تم یہ سمجھتے ہو کہ عذاب یا قیامت تم سے بہت دور ہے اور ان کا وقوع تمہارے نزدیک بعید از عقل ہے، تو پھر ایسی عقل پر ماتم کرنا چاہیے۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿۸﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ﴿۹﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿۱۰﴾

(پس جب ستارے مٹا دیئے جائیں گے۔ ۸) اور جب آسمان پھاڑ دیا جائے گا۔ ۹)
اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے۔ ۱۰)

نفخۂ اولیٰ کے بعد کی ہلچل

قیامت کے پہلے مرحلے میں جو نفخۂ اولیٰ کے بعد وقوع پذیر ہوگا جس طرح کی ہلچل مچے گی اور جو ہمہ گیر تباہی بروئے کار آئے گی ان میں سے چند ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں کائنات کی بہت عظیم اور بڑی ہی پرشوکت مخلوقات کی تباہی کا منظر پیش کیا گیا ہے جن کے بارے میں مشرکین کا عام تاثر یہ تھا کہ یہ چیزیں اپنے حجم اور اپنے استحکام میں اس قدر عظیم ہیں کہ ان کے ٹوٹنے اور تباہ ہونے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ایسی ہی چند مخلوقات کی تباہی کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جن مخلوقات کو تم ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے اور جن کی تباہی

Marfat.com

تمہارے نزدیک ناممکن تھی جب ان کا حشر وہ ہوگا جیسا کہ ہم ذکر کر رہے ہیں تو اس سے اندازہ کرو کہ قیامت کے دن کی ہولنا کی کا عالم کیا ہوگا۔ ان میں سب سے پہلے فرمایا کہ اس تصور کو ذہن میں لاؤ جب ستارے بے نشان کر دیئے جائیں گے۔

طُمِسَ کے معنی کسی چیز کو مٹا دینے، بگاڑ دینے اور بے نشان کر دینے کے ہیں۔ سورۃ النساء آیت ۴۷ میں فرمایا گیا ہے کہ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَا ''اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور ان کو ان کے پیچھے پھیر دیں۔'' پیشِ نظر آیت کا معنی ہوگا جبکہ ستارے بے نور اور بے نشان کر دیئے جائیں گے۔ ستارے جو انسانی آنکھ سے غیر معمولی فاصلے پر اور سائنسدانوں کے بقول اپنے حجم میں زمین سے بہت بڑے ہیں اور پھر ان کی تعداد حدِ شمار سے باہر ہے لیکن قیامت کے دن جب ہر چیز تباہی کا شکار ہوگی تو یہ بھی تباہ و برباد کر دیئے جائیں گے۔

وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ...... آسمانوں کے بارے میں بھی آنحضرت ﷺ کی ہم عصر دنیا کا تصور یہ تھا کہ ان کی وسعت، ان کا استحکام اور ان کا ٹھوس ہونا ہر طرح کے نقصان سے ماورا ہے۔ لیکن پیشِ نظر آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن انہیں بھی پھاڑ دیا جائے گا۔ اور ایک دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ آسمان کھول دیا جائے گا اور وہ دروازے، دروازے بن کے رہ جائے گا۔ اور سورۃ انفطار میں فرمایا کہ آسمان پاش پاش ہو جائے گا۔ یعنی عالمِ بالا کا بندھا ہوا نظام جس کی بدولت ہر ستارہ اور سیارہ اپنے مدار پر قائم ہے اسے توڑ ڈالا جائے گا اور اس کی ساری بندشیں کھول دی جائیں گی۔

وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ...... نسف کے معنی ریزہ ریزہ کر دینے، پیس دینے، پراگندہ کر دینے اور دھنک ڈالنے کے ہیں۔ منکرینِ قیامت پہاڑوں کے بارے میں خاص طور پر یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ کبھی زوال کا شکار نہیں ہوں گے بلکہ ان میں سے بعض لوگ جب قیامت کا مذاق اڑاتے تو پہاڑوں کے بارے میں خاص طور پر سوال کرتے کہ ان پہاڑوں کا کیا بنے گا۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ آیت ۱۰۵ میں قرآنِ کریم نے ان کے سوال کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنے جواب کا بھی۔ ارشاد ہے وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّىْ نَسْفًا ''وہ آپ سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے، میرا رب ان کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔''

انسانی آنکھوں میں جو بڑی بڑی چیزیں ہیں ان میں آسمان، ستارے اور پہاڑ اپنی عظمت اور اہمیت میں غیر معمولی سمجھے جاتے ہیں ان کی تباہی اور بربادی کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت کے دن ایک ایسی ہمہ گیر اور ہولناک تباہی مچے گی کہ جس کے سامنے ہر چھوٹی بڑی مخلوق ذرۂ ناچیز ہو کے رہ جائے گی۔ ہر طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت غالب نظر آئے گی اور اس کی حاکمیت کا پھریرا ہر طرف لہراتا دکھائی دے گا۔

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾

(اور جب رسولوں کا وقت مقرر کر دیا جائے گا۔ ۱۱)

Marfat.com

نفخۂ ثانیہ کے بعد کی کیفیت

اُقِّتَتْ ...... اصل میں وُقِّتَتْ ہے، تعلیل کے بعد اُقِّتَتْ ہوگیا۔ یہ توقیت سے مشتق ہے جس کے اصلی معنی تعیینِ وقت اور تحدیدِ وقت کے ہیں۔ اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ "وقت مقرر کیا جائے گا" سے کیا ہے۔ علامہ زمخشری کا خیال ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں "کسی مقررہ وقت پر پہنچ جانا" لیکن انجام کے اعتبار سے دونوں معنی میں کوئی فرق نہیں۔ رسولوں کا وقت مقرر کیا جائے گا، تو مفہوم اس کا یہ ہے کہ وہ وقتِ مقرر پر پہنچیں گے۔ اور اگر یہ معنی کیا جائے کہ رسول اپنے مقررہ وقت پر پہنچ گئے تو مفہوم اس کا بھی یہی ہے کہ جو وقت ان کا مقرر کیا گیا تھا اس پر وہ حاضر ہو گئے۔

گزشتہ تین آیات میں قیامت کی ہولناکی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے کہ قیامت کی ہولناکی اس حد تک پہنچ جائے گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت بلند مرتبہ اور نہایت مقرب ہیں انہیں بھی حکم دے دیا جائے گا کہ وہ فلاں وقت پہنچ کر اپنی قوموں کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کے حضور یہ بتائیں کہ انہوں نے اپنے فریضۂ انذار کا حق کہاں تک ادا کیا تھا۔ اور ان کی امتوں نے کیا جواب دیا تھا۔ سورۃ المائدہ آیت ۱۰۹ میں تفصیل سے اس گواہی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ "جس دن اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر ان سے پوچھے گا تمہیں امتوں کی طرف سے کیا جواب دیا گیا" یہ وقت امتوں اور رسولوں دونوں کیلئے انتہائی گھبراہٹ میں ڈالنے والا ہوگا۔ رسول اپنے فریضہ کی ادائیگی کے حوالے سے دربار میں بلائے جائیں گے اور پوچھا جائے گا کہ آپ نے اپنے فریضۂ انذار کو کہاں تک ادا کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی رسول نے بھی اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی۔ لیکن بارگاہِ حق میں طلبی اور جواب دہی ایسی شخصیات کیلئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے صرف اعمال ہی نہیں، احساسات میں بھی معصومیت بخشی، انتہائی تکلیف دہ بات ہوگی۔ اس لئے جب تک اس مرحلے سے گزر نہیں جائیں گے وہ لرزاں و ترساں رہیں گے۔ آنحضرت ﷺ کے بارے میں ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات احادیث میں ذکر کی گئی ہے کہ آپ اس موقع کے تصور سے بھی لرز اٹھتے تھے۔ اور جہاں تک امتوں کا حال ہے ان کے جزاء و سزا کا معاملہ چونکہ پیغمبروں کی گواہی پر انحصار رکھتا ہوگا اور اسی گواہی کے نتیجے میں وہ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اس لئے وہ اس موقع پر نہایت پریشان کن صورتحال سے دوچار ہوں گی۔

لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ﴿۱۲﴾ لِیَوْمِ الْفَصْلِ ﴿۱۳﴾

(کس روز کیلئے یہ کام اٹھا رکھا گیا۔ ۱۲) فیصلے کے دن کیلئے۔ ۱۳)

فیصلے کے دن کی اہمیت

گزشتہ آیت میں رسولانِ گرامی کی حاضری کا وقت مقرر کرنے کی جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق نفخۂ ثانیہ کے بعد سے ہے۔ مکمل تباہی کے بعد دوسرا مرحلہ میدانِ حشر کے قائم ہونے سے تعلق رکھتا ہے جس میں تمام انسانوں کو جوابدہی کیلئے طلب کیا جائے گا اور یہ وہ مرحلہ ہوگا جو جزاء و سزا کے اعتبار سے انسانوں کیلئے سب سے مشکل ہوگا۔ اس میں افراد کا حساب بھی ہوگا اور قوموں کا بھی۔ قوموں کے انجام کا آخری فیصلہ رسولانِ گرامی کی گواہی سے وابستہ ہوگا۔ اس لئے اس واقعہ کی اہمیت ہر شخص کے انجام اور قوموں کے انجام کے اعتبار سے نہایت

Marfat.com

واضح اور اہم ہے۔ اسی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ان کی حاضری کا وقت، تمہیں معلوم بھی ہے کس دن کیلئے اٹھا رکھا تھا؟ اور ان مقدس لوگوں کے مقام و مرتبہ کو دیکھتے ہوئے کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس دن کی اہمیت کا عالم کیا ہوگا۔ پھر خود ہی فرمایا کہ یہ دن وہ ہے جس کو یوم الفصل کہا جاتا ہے، یعنی جب ہر فرد اور ہر قوم کا فیصلہ ہوگا کہ انہوں نے دنیا میں کس طرح زندگی گزاری اس کا ایک ایک عمل سامنے ہوگا اور ان کا اعمال نے جو نتائج پیدا کئے اور ان کے اثرات جہاں جہاں تک پھیلے ہر چیز نظروں کے سامنے لائی جائے گی۔ اور اس یوم الفصل کی اہمیت کو مزید واضح کرنے کیلئے فرمایا تاکہ انسان اس دن کی تیاری کیلئے کچھ کر سکے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿١٤﴾

(اور تم کیا جانو کہ کیا ہے فیصلے کا دن۔ ۱۴)

یہ اسلوبِ کلام کسی چیز کی عظمت و ہیبت کے اظہار کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ گزشتہ آیت میں بھی اس کی عظمت کو نمایاں کیا گیا اور پیشِ نظر آیت میں بھی سوال کی صورت میں اس کی عظمت کو مزید اجاگر کیا گیا تاکہ جس دل میں اپنے انجام کی کچھ بھی فکر ہے اسے گہرائی نصیب ہو۔ اور جو آج تک اس سے بےفکر رہا ہے، اسے سوچنے کا موقع ملے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٥﴾

(تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۱۵)

قیامت کا نتیجہ

اس آیتِ کریمہ میں ایک تو اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ قیامت کو جو فیصلے کا دن بنایا گیا ہے اس فیصلے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور دوسرا اس میں قریش اور اہلِ مکہ کو وارننگ دی گئی ہے کہ تم اگر اس قیامت کا مذاق اڑاتے رہو گے اور اسے بعید از عقل سمجھتے ہوئے تذبذب کا شکار رہو گے اور یا اپنے عیش و عشرت میں مست ہو کر زندگی لاپرواہی کی نذر کر دو گے تو اس دن کا آنا تو اٹل ہے، اسے تو بہرحال آنا ہے، تمہیں ہم خبردار کئے دیتے ہیں کہ وہ دن جس طرح اپنے ماننے والوں کیلئے کامیابیوں، کامرانیوں اور راحتوں کا پیغام لے کر آئے گا، اسی طرح تکذیب کرنے والوں اور مذاق اڑانے والوں کیلئے تباہی اور بربادی ثابت ہوگا۔ تم سوچ لو کہ اپنے لئے کیا پسند کرتے ہو۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٧﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٨﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٩﴾

(کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ ۱۶) پھر ان کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں گے۔ ۱۷) ہم مجرموں کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں۔ ۱۸) خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔ ۱۹)

Marfat.com

قیامت کے حق میں تاریخ سے استدلال

آخرت اور قیامت کے حق میں تاریخ سے استدلال فرمایا گیا ہے۔انسان بعض دفعہ عقلی دلائل کو سمجھ نہیں پاتا یا سمجھ کر جھٹلا دیتا ہے، لیکن تاریخی دلائل کا انکار بہت مشکل ہوتا ہے۔اس لئے کہ تاریخ سے آگاہ لوگ اِکاّدُکاّ نہیں بلکہ بکثرت ہوتے ہیں جبکہ تاریخ بھی کسی قوم کی تباہی کی ہو۔آپ واقعات کا انکار تو کرسکتے ہیں لیکن کھنڈرات کی کہانی کو تو نظرانداز نہیں کرسکتے۔چنانچہ اسی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منکرینِ قیامت سے کہا گیا ہے کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تم سے پہلے کتنی قومیں ہلاکت کی نذر ہوچکی ہیں اور یہ سب وہ قومیں تھیں جنہوں نے آخرت کا انکار کرکے زندگی کے بارے میں تصورات وضع کئے،جس کے نتیجے میں دنیا کو دارالعمل سمجھنے کی بجائے اسی کو اصل زندگی سمجھا۔اور اسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو خیر وشر کا معیار سمجھ کر اپنا اخلاقی رویہ متعین کیا۔ان کی طرف آنے والے اللہ تعالیٰ کے رسول انہیں بار بار حقیقی تصورات سے آگاہ کرتے رہے۔دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری کا درس دیتے رہے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔چنانچہ اسی تکذیب کے نتیجے میں یہ لوگ ہلاک کردیئے گئے۔ان کے بعد جو قومیں اٹھیں اور انہوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تو وہ بھی ہلاکت کا نشانہ بنیں۔قومِ نوح، عاد اور ثمود اور ان کے بعد کی آنے والی قومیں لوط، مدین اور قومِ فرعون وغیرہ تم ان سب سے واقف ہو۔ان کی تاریخ سینہ بہ سینہ تم تک پہنچی ہے۔تم تجارتی اسفار میں ان کے کھنڈرات پر سے گزرتے ہو۔یہ تاریخ مسلسل اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جن قوموں نے رسولوں اور ان کے انذار کی تکذیب کی ہم نے ان کو ہلاک کردیا۔تو آخر ان ہی کی روش پر چلنے والے آج کے مجرموں کے باب میں ہماری سنت کیوں بدل جائے گی۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔یعنی یہ ایک ایسی سنت اللہ ہے جو کبھی نہیں بدلی، اور نہ آج اس میں تبدیلی آئے گی۔تو قریش کو سوچنا چاہیئے کہ اگر انہوں نے اپنا طرزِ عمل نہ بدلا تو اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ان کا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کیلئے یکساں ہے۔آخر میں ترجیع کی آیت ہے جو بطورِ خاص اپنے مخاطبوں کو توجہ دلانے کیلئے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون کبھی بدلنے والا نہیں۔قیامت کی تکذیب کرنے والے ہمیشہ تباہی کا شکار ہوتے رہے ہیں۔آج بھی وہ اسی قانون کی زد میں آئیں گے۔لیکن ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی گرفت جو عذاب کی صورت میں ہوتی ہے اس کو قیامت کا عذاب نہ سمجھا جائے۔یہ تو مجرموں کی گرفتاری کی مانند ہے، اصل عذاب تو وہ ہوگا جو قیامت کے دن ہوگا۔اس لئے فرمایا کہ خرابی تو اس دن ہے مکذبین کیلئے جسے قیامت کہتے ہیں۔اس لئے دوسری جگہ قرآنِ کریم نے دنیا کے عذاب کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ''اور آخرت کا عذاب سب سے بڑا ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔''

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿٢٠﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿٢١﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٢٢﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٢٤﴾

(کیا ہم نے تم کو ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا۔ ۲۰) پھر ہم نے اس کو رکھا ایک محفوظ جگہ میں۔ ۲۱) ایک معین مدت تک۔ ۲۲) پس ہم نے اس کو ٹھہرایا، ہم کیا ہی اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔ ۲۳) خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۲۴)

Marfat.com

قیامت کے وقوع پر ایک انفسی دلیل

گزشتہ آیتِ کریمہ میں قیامت کے وقوع اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر آفاقی دلیل قائم کی تھی۔ پیشِ نظر آیات میں انفسی دلیل سے کام لیا گیا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہی گئی ہے اور خود انسان سے اس کا سوال کیا گیا ہے کیونکہ اس کے دو جواب ہو ہی نہیں سکتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے تمہیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا، پانی کی ایک بوند یعنی جس سے انسان نفرت کرتا اور اسے گندہ سمجھتا ہے وہ باپ کی صُلب سے نکلتا ہے اور اس میں بے شمار جرثومے ہوتے ہیں جس میں سے ہر جرثومہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بچہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر ان بے شمار جرثوموں میں سے ایک جرثومہ جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے ماں کے بے شمار بیضوں میں سے ایک بیضے میں داخل ہو کر بچہ کے جسمانی وجود کی بنیاد بنتا ہے۔ جو شخص بھی اس پراسیس کو گہری نظر سے دیکھے گا وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وسعت میں ڈوب جائے گا۔ اور پھر مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی جرثومے اور بیضے کو ایک مقررہ مدت تک ایک محفوظ اور جمے ہوئے مقام میں رکھا جاتا ہے۔ کسی کو خبر نہیں کہ ماں کے پیٹ میں استقرارِ حمل کے بعد استقرار کی مدت کتنی ہے۔ وہ کتنے مہینے، کتنے دن، کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ اور سیکنڈ ماں کے پیٹ میں رہے گا، اس کا ٹھیک وقتِ ولادت کیا ہوگا۔ کہنے کو بچہ نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں رہتا ہے، لیکن ٹھیک ٹھیک مدت کا تعین اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ اور اس پر مزید یہ کہ جہاں اس بچے کے ابتدائی مادے کو رکھا جاتا ہے وہ جگہ اتنی محفوظ اور اس کی حفاظت اور پرورش کے ایسے مکمل انتظامات ہیں کہ کسی شدید حادثے کے بغیر اس کا اسقاط نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یہ انتظامات ایسے ہیں جو انسانی دسترس سے ماورا ہیں۔ اس میں ذرا پیچیدگی پیدا ہو جائے تو بعض دفعہ یہ انسانی قدرت کیلئے لاینحل صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اس پورے منظرنامے کو سامنے رکھتے ہوئے پروردگار توجہ دلاتے ہیں کہ جب تمہارے رب کی بے پناہ قدرت ایسے نازک مواقع پر اور ایسے حیران کن انداز میں اپنے اظہار پر قادر ہے۔ تو آخر دوبارہ تمہیں پیدا کرنے پر کیوں قادر نہیں۔ ہماری قدرت کا ایک ایک منظر یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔ ایسے عاجز نہیں ہیں کہ ایک دفعہ پیدا کر کے دوبارہ پیدا نہ کر سکیں۔ آخر میں ترجیع کی آیت کو لا کر فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ حیات بعد موت کے امکان پر ایسے صریح اور سادہ دلیل کو دیکھتے ہوئے بھی اس کا انکار کرتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ آج تو ان کی زبانیں بے روک ہیں جو چاہیں کہیں اور جیسے چاہیں مذاق اڑائیں، لیکن جب وہ دن آئے گا جسے یہ لوگ جھٹلا رہے ہیں تو تب انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کیلئے وہ دن تباہی کا دن ہوگا۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْیَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّجَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ
شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۲۸﴾

(کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا۔ ۲۵) زندوں کیلئے بھی اور مردوں کیلئے بھی۔ ۲۶) اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے اور تمہیں خوشگوار پانی پلایا۔ ۲۷) تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۲۸)

Marfat.com

یوم الفصل پر اہتمامِ ربوبیت سے دلیل

کفات، کفت سے ہے۔اس کے معنی ہیں جمع کرنا، اکٹھا کرنا اور ملانا۔کفات وہ چیز ہے جو بہت سی چیزوں کو اپنے اندر جمع کرے۔

یوم الفصل کے ممکن اور معقول ہونے پر پروردگار نے اہتمامِ ربوبیت سے دلیل قائم فرمائی ہے۔اس سے پہلے گندے پانی کی ایک بوند سے انسان کی پیدائش کا ذکر فرمایا۔اور پھر جس طرح استقرارِ حمل کے بعد انسان کو رحمِ مادر میں رکھ کر اسے تخلیق کے مراحل سے گزارا۔اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت نے قدم قدم پر اس کی دستگیری فرمائی، اس کی تفصیلات کی طرف اشارے فرمائے۔اب پیشِ نظر آیت میں ماں کی آغوش کے بعد زمین کے بچھونے کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔یہ مٹی کا تودہ جو بظاہر بے جان اور بے حس معلوم ہوتا ہے اپنے اندر تربیت و پرورش کی وہ صلاحیت اور وسعت رکھتا ہے کہ جس کی تفصیلات کو جان کر آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔سب سے پہلے تو اس کی وسعت کو دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ کس قدر بے شمار مخلوقات اس کی گود میں پل رہی ہیں۔ہر قسم کی نباتات اور ہر قسم کے حیوانات اور بے شمار جن وانس اس پر زندگی گزار رہے ہیں۔اور اس کی آغوش صرف زندوں کیلئے مخصوص نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس گود کی وسعت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔جس طرح زندہ لوگوں کی سرگرمیاں اس کے اوپر اس طرح جاری و ساری رہتی ہیں کہ کہیں بھی انہیں فطری ارضی رکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی بے شمار لوگوں کی اس میں قبریں کھودی جاتی ہیں اور انہیں اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے، لیکن کیا مجال ہے کہ زمین انہیں قبول کرنے سے انکار کرے، یا انہیں ٹھکانے لگانے سے دریغ کرے۔آبادیاں اٹھائی جاتی ہیں، یہ ان کے بوجھ کو اٹھاتی ہے۔سرنگیں کھودی جاتی ہیں، یہ ان کو پناہ دیتی ہے۔لاشوں کو قبول کرتی ہے اور ایک عرصے کے بعد دوسری لاشوں کیلئے آغوش کھول دیتی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے گہوارے میں جانے والے ہمیشہ کیلئے مٹ نہیں جاتے بلکہ قیامت کے اعلان کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین ان کو اگل کر مہیا کر دے گی اور قیامت تک اس طرح اپنی تحویل میں رکھے گی کہ کسی کو ان کی موجودگی کا احساس تک بھی نہیں ہوگا۔

زمین کی افادیت کو دیکھتے ہوئے انسان ششدر رہ جاتا ہے۔دریاؤں کا میٹھا پانی، سیماب اگلتے ہوئے چشمے، چاندی بہاتی ہوئی آبشاریں اور زمین دوز پانی کے ذخیرے کہ جب انہیں کھودا جائے تو اپنے وجود سے انکار نہ کریں اور جہاں بھی انسانی آبادی موجود ہے وہاں اپنے وجود سے ان کی سیرابی اور ضرورت کا انتظام کریں۔

زمین کے اندر چھپا ہوا روئیدگی کا خزانہ جو زمین پر پھیلی ہوئی نباتات اور لہلہاتی ہوئی فصلیں اور رسیلے پھلوں سے لدے ہوئے درخت اور چھتریوں کی طرح سایہ کرنے والے خوبصورت پودے، قسم قسم کے پھول اور خوش رنگ بیلیں انسان کی غذائی ضروریات کے ساتھ ساتھ لذتِ کام و دہن اور ذوق سمع بصر کا سامان بھی ہیں۔

حیران کن بات یہ ہے کہ اسی زمین کو رہائش و پرورش کا گہوارہ بنانے کیلئے پہاڑوں کی میخیں گاڑی گئیں تاکہ زمین کا توازن برہم نہ ہونے پائے۔پھر انہیں پہاڑوں سے موسموں کے تغیرات، بارشوں کے برسنے، دریاؤں کی پیدائش، زرخیز وادیوں کے وجود، قسم قسم کی معدنیات اور طرح طرح کے پتھروں کی فراہمی میں اس طرح کام لیا گیا کہ کسی کو احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ یہ بلند و بالا پتھروں کے ڈھیر کیا زمین کی نفع رسانی کی قوت میں ایسا مؤثر کردار انجام دے رہے ہیں۔پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پہاڑوں کی بلندی ہواؤں اور بادلوں کو کنٹرول

Marfat.com

کرنے اور پانی کے قدرتی ذخائر جمع کرنے میں نہایت مؤثر ہے۔ سمندر بظاہر زمین کے بیشتر حصے کو گھیرے ہوئے ہے اور اپنے اندر کھاری پانی کا ذخیرہ رکھتا ہے جس میں قدرت نے بے شمار فوائد و منافع رکھے ہیں لیکن انسان کیلئے ٹھنڈا پانی مہیا کرنے کیلئے انہیں سمندروں کے کھاری پانی سے صاف ستھرے بخارات اٹھائے جاتے ہیں جن سے نتھرا ہوا پانی برسانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کیا یہ سب کچھ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک قادرِ مطلق نے یہ سب کچھ بنایا ہے اور وہ محض قادر ہی نہیں ہے بلکہ علیم و حکیم بھی ہے۔ کیا اس کی علم و حکمت کا یہ تقاضا ہو سکتا ہے کہ وہ محض تفریح کیلئے یہ سب کچھ بنائے اور پھر بچوں کی طرح اس کھلونے کو ایک دن توڑ ڈالے۔ حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کے بعد ایک دوسری دنیا بنائے تاکہ انسان سے ان اعمال کا حساب لے جو اس نے دنیا میں کیے ہیں۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۚ ﴿۲۹﴾

(چلو اس چیز کی طرف جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ ۲۹)

قیامت میں منکرین کا حشر

فیصلے کے دن کا اثبات بلکہ مشاہدہ، آفاق و انفس کے آثار و شواہد کے اندر کرایا گیا۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ یوم الفصل آ جائے گا یعنی قیامت برپا ہو جائے گی تو وہاں منکرین کا کیا حشر ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ چلو اس چیز کی طرف جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے، وہ اب تمہارے انتظار میں ہے۔ اب تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ تم کس خطرناک غلطی کا ارتکاب کرتے رہے ہو۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۙ ﴿۳۰﴾

(چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ ۳۰)

گزشتہ آیت میں جس ہولناک چیز کی طرف چلنے کو کہا گیا تھا اس آیت میں اس سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ اس تین شاخوں والے سائے کی طرف چلو۔ ظِلٍّ کے معنی تو سایہ کے ہیں لیکن اس سے مراد معروف سایہ نہیں بلکہ دھویں کا سایہ ہے۔ سورۃ واقعہ کی آیات ۴۳، ۴۴ میں اس کی تشریح فرمائی گئی ہے۔ وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ''اور سیاہ دھویں کا سایہ، نہ ٹھنڈا، نہ نفع بخش۔''

دھویں کے اس سائے کی صفت ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دھواں ان کے آگے تمام سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ صرف وہی سمت اس کی آفت سے محفوظ ہوگی جس سے یہ مکذبین جیسا کہ لفظ اِنْطَلِقُوْٓا سے واضح ہے کھدیڑ دیے جائیں گے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے بعد ان کیلئے دھواں ہی دھواں ہوگا۔

اس ٹکڑے کی تاویل میں بعض اہلِ علم نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت، (۲) مخلوق سے بے پروائی، (۳) روزِ جزاء کا انکار۔ انہیں تین خصلتوں کے مطابق عذاب کی تین شاخیں

Marfat.com

ان کی طرف بڑھیں گی اوران کو چھالیں گی۔ یہ نکتہ لطیف ہے لیکن یہ تینوں خصلتیں باہم دگر بالکل لازم وملزوم ہیں۔اور یہ تمام کفار میں مشترک بھی نہیں۔ان کی بنیاد پر کفار کی الگ تھلگ درجہ بندی کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔واضح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمتیں بہرحال چار ہی ہوتی ہیں۔تو جب وہ اس سمت سے نکال دیئے جائیں گے جو اس دھویں کے عذاب سے محفوظ ہوگی تو تین سمتیں بچ رہتی ہیں اور یہ تینوں اس دھویں کے احاطہ میں ہوں گی، گویا اس کے بعد وہ ہر طرف سے دھویں کے عذاب میں ہوں گے۔ (تدبر قرآن)

لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾

(نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپٹ سے بچانے والا۔ ۳۱)

ظِلٌ کی وضاحت

گزشتہ آیت میں ظِـلِّ کے لفظ سے مغالطہ ہوسکتا تھا کہ اہلِ جہنم کو جو خطرناک صورتحال پیش آنے والی ہے اس میں شاید ظِـلِّ یعنی سائے کی راحت موجود ہوگی۔اس لئے اس مغالطے کو رفع کرنے کیلئے فرمایا کہ وہ سایہ ضرور ہوگا لیکن سائے کی کیفیت سے خالی۔اس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہوگی اور نہ کوئی راحت۔نہ اس میں چھاؤں ہوگی، نہ وہ شعلوں کی لپٹ سے بچاؤ کا سامان کرے گا۔یوں کہنا چاہئے کہ دھویں کی اذیت بخشی کے سارے سامان تو اس میں موجود ہوں گے لیکن ظِلِّ کے لفظ سے جو کیفیت محسوس ہوتی ہے اس کا کوئی نفع بخش پہلو اس میں موجود نہیں ہوگا۔

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾

(بیشک وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی۔ ۳۲) گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں۔ ۳۳)

پیچھے دھویں کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے قرینِ قیاس یہ ہے کہ اِنَّهَا میں ضمیر کا مرجع وہ آگ ہے جو دھویں کے بعد بھڑکے گی۔وہ آگ ایسی ہولناک ہوگی جس کی ایک ایک چنگاری محل کی طرح عظیم ہوگی۔اور جب یہ بڑی بڑی چنگاریاں اٹھ کر پھٹیں گی اور چاروں طرف اڑنے لگیں گی تو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے زرد رنگ کے اونٹ اچھل کود رہے ہیں۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾

(اس دن خرابی ہے جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۳۴)

گزشتہ آیاتِ ترجیع کی طرح یہ بھی آیتِ ترجیع ہے جس میں اس بات کی توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ یوم الفصل جس کی یہاں منظر کشی کی گئی ہے اس دن جن لوگوں کو اس منظر سے سابقہ پیش آئے گا ان کیلئے اس سے بڑھ کر خرابی اور تباہی کا دن کیا ہوگا۔اور چونکہ اس سے دوچار ہونے والے سب سے زیادہ وہی لوگ ہوں گے جو قیامت کی تکذیب کرتے رہے ہیں اس لئے بطورِ خاص ان کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

Marfat.com

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾

(یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے۔ ۳۵) اور نہ ان کو اجازت دی جائے گی کہ کوئی عذر پیش کر سکیں۔ ۳۶)
اس دن جھٹلانے والوں کیلئے تباہی ہے۔ ۳۷)

مکذبین قیامت جس ہولناک صورتحال سے دوچار ہوں گے اس کا تعلق آخری فیصلے سے پہلی حالت سے ہوگا۔ اس وقت تک وہ برابر کوشش جاری رکھیں گے کہ کسی طرح آخری انجام سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔ معذرتیں پیش کریں گے، دوسروں پر اپنے قصوروں کا الزام دھریں گے، گمراہ کرنے والے سرداروں اور پیشواؤں کو گالیاں دیں گے۔ لیکن جب تمام شہادتوں سے ان کا مجرم ہونا پوری طرح ثابت کر دیا جائے گا اور صفائی کے تمام مواقع ان کے ہاتھ سے جاتے رہیں گے، حتیٰ کہ ان کے ہاتھ پاؤں اور ان کے اعضاء تک ان کیخلاف گواہی دے کر ان کے مجرم ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں گے تو تب ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ اب وہ بولنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ہر چیز ثابت ہو جانے کے بعد ان کے پاس کہنے کی کوئی بات باقی نہیں رہے گی۔ البتہ ایک موقع تو آخر تک باقی رہتا ہے کہ مجرم بار بار معافی مانگتا ہے اور اپنی معذرت پیش کرتا ہے لیکن اس کا موقع بھی ان کو نہیں دیا جائے گا۔ اس کے بعد یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ وہ دن قیامت کو جھٹلانے والوں کیلئے کس قدر تباہی کا باعث ہوگا۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٠﴾

(یہ ہے فیصلہ کا دن، ہم نے تم کو بھی جمع کیا اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بھی۔ ۳۸) اب اگر تمہارے پاس کوئی داؤ ہے تو میرے مقابلے میں کر دیکھو۔ ۳۹) اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے۔ ۴۰)

ان آیات میں پروردگار نے مجرموں سے براہِ راست خطاب فرمایا ہے کہ تم نے زندگی بھر جس یوم الفصل کا انکار کیا اور اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے دوبارہ اٹھائے جانے کا تمسخر اڑایا اور وقوعِ قیامت کو خلافِ عقل قرار دیا یہ وہی دن تمہارے سامنے ہے، ہم نے تمہیں بھی اور تمہارے آباؤ اجداد کو بھی اس دن میں جمع کر دیا ہے تاکہ جن جن چیزوں کو تم مستبعد از عقل سمجھتے تھے انہیں اپنے گردو پیش میں دیکھ لو۔ اور پھر جس طرح تم نے دنیا میں ہمارے رسول کو شکست دینے کیلئے بڑی بڑی چالیں چلیں، اگر کوئی چال باقی رہ گئی ہو تو وہ بھی آزما دیکھو۔ اب تو تم اگلے پچھلے سب جمع ہو تو ایک دوسرے کی مدد بھی کر سکتے ہو۔ تو سب اکٹھے ہو کر کوئی تدبیر کر سکتے ہو تو کرو۔ لیکن آج ظاہر ہے کہ ان کے پاس رسوائی اور ندامت کے سوا کوئی جواب نہ ہوگا۔ اس لئے فرمایا کہ آج کا دن جھٹلانے والوں کیلئے انتہائی خرابی کا باعث ہوگا۔

Marfat.com

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاکِہَ
مِمَّا یَشْتَہُوْنَ ﴿۴۲﴾ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا ہَنِیْٓـًٔا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا
کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ﴿۴۵﴾ کُلُوْا
وَتَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّکُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ﴿۴۷﴾
وَاِذَا قِیْلَ لَہُمُ ارْکَعُوْا لَا یَرْکَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

رکوع: ۲۔ (بیشک اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے سایوں اور چشموں میں ہوں گے۔ ۴۱) اور ان میووں اور پھلوں میں ہوں گے جن کی وہ خواہش کریں گے۔ ۴۲) کھاؤ اور پیو، راس آتا اپنے اعمال کے صلہ میں۔ ۴۳) ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ ۴۴) تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۴۵) کھالو اور مزے کرلو تھوڑے دن، حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ ۴۶) تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۴۷) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے رب کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔ ۴۸) تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۴۹) اب اس قرآن کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ ۵۰)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاکِہَ مِمَّا یَشْتَہُوْنَ ﴿۴۲﴾

(بیشک اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے سایوں اور چشموں میں ہوں گے۔ ۴۱) اور ان میووں اور پھلوں میں ہوں گے جن کی وہ خواہش کریں گے۔ ۴۲)

متقین کا انجام

مکذبین قیامت کے بعد ان لوگوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے جنہوں نے زندگی اس احساس کے ساتھ گزاری کہ قیامت کو اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا اندیشہ ہر وقت ان کے دامن گیر رہا۔ اور ان کے تمام احساسات پر اللہ تعالیٰ کے خوف کا پہرہ رہا۔ اور اس کی رضا کا حصول ہمیشہ ان کی منزل بنا رہا۔ قیامت کے دن ان کی اس پاکیزہ زندگی کے بدلے میں انہیں وہ عیش نصیب ہوگا جن

Marfat.com

میں ٹھنڈے سایوں، میٹھے چشموں اور اپنی پسند کے میووں پر ان کی حکمرانی ہوگی۔ ان کیلئے ہر وہ نعمت میسر ہوگی جس کی وہ چاہت کریں گے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو صرف جنت میں حاصل ہوسکتا ہے، دنیا میں کسی کیلئے اس کا امکان نہیں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٥﴾

(کھاؤ اور پیو، راس آتا اپنے اعمال کے صلہ میں۔ ۴۳) ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ ۴۴) تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۴۵)

اعمالِ حسنہ کا حیرت انگیز نتیجہ

دنیا میں دولت کی قیمت پر ہر چیز تو نہیں، بیشتر چیزیں خریدی جاسکتی ہیں اور حکومت کے زور سے بھی بہت کچھ مزے لوٹے جاسکتے ہیں، لیکن ایک چیز ایسی ہے جو نہ دولت سے حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ حکومت سے۔ وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو بھی یہ یقین نہیں دلاسکتا کہ آپ جو کچھ کھائیں گے یا پئیں گے وہ آپ کیلئے تکلیف کا باعث نہیں ہوگا۔ اور ہر حال میں ہر نعمت آپ کو وہی کچھ دے گی جو آپ اس سے چاہتے ہیں۔ اور دوسری اس بات کی بھی کوئی شخص ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی ہے اسے کبھی زوال نہیں ہوگا، دولت ہمیشہ رہے گی اور حکومت کبھی نہیں چھینی جائے گی۔ لیکن جنت ایسی جگہ ہے جس میں اہلِ جنت کو ضمانت دی جائے گی کہ یہاں کی کسی نعمت کو نہ زوال ہے اور نہ اس میں خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ آپ خوشیوں کے حصار میں ہیں جس میں کوئی چیز بھی بارِ خاطر نہیں بن سکتی۔ اور یہ غیر معمولی انعامات صرف اس لئے ہیں کہ ہم اپنے شکر گزاروں اور اپنے فرمانبرداروں کو ہمیشہ ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ لیکن آج کا دن چونکہ دارالجزا ہے اور آج عدل کی حکومت ہے اس لئے جس طرح محسنین کو آج نوازا جائے گا اسی طرح مکذبین کیلئے آج کا دن انتہائی خرابی کا دن ہوگا۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٧﴾

(کھالو اور مزے کرلو تھوڑے دن، حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ ۴۶) تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۴۷)

اشرافِ قریش سے براہِ راست خطاب

اشرافِ قریش کو یوں تو قیامت سے انکار تھا لیکن کبھی کبھی وہ یہ بات بھی کہتے کہ اگر واقعی قیامت ہوئی جیسا کہ محمد (ﷺ) کہتے ہیں تو ہم وہاں بھی اسی طرح تم سے بہتر سلوک کے مستحق سمجھے جائیں گے۔ کیونکہ جس پروردگار نے ہمیں دنیا میں خوش عیشی سے نوازا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ قیامت کے دن ہمیں سزا دے۔ قرآنِ کریم نے جابجا اس غلط فہمی کا ازالہ کیا۔ یہاں بھی ان کے اسی غلط تصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم کھالو اور مزے کرلو، یہ دنیا چند روزہ ہے، تمہیں اس میں ڈھیل دی گئی ہے، کیونکہ یہ دارالعمل ہے، دارالجزاء نہیں۔ لیکن یہ

Marfat.com

مت بھولو کہ تم یہاں بھی مجرم ہو اور وہاں بھی مجرم ہو۔ یہاں تم ڈھیل سے فائدہ اٹھا رہے ہو اور غلط فہمیوں میں اپنے جرائم میں اضافہ کر رہے ہو۔ لیکن آخرت کا دن چونکہ عدل کی بالادستی اور روبکاری کا دن ہے، اس لئے اس روز صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے نوازے جائیں گے، لیکن تمہارے لئے وہ دن انتہائی خرابی کا دن ہوگا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے رب کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔ ۴۸) تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۴۹)

منکرینِ قیامت کو ملامت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں قریش کے لیڈروں سے خطاب فرمایا گیا تھا، اب ان سے منہ پھیر کر فرمایا گیا ہے بلکہ انہیں ملامت کی گئی ہے کہ یہ اپنے موجودہ طور اطوار کو اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل سمجھتے ہوئے نہ صرف قیامت کا انکار کرتے ہیں بلکہ ان کا حال تو یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جائے کہ تم اپنے رب کے سامنے جھکو تو باوجود اس کے کہ وہ اسے اپنا رب سمجھتے ہیں لیکن اس کے سامنے جھکنا پسند نہیں کرتے بلکہ تکبر کا اظہار کرتے۔ ایسے لوگوں کیلئے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قیامت کا دن ان کیلئے تباہی کا باعث بنے اور یقیناً وہ دن ان کیلئے تباہی اور بربادی کا باعث ہوگا۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

(اب اس قرآن کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ ۵۰)

آخری تنبیہ

قرآنِ کریم آخری کتاب ہے جو نوعِ انسانی کو خیر و شر کا امتیاز سکھانے اور اس کی حقیقی منزل واضح کرنے کیلئے نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد دنیا کی ہدایت کیلئے کوئی نسخۂ کیمیا نازل نہیں ہوگا۔ اور نہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد کوئی اور نبی آئے گا۔ یہ لوگ اگر آنحضرت ﷺ کی بعثت اور قرآن کے نزول کے بعد بھی راہِ راست اختیار کرنے کیلئے تیار نہیں تو پھر دنیا میں اور کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جو حق و باطل کا فرق سمجھانے والی اور ہدایت کا راستہ دکھانے والی ہو۔ قرآنِ کریم سے اعراض اور آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار دنیا و آخرت کی سب سے بڑی محرومی ہے۔

Marfat.com

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑا ئیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ النَّبَاِ

(۷۸)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ النَّبَاِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام النَّبَا ہے۔ یہ اس سورۃ کی دوسری آیت سے ماخوذ ہے۔ سورتوں کے نام بالعموم شناخت کیلئے ہیں، سورۃ کے مضامین سے ان کا تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن یہ نام سورۃ کے مضامین کا عنوان بھی ہے۔ کیونکہ اس سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے اور اس سورۃ میں ساری بحث اسی کے حوالے سے کی گئی ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے اور مکے میں آنحضرت ﷺ کی نبوت کے ابتدائی دور میں جو سورتیں نازل ہوئی ہیں اس کا شمار ان میں ہوتا ہے۔ کیونکہ سورۂ قیامت سے سورۂ نازعات تک سب کے مضامین میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ بالخصوص سورۃ مُرسلٰت جو اس سورۃ سے پہلے کی سورۃ ہے وہ تو اس کی توأم سورۃ معلوم ہوتی ہے، کیونکہ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ اور یہ سب سورتیں آنحضرت ﷺ کی نبوت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

آنحضرت ﷺ کی نبوت کے ابتدائی دور میں آپ کی تبلیغ و دعوت کا عنوان عموماً تین بنیادی عقائد تھے۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ توحید پر قرآنِ کریم نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ اسلام کی اساس ہے۔ اور توحید کی ضد چونکہ شرک ہے اس لئے قرآنِ کریم نے شرک کے ابطال میں بھی بہت تفصیل سے کام لیا ہے۔ اہلِ مکہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے اور اس کو ربِ اعلیٰ اور خالق ورازق بھی مانتے تھے۔ اس لئے توحید فی الذات میں انہیں کوئی زیادہ بحث نہ تھی۔ البتہ جہاں تک صفات اور حقوق میں توحید کا تعلق ہے اس کو تسلیم کرنا ان کیلئے بہت مشکل تھا۔ اس لئے قدم قدم پر آنحضرت ﷺ کی تبلیغ ودعوت کے ساتھ ان کے مزعومات کا تصادم ہوا۔

جہاں تک آپ کے دعویٰ رسالت کا تعلق ہے، اہلِ مکہ کو اگرچہ اس سے بھی انکار تھا لیکن آنحضرت ﷺ کے بلند کردار اور آپ کی چالیس سالہ پاکیزہ زندگی کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ جب ان سے یہ کہا جاتا کہ جس شخص نے چالیس سال میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اب وہ کیا ڈھلتی عمر میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے گا تو وہ مبہوت ہو جاتے۔ اس طرح سے آپ کی نبوت کے انکار میں وہ اپنے لئے دشواری محسوس کرتے تھے اور اپنے انکار کو مختلف قسم کے الزامات کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔

Marfat.com

البتہ ان کیلئے سب سے الجھن کا باعث قیامت اور آخرت کا عقیدہ تھا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے جب نہایت بلند آہنگی، اسلوبِ بیان کے شان وشکوہ اور خطاب وکلام کے نہایت بلند مقام سے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ آخرت کے عقیدے کو پیش کیا۔ اور اس کے ماننے اور تسلیم کرنے پر تمام تر اسلامی زندگی کی بنیاد رکھی۔ تو اہلِ مکہ نے اس عقیدے کو تسلیم کرنے میں سب سے زیادہ مزاحمت کا ثبوت دیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس بنیادی تصور کو قبول کرلینے سے انسانی زندگی میں ایک بنیادی انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مختلف طریقوں سے اس کو تنقید کا موضوع بنایا۔ ایک طرف تو اس عقیدے کی اہمیت کی بنیاد پر ان کی مجلسوں میں بار بار اس حوالے سے گفتگو ہونے لگی۔ اور دوسری طرف اس کے اثرات کو دیکھتے ہوئے اس کو مذاق اور تمسخر بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ لوگ اس کو سنجیدگی سے لینے کی غلطی نہ کریں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے سب سے پہلے ان کی آپس کی چہ میگوئیوں کو موضوعِ سخن بنایا۔ اور اس کیلئے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جس میں زجر وملامت اور تہدید وتوبیخ جھلکتی ہے۔ انہیں ایک طرح سے تنبہ کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں فرمایا گیا ہے کہ تم جس خبرِ عظیم پر آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے اور مذاق اڑاتے ہو وہ خبر تو اس قابل تھی کہ تمہاری راتوں کی نیندیں اڑ جاتیں اور تم شب وروز تیاری میں لگ جاتے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، رحمت، حکمت اور قدرت کی ان نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے جو زمین سے لے کر آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر ان میں سے بعض ایسی نشانیوں کا نام لے لے کر سوال کیا گیا ہے جو ہر آنکھیں رکھنے والے کو نظر آتی ہیں اور ہر سوچنے والا انہیں محسوس کرسکتا ہے۔ مثلاً کیا تمہیں زمین نظر نہیں آتی جسے ہم نے تمہارے لئے فرش بنا رکھا ہے۔ کیا یہ بلند وبالا پہاڑ تمہیں دکھائی نہیں دیتے جنھوں نے زمین کی طنابیں کھینچ رکھی ہیں۔ پھر کیا تمہیں اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کی یہ حیرت انگیز قدرت نظر نہیں پڑتی کہ کس طرح ہم نے تمہیں مردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔ اور کہیں ایسا نہیں ہوا کہ کسی علاقے میں صرف مرد ہی پیدا ہوں اور کہیں صرف عورتیں ہی جنم لیں۔ یا کہیں خطرناک حد تک یہ تناسب بگڑ جائے۔ پھر نیند کی طرف توجہ دلائی کہ تم دیکھتے نہیں کہ کس طرح نیند کے ذریعے سے ہم نے تم کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنائے رکھنے کیلئے ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد ہر چند گھنٹے آرام لینے پر مجبور کررکھا ہے۔ پھر کیا تم رات اور دن کی آمد ورفت کو نہیں دیکھتے ہو۔ کیا تمہارے اوپر آسمانوں کا مضبوط نظام قائم نہیں کررکھا۔ کیا تمہیں سورج نظر نہیں آتا جس کی روشنی میں تم زندگی کے فرائض انجام دیتے ہو۔ پھر کیا تمہیں بارشیں اور ان کے برسنے کا حیرت انگیز طریقہ اور پھر ان کی گہری افادیت تمہارے غور وفکر کا کبھی موضوع نہیں بنتی۔ کیا یہ ساری چیزیں یہ بتانے کیلئے کافی نہیں کہ جس قادرِ مطلق نے ان کو پیدا کیا ہے اسی قادرِ مطلق کی قدرت قیامت لانے اور آخرت برپا کرنے کیلئے کافی ہے۔ اس پورے کارخانے میں جو کمال درجے کی حکمت و دانائی صریحاً کارفرما ہے کیا اس کو دیکھتے ہوئے کوئی یہ شخص کہہ سکتا ہے کہ اس کارخانے کا ایک ایک جز اور ایک ایک فعل تو بامقصد ہے مگر بجائے خود پورا کارخانہ بے مقصد ہے۔ پھر اس سے زیادہ لغو اور بے معنی بات کیا ہوسکتی ہے کہ اس کارخانے میں انسان کو اشرف المخلوقات کے طور پر پیدا کرکے خلافتِ ارضی کے منصب پر مامور کرکے بڑے وسیع اختیارات دے دیئے جائیں۔ مگر جب وہ اپنا کام پورا کرکے یہاں سے رخصت ہو تو نہ اس کے اچھے کام کرنے والوں کو انعام ملے اور نہ زندگی برائی میں گزارنے والوں کو کسی سزا سے واسطہ پڑے۔

ان دلائل سے خود بخود یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آخرت اور قیامت کا آنا انسان کی بامقصد زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے زور دے کر فرمایا گیا ہے کہ فیصلے کا دن یقیناً اپنے مقررہ وقت پر آکر رہے گا۔ اور اس فیصلے کے دن کو لانے میں پروردگار کیلئے کوئی مانع نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کے حکم کے تابع ہے۔ جب وہ چاہے گا تو ایسا صور پھونکے گا کہ سب قبروں سے نکل کر فوج در فوج اس کی طرف چل پڑیں گے۔

Marfat.com

آسمان، زمین، دریا اور پہاڑ سب متزلزل، پراگندہ اور منتشر ہو جائیں گے۔ جہنم اس دن گھات لگائے ہوئے تیار ہوگی، وہی تمام سرکشوں کا ٹھکانہ بنے گی۔ ہر ایک کو اپنے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا اور ہر ایک کا عمل رجسٹر میں لکھا ہوا موجود ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا جو انجام تمہارے سامنے آیا ہے وہ تمہارے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے، اب اس کا مزہ چکھو۔

جن لوگوں نے آخرت کا یقین کر کے اپنے آپ کو جوابدہی کیلئے تیار کر لیا، انہیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ انہیں ان کی خدمات کا صرف اجر ہی نہیں دیا جائے گا بلکہ اس سے زائد کافی انعام بھی دیا جائے گا۔ انہیں ایسی پاکیزہ سوسائٹی نصیب ہوگی جس میں ان لغویات کا کوئی گزر نہیں ہوگا جس سے ان کو دنیا میں سابقہ رہا ہوگا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی عدالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اور ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو باطل شفاعت کے بھروسے پر آخرت کی ہولناکیوں سے بے پرواہ زندگی گزار رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں غلط شفاعت کا کیا تصور، وہاں تو کوئی اجازت کے بغیر زبان بھی نہ کھول سکے گا اور جسے اجازت ملے گی وہ بھی بالکل سچی بات کہے گا، کسی غلط بیانی کی جرأت کوئی نہ کر سکے گا۔ اور سفارش کی اجازت صرف ان لوگوں کے حق میں دی جائے گی جو صاحبِ ایمان حق سے کبھی لاپرواہ نہ ہوئے۔ البتہ حُسنِ عمل میں کوتاہی کے ارتکاب میں ماخوذ ہوں گے۔

آخرت میں تنبیہ کی گئی ہے کہ جس دن کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے اس دن کا آنا برحق اور یقینی ہے، اسے دور مت سمجھو۔ جس کا جی چاہے اسے مان کر اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔ لیکن جو اس تنبیہ کے بعد بھی اس کا انکار کرے گا وہ جب اپنے زندگی بھر کے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا تو اس وقت وہ ندامت کی تصویر بنے بار بار کہے گا کہ کاش میں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت یہ پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٤٠	سُوْرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ (٧٨)	رُكُوْعَاتُهَا ٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ (١) عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ (٢) الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ
مُخْتَلِفُوْنَ (٣) ؕ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ (٤) ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (٥) اَلَمْ نَجْعَلِ
الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ (٦) وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ (٧) وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ (٨) وَّجَعَلْنَا
نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ (٩) وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ (١٠) وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (١١)
وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ (١٢) وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۙ (١٣) وَّاَنْزَلْنَا
مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ (١٤) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ (١٥) وَّجَنّٰتٍ
اَلْفَافًا (١٦) ؕ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۙ (١٧) يَّوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ
فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۙ (١٨) وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۙ (١٩) وَّسُيِّرَتِ
الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (٢٠) ؕ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۙ (٢١) لِّلطّٰغِيْنَ
مَاٰبًا ۙ (٢٢) لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ (٢٣) لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۙ (٢٤)
اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۙ (٢٥) جَزَآءً وِّفَاقًا (٢٦) ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ
حِسَابًا ۙ (٢٧) وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا (٢٨) ؕ وَكُلَّ شَىْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۙ (٢٩)

Marfat.com

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا

رکوع: ۱۔ (یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ ۱) اس بڑی خبر کے بارے میں۔ ۲) جس میں وہ خود اختلاف رکھتے ہیں۔ ۳) ہرگز نہیں، وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۴) پھر ہرگز نہیں، وہ جلد جان لیں گے۔ ۵) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو گہوارہ بنایا۔ ۶) اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ ۷) اور تم کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔ ۸) اور ہم نے تمہاری نیند کو دافعِ کلفت بنایا۔ ۹) اور رات کو تمہارے لئے پردہ پوش بنایا۔ ۱۰) اور دن کو معاش کا وقت بنایا۔ ۱۱) اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔ ۱۲) اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا۔ ۱۳) اور پانی سے لبریز بدلیوں سے ہم نے موسلا دھار بارش نازل کی۔ ۱۴) تاکہ اس کے ذریعے سے اگائیں غلہ اور نباتات۔ ۱۵) اور گھنے باغ۔ ۱۶) بیشک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے۔ ۱۷) جس روز صور میں پھونکا جائے گا تو تم آؤ گے فوج در فوج۔ ۱۸) اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ دروازے دروازے بن کر رہ جائے گا۔ ۱۹) اور پہاڑ چلا دیئے جائیں گے تو وہ بالکل سراب بن کر رہ جائیں گے۔ ۲۰) بیشک جہنم گھات میں ہے۔ ۲۱) سرکشوں کا ٹھکانا۔ ۲۲) اس میں وہ مدتوں رہیں گے۔ ۲۳) اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ نہ چکھیں گے۔ ۲۴) بجز گرم پانی اور زخموں کے دھوون کے۔ ۲۵) بدلہ ان کے عمل کے موافق۔ ۲۶) وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے۔ ۲۷) اور انہوں نے ہماری آیات کی بے دریغ تکذیب کی۔ ۲۸) اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر شمار کر رکھا ہے۔ ۲۹) اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لئے عذاب کے سوا کسی اور چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے۔ ۳۰)

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱

(یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ ۱)

عَمَّ ...... اصل میں عَنْ مَا ہے۔ یعنی یہ عَنْ اور مَا دو حرفوں سے مرکب ہے۔ حرف مَا میں سے الف ساقط کر دیا گیا ہے۔ مَا استفہام کیلئے ہے۔ اس کا معنی ہے کس چیز کے بارے میں۔

يَتَسَآءَلُوْنَ تساء ل اس کا مصدر ہے۔ اس کا معنی آپس میں ایک دوسرے کے متعلق پوچھ گچھ کرنا ہے۔ پوچھ گچھ تحقیق کیلئے بھی ہوتی ہے اور کبھی محض استہزاء کیلئے بھی۔ یہاں یہ استہزاء کے مفہوم میں ہے۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۲ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝۳

(اس بڑی خبر کے بارے میں۔ ۲) جس میں وہ خود اختلاف رکھتے ہیں۔ ۳)

Marfat.com

قیامت کی اہمیت وعظمت کو اجاگر کیا گیا ہے

نَبَا ...... کسی بڑے واقعہ یا اہم خبر کو کہتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے اس لفظ کی معنویت کو نمایاں کرنے کیلئے تا کہ اس کے مصداق کی اہمیت دلوں میں اتر جائے العظیم کی صفت بھی ذکر فرمائی ہے۔ یعنی وہ خبر جس کے بارے میں یہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں وہ بہت بڑی خبر ہے۔ مراد اس سے آخرت ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اتنی بڑی اور اہم خبر جسے سن کر سینہ شق اور جگر پھٹ جانا چاہئے اور جس کی فکر سے خواب وخور کی لذت جاتی رہنی چاہئے یہ شامت زدہ لوگ اسی کو طنز ومزاح کا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ قرآنِ کریم نے جس لب ولہجہ اور اندازِ بیان کی سطوت وہیبت اور دلائل کی قطعیت کے ساتھ آخرت کا ذکر کیا تو جس نے بھی ان سورتوں کو سنا وہ متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ قریش کی مجلسوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ قریش نے محسوس کیا کہ اگر اس خبر کا اثر عوام میں پھیل گیا تو اسلام کی دعوت کو پھیلنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ انہوں نے عوام کو اس کے اثر سے بچانے کیلئے جہاں اور بہت سی احمقانہ تدبیریں اختیار کیں وہاں یہ حماقت بھی کی کہ اپنی مجالس میں اس کو اپنے مذاق اور طبع آزمائی کا موضوع بنا لیا، تا کہ لوگ اسے کسی سنجیدہ موضوع کے طور پر لینے کی کوشش نہ کریں۔ کوئی یہ کہتا کہ کیا یہ بات ماننے کے قابل ہے کہ گل سڑ کر جو ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں ان میں نئے سرے سے جان پڑے گی۔ کسی نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بڑے بڑے جمے ہوئے پہاڑ ہوا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں۔ کوئی حیران ہو کر کہتا کہ بھلا یہ بھی کوئی ماننے کی بات ہے کہ ایک دن سورج، چاند اور ستارے سب بجھ کر رہ جائیں اور دنیا کا یہ سارا نظام الٹ پلٹ ہو جائے۔ کبھی وہ جنت ودوزخ کا مذاق اڑانے لگتے کہ وہ کیسی دوزخ ہے جس میں آگ بھی ہے اور پانی بھی۔ اور جس میں درخت بھی کھڑے ہیں۔ اور قرآنِ کریم نے کہیں کہیں جہنم کے بعض احوال کا ذکر کیا ہے بعض لوگ اس کو تمسخر کا موضوع بناتے۔ یہ ہیں آپس کی وہ چہ میگوئیاں اور آپس کی پوچھ گچھ جس کی طرف قرآنِ کریم نے توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیسے بے فکرے ہیں کہ انہیں ایک عظیم خبر کی اطلاع دی گئی ہے اور یہ اس کے بارے میں اس طرح ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں جیسے وہ کوئی تفریح کا موقع ہو۔ اور حال یہ ہے کہ ان باتوں میں خود وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خود بھی دنیا کے انجام کے بارے میں یکساں رائے نہیں رکھتے بلکہ دنیا کے انجام اور آخرت کے بارے میں ان کے درمیان مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس طرح سے ان میں فکری تناقض بھی ہے اور اختلافِ رائے بھی۔ ان میں سے بعض لوگ عیسائیوں کے خیالات سے متاثر ہیں۔ اور وہ آخرت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے جسمانی نہیں بلکہ روحانی قرار دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ قطعی انکار تو نہیں کرتے لیکن انہیں قیامت کے آنے کا یقین بھی نہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کے خیال کو نقل کرتے ہوئے فرمایا اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ "ہم سب ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں۔" (الجاثیہ۔۳۱) اور بعض لوگ اس کا بالکل انکار کرتے تھے کہ ہم ہرگز مرنے کے بعد اٹھائے نہیں جائیں گے۔ بعض لوگ دہریئے تھے، یعنی وہ دہر اور زمانے ہی کو اصل مؤثر مانتے تھے۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کو تسلیم کرتے تھے لیکن دوسری زندگی کو ناممکن قرار دیتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ وہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں۔ اور دلیل یہ دیتے تھے کہ جو ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں انہیں کون دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ غرضیکہ زندگی کے خاتمے اور دنیا کے انجام کے بارے میں یکسو

Marfat.com

نہیں تھے۔لیکن جب آنحضرت ﷺ نے آخرت کے عقیدے کو پیش فرمایا اور اسے عملی زندگی میں تبدیلی کیلئے نہایت اہم قرار دیا، تو انہوں نے اس کے اثر کو روکنے کیلئے اسے تمسخر کا موضوع قرار دینے کی کوشش کی۔ حالانکہ عقل اور فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ انسان کو زندگی کے کسی ایسے معاملے میں اگر ذہنی یکسوئی حاصل نہ ہو جس میں اس کی ابدی فلاح یا ابدی ہلاکت کا راز مضمر ہے تو ایسے لوگوں کی بات توجہ سے سنے جو اس کے تضادِ فکر سے اس کو آگاہ کر رہے ہیں۔ قرآنِ کریم کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے انہیں اس تضاد و اختلاف سے نکلنے کی راہ دکھائی۔ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی قدر کرتے۔ لیکن انہوں نے اپنی بدبختی سے اسے غیر سنجیدہ موضوع بنا دیا۔

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿٤﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ﴿٥﴾

(ہرگز نہیں، وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۴) پھر ہرگز نہیں، وہ جلد جان لیں گے۔ ۵)

منکرین کے استہزاء کا جواب اور تنبیہ

اہلِ مکہ نے جس طرح قیامت جیسی اہم حقیقت کو استہزاء کا موضوع بنا لیا تھا اور اپنی مجلسوں میں اس طرح کے سوال و جواب کئے جا رہے تھے گویا یہ حقیقت نہیں بلکہ بازاری لوگوں کا بنایا ہوا کوئی قصہ ہے۔ اس پر نہایت زوردار الفاظ میں تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ پہلے حرفِ تنبیہ لایا گیا پھر فعل مضارع پر حرفِ استقبال لا کر اس تنبیہ میں اضافہ فرمایا گیا۔ اور فعل وہ لایا گیا جو بجائے خود تنبیہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور مزید یہ کہ جملے کی تکرار کے ساتھ اس تنبیہ کو تاکید کی انتہاء تک پہنچا دیا گیا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں اور ان کا جس طرح کا رویہ ہے اور جس طرح قیامت کے تصور کو انہوں نے ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے ان تمام باتوں کا انجام وہ عنقریب دیکھ لیں گے۔ تب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے ان میں سے کوئی بات صحیح نہ تھی۔ حقیقت وہی تھی جس کی ہمیں خبر دی گئی تھی۔

بعض اہلِ علم نے اس میں ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے کہ یہاں جملے کا تکرار تاکید کیلئے نہیں بلکہ بیانِ حقیقت کیلئے ہے۔ پہلے جملے میں جس سے باخبر کیا گیا ہے وہ، وہ عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں ان کی امتوں پر آتا رہا ہے اور تمام معذب قومیں جس کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔ اور دوسرے جملے میں آخرت کے عذاب کا ذکر ہے۔ اہلِ مکہ کو ان دونوں عذابوں سے ڈرایا گیا ہے۔ اس لئے ایک جیسے دو جملے لا کر ان دونوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اگر تم آنحضرت ﷺ کی دعوت اور آپؐ کی نبوت کی تکذیب سے باز نہ آئے تو تم پر دنیا میں بھی عذاب آ سکتا ہے۔ اور جہاں تک آخرت کا تعلق ہے وہاں کا عذاب تو ہر کافر کیلئے ایک حقیقت ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ﴿٦﴾ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴿٧﴾ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ﴿٨﴾ وَّجَعَلْنَا
نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿٩﴾ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿١٠﴾ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿١١﴾ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا
شِدَادًا ﴿١٢﴾ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿١٣﴾ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿١٤﴾
لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿١٥﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿١٦﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ﴿١٧﴾

Marfat.com

(کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو گہوارہ بنایا۔ ۶) اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ ۷) اور تم کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔ ۸) اور ہم نے تمہاری نیند کو دافعِ کلفت بنایا۔ ۹) اور رات کو تمہارے لئے پردہ پوش بنایا۔ ۱۰) اور دن کو معاش کا وقت بنایا۔ ۱۱) اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔ ۱۲) اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا۔ ۱۳) اور پانی سے لبریز بدلیوں سے ہم نے موسلا دھار بارش نازل کی۔ ۱۴) تا کہ اس کے ذریعے سے اگائیں غلہ اور نباتات۔ ۱۵) اور گھنے باغ۔ ۱۶) بیشک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے۔ ۱۷)

قیامت اور بعض دیگر حقائق پر آیاتِ ربوبیت سے استدلال

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کے چند آثار کے ذریعے بعض حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جو شخص بھی کائنات کے ان آثار پر غور کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کو دیکھے گا اگر وہ عقل کی سلامتی اور فطرت کی سادگی سے تہی دامن نہیں ہوا تو یقیناً اسے قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی قدرت دکھائی دے گی۔ جا بجا اس کی رحمت کی پرچھائیں نظر آئیں گی۔ وہ محسوس کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے اور اس کی ہر تخلیق کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت نظر آتی ہے۔ پھر وہ ربوبیت کے وسیع نظام کو ہر طرف پھیلا ہوا دیکھے گا۔ تو آخر اسے اس بات کا یقین کرنا پڑے گا کہ اس کائنات کا نظام چلانے والی ایک تنہا ذات ہے جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کی ربوبیت کے دسترخوان سے ہر مخلوق متمتع ہو رہی ہے۔ اور ان میں حضرت انسان کو خصوصی صلاحیتیں دے کر اہم حیثیت عطا کی گئی ہے۔ اسے جو بیشمار نعمتیں بخشی گئی ہیں ان تمام کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ انسان کی جسمانی، معنوی اور روحانی مقاصد کیلئے اسباب و ذرائع کے طور پر کام آئیں تا کہ اسے اپنے فیصلوں کو بروئے کار لانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس طرح سے ہر چیز کا ایک مقصد مقرر کر دیا گیا ہے اور خود انسان کی زندگی بھی مقصد کے ساتھ مکلّف کر دی گئی ہے۔ اور اسی پر اس کی کامیابی و ناکامی کا دار و مدار رکھا ہے۔ جو بھی اس صورتحال کو دیکھے گا اس میں یہ احساس ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ایک مخلوق کو غیر معمولی صلاحیتوں کا عطا کیا جانا پھر اسے اختیارات کا ملنا، اس کو فیصلہ کرنے کی آزادی دینا اور اس کو ایسے اختیارات بہم پہنچانا جس سے وہ اپنے ارادوں کی تکمیل کر سکے، یقیناً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ سب کچھ بے حکمت و بے مقصد نہیں، یقیناً ایک ایسا دن آئے گا جب انسان کو دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس سے اس مقصد کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ اس نے اپنی زندگی اس مقصد کے مطابق گزاری یا اس کی مخالفت میں۔ ان آیات میں یہی حقیقت ہے جو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان فرمائی گئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل بھی ہیں، اس کی حکمت کے جلوے بھی ہیں، انسان کی با مقصد زندگی کی طرف اشارے بھی ہیں اور آخر میں اسی مقصد کے حوالے سے جواب طلبی کیلئے ایک مقررہ دن کی خبر بھی ہے۔

اس میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے زمین کو گہوارہ اور فرش بنایا ہے۔ یعنی انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے جو اس کیلئے ربوبیت کا دسترخوان بچھایا گیا ہے اس میں سب سے پہلی چیز وہ زمین ہے جس پر اسے رہنا ہے۔ چنانچہ اس زمین کو اس طرح کا بنایا گیا ہے کہ وہ آدمی کیلئے گہوارے کی طرح قرار و سکون کی جگہ بن گئی ہے۔ اس پر کوئی چلتا ہے تو انکار نہیں کرتی، کوئی لیٹتا ہے تو اس کی سختی اسے پریشان نہیں کرتی، اس کی مٹی اسے سکون کی دولت دیتی ہے، اسے کوئی پھاڑتا ہے تو اپنا سینہ نرم کر دیتی ہے۔ اس کی تہ میں چھپے ہوئے خزانے اس کی تسخیری قوت کو دعوت دیتے ہیں، اس کے نیچے بہتا ہوا پانی کا سمندر اور زرِ سیال اس کی ضرورتوں کا خزانہ ہے۔ اور وہ ان سب چیزوں سے اس طرح فائدہ اٹھاتا ہے جیسے بچہ گہوارے میں ماں کے دودھ سے متمتع ہوتا ہے۔

Marfat.com

دوسری آیت میں اسی زمین ہی کی حفاظت اور انسان کیلئے اسے محفوظ بنانے کے حوالے سے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تا کہ وہ تمہارے سمیت کسی طرف لڑھک نہ جائے۔ اور تمہارے معمولات اور تمہارے آرام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ جو رب اس زمین کے گہوارے میں اس اہتمام سے انسان کی پرورش کر رہا ہے تو کیا یہ اس لئے ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اور کبھی ایسا دن نہ آئے جس میں اس سے باز پرس کی جائے، جس میں ان لوگوں کو انعام سے نوازا جائے جنھوں نے اپنے مقصد سے وفا کی۔ اور ان لوگوں کو سزا ملے جنھوں نے مقصد کو پامال کیا، اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کی۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔ یوں تو اس کی تشریح پہلے بھی ہو چکی ہے، یہاں اختصار سے اتنا عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت نے انسان کی صرف ضرورتیں ہی پوری نہیں کیں بلکہ اس کی تسکین کا سامان بھی کیا۔ اسے زمین جیسا گہوارہ اگر میسر آتا، لیکن اس کی تنہائی اس کیلئے زندگی اجیرن کر دیتی، تو وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے کیا فائدہ اٹھاتا۔ اس لئے پروردگار نے جس فطرت اور جن احساسات کے ساتھ اسے پیدا کیا ہے اس کی تسکین کیلئے اس کی تنہائی کا علاج اسی کی جنس سے جوڑا بنا کر کیا۔ اور پھر حیرانی کی بات یہ ہے کہ مرد اور عورت بظاہر ضدین ہیں لیکن دونوں کی آپس میں ایسی گہری وابستگی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تنہا اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا نہیں کر سکتا۔ ان کے اندر ایسے ظاہری اور باطنی داعیات رکھے گئے ہیں کہ وہ الگ الگ کبھی اطمینان کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ باہم مل کر رہنے ہی میں سکون و راحت پاتے اور ایک برتر مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ اور پھر یہ قدرت کا نظام کس قدر ہمہ گیر اور حیرت انگیز حد تک عادلانہ ہے کہ روئے زمین پر جہاں جہاں انسانی آبادی ہے وہاں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ صرف مرد ہی پیدا ہوں یا صرف عورتیں ہی پیدا کی جائیں۔ یا ان کی تعداد میں تناسب کا خیال نہ کیا گیا ہو۔ ہر جگہ مرد اور عورت ایک تناسب کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس تناسب میں خفیف سا فرق ان حکمتوں کے پیشِ نظر ہے جن کا لحاظ صرف اسلام نے کیا ہے۔ اور باقی قومیں اس کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے اخلاقی اعوارض کا شکار ہو گئی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے نیند کو سبات بنایا، سبات کا معنی ہے کاٹنا یا مونڈنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلسل کام، مصروفیت اور بے آرامی انسان کی راحت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیند کو اسی رکاوٹ کو دور کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اس لئے سبات کا ترجمہ کیا جاتا ہے، دافعِ کلفت۔ یعنی جو چیزیں کلفت کا ذریعہ تھیں نیند انہیں ہٹا دیتی ہے اور راحت و آرام مہیا کرتی ہے۔ اس لئے بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ راحت و سکون بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ اس نے صرف ایسا ہی نہیں کیا کہ نیند کو کلیۃً انسان کے اختیار پر چھوڑ دیا جاتا، کہ وہ چاہے تو سوئے، چاہے تو نہ سوئے۔ بلکہ نیند کو اس نے انسان کی فطرت میں ایک داعیہ کی حیثیت دی ہے کہ جب آدمی چند گھنٹے کے کام کے بعد تھک جاتا ہے تو نیند اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ چند گھنٹے آرام کرے۔ یہ گویا ایک ایسا خودکار انتظام ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی حکمت نے انسانوں کے جسموں میں ودیعت کیا ہے۔

اور اسے مزید مستحکم اور مؤثر بنانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے رات کو تاریک پیدا فرمایا۔ کیونکہ روشنی میں آسانی سے سویا نہیں جا سکتا۔ نیند کا سکون حاصل کرنے کیلئے تاریکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رات کو لباس قرار دیا، کہ جس طرح لباس آدمی کو اپنے اندر چھپا لیتا اور سکون و اطمینان بخشتا ہے، اسی طرح شب کی چادر بھی اس کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ اور وہ پردۂ شب میں اس طرح محجوب ہو جاتا ہے کہ خلل انداز ہونے والی چیزوں سے محفوظ ہو کر سکون حاصل کرتا ہے اور اس کی قوتِ کارکردگی بحال ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

اوراس کے بعد فرمایا کہ ہم نے دن کو معاش کی سرگرمیوں کا وقت بنایا، اور معاش کی دوڑ بھاگ کیلئے چونکہ روشنی کی ضرورت تھی اس لئے دن کو روشن بنایا۔ اور پھر یہ رات دن کا الٹ پھیر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک ایسی نمود ہے کہ جس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ اس کے بے شمار فوائد ہیں، لیکن یہاں صرف اس کے ایک فائدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ دن کی روشنی نے معیشت کی سرگرمیوں کیلئے آسانی پیدا کی۔ اور انسانی ضروریات اور اس کے مفادات کے حصول کو یقینی بنایا۔ اور رات کو سکون واطمینان کا ذریعہ بنا دیا۔ جو شخص بھی ان نشانیوں پر غور کرے گا اس میں بصیرت ہوگی تو وہ لازمی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ رات اور دن نہ از خود چکر کھا رہے ہیں اور نہ ان کا یہ چکر بالکل بے غایت و بے مقصد ہے بلکہ ایک حکیم وقدیر پروردگار مخلوقات کی خدمت کیلئے ان کو اس سرگرمی کے ساتھ مصروف کئے ہوئے ہے تاکہ لوگ ان کی خدمت سے فائدہ اٹھائیں۔ اور جس نے یہ سب اہتمام کیا ہے اس کے شکر گزار رہوں۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ ربوبیت کے اس تمام اہتمام کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی جوابدہی کیلئے ایک دن آئے جس میں ہر شخص کا حساب ہو تاکہ نیک اپنے انعام سے محروم نہ رہیں اور برے لوگ اپنی برائی کے انجام سے بے فکر زندگی نہ گزاریں۔

اس کے بعد آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے یعنی زمین پر تم اللہ تعالیٰ کی جس طرح بے شمار نشانیاں دیکھتے ہو، اسی طرح اوپر کی طرف نظر اٹھا کے دیکھو تو تمہیں بے شمار نشانیاں نظر آئیں گی جن میں سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات محکم اور مضبوط آسمان بنائے۔ جس طرح زمین کے اندر پھیلی ہوئی نشانیوں کا ذکر کرنے سے پہلے خود زمین کو ایک بڑی نشانی کے طور پر ذکر فرمایا اسی طرح اوپر کی نشانیوں میں سے خود آسمان کو سب سے بڑی نشانی قرار دیا گیا ہے اور سب سے پہلے اسی کا ذکر فرمایا ہے۔ مضبوط اور محکم سے مراد شاید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کی سرحدیں نہایت مستحکم بنائیں۔ ان میں ذرہ بھر تغیر وتبدل نہیں ہو پاتا۔ اور کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس آسمان کے اوپر نہیں جا سکتی بلکہ اس کے نیچے بھی بہت سے ایسے منطقے ہیں جن میں کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔ پھر ان سرحدوں کے پار عالمِ بالا میں بے شمار ستارے اور سیارے ہیں جن میں سے کوئی آپس میں نہیں ٹکراتا۔ بے شمار شہابِ ثاقب ٹوٹتے نظر آتے ہیں لیکن کوئی زمین پر نہیں گرتا۔ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اظہار کیلئے کبھی کوئی ایک آدھ کسی ملک میں گرا ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ منوں اور ٹنوں وزن رکھنے والے پتھر اگر بار بار اور بڑی تعداد میں زمین پر گرتے تو اہلِ زمین کیسے زندہ رہتے۔ وہ کیسا مستحکم نظام ہے کہ جس میں کروڑوں شہابِ ثاقب زمین کی طرف لپکتے ہیں لیکن راستے میں بھسم کر دیئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے آسمان میں ایک روشن چراغ رکھا ہے جس سے مراد سورج ہے۔ ''سراج'' کا معنی چراغ ہے۔ اس کی صفت ''وھاج'' لائی گئی ہے۔ اس کے معنی نہایت روشن بھی ہیں اور نہایت گرم بھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں خدمتیں اس کے سپرد کر رکھی ہیں کہ وہ کائنات کو روشنی بھی دیتا ہے اور گرمی بھی بہم پہنچاتا ہے۔ اگر یہ چراغ نہ ہوتا تو سارا عالم تیرہ وتار رہتا۔ اور زمین کی ہر چیز یخ بستہ ہو کر رہ جاتی اور زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا ایک عظیم الشان نشان ہے۔ جس کا قطر زمین کے قطر سے ایک سو نو گنا اور اس کا حجم زمین کے حجم سے تین لاکھ تینتیس ہزار زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجۂ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہونے کے باوجود اس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اس سے ٹھیک فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اس سے بہت قریب ہونے کے باعث یہ بے انتہا گرم ہے اور نہ بہت دور ہونے کے باعث بے انتہا سخت۔ پھر زمین کا رخ سورج کی طرف بالکل سیدھا نہیں بلکہ تیس درجے ایک طرف ہٹا ہوا ہے اور اسی وجہ سے موسموں کے تغیرات پیدا ہوتے اور بارشیں ہوتی ہیں۔

Marfat.com

مزید فرمایا کہ ہم نے بادلوں سے موسلا دھار پانی برسایا، یعنی لگاتار بارش کی۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بے شمار پہلو ہیں اور انسان کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ یہی حال بارشوں کے نظام کا بھی ہے۔ لیکن اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سورج ہی کی حرارت سے سمندروں کے پانی سے بھاپیں اٹھتی ہیں جو ہواؤں کے ذریعے سے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلتی ہیں اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ پھر اس سے پروردگار زمین کو سیراب کرتا اور محض اپنی قدرت سے اس سیرابی کے نتیجے میں غلے، نباتات اور گھنے باغات اگاتا ہے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے خوانِ نعمت کی بے شمار جہتیں مکمل ہوجاتی ہیں۔

ان آیات میں بہت سے آثار وشواہد کو بیان کیا گیا ہے جن میں توحید کے اثبات، شرک کے ابطال اور قیامت اور آخرت کے امکان پر روشنی پڑتی ہے۔ انسان چونکہ زمین پر خلیفہ بنایا گیا ہے اور خلافتِ ارضی کی ذمہ داریاں اس پر ڈالی گئی ہیں اس لئے سب سے پہلے انسان کو زمین ہی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو کہ کس طرح ہم نے زمین کو تمہارے لئے گہوارہ بنایا، بچھونے کی طرح بچھا دیا، پہاڑوں کی میخیں گاڑ کر اس کی طنابیں کھینچ دیں اور پھر روشنی کے سامان کیلئے سورج جیسا چراغ روشن کردیا۔ تمہارے چولہے جلانے، غلہ اور پھل پکانے کیلئے سورج کی گرمی مہیا کی۔ تمہاری غذائی ضرورتوں کیلئے زمین میں قوتِ روئیدگی رکھی اور بارش کے ذریعے اس کی سیرابی کا انتظام کیا اور اس میں تمہارے لئے غلے اگائے، نباتات پیدا کیں اور گھنے باغات اگا دیئے۔ اس طرح سے ربوبیت کا دسترخوان بچھایا گیا اور نہایت اہتمام کے ساتھ تمہاری نمود و پرداخت اور تربیت کا انتظام کیا گیا۔ پھر اس نے رات اور دن کے اختلاف سے تمہارے لئے معاشی ہماہمی کا سامان بھی کیا اور مصروفیات سے تھکاوٹ کے بعد قوتِ کارکردگی کی بحالی کیلئے نیند جیسی نعمت بھی عطا کی۔ سوال یہ ہے کہ جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ اس اہتمام سے پال پوس رہا ہے اور حیرت انگیز طریقے سے اس کو نہایت خوبصورت وجود ہی نہیں دیا بلکہ اس کی تمام ضرورتیں بھی پوری کی گئی ہیں حتیٰ کہ اسے حواس اور عقل عطا کئے اور شعور جیسی نعمت دی، کام کرنے کی آزادی سے نوازا، قوتِ فیصلہ سے بہرہ ور فرمایا۔ کیا کوئی شخص یہ باور کرسکتا ہے کہ ان تمام نعمتوں کا عطا کرنے والا زبردست قدرت نہیں رکھتا اور اس کی قدرت میں کوئی ایسی کمزوری ہے کہ یہ کہا جاسکے کہ وہ فلاں کام نہیں کرسکتا، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں مختلف دیوتاؤں کی حکومت ہے، کسی ایک بڑی ذات کی نہیں جو ان تمام کی خالق و مالک ہے۔ اگر یہاں مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائی ہوتی تو کوئی ایک مخلوق بھی اپنی معراج کو نہ پہنچتی، کوئی ایک فیصلہ بھی اپنے منطقی انجام کو نہ پہنچ سکتا۔ مزید یہ کہ جس انسان کو ایسی عظیم نعمتوں سے نوازا گیا ہے کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اور اسے جو بے شمار مخلوقات پر تصرف کے اختیارات دیئے گئے ہیں ان کی کوئی باز پرس نہ ہو۔ اور انسان کے اعمال میں خیر و شر کی کوئی تمیز نہ ہو۔ ان میں سے جو شخص بھلائی کے کام کرے وہ بھی ایک دن مٹی میں مل کر ختم ہوجائے۔ اور جو برائی کے کام کرے اس کا انجام بھی ایسا ہی ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی بے عقل آدمی ہی ایسی بات کہہ سکتا ہے ورنہ ان میں سے ہر نشانی اور ہر امرِ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اور متصرف بھی ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے جس طرح سورج، چاند، ستاروں کو بے مقصد نہیں بنایا، اسی طرح انسان کی زندگی کا بھی ایک مقصد ہے۔ اس کیلئے یقیناً کوئی ایسا انتظام ہونا چاہئے جس میں اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ اس نے اپنی زندگی مقصد کے مطابق گزاری ہے یا مقصد کی مخالفت میں۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بیشک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے۔ یعنی ہم نے یہ دیکھنے کیلئے کہ کن لوگوں نے ہماری شکر گزاری کی اور فرمانبرداری میں زندگی گزاری اور کن لوگوں نے کفرانِ نعمت کیا اور نافرمانی میں زندگی بسر کی۔ اس کیلئے ہم نے فیصلے کا ایک دن مقرر کردیا ہے۔

Marfat.com

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾ وَّسُيِّرَتِ
الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ
اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾
اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ
اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾

(جس روز صور میں پھونکا جائے گا تو تم آ ؤ کے فوج درفوج۔ ۱۸) اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ دروازے دروازے بن کررہ جائے گا۔ ۱۹) اور پہاڑ چلا دیئے جائیں گے تو وہ بالکل سراب بن کررہ جائیں گے۔ ۲۰) بیشک جہنم گھات میں ہے۔ ۲۱) سرکشوں کا ٹھکانا۔ ۲۲) اس میں وہ مدتوں رہیں گے۔ ۲۳) اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ نہ چکھیں گے۔ ۲۴) بجز گرم پانی اور زخموں کے دھوون کے۔ ۲۵) بدلہ ان کے عمل کے موافق۔ ۲۶) وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے۔ ۲۷) اور انہوں نے ہماری آیات کی بے دریغ تکذیب کی۔ ۲۸) اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر شمار کر رکھا ہے۔ ۲۹) اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لئے عذاب کے سوا کسی اور چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے۔ ۳۰)

قیامت کے وقوع پذیر ہونے کا منظر

جس یوم الفصل کا وقت مقرر کر دیا گیا ہے اور جس کے آنے میں مشرکین بہت تذبذب کا شکار ہیں اور وہ مختلف پہلوؤں سے اسے مستبعد از عقل قرار دیتے ہیں۔ یہاں اس کے وقوع پذیر ہونے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اس کے برپا ہونے میں کوئی بڑا وقت صرف نہیں ہوگا اور نہ پروردگار کو اس میں کوئی دشواری پیش آئے گی۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام صور منہ میں لئے حکم کے انتظار میں ہیں۔ یہ صور کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے یہ متشابہات میں سے ہے، اللہ تعالیٰ ہی اسے جانتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب حضرت اسرافیل علیہ السلام کو اس میں پھونک مارنے کا حکم دیا جائے گا تو پھونک مارتے ہی ایک بڑی ہلچل مچے گی۔ تمام مرے ہوئے انسان یکا یک جی اٹھیں گے اور فوج درفوج اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ اور یہ آسمان جو آج گنبد بے در نظر آتا ہے اس دن اس طرح اسے کھول دیا جائے گا کہ ہر طرف اس میں دروازے ہی دروازے نظر آئیں گے۔ یعنی عالمِ بالا میں کوئی بندش اور رکاوٹ باقی نہ رہے گی اور ہر طرف سے آفاتِ سماوی ہجوم کر کے دنیا پر حملہ آور ہوں گی۔ اور وہ پہاڑ جن کے استحکام کو دیکھتے ہوئے اہلِ مکہ کو قیامت کے آنے کا یقین پیدا نہیں ہوتا تھا وہ اس دن اکھاڑ کر چلا دیئے جائیں گے۔ یعنی آج وہ ٹھوس پتھر ہیں لیکن اس دن ریت بن کر ہر طرف اڑتے پھریں گے اور ریزہ ریزہ ہو کر ہر طرف پھیل جائیں گے۔ سورۃ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آخر اس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے، ان سے کہئے، میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا۔ اور زمین کو ایسا ہموار اور چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ تک نہ دیکھو گے۔ (آیت ۱۰۵ تا ۱۰۷) یہاں فرمایا گیا ہے کہ پہاڑوں کو سراب بنا دیا جائے گا۔ سراب سے مراد ریت ہے جو صحرا میں دور سے انسان کو دکھائی دیتی ہے اور وہ پیاس کی شدت کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ وہاں کوئی بہتا ہوا پانی ہے۔ اس ہلچل اور افراتفری کے بعد اچانک جہنم نمودار ہو جائے

Marfat.com

گی۔ یوں معلوم ہوگا کہ وہ سرکشوں کا ٹھکانہ بننے کیلئے اس ہلچل کی آڑ میں گھات ہی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور شاید اسی لئے بعض جگہ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے کہ جہنم خاص قسم کے مجرموں کو پہچانے گی اور انہیں دیکھ کر وہ اس طرح جوش میں آئے گی کہ اس کی دھاڑ دور تک سنائی دے گی۔ اور پکارنے والا کہے گا کہ یہی وہ جہنم ہے جس کا تمہیں دنیا میں یقین نہیں آتا تھا۔ میدانِ حشر میں ایمان وعمل کے فیصلے کے بعد یہی جہنم سرکشوں کا ٹھکانہ بنے گی۔ چنانچہ ہر کافر ومشرک اور ہر باغی وطاغی اپنے اپنے جرائم کے مطابق جہنم میں ڈالا جائے گا اور وہ مدت ہائے دراز تک اس میں رہے گا۔ آیت میں ''احقاب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ ''حقب'' کی جمع ہے جس کا اطلاق طویل زمانے پر ہوتا ہے۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہمیشگی اور دوام ہوگا اور اس کے تسلسل میں کبھی انقطاع نہیں ہوگا۔ لیکن جہنم میں ہیشگی نہیں ہوگی، جہنم بالآخر ایک دن ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں لیکن مدتوں کا لفظ خود بتلاتا ہے کہ وہ لامتناہی نہیں، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ہر چیز کے سمجھنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے جسے اہلِ علم قاعدۂ کلیہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مجمل کو سمجھنے کا بھی ایک طریقہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ مجمل کی شرح مفصل کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ البتہ مفصل کی شرح مجمل کی روشنی میں نہیں کی جاتی۔ قرآنِ کریم نے جہنم کی سزا کو خُلُوْدٌ فِی النَّار سے تعبیر کیا ہے اور کئی جگہ یہ الفاظ آئے ہیں خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا یہ الفاظ مفصل ہیں۔ اسی کی روشنی میں ''احقاب'' کی وضاحت کی جائے گی۔ واضح ہے کہ اس کا مطلب ہمیشہ ہمیشہ جہنم کا قیام ہوگا نہ کہ ایک طویل مدت جو ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اہلِ جہنم شدید عذاب کے باوجود کھانے پینے سے بے نیاز نہیں ہوں گے، انہیں بھوک اور پیاس لگے گی لیکن اس میں پینے کو گرم کھولتا ہوا پانی اور کھانے کو ''غساق'' ملے گا۔ اہلِ لغت نے ''غساق'' کی تشریح پیپ اور لہو سے بھی کی ہے اور گندے پانی سے بھی۔ اور بعض اہلِ لغت کچ لہو اور آنکھوں اور کھالوں سے بہنے والی ان تمام رطوبتوں پر اس کا اطلاق کرتے ہیں جو شدید تعذیب کی وجہ سے بہ نکلتی ہیں۔ اور یہ لفظ ایسی چیز پر بھی بولا جاتا ہے جس میں سخت تعفن اور سڑاند ہو۔ جہنم کی اس ہولناک وادی میں اہلِ جہنم کو کہیں ٹھنڈک کا احساس تک نہیں ہوگا۔ نہ پینے کو کوئی ایسی چیز ملے گی جسے پینے کے قابل کہا جا سکے۔ اور یہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوگا یہ ان کے اعمال ہی کا پورا پورا بدلہ ہوگا۔ جو کچھ دنیا میں انہوں نے کمائی کی اسی کا انجام وہ جہنم میں دیکھیں گے۔ آخرت میں ہر نیکی فطرت کے لحاظ سے اپنا پھل لائے گی اور ہر برائی اپنی مکروہ شکل اختیار کرے گی۔

پھر اس برے انجام تک پہنچنے کا جو اصل سبب ہے اس کو بیان فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کا گمان یہ تھا کہ ہم جیسی کیسی زندگی گزار رہے ہیں اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا۔ اور جو کچھ قرآنِ کریم میں قیامت کا یقین پیدا کرنے کیلئے آیات نازل ہوئیں اور جو کچھ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کا نہایت برے طریقے سے انہوں نے انکار کیا۔ اور جن لوگوں نے نہایت ہمدردی اور خیر خواہی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی ان کی جان کے لاگو ہو گئے۔ اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ نہ قیامت آئے گی نہ ان کا حساب کتاب ہوگا۔ لیکن ہم نے ان کے اقوال وافعال، ان کی حرکات وسکنات حتیٰ کہ ان کی نیتوں اور خیالات اور مقاصد تک کا مکمل ریکارڈ تیار کر رکھا تھا۔ جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا اور کہا ہم نے کوئی بات بھی ریکارڈ میں درج کرنے سے چھوڑی نہیں۔ آخر میں فرمایا کہ تم تو اپنے انجام سے بے خبر رہے لیکن ہم نے تمہارے اعمال محفوظ کرنے میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ اب تم اپنے اعمال کا مزہ چکھو۔ اور ساتھ ہی یہ چتاونی بھی سنا دی کہ اب اس کی امید مت رکھو کہ تمہارے عذاب میں کوئی کمی ہوگی یا کوئی تبدیلی عمل میں آئے گی۔ ہاں اگر کوئی تبدیلی عمل میں آئی تو وہ صرف یہ ہوگی کہ تمہارے عذاب یا عذاب کی نوعیت میں اضافہ کر دیا جائے گا۔

Marfat.com

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾

حَدَآئِقَ وَأَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿۳۳﴾ وَّكَأْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّن رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ

خِطَابًا ﴿۳۷﴾ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا

مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ

شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهِ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ إِنَّآ أَنذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَّوْمَ

يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُولُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِي كُنتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

رکوع: ۲۔ (یقیناً اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے کامیابی کا ایک مقام ہے۔ ۳۱) باغ اور انگور۔ ۳۲) اٹھتی ہوئی جوانیوں والی ہم سن لڑکیاں۔ ۳۳) اور چھلکتے ہوئے جام۔ ۳۴) نہ اس میں بک بک سنیں گے نہ بہتان طرازی۔ ۳۵) جزاء اور کافی انعام تیرے رب کی طرف سے ہے۔ ۳۶) جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بڑی رحمت والا ہے، یہ اس سے بات کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ ۳۷) جس دن روح اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے کوئی بات نہیں کرے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اجازت دے اور وہ بالکل ٹھیک بات کرے گا۔ ۳۸) وہ دن برحق ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کرے۔ ۳۹) ہم نے تم لوگوں کو ایک قریب آجانے والے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے، جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اور کافر پکار اٹھے گا، کاش! میں مٹی ہوتا۔ ۴۰)

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَأَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿۳۳﴾

وَّكَأْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾

(یقیناً اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے کامیابی کا ایک مقام ہے۔ ۳۱) باغ اور انگور۔ ۳۲) اٹھتی ہوئی جوانیوں والی ہم سن لڑکیاں۔ ۳۳) اور چھلکتے ہوئے جام۔ ۳۴) نہ اس میں بک بک سنیں گے نہ بہتان طرازی۔ ۳۵)

Marfat.com

قیامت سے ڈرنے والوں کا صلہ

اس سے پہلے ان لوگوں کا تذکرہ ہوا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کی اور جو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کی امید نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے نفس کے اتباع میں سرکشی کی زندگی گزارتے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کا انجام بھی بیان ہوا۔ اب ان کے مقابلے میں ان لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے، ہر کام کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضا کی فکر کرتے ہیں اور ہمیشہ یہ خیال ان کے دامن گیر رہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے اور وہاں اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کو یہاں متقین کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انہیں اپنے تقویٰ، خدا ترسی اور جوابدہی کے خوف کے تحت گزاری ہوئی زندگی کا صلہ یہ ملے گا کہ انہیں باغات عطا کئے جائیں گے اور انگوروں سے نوازا جائے گا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جنت جس میں ان کا مقام ہوگا وہ بہت بڑے بڑے باغات ہوں گے اور ''حدائق'' کا اطلاق عام طور پر کھجوروں کے باغ پر ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کھجوروں کے باغ دیئے جائیں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ انگوروں کے باغ بھی دیئے جائیں گے اور یہ کھجوروں کے باغ سے الگ باغ ہوں گے جسے اگر انگورستان کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اہلِ عرب عام طور پر اس باغ کو نمونے کا اور قیمتی باغ سمجھتے تھے جس کے باہر کھجوروں کے جھنڈ ہوتے جو حصار کا کام دیتے اور اندر اس کے انگوروں اور دوسرے پھلوں اور سبزیوں کے قطعات ہوتے۔ اور یہ ایک بلند جگہ پر واقع ہوتا تاکہ سیلاب کی دستبرد سے محفوظ رہے۔ اور بارش کے پانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ یہاں حدائق اور اعناب کا ایک ساتھ ذکر ہوسکتا ہے اسی مفہوم کیلئے ہو۔ دونوں صورتوں میں ایک بات تو واضح ہے کہ انہیں کھجوریں بھی فراوانی سے عطا ہوں گی جو اہلِ عرب کی اصل خوراک ہیں اور انگور بھی بکثرت ملیں گے جو ان کے تفکہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر کئے جانے والے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ یعنی مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا جوڑا بنایا۔ کیونکہ دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے اور دونوں ایک دوسرے کیلئے سکون کا ذریعہ ہیں۔ یہاں بھی شاید یہی فرمایا جا رہا ہے کہ کام و دہن کی لذت کیلئے جنت میں جس طرح بے شمار نعمتیں عطا کی جائیں گی اسی طرح مردوں کی تنہائی دور کرنے کیلئے انہیں وہ عورتیں بھی دی جائیں گی جنہیں قرآن و حدیث میں حوروں کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح یہ حوریں مردوں کے سکون کا باعث ہوں گی اسی طرح جنت کے مرد بھی ان کی خوشیوں میں اضافے کا باعث ہوں گے۔ اور ان حوروں کی تعریف میں یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اٹھتی ہوئی جوانیوں والی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ عمر ہر لحاظ سے اپنے اندر خوشیوں کی نوید رکھتی ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ جن مردوں کو یہ حوریں دی جائیں گی یہ ان کی ہم عمر ہوں گی۔ اور یا سب اہلِ جنت کیلئے ہم سن اور ہم عمر حوریں ہوں گی۔ وہ آپس میں بھی سہیلیوں کی طرح ملیں گی اور اپنے رفقاءِ حیات کیلئے بھی مسرتوں کا پیغام لے کر آئیں گی۔ اور کسی جنتی کو یہ خیال نہیں ہوگا کہ فلاں جنتی کو تو ایسی بیوی دی گئی ہے جو نوخیز کلی کی مانند ہے، لیکن میری بیوی ایسی نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ سب ہم سن لڑکیاں ہوں گی۔

Marfat.com

عرب کی کوئی مجلس جو عیش ونشاط کیلئے منعقد ہوتی تھی اس کا لازمی حصہ مے نوشی بھی تھی۔ کیونکہ جب تک وہ شراب کے نشے میں مخمور ہو کر ناچنے نہیں لگتے تھے اس وقت تک اپنی خوشیوں کو نامکمل سمجھتے تھے۔ لیکن یہ خوشیاں چونکہ عارضی گناہ پیدا کرنے والی حرام اور ظلم سے آلودہ ہوتی تھیں، اسلام نے اس سے زندگی بھر کیلئے روک دیا اور اس کے بدلے میں وہ تمام نعمتیں دینے کا وعدہ فرمایا جس کی انسان ہمیشہ تمنا کرتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں فرمایا کہ تمہیں جنت میں شراب پینے کی عام اجازت ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ شراب طہور ہوگی جس میں خمار نہیں ہوگا۔ جس کے نتیجے میں کسی گناہ کا تصور ابھرنے نہیں پائے گا۔ ہر مجلس میں بیٹھنے والوں کے ہاتھوں میں چھلکتے ہوئے جام ہوں گے۔ یعنی کثرتِ شراب نوشی سے انہیں روکا نہیں جائے گا۔

شراب نوشی کی کثرت سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب شراب کے نشے کا عقل پر غلبہ ہوتا ہے تو انسان لغویات بکتا ہے۔ اچھا خاصا سنجیدہ انسان الٹی سیدھی حرکتیں کرتا اور اخلاق سے گری ہوئی باتیں کہتا اور لاف زنی کرتا ہوا ہر انتہا سے آگے نکل جاتا ہے۔ اور دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ عقل و ہوش کے ماؤف ہونے کی وجہ سے شراب کی ترنگ میں آ کر بعض دفعہ دوسروں پر تہمتیں لگانے سے بھی باز نہیں آتا۔ بعض لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں کا نام لے کر ان سے معاشقے کا اظہار کرتا ہے۔ عرب چونکہ اہلِ یورپ کی طرح بے غیرت نہیں، غیرت مند لوگ تھے اس لئے شراب کی مجلسوں میں اس طرح کی تہمتیں بعض دفعہ ان کی غیرت کو اس طرح اشتعال دیتیں کہ قبیلوں کی آپس میں جنگ چھڑ جاتی۔ اور ایک شخص کی بدمستی میں کہی ہوئی بات نہ جانے کتنی زندگیوں کیلئے خطرہ ثابت ہوتی۔ چنانچہ اسی پس منظر میں فرمایا گیا ہے کہ جنت میں تمہیں شراب کے چھلکتے ہوئے جام ملیں گے اس کو پی کر تم ایک ایسے کیف وسرود میں ڈوب جاؤ گے جس کا دنیا میں تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ تمہاری عقلوں کو ماؤف نہیں کرے گی۔ اس لئے وہاں کوئی شخص بھی نہ زبان پر کوئی لغو بات لائے گا، نہ ہرزہ سرائی کرے گا اور نہ کسی پر تہمت باندھے گا۔ لغو سے مراد بے سروپا بے ہودہ باتیں اور کِذاب سے مراد وہ جھوٹی تہمتیں ہیں جو دشمنی کا باعث بنتی ہیں۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿٣٦﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾

(جزاء اور کافی انعام تیرے رب کی طرف سے ہے۔ ۳۶) جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بڑی رحمت والا ہے، یہ اس سے بات کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ ۳۷)

جنت کے اعمال کا صلہ بھی اور اللہ تعالیٰ کی عطا بھی

اوپر جنت کی جن نعمتوں کا ذکر آیا ہے یہ جزاء ہے مومنین کیلئے اور عطا ہے ان کے رب کی طرف سے۔ یعنی یہ داد و دہش اور یہ قدر افزائی ایک تو یہ مومنوں کے اعمال کا صلہ ہے کہ انہوں نے ہر طرح کے حالات میں جس طرح اسلام قبول کیا پھر اس کیلئے استقامت دکھائی اور ہر طرح کی سہولتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا یہ نعمتیں اس کا بدلہ ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ اور اس کا انعام ہے۔ بظاہر ان دونوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے کیونکہ بدلہ اور جزاء تو اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے بدلے میں ہو۔ اور عطا وہ ہے جو کسی چیز

Marfat.com

کے بدلے کی بجائے بطور انعام اور احسان ہو۔ لیکن حقیقت میں ان میں تضاد نہیں۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں لفظوں کو یکجا جمع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جنت میں دخول اور اس کی نعمتیں صورت اور ظاہر کے اعتبار سے تو اہلِ جنت کے اعمال کی جزاء ہیں۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ خالص عطائے ربانی ہے۔ کیونکہ انسانی اعمال تو ان نعمتوں کا بدلہ بھی نہیں بن سکتے جو ان کو دنیا میں میسر ہیں۔ آخرت کی نعمتوں کا حصول تو صرف اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کا انعام ہے۔

''حِسَابًا'' کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ آئمہ تفسیر میں بعض نے پہلے اور بعض نے دوسرے معنی لئے ہیں۔ پہلا معنی یہ ہے حِسَابًا، عَطَاءً، کَافِیًا، کَثِیْرًا یعنی ایسی عطا جو اس کی تمام ضرورتوں کیلئے کافی وافی اور کثیر ہو۔ اور دوسرا معنی حساب کا موازنہ اور مقابلہ۔ حضرت مجاہد نے اس جگہ یہی معنی لے کر مطلب آیت کا یہ قرار دیا کہ عطائے ربانی اہلِ جنت پر ان کے اعمال کے حساب سے مبذول ہوگی۔ اس عطاء میں درجات بحسابِ اخلاص اور احسانِ عمل کے ہوں گے۔

مزید فرمایا کہ اہلِ ایمان کیلئے یہ صلہ جو اوپر مذکور ہوا اس خدائے رحمٰن کی طرف سے ہوگا جو آسمانوں اور زمین اور اس کے درمیان کی ساری ہی چیزوں کا مالک ہے۔ کوئی دوسرا کسی چیز میں اس کا شریک و سہیم نہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ باوجود اس کے کہ اہلِ جنت پر انعامات کی بارش ہوگی۔ بااین ہمہ میدانِ حشر میں رعب اور ہیبت کا عالم یہ ہوگا کہ کسی کو اپنے رب سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑے گی۔ اور کسی میں لب کشائی کی طاقت نہیں ہوگی۔ غالباً یہ بات مشرکین کی غلط فہمی کے ازالے کیلئے بھی فرمائی گئی ہے کیونکہ وہ عقیدۂ شفاعت کے غلط تصور کی وجہ سے نچنت بیٹھے تھے اور انہیں اس خیال سے بڑا سہارا ملتا تھا کہ اگر قیامت آئی بھی تو ہماری واپسی اپنے معبودوں کی طرف ہوگی اور وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی رسائی رکھتے ہیں، وہ جو چاہیں گے خدا سے کہہ سکیں گے اور جو چاہیں گے منوا سکیں گے۔ اس لئے فرمایا کہ وہاں تو اذنِ خداوندی کے بغیر کسی کو لب کشائی کی بھی ہمت نہیں ہوگی، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو یہ اعزاز عطا فرمائے۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙۗ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾

(جس دن روح اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے کوئی بات نہیں کرے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اجازت دے اور وہ بالکل ٹھیک بات کرے گا۔ ۳۸)

آیتِ کریمہ میں روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ قرآنِ کریم نے جگہ جگہ ان کیلئے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا مطاع اور گلِ سرسبد بنایا ہے۔ ان کا پہلے ذکر عام سے پہلے خاص کے ذکر کے طور پر ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ سب سے زیادہ فرشتوں کی سفارش پر اعتماد کرتے تھے۔ وہ انہیں اپنے زعم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک سمجھنے کی وجہ سے ان کی پوجا بھی کرتے تھے اور ان سے استمداد بھی کرتے تھے۔

Marfat.com

یہاں کہنا یہ ہے کہ فرشتے اور ان کے سردار قیامت کے دن سب غلاموں کی طرح صف بستہ کھڑے ہوں گے اور ان میں سے کسی کو لب کشائی کی جرأت نہیں ہوگی۔ تم جن کی شفاعت پر اعتماد رکھتے ہو وہ تو خود پروردگار کے جلال کے سامنے لرزاں و ترساں بولنے سے معذور کھڑے ہوں گے۔ تو جب ان کا قیامت کے دن یہ حال ہوگا تو اور کسی کے بارے میں کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور مشرکین کی سفارش کرے گا اور ناز و انداز سے اپنی بات منوا سکے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہاں سفارش کا امکان اس شخص کیلئے ہوگا جسے اللہ تعالیٰ سفارش کا اعزاز بخشیں اور جس کسی کیلئے سفارش سننا پسند فرمائیں۔ گویا سفارش اور شفاعت کی پہلی شرط اذنِ خداوندی ہے۔ اور یہ ہم جانتے ہیں کہ شفاعت کا اذن اس شخص کیلئے ملے گا جو گناہگار ہوگا لیکن اس کا دامن شرک سے آلودہ نہیں ہوگا۔ اور دوسری شرط اس میں یہ ہے کہ سفارش کرنے والی عظیم شخصیت بھی کسی گناہگار کے بارے میں ایسی بات کبھی نہ کہہ سکے گی جو صواب اور راستی سے ہٹی ہوئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں شفاعت کے اعزاز پانے والے خود جن صفات کے حامل ہوں گے انہیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور غلط بات کہنے کی جرأت کریں گے۔

ذٰلِکَ الْیَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾

(وہ دن برحق ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کرے۔ ۳۹)

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ دنیا میں اس قوم پر عذاب نہیں بھیجتا اور نہ قیامت کے روز ان سے باز پرس کرے گا جن پر اتمامِ حجت نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے محض اپنے فضل و کرم سے یہ بات لے رکھی ہے کہ میں کسی کو بھی پکڑنے سے پہلے کسی نہ کسی ڈرانے والے کو اس قوم میں ضرور بھیجوں گا۔ وہ ان کے سامنے ضروریاتِ دین کو واضح کرے گا اور اس نظامِ حق کی ایک ایک بات کو کھولے گا جس پر عمل کرنے سے آخرت میں سرخروئی ملتی ہے۔ اور جب کسی پیغمبر کے واسطے سے اس فرض کو انجام دے دیا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس ذمہ داری سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اسی کو براءتِ ذمہ کہتے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی بعثتِ مبارکہ سے اس ذمہ داری کو بااحسن طریق انجام دے دیا گیا۔ اور اب اہلِ عرب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے یہ فرمایا جارہا ہے کہ قیامت کا آنا یقینی ہے، کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ تم پر یہ بات پوری طرح واضح کر دی گئی ہے۔ تو جس شخص کو آخرت کی سرخروئی عزیز ہے اور وہ جہنم کے عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو وہ اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔ یعنی وہ راستہ جسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰکُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا ۚۖ یَّوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ
وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

(ہم نے تم لوگوں کو ایک قریب آجانے والے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے، جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اور کافر پکار اٹھے گا، کاش! میں مٹی ہوتا۔ ۴۰)

Marfat.com

آخری تنبیہ

یہ آخری تنبیہ ہے اور اتمامِ حجت بھی۔اس میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں ایک ایسے عذاب سے خبردار کردیا ہے جو بالکل قریب آچکا ہے۔سوال یہ ہے کہ اس عذاب سے کون سا عذاب مراد ہے۔بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے رسول کے بعثت کے بعد ہر اس قوم پر آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب کرتی اور پھر اس پر جم جاتی ہے۔لیکن آیت کا دوسرا جملہ اس بات پر قرینہ ہے کہ اس سے مراد دنیا میں آنے والا عذاب نہیں جو سنتِ الٰہی کے مطابق آتا ہے بلکہ اس سے مراد قیامت ہے۔اور اس میں مجرمین کو ہونے والا عذاب ہے کیونکہ وہی دن ہوگا جب آدمی اپنی آنکھوں سے اپنے تمام اعمال کو دیکھے گا۔اس پر سوال یہ ہے کہ اس میں تو فرمایا گیا ہے کہ یہ عذاب بالکل قریب آچکا ہے جبکہ قیامت کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔اور اس آیتِ کریمہ کو نازل ہوئے بھی تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ ہونے کو ہے۔اور آئندہ بھی کچھ خبر نہیں کہ قیامت کا وقوع کب ہوگا۔تو پھر اسے قریب کیسے کہا جاسکتا ہے۔بات درحقیقت یہ ہے کہ ایک انسان کیلئے دو مرحلے فیصلہ کن ہیں۔پہلا مرحلہ دنیا کی زندگی ہے۔یہ مہلتِ عمل ہے اور یہاں کا ایک ایک لمحہ آخرت کے امتحان کی تیاری کیلئے ہے۔جب موت زندگی کا چراغ گل کردیتی ہے تو یہ مرحلہ ختم ہوجاتا ہے۔اور عمل کے تمام امکانات بھی معدوم ہوجاتے ہیں۔اب اس کے بعد دوسرا مرحلہ ہے۔وہ یہ ہے کہ اس زندگی میں جو کچھ کیا گیا ہے اس کی جانچ پرکھ کا وقت آئے اور پھر جزاء وسزا کا فیصلہ ہو۔درمیان میں برزخی زندگی صرف انتظار کی مدت ہے جو انسانی زندگی کیلئے فیصلہ کن نہیں۔تو جب انسان موت کا شکار ہوتا ہے اور پہلا مرحلہ اختتام کو پہنچتا ہے تو مہلتِ عمل ختم ہوجانے کی وجہ سے یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی قیامت کا آغاز ہوگیا۔کیونکہ اب صرف جزاء وسزا کا انتظار ہے۔اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ "جو شخص مرگیا اس کی قیامت قائم ہوگئی۔" اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح موت آدمی کے بہت قریب ہے اسی طرح قیامت بھی قریب ہے۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو وقت کا احساس صرف اس وقت تک رہتا ہے جب تک وہ اس دنیا میں زمان ومکان کی حدود کے اندر جسمانی طور پر زندگی بسر کررہا ہے۔مرنے کے جب صرف روح باقی رہ جائے گی وقت کا احساس وشعور باقی نہ رہے گا۔اور قیامت کے روز انسان جب دوبارہ زندہ ہوکر اٹھے گا اس وقت اسے یوں محسوس ہوگا کہ ابھی سوتے سوتے کسی نے اسے جگا دیا ہے۔اس کو یہ احساس بالکل نہیں ہوگا کہ وہ ہزارہا سال کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہے۔

وہ قیامت اور آخرت جسے جزاء کا دن کہا جاتا ہے اس کا وقوع تو اپنے وقت پر ہوگا جس کا ٹھیک ٹھیک علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔لیکن جہاں تک قیامت کی علامت جزاء وسزا کا تعلق ہے اس کا ظہور بعض دفعہ افراد اور قومیں دنیا میں بھی دیکھتے ہیں۔حالانکہ دنیا دار العمل ہے لیکن کبھی کبھی بعض اعمال کے نتائج دنیا میں بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔اور اگر اس کا دائرہ وسیع ہو اور قوم کا بیشتر حصہ اس کی لپیٹ میں آجائے تو اہلِ نظر محسوس کرنے لگتے ہیں کہ قیامت برپا ہوگئی۔اور ایسی قیامتیں شاید اس لئے ہوتی ہیں تاکہ اصل قیامت کی یاددہانی کراسکیں۔آج بھی دنیا ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہے اور امتِ مسلمہ بالخصوص ہر روز ایک نئی قیامت کا سامنا کررہی ہے۔اس لئے جگر مرادآبادی نے کہا:

اربابِ نظر کی خدمت میں اتنی سی گزارش ہے میری
دنیا سے قیامت دور سہی دنیا کی قیامت دور نہیں

Marfat.com

آیت کے آخری حصہ میں فرمایا گیا ہے کہ آج اہلِ مکہ اور اشرافِ قریش کو قیامت کا یقین نہیں آتا بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔اور اس کی فکر کرنے کی بجائے سرکشی کا رویہ دکھاتے ہیں۔اور اگر انہیں کوئی سمجھانے کی کوشش کرے تو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے۔لیکن جب ان کا قیامت سے سامنا ہوگا ان میں سے ایک ایک کافر پکار اٹھے گا کہ کاش میں مٹی ہی رہا ہوتا اور مجھے مٹی سے نہ اٹھایا جاتا تا کہ آج میں اس صورتحال کا سامنا نہ کرتا۔لوگوں کیلئے بہتر یہ ہے کہ اس حسرت ناک انجام سے دوچار ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف راستہ اختیار کریں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوۡرَةُ النّٰزِعٰتِ

(۷۹)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اس کے پہلے ہی لفظ وَالنّٰزِعٰتِ سے ماخوذ ہے۔

مقامِ نزول:۔ یہ سورۃ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ابتدائی زمانے میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

زمانۂ نزول:۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ یہ سورۃ النباء کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس کے مضمون سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

اہلِ مکہ کو چونکہ قیامت کے آنے سے انکار تھا اور وہ اسے مستبعد از عقل خیال کرتے تھے۔ چنانچہ آغازِ کلام ہی میں نہایت مؤکد انداز میں اس خیال کا رد کیا گیا ہے۔اور اکثر آئمہ تفسیر کی رائے کے مطابق پانچ آیتوں میں کائنات کا انتظام چلانے والے فرشتوں کی قسمیں کھا کر یقین دلایا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی۔یعنی تمہیں جس قیامت کا آنا خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے اور جسے تم بہت مشکل خیال کرتے ہو وہ انہیں فرشتوں کے ہاتھوں آئے گی جو آج تمہاری زندگی کے معاملات کا انتظام وانصرام چلا رہے ہیں اور جن کے ہاتھوں تمہاری جانیں نکالی جاتی ہیں۔اور وہی فرشتے تمہاری روحوں کو لے کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان کے ٹھکانوں تک پہنچاتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ جو فرشتے آج اللہ تعالیٰ کے حکم سے مخلوقات کی جان نکالتے ہیں اور کائنات کا انتظام چلاتے ہیں جب انہیں کائنات کے نظام کو درہم برہم کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اس کی جگہ ایک دوسرا نظام قائم کرنے کا حکم ہوگا تو آخر ان کیلئے کیا مشکل پیش آئے گی۔

پھر اس کے بعد وقوعِ قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے اور قیامت کے جھٹلانے والوں پر جو کچھ گزرے گی اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قیامت کا انکار کرنے والو! تم قیامت کو آج بہت دشوار کام سمجھ رہے ہو کہ جس کیلئے شاید کسی بڑی تیاری کی ضرورت ہوگی حالانکہ اللہ تعالیٰ کیلئے ایسی کسی تیاری کی ضرورت نہیں، اس کے حکم سے ایک جھٹکا دنیا کے نظام کو درہم برہم کردے گا۔اور دوسرا جھٹکا ایک دوسرے نظام کے ساتھ نئی دنیا کو سامنے لے آئے گا اور انسان اپنی جزاء وسزا کیلئے میدانِ حشر میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

اس کے بعد فراعنۂ قریش کو تنبیہ کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کے ایک حصے سے یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کے جھٹلانے کا آخر انجام کیا ہوتا ہے۔اور جب اللہ تعالیٰ کی گرفت آتی ہے تو وقت کا فرعون اپنی بقا کیلئے کچھ نہیں کرسکتا۔فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور اس نے آپ کی ہر نصیحت کو رد کرتے ہوئے حاکمانہ تمرد کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آگیا۔

Marfat.com

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۳۳ تک آخرت اور حیات بعد الموت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اور مخالفین سے پوچھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عظیم کائنات کو پیدا کیا۔ اور اس کائنات کی ہما ہمی تمہارے سامنے ہے۔ اسی طرح عالمِ بالا میں بے حد و بے حساب ستاروں اور سیاروں کی ایک دنیا سجائی۔ اتنی بڑی کائنات کو پیدا کرنا اور اس کیلئے ربوبیت کا دستر خوان بچھانا اور اس کی زندگی کی تمام ضرورتوں کو بہم پہنچانا یہ مشکل کام ہے یا تمہیں بارِ دگر زندہ کر دینا مشکل ہے۔ ظاہر ہے کہ پروردگار کیلئے دونوں کاموں میں سے کوئی چیز بھی مشکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس تخلیقی عمل اور جا بجا اس کی قدرت کے اظہار سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کیلئے کسی کام کو کرنا مشکل نہیں۔ اور دوسری یہ بات کہ اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ بڑی حکمت کے ساتھ کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرنے کیلئے بنائی ہے۔ یہ اشارہ کر کے ایک بات کا جواب انسان کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ وہ خود اپنی جگہ سوچ کر رائے قائم کرے کہ اس حکیمانہ نظام میں انسان جیسی مخلوق کو اختیارات اور ذمہ داریاں سونپ کر اس کا محاسبہ کرنا زیادہ مقتضائے حکمت ہے یا یہ کہ زمین میں اسے شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے اور اس کے کسی عمل کا حساب نہ لیا جائے۔

اس کے بعد آیت ۳۴ سے ۴۱ تک یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن انسان کے اچھے یا برے مستقبل کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس نے زندگی میں بندگی کی حدود میں رہ کر زندگی گزاری ہے یا اس نے بار بار حدود سے تجاوز کیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر حیاتِ دنیا کی ترغیبات اور ترجیحات رہی ہیں یا اس نے ہر قدم اٹھانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے احساس کو زندہ رکھا ہے۔

پھر آیت نمبر ۴۲ سے ۴۴ تک آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ بار بار آپؐ سے قیامت کی تاریخ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس کیلئے جلدی مچاتے ہیں آپؐ ان کی باتوں کی پرواہ نہ کریں۔ قیامت کی تاریخ کا معاملہ آپؐ سے متعلق نہیں، اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے۔ آپ اس سے انذار کیلئے آئے ہیں، لوگوں کو اس کی تاریخ اور وقت سے آگاہ کرنے کیلئے نہیں آئے۔ آج جن لوگوں کو قیامت بہت بعید معلوم ہوتی ہے وہ قیامت کے دن دنیا کو بہت محدود وقت خیال کریں گے۔ تب انہیں معلوم ہوگا کہ اس چند روزہ زندگی کے فیصلوں نے ان کی ابدی زندگی کو تباہ کر دیا ہے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٤٦	سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ (٧٩)	رُكُوْعَاتُهَا ٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ﴿۵﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾
تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ﴿۹﴾
يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ ؕ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا
نَّخِرَةً ؕ﴿۱۱﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِىَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿۱۳﴾
فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ؕ﴿۱۴﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ
رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۚ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۖ﴿۱۷﴾
فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۸﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۚ﴿۱۹﴾
فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۖ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۫ۖ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۫ۖ﴿۲۲﴾
فَحَشَرَ فَنَادٰى ۫ۖ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۫ۖ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ
الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ؕ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ؕ﴿۲۶﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ا۔ (قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو سختی سے جان نکالنے والے ہیں۔ ۱) اور قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو بند آسانی سے کھول دینے والے ہیں۔ ۲) اور قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو کائنات میں تیزی سے تیرنے والے ہیں۔ ۳) پھر تیزی سے دوڑنے والے ہیں۔ ۴) پھر ہر امر کی تدبیر کرنے والے ہیں۔ ۵) اس دن سے ڈرو جس دن ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا۔ ۶) اور اس کے پیچھے آئے گا ایک اور جھٹکا۔ ۷) کچھ دل ہوں گے جو اس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے۔ ۸) نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی۔ ۹) یہ لوگ پوچھتے ہیں کیا ہم لوٹائے جائیں گے پہلی حالت کی طرف۔ ۱۰) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔ ۱۱) کہتے ہیں اس صورت میں واپسی میں بڑے خسارہ کی ہوگی۔ ۱۲) وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔ ۱۳) اور یکا یک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے۔ ۱۴) کیا آپ کو موسیٰ کی سرگزشت پہنچی ہے۔ ۱۵) جب اس کے رب نے اسے وادیِ مقدس۔طویٰ۔میں پکارا۔ ۱۶) کہ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ ۱۷) اور اس سے کہو کیا تم میں کچھ اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؟ ۱۸) کیا میں تمہیں تمہارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے ڈرنے لگو۔ ۱۹) پھر موسیٰ نے فرعون کو بڑی نشانی دکھائی۔ ۲۰) تو اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ ۲۱) پھر پلٹا تا کہ (ان کے اثرات کو روکنے کیلئے) کوششیں تیز کردے۔ ۲۲) پس لوگوں کو جمع کیا اور اعلان کیا۔ ۲۳) پس اس نے کہا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ ۲۴) پس اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑا۔ ۲۵) بیشک اس میں سبق ہے اس شخص کیلئے جو ڈرتا ہے۔ ۲۶)

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝۱ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝۲ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝۳
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵

(قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو سختی سے جان نکالنے والے ہیں۔ ۱) اور قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو بند آسانی سے کھول دینے والے ہیں۔ ۲) اور قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو کائنات میں تیزی سے تیرنے والے ہیں۔ ۳) پھر تیزی سے دوڑنے والے ہیں۔ ۴) پھر ہر امر کی تدبیر کرنے والے ہیں۔ ۵)

ان پانچ قسموں کا مفہوم

ان آیات میں پانچ اوصاف رکھنے والی چیزوں یا ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن یہ واضح نہیں کیا گیا کہ ان اوصاف کا موصوف کون ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں اہلِ تفسیر میں اختلاف ہوا۔ بعض اہلِ علم نے ان اوصاف کا موصوف ہواؤں کا سمجھا۔ عمومی عقل کے اعتبار سے اسے غلط بھی نہیں کہا جا سکتا، لیکن دلیل اس پر کوئی نہیں۔ رہی یہ بات کہ بعض امتوں پر ہواؤں کے ذریعے جو عذاب آیا ہے اور اس میں کچھ ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا ان سے تعلق جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ تو ایسی دلیل نہیں جسے کافی سمجھا جا سکے۔ لیکن اکثر آئمہ تفسیر نے ان اوصاف کا موصوف فرشتوں کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس پر بھی کوئی قطعی دلیل تو پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ کسی صحیح حدیث

Marfat.com

میں نبی کریم ﷺ سے یہ معنی منقول نہیں، لیکن چند اکابر صحابہ اور تابعین جو ان کے شاگرد تھے انہوں نے اس سے فرشتے مراد لئے ہیں۔ صحابہ کی رائے کے بارے میں یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے سنی ہوگی۔ اگرچہ ہم تک متصل سند کے ساتھ آنحضرت ﷺ سے کوئی بات نہیں پہنچی تو صحابہ کے بارے میں اس امکان کی وجہ سے اس رائے کو یقیناً ترجیح تو حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں وَالنّٰزِعٰتِ سے ڈوب کر کھینچنے والے یا سختی سے جان نکالنے والے۔ اور وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا سے آہستگی سے جان نکالنے والے فرشتے مراد لئے گئے ہیں۔ اور اس کے مراد لینے والے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مسروق، سعید بن جبیر، ابوصالح اور ابوالضحیٰ رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے بزرگ ہیں۔ اور وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا سے حضرت علیؓ، حضرت ابنِ مسعودؓ، مجاہد، سعید بن جبیر اور ابوصالح رحمہم اللہ تعالیٰ نے وہ فرشتے مراد لئے ہیں جو احکامِ الٰہی کی تعمیل میں اس طرح تیزی سے رواں دواں رہتے ہیں جیسے کہ وہ فضاء میں تیر رہے ہیں۔ اسی طرح فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا سے حضرت علیؓ، مجاہد، مسروق اور حسن بصری نے وہ فرشتے مراد لئے ہیں جو حکمِ الٰہی کا اشارہ پاتے ہی اس کی تعمیل کیلئے دوڑ پڑتے ہیں۔ اور فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا سے حضرت علیؓ، مجاہد اور بعض دیگر تابعین نے وہ فرشتے مراد لئے ہیں جن کے ہاتھوں دنیا کا سارا انتظام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔ ایسے جلیل القدر صحابہؓ اور کبار تابعین سے جو تفسیر منقول ہو اسے اگر قطعی اور حتمی نہ بھی کہا جائے تب بھی وہ ترجیح پانے کے قابل تو یقیناً ہے۔

قسم اور مقسم علیہ کا مفہوم

یہ بات ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ قسم کی حیثیت دلیل کی ہوتی ہے اور مقسم علیہ کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے۔ گویا قسم کے ذریعے دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک قسم یعنی دلیل کو مقسم علیہ یعنی دعویٰ سے زیادہ واضح، بین، نمایاں اور معروف ہونا چاہئے تا کہ اس کے اثبات سے دعویٰ کا اثبات ہو سکے۔ اب اگر ان قسموں سے مراد فرشتے ہیں، تو فرشتے تو ایک غیر مرئی مخلوق ہیں جنہیں محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ تو وہ مقسم علیہ پر دلیل کیسے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات قلتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ فرشتے اگرچہ دکھائی نہیں دیتے لیکن ان کا وجود جانا پہچانا اور تسلیم شدہ ہے۔ عرب بھی ان کے وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ بلکہ یہاں ان کیلئے جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے انہیں ان سے بھی انکار نہ تھا۔ یہ البتہ ان کی گمراہی تھی کہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ قرآنِ کریم نے بار بار اس کی تردید کی اور ان کی اصل حیثیت کو واضح کیا۔ قیامت یا عذابِ خداوندی کو عرب تسلیم کرنے سے انکاری تھے، بلکہ وہ اسے محض ایک ڈراوا سمجھتے تھے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کا ایسی ہستیوں کی قسم کھا کر یقین دلانا یقیناً ایک معروف چیز سے غیر معروف چیز کا یقین دلانا ہے۔ اور ایک یقینی چیز سے غیر یقینی کو یقینی ثابت کرنا ہے۔ اس لحاظ سے ان آیات سے فرشتوں کو مراد لینا اور ان کا وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر بطور دلیل کے پیش کرنا یقیناً خطابی اسلوب کے عین مطابق ہے۔

رہی یہ بات کہ فرشتوں کے ذکر سے وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت کا اثبات کس طرح ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس پروردگار کے حکم سے فرشتے تمہاری جان نکالتے ہیں تو کیا اسی کے حکم سے دوبارہ جان ڈال نہیں سکتے۔ اسی طرح جس پروردگار کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں تو کیا اسی کے حکم سے کائنات کو درہم برہم نہیں کر سکتے۔ اور اسی کے ارشاد پر ایک دوسری دنیا بسا نہیں سکتے جبکہ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں ذرہ برابر سستی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

حاصل کلام یہ کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت فرشتے آتے ہیں وہ نہایت سختی سے کافروں کی جان نکالتے ہیں اور نہایت نرمی سے مومن کی روح قبض کرتے ہیں۔ اور پھر وہ ان روحوں کو لے کر آسمان کی طرف جاتے ہیں اور نیکوں کی روحوں کو اچھے ٹھکانوں میں اور بروں کی روحوں کو برے ٹھکانوں میں پہنچاتے ہیں۔ اور پھر نہایت تندہی سے ان روحوں کے ثواب یا عذاب اور تکلیف یا راحت کے انتظامات کردیتے ہیں۔ لیکن یہ عذاب وثواب کا تعلق قبر یعنی برزخ سے ہوگا۔ حشر کا عذاب یا ثواب اس کے بعد ہوگا۔ احادیث میں قبر کے عذاب کا ذکر مختلف مواقع پر نہایت تفصیل سے آیا ہے۔ لیکن اس عذاب کا تعلق چونکہ روح سے ہے اور روح کے معاملات کو سمجھنا آسان نہیں۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیرِ مظہری میں اس کی تفصیل لکھی ہے ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں:

نفسِ انسانی ایک جسمِ لطیف ہے جو اس کے جسمِ کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے اور وہ انہیں مادی عناصر اربعہ سے بنا ہے۔ فلاسفہ اور اطباء اس کو روح کہتے ہیں مگر درحقیقت روح انسانی ایک جوہر مجرد اور لطیفۂ ربانی ہے جو اس طبعی روح یعنی نفس کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتا ہے اور روح یعنی نفس کی حیات خود اس لطیفۂ ربانی پر موقوف ہے گویا اس کو روح الروح کہہ سکتے ہیں کہ جسم کی زندگی نفس سے ہے اور نفس کی زندگی اس روح سے وابستہ ہے۔ اس روح مجرد اور لطیفۂ ربانی کا تعلق اسی جسمِ لطیف یعنی نفس کے ساتھ کیا اور کس طرح کا ہے اس کی حقیقت کا علم ان کے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں، اور یہ جسمِ لطیف جس کا نام نفس ہے اس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایک آئینہ کی مثال بنایا ہے جو آفتاب کے بالمقابل رکھ دیا گیا ہو تو آفتاب کی روشنی اس میں ایسی آجاتی ہے کہ یہ خود آفتاب کی روح روشنی پھیلاتا ہے۔ نفسِ انسانی اگر تعلیمِ وحی کے مطابق ریاضت ومحنت کرلیتا ہے تو وہ بھی منور ہوجاتا ہے ورنہ وہ جسمِ کثیف کے خراب اثرات میں ملوث ہوتا ہے، یہی جسمِ لطیف ہے جس کو فرشتے اوپر لے جاتے ہیں اور پھر اعزاز کے ساتھ نیچے لاتے ہیں جبکہ وہ منور ہوچکا ہو، ورنہ آسمان کے دروازے اس کیلئے نہیں کھلتے، اوپر ہی سے نیچے پٹخ دیا جاتا ہے۔ یہی جسمِ لطیف ہے جس کے بارے میں حدیث مذکور میں ہے کہ ہم نے اس کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا، پھر اس میں لوٹائیں گے پھر اسی سے دوبارہ پیدا کریں گے، یہی جسمِ لطیف اعمالِ صالحہ سے منور اور خوشبودار بن جاتا ہے اور کفر وشرک سے بدبودار ہوجاتا ہے۔ باقی روحِ مجرد اس کا تعلق جسمِ کثیف کے ساتھ بواسطہ جسمِ لطیف یعنی نفس کے ہوتا ہے اس پر موت طاری نہیں ہوتی، قبر کا عذاب وثواب بھی اسی جسمِ لطیف یعنی نفس سے وابستہ ہے اور اس نفس کا تعلق قبر سے ہی رہتا ہے اور روح مجرد علیین میں ہوتی ہے۔ اور روح مجرد اس کے ثواب وعذاب سے بالواسطہ متاثر ہوتی ہے، اس طرح روح کا قبر میں ہونا بمعنی نفس کے صحیح ہے اور اس کا عالمِ ارواح یا علیین میں رہنا بمعنی روح مجرد صحیح ہے اس سے ان روایات مختلفہ کی تطبیق بھی ہوجاتی ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ﴿٦﴾ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ﴿٧﴾

(اس دن سے ڈرو جس دن ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا۔ ٦) اور اس کے پیچھے آئے گا ایک اور جھٹکا۔ ٧)

Marfat.com

وقوعِ قیامت کی تصویر

اس میں وقوعِ قیامت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ پہلے جھٹکے سے مراد نفخۂ اولیٰ ہے جو زمین اور اس کی ہر چیز کو تباہ کر دے گا۔ ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ اور دوسرے جھٹکے سے مراد نفخۂ ثانیہ ہے۔ یعنی جب دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو سب اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور میدانِ حشر کی طرف چل پڑیں گے۔

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ﴿۸﴾ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ﴿۹﴾

(کچھ دل ہوں گے جو اس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے۔ ۸) نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی۔ ۹)

قلوب پر قیامت کا اثر

آج جس قیامت کے ذکر سے قریش اور دیگر اہلِ مکہ خوفزدہ اور فکر مند ہونے کی بجائے محظوظ ہوتے اور اسے مذاق بنا لیتے ہیں۔ کوئی اس کے بارے میں کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے۔ لیکن جب یہ قیامت کے برپا ہو جانے کے بعد میدانِ حشر میں کھڑے ہوں گے تو ان پر ایک ہول طاری ہوگا، چہروں پر وحشت چھائی ہوئی ہوگی، دل کانپ رہے ہوں گے اور آنکھیں جھکی ہوئی سراسیمہ اور سہمی ہوئی ہوں گی، کوئی لفظ منہ سے نہ نکل سکے گا اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ ہوگا۔ لیکن جن مسلمانوں کا دنیا میں یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں سورۃ انبیاء آیت ۱۰۳ کی شہادت کے مطابق وہ اس انتہائی گھبراہٹ میں بھی ذرا پریشان نہیں ہوں گے اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

اَبْصَارُهَا ...... اس میں ضمیر مونث کا مرجع کیا ہے؟ اس کے بارے میں خلجان ہے۔ کیونکہ ذکر ان لوگوں کا کیا جا رہا ہے جو قیامت کے وقوع کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے اور اس کی طرف سے بالکل بے فکر تھے۔ قیامت کے دن ان پر جو کچھ گزرے گی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ دل ان کے کانپ رہے ہوں گے اور آنکھیں ان کی جھکی ہوئی ہوں گی۔ اس لحاظ سے یہاں ضمیر مونث کی بجائے ضمیر مذکر ہونی چاہئے۔ بعض اہلِ علم نے ان انکار کرنے والوں کو جمع تصور کرتے ہوئے ضمیر مونث کا جواز پیدا کیا ہے اور اس میں بھی کوئی غلط بات نہیں ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع قلوب ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آدمی کے اندر دل ہی وہ چیز ہے جس سے اس کی شخصیت عبارت ہے۔ اور آنکھ وہ چیز ہے جس کے آئینہ میں اس کے دل کی مخفی کیفیت بھی جھلکتی ہے۔ دل کے ساتھ آنکھوں کے اس تعلق کے سبب سے ان کی اضافت دل کی طرف کر دی گئی ہے۔

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾
قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾

(یہ لوگ پوچھتے ہیں کیا ہم لوٹائے جائیں گے پہلی حالت کی طرف۔ ۱۰) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔ ۱۱)
کہتے ہیں اس صورت میں واپسی بڑے خسارہ کی ہوگی۔ ۱۲)

اَلْحَافِرَةِ کے اصل معنی نقشِ قدم کے ہیں، لیکن محاورے میں اگر کہیں کہ فُلَانٌ رَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِهٖ اَوْ فِیْ حَافِرَتِهٖ تو اس کے معنی ہوں گے کہ فلاں شخص جس حال میں تھا اس سے نکل کر پھر الٹے پاؤں اسی میں واپس آ گیا۔

Marfat.com

کفار کے استہزاء کی تصویر

نبی کریم ﷺ جب انہیں قرآنِ کریم پڑھ کر قیامت کی تفصیلات کے آگاہ کرتے اور نہایت یقینی انداز میں ان پر یہ بات واضح کرتے کہ تمہیں ایک دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور میدانِ حشر میں تمہیں حساب کتاب کیلئے لے جایا جائے گا جہاں تمہاری پوری زندگی کا حساب ہوگا۔ وہ ازراہِ تمسخر ایک دوسرے سے کہتے کہ لیجئے ایک نئی بات سنئے کہ ہم مرنے کے بعد ایک نہ ایک دن پھر اسی حالت میں لوٹائے جائیں گے، یعنی ہمیں پھر زندہ کیا جائے گا۔ اور اس مذاق کو آگے بڑھاتے ہوئے کوئی دوسرے صاحب گرہ لگاتے کہ صرف اتنی سی بات نہیں بلکہ ہمیں اس حالت میں دوبارہ زندہ کیا جائے گا جب ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہو کر خاک میں مل چکی ہوں گی۔ تو کیا ایسی صورت میں بھی کسی کا زندہ کیا جانا ممکن ہے۔ اس طرح سے وہ ان حقائق کو بعید از عقل قرار دے کر اس پر خوب ہنستے اور مذاق اڑاتے۔ اور پھر یہ سارے مسخرے بظاہر سنجیدہ شکلیں بنا کر یہ کہتے کہ اگر یہی بات ہونے والی ہے جو ہمیں کہی جارہی ہے تو پھر تو ہم مارے گئے، یہ تو نہایت خسارے کی بات ہوگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے اندر فکر مندی کی کوئی لہر اٹھتی ہے کہ اگر واقعی قیامت ایک حقیقت ثابت ہوگئی اور ہم نے تو اس کیلئے کوئی تیاری نہیں کی تو پھر ہمارا کیا بنے گا، ہم تو پھر پکڑے جائیں گے۔ نہیں، ان کا مقصد صرف مختلف پیرایوں سے ان باتوں کو خارج از عقل قرار دینا اور لوگوں کے سامنے ناقابلِ قبول بنانا ہوتا۔ اور بعض دفعہ دوسروں کو سمجھانے کیلئے وہ فلسفہ بھی بگھارتے کہ بھائیو! تم کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جانا، جس قیامت سے ہمیں ڈرایا جارہا ہے اس کے برپا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اربوں کھربوں مخلوق پیدا ہو چکی اور ابھی نہ جانے کتنی اور پیدا ہوگی اور ان سب کی ہڈیاں بوسیدہ ہو کر خاک میں مل چکی ہوں گی تو آخر اس مٹی کو دوبارہ نئی زندگی کیسے دی جاسکے گی۔ اور انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو کیسے از سرِ نو زندہ کیا جائے گا۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾

(وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی۔ ۱۳) اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے۔ ۱۴)

یہ لوگ جتنے چاہیں الفاظ کے طوطے مینا اڑالیں اور جتنی چاہیں سخن سازیاں کرلیں۔ لیکن کوئی حقیقت پھبتیوں اور فقرہ بندیوں کے طومار سے نہیں رکتی۔ قیامت تو ایک بہت بڑی حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت کا بہت بڑا فیصلہ ہے۔ اسے تو بہرحال برپا ہونا ہے اور اسے برپا کرنے والی ذات بے پناہ قدرتوں کی مالک ہے۔ جب اسے منظور ہوگا تو اس کے وقوع کیلئے صرف ایک ڈانٹ کافی ہوگی۔ اس سے مراد نفخۂ ثانیہ ہے۔ یعنی حضرت اسرافیل علیہ السلام جب دوسری دفعہ صور پھونکیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ڈانٹ ہے جس کے نتیجے میں ہر طرف سے لوگ قبروں سے نکل کر اور بکھری ہوئی خاک سے متشکل ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔ کوئی شخص خاک کی صورت اختیار کر چکا تھا یا راکھ کی۔ کسی کو سمندر نگل چکا تھا، کسی کو کسی درندے نے کھالیا تھا، لیکن یہ سب بھی نفخۂ ثانیہ کے بعد ہر طرف سے میدانِ حشر کی طرف ہجوم کر آئیں گے۔ سورۃ زمر میں اس کی وضاحت اس طرح فرمائی گئی ہے ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ "پھر اس صور میں دوبارہ پھونکا جائے گا تو وہ اچانک اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔"

سَاهِرَةٌ ...... ہموار زمین اور کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے میدانِ حشر مراد ہے۔

Marfat.com

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾

(کیا آپ کو موسیٰ کی سرگزشت پہنچی ہے۔ ۱۵) جب اس کے رب نے اسے وادیٔ مقدس۔طویٰ۔میں پکارا۔ ۱۶)

حضرت موسیٰ ؑ اور فرعون کی سرگزشت سے استشہاد

کفارِ مکہ قیامت کا انکار بھی کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کو ماننے سے بھی انکاری تھے۔ بلکہ ان کے انکارِ آخرت میں شدت ہی اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ وہ نبی کریم ﷺ کی نبوت اور رسول کی حیثیت سے آپ کی کسی خبر کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اس حوالے سے انہیں دو باتیں ارشاد فرمائی جارہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہیں وقوعِ قیامت بعید از عقل معلوم ہوتا ہے اور تمہارے خیال میں اتنا بڑا حادثہ وقوع پذیر نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کیلئے اس کے بپا کرنے میں کوئی دشواری نہیں بلکہ اس کا بپا ہو جانا محض اس کی ایک ڈانٹ کا نتیجہ ہوگا۔ اور دنیا میں تم اگر اس ڈانٹ کا کوئی چھوٹا سا نتیجہ دیکھنا چاہو تو وہ فرعون کا انجام ہے جو بحرِ قلزم میں ڈوبنے کے نتیجے میں ہوا۔ وہ اپنے آپ کو ارضِ مصر کا مالک سمجھتا تھا بلکہ اپنے آپ کو سب سے بڑا رب قرار دیتا تھا۔ لیکن بحرِ قلزم کی موجوں کی شکل میں محض ایک ڈانٹ سے لقمۂ اجل ہوگیا۔ اور دوسری بات یہ فرمائی جارہی ہے کہ تم آنحضرت ﷺ کی نبوت کے انکار کو معمولی بات سمجھ رہے ہو، حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آنحضرت ﷺ کی طرح فرعون اور آلِ فرعون کی طرف رسول بن کر آئے تھے۔ لیکن جب اس نے مسلسل تکذیب کی اور اس پر اڑ گیا تو اس کا انجام کیا ہوا، تم اس سے واقف ہو۔ اس لئے آخرت کا انکار کرتے ہوئے اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کو مذاق میں اڑاتے ہوئے اپنے انجام کو نہ بھولنا۔ چنانچہ اسی حوالے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ پیش کیا جارہا ہے اور اس کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنے اہلِ خانہ کیلئے آگ کی تلاش میں اس وادیٔ مقدس میں پہنچے تھے جس کا نام طویٰ یعنی طور ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک عظیم منصب کیلئے منتخب فرمالیا۔ ایسے ہی آنحضرت ﷺ کو بھی تمہاری ہدایت کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾
وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾

(کہ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ ۱۷) اور اس سے کہو کیا تم میں کچھ اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؟ ۱۸) کیا میں تمہیں تمہارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے ڈرنے لگو۔ ۱۹)

فرعون کی سرکشی اور حضرت موسیٰ ؑ کی ہمدردانہ دعوت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوت پر مقرر کرتے وقت جو حکم دیا گیا یہ اس کا بیان ہے۔ وہ حکم یہ تھا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔ فرعون کی سرکشی کے دو پہلو تھے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تھا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ قرار دیتا تھا۔ اور اپنی ذات سے لے کر اپنی ریاست کے معاملات تک اور اپنی عدالتوں سے لے کر اپنی حکومت

Marfat.com

کے طور اطوار تک وہ اپنے آپ کو سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اس کا گمان یہ تھا کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہے۔ اور اس کی ذات اہلِ مصر کا مرجع اور معبد ہے۔ اور اس کی مرضی اور خواہش ہر ایک کیلئے واجب الاتباع ہے۔ اور اس کے احکام ہر سطح پر غیر مشروط طور پر واجب الاطاعت ہیں۔

اور اس کی سرکشی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک طبقے کو غیر معمولی مراعات دے کر مراعات یافتہ طبقہ قرار دے دیا تھا۔ ان کے خاص قسم کے حقوق تھے۔ انہیں دوسروں کے مقابلے میں آج کی طرح وی آئی پی یا وی وی آئی پی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے ارکانِ اسمبلی کی طرح اس کے اراکینِ سلطنت کے کچھ استحقاقات تھے جن کے مجروح ہونے کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ اور دوسرا طبقہ عام لوگوں اور غرباء پر مشتمل تھا۔ ان طبقوں پر بری طرح ظلم ڈھایا جاتا تھا۔ بالخصوص بنی اسرائیل ناگفتہ بہ صورتحال سے دوچار تھے۔ یہ اس کی سرکشی کے دو پہلو تھے جن کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

ایک اور بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کیلئے نہیں تھی بلکہ فرعون، آلِ فرعون اور اہلِ مصر کو بھی ہدایت دینا مقصود تھا۔ اور اس مقصود کی حیثیت سب سے پہلے تھی۔ اسی وجہ سے دوسرے مقصود سے پہلے اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ فرعون سے پوچھو کہ تم دوسروں پر صرف حکم چلانا ہی جانتے ہو یا تمہارے اندر اپنی اصلاح اور اپنے تزکئے کا بھی کوئی جذبہ پایا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اس فقرے پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ایک تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس درجہ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے سے فرعون سے بات کر رہے ہیں کہ مقصود تیری حکومت چھیننا نہیں اور نہ تیرے ملک پر قبضہ کرنا ہے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم نے اپنے اندر جو غلط خیالات پیدا کر لئے ہیں اور ان سے پورا ملک متاثر ہو رہا ہے اگر تم سب سے پہلے اپنی شخصیت کو سنوارنے کی خواہش کرو تاکہ پورا ملک اس کے نتیجے میں سنور جائے تو میں تمہاری اس سلسلے میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس لب و لہجے میں جہاں ہمدردی اور خیر خواہی نظر آتی ہے وہیں عظمت و جلالت بھی دکھائی دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے سفیر کے کلام میں ہونی چاہئے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا اولین کام لوگوں کی تعلیم اور تزکیۂ قلوب ہوتا ہے۔ یعنی دلوں میں خودسری، انانیت، حفظِ ذات، تحقیرِ غیر اور ظلم و جور کے جو جذبات پیدا ہو جاتے ہیں ان کی اصلاح سب سے پہلا فرض ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جب رسول بنا کے بھیجا گیا ہے تو آپ کے اہداف میں بھی تزکیۂ نفوس کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ جو فرمایا کہ تم اگر چاہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی رہنمائی کر سکتا ہوں تو رہنمائی کا ہدف بھی مقرر کر دیا۔ وہ یہ کہ تمہاری خرابی اور گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو رب سمجھتے ہو اور تم پر اپنی خدائی کا بھوت سوار ہے۔ اس لئے کسی کی بات سننا تمہیں گوارا نہیں۔ میں تمہیں سب سے پہلے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس جہان کا رب کوئی اور ہے تم نہیں، اسی سے سب کو ڈرنا چاہئے۔ لیکن یہ خشیت اور ڈر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب تمہیں اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہو۔ اور تم خدائی کے پندار سے نکل کر اسے اپنا اور سارے جہان کا رب سمجھو۔ جب تک یہ خشیت اور معرفت پیدا نہیں ہوگی اس وقت تک کسی کی زندگی میں بھی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔

فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿٢٠﴾

(پھر موسیٰ نے فرعون کو بڑی نشانی دکھائی۔ ۲۰)

Marfat.com

سندِ ماموریت کے طور پر عظیم معجزہ کا اظہار

سابقہ حکم کے تحت حضرت حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں پہنچے اور اسے جا کر اس کائنات کے اصل رب کی طرف دعوت دی اور اپنا اور اپنے بھائی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ہم اس کے بھیجے ہوئے رسول یعنی اس کے سفیر ہیں۔ اور ہم تمہارے پاس اس کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ تو اس نے ایک حکمران کی حیثیت سے پوچھا کہ تمہارے سفیر ہونے کی دلیل اور سند تمہارے پاس کیا ہے۔ تو آپ نے ان کو سندِ ماموریت کے طور پر وہ سب سے بڑی نشانی دکھائی جسے عصائے موسیٰ کہا جاتا ہے۔ اس کو بڑی نشانی اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کے علاوہ جتنے معجزات دیئے گئے ہیں وہ عام طور پر اسی کے ذریعے ظاہر ہوئے ہیں۔ اور مزید یہ بات کہ یہی وہ معجزہ تھا جس نے ہر موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کو سربلند اور غالب کیا۔

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿٢١﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿٢٢﴾

(تو اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ ۲۱) پھر پلٹا تا کہ (ان کے اثرات کو روکنے کیلئے) کوششیں تیز کردے۔ ۲۲)

فرعون کا رویہ

اتنے بڑے معجزے کو دیکھنے کے بعد بھی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسول ماننے سے انکار کردیا۔ آپ کو اور آپ کے بھائی کو بھی ساحر اور مفتری قرار دیا اور ان کی تکذیب کردی۔ اور آپ جس بات کی طرف دعوت دے رہے تھے اس کو ماننے سے انکار کردیا۔ اور پھر اس انکار پر خاموش ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ اس نے محسوس کیا کہ ان دونوں بھائیوں کی دعوت اپنے اندر بے پناہ اثرات رکھتی ہے اور جس معجزے کا انہوں نے اظہار کیا ہے اگر اس کا تدارک جادو کے زور سے نہ کیا گیا تو لوگ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ چنانچہ وہ فوراً اپنے مشیروں کی طرف پلٹا، انہیں اونچ نیچ سمجھا کر مشورہ طلب کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ دونوں بہت بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں، عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرنا شکست اور جگ ہنسائی کا سبب ہوسکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مملکت کے تمام اطراف کے ماہر جادوگروں کو دعوت دی جائے اور ایک کھلے میدان میں ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ چنانچہ تمام اطراف ریاست سے جادوگروں کو جمع کیا گیا اور ایک کھلے میدان میں مجمعِ عام کے سامنے ساحرانِ مصر اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا مقابلہ ہوا۔ اور جادوگروں کو اس مقابلے میں نہ صرف کہ شکست ہوئی بلکہ جادوگروں نے ایمان لا کر فرعون کی شکست پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿٢٣﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾

(پس لوگوں کو جمع کیا اور اعلان کیا۔ ۲۳) پس اس نے کہا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ ۲۴)

جمع کی ایک صورت تو وہ ہے جس کا ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا کہ تمام ملک کے جادوگروں کو ایک کھلے میدان میں جمع کر کے مجمع عام کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرایا گیا۔ اور مقابلے سے پہلے اس نے لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ تو آخر یہ دونوں بھائی کس کے سفیر بن کے آئے ہیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ جب اس کھلے مقابلے میں ساحرانِ مصر نے

Marfat.com

شکست کھائی تو فرعون نے محسوس کیا کہ موسیٰ اور ہارون کے اثرات کو روکنا اب بہت مشکل ہو گیا ہے اور اس کے اثرات بنی اسرائیل پر ہی نہیں بلکہ قبطیوں تک پہنچنے لگے ہیں۔ تو اس نے گھبرا کر قوم کے تمام ذمہ دار افراد کو جمع کیا اور ان کے اندر اپنا اثر بحال کرنے کیلئے جو تقریر کی یہ شاید اسی کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ سورۃ زخرف میں اس کی تفصیل ذکر فرمائی گئی ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّ لَا يَكَادُ يُبِيْنُ ○ فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ○ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○

اور فرعون نے اپنی قوم میں پکارا کہ کیا مصر کی بادشاہی اور یہ نہریں جو میرے نیچے جاری ہیں، میرے لئے نہیں ہیں؟ کیا تم لوگ دیکھ نہیں رہے ہو؟ تو یہ بہتر ہوا یا میں اس سے بہتر ہوں جو ایک حقیر آدمی ہے اور اپنی بات کھل کر کہہ بھی نہیں سکتا؟ (اگر یہ خدا کا رسول ہے) تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس پر سونے کے کنگن اتارے جاتے یا اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھ کر آتے؟ ان باتوں سے اس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنا لیا اور وہ تھے ہی نافرمان لوگ۔ تو جب انہوں نے ہم کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پس ان سب کو غرق کر دیا۔

ان دونوں صورتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ پیغمبر کی دعوت کے اثرات ایسے سطحی نہیں ہوتے کہ ایک آدھ کوشش سے زائل کر دیئے جائیں۔ یقیناً مختلف اجتماعات ہوئے ہوں گے۔ اور فرعون نے ایک سیاسی شاطر کے طور پر مختلف خطابات میں مختلف باتیں کہی ہوں گی۔ کسی خطاب میں اپنے ربِ اعلیٰ ہونے پر زور دیا ہوگا اور کہیں اپنی دولت و ثروت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے سروسامانی پر۔ پیش نظر آیت میں اپنی ربوبیت پر زور ہے۔ ضروری ہے کہ اس کا مفہوم واضح کر دیا جائے۔ صاحب تفہیم القرآن نے اس پر ایک مختصر سا نوٹ لکھا ہے، ہم یہاں اسے نقل کر رہے ہیں۔

فرعون کے ربِ اعلیٰ ہونے کا مفہوم

فرعون کا یہ دعویٰ کئی مقامات پر قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک موقع پر اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو خدا بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا۔" (الشعراء، آیت ۲۹) ایک اور موقع پر اس نے اپنے دربار میں لوگوں کو خطاب کر کے کہا "اے سردارانِ قوم! میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا بھی ہے۔" (القصص، آیت ۳۸) ان ساری باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہیں ہو سکتا تھا کہ وہی کائنات کا خالق ہے اور اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدعی تھا۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔ قرآن مجید ہی میں اس بات کی

Marfat.com

شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے اہلِ دربار ایک موقع پر اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ "کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (الاعراف، آیت ۱۲۷)۔ اور قرآن میں فرعون کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اگر موسیٰ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا اس کے ساتھ ملائکہ اس کی اردلی میں کیوں نہ آئے؟ (الزخرف، آیت ۵۳)۔ پس درحقیقت وہ مذہبی معنی میں نہیں بلکہ سیاسی معنی میں اپنے آپ کو اِلٰہ اور ربِ اعلیٰ کہتا تھا، یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک میں ہوں، میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے، اور میرے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان یہاں جاری ہو سکتا ہو۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾

(پس اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑا۔ ۲۵)

عبرت انگیز گرفت

فرعون نے جب دو پیغمبروں کی دلآویز شخصیات، اللہ تعالیٰ کے پیغام کے جلال اور بیسیوں معجزات دیکھ لینے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور اللہ تعالیٰ کے پیغام کو ماننے سے انکار کر دیا اور ساتھ ساتھ بنی اسرائیل پر ظلم کے شکنجے کو مزید کستا چلا گیا تو آخر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور اس کو دنیا اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لیا۔ دنیا کا عذاب تو وہ ہے جو بحرِ قلزم میں ڈبو کر دیا گیا۔ وہ چیختا رہا کہ اب میں بنی اسرائیل کے رب کو ماننے کیلئے تیار ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کے ایمان کو قبول نہ کیا اور بحرِ قلزم کی موجوں نے اس کو نہ جانے کتنی دفعہ پٹخا، ڈبویا، نکالا اور آخر کام تمام کر دیا۔ اور دوسرا عذاب وہ ہے جو اسے قیامت کے دن ہو گا۔ جس کی شدت کا عالم یہ ہے کہ ہر روز عالمِ برزخ میں بھی اسے وہ عذاب دکھایا جاتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾

(بیشک اس میں سبق ہے اس شخص کیلئے جو ڈرتا ہے۔ ۲۶)

یہ ہے وہ اصل بات جو فرعون کی سرگزشت سے قریش کو سنانی مقصود ہے۔ یہ اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر فرعون بنے ظلم وستم کو جاری رکھے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی کسی بات کو مان کر دینے کیلئے تیار نہیں۔ اور ان کی معمولی دولت و ثروت کا نشہ روز بروز ان کے پندار میں اضافہ کر رہا ہے۔ اور ان کی اذیت رسانیوں کا سلسلہ کسی جگہ رکنے کا نام نہیں لے رہا۔ انہیں اس واقعہ کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں وہ اپنا انجام دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سے سبق حاصل کرنے کیلئے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت ضروری ہے۔ جب تک ان کے دلوں میں یہ تصور جاگزیں نہیں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی بغاوت و نافرمانی کیسے نتائج پیدا کر سکتی ہے اور اس پر کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کی گرفت آ سکتی ہے اس وقت تک کوئی بڑے سے بڑا واقعہ بھی انہیں سبق دینے سے قاصر رہے گا۔

Marfat.com

ءَاَنْتُمْ
اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾ وَ
اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ
وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ
الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾
وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ
خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ
هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿٤٢﴾ فِيْمَ اَنْتَ
مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿٤٣﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿٤٤﴾ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿٤٥﴾
كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿٤٦﴾ ع

رکوع: ۲۔ (کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی، اللہ نے اس کو بنایا۔ ۲۷) اس کی چھت اونچی اٹھائی، پھر اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ ۲۸) اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔ ۲۹) اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ ۳۰) اس زمین سے پانی نکالا اور چارہ نکالا۔ ۳۱) اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں۔ ۳۲) سامان تمہارے لئے اور تمہارے چارپایوں کیلئے۔ ۳۳) اور جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا۔ ۳۴) اس دن انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا۔ ۳۵) اور دوزخ ہر دیکھنے والے کیلئے بے نقاب کر دی جائے گی۔ ۳۶) تو جس نے سرکشی کی۔ ۳۷) اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ ۳۸) تو بیشک جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ ۳۹) اور وہ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے

Marfat.com

اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا۔ ۴۰) تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ ۴۱) وہ قیامت کے بارے میں آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کب ہوگا اس کا قیام؟ ۴۲) آپ کو کیا کام اس کے ذکر سے۔ ۴۳) اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ ۴۴) آپ تو صرف ان لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے والے ہیں جو اس سے ڈریں۔ ۴۵) جس روز یہ لوگ اسے دیکھیں گے (تو وہ یوں محسوس کریں گے) کہ گویا وہ ایک شام یا اس کی صبح سے زیادہ وقفہ نہیں ٹھہرے۔ ۴۶)

ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ﴿۲۸﴾
وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿۲۹﴾

(کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی، اللہ نے اس کو بنایا۔ ۲۷) اس کی چھت اونچی اٹھائی، پھر اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ ۲۸) اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔ ۲۹)

مظاہر قدرت سے قیامت پر استدلال

پیشِ نظر تین آیتیں اور اس کے بعد چار آیتیں دو باتوں پر دلالت کر رہی ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اور دوسرے اس کے فیضانِ ربوبیت پر۔ قدرت کا اظہار اس طرح فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے آسمان کی تخلیق کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ نیلگوں چھت اور گنبدِ بے در جو ہمارے سروں پر چھایا ہوا ہے، جس میں بے شمار ستارے اور سیارے ہیں، حیران کن شمسی نظام ہے، ان گنت کہکشائیں ہیں، حیران کر دینے والی نظم و ترتیب ہے۔ یہ ایک ایسی حیرت انگیز تخلیق ہے کہ انسان اپنے تمام تر علمی کمالات کے باوجود اس کے اور چھور کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس کی وسعتوں کو ناپ نہیں سکتا۔ اس کے ستاروں اور سیاروں کو شمار نہیں کر سکتا۔ اس کی کہکشاؤں کو پوری طرح دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس کی وسعتیں انسانی علم کیلئے چیلنج بنی ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو پروردگار اتنے عظیم عالمِ بالا کو تخلیق کر سکتا ہے اس کیلئے تمہیں مر کھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا کیسے دشوار ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اس کا خوانِ ربوبیت پوری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ انسان ہی نہیں تمام مخلوقات اس کے فیضان سے حصہ پا رہی ہیں۔ وہ ہر مخلوق کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتا ہے۔ جو مخلوق زمین پر بستی ہے، جو پانی میں رہتی ہے، جو پہاڑوں اور اس کے پتھروں کے نیچے پوشیدہ ہے اور وہ مخلوق جس کو ہماری نگاہیں دیکھ نہیں سکتیں وہ سب کو جانتا اور سب کی ضرورتوں سے واقف ہے۔ ہر مخلوق کو اس کی حیثیت کے مطابق روزی پہنچ رہی ہے۔ اور انسان کو بالخصوص بے شمار نعمتوں سے نوازا گیا ہے۔ اسے حواس کے ساتھ ساتھ عقل کا چراغ، تجسس کی دولت، ندرتِ ایجاد اور قوتِ تسکین سے بہرہ ور کیا گیا۔ تو کیا یہ اس کی ربوبیت کا فیضان اس لئے ہے کہ وہ اس سے فیض پانے والوں کو بغیر کسی مقصد کے چھوڑ دے۔ یا اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر مسؤلیت عاید کرے اور ایک دن ان کو اکٹھا کر کے پوچھے کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور کس نے ناشکری کی۔ اور پھر ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزاء یا سزا دے۔ ظاہر ہے اس کی ربوبیت کا فیضان اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ اور عقل اور انصاف کا فیصلہ بھی اسی بات کے حق میں ہے۔ مختصر یہ کہ جو ذات اس قدر عظیم قدرتوں کی مالک ہے اور جس کا ہر کام اپنے اندر حکمت

Marfat.com

رکھتا ہے اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ دوبارہ انسان کو زندہ نہیں کرسکتا یا وہ انسان کے اعمال کی جزاء وسزا کیلئے قیامت نہیں لائے گا، سراسر جہالت اور بے علمی کی دلیل ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آسمان کی تخلیق اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت وحکمت کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ سمک کے معنی چھت کے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بنایا اور پھر اس کی چھت بلند کی۔ اور پھر اس کو اس طرح ہموار کیا کہ اگر انسان آج اسے نہایت غور واحتیاط سے بار بار بھی دیکھے تو کہیں بھی کسی خلل کی نشاندہی نہیں کرسکے گا۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو پیدا فرمایا تو اس کے اندر رات ہی رات تھی۔ کیونکہ وہ دھویں کی شکل میں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی رات ڈھانک دی۔ رات اور دن کو آسمان کی طرف منسوب کیا گیا ہے کیونکہ آسمان کا سورج غروب ہونے سے رات آتی ہے اور اسی کے طلوع ہونے سے دن نکلتا ہے۔ اور دونوں یعنی دن اور رات کو اس طرح ایک نظام کا پابند ٹھہرایا ہے کہ کبھی کوئی ان دونوں میں سے تخلف کرتا اور نہ پیشقدمی کرتا ہے۔ تو جو پروردگار اس جہان پر رات طاری کردینے پر قادر ہے اور رات طاری ہوجانے کے بعد دن لانے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اس کیلئے دنیا کے مر کھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنا، ناممکن ہوگا۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴿٣٠﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ﴿٣١﴾
وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾

(اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ ۳۰) اس زمین سے پانی نکالا اور چارہ نکالا۔ ۳۱) اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑدیں۔ ۳۲) سامان تمہارے لئے اور تمہارے چارپایوں کیلئے۔ ۳۳)

فیضانِ ربوبیت سے قیامت پر استدلال

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے مظاہر ذکر فرمانے کے بعد اب اپنے فیضانِ ربوبیت کا ذکر فرمارہا ہے۔ مظاہر قدرت سے کائنات کو بالعموم اور انسان کو بالخصوص ازسرنو زندہ کرنے پر استدلال کیا گیا ہے یعنی جس پروردگار کی قدرت کے یہ مظاہر ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اس کے بارے میں اس گمان کی کیا حیثیت ہے کہ وہ کائنات اور انسان کو دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا۔ اب اپنے فیضانِ ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے زمین کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کے بعد ہم نے زمین کو بچھایا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پہلے آسمان کو بنایا اور عالمِ بالا کو مختلف تخلیقات سے سجایا، اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ کیونکہ بعض جگہ قرآنِ کریم نے آسمان سے پہلے زمین کو پیدا کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اس میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ یہاں تخلیقی اعمال میں ترتیب کا ذکر مقصود نہیں، بلکہ بتانا صرف یہ ہے کہ جس پروردگار کی قدرت کے یہ یہ مظاہر ہیں اسی کی ربوبیت کی یہ یہ علامات ہیں۔ یعنی جس نے مخلوقات کو تخلیق فرمایا ہے اسی نے ان کیلئے رہنے سہنے کا انتظام کیا، زندگی کے امکانات پیدا کئے اور غذائی سروسامان مہیا فرمایا ہے۔ البتہ ان میں سے صرف چند بنیادی تخلیقات کا ذکر فرما کر باقی چیزوں کو انسان کے مشاہدے اور عقل پر چھوڑ دیا اور ان میں سب سے پہلے زمین کا ذکر کیا۔ اور آیت کریمہ میں بَعْدَ ذٰلِكَ کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ہم نے آسمان کا ذکر کرکے تمہاری توجہ ایک خاص نہج کی طرف مبذول کی۔ اب ہم اسی طرح زمین کے ذکر سے ایک اور پہلو کی طرف تمہیں متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بات بھی توجہ چاہتی تھی اور یہ بات بھی توجہ چاہتی ہے۔ اس میں آگے پیچھے اور ترتیب کا کوئی تصور نہیں۔ زمین چونکہ مخلوقات کی

Marfat.com

آبادی کیلئے سب سے پہلی ضرورت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کا ذکر فرمایا۔ یہ دیگر مخلوقات کی طرح انسان کا بھی مسکن اور مدفن بھی ہے۔ اور اس کی تگ وتاز کا میدان بھی ہے۔ اور پھر اس کو اس طرح بچھایا گیا ہے جیسے بچھونا بچھایا جاتا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ایک طرف اس کے استحکام اور صلابت کا عالم یہ ہے کہ وہ پہاڑوں کا بوجھ اٹھاتی اور قلعوں کا وزن برداشت کرتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ نرمی اور اپنایت کا حال یہ ہے کہ جب کوئی آدمی ننگی زمین پر لیٹ جاتا ہے تو وہ اس طرح محسوس کرتا ہے جیسے ماں کی آغوش میں لیٹ گیا ہو۔ اس میں خوشنمائی اور حُسن آرائی کے تمام امکانات مہیا کئے گئے ہیں۔ حیران کن طریقے سے مختلف علاقوں کو آپس میں جوڑنے کیلئے راستے بنا دیئے گئے۔ ملکوں کے درمیان قدرتی سرحدوں کے طور پر پہاڑوں کی فصیلیں کھڑی کر دی گئیں۔ اور جہاں تک اس کے عجائبات کا تعلق ہے اس کو سائنس کی روشنی میں دیکھئے تو سر دھنتے رہ جایئے۔ اسی طرح اس کے فیوض اور برکات کا حال یہ ہے کہ اس میں پانی کے چشمے ابل رہے ہیں، نہروں کی جدولیں بہہ رہی ہیں، دریا ٹھاٹھیں مارتے ہوئے گزر رہے ہیں اور پھر اس کے اندر قوتِ روئیدگی کا عالم یہ ہے کہ پہاڑوں میں سر بفلک درخت کھڑے ہیں اور میدانوں میں مختلف رنگوں کی بہار دیتی ہوئی فصلیں لہلہا رہی ہیں۔ اس تمام غذائی سامان کو یہاں مَرْعٰی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بظاہر تو اس کا ترجمہ گھاس ہے جو حیوانات کی غذاء ہے۔ لیکن بعض دفعہ انسانوں کے کھانے پینے کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والدِ گرامی سے درخواست کی تھی اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ ''یوسف کو کل ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تا کہ وہ چرچگ لے اور کھیلے۔'' پھر اگلی آیت میں فرمایا کہ زمین کو چونکہ تمہارا مسکن بنایا گیا ہے اس لئے اس کی حفاظت کیلئے ہم نے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے تا کہ زمین کا توازن قائم رکھا جائے اور اس کے بعد کی آیت میں فرمایا کہ یہ سب کچھ ہم نے تمہارے لئے سامانِ زیست بنایا ہے اور تمہارے جانوروں کیلئے بھی۔ کیونکہ جانور بجائے خود انسان کی ضرورت ہیں اور جنگلوں میں دوڑتے پھرنے والے درندے بھی کسی نہ کسی طرح انسان ہی کے کام آتے ہیں۔ اس لئے قدرت نے ان کیلئے جو سامانِ زیست بنایا ہے درحقیقت وہ انسان ہی کیلئے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سامانِ ربوبیت کی چند نمایاں علامتیں ہیں۔ ان سے اس خوانِ ربوبیت کی طرف اشارہ ہے جو ساری زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد قیامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہنا شاید یہ ہے کہ جس پروردگار کے دسترخوان سے تمہیں پالا پوسا جا رہا ہے اور جس زمین پر تمہاری ہر ضرورت پوری کی جا رہی ہے اور تمہارے عزائم کو بروئے کار لایا جا رہا ہے کیا یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ تمہیں کھلا پلا کر خود رو پودوں کی طرح مل دل کر زندگی ختم کرنے کا موقع دیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ دنیا کسی خالق حکیم کی تخلیق نہیں بلکہ بازیچۂ اطفال ہے۔ لیکن اگر واقعی اس کو پروردگار نے کسی مقصد کیلئے پیدا کیا ہے تو اس مقصد کے مطابق جزاء وسزا کے عمل کو بروئے کار لانے کیلئے بہت ضروری ہے کہ ایک روزِ جزاء لایا جائے تا کہ اچھے اپنے انعام کو پہنچیں اور برے اپنی سزا سے دوچار ہوں۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾
وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾

(اور جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا۔ ۳۴) اس دن انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا۔ ۳۵)
اور دوزخ ہر دیکھنے والے کیلئے بے نقاب کر دی جائے گی۔ ۳۶)

Marfat.com

احوالِ قیامت

الطَّآمَّةُ الْکُبْرٰی ...... طَآمَّةٌ، ایسی بڑی آفت کو کہتے ہیں جو سب پر چھا جائے۔ کُبْرٰی کا معنی ہے بڑی۔ اسے صفت کے طور پر لایا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا معنی ہوگا، بہت بڑی آفت، بہت بڑا ہنگامہ، بہت بڑی ہلچل، مراد اس سے قیامت ہے۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق محض اس کی قدرت سے ایک دن ایسا آئے گا جب قیامت ایک بہت بڑے ہنگامے کی صورت میں برپا ہو جائے گی۔ یعنی نفخۂ اولیٰ سے ہر چیز تباہ ہو جائے گی اور نفخۂ ثانیہ سے سب لوگ جی اٹھیں گے اور محشر میں پہنچ جائیں گے۔ یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ وہ لوگ جو آج تک اسے تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے وہ بھی زندہ ہو کر میدانِ حشر میں کھڑے ہوں گے۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے کہ ہم مُحاسبے کے جس دن کا انکار کرتے رہے ہیں وہ دن تو آ گیا۔ اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھوں میں نامۂ اعمال دیا جائے ان میں سے ہر شخص لرزاں و ترساں سر جھکائے اپنی زندگی کے ایک ایک عمل کو یاد کر رہا ہوگا۔ کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی ایک ایک بات یاد آئے گی کہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ قیامت کے دن ایک ایک عمل کا حساب ہوگا۔ ہم نے ان کی باتوں پر یقین نہ کیا۔ لیکن آج تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے فلاں جو بڑے بڑے مظالم کئے، لوگوں سے بہت زیادتیاں کیں، عیش و عشرت میں ڈوبے رہے اور ہر وہ کام کیا جس سے انسانیت پسینہ پسینہ ہو گئی۔ ان کاموں کی فلم ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہوگی اور وہ ایک ایک عمل کو یاد کر کے سوچ رہا ہوگا کہ آج ان باتوں کا میں کیا جواب دوں۔ دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص اچانک قانون کے شکنجے میں آ جاتا ہے اور وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ عنقریب عدالت میری قسمت کا فیصلہ کرنے والی ہے تو اسے اپنی زندگی میں کیا ہوا ایک ایک عمل یاد آتا ہے اور چشمِ تصور سے وہ سب کچھ دیکھتا ہے جس کا اس نے کبھی اعتراف نہیں کیا تھا۔ یہی کیفیت آج بھی اس کی ہوگی۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ آج منکرینِ قیامت جس جہنم کا مذاق اڑاتے ہیں جب یہ لوگ میدانِ حشر میں کھڑے ہوں گے تو وہ جہنم ان کے سامنے بے نقاب کر دی جائے گی۔ صرف ایک پردہ درمیان میں ہوگا۔ حکم ملتے ہی انہیں جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ اور جہنم کے بے نقاب ہونے کے بعد انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ فیصلہ ہوتے ہی ہمارے لئے وہ انجام شروع ہو جائے گا جس سے ہمیں دنیا میں ڈرایا جاتا رہا۔

لِمَنْ یَّرٰی سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کو بے نقاب ان کیلئے کیا جائے گا جو اپنے اعمال کی پاداش میں اس جہنم میں جانے والے ہوں گے۔ اور جنہوں نے آج تک کبھی اسے مان کر نہ دیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور پھر اس کے جہنم سے لرزاں و ترساں رہے اللہ تعالیٰ ان کو آج بھی جہنم سے دور رکھے گا، وہ کبھی اس کی آہٹ بھی نہ سن پائیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۴۱﴾

(تو جس نے سرکشی کی۔ ۳۷) اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ ۳۸) تو بیشک جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ ۳۹) اور وہ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا۔ ۴۰) تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ ۴۱)

Marfat.com

جنت وجہنم میں جانے کے اسباب

اللہ تعالیٰ کا بے حد کرم ہے کہ ہر انسان کا آخرت میں جو انجام ہونے والا ہے اس کے اسباب ونتائج کو نہایت اختصار کے ساتھ اس طرح سمیٹ کر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی طرح کی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ الفاظ مختصر ہیں لیکن ان کی معنویت پوری زندگی پر محیط ہے۔

سب سے پہلے اس بات کو واضح فرمایا کہ وہ کون بدنصیب ہیں جن کا ٹھکانہ آخرت میں جہنم ہوگا۔ ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنی زندگی کو طغیانی کی نذر کر دیا۔ دریا میں جب طغیانی آتی ہے تو دریا اپنے کناروں کو توڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی میں جب طغیانی اور سرکشی آتی ہے تو وہ توحید اور شرک، حلال اور حرام، جائز اور ناجائز اور اوامر اور نواہی کی حدود کو توڑ کر زندگی کو بگٹٹ اور بے روک ٹوک آوارہ پھرنے کیلئے چھوڑ دیتا ہے۔ اسے دنیا کی زندگی مہلتِ عمل اور آخرت کی تیاری کیلئے دی گئی ہے۔ لیکن وہ اس دنیا ہی کو مقصد بنا کر عیش وعشرت میں غرق کر دیتا ہے۔ وہ ہر اس چیز کے درپے ہوتا ہے جو اس کی عیش وعشرت کا سامان بن سکے۔ جو اس کی خواہشات کو غذا بہم پہنچا سکے، جو اس کے سر پر کلغی سجا سکے، اور جو اس کے آرام وراحت کا ذریعہ بنے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ میرا سر کس آستانے پر جھکتا ہے اور میں اپنے دل کو کس سے آباد رکھتا ہوں۔ اسے بھول کر بھی کبھی آخرت کا خیال نہیں آتا۔ اور اگر آتا بھی ہے تو وہ حیاتِ دنیا کو حیاتِ آخرت پر ترجیح دیتے ہوئے دنیا کی فکر کرتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے۔ اس کے احساسات، اس کے خیالات، اس کے افکار اور اس کے اعمال پر صرف خواہشات کا پہرہ ہوتا ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے میرا اللہ خوش ہوگا یا ناراض ہوگا۔ اس نے مجھے زندگی گزارنے کیلئے جو ضابطۂ حیات دیا ہے میں اس کی پابندی کر رہا ہوں یا اسے پامال کر رہا ہوں۔ کسی مقام پر بھی اس کی خواہشاتِ نفس میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ وہ شتر بے مہار بن کر زندگی گزارتا ہے۔ ایسا شخص یقیناً اپنے اللہ کو ناراض کر لیتا ہے اور اس کا ٹھکانہ یقیناً جہنم ہوگا۔

اس کے بعد ان لوگوں کی بات کی گئی ہے جن کا ٹھکانہ جنت ہوگا۔ جو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں جنت کی نعمتوں سے نوازے گا۔ ان کی زندگی کی تصویر کھینچتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی اس ضابطۂ حیات کے مطابق گزرتی ہے جو اسلامی شریعت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر نافذ کیا ہے۔ یہ ہر کام کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچتے ہیں کہ میرا کوئی قول اور عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف تو نہیں، میں کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہا جس سے اللہ تعالیٰ کی شریعت کا کوئی حکم ٹوٹتا ہو۔ وہ اپنے نفس کو ہوائے نفس کی پیروی سے روک کر رکھتے ہیں۔ نفس بار بار حلال وحرام کے کنارے توڑنا چاہتا ہے لیکن وہ اسے لگام دے کے رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھے ہر کام کرنے کی آزادی ہے لیکن شریعت کے احکام توڑنے کی نہیں۔ میں حیاتِ دنیا کی نعمتوں سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں لیکن میں کسی بات میں اسے آخرت پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ وہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے، ہر بات کہنے سے پہلے، ہر فیصلہ کرنے سے پہلے اور ہر کام کرنے سے پہلے شریعت کے احکام کی فکر کرتے ہیں۔ انہیں غصہ آتا ہے تو شریعت کی لگام اسے پہناتے ہیں، وہ خوش ہوتے ہیں تو تب بھی شریعت کی حدود میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ آخر جنت ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے جن لوگوں کی تربیت کی تھی جنہیں ہم صحابہ کہتے ہیں وہ سب ایسی ہی زندگی کے حامل اور ایسے ہی طرزِ عمل کے نمائندہ تھے۔ حالی نے ان کی تصویر کھینچتے ہوئے ٹھیک کہا:

Marfat.com

بھڑکتی نہ تھی خودبخود آگ ان کی
شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم، نرما گئے وہ
جہاں کردیا گرم، گرما گئے وہ

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا ﴿۴۲﴾

(وہ قیامت کے بارے میں آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کب ہوگا اس کا قیام؟ ۴۲)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

کفارِ مکہ رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ سوال کرتے تھے کہ آخر وہ قیامت کب آئے گی جس کا آپ ہمیں بار بار ڈراوا دے رہے ہیں۔ آخر اس کا سفینہ کہاں رک کر رہ گیا ہے، وہ ہمارے ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا۔ کیونکہ اَیَّانَ مستقبل کے وقت کے متعلق سوال کیلئے آتا ہے۔ اور مُرْسیٰ جہاز کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں۔ کھڑے ہونے اور قائم ہونے پر بھی بولا جاتا ہے۔ وہ یہ سوال پوچھنے کیلئے نہیں بلکہ طنز کیلئے کرتے تھے کہ ایک عرصہ گزر گیا آپ ہمیں قیامت کی خبر دے رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا سفینہ بہت عرصے سے روانہ ہو چکا ہے، لیکن ہمارے ساحل پر پہنچنے کا نام نہیں لیتا۔ تو آخر اس کا سبب کیا ہے، آپ ہمیں اس کے آنے کا ٹھیک وقت کیوں نہیں بتاتے؟

فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَهٰهَا ﴿۴۴﴾

(آپ کو کیا کام اس کے ذکر سے۔ ۴۳) اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ ۴۴)

فِیْمَ ...... اصل میں فِیْمَا ہے۔ یہ پورا جملہ عربی کے ایک خاص اسلوب کی عکاسی کر رہا ہے، جس کا معنی ہے کہ آپ کا اس بحث سے کیا تعلق، آپ کا اس سے کیا کام۔ یعنی یہ بات یکسر آپ کے منصب سے غیر متعلق ہے۔ آپ دنیا میں لوگوں کی ہدایت کیلئے تشریف لائے ہیں اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ آپ انہیں ایک ایسے دن سے ڈرائیں جہاں ان کے اعمال کا حساب ہوگا۔ اچھے یا برے اعمال کے حوالے سے جزاء یا سزا ہوگی۔ رہی یہ بات کہ وہ دن کب آئے گا اس کا آپ کے انذار اور آپ کے منصب سے کیا تعلق؟ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی لاپرواہ اور انجام سے بے فکر آدمی کو سمجھاتے ہوئے کوئی شخص کہتا ہے کہ تم ذرا ہوش کرو، تمہیں اس دنیا میں ہمیشہ تو نہیں رہنا، آخر ایک دن موت آئے گی تو تم اپنی زندگی کو کیوں برباد کر رہے ہو۔ تو اگر وہ سمجھدار شخص ہے تو اس کیلئے موت کا ڈراوا کافی ہے۔ وہ پلٹ کر کبھی نہیں پوچھتا کہ بتائیے میری موت کا وقت کون سا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بھی آخرت کی جوابدہی سے ڈراتے ہیں لیکن آخرت کے وقت کا تعین، یہ ان کے فرائض میں شامل نہیں۔ وقوعِ قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے کیونکہ ہر چیز کا سررشتہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ علم کی ابتداء بھی اسی سے ہے اور نہتاء بھی اسی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو جس بات کا چاہتے ہیں علم عطا فرماتے ہیں۔ اور جس کا علم اس کی حکمت کا تقاضا نہیں ہوتا وہ علم نہیں دیا جاتا۔ لیکن جہاں تک ہر بات اور ہر چیز کے علم کا تعلق ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، کسی پیغمبر کی نہیں۔ کائنات کے بہت سے اسرار ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی عطا نہیں فرمایا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کیخلاف اور مخلوق کی مصلحت کے منافی ہے۔

Marfat.com

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ۝٤٥

(آپ تو صرف ان لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے والے ہیں جو اس سے ڈریں۔ ۴۵)

جو لوگ قیامت کو دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں آپ پر ان کی ذمہ داری نہیں، آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے، آپ کسی کے ایمان کے ذمہ دار نہیں، آپ کی حیثیت خبردار کرنے والے کی ہے۔ اور یہ خبردار کرنا اور یہ انذار صرف ان لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے جو قیامت کو دیکھے بغیر صرف آپ کی اطلاع پر یقین لا کر اسے تسلیم کریں اور اس سے ڈریں۔ اور ان کے اندر یہ فکرمندی پیدا ہو کہ اگر آج ہم نے اپنی زندگی میں قیامت کے دن کی جوابدہی کی تیاری نہ کی تو وہاں ہمیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون بچا سکے گا۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ۝٤٦

(جس روز یہ لوگ اسے دیکھیں گے (تو وہ یوں محسوس کریں گے) کہ گویا وہ ایک شام یا اس کی صبح سے زیادہ وقفہ نہیں ٹھہرے۔ ۴۶)

منکرینِ قیامت کی بے خبری

آج یہ لوگ وقوعِ قیامت کو خلافِ عقل کہہ کر ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اور جنہیں اس کا امکان تسلیم ہے وہ بھی اسے بہت دور خیال کر کے اپنی زندگی کو بے رنگ کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ چیز جو سراسر موہوم ہے یا جس کا وقوع ہم سے بہت دور ہے تو آخر اس کی خاطر ہم اپنے عیش و عشرت، ٹھاٹھ باٹھ اور من مرضی کی زندگی کو کیسے ترک کر دیں۔ ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے جب قیامت کے دن انہیں اٹھایا جائے گا تو یہ اپنے قیامِ برزخ یا دنیوی زندگی کو ایسا خیال کریں گے جیسے ایک شام گزری ہو یا صبح گزری ہو۔ یعنی دن کا پچھلا پہر یا اس کا اگلا پہر، جو ظاہر ہے زندگی کے مقابلے میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں۔ تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قیامت کے بعد کی ابدی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی زندگی وہ درجہ بھی نہیں رکھتی جو ان کی اپنی زندگیوں میں دن کے اگلے یا پچھلے پہر کا ہے۔ تو جو قیامت ان کے اتنی قریب ہے اس کے بارے میں فکرمند نہ ہونا ایک ایسا خسارے کا معاملہ ہے جس پر پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ عَبَسَ

(۸۰)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ عَبَسَ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام عَبَسَ ہے جو اس سورۃ کا پہلا لفظ ہے۔

مقامِ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ اپنے بنیادی مضامین میں سابقہ سورۃ النّٰزِعٰت سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔ اسلوبِ بیان اور موادِ استدلال میں بھی دونوں سورتوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور سورۃُ النّٰزِعٰت کے ساتھ اس کی گہری مناسبت ہے۔ البتہ یہ بات کہ اس کے نزول کا زمانہ کون سا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک تعین بعض قرائن کی مدد سے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی پہلی آیات ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مکہ معظمہ کے چند بڑے بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور آنحضرت ﷺ ان کے سامنے اسلام کی حقانیت واضح کر رہے تھے اور انہیں اس کے قبول کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ اور وہ سردار قرآنِ کریم اور آپؑ کی دعوت پر اعتراضات کر رہے ہیں اور آپؑ ان کا جواب دے رہے تھے۔ اسی اثناء میں عبداللہ ابنِ ام مکتوم جو ایک نابینا صحابی تھے، حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متعلق کچھ پوچھنے کی غرض سے بے تکلفی سے وہاں پہنچ گئے جہاں آپؑ سرداروں سے گفتگو فرما رہے تھے اور نابینا ہونے کی وجہ سے انہیں اس کا اندازہ نہیں ہوا کہ آپؑ کے پاس کون لوگ اس وقت موجود ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو ان کی مداخلت ناگوار گزری اس لئے آپؑ نے ان سے بے رخی فرمائی۔ اس سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) کہ یہ زمانہ وہ تھا جب مخالفت اتنی نہیں بڑھی تھی کہ اشرافِ قریش کا آپ کے یہاں آنا جانا بالکل ختم ہو جائے اور معاملہ دشمنی تک پہنچ جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کیفیت نبوت کے ابتدائی سالوں میں رہی ہے۔

(۲) عبداللہ ابنِ ام مکتوم ان صحابہ میں سے ہیں جو قدیم الاسلام کہلاتے ہیں۔ حافظ ابنِ حجر اور حافظ ابنِ کثیر نے اس کی تصریح کی ہے۔ ان کے اسلام کی قدامت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نبوت کے ابتدائی سالوں ہی میں ایمان لائے ہیں۔ اگرچہ بعض روایات سے اشتباہ ہوتا ہے کہ وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے لیکن اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ان کے اندر طلبِ حق کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بات بھی ہو، یہ ان سے وابستگی پر دلالت ضرور کرتی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں اس بات پر بھی قرینہ ہیں کہ یہ سورۃ آنحضرت ﷺ کی نبوت کے ابتدائی سالوں میں نازل ہوئی ہے۔

Marfat.com

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

ایک سے سولہ تک آیات میں ایک واقعہ کو طرازِ عنوان بنا کر آنحضرت ﷺ کو بعض اصولِ تبلیغ سے بہرہ ور فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس میں بظاہر جو عتاب معلوم ہوتا ہے اس کا مورد آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی نہیں بلکہ وہ اشرافِ قریش ہیں جو اپنے تکبر اور ہٹ دھرمی کے باعث آنحضرت ﷺ کی دعوت کو مناسب اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔ البتہ یہ جانچنے کیلئے کہ حضور کس بات کی دعوت پیش کرتے ہیں اس شرط کے ساتھ آپ کے پاس آنے کیلئے تیار تھے کہ کوئی غریب اور نادار اور معاشرتی اور معاشی لحاظ سے چھوٹے درجے کا آدمی آپ کے پاس موجود نہ ہو، کیونکہ وہ اپنے تکبر کے باعث اس بات کے خوگر تھے کہ چھوٹا آدمی ان کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور ان کے نزدیک چھوٹا آدمی مال و دولت کی کمی اور معاشرتی حیثیت کے فقدان سے ہی نہیں بلکہ طبعی عوارض اور جسمانی کمزوریوں سے بھی بنتا تھا۔ عبداللہ ابنِ امِ مکتوم اس معنی میں چھوٹے آدمی نہ تھے کہ وہ نادار یا کسی چھوٹے قبیلے کے آدمی تھے، کیونکہ وہ حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے یعنی ان کی والدہ امِ مکتوم حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد کی بہن تھیں۔ ان کے چھوٹے ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ آنکھوں سے اندھے تھے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے ان کا نام لینے کی بجائے اعمیٰ کے حوالے سے ان سے متعلق بات کی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی نگاہ میں کوئی آدمی چھوٹا بڑا نہ تھا۔ وہ جس دین کو لے کر آئے ہیں اس میں عظمت اسے ملتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو مانتا اور اس کے دین کو قبول کرتا ہے۔ اور جو اس سے محروم ہے وہ چاہے حسب و نسب کے اعتبار سے کیسا ہی عظیم کیوں نہ ہو اسلام کی نگاہ میں بہت چھوٹا اور ذلیل آدمی ہے۔ لیکن تبلیغ و دعوت کے کچھ اپنے تقاضے ہیں۔ جن میں ایک تقاضا یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کا ہدف اسے بنایا جائے جس کے ایمان قبول کرنے سے دوسرے لوگ بھی اسلام کی طرف مائل ہو سکتے ہوں۔ اس کی ذات اور اس کے خیالات دوسروں پر اثر انداز ہوتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ دنیاداروں میں ہمیشہ اس طبقے کے لوگ اہم اور موثر سمجھے جاتے ہیں جن کے پاس دولت و ثروت ہوتی ہے۔ وہ جس بات کو قبول کر لیتے ہیں لوگ ان کے اثرات کی وجہ سے اس بات کو صحیح سمجھنے لگتے ہیں۔ اور جسے وہ رد کر دیتے ہیں لوگ بھی اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اس لئے ہر پیغمبر اور ہر داعی کی اولین توجہ ہمیشہ طبقۂ امراء اور حکمرانوں پر ہوتی ہے کہ وہ اگر ایمان لے آئیں تو ان کے زیر اثر لوگ خود بخود ایمان لے آئیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ بڑے لوگوں کو عزیز سمجھتے ہیں اور چھوٹے طبقے کے لوگوں کو حقیر جانتے ہیں۔ انبیائے کرام کی تبلیغ و دعوت کا یہ انداز ان کے اخلاص اور اس حرص اور خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے جو وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی توسیع اور بالادستی کے حوالوں سے اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ لیکن پروردگار نے اس کی اصلاح فرماتے ہوئے آنحضرت ﷺ کو توجہ دلائی کہ اسلام کی دعوت وہ لوگ قبول کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور فکرِ آخرت ہوتی ہے۔ وہ لوگ نہیں، جو اللہ تعالیٰ سے تعلق اور آخرت کی جوابدہی سے بے نیازی برتتے اور تکبر کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کی توجہ کے اصل مستحق عبداللہ ابنِ امِ مکتوم جیسے لوگ ہیں جو دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف بسائے، عاقبت کی فکر کے ساتھ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس آتے ہیں تاکہ آپ ان کا تزکیہ کریں۔ وہ لوگ نہیں کہ آپ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا دین پیش کرتے ہیں اور وہ اس سے بے نیازی برتتے اور تمرد کا اظہار کرتے ہیں۔

Marfat.com

پھر آیت سترہ سے تیئیس تک براہِ راست عتاب کا رخ ان کفار کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو رد کر رہے تھے۔ پہلے ان سرکشوں کی حالت پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے جو قیامت کے انکار پر اڑے ہوئے ہیں۔ پھر انہیں ملامت کرتے ہوئے خود ان کی اپنی تخلیق اور زندگی کے بعض مراحل سے یاددہانی کرائی گئی ہے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے اور مختلف مراحل طے کرتا ہوا قبر تک پہنچتا ہے۔ حیف ہے اس پر اگر وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو ناممکن سمجھے۔ جو اتنے واضح دلائل کے بعد بھی سمجھنے اور ماننے کو تیار نہیں ہوا وہ کسی دلیل سے بھی قائل نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے جس سے انسان اور حیوان سب مستفیض ہورہے ہیں۔ یہ اس بات کی واضح شہادت ہے کہ جس پروردگار نے یہ خوانِ نعمت بچھایا ہے وہ لوگوں کو غیر مسئول تو نہیں چھوڑے گا بلکہ وہ اپنی نعمتوں کا حساب لے گا۔ اس دن سرخرو وہی ہوں گے جنہوں نے نعمتوں کا حق ادا کیا ہوگا اور جنہوں نے اتباعِ نفس میں زندگی گزاری ہوگی وہ اس دن ذلیل ونامراد ہوں گے۔ اور آخر میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز ہر شخص پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی اور ہر شخص اپنی روش کا اچھا یا برا انجام دیکھے گا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۴۲	سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ (۸۰)	رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝١ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝٢ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝٣
اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝٤ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝٥ فَاَنْتَ لَهٗ
تَصَدّٰى ۝٦ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝٨
وَهُوَ يَخْشٰى ۝٩ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝١٠ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١ فَمَنْ
شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝١٢ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝١٣ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝١٤ بِاَيْدِيْ
سَفَرَةٍ ۝١٥ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝١٦ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝١٧ مِنْ اَيِّ
شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝١٨ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝١٩ ثُمَّ السَّبِيْلَ
يَسَّرَهٗ ۝٢٠ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝٢١ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۝٢٢ كَلَّا لَمَّا
يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝٢٣ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝٢٤ اَنَّا صَبَبْنَا
الْمَآءَ صَبًّا ۝٢٥ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝٢٦ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝٢٧
وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝٢٨ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝٢٩ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝٣٠ وَّفَاكِهَةً
وَّاَبًّا ۝٣١ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝٣٢ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝٣٣

Marfat.com

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَ
بَنِيهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوهٌ
يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوهٌ
يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

رکوع: ۱۔ (تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا۔ ۱) اس بات پر کہ آیا اس کے پاس ایک اندھا۔ ۲) تمہیں کیا خبر شاید وہ اپنی اصلاح کرے۔ ۳) یا نصیحت سنے تو نصیحت اس کو نفع پہنچائے۔ ۴) رہا وہ شخص جو بے پروائی برتتا ہے۔ ۵) تو آپ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ۶) حالانکہ آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے۔ ۷) اور رہا وہ شخص جو آپ کے پاس آتا ہے دوڑتا ہوا۔ ۸) اور وہ اللہ سے ڈر رہا ہے۔ ۹) تو آپ اس سے بے پروائی برتتے ہیں۔ ۱۰) ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے۔ ۱۱) پس جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ ۱۲) یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو لائقِ تعظیم ہیں۔ ۱۳) بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں۔ ۱۴) ایسے کاتبوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ ۱۵) جو معزز اور باوقار ہیں۔ ۱۶) ہلاک ہو انسان یہ کتنا ناشکرا ہے۔ ۱۷) اسے (اللہ نے) کس چیز سے پیدا کیا؟ ۱۸) پانی کی ایک بوند سے، اللہ نے اسے پیدا کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی۔ ۱۹) پھر اس کیلئے راہ آسان کر دی۔ ۲۰) پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔ ۲۱) پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ ۲۲) ہرگز نہیں! اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔ ۲۳) پس انسان ذرا اپنی خوراک کو دیکھے۔ ۲۴) ہم نے خوب پانی برسایا۔ ۲۵) پھر اچھی طرح زمین کو پھاڑا۔ ۲۶) پھر اس کے اندر غلے اگائے۔ ۲۷) اور انگور اور ترکاریاں۔ ۲۸) اور زیتون اور کھجوریں۔ ۲۹) اور گھنے باغات۔ ۳۰) اور طرح طرح کے پھل اور چارے۔ ۳۱) سامانِ زیست تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کیلئے۔ ۳۲) پس جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز آئے گی۔ ۳۳) اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے۔ ۳۴) اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔ ۳۵) اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے۔ ۳۶) ہر آدمی کیلئے اس دن ایسا حال ہوگا جو اس کیلئے کافی ہوگا (یعنی اس روز ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی)۔ ۳۷) کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے۔ ۳۸) ہشاش بشاش، خوش و خرم۔ ۳۹) اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی۔ ۴۰) اور کلونس چھائی ہوگی۔ ۴۱) یہ کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔ ۴۲)

Marfat.com

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۝۱ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ۝۲ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓی ۝۳
اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ۝۴

(تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا۔ ۱) اس بات پر کہ آیا اس کے پاس ایک اندھا۔ ۲) تمہیں کیا خبر شاید وہ اپنی اصلاح کرے۔ ۳) یا نصیحت سنے تو نصیحت اس کو نفع پہنچائے۔ ۴)

پہلی دو آیتوں میں آنحضرت ﷺ سے خطاب نہ کرنے کی وجہ

پہلی آیت میں دونوں فعلوں کا فاعل مذکور نہیں۔ البتہ تیسری آیت میں آنحضرت ﷺ سے براہِ راست خطاب فرمایا گیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے فاعل آنحضرت ﷺ ہیں، لیکن کلام کے ابتداء میں براہِ راست آنحضرت ﷺ سے خطاب نہ کرنا دو باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے جیسے بلند اخلاق آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائے ہیں اور جیسی عالی ظرفی اور رواداری آپ ؐ کی طبیعت کا حصہ ہے اس سے یہ بات میل نہیں کھاتی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رویئے کی مرتکب ہونے والی شخصیت آپ نہیں کوئی اور ہے۔ اس طرح سے نہایت لطیف طریقے سے آپ کو اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بظاہر اس طرزِ بیان میں ایک ناگواری اور عتاب کا اظہار ہے۔ اگر آپ کو خطاب فرما کر یہ عتاب کیا جاتا تو یقیناً آنحضرت ﷺ کیلئے تکلیف کا باعث ہوتا۔ اس لئے کہ جس بارگاہ سے ہمیشہ رحمت کی پھوار برستی ہو وہاں سے ہوا کا ایک گرم جھونکا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ اس سے اشارہ شاید اس بات کی طرف ہے کہ عتاب آپ پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر ہے جن کی وجہ سے آپ ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

آیت کا شانِ نزول

آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ اشرافِ قریش میں سے چند نمایاں لوگ اسلام کی حقیقت جاننے کیلئے آپ کے پاس حاضر ہوئے تھے۔ مختلف روایات سے جن ناموں کی صراحت ہوتی ہے ان میں عتبہ، شیبہ، ابوجہل، امیہ بن خلف اور ابی ابنِ خلف جیسے دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ آپ انتہائی دلسوزی سے انہیں اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش فرما رہے تھے کہ اسی اثناء میں عبداللہ ابنِ ام مکتوم جو حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے وہ اسلام کے حوالے سے کوئی بات پوچھنے کیلئے حاضر ہوئے۔ وہ چونکہ نابینا تھے اس لئے وہ یہ جان نہیں سکے کہ آپ کے پاس کون لوگ بیٹھے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہوگا کہ مختلف مسلمان آپ سے مختلف باتیں پوچھ رہے ہیں۔ اس لئے بے تکلفی سے آگے بڑھتے گئے اور قریب پہنچ کر جو بات وہ جاننا چاہتے تھے اس کے بارے میں سوال کر دیا۔ سوال کے الفاظ مختلف روایات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے جو تڑپ نظر آتی ہے وہ دین کے بارے میں علم سیکھنے کی ہے۔ اس کا حوالہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، عقیدہ بھی اور احکام بھی۔ لیکن نبی کریم ﷺ کو اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ میری خصوصی توجہ سے قریش کے ان سرداروں کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے دیتا۔ اس لئے عبداللہ کو اس وقت میرے پاس نہیں آنا چاہئے تھا۔ چنانچہ آپ کے چہرے پر بل پڑے اور آپ نے ان سے رخ پھیر لیا۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ عبداللہ کوئی نادار آدمی تھے ان کی ناداری کی وجہ سے حضورؐ کو ان کا آنا برا لگا۔ لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں۔ اس لئے کہ جیسے میں

Marfat.com

عرض کر چکا ہوں کہ عبداللہ حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور آپ کی والدہ حضرت خدیجہؓ کے والد کی بہن تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا خاندان کوئی چھوٹا خاندان نہ تھا اور وہ ایک کھاتے پیتے گھر کے فرد تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ وہ ایک بااثر آدمی تھے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے بعض دفعہ اپنی غیر موجودگی میں انہیں مدینے کا امام بنایا۔ اور قرآنِ کریم نے بھی اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں اعمیٰ سے تعبیر کیا جس سے ان کی طبعی معذوری کا اظہار ہوتا ہے، ان کی ناداری کا نہیں۔

آنحضرت ﷺ کا امرائے قریش کو الگ سے وقت دینا ان کی امارت کے سبب سے نہ تھا بلکہ یہ ایک فطری عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے دلوں میں لوگوں کے ایمان لانے کی جو شدید خواہش ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہ ہر طریقہ اختیار کرتے ہیں جس سے اسلام کی توسیع و اشاعت میں مدد ملتی ہے تاکہ ان کے قبولیتِ ایمان سے دوسرے لوگوں میں اسلام کا چرچا ہو اور اس طرح اسلام کی اشاعت اور قبولیت کا راستہ کھلے۔ یہ ایک ایسی فطری خواہش ہے جس پر نکیر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ لیکن اس سے بالعموم نقصان یہ ہوتا ہے کہ طبقۂ امراء میں ایسی خواہش کو کمزوری جان کر ان کے تمرد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کی رعونت اور سرکشی اور بڑھ جاتی ہے۔ اور مزید یہ کہ ان پر زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے ان غریب مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی ہے جو ایمان لا چکے ہیں اور اپنی تعلیم و تربیت کیلئے زیادہ سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی توجہ چاہتے ہیں۔ پروردگار نے آنحضرت ﷺ کو چونکہ مینارۂ نور اور ہر معاملے میں اسوہ بنایا تھا۔ اس لئے اس شدید خواہش کو جو تبلیغ و دعوت کے تقاضوں کی حدود سے تجاوز کرتی جا رہی تھی اس سے روک کر آنے والی نسلوں کو یہ سبق دیا کہ ایسی امت جس کا سرمایہ اسلامی تعلیم، اسلامی اخلاق، اللہ تعالیٰ پر بے پناہ توکل اور بھروسہ ہو اس کی اصل قوت اور سرمایہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دین کیلئے اپنے اندر بے پناہ تڑپ اور احساس رکھتے ہیں۔ چاہے وہ نابینا ہی کیوں نہ ہوں۔ اور چاہے مال و دولت کے اعتبار سے ان کا ہاتھ تنگ کیوں نہ ہو۔ اور وہ لوگ جو اسلام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسلامی تبلیغ کو مناسب وزن دینے کیلئے تیار نہ ہوں اسلام کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام ان کا محتاج نہیں بلکہ وہ اسلام کے محتاج ہیں۔

طالبِ حق کی دو صفتیں

تیسری اور چوتھی آیت میں بظاہر عبداللہ ابنِ ام مکتوم کی لیکن حقیقت میں ہر طالبِ حق کی دو صفتیں بیان فرمائی ہیں جو حصولِ ہدایت کیلئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول بلکہ ہر مصلح کو ایسے ہی وابستگانِ حق اور ایسی ہی صفات کے حاملین کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا چاہئے۔ جن میں پہلی صفت یہ ہے کہ ایسے وابستگانِ حق اپنی اصلاح و تربیت کو اپنے وقت کا اصل مصرف اور اپنی مساعی کا اصل ہدف سمجھتے ہیں۔ انہیں جب اس سلسلے میں کوئی سوال درپیش ہوتا ہے تو وہ رہنمائی کیلئے بے تابانہ سرچشمۂ ہدایت کی طرف لپکتے ہیں، ان کے سامنے اپنی الجھنیں بیان کرتے ہیں اور اپنے درد کا مرہم چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ وہ تزکیۂ نفس کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور دوسری صفت ان لوگوں میں یہ ہوتی ہے کہ وہ سرچشمۂ علم و ہدایت کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے سامنے کسی سوال کا جواب لینا مقصود ہو یا نہیں۔ بلکہ جب دوسرے لوگ جو مجلس میں حاضر ہوتے ہیں وہ کوئی سوال کرتے ہیں یا خود بخود کوئی ضرورت پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے رسول اس کے حوالے سے کچھ ارشاد فرماتے ہیں۔ تو یہ اس کو نہایت توجہ سے سنتے، اپنے دل میں جگہ دیتے اور اپنے عمل کا حصہ بنا لیتے۔ یہ وہ چیز ہے جسے چوتھی آیت میں بیان کیا گیا۔ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول کے التفات کے حقیقی مستحق ہیں اور انہیں کی طرف آپ کو اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے۔

Marfat.com

یاد رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے ان کے مقامِ بلند سے فروتر کسی چیز کا صدور ہوتا ہے تو اس کا سبب نفس کی خواہشوں کی پاسداری نہیں ہوتی بلکہ وہ بعض دفعہ اپنے رب کی رضا طلبی کے جوش میں اس حد سے آگے نکل جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتی ہے۔ یہاں جس بات پر نبی کریم ﷺ کو توجہ دلائی جارہی ہے وہ اسی قسم کی بات ہے جس کا تعلق آپ کی کسی خواہش سے نہیں بلکہ اسلام کی بالادستی سے تھا۔ اس سے اسلام کا وقار بھی بلند ہوتا ہے اور نبی کریم ﷺ کو ایک تسلی بھی ہوتی ہے اور آپ کے بعد آپ کے راستوں پر چلنے والوں کو ایک گائیڈ لائن مل جاتی ہے جو ان کی تبلیغ و دعوت کی حدود طے کر دیتی ہے۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ﴿۶﴾ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ﴿۷﴾
وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰی ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ﴿۱۰﴾

(رہا وہ شخص جو بے پروائی برتتا ہے۔ ۵) تو آپ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ۶) حالانکہ آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے۔ ۷) اور رہا وہ شخص جو آپ کے پاس آتا ہے دوڑتا ہوا۔ ۸) اور وہ اللہ سے ڈر رہا ہے۔ ۹) تو آپ اس سے بے پروائی برتتے ہیں۔ ۱۰)

اصل تنبیہ

یہ ہے وہ اصل تنبیہ جو آنحضرت ﷺ کو فرمائی گئی ہے۔ اور یہ ہے تبلیغ دین کا وہ اصل نکتہ جس کی طرف آنحضرت ﷺ کو توجہ دلائی گئی ہے۔ اس میں دو شخصوں کا نقشہ کھینچ کر بتایا گیا ہے کہ ایک وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ کے دین کی کوئی پرواہ نہیں۔ وہ دنیا کے عیش و عشرت میں ایسا غرق ہو چکا ہے کہ اسے بھول کر بھی کبھی آخرت کا خیال نہیں آتا۔ مال و دولت میں اضافہ اس کی زندگی کا مقصد بن چکا ہے۔ اسے ہر صورت میں اپنی بھلائی، اپنا عیش و عشرت، اپنا اثر و رسوخ اور اپنی ذات عزیز ہے۔ اسے اس سے کچھ غرض نہیں کہ انسانیت کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں، انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ انسان کا کوئی الٰہ ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو اس کی صفات اور حقوق کیا ہیں۔ دوسرے بندوں سے میرا رشتہ کیا ہے۔ اور اس رشتے کے آداب کیا ہیں۔ گویا کہ وہ ایک بے نیاز آدمی ہے جس نے ہر رشتے اور زندگی کے ہر تقاضے سے تعلق توڑ لیا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جسے آخرت کی فکر نے آ پکڑا ہے۔ وہ زندگی کی ناپائیداری اور آخرت میں جوابدہی کا یقین پیدا کر چکا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے کہ میں اس کی نافرمانی کی پاداش میں نہ پکڑا جاؤں اور پھر اس کے اندر خیر کا زوردار جذبہ پیدا ہو چکا ہے جس کی وجہ سے وہ دوڑتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ یہ دو طرح کے افراد آپ کے سامنے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ پہلی قسم سے تعلق رکھنے والا شخص چونکہ بااثر، مالدار اور وسیع حلقۂ تعارف کا مالک ہے اور اس کی پسند و ناپسند کا اثر دوسرے قبول کرتے ہیں۔ تو آپ محض اسلام کی بالادستی اور تبلیغ و دعوت کی قبولیت کیلئے ایسے آدمی کے درپے ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ توجہ اس کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ اسے حق طلبی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور آپ کی تبلیغ و دعوت کا کوئی اثر قبول کرنے کیلئے وہ تیار نہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسرا آدمی جو حق کا طالب، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور نہایت بے تابانہ طلب لے کر براہِ راست علم کے حصول کیلئے آپ کے پاس پہنچتا ہے۔ وہ غریب اور

Marfat.com

نادار ضرور ہے اور ہوسکتا ہے جسمانی عوارض کا بھی شکار ہو۔ تو آپ اس خیال سے اس سے پہلو تہی کرتے ہیں تاکہ دوسری طرح کے لوگوں کو آپ زیادہ سے زیادہ وقت دے سکیں اور ان کو اسلام کی طرف مائل کرسکیں۔ حالانکہ اگر کوئی شخص آپ کی کوششوں کے باوجود اسلام کی طرف آنے سے انکار کر دیتا ہے تو آپ کی یہ ذمہ داری نہیں کہ آپ بہرصورت اسے اسلام کی طرف لائیں۔ کیونکہ آپ کا فرض تبلیغ و دعوت ہے اور حق کو پہنچا دینا ہے، کسی کو مومن بنانا نہیں۔ البتہ جو شخص آپ کے پاس ایمان لانے اور حق کی طلب کیلئے پہنچتا ہے اس کا تزکیہ کرنا اور اسے ایمان کی دولت سے مالا مال کرنا اور اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔

تَصَدّٰی ...... یہ دراصل تَتَصَدَّدُ ہے۔ اس کا مادہ صَدَدَ ہے۔ یہ تعلیل کے بعد تَصَدّٰی ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسلام سے بے نیازی برتتے ہیں اور آپ کی تبلیغ و دعوت کو اہمیت دینے کیلئے تیار نہیں آپ ان پر زیادہ توجہ صرف کرتے اور ان کے درپے ہوتے ہیں۔ یقیناً اس کے پس منظر میں ان کے ساتھ خیر خواہی اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی ہے۔ اور آپ ہر صورت میں امکانی حد تک انہیں اسلام کی آغوش میں لانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا فرض ہے جو آپ نے خود اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہیں کیا۔ آپ کی اصل ذمہ داری انذار و ابلاغ کی ہے۔ اس کے ادا کر چکنے کے بعد آپ بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ مومن اور مسلم بنانا آپ کی ہرگز ذمہ داری نہیں۔ لیکن جو شخص ذوق و شوق اور کوشش سے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوا آپ کے پاس آتا ہے وہ یقیناً آپ کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اس پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کرنا آپ کے فرائض کا حصہ ہے۔ اور ایسے ہی لوگ ہیں جو آپ کے قافلے کی اصل قوت ہیں۔ اُن پتھروں میں جونک لگانے کی بجائے اِن ہیروں میں آب و تاب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿١٢﴾

(ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے۔ ۱۱) پس جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ ۱۲)

پیغمبر کی اصل ذمہ داری

ہرگز نہیں، سے مراد یہ ہے کہ آپ جس طرح اللہ تعالیٰ کے دین سے بے نیاز لوگوں اور آپ کی تبلیغ و دعوت سے منہ پھیرنے والوں کو محض ان کی خیر خواہی اور اسلام کی توسیع و اشاعت کیلئے اہمیت دے رہے ہیں اور آپ کے اندر یہ خواہش کروٹیں لے رہی ہے کہ کاش یہ لوگ اسلام کے دست و بازو بنیں، اس کی کشتی کے کھینے والے ہوں اور اس شمع کو دنیا میں عام کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس خواہش کے نیک اور خوبصورت ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن یہ لوگ ایسے بدمست ہیں کہ یہ آپ کی دردمندی اور سوز و گداز سے بھرپور کاوشوں کو ایک کمزوری سمجھتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ ہم شاید ایسے کوئی غیر معمولی لوگ ہیں کہ اگر ہم نے اسلام قبول نہ کیا تو اسلام کی کھیتی اجڑ جائے گی۔ آپ ایسے خودسروں کو اہمیت دینا چھوڑ دیں۔ نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے منہ موڑے اس کے سامنے اسے نہایت نیازمندی سے پیش کیا جائے اور نہ آپ کے بلند مرتبے سے یہ بات میل کھاتی ہے کہ آپ ان کو اسلام سے قریب لانے کیلئے اپنی بلند سطح سے نیچے اتریں۔ یہ اگر حق سے بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں تو حق بھی ان سے اتنا ہی بے نیاز ہے جتنے یہ حق سے بے نیاز ہیں۔

Marfat.com

مزید فرمایا کہ یہ تو ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جس کا جی نہ چاہے وہ اپنے برے انجام سے دوچار ہونے کیلئے تیار ہو جائے۔ ''اِنَّھَا'' میں ضمیر کا مرجع ذکریٰ ہے جس کا ذکر آیت چار میں ہوا۔ اس لئے ضمیر کو مونث لایا گیا ہے۔ اور ''ذَکَرَہٗ'' میں بھی ضمیر کا مرجع وہی ذکریٰ ہے۔ لیکن یہاں ضمیر مذکر لا کر معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور قرآنِ کریم اور عربی زبان میں یہ اسلوب عام ہے کہ ضمیر میں کہیں لفظ کا لحاظ ہوتا ہے اور کہیں معنی کا۔ سورۃ کے آغاز میں ہم نے جس عتاب کا ذکر پڑھا ہے جس کے مخاطب آنحضرت ﷺ ہیں اس آیتِ کریمہ نے اس کی اصل حقیقت واضح کر دی ہے۔ اس آیت کو غور سے پڑھنے کے بعد صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ عام عتاب نہیں بلکہ اس کی نوعیت عتابِ محبت کی ہے۔ کہ نہایت پیار سے آپ سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ یہ قرآنِ کریم تو ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ اس سے جو شخص فائدہ اٹھانا چاہے تو اٹھا سکتا ہے۔ لیکن جو شخص بہرہ بنا رہے وہ خود اپنی قسمت پھوڑ لیتا ہے، آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیونکہ آپ کے ذمہ صرف نصیحت کرنا ہے، سننے والوں کی زندگیوں کو تبدیل کرنا نہیں۔ جب آپ نے تبلیغ و انذار کا حق ادا کر دیا تو آپ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے۔ قطع نظر اس سے کہ سننے والوں نے اسے قبول کیا ہے یا نہیں۔ تو اے پیارے رسول! جب آپ کی ذمہ داری صرف انذار و ابلاغ ہے تو آپ کو کیا ضرورت پڑی کہ آپ ان کندہ ناتراش لوگوں کی باتیں سنیں اور ان کی ناز برداری کریں۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

(یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو لائقِ تعظیم ہیں۔ ۱۳) بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں۔ ۱۴)
ایسے کاتبوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ ۱۵) جو معزز اور باوقار ہیں۔ ۱۶)

گزشتہ مضمون کی مزید وضاحت

اوپر جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ اس کی مزید وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کے بلند مرتبہ ہونے کی وجہ سے یہ شایانِ شان نہیں کہ آپ ان بد دماغ اشرافِ قریش کے سامنے اس طرح بات کریں جیسا چھوٹا بڑوں کے سامنے کوئی درخواست پیش کرتا ہے۔ آپ خالقِ کائنات کے سفیر ہیں۔ ان اشراف سے بات کرتے ہوئے آپ کی عظمت کا اظہار ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح آپ جو قرآنِ کریم ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور جسے سننا انہیں گوارا نہیں، وہ بھی کوئی ایسی چیز نہیں جو نہایت لجاجت اور عاجزی کے ساتھ ان متمردین کے سامنے پیش کی جائے۔ جس طرح آپ کی ذات اللہ تعالیٰ کی سفیر ہے اسی طرح قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ تو جیسا متکلم عظیم ہوگا، ویسا ہی کلام بھی عظیم ہوگا۔ چونکہ خالقِ کائنات کی ہمسری اور برابری مخلوق کیلئے ممکن نہیں، بلکہ ایسا تصور کرنا بھی انتہائی گری ہوئی حرکت ہے۔ اسی طرح خالقِ کائنات کے کلام کو ان متکبرین کے سامنے برابری کی سطح پر پیش کرنا بھی کلامِ خداوندی کی قدر کو کم کرنا ہے۔ اس لئے ان آیات میں قرآنِ کریم کی چند صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے جس سے اس کی رفعت و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آیت کے پہلے لفظ فِيْ صُحُفٍ سے پہلے هُوَ محذوف ہے جو مبتداء ہے۔ صُحُفٍ، صَحِيْفَةٌ کی جمع ہے۔ لکھے ہوئے ورق کو کہتے ہیں لیکن عموماً چھوٹی کتاب کیلئے بولا جاتا ہے۔ یہاں اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ وہ اگرچہ ایک ہی ہے لیکن اس کو بصیغۂ جمع شاید اس لئے لایا گیا ہے کہ اس میں سب صحائفِ آسمانی لکھے ہوئے ہیں۔ اور یا اس لئے کہ فرشتے اپنے صحیفے اس سے نقل کرتے ہیں۔ مُكَرَّمَةٍ سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک عزیز، گراں مایہ اور قیمتی خزانہ ہے جس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے فرشتے نہایت اہتمام کے ساتھ کر رہے ہیں۔

Marfat.com

مَرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ...... یعنی وہ صحیفے اپنے مقام اور معنی کے لحاظ سے انتہائی بلند واقع ہوئے ہیں۔اور ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہیں۔شیاطین اور ارواحِ خبیثہ کی دسترس سے بالکل محفوظ ہیں۔جس طرح قرآنِ کریم میں سورۃ الواقعہ میں فرمایا گیا ہے فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ O لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ''وہ ایک محفوظ کتاب میں ہے،جس تک صرف پاکیزہ ہاتھوں ہی کی رسائی ہے۔'' یعنی کسی نوعیت کے باطل اور فاسد افکار ونظریات ان میں راہ نہیں پاسکتے۔ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ کِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ سَفَرَةٍ، سَافِرٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے،جس کا معنی کاتب کے ہیں۔اس صورت میں اس سے مراد فرشتے یا انبیاء علیہم السلام اور ان کی وحی کو لکھنے والے حضرات ہوں گے۔اور یہ سفیر کی جمع بھی ہوسکتی ہے،جس کے معنی قاصد ہوتے ہیں۔اس صورت میں اس سے مراد رسل، ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام اور وحی کی کتابت کرنے والے حضرات صحابہ کرام ہوں گے۔اور علماء امت بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ اور امت کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں۔ بَرَرَةٍ جمع ہے بَارٌّ کی فرمانبردار، باوفا اور اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ادا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قرآنِ کریم کے صحیفوں کو اللہ تعالیٰ کی براہِ راست ہدایت کے مطابق لکھ رہے تھے اور ان کی حفاظت کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ تک انہیں جوں کا توں پہنچا رہے تھے۔وہ اس قدر امانت دار اور امانت کا حق ادا کرنے والے ہیں کہ اس میں خیانت کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔قرآنِ کریم جیسی عظیم کتاب اس اہتمام کے ساتھ لوحِ محفوظ میں اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں فرشتے لکھتے ہیں اور پھر وہی معزز ملائکہ اس کی حفاظت پر مامور ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول تک پہنچانا بھی ان کی ذمہ داری میں داخل ہے۔قرآن اور اس کے محافظین کی ان صفات کے ذکر سے آنحضرت ﷺ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے جسے متمردین کے سامنے لجاجت کے ساتھ پیش کیا جائے۔بلکہ جس عظمت وشان کا وہ کلام ہے اسی وقار اور خودداری کے ساتھ اس کی دعوت دی جائے۔اور جس طرح باوقار ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اور اس کو نازل کرنے پر مامور فرمایا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور ان کے ساتھی اس کی دعوت وتبلیغ میں اسی وقار اور تمکنت اور گہری دلسوزی کا اظہار کریں۔

ان آیات سے اشارۃً یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جب اتنے عظیم فرشتے اس قدر دیانت وامانت اور اہتمام اور انصرام کے ساتھ اس کتاب کی حفاظت کرتے اور آنحضرت ﷺ تک پہنچاتے ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کے عظیم صحابہ جنہوں نے اس کتاب کی حفاظت اور کتابت اور اس کے پیغام کو دنیا تک پہنچانے اور پھر نہایت محنت اور دیانت کے ساتھ لوگوں کے دلوں اور حافظوں میں اتارنے کا فرض انجام دیا ہے وہ بھی یقیناً انہیں بلند صفات اور اسی قدر دیانت وامانت کے حامل ہوں گے جیسے آسمانوں پر اس کی حفاظت کرنے والے تھے۔کیونکہ وہ کتاب جو اللہ تعالیٰ کی صفت اور دنیا میں انسانوں کیلئے آخری اللہ تعالیٰ کا پیغام اور رحمت بن کر آئی ہے جس اہتمام کے ساتھ اسے لوحِ محفوظ سے لے کر آنحضرت ﷺ کے قلبِ اطہر تک پہنچانے میں اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے دنیا میں اس کی حفاظت وصیانت اور لوگوں تک پہنچانے میں یقیناً اس سے کم اہتمام اور ان سے کم پاکیزہ لوگوں کا انتخاب نہیں کیا جاسکتا تھا۔کیونکہ دنیا میں اس کی حفاظت اور اس کی تبلیغ ودعوت یقیناً بہت بڑی ذمہ داری اور بہت نازک کام تھا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾

(ہلاک ہو انسان یہ کتنا ناشکرا ہے۔ ۱۷)

Marfat.com

کفار پر براہِ راست عتاب

اس سے پہلے کی آیات میں خطاب نبی کریم ﷺ سے تھا لیکن عتاب در پردہ کفار پر تھا۔آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا تھا کہ آپ ان لوگوں پر توجہ دے رہے ہیں جو درحقیقت اس قابل نہیں ہیں۔وہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے انسان کی عظمت کھو چکے ہیں۔اب وہ اس قابل ہرگز نہیں رہے کہ آپ اپنا قیمتی وقت اور قرآنِ کریم جیسی عظیم کتاب ان کے سامنے پیش کریں۔پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں عتاب ان کفار پر براہِ راست ہو رہا ہے۔اور عتاب کے تیور اتنے تیکھے ہیں کہ پہلے جملے ہی سے ان پر لعنت کی جارہی ہے اور غضب کا اظہار فرمایا جارہا ہے۔آیت میں مذکور ''انسان'' کا لفظ اگرچہ عام ہے، لیکن مراد اس سے نوعِ انسانی کا ہر فرد نہیں۔بلکہ روئے سخن ان متکبرین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔کیونکہ مقصود کسی انسان پر غضب کا اظہار کرنا نہیں بلکہ ان کی ناپسندیدہ صفات کی مذمت کرنا ہے۔اور مقصود یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ صفات پائی جائیں گی جن کا ذکر سابقہ آیات میں ہو چکا ہے تو ایسی صفات کے موصوف انسان ایسی ہی مذمت کے مستحق ہوں گے۔ویسے بھی قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ بعض دفعہ وہ کفار کے کسی گروہ کو مستحقِ خطاب نہیں سمجھتا۔اور دوسرے سے خطاب کے ضمن میں ان سے منہ پھیر کر، لیکن انہیں سمجھانے کیلئے بات کہتا ہے۔علاوہ ازیں قرآن وسنت میں جو ہمیں حکمتِ خطاب نظر آتی ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مخصوص لوگوں کو تعین کے ساتھ ملامت نہ کی جائے تاکہ ان میں ضد پیدا نہ ہو۔عام انداز میں بات اس طرح کہی جائے کہ وہ اپنی برائی کو سمجھ لیں۔لیکن براہِ راست خطاب نہ ہونے کی وجہ سے انہیں برہم ہونے کا موقع بھی نہ ملے۔

انسان کی ناشکری پر اظہارِ تعجب

مَـآ اَكْفَرَهٗ ...... پروردگار اظہارِ تعجب کرتا ہوا فرمارہا ہے کہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ انسان کتنا ناشکرا بن کر رہ گیا ہے۔اور کس قدر بد دماغ ہو گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو خاطر میں نہیں لاتا۔اور اللہ تعالیٰ کا کلام اور پیغام سننے کا روادار نہیں ہوتا۔

اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ آخر انسان کس بل بوتے پر اللہ تعالیٰ سے کفر کرتا اور اس کے احکام کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔حالانکہ وہ دیکھتا ہے کہ میرے گردوپیش میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پھیلی ہوئی ہیں۔اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا منکر اور اس کا ناشکرا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کا محسن ہے اور وہ احسانات کی ناشکری کرتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ اس کا خالق و مالک ہے اور وہ اس کے سامنے باغیانہ روش اختیار کرتا ہے۔

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾
ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾

اسے (اللہ نے) کس چیز سے پیدا کیا؟ ۱۸) پانی کی ایک بوند سے، اللہ نے اسے پیدا کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی۔ ۱۹) پھر اس کیلئے راہ آسان کر دی۔۲۰) پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔ ۲۱) پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ ۲۲)

Marfat.com

انسان پر احسانات سے استدلال

یہ کفار جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کے سامنے تکبر کا اظہار کرتے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سامنے سرکشی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کاش انہیں کبھی ان باتوں پر غور کرنے کا موقع ملے کہ ان کے ایک ایک فرد کو اللہ تعالیٰ نے کس چیز سے پیدا کیا ہے؟ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی فرمایا کہ حقیر پانی کی ایک بوند سے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کے کلام کے سامنے تکبر کا اظہار کرتا ہے آخر وہ یہ تو بتائے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کیونکہ تکبر وہ اختیار کرتا ہے جو اپنی ذات میں بہت بڑی چیز ہو اور کسی بہت بڑے حوالے سے اس کی ابتدا ہوئی ہو۔ اس کے دماغ میں جو ہوا ابھری ہے کہ اپنے خالق کو بھی خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اس کی اصل اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کو حقیر پانی کی ایک بوند سے اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمایا ہے، جس پانی سے ہر شخص نفرت کرتا ہے، جس کپڑے کو لگ جائے وہ ناپاک ہو جاتا ہے، جسم کو لگ جائے تو اس کا دھونا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان عجیب واقع ہوا ہے کہ ایسی مکروہ اصل سے وجود پانے کے باوصف اپنے خالق ہی کے سامنے اکڑنے لگتا ہے۔ مزید فرمایا کہ اس کی اصل تو ایک ایسی چیز ہے جو سراسر قابلِ نفرت ہے۔ البتہ جس ذات نے اس قابلِ نفرت چیز سے ایک باعظمت انسان کو پیدا کیا ہے اور پھر پیدا کر کے ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ بطنِ مادر ہی میں اس کی تقدیر بھی طے کر دی جس سے اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے بعض مفسرین اس تقدیر کی وضاحت آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے کرتے ہیں جو اس آیت کی تفسیر میں تو آپ نے نہیں فرمایا لیکن اس سے اس پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ وہ ارشاد یہ ہے کہ انسان جس وقت بطنِ مادر میں زیرِ تخلیق ہوتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ اس کی چار چیزوں کی مقدار لکھ دیتے ہیں۔ (۱) وہ کیا اور کیسے عمل کرے گا۔ (۲) اس کی عمر کتنی ہوگی۔ (۳) اس کو رزق کتنا ملے گا۔ (۴) اور وہ انجام کار سعید اور نیک بخت ہوگا یا شقی بد بخت۔ (کما فی حدیث ابنِ مسعودؓ عند الشیخین)۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس سے اشارہ ان منازل و مراحل کی طرف ہے جو انسان کی تدریجی تشکیل میں نمایاں ہیں۔ البتہ ہر مفسر نے اپنے ذوق کے مطابق ان کو شمار کیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہیں، اس لئے کہ بعض دفعہ اجمال سے کام لیا جاتا ہے اور بعض دفعہ تفصیل سے۔ اور پھر ہر اہلِ علم کی قوتِ مشاہدہ میں بھی تنوع ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں تقدیر سے مراد یہ ہے کہ یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ دنیا میں آنے والے بچے کی جنس کیا ہوگی، اس کا رنگ کیا ہوگا، اس کا قد کتنا ہوگا، اس کے بچپن کی کیفیت کیا ہوگی، لڑکپن کیسے گزرے گا، جوانی کی کیا کیفیات ہوں گی، اس کے اعضاء کس حد تک صحیح و سالم اور کس حد تک ناقص ہوں گے، اس کی شکل و صورت اور آواز کیسی ہوگی، اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی، اس کے ذہن کی صلاحیت کیا ہوگی، کس سرزمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں پیدا ہوگا، اس کی شخصیت کی تعمیر میں موروثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خوبی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا، اس کی موت کہاں واقع ہوگی اور خیر و شر کے حوالے سے وہ کیا کردار انجام دے گا۔ ایسی ہی مزید تفصیلات جو انسانی زندگی کی حقیقت، اس کے خواص، اس کے عوارض اور اس کے اثرات میں داخل ہیں، ان سب چیزوں کا فیصلہ ماں کے پیٹ ہی میں کر دیا جاتا ہے۔ انسان چاہے بھی تو ان سے بال برابر ہٹ نہیں سکتا۔ نہ اس میں ذرہ برابر کوئی ردوبدل کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ایک نظام کے تحت دنیا میں آتا اور تکوینی معاملات میں اس نظام کی پابندی کرنے پر مجبور ہے لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کفر کرتا اور اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے۔

Marfat.com

مزید فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اس آنے والے کیلئے تیسیر یعنی آسانی سے کام لیا۔ بطنِ مادر میں انسان کس آسانی سے مختلف مراحل طے کرتا ہے اسے اگرچہ اس کا اندازہ نہیں، لیکن ماں کسی حد تک احساس رکھتی ہے اور میڈیکل سائنس میں درک رکھنے والے لوگ کسی نہ کسی حد تک اس سے آگاہی رکھتے ہیں۔ پھر جب اس کا دنیا میں آنا منظور ہوتا ہے تو بطنِ مادر سے برآمد ہونے کیلئے ماں کے نظامِ جسم اور بچے کے نظامِ جسم میں جو تبدیلیاں ودیعت کی جاتی ہیں اور عین تخلیق کے وقت ان کا اظہار ہوتا ہے وہ بجائے خود ایسی آسانی کا عمل ہے جو سراسر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی رحمت پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر پروردگار کی جانب سے یہ قدرتی انتظام نہ ہوتا تو کوئی انسانی تدبیر اس کی متبادل نہیں ہوسکتی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ زچہ اور بچہ دونوں ہلاک ہوجاتے۔ اور پھر یہ تیسیر کا عمل پوری زندگی پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مہد سے لحد تک قدرت کی اسی کارفرمائی سے انسان زندگی کے تمام نشیب و فراز سے کامیابی سے گزرتا ہے۔ انسان کا بچہ سب حیوانات کے بچوں سے زیادہ بے بس ہوتا ہے لیکن اس کی زندگی کی بقاء کیلئے اللہ تعالیٰ اسے بھوک کا احساس بخشتا ہے، اس کی ماں کی چھاتیوں میں اس کی غذا پیدا کردی جاتی ہے اور پھر اس غذا کو چوس کر چھاتیوں سے حاصل کرنے کی رہنمائی جبلی طور پر اس کے اندر ودیعت کردی جاتی ہے۔ ماں کے اندر جس طرح ممتا پیدا کی جاتی ہے اسی طرح باپ کے اندر شفقت کا ایک چشمہ رواں کردیا جاتا ہے۔ پھر بچہ بڑا ہو کر جب عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ خدا ہی کے بخشے ہوئے اعضاء، توانائی، دماغی صلاحیت اور عقل کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں اس کے اندر اخلاق کی حس پیدا کی جاتی ہے، خیر و شر کا شعور دیا جاتا ہے، فجور اور تقویٰ کا الہام کیا جاتا ہے، قدم قدم پر آسانی کے چراغ ہیں جو اس کے راستے کو روشن کرتے ہیں اور تیسیر کا ایک نور ہے جو اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

مزید فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ اس کو موت دیتا ہے اور قبر میں پہنچا دیتا ہے۔ یہ زندگی کے آخری مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ آخر وہ وقت آتا ہے کہ انسان زندگی کیسی بھی گزارے اسے بہرحال موت کا شکار ہونا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نظام میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ اس کے نتیجے میں بالآخر اس کی زندگی کا اختتام موت پر ہوتا ہے۔ کوئی شخص چاہے کیسا ہی سرپھرا ہو موت سے اسے کوئی مفر نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا مزید کرم یہ ہے کہ جس نوعیت کی قبر اس کیلئے طے کردی گئی ہے اسی نوعیت کی قبر میں دفن ہوتا ہے، خواہ وہ زمین کا پیٹ ہو یا سمندر کی گہرائیاں، آگ کا آلاؤ ہو یا کسی درندے کا معدہ۔ کسی میں یہ مجال نہیں کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو تبدیل کرسکے۔ اور اسی سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ جو شخص مرتا ہے وہ فنا نہیں ہوجاتا بلکہ قدرت اسے قبر کی تحویل میں دے دیتی ہے۔ اور جو چیز تحویل میں دی جاتی ہے وہ لازماً ایک دن واپس لی جاتی ہے۔ چنانچہ جب وقت آئے گا اللہ تعالیٰ اس امانت کو زمین سے واپس لے لے گا۔

مزید فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے موت دی اور پھر قبر میں دفن کردیا اسے وہ جب چاہے گا اٹھا کھڑا کرے گا۔ اس کی یہ مجال نہیں کہ یہ اٹھنے سے انکار کردے۔ جس طرح پیدا کرنے سے پہلے اس کی رائے نہیں لی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہوا۔ اسی طرح اس کے اٹھائے جانے کے وقت بھی اسے نہیں پوچھا جائے گا۔ اور اگر وہ انکار بھی کرے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کو اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ جب پانی کی ایک بوند کو رحمِ مادر کے اندر اس نے ایک انسان کی شکل دی اور اس کام میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو اب اسے زمین سے برآمد کرنے اور از سرِ نو زندہ کرنے میں بھی اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ؕ ﴿۲۳﴾

(ہرگز نہیں! اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔ ۲۳)

Marfat.com

انسان کو تنبیہ

گزشتہ آیات میں تخلیقِ انسانی کی ابتداء اور انتہاء اور ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور انعامات کا ذکر کرنے کے بعد تنبیہ کرتے ہوئے اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ایسے واضح احسانات اور قدرت کے ایسے نمایاں شواہد کے بعد تو اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو ماننے سے انکار کر دے یا اس کی نعمتوں کی قدر دانی اور ادائے شکر میں کوتاہی کرے۔ کیونکہ اس کے تخلیقی عمل، پھر اس کی زندگی کے امکانات اور بقاء کے انتظامات اور رہنمائی کے تمام اسباب کو دیکھتے ہوئے غبی سے غبی آدمی بھی اپنے خالق و مالک کی معرفت اور اپنے محسن کی احسان شناسی میں کوتاہی نہیں کر سکتا۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ انسان نے اپنے فرض کو نہ پہچانا، اور جس کا اسے حکم دیا گیا تھا اس کو ادا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

حکم سے مراد صرف وہی حکم نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور کتاب کے ذریعے انسانوں کو دیا ہے بلکہ اس سے مراد وہ تمام احکام و اوامر ہیں جو فطرت کی بدیہیات میں سے ہیں۔ اور وہ احکام بھی جن کی طرف انسان کا اپنا وجود اور زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ہر ذرہ اشارہ کر رہا ہے۔ اور وہ احکام بھی مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے نازل کئے ہیں اور ہر دور کے علماء اور مصلحین نے انہیں لوگوں تک پہنچایا ہے۔

فَلۡيَنظُرِ ٱلۡإِنسَٰنُ إِلَىٰ طَعَامِهِۦٓ ﴿۲۴﴾

(پس انسان ذرا اپنی خوراک کو دیکھے۔ ۲۴)

تدبر کی نگاہ ہو تو دلائل کی کمی نہیں

سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی کوئی انتہاء ہے اور نہ اس کے احسانات کا کوئی شمار۔ انسان اپنی غذا ہی کو دیکھے کیونکہ انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں اور وجاہتوں کے باوجود غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر باہمہ جلالتِ قدر کھانے پینے کی احتیاج رکھتے تھے، اس لئے کافروں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا مَالِ هَٰذَا ٱلرَّسُولِ يَأۡكُلُ ٱلطَّعَامَ وَيَمۡشِي فِي ٱلۡأَسۡوَاقِ "یہ کیسے رسول ہو سکتا ہے، یہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔" تو باقی انسانوں کے بارے میں کہنے کی گنجائش ہی کیا رہ جاتی ہے۔ ایسی بنیادی چیز جس کے بغیر انسانی زندگی باقی نہیں رہ سکتی کبھی انسان نے اس پر غور کیا ہے کہ یہ کہاں سے آتی ہے اور اس کے بننے اور پروان چڑھنے میں کیا کیا مراحل پیش آتے ہیں۔ اگر پروردگار غذا کے اسباب فراہم نہ کرتا تو انسان کے بس میں نہ تھا کہ وہ غذا پیدا کر لیتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حال یہ ہے کہ اس نے صرف غذا ہی پیدا نہیں کی بلکہ اس میں اتنی وسعت، تنوع اور ضروریات کی ایک ایک نوعیت کا لحاظ رکھا ہے کہ دیکھ کر آدمی مبہوت ہو جاتا ہے۔ وہ مخلوق کی ہر قسم کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا فراہم کرتا ہے۔ اور ایسے ایسے مقامات پر غذا کی ترسیل کا انتظام کرتا ہے جہاں تک انسان کی نگاہوں کی رسائی نہیں۔

Marfat.com

اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾
وَّ عِنَبًا وَّ قَضۡبًا ﴿۲۸﴾ وَّ زَیۡتُوۡنًا وَّ نَخۡلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلۡبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاکِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا
لَّکُمۡ وَ لِاَنۡعَامِکُمۡ ﴿۳۲﴾

(ہم نے خوب پانی برسایا۔ ۲۵) پھر اچھی طرح زمین کو پھاڑا۔ ۲۶) پھر اس کے اندر غلے اگائے۔ ۲۷) اور انگور اور ترکاریاں۔ ۲۸) اور زیتون اور کھجوریں۔ ۲۹) اور گھنے باغات۔ ۳۰) اور طرح طرح کے پھل اور چارے۔ ۳۱) سامانِ زیست تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کیلئے۔ ۳۲)

سابقہ آیت میں انسان کو اپنے کھانے پر غور کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اب اس کھانے اور غذا کو بہم پہنچانے کیلئے جس بنیادی چیز کی ضرورت ہے اور جو خود غذا کا اہم ترین حصہ ہے، یعنی پانی، اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ انسانی غذا میں کچھ چیزیں وہ ہیں جو بھوک مٹاتی ہیں۔ لیکن ان چیزوں کے بغیر آدمی دو تین روز تک زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن پیاس بجھانے کیلئے پانی کی ضرورت ہے۔ پانی کے بغیر اتنا طویل عرصہ زندہ رہنا مشکل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پانی کا ذکر فرمایا اور اپنی پیدا کردہ نعمتوں میں پانی کو سب سے زیادہ فراوانی سے وجود بخشا۔ یوں تو پانی کے ذرائع ایک سے زیادہ ہیں لیکن اس میں اہم ترین ذریعہ بارش ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پانی کے دیگر ذرائع بھی بارش ہی کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ اور پھر اس بارش کا جو پراسس ہے وہ بجائے خود حیران کن ہے۔ سورج کی حرارت سے سمندروں سے پانی بھاپ بنا کر اٹھایا جاتا ہے اور پھر فضاء میں اس بھاپ کو کثیف بادل کی شکل دے دی جاتی ہے۔ پھر ہواؤں کے فیضان سے یہ بادل دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل جاتے ہیں۔ پھر عالم بالا کی ٹھنڈک سے وہ بھاپیں ازسرنو پانی کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ پھر بارش برستی ہے تو ایک خاص حساب سے برستی ہے۔ زمین اپنی ضرورت کے مطابق اس سے سیراب ہوتی ہے اور باقی پانی ندی نالوں کی شکل میں بہتا ہوا دور تک پھیل جاتا ہے۔ اسی سے چشمے وجود میں آتے ہیں، اسی سے کنوؤں کو پانی مہیا ہوتا ہے، دریا اور ندی نالے اسی بارش سے بہتے ہیں۔ پہاڑوں پر ہونے والی بارشیں میدانی علاقوں کے پانی کے ذخیروں میں اضافہ کرتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی انتظام ہے کہ پہاڑوں پر برف کی شکل میں پانی جمتا ہے اور پھر گرمیوں میں پگھل کر ذخیرۂ آب میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ اور مزید حیران کن بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف پانی ہی نہیں برساتا بلکہ زمین کے مسامات کو اس بارش سے سیراب ہونے کیلئے اچھی طرح کھول دیتا ہے۔ اگر آسمان سے پانی نہ برستا تو زمین پر کوئی چیز باقی نہ رہتی۔ اور اگر پانی برستا لیکن زمین کے مسامات بند رہتے تو زمین روئیدگی سے محروم رہ جاتی اور انسان غذائی سروسامان سے محروم ہو جاتا۔ اس لئے بعض اہلِ علم نے زمین کے پھاڑنے سے مراد اس کے مسامات کا کھلنا لیا ہے۔ بلاشبہ یہ بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ لیکن یہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کسان زمین میں ہل چلاتا ہے، پھر اس میں تخم پاشی کرتا ہے، پھر اس پر سہاگہ پھیر کر تخم کو چھپا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عام قانون کے تحت زمین میں مدفون چیز گل سڑ کر ختم ہو جاتی ہے تو دانے کو اگنے کی بجائے کاشتکار کے اس عمل کے نتیجے میں ختم ہو جانا چاہئے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت یہ ہے کہ وہ جب بارش برساتا ہے تو زمین کے مسامات بھی کھولتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جہاں دانہ بویا گیا ہے وہاں سے زمین دراڑوں کی شکل میں پھٹتی ہے اور انہیں دراڑوں سے دانہ پھوٹ کر سوئی کی شکل میں باہر نکلتا ہے جو رفتہ رفتہ تنا بن جاتا ہے۔ اور اس طرح سے غلے کی فصل لہلہانے لگتی ہے۔

Marfat.com

مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ضروریات کو جانتا ہے اس لئے جہاں اس نے غلے پیدا کیے ہیں وہیں اس نے انگور اور ترکاریاں بھی پیدا کی ہیں۔غلہ انسان کی غذا ہے اور غذا کے بعد انسان کی ضرورت پھل ہیں۔اور سرزمینِ عرب پر رہنے والے پھلوں میں انگور کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اس لئے نمونے کے طور پر اس کا ذکر فرمایا کہ ہم نے انسان کو غلہ بھی دیا اور پھل بھی دیئے۔اور غلہ کے ساتھ بطور سالن سبزیوں اور ترکاریوں کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی ذکر فرمایا۔ان ترکاریوں میں وہ سبزیاں بھی شامل ہیں جو پکائے بغیر کھائی جاتی ہیں اور وہ بھی شامل ہیں جنہیں پکا کے کھایا جاتا ہے۔

پھر ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو فضاء میں ابھرے ہوئے درختوں سے حاصل ہوتی ہیں اور جن کو دیکھنے کیلئے سر اٹھانا پڑتا ہے۔ان میں مثال کے طور پر زیتون اور کھجور کا ذکر فرمایا ہے۔زیتون کی روغن پیدا کرنے والی چیزوں میں جو اہمیت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔اور کھجور اہلِ عرب کیلئے بیک وقت گوناگوں فوائد کا مجموعہ ہے۔یہ غذا بھی ہے اور میوہ بھی۔اسے فوری طور پر بھی کھایا جاتا ہے اور اس کو ذخیرہ بھی کیا جاتا ہے۔اور اس سے نہایت لذیز مشروب بھی بنائے جاتے ہیں۔

مختلف نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد گھنے باغات کا ذکر بھی فرمایا۔ان میں سامانِ تغذیہ بھی ہے اور کام و دہن کی لذت کا سامان بھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ عرب کی چلچلاتی دھوپ میں ٹھنڈے سائے کا ذریعہ بھی۔اور ریگستانی علاقوں میں آنکھوں کی ٹھنڈک کا سبب بھی۔

غُلْبًا ...... یہ اغلب کی جمع ہے۔موٹی گردن والے کو کہتے ہیں۔لیکن جب حدائق کی صفت آئے تو اس سے مراد سرسبز و شاداب گھنے باغات ہوتے ہیں۔

وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا اور پھل اور چارے۔خاص خاص پھلوں کا ذکر اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے لیکن یہاں فَاكِهَةً سے مراد وہ عام پھل ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں پیدا ہوتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم تھا کہ ایک روز دنیا بھر کے پھل سرزمینِ عرب میں پہنچیں گے بالخصوص حرمین کے بازار ان سے لدے ہوئے ہوں گے اس لئے عام پھلوں کا ذکر بھی فرمادیا۔ اَبًّا کے معنی نبات اور شاداب گھاس کے ہیں۔اس کا تعلق اگرچہ انسانی غذا سے نہیں بلکہ ہر طرح کے جانوروں سے ہے اور کتنے جانور ہیں جن سے گوشت، چربی، دودھ، مکھن وغیرہ سامانِ خوراک انسان حاصل کرتا ہے۔اس لحاظ سے وہ چونکہ انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور انسانی معیشت کا ذریعہ ہیں اس لئے نعمتوں کا ذکر ناتمام رہتا اگر ان جانوروں کے غذائی سامان کا ذکر نہ کیا جاتا، اس لئے اس کا ذکر فرمایا گیا۔اور شاید اسی لئے آخر میں فرمایا گیا کہ یہ سامانِ زیست ہے تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کیلئے۔یعنی تمہیں تو گوناگوں نعمتوں کی ضرورت تھی لیکن مویشیوں کیلئے بھس وغیرہ کے علاوہ شاداب گھاس سب سے بڑی نعمت ہے۔اور مویشی انسانوں کیلئے بہت بڑی ضرورت اور بہت بڑی نعمت ہیں۔تو جو غذا بہتر سے بہتر مویشیوں کیلئے مہیا کی جائے گی وہ یقیناً انسانوں پر بھی احسان کا درجہ رکھتی ہے۔

ان تمام نعمتوں کا ذکر کرنے سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنے فضل و کرم کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ایک سے ایک بڑا انعام ان پر کیا گیا ہے۔لیکن ان کو یہ سوچنے کی زحمت کرنی چاہئے کہ یہ انعامات بے سبب تو نہیں ہیں۔یقیناً ان کے بدلے میں انسانوں کی کوئی ذمہ داریاں بھی رکھی گئی ہیں۔اگر انسان ان نعمتوں کی قدر کرنا چاہتا ہے تو اسے ان ذمہ داریوں کا ادراک بھی ہونا چاہئے اور فکرمندی بھی ہونی چاہئے۔

Marfat.com

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾
وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾

(پس جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز آئے گی۔ ۳۳) اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے۔ ۳۴) اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔ ۳۵) اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے۔ ۳۶) ہر آدمی کیلئے اس دن ایسا حال ہوگا جو اس کیلئے کافی ہوگا (یعنی اس روز ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی)۔ ۳۷)

قیامت کی ہولناکی

الصَّآخَّةُ کا معنی ہے بہری کر دینے والی کڑک یا چیخ۔ مراد اس سے آخری نفخ صور کی قیامت خیز آواز ہے جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی اٹھیں گے اور میدانِ حشر کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عدالت کے کٹہرے میں جوابدہی کیلئے کھڑے کر دیئے جائیں گے۔ اس مفہوم کا حاصل جواب شرط ہے جو یہاں محذوف ہے۔ لیکن غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کی آیت کا پہلا لفظ یعنی یوم اس جواب شرط کا ظرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس روز ایک ایسی ہیبت اور ہولناکی کی کیفیت ہوگی اور انسان اپنے انجام کو سامنے دیکھ کر اس حد تک سراسیمہ ہوگا کہ اسے اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کا ہوش جاتا رہے گا۔ اس کا اپنا خاندان اور اس کے قریبی عزیز جنہیں وہ قبائلی زندگی میں اپنی قوت و عصبیت کا سامان سمجھتا تھا سب کو پہچاننے سے انکار کر دے گا۔ ہر شخص پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی، بھائی بھائی سے بھاگے گا اور ماں باپ اپنی اولاد سے اور اولاد اپنے ماں باپ سے گریزاں ہوگی۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے اجنبی بن چکے ہوں گے۔ کیونکہ جو شخص طوفان میں ڈبکیاں کھاتا ہوا موت سے لڑ رہا ہو اسے اس بات کی ہوش نہیں ہوتی کہ اس کے دائیں بائیں ڈوبنے والے کون ہیں۔ اسے فکر صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوا کنارے تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ یہ پریشانی، بیچارگی، ہیبت اور سراسیمگی کی کیفیت کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے جس سے پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ بعض اہلِ علم نے یہ سمجھا ہے کہ ہر شخص دوسرے سے اس لئے دوڑے گا کہ وہ مجھے اپنی مدد کیلئے نہ پکار لے۔ اور یا ہر شخص دوسرے سے اس لئے گریزاں ہوگا کہ ہم نے مل جل کر جو جرائم کئے ہیں کہیں ان کی گواہی کیلئے مجھے نہ بلا لیا جائے۔ ان میں سے کسی بات کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس سے صرف ہولناکی اور پریشانی کا منظر دکھانا مقصود ہے۔ یعنی آج یہ لوگ پیغمبر کے انذار سے کان بند کئے ہوئے قیامت کی بات سننے کے روادار نہیں اور ہر شخص اس کا مذاق اڑانے میں پیش پیش ہے۔ لیکن جب یہ لوگ نفخۂ ثانیہ کے بعد میدانِ حشر میں کھڑے ہوں گے تو اس وقت ان کی حالت دیدنی ہوگی۔ تب انہیں احساس ہوگا کہ آج ہمیں غرور و تکبر کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

(کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے۔ ۳۸) ہشاش بشاش، خوش و خرم۔ ۳۹) اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی۔ ۴۰) اور کلونس چھائی ہوگی۔ ۴۱) یہ کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔ ۴۲)

Marfat.com

مُسْفِرَةٌ ...... روشن اور تابناک۔ یہ اَسْفَرَ الصُّبْحُ کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ ضَاحِكَةٌ مسکرانے والے چہرے، کیونکہ یہ وُجُوْہٌ کی صفت ہے۔

مُسْتَبْشِرَةٌ ...... ہشاش بشاش۔

قیامت کے روز کافر اور مومن الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ''اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔'' اس طرح سے فرمانبردار اور نافرمان جدا جدا کر دیئے جائیں گے۔ اور ان میں سے ہر شخص اپنے چہرے سے پہچانا جائے گا کہ وہ مومن ہے یا کافر، اطاعت گزار ہے یا نافرمان، باغی ہے یا وفادار۔ ممکن ہے علامت کے طور پر ان کے چہروں کی یہ کیفیت بنا دی جائے۔ لیکن اس بات کا بھی امکان ہے کہ ان میں سے ہر شخص جب اپنے انجام کو سامنے دیکھے گا کیونکہ جنت قریب کر دی جائے گی اور مومن اسے دیکھیں گے۔ اور جہنم دھاڑ رہی ہو گی، اور کافر اسے دیکھ بھی رہے ہوں گے اور سن بھی رہے ہوں گے۔ اس منظر کو دیکھ کر چہروں پر علامتوں کا ظاہر ہونا فطری بات ہے۔ مومن جنت کو دیکھ کر شاداں اور فرحاں، ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے اور دمکتے ہوئے چہروں والے ہوں گے۔ اور کافروں کو جیسے ہی اللہ تعالیٰ کے عتاب کا سامنا ہو گا اور وہ جہنم کی صورت میں اپنے انجام کو دیکھیں گے تو ان کے چہروں پر سیاہی چھا جائے گی۔ ان کے رنگ غبار میں اٹ جائیں گے۔ اس طرح سے یہ معاملہ کھل جائے گا کہ مومن اور کافر میں کیا فرق ہے۔ آج تو کافر مومنوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی تنگدستی اور بدحالی پر پھبتیاں کستے ہیں اور غرہ یہ ہے کہ ہم یہاں جس طرح خوشحال اور عزت و وقار کے حامل ہیں قیامت کے دن بھی ہمیں اسی طرح نوازا جائے گا۔ اور یہ غریب لوگ آج بھی چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے اور پیٹ پر پتھر باندھے پھرتے ہیں قیامت کے روز بھی ان کا یہی حال ہو گا۔ اس لئے کچھ چہروں کی آب و تاب اور کچھ چہروں کی روسیاہی کا منظر دکھا کر واضح کر دیا جائے گا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اور مزید واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر پہچان نہیں سکے تو ہم واضح کئے دیتے ہیں کہ یہ جن سیاہ چہروں کو دیکھ رہے ہو یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں بڑے بڑے کافر اور فاجر تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے منکر، اس کی نعمتوں کا کفران کرنے والے اور اس کے باغی و نافرمان تھے۔ تو یہ دونوں لفظ ان کی پہچان بھی ہیں اور ان کی فردِ قرار دادِ جرم کا اظہار بھی۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیاایمان والوں کیلیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ

(۸۱)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام التَّكْوِيْرِ ہے جو اس کی پہلی ہی آیت کے لفظ كُوِّرَتْ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ گزشتہ سورۃ میں طَآمَّةُ اور صَآخَّةُ کے ناموں سے جس ہولِ قیامت کا ذکر کیا گیا ہے اس سورۃ میں اسی ہول کی پوری تصویر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ اس قربت سے گمان کیا جاسکتا ہے کہ ان کا زمانۂ نزول بھی تقریباً ایک ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

پہلی چھ آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو مردوں کو زندہ کیے جانے سے پہلے پیش آئیں گے۔ پہلی تین آیتوں میں کائنات کی بلند و بالا اور عظیم و پرشوکت مخلوقات کا جو حال ہوگا اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ مثلاً سورج بے نور ہو جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، پہاڑ زمین سے اکھڑ کر چلتے ہوئے یا اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اس کے بعد کی تین آیتوں میں یہ بیان کی گیا ہے کہ زمین کی ہر چیز پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ لوگ اپنی محبوب ترین چیزوں کو بھول جائیں گے۔ اور جنگلوں کے جانور بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے۔ کیونکہ سمندروں کی طغیانی سے فرار کے راستے بند ہو جائیں گے۔ شیر اور ہرن ساتھ ساتھ ہوں گے لیکن مشترک مصیبت نے انہیں ایک دوسرے سے بے نیاز کر دیا ہوگا۔

اس کے بعد آٹھ آیتوں میں وہ احوال بیان ہوئے ہیں جو اٹھائے جانے کے بعد مشاہدہ میں آئیں گے۔ جب روحیں از سر نو جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی۔ نامۂ اعمال کھولے جائیں گے، جرائم کی بازپرس ہوگی، آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے۔ تو دوزخ اور جنت لوگوں کی نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گی۔ جہنم دہکائی جائے گی، جنت نیک لوگوں کے قریب لائی جائے گی۔ اس دن ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنے رب کے حضور کیا لے کے آیا ہے۔

اس کے بعد رسالت کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے ستاروں کے ٹوٹنے اور شب کی تاریکی کے بعد صبح کے نمودار ہونے سے استشہاد کیا گیا ہے کہ قرآن کاہنوں کی خرافات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے جو عرش والے کے نزدیک بڑا مقام و مرتبہ رکھتا ہے، تمام ملائکہ اس کی اطاعت کے پابند ہیں، وہ نہایت معتمد اور دیانتدار ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد مخالفین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جو رسول تم کو یہ کلام سنا رہا ہے وہ کوئی خبطی اور دیوانہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور نہایت فرزانہ ہے۔ نہ یہ کسی شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ ہے بلکہ خدا کے بھیجے ہوئے اس فرشتے کا بیان ہے جسے محمد ﷺ نے کھلے آسمان کے افق پر دن کی روشنی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ غیب دانی کا حریص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے عائد کئے ہوئے ایک فرض کی انجام دہی کر رہا ہے۔ یہ کلام جو تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمہارے لئے یاد دہانی ہے۔ اس کیلئے وہی سینے کھلتے ہیں جو سیدھی راہ پر چلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور یہ حوصلہ انہیں کے اندر پیدا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق اس کے مستحق ہوں گے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٢٩	سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ (٨١)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿١﴾ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ﴿٢﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ
سُيِّرَتْ ﴿٣﴾ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿٤﴾ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴿٥﴾ وَ
اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿٦﴾ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴿٧﴾ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ
سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿١٠﴾ وَاِذَا
السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿١١﴾ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿١٢﴾ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿١٣﴾
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿١٤﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿١٥﴾ الْجَوَارِ
الْكُنَّسِ ﴿١٦﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿١٧﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿١٨﴾ اِنَّهٗ
لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿٢٠﴾
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿٢١﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ
بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ
بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾

Marfat.com

رکوع: ۱۔ (جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ ۱) اور جب ستارے بکھر جائیں گے یا بے نور ہو جائیں گے۔ ۲) اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ ۳) جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ ۴) جب وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے۔ ۵) اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے۔ ۶) جبکہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی۔ ۷) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔ ۸) کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی۔ ۹) اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ ۱۰) اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ ۱۱) اور جب جہنم بھڑکا دی جائے گی۔ ۱۲) اور جب جنت قریب لائی جائے گی۔ ۱۳) اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ ۱۴) پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے ستاروں کی۔ ۱۵) سیدھے چلنے والوں اور چھپ جانے والے ستاروں کی۔ ۱۶) اور رات کی جب وہ جانے لگے۔ ۱۷) اور صبح کی جب وہ سانس لے۔ ۱۸) یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ ۱۹) جو بڑی قوت والا ہے اور عرش والے کے ہاں بہت بلند مرتبہ ہے۔ ۲۰) اس کی اطاعت کی جاتی ہے وہ نہایت امین بھی ہے۔ ۲۱) اور تمہارا صاحب مجنون نہیں ہے۔ ۲۲) اور اس نے اس کو کھلے افق پر دیکھا ہے۔ ۲۳) وہ غیب کے معاملہ میں بخیل نہیں ہے۔ ۲۴) یہ کسی شیطانِ مردود کا قول نہیں ہے۔ ۲۵) تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو۔ ۲۶) یہ تو سارے جہاں والوں کیلئے ایک نصیحت ہے۔ ۲۷) تم میں سے ہر اس شخص کیلئے جو سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے۔ ۲۸) اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ چاہے گا جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ ۲۹)

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱

(جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ ۱)

وقوعِ قیامت کے وقت سورج کا حال

تکویر کا معنی کسی شے کو لپیٹ دینا ہے۔ کَوَّرَ الْعِمَامَةَ عَلٰى رَاسِهٖ ''اس نے عمامہ اپنے سر پر لپیٹ لیا'' لپیٹ لینا بے نور کر دیئے جانے کا استعارہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز سورج کو بے نور کر دیا جائے گا۔ سورج کائنات کی سب سے عظیم اور بینظیر مخلوق ہے۔ حادثۂ قیامت کی وسعت اور اہمیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ کائنات کی سب سے عظیم چیز کی بساط کو لپیٹ دیا جائے گا۔ یعنی جس طرح عمامہ لپیٹے جانے سے پہلے پھیلا ہوا ہوتا ہے اور پھر سر کے گرد لپیٹے جانے سے اس کا پھیلاؤ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سورج کی روشنی جو سورج سے نکل کر سارے نظامِ شمسی پر پھیلتی ہے اسے عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا۔ یعنی اس کی روشنی پھیلنا بند ہو جائے گی اور سورج بے نور رہ جائے گا اور سارا عالم تیرہ و تار ہو جائے گا۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲

(اور جب ستارے بکھر جائیں گے یا بے نور ہو جائیں گے۔ ۲)

Marfat.com

ستاروں کا حال

انکدار کا معنی منتشر ہو جانا بھی ہے اور تاریک ہو جانا بھی۔اس لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ قیامت کے برپا ہونے سے جب نظام کی ہر بندش ڈھیلی پڑ جائے گی اور ہر بندھن ٹوٹ جائے گا تو ستارے اپنے اپنے مدار اور مقام پر جس بندش میں بندھے ہوئے ہوں گے وہ کھل جائے گی۔اور اس طرح سب ستارے اور سیارے کائنات میں منتشر ہو جائیں گے۔اور بے نور ہو جانے کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورج ہی کی بساط لپیٹ دی جائے گی تو جتنے بلب اور قمقمے اس کے نظام سے وابستہ ہیں وہ سب آپ سے آپ بے نور ہو جائیں گے۔

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ﴿۳﴾

(اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ ۳)

پہاڑوں کا حال

جس طرح آسمان کی نمایاں اور شاندار مخلوقات سورج اور ستارے ہیں۔اسی طرح زمین کی سب سے نمایاں شاندار اور پرہیبت مخلوق پہاڑ ہیں۔یہ چونکہ زمین میں بہت مضبوطی سے گڑے ہوئے ہیں اس لئے عرب انہیں غیر فانی اور اٹل سمجھتے تھے۔چنانچہ جب انہیں قیامت کی تفصیلات بتائی جاتیں تو وہ حیران ہو کر پوچھتے کہ کیا قیامت آنے سے پہاڑ بھی اکھڑ جائیں گے۔اور جب انہیں اثبات میں جواب دیا جاتا تو وہ اسے خلافِ عقل سمجھتے ہوئے مذاق اڑاتے۔اس لئے زمین کی اس نمایاں مخلوق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ وقوعِ قیامت سے جب زمین کی کشش ختم ہو جائے گی جس کی بدولت پہاڑ جمے ہوئے ہیں تو وہ بھی اکھڑ جائیں گے۔اس آیتِ کریمہ میں تو یہ فرمایا کہ وہ چلا دیے جائیں گے۔لیکن سورۃ القارعہ میں فرمایا گیا ہے کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اپنا وزن بالکل کھو دیں گے تو کہیں وہ اس طرح چلتے ہوئے دکھائی دیں گے جیسے فضاء میں بادل چلتے ہیں۔اور کہیں وہ ریزہ ریزہ ہو کر روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔کیونکہ پہاڑوں کا ہر پتھر دوسرے پتھر سے اور ہر ذرہ دوسرے ذرے سے الگ ہو جائے گا۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿۴﴾

(جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ ۴)

اَلْعِشَارُ ، عُشَرَاءُ کی جمع ہے۔اس اونٹنی پر بولا جاتا ہے جو دس ماہ کی گابھن ہو،یعنی بچہ جننے کے بالکل قریب ہو۔

محبوب چیزوں سے غفلت

جس طرح کائنات کی عظیم اور مضبوط مخلوقات اپنا وزن کھو دیں گی اور اپنے مدار سے نکل جائیں گی اسی طرح اس دن قیامت کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ انسان اپنی محبوب سے محبوب چیزوں سے بھی غافل ہو جائے گا اور اس کے دل سے ان کی وقعت نکل جائے گی۔کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب اس کی اپنی جان کے لالے پڑتے ہیں تو وہ قیمتی متاع سے بھی لاپرواہ ہو جاتا ہے۔چنانچہ اسی فطری اصول کے تحت

Marfat.com

اہلِ عرب کے مذاقِ طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اہلِ عرب کے یہاں چونکہ سب سے قیمتی چیز اونٹ ہیں، خاص طور پر وہ اونٹنیاں انہیں نہایت عزیز اور محبوب ہوتی ہیں جن کے حمل پر دس ماہ گزر چکے ہوں۔ ایسی اونٹنیوں کا ان کے مالک بہت دھیان رکھتے اور ان کی نگہداشت کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے مستقبل کی بہت سی آرزوؤں کا ان پر انحصار ہوتا تھا۔ لیکن قیامت کی ہولنا کی ملاحظہ ہو کہ عرب اپنی ایسی قیمتی متاع سے بھی غافل ہو جائیں گے۔ اس میں ایک طرح سے دنیا کی محبت میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بھی متوجہ کرنا ہے کہ جس مال و دولت پر تم اس قدر بھروسہ کر چکے ہو، قیامت کے پہلے ہی مرحلے میں تم اس سے بالکل بے نیاز ہو جاؤ گے۔ کیونکہ تمہیں جس ہولنا کی سے واسطہ پڑے گا وہ تمہیں اپنی ذات کے سوا کسی اور طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہیں دے گی۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵

(جب وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے۔ ۵)

وحشی جانوروں کا حال

انسانوں میں رنج و غم کو محسوس کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ اس لئے وہ ایسے ہر موقع پر شدید تاثر کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ لیکن قیامت کی ہولنا کی کا عالم یہ ہوگا کہ صرف انسان ہی نہیں، وحشی اور جنگلی جانور بھی بری طرح اس کی گرفت میں ہوں گے۔ وحشی جانوروں کی سرشت یہ ہے کہ وہ کبھی اپنی وحشت اور درندگی سے باز نہیں آتے۔ بچھو کو ڈوبتے ہوئے نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیا جائے تو وہ اس حال میں بھی ڈنک مارنے سے باز نہیں آتا۔ اور جن درندوں کی گزر بسر گوشت خوری پر ہے وہ کبھی اپنے شکار کو دیکھ کر صبر نہیں کر سکتے۔ لیکن جب خطرہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو درندے بھی اپنی سرشت بھول جاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہوئے بھی کسی پناہ کی جگہ میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب کا پانی پھیل جائے تو جنگلی جانور سراسیمگی کی حالت میں جس ٹیلے اور ٹیکرے پر انہیں پناہ ملنے کی توقع ہو وہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ شیر کے ساتھ ہرن کھڑا ہوتا ہے لیکن شیر اس پر حملہ نہیں کرتا۔ بھیڑیا بے ضرر ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی حال قیامت کے دن ہوگا کہ سب جنگلی اور وحشی جانور جہاں انہیں جگہ ملے گی اکٹھے ہو جائیں گے کہ شاید اس طرح اس ہولنا کی کا سامنا کر سکیں۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶

(اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے۔ ۶)

سمندر بھڑک اٹھیں گے

تَسْجِیْر، سُجِّرَتْ سے ماضی مجہول ہے۔ تَسْجِیْر عربی زبان میں تنور کو ایندھن سے بھر کر آگ دہکانے کیلئے بولا جاتا ہے۔ سمندر اگرچہ پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں آگ لگنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اور پانی تو ویسے بھی آگ بجھانے کیلئے ہے، آگ قبول کرنے کیلئے نہیں۔ لیکن جب ہم اس حالت کو دیکھتے ہیں جو قیامت میں پیدا ہوگی تو پھر یہ بات سمجھنا کچھ مشکل نہیں، کیونکہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن جیسی دو گیسوں سے ایک تناسب کے ساتھ مل کر بنا ہے جبکہ یہ دونوں گیسوں میں سے ایک آگ کو بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اٹھنے والی

Marfat.com

ہے۔لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حیران کن قوت ہے جس نے ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے۔قیامت کے دن چونکہ ہر مرکب اجزاء میں بدل جائے گا تو پانی کے اجزاء بھی الگ الگ ہو جائیں گے۔چنانچہ پانی کے گیسوں میں بدل جانے کے بعد آگ بن کر بھڑک اٹھنا ان گیسوں کے طبعی خواص کا لازمی نتیجہ ہے۔اس لحاظ سے سمندروں کا بھڑکا دیا جانا قیامت کے حالات کی صحیح ترجمانی ہے۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴿۷﴾

(جبکہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی۔ ۷)

ظہورِ قیامت کے بعد کے احوال

بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''اور جب جانیں جسموں سے جوڑ دی جائیں گی۔'' اس ترجمے کے لحاظ سے مفہوم بالکل واضح ہے کہ انسان از سرِ نو اسی طرح زندہ کئے جائیں گے جس طرح وہ دنیا میں مرنے سے پہلے جسم و روح کے ساتھ زندہ تھے۔لیکن ہم نے اوپر جو ترجمہ کیا ہے اس کے لحاظ سے اس کا مفہوم کچھ مختلف ہے۔اور دونوں ترجموں میں یہ بات تو واضح ہے کہ یہاں سے وہ باتیں شروع ہو رہی ہیں جن کا تعلق ظہورِ قیامت کے بعد کے احوال سے ہے جن میں نفوس کی تزویج بھی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کی اعمال وعقائد کے اعتبار سے الگ الگ گروہ بندی کی جائے گی۔یعنی دنیا میں میں تو نیک و بد دونوں ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں،لیکن جس طرح نیکی اور برائی یکساں نہیں اور دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں،اسی طرح نیک اور بد بھی ہمیشہ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ایک ایسا دن آنے والا ہے جب لوگوں کی درجہ بندی ان کے ایمان واخلاق پر ہوگی۔صاحبِ معارف القرآن نے ایک حدیث بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہ گروہ بندی خود مومنوں کے اندر اعمال واخلاق کے اعتبار سے بھی ہوگی اسی طرح اعمال ہی کے لحاظ سے کفار میں بھی مختلف قسم کے گروہ ہو جائیں گے۔انہوں نے بیہقی سے بروایت حضرت نعمان بن بشیرؓ حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت کیا ہے کہ جو لوگ ایک جیسے اعمال کرتے ہوں گے وہ ایک جگہ کر دیئے جائیں گے۔اعمالِ حسنہ ہوں یا سیئہ۔مثلاً اچھے مسلمانوں میں علمِ دین کی خدمت کرنے والوں میں علماء ایک جگہ،عباد اور زہاد ایک جگہ۔جہاد کرنے والے غازی ایک جگہ،صدقہ وخیرات میں خصوصیت رکھنے والے ایک جگہ۔اسی طرح بد اعمال لوگوں میں چور ڈاکو ایک جگہ۔زنا کار فحاش ایک جگہ۔دوسرے خاص خاص گناہوں میں باہم شریک رہنے والے ایک جگہ ہو جائیں گے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ محشر میں ہر شخص اپنی قوم کے ساتھ ہوگا۔مگر یہ قومیت نسبی یا وطنی نہیں بلکہ عمل وعقیدہ کے اعتبار سے ہوگی۔نیک عمل کرنے والے ایک جگہ اور بد عمل والے دوسری جگہ ہوں گے۔اور اس پر آیتِ قرآنی سے استشہاد فرمایا وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً یعنی محشر میں لوگوں کے بڑے گروہ تین ہوں گے۔جیسا کہ سورۃ واقعہ کی آیت میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے کہ ایک گروہ سابقین اولین کا ہوگا،دوسرا اصحاب الیمین کا۔یہ دونوں گروہ نجات پانے والے ہوں گے۔تیسرا گروہ اصحاب الشمال کا ہوگا جو کفار اور فجار پر مشتمل ہوگا۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿۸﴾ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾

(اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔ ۸) کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی۔ ۹)

Marfat.com

مظلوم بچیوں کی دادرسی

ان دونوں آیتوں کے اسلوب میں جو غضب پنہاں ہے وہ ان الفاظ کے ایک ایک حرف سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پروردگار نہایت جلال میں ہے۔ چاروں طرف سناٹا اور پروردگار کے جلال کی ہیبت برس رہی ہے کہ اچانک ان معصوم بچیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا جاتا ہے جن کو ان کے سنگدل باپوں نے زندہ درگور کر دیا تھا۔ ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ مونث کیوں پیدا ہوئیں۔ کیونکہ عرب کے بعض نہایت اجڈ قبیلوں میں جہالت نے جو مختلف نتائج پیدا کیے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ عرب میں قحط سالی کے باعث معاش کا حصول ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ بنابریں کثرتِ عیال تنگدستی میں ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ لڑکے کی پیدائش پر یہ سوچا جاتا کہ لڑکا بڑا ہو کر حصولِ معشیت میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کا وجود اہلِ خانہ کیلئے ایک رحمت ہے۔ لیکن لڑکی ایک بوجھ کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ پہلے ہی دن یا جب بھی موقع ملتا اس بوجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کی جاتی۔

ایک خیال یہ بھی تھا کہ بیٹا تو اپنے گھر اور قبیلے کیلئے جوان ہو کر قوت اور دفاع کا سامان بنتا ہے۔ لیکن بیٹیاں دفاع میں معاون تو کیا ہوں گی، البتہ خود انہیں سنبھالنا پڑتا ہے۔ اور عرب جیسے ملک میں جس میں قبائلی لڑائیاں آئے دن کا معمول تھیں۔ ان میں بیٹیوں کو پالتے رہنا بجائے خود کوئی عقل کی بات نہ تھی۔ اس لئے ان سے بچپن ہی میں پیچھا چھڑا لیا جاتا تھا۔

یہ خیال بھی تھا کہ جب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر شبخون مارتا ہے تو جو لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی ہیں انہیں لے جا کر یا تو لونڈیاں بنا لیا جاتا ہے اور یا ان سے پیشہ کرایا جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں چونکہ غیرت کیخلاف تھیں اس لئے بیٹی کے وجود ہی کو غیرت کیلئے چیلنج سمجھ کر ختم کرنے میں عافیت سمجھی جاتی تھی۔

اس آیتِ کریمہ میں نہایت برہمی سے ظلم کرنے والے باپوں سے نہیں بلکہ مظلومیت کی تصویر بیٹیوں کو بلا کر پوچھا جائے گا کہ تمہیں کس جرم میں قتل کیا گیا۔ اس طرح سے قیامت کا مزاج واضح کیا جا رہا ہے کہ دنیا میں جن مظلوموں کو انصاف نہ مل سکا کیونکہ کوئی ان کی طرف سے انصاف طلب کرنے والا نہ تھا اور باپوں کے وسیع اختیارات کی وجہ سے کسی کو زبان کھولنے کا یارا بھی نہ تھا۔ سب سے پہلے ایسے مظلوموں کی فریاد رسی کی جائے گی۔ اور اسی سے قیامت کے وجود کے یقینی ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر عدل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور دنیا میں پوری طرح اس کا بروئے کار آنا ممکن نہیں اور ظالم کو ظلم کی سزا اور مظلوم کو انصاف بھی پوری طرح دنیا میں ملنے کا کوئی سوال نہیں۔ بنابریں ضروری ہے کہ قیامت کا دن آئے تاکہ کوئی مظلوم انصاف کے بغیر نہ رہ جائے۔

اس آیتِ کریمہ نے نہایت تیکھے انداز میں ان ظالم باپوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا جو یہ سمجھتے تھے کہ اس ظلم کا ہم سے کبھی سوال نہیں ہوگا۔ پھر جیسے جیسے اخلاقی تعلیم و تربیت اسلام کے حوالے سے آگے بڑھتی گئی اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات نے اولاد کے حقوق کے حوالے سے بیٹیوں کے حقوق پر زور دیا اور ان کے حُسنِ تعلیم و تربیت کو آخرت میں سرخروئی کا ذریعہ ٹھہرایا تو نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جیسے جیسے لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے گئے، ویسے ویسے عورت کی عزت میں اور ان کے حقوق کے تحفظ میں نہ صرف اضافہ ہوتا گیا بلکہ اس کا احساس بھی بڑھتا گیا اور قانونی طور پر اس کو تحفظ بھی دیا گیا۔ اخلاقی طور پر اسے گناہِ کبیرہ اور ظلمِ عظیم ٹھہرایا گیا۔ اور فقہی طور پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ

Marfat.com

جب حمل چار ماہ کا ہو جائے اس وقت اسے بالقصد ضائع کرنا بھی اسی حکم میں ہے۔کیونکہ چوتھے مہینے میں حمل میں روح پڑ جاتی ہے اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے۔اسی طرح جو شخص کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائے اور اس سے بچہ ساقط ہو جائے تو باجماع امت مارنے والے پر اس کی دیت میں غرہ واجب ہے۔اور اگر بطن سے باہر آنے کے وقت وہ زندہ تھا پھر مر گیا تو پوری دیت واجب ہوگی۔اور چار ماہ سے پہلے اسقاطِ حمل بھی اضطراری حالات کے بغیر حرام ہے۔

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾

(اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ ۱۰)

اعمال نامے سب کے سامنے

صُحُفُ سے مراد لوگوں کے اعمال نامے ہیں۔ان کے کھولے جانے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نے جو کچھ دنیا میں اعمال کی صورت میں کیا ہے اسے ایک نظم کے تحت ضبطِ تحریر میں لایا جاتا رہا ہے۔اور یہی تحریری روزنامچہ نامۂ عمل کہلاتا ہے اور اسے قیامت کے دن ہر شخص کے سامنے لا کر کھول دیا جائے گا۔اور اسے یہ کہا جائے گا کہ اسے پڑھ کر دیکھو کہ تم دنیا میں کیا کچھ کر کے آئے ہو۔وہ جب اسے دیکھے گا تو چیخ اٹھے گا کہ ہائے یہ کیسا اعمال نامہ ہے جس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات چھوٹنے نہیں پائی۔میری زندگی کا ہر عمل اس میں محفوظ کر لیا گیا ہے اور آج مجھے ہر عمل کے بارے میں جوابدہی کرنی ہے۔

وَإِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾

(اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ ۱۱)

آسمان کی کیفیت

كَشْطٌ ...... کے اصل معنی کسی بھی چیز کے اوپر کے حصے کو اتار لینے کے ہیں جس نے اسے ڈھانپ رکھا ہو۔اسی مناسبت سے ذبیحہ کی کھال اتار لینے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔اونٹ کی کھال کھینچ لینے کے معنی میں تو یہ شائع وذائع ہے۔مقصود اس سے یہ ہے کہ آسمان کائنات کیلئے کھال اور پوست کی مانند ہے۔جب آسمان کو ہٹا دیا جائے گا تو یوں سمجھئے کہ کائنات کا پردہ اتر جائے گا۔جو کچھ اب تک نگاہوں سے پوشیدہ تھا وہ سب عیاں ہو جائے گا۔اس وقت تو ہمیں صرف خلاء نظر آتا ہے یا چاند، سورج اور ستارے، لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کی سلطنت اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سب کے سامنے کھل کر آجائے گی۔

وَإِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾

(اور جب جہنم بھڑکا دی جائے گی۔ ۱۲)

Marfat.com

جہنم کا بھڑک اٹھنا

تسعیر کے معنی بھڑکانے اور دہکانے کے ہیں۔ جہنم تیار تو پہلے سے ہی ہوگی لیکن جب مجرموں کے اس میں ڈالنے کا وقت آئے گا تو اس وقت اسے خاص طور پر بھڑکا دیا جائے گا۔ قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم مجرموں کو پہچانے گی اور دور سے ہی انہیں دیکھ کر دھاڑے گی۔ اسی طرح یہ بھی قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور پتھر جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ چنانچہ جیسے ہی اس میں انسان ڈالے جائیں گے تو ایندھن مل جانے سے اور بھڑکے گی۔ یہ چیزیں چونکہ متشابہات سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے کوئی حتمی بات تو کہنا مشکل ہے لیکن کبھی خیال آتا ہے کہ جس طرح ایک کمرہ گیس سے بھرا ہوا ہو تو دیکھنے والے کو بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ اس میں آگ ہے۔ لیکن دیا سلائی دکھانے کی دیر ہوتی ہے کہ وہ بھک سے بھڑک اٹھتا ہے۔ ممکن ہے جہنم کی بھی کوئی ایسی کیفیت ہو۔ واللہ اعلم۔

وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾

(اور جب جنت قریب لائی جائے گی۔ ۱۳)

جنت کا قرب

جنت تو پہلے سے موجود ہوگی۔ البتہ جب لوگوں کی ایمان وعمل کے اعتبار سے درجہ بندی ہوجائے گی تو تب وہ ان کے قریب لائی جائے گی یعنی اس کی نقاب کشائی ہوگی۔ اور قریب لانے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ کہیں دور ہوگی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے سے قریب ہوگی لیکن اب اسے اور قریب لایا جائے گا اور یہ اہلِ جنت کا اعزاز ہوگا۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں سورۃ ق میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ''اور جنت خدا ترسوں کیلئے قریب لائی جائے گی درآنحالیکہ وہ کچھ دور بھی نہ ہوگی۔''

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾

(اس وقت ہر شخص کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ ۱۴)

ہر نفس کا احساسِ ماحضر

گزشتہ آیات میں وقوعِ قیامت کے بعد جن احوال کے ظہور پذیر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے ان احوال کو دیکھ لینے کے بعد ہر شخص جان لے گا کہ واقعی قیامت آگئی، اور میں جن باتوں کو محض ایک واہمہ یا مذاق سمجھتا تھا وہ حقیقت بن کر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میرا نامۂ عمل میرے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ جنت بھی موجود ہے اور جہنم بھی۔ اب کوئی چیز صیغۂ راز میں نہیں رہی۔ نامۂ عمل دیکھ کر میں جان گیا ہوں کہ میں اپنے ساتھ اپنے رب کے حضور پیش کرنے کیلئے کیا لے کر آیا ہوں۔ اچھے اعمال کا انجام بھی سامنے ہے اور برے اعمال کا بھی۔ اب جیسے کچھ اعمال میں اپنے ساتھ لایا ہوں اس کے مطابق انجام سے دوچار کیا جاؤں گا۔

Marfat.com

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾
وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾

(پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے ستاروں کی۔ ۱۵) سیدھے چلنے والوں اور چھپ جانے والے ستاروں کی۔ ۱۶) اور رات کی جب وہ جانے لگے۔ ۱۷) اور صبح کی جب وہ سانس لے۔ ۱۸) یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ ۱۹)

خُنَّسِ جمع ہے خَانِسٌ کی۔ اس کا معنی ہے آگے بڑھ کر پیچھے ہٹ جانے والے۔ یعنی ظاہر ہو کر غائب ہو جانے والے اور نمایاں ہو کر روپوش ہو جانے والے۔

اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ جواری کے معنی چلنے والے کے ہیں۔ اور کُنَّسٌ جمع ہے کَانِسٌ کی۔ اس کا معنی ہے چھپ جانے والے۔ یعنی ستارے اپنے مدار میں چلے اور چل کر اپنے ٹھکانے میں روپوش ہو گئے۔

اشرافِ قریش کے پروپیگنڈے کا جواب

یہ درحقیقت اشرافِ قریش کے پروپیگنڈے کا جواب اور ان کے ایک وہم کی تردید ہے۔ ان کا گمان یہ تھا اور وہ اسی کو لوگوں کے ورغلانے کیلئے استعمال کر رہے تھے کہ یہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں، بلکہ یہ ہمارے کاہنوں کی طرح کے ایک کاہن ہیں۔ جس طرح کاہنوں کا تعلق جنات سے ہوتا ہے جو ان پر غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کا رابطہ بھی نعوذباللہ من ذلک کسی شیطان سے ہے جو ان پر اپنی باتیں القاء کرتا ہے اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی وحی کے نام سے ہمارے سامنے پیش کرتے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رسول بتاتے ہیں تاکہ ہم ان کی اطاعت کرنے پر مجبور ہو جائیں اور قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب سمجھ کر اس کے سامنے سر جھکا دیں۔ یہ محض ایک فریب ہے جو ہمیں دیا جا رہا ہے۔ اور پھر بار بار عذاب کے ذکر سے اور آخرت کا ڈراوا دے کر ہمیں ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ قرآنِ کریم نے نہایت محکم انداز میں اس کی تردید کی ہے۔ اسی لئے اس کا آغاز ہی "فَلَآ" سے کیا ہے۔ اس کا تعلق "اُقْسِمُ" سے نہیں۔ یعنی اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں قسم نہیں کھاتا۔ بلکہ اس کا تعلق مخاطب کے زعم اور وہم سے ہے۔ یعنی تم جو کچھ سمجھتے ہو، میں اس سے انکار کرتا ہوں اور اس کی نہایت محکم انداز میں تردید قسم کی صورت میں کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ستاروں کی قسمیں کھائی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ستاروں کی قسموں سے کس چیز کی تردید کرنا مقصود ہے۔ میں اس سے پہلے واضح کر چکا ہوں کہ کفار آنحضرت ﷺ کو رسول کی بجائے ایک کاہن قرار دے رہے تھے۔ چنانچہ قسموں کے ذریعے اسی کی تردید کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ کہانت سے متعلق چند باتیں ذہن نشین کر لی جائیں۔ کاہنوں کے مزعومہ علمِ غیب کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ ایک ان ستاروں کے مؤثر بالذات ہونے کے تصور پر۔ اور دوسرے اس وہمِ باطل پر کہ آسمانوں کے اندر ایسے ٹھکانے ہیں جن میں بیٹھ کر جنات غیب کی باتیں سنتے اور پھر ان کو پہنچاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ستاروں کی مذکورہ صفات کے حوالے سے قسمیں کھا کر ان دونوں باتوں کی تردید فرمائی

Marfat.com

ہے۔ یہ سمجھنا کہ ستارے مؤثر بالذات ہیں اور وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں یہ سراسر ایک وہم باطل ہے۔ اس لئے کہ ستارے اللہ تعالیٰ کے حکم سے طلوع ہوتے، اسی کے حکم سے غروب ہوتے، اسی کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق فرائض بجالاتے۔ اور پھر اس طلوع وغریب اور ایاب و ذہاب میں اوقات کی ایسی پابندی کے پابند ہیں کہ منٹ اور سیکنڈ کا بھی فرق پیدا نہیں کرسکتے۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ جو شخص بھی علمِ نجوم سے کچھ بھی تعلق رکھتا ہے وہ اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ اور یہ اس بات کی واضح شہادت ہے کہ وہ اس کائنات کے نظام میں مؤثر بالذات عناصر کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک بالاتر حکیم وقدیر کے ہاتھوں میں مسخر ہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
جو خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

دوسرے وہم کی تردید کیلئے قرآنِ کریم نے جابجا ایک حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ جہلائے عرب میں یہ بات جو مشہور ہوگئی ہے اور اس نے ان کے عقیدے کی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ کاہنوں کا تعلق جنات سے ہے اور جنات آسمان پر جاکر گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب ان کے کانوں میں کسی فیصلے کی بھنک پڑتی ہے یا وہ چوری چھپے فرشتوں کی باتیں سن لیتے ہیں تو آکر کاہنوں کو مبالغوں کے ساتھ خبر دیتے ہیں اور کاہن آگے اپنی غیب دانی کی دکان چلاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بتایا کہ آسمان کے قرب وجوار میں ایسے کوئی ٹھکانے نہیں ہیں جہاں سے استراقِ سماع اور تجسسِ غیب کی کوشش کی جاسکے۔ بلکہ ایسی برجیاں اور دیدبان بنے ہوئے ہیں جہاں سے ان جنات اور شیاطین پر شہابِ ثاقب برستے ہیں۔ اور جو قریب جانے کی کوشش کرتا ہے وہ اس کا نشانہ بن جاتا ہے۔ ان قسموں میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ستارے شیاطین کے تعاقب میں آگے بڑھتے ہیں اور پھر ایک برقِ خاطف کی طرح لپکتے ہیں اور ہدف کو بھسم کرکے پھر اپنے ٹھکانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

ان دونوں باتوں کی تردید کرکے گویا اس بات کو ثابت کیا ہے کہ کاہنوں کا تمام تر کاروبار دو بنیادوں پر کھڑا ہے اور یہ دونوں اپنی کوئی اصل نہیں رکھتیں۔ محمد ﷺ کاہن نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ ان کا تعلق کسی جن یا شیطان سے نہیں، جو ان کے ذہن میں خرافات القاء کرتا ہو۔ بلکہ ان پر جو کتاب اترتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ ایک معزز فرستادہ کی معرفت آپؐ پر نازل کیا جاتا ہے۔ اور وہ فرستادہ اور پیغامبر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نہایت مقرب ومکرم ہے اور پھر اس کے بعد ان کی چند صفات بیان کی گئی ہیں۔

بعض دیگر اہلِ علم نے ان قسموں کا مفہوم نہایت سہل انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اہلِ مکہ آنحضرت ﷺ کو چونکہ نبی ماننے سے انکاری تھے اور وہ کسی طرح بھی اس کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھے کہ آپؐ پر اللہ تعالیٰ کا کلام اترتا اور آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اس لئے جب وہ لوگوں کو دیکھتے کہ وہ قرآنِ کریم کی فصاحت وبلاغت اور آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت سے متاثر ہورہے ہیں تو انہیں مطمئن کرنے کیلئے اس طرح کی باتیں کہتے کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں بلکہ آپؐ کو جنون کا دورہ پڑتا ہے اور اس کیفیت میں آپ جو محسوس کرتے ہیں اسے وحی گمان کرلیا جاتا ہے۔ اور یا کوئی شیطان ہے جو آپ کے دماغ میں اس طرح کی باتیں القاء کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی تردید میں یہ قسمیں کھاکر فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن نہ کسی دیوانے کی بڑ ہے اور نہ کوئی شیطانی وسوسہ ہے اور نہ آپ کو کسی بات کا وہم ہوا ہے۔ بلکہ یہ آپ کا مشاہدہ ہے، ایسے حال میں کہ جب تارے چھپ گئے تھے، رات رخصت ہوگئی تھی اور صبح روشن ہوگئی تھی۔ اس وقت کھلے آسمان پر آپ نے اللہ تعالیٰ کے فرشتے کو دیکھا ہے جس کا نام جبرائیل ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے عظیم فرشتے اور پیغام لانے والے ہیں۔ تو آپ نے اس پیغام کو

Marfat.com

بیداری اور پورے ہوش میں سنا اور لانے والے کو کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ اور پھر اس کے بعد اس پیغامبر کی اللہ تعالیٰ نے چند صفات بیان فرمائیں تاکہ اشرافِ قریش کو اندازہ ہو کہ قرآنِ کریم کس اہتمام سے نازل ہو رہا ہے اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے عظیم رسول ہیں۔

یاد رہے کہ پیشِ نظر آیت میں قرآنِ کریم کو اس بزرگ پیغامبر کا قول قرار دیا گیا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ قرآنِ کریم اس پیغامبر یعنی فرشتے کا اپنا کلام ہے۔ کیونکہ پیغامبر کا لفظ ہی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے کافی ہے۔ یہ کلام اس کا ہے جس کا وہ پیغامبر ہے۔ یعنی یہ کلام دراصل اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے۔ سورۃ الحاقۃ میں قرآنِ مجید کو نبی کریم ﷺ کا قول کہا گیا ہے۔ دونوں جگہوں میں مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کی زبان سے آنحضرت ﷺ تک پہنچتا تھا، اس لئے اسے حضرت جبرائیل علیہ السلام کا قول قرار دیا گیا۔ اور لوگوں تک یہ کلام آنحضرت ﷺ کی زبان سے ادا ہوتا تھا، اس لئے اسے آپؐ کا قول قرار دیا گیا۔ کیونکہ قول اسے کہتے ہیں جو زبان سے نکلتا ہے، چاہے وہ کسی اور کا کلام ہو۔ اس لئے یہاں اس اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا کلام ہے۔

ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾

(جو بڑی قوت والا ہے اور عرش والے کے ہاں بہت بلند مرتبہ ہے۔ ۲۰) اس کی اطاعت کی جاتی ہے وہ نہایت امین بھی ہے۔ ۲۱)

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی صفات

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی پہلی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ بڑی قوت والے ہیں۔ سورۃ نجم میں آپ کو شدید القویٰ کہا گیا ہے۔ اس کا مفہوم بھی یہی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ وہ فرشتہ جو اللہ تعالیٰ کا کلام لے کر اترتا ہے وہ نہایت زور اور قوت والا ہے۔ شیطانی قوتوں کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس کو مرعوب یا مغلوب یا متاثر کرسکیں۔ اور جب وہ کلام خداوندی کو لے کر اترتے ہیں اس میں سے کسی چیز کو اچک لیں۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ عرش والے کے ہاں بہت بلند مرتبہ ہے۔ نہایت تقرب اور رسوخ رکھنے والا ہے اسے بارگاہِ حق میں براہِ راست رسائی حاصل ہے۔ کوئی فرشتہ اس کے احکام سے سرِ مو انحراف نہیں کرسکتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو پورے اختیار اور اقتدار کے ساتھ نافذ کرتا ہے۔

ثَمَّ اَمِيْنٍ ...... ثَمَّ، کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کیلئے بھی آتا ہے اور کسی صفت کے ذکر سے پہلے اس پر زور دینے کیلئے بھی آتا ہے۔ اور یہاں اسی مقصد کیلئے لایا گیا ہے۔ یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی صفت امین سے پہلے ثَمَّ کو ذکر کرکے اس صفت کی طرف خاص توجہ دلانا مقصود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صفت ہی درحقیقت اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول کے پاس جو کچھ لاتے ہیں اس میں نہ کسی ملاوٹ کا کوئی شائبہ ہوتا ہے، نہ کسی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اپنی اصل شان و شوکت اور واقعیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ تک پہنچتا ہے۔

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾

(اور تمہارا صاحب مجنون نہیں ہے۔ ۲۲)

Marfat.com

قریش کو تنبیہ

آیت میں صَاحِبُكُمْ کے لفظ پر خاص زور ہے۔ کہنا دراصل یہ ہے کہ محمد ﷺ تمہارے صاحب، تمہارے رفیق اور تمہارے ساتھی رہے ہیں۔ انہوں نے نبوت سے پہلے چالیس سال تمہارے اندر گھل مل کے گزارے۔ وہ تم میں کوئی اجنبی شخص نہیں، بلکہ ان کا رشتہ تمہاری قوم اور قبیلے کے ساتھ جانا پہچانا ہے۔ شہر کا ہر چھوٹا بڑا جانتا ہے کہ آپ کس قدر دانا اور ہوش مند انسان ہیں۔ ان کے بے عیب سیرت و کردار کی ہر شخص گواہی دیتا ہے۔ ایسے شخص کو مجنون قرار دیتے ہوئے کیا تمہیں حجاب مانع نہیں ہوتا۔ اشرافِ قریش غلط بات کہنا اپنے لئے باعثِ عیب سمجھتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اپنے مذہبی تعصب میں بنیادی اقدار تک کو بھول گئے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿٢٣﴾

(اور اس نے اس کو کھلے افق پر دیکھا ہے۔ ۲۳)

گزشتہ آیت کے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ تمہارے صاحب یعنی محمد ﷺ کس اخلاق و دانش کے پیکر ہیں۔ اس لئے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے کھلے افق پر حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا ہے تو یقیناً اس میں کوئی جھوٹ یا فریبِ نفس نہیں، بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ افقِ مبین سے مراد فضائے آسمانی کا وہ حصہ ہے جو نظر کے بالکل سامنے ہوتا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام اس فضاء میں اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہوئے اور آنحضرت ﷺ نے انہیں دیکھا۔ اور سورۃ نجم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دوسری دفعہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا جس کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب پہلی مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو افق پر دیکھا تو آپ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کی وجاہت اور ان کی جسامت اور ان کے پروں کی کثرت سے پورا افق ڈھکا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے جس رسول کے مشاہدات کا یہ عالم ہو، تم اس پر جنون کی تہمت رکھتے ہو اور کبھی اسے کاہنوں سے تشبیہ دیتے ہو۔ کیا دنیا میں عقل اور انصاف بھی کوئی چیز ہیں یا نہیں؟

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾

(وہ غیب کے معاملہ میں بخیل نہیں ہے۔ ۲۴)

اللہ تعالیٰ کا رسول غیب کا حریص نہیں

یعنی آنحضرت ﷺ پر جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ شریعت کے احکام ہوں یا عالمِ غیب کے حقائق، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان ہو یا فرشتوں کی تفصیلات یا زندگی بعد الموت، قیامت اور آخرت اور جنت اور دوزخ کے بارے میں انکشافات ہوں یا گزشتہ قوموں کے حالات یا آنے والے حالات کے بارے میں پیشگوئیاں، آپ ان میں سے کسی بات کو چھپا کر نہیں رکھتے۔ ہر چیز بے کم وکاست بیان کر دیتے ہیں۔ کیونکہ آپ ایسی باتوں پر جو ہم سے غیب ہیں یعنی ہم انہیں نہیں جانتے ان پر بخیل نہیں ہیں کہ اپنے تک محدود رکھیں۔

Marfat.com

ضَنِيْنٍ ...... کا معنی جس طرح بخیل ہوتا ہے اسی طرح حریص بھی ہوتا ہے۔ ویسے بھی بخل اور حرص دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ حریص کیا ہے۔ اس سورۃ میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کاہنوں کی طرح غیب کے علم پر حریص نہیں۔ جس طرح کاہن ایسی باتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جنہیں عام لوگ نہ جانتے ہوں وہ اسے غیب قرار دے کر اپنی غیب دانی کا کاروبار چلاتے ہیں۔ اور اس طرح سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا رسول غیب کی کسی بات پر اس طرح حریص نہیں ہوتا۔ ان پر جو وحی اترتی ہے وہ اضطراری طور پر آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا پیغمبر اسے لوگوں تک پہنچانے کا مکلف ہوتا ہے۔ کیونکہ تبلیغ و دعوت اس کے فرائض میں شامل ہے۔ اپنے اس فرض کی ادائیگی کیلئے نبی کریم ﷺ تمہارے سامنے ان حقائق کو بیان کرنے کے بھی پابند ہیں جو تمہیں بیشک ناگوار ہوں لیکن تمہاری زندگی کی صلاح و بقاء کیلئے ضروری ہیں۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾

(یہ کسی شیطانِ مردود کا قول نہیں ہے۔ ۲۵)

قریش کے پروپیگنڈے کا مزید جواب

مشرکینِ مکہ لوگوں کو بہکانے کیلئے یہ بھی کہتے تھے کہ محمد ﷺ پر کوئی فرشتہ نہیں اترتا بلکہ کوئی شیطان ہے جو انہیں بعض باتیں القاء کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے یہ بات فرمائی گئی کہ یہ رسولِ کریم کا قول ہے۔ یعنی ایک معزز فرشتہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آتا ہے۔ اب اسی بات کو منفی انداز میں بیان فرمایا گیا۔ اور اس کے پیچھے ایک سوچنے کی دعوت بھی کارفرما ہے وہ یہ کہ شیطان کا کام انسان کو شرک میں ملوث کرنا اور بت پرستی کی تعلیم دینا ہے۔ وہ انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ شترِ بے مہار بن کر زندگی گزارے۔ وہ ہر ظلم اور بداخلاقی کو مزین کر کے لوگوں کے دلوں میں اتارتا ہے۔ ایسی ہی باتیں ہیں جن کو شیطنت یا شیطان کے کام کہا جاتا ہے جبکہ آنحضرت ﷺ جو تعلیم لے کر آئے ہیں ان میں شرک اور بت پرستی کی بجائے توحید کی تعلیم ہے۔ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔ ہر ظلم اور ہر بداخلاقی سے نفرت پیدا کی جاتی ہے اور عدل اور تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے۔ تو کیا یہ کام اور یہ تعلیم شیطانِ رجیم کی تعلیم سے میل کھاتی ہے؟ تو جس آدمی میں عقل کی کچھ بھی رمق باقی ہے اسے سوچنا چاہئے کہ آخر اس الزام میں کتنی حقیقت ہے۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾

(تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو۔ ۲۶)

یعنی کہاں قرآنِ کریم کی یہ تعلیم اور کہاں تمہاری خرافات دونوں میں آخر کیا نسبت ہے۔ تو تم اپنے مذہبی تعصبات کا شکار ہو کر آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار کر کے، آخر کدھر جا رہے ہو۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾

(یہ تو سارے جہاں والوں کیلئے ایک نصیحت ہے۔ ۲۷) تم میں سے ہر اس شخص کیلئے جو سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے۔ ۲۸)

Marfat.com

آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے نہایت مؤثر انداز میں آخری بات فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ قرآنِ کریم سب جہان والوں کیلئے نصیحت بن کر آیا ہے۔ اس میں عرب وعجم اور گورے اور کالے سب برابر ہیں۔ لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اندر اس کا احساس، اس کی چاہت اور اس کی امنگ پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے اپنی کتاب اتار کر ہمارے لئے راستہ کھول دیا ہے۔ لیکن اس کیلئے دل کھولنا ہماری اپنی ذمہ داری ہے۔ اور دماغی کاوشوں کو استعمال کرنے کا بار ہم پر ڈالا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کو لوگوں کے دلوں میں اتارے۔ جو سیدھی راہ چلنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے گا۔ اور جو کج روی اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس کے انجام کے حوالے کر دے گا۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾

(اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ چاہے گا جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ ۲۹)

ہدایت وضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کا قانون

ہدایت وضلالت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا جو قانون ہے یہاں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ وہ ہدایت کی توفیق ان لوگوں کو بخشتا ہے جو اس کے طالب بنتے، اپنے صلاحیتیں اس کیلئے صرف کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق مانگتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اندھے بہرے بن کر زندگی گزارتے ہیں اور اتباعِ نفس ان کا طرزِ عمل بن جاتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسندیدہ راہ پر چلنے کیلئے چھوڑ دیتا ہے۔ اور بجائے انہیں روکنے کے ان کیلئے آسانیاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے۔ یعنی جب تک تم اس سے وہ توفیق نہ مانگو اور وہ توفیق تمہیں عطا نہ کر دے اس وقت تک تم ہدایت نہیں پا سکتے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

(۸۲)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الانفطار ہے۔ یہ اس کی پہلی آیت کے لفظ انفطرت سے ماخوذ ہے۔ انفطرت فعل ماضی ہے اور انفطار اس سے مصدر ہے، جس کا معنی ہے پھٹ جانا۔

زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ اور یہ سورۃ ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے ظاہر و باطن اور اسلوب و معنی میں نہایت واضح مشابہت ہے۔ سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ میں بھی ظہورِ قیامت کے وقت جو ہلچل مچے گی اس کی تصویر ہے۔ اور اس سورۃ کا آغاز بھی ہولِ قیامت کے ذکر سے ہو رہا ہے۔ مختلف حدیث کی کتابوں میں حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ سے جو حدیث روایت کی گئی ہے اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہے کہ روزِ قیامت کو اس طرح دیکھے جیسے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ سورۃ التکویر، سورۃ الانفطار اور سورۃ الانشقاق کو پڑھ لے۔ اور دونوں میں مشابہت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ دونوں میں اصل مدعا تقریباً ایک ہی طرح کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ سورۃ التکویر میں ہولِ قیامت کی تصویر کے بعد فرمایا ہے علمت نفس مااحضرت اور اس سورۃ میں فرمایا گیا ہے علمت نفس ماقدمت واخرت۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ بنائے استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ سورۃ التکویر میں استدلال کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی ہے کہ قرآنِ کریم کا نور جس منبع سے پھوٹا ہے اور اس کا نزول جس عظیم واسطے سے ہوا ہے اور جس ذاتِ عزیز پر اسے اتارا گیا ہے سب کے طاہر اور مطہر ہونے میں دو رائے نہیں ہوسکتیں۔ جبکہ مخالفین کی بے بصیرتی کا حال یہ ہے کہ وہ اس کا تقابل کاہنوں اور منجموں کی بے سروپا باتوں سے کرتے ہیں جبکہ اس سے زیادہ بے سروپا بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ لیکن سورۃ الانفطار میں استدلال کا مدار اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خلق، قدرت، حکمت، عدل اور رحمت پر کیا گیا۔ اور روزِ جزاء و سزا کو اسی کا بدیہی تقاضا قرار دیتے ہوئے اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

پہلی پانچ آیتوں میں ظہورِ قیامت کا نقشہ کھینچتے ہوئے آسمان کے پھٹنے اور ستاروں کے بکھر جانے اور قبروں کے کھلنے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور لوگوں کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اس دن ہر شخص نے جو کچھ دنیا میں کیا ہوگا وہ سب کچھ اس کے سامنے آجائے گا۔

Marfat.com

اس کے بعد تین آیتوں میں انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، رحمت اور عدل کی جو نشانیں ظاہر ہیں اس کی روشنی میں یاددہانی کرائی گئی ہے کہ قیامت کے وقوع کو بعید از امکان مت سمجھو۔ اور نہ اس فریب میں مبتلا رہو کہ تم دنیا میں شتر بے مہار کی طرح زندگی گزار کر چلے جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے جس اہتمام کے ساتھ تمہیں پیدا کیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارا وجود بے مقصد اور بے غائت نہیں۔

اس کے بعد چار آیتوں میں اس غلط فہمی پر تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہارے تمام اقوال و اعمال کا علم اللہ تعالیٰ کو کس طرح ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے تم پر اپنے معزز فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جو تمہارے ہر قول و فعل کو نہایت احتیاط اور دیانت سے قلمبند کر رہے ہیں۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کے کریم ہونے سے یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کبھی انصاف کا دن نہیں لائے گا۔ وہ رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ساتھ عادل بھی ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف سے کام لے گا۔

اس کے بعد دو آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ جزاء و سزا کے دن اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے نعمت کے باغوں میں رکھے جائیں گے۔ اور نافرمان اور باغی لوگ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ اور وہاں سے انہیں کبھی باہر نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔

آخر میں زور دے کر فرمایا گیا ہے کہ یقیناً روزِ جزاء برپا ہونے والا ہے۔ اس روز جزاء و سزا کا عمل بالکل بے لاگ ہوگا۔ اس دن سارا زور و اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوگا، کوئی دوسرا نہ کسی معاملے میں دخیل ہو سکے گا اور نہ اثر انداز ہو سکے گا۔

Marfat.com

رُكُوعَاتُهَا ١	سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ (٨٢)	اٰيَاتُهَا ١٩

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝١ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝٢ وَإِذَا الْبِحَارُ
فُجِّرَتْ ۝٣ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۝٤ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ
أَخَّرَتْ ۝٥ يٰٓأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝٦ الَّذِيْ
خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝٧ فِيْٓ أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝٨
كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّيْنِ ۝٩ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝١٠ كِرَامًا
كَاتِبِيْنَ ۝١١ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝١٢ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝١٣ وَ
إِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝١٤ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝١٥ وَمَا هُمْ عَنْهَا
بِغَآئِبِيْنَ ۝١٦ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٧ ثُمَّ مَآ أَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ
الدِّيْنِ ۝١٨ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝١٩

رکوع: ا۔ (جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۱) اور جب ستارے بکھر جائیں گے۔ ۲) اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے۔ ۳) اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ ۴) اس وقت ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے اور کیا پیچھے چھوڑا ہے۔ ۵) اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے ربِ کریم کی طرف سے دھوکے میں

Marfat.com

ڈال دیا۔ ۶) جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے، پھر تجھے متناسب بنایا۔ ۷) پھر جس شکل میں چاہا تجھے جوڑ کر تیار کر دیا۔ ۸) ہرگز نہیں! بلکہ تم جزاء کو جھٹلاتے ہو۔ ۹) حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں۔ ۱۰) معزز کاتب۔ ۱۱) وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۱۲) بیشک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ ۱۳) اور بیشک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ ۱۴) وہ جزاء کے دن اس میں داخل ہوں گے۔ ۱۵) اور پھر اس سے وہ غائب ہونے والے نہیں۔ ۱۶) اور تم کیا جانتے ہو کہ جزاء کا دن کیا ہے۔ ۱۷) ہاں تمہیں کیا خبر کہ وہ جزاء کا دن کیا ہے۔ ۱۸) اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کیلئے کچھ نہ کر سکے گی، فیصلہ اس دن بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔ ۱۹)

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱

(جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۱)

انفطار کا معنی پھٹ جانا اور شق ہو جانا ہے۔ سورۃ الانشقاق میں اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ فرمایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفطار و انشقاق دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

نفخۂ اولٰی کے بعد آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر

اس پھٹ جانے کی کیفیت کیا ہوگی، اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ وہ گنبد بے در جو ہمارے سروں پر چھایا ہوا ہے اور جسے سقفِ نیلگوں بھی کہتے ہیں اور جس میں کہیں کوئی شگاف نظر نہیں آتا، قیامت کے روز یہ پھٹ جائے گا اور شق ہو جائے گا۔ اور اس میں جگہ جگہ شگاف دیکھنے والوں کو نظر آئیں گے۔ آج ہمارے علم اور سائنس کے ترازو میں چاہے یہ باتیں تلیں یا نہ تلیں لیکن جب اس کا خالق اسے ایک محکم حقیقت کے طور پر بیان کر رہا ہے تو اسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ سائنس کے پاس آج تک اپنی بے خبری، کوتاہی فکر اور نارسائی کے سوا کچھ نہیں۔ عدمِ علم عدمِ وجود کو مستلزم نہیں ہوتا۔

آسمان کے پھٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بعد ایک نیا عالم نئے نوامیس و قوانین کے تحت ظہور میں آئے گا۔ اس وجہ سے اس عالمِ کہن کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس سے قیامت کے وہ منکرین جو اپنے قلعوں پر بے جا ناز کرتے ہوئے نہایت تکبر سے قیامت کا انکار کرتے تھے انہیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ جب قیامت کے آنے سے ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی تو جن قلعوں اور گڑھیوں پر تم اعتماد کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ ان پر کبھی زوال نہیں آئے گا، یہ تمہارے گھروندے بھی باقی نہیں رہیں گے۔

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲

(اور جب ستارے بکھر جائیں گے۔ ۲)

Marfat.com

ستاروں کی پراگندگی

انتشار کے معنی بکھر جانے، منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے ہیں۔ آسمان کے پھٹ جانے کے بعد وہ شیرازہ بکھر جائے گا جس میں آج یہ ستارے ہمیں پروئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور سورج کے بے نور ہو جانے اور اس کی بساط لپیٹ دیئے جانے کے بعد نظامِ شمسی سے ان کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ تو اس کے بعد پراگندگی اور انتشار کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہیں ہوگی۔ جس غیر مرئی قوت سے وہ لٹک رہے تھے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ اور جس نظامِ شمسی سے ان کو روشنی مل رہی تھی اس سے تعلق ٹوٹ جانے سے وہ بجھ کر رہ جائیں گے۔ اس طرح سے ان کا وجود ختم ہو جائے گا۔

وَاِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۝۳

(اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے۔ ۳)

سمندروں کا پھٹ جانا

سورۃ التکویر میں فرمایا گیا ہے وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ...... تسجیر کا معنی جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے تنور کے اندر آگ دہکانے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ ان دونوں آیتوں اور سورۃ ص کی پہلی آیت جس میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کا زلزلہ ایک بہت بڑی شے ہے کو جب ملا کر پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبردست زلزلہ آئے گا جس سے پوری زمین ہلا دی جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سمندروں کی تہہ پھٹ جائے گی اور ان کا پانی زمین کے اس اندرونی حصے میں اترنے لگے گا جہاں ہر وقت بے انتہاء گرم لاوا کھولتا رہتا ہے۔ سائنسدانوں کا خیال یہ ہے کہ آج سے لاکھوں سال پہلے جب زمین سورج سے الگ ہوئی تھی تو اس کا درجۂ حرارت سورج کے برابر تھا۔ آج بھی یہ حرارت بطنِ زمین میں موجود ہے۔ اور لاوے کا درجہ حرارت وہی ہے جو آغاز میں زمین کا تھا۔ یعنی بارہ ہزار فارن ہائیٹ۔ جب پانی اس لاوے تک پہنچے گا تو وہ اپنے ان اجزاء کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن سے وہ مرکب ہے۔ جن میں ایک آکسیجن جلانے والی ہے۔ اور دوسری یعنی ہائیڈروجن بھڑک اٹھنے والی ہے۔ تو یہ دونوں گیسیں چونکہ آتش پذیر ہیں اس لئے پانی کے گیسوں میں تبدیل ہو جانے کے بعد دنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ وہ بات ہے جو ان دونوں آیتوں کو ملانے سے قیاس کی جاسکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام باتیں متشابہات سے تعلق رکھتی ہیں جن کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہے، ہم نے محض ان کا مطلب واضح کرنے کیلئے ایک قیاس سے کام لیا ہے، ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہو۔

وَاِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ۝۴

(اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ ۴)

Marfat.com

نفخۂ ثانیہ کے بعد قبروں کا کھولا جانا

پہلی تین آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے۔ جب ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور ہر زندہ چیز پر موت طاری ہو جائے گی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دوسرے مرحلے کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ قبروں کے کھولے جانے سے مراد یہ ہے کہ لوگ زندہ ہو کر اپنی قبروں سے نکلیں گے۔ اور میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ﴿٥﴾

(اس وقت ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے اور کیا پیچھے چھوڑا ہے۔ ۵)

قیامت کے اصل مقصد کا ظہور

قیامت کے برپا کرنے سے جو چیز مقصود ہے وہ اس آیت میں بیان فرما دی گئی ہے۔ یعنی آج جو لوگ قیامت کے وقوع کا انکار کرتے ہیں اور بعض ایسے سرپھرے ہیں جو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ قیامت کی ہولناک شکست وریخت اور ہلچل کو دیکھتے ہوئے انہیں اندازہ ہوگا کہ ہم جس چیز کا انکار کرتے رہے ہیں وہ تو اب ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ تب انہیں زندگی کے معمولات پر غور وفکر کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ آج کا دن اگر واقعی جوابدہی کا دن ہے تو کیا ہمارے اعمال اس قابل ہیں کہ ہم انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرسکیں۔ تو جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا ہوگا وہ ایک ایک کر کے ان کے سامنے آنا شروع ہو جائے گا۔ انہیں وہ اعمال بھی یاد آئیں گے جو انہوں نے زندگی میں انجام دیئے۔ اور ایسی باتیں بھی ان کے ذہنی افق پر روشن ہوں گی جنہیں وہ انجام دینا چاہتے تھے لیکن نہ دے سکے۔ اور اس کی حسرت لئے ہوئے موت کا شکار ہوگئے۔ کیونکہ ہر شخص زندگی میں جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اچھا ہو یا برا، ضروری نہیں کہ اپنے ہر عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ جن کاموں کو وہ کر گزرتا ہے انہیں گویا وہ آگے بھیج دیتا ہے۔ اور جنہیں خواہش کے باوجود کر نہ سکا یا پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا تو اس کی حسرت یا خلش لئے ہوئے آخرت کو سدھار جاتا ہے۔ تو یہ وہ عمل ہے جو وہ پیچھے چھوڑ گیا۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ اس نے کیا وہ عمل کی صورت میں اسے بھی نظر آتا ہے اور اہلِ دنیا کو بھی۔ اور یہ وہ عمل ہے جو اس نے آگے بھیجا۔ لیکن اس کے اثرات اور اس کے نتائج بعض دفعہ زندگی گزرنے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ جو شخص ایک تعلیمی ادارہ کھولتا ہے اس تعلیمی ادارے سے فائدہ اٹھانے والے اپنے علم ودانش سے اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد نسلاً بعد نسلٍ نہ جانے کب تک اس کے اس عمل کے برگ وبار کو دنیا میں پھیلاتے رہتے ہیں، اس کا اندازہ قیامت کے دن ہوگا۔ اور یہ وہ عمل ہے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اس سے مختلف بھی اس کے مفاہیم ہوسکتے ہیں جو سب اپنے اپنے دائرۂ کار میں مراد لئے جاسکتے ہیں۔ ان سب کو قیامت کے دن آدمی اپنے سامنے دیکھے گا اور جان لے گا کہ میں کیا کچھ کر چکا ہوں۔

یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ ﴿٦﴾

(اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے ربِ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا۔ ٦)

Marfat.com

انسان کے بگاڑ کا اصل سبب جواب دہی سے بے نیازی ہے

روئے سخن اگرچہ انہیں کفار ومشرکین کی طرف ہے جو بڑے تکبر سے قیامت کا انکار کرتے تھے۔لیکن خطاب میں انسان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک دنیا میں نوع انسانی کا وجود ہے اس کے بگاڑ کا سبب ہمیشہ آخرت اور قیامت کا انکار اور جوابدہی سے بے نیازی ہے۔اس لئے یہ مسئلہ صرف اہلِ مکہ کا نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کا ہے۔اور خطاب میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تم نے اپنے رب کو نہایت رحیم وکریم پایا۔وہ تمہاری سرکشیوں پر فوراً گرفت نہیں کرتا۔تم نے اس کے ساتھ بے شمار قوتوں کو شریک بنایا، قدم قدم پر تم نے اس کے احکام توڑے، تم نے بے بس اور بے کس انسانوں پر مظالم کی انتہا کردی۔لیکن اس نے تمہیں کبھی سزا دینے میں جلدی نہیں کی۔ہمیشہ تمہاری مہلتِ عمل میں اضافہ کرتا رہا۔تم اس سے یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ جس طرح آج تک تمہاری کسی بات پر باز پرس نہیں ہوئی، آئندہ چل کر بھی نہیں ہوگی۔اور تمہیں جو دولت وثروت حاصل ہے یہ تمہارا پیدائشی حق ہے۔تو جس کریم نے تمہیں یہاں اس رفاہیت اور عیش و آرام میں رکھا ہے وہ تمہیں قیامت کے بعد بھی (اگر وہ آئی) تو اسی عیش وآرام میں رکھے گا۔یہ وہ فریب ہے جس نے تیری زندگی برباد کردی ہے۔بجائے اس کے کہ تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کا معترف ہوتا اور شکر بجالاتا، تو نے اسے اس کی کمزوری سمجھا، کہ اس نے تیری سرکشیوں اور حدود کی پامالیوں پر تیری گرفت نہیں کی۔تو تو نے یہ سمجھا کہ یا تو اس کائنات کا کوئی خدا نہیں، اگر ہے تو وہ اس قابل نہیں کہ زمین پر رہنے والوں کو ان کے گناہوں پر پکڑے۔اور یا پھر یہ حقیقت ہے کہ اس نے زمین پر بسنے والے انسانوں کو چھٹی دے رکھی ہے کہ شتر بے مہار کی طرح زندگی گزارو، تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔نہ دنیا میں تمہیں پکڑا جائے گا اور نہ آخرت میں کوئی حساب کتاب ہوگا۔حالانکہ اس فریب میں پڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔لیکن فریبِ نفس ایک ایسا دام ہے جس سے بچ کر نکلنا آسان نہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ⑦ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَکَ ⑧

(جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تیرے نوک پلک سنوارے، پھر تجھے متناسب بنایا۔ ۷
پھر جس شکل میں چاہا تجھے جوڑ کر تیار کردیا۔ ۸)

اللہ تعالیٰ کا اپنی بعض صفات سے استدلال

اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کے تدارک کیلئے اپنی چند صفات کا ذکر فرمایا ہے جس کا تعلق انسان کی خلقت سے ہے۔کہنا یہ ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے جو دھوکا ہوا ہے اور تم نے اسے کمزوری پر محمول کیا ہے۔اگر تم اپنی خلقت پر غور کرتے اور اپنے وجود کا تجزیہ کرتے تو تمہیں یہ غلط فہمی کبھی نہ ہوتی۔تمہارا وجود خود بتارہا ہے کہ یہ نہ آپ سے آپ وجود میں آیا ہے، نہ اسے ماں باپ نے تخلیق کیا ہے، نہ چند عناصر کے مل جانے کی وجہ سے اتفاق سے انسان بن گیا ہے۔بلکہ جس تدریج اور اہتمام کے ساتھ انسان کی تخلیق ہوتی ہے اس کے ایک ایک قدم پر اللہ تعالیٰ کی شانیں ظاہر ہوتی ہیں اور اس کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے۔میاں بیوی کے اتصال سے ماں کے رحم میں پانی کی ایک بوند کا انتقال ہوتا ہے۔پھر کس حیرت انگیز طریقے سے اللہ تعالیٰ اس کی صورت آرائی فرماتا ہے، پھر کس طرح سے اس کی نوک پلک سنوارتا ہے اور پھر کیسے حیران

Marfat.com

کر دینے والے طریقے سے اس کا تناسب درست کرتا اور اس کی صلاحیت میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔ اور پانی کے اس قطرے کو ایک من موہنی اور خوبصورت شکل ہی میں تبدیل نہیں کرتا بلکہ اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ چاہے تو زمین کو اپنی ایجادات سے بھر دے۔ اور چاہے تو انسان کے جذبات و احساسات کو اتنا پاکیزہ کر دے کہ اس کے سر پر خلافتِ ارضی کا تاج رکھا جا سکے۔ اور آسمان کی بادشاہی کا اسے سزاوار کہا جا سکے۔ اور مزید حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ وہ صورت آرائی اور کمالات کی عطا و بخشش میں ایسے کمالِ قدرت کا اظہار فرماتا ہے کہ لاکھوں انسانوں کے اندر سے کوئی دو آدمی ایسے نہیں نکالے جا سکتے جو شکل و صورت میں کامل مشابہت رکھتے ہوں۔ اور نہ دو شخص ایسے تلاش کیے جا سکتے ہیں جو احساس و انفعال اور فکر و ایجاد کی یکساں صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ ایسی حیران کن اور بے پناہ قدرتوں کی مالک ذات کے بارے میں تمہیں گمان یہ ہے کہ نہ وہ تمہیں از سرِ نو زندہ کر سکتا ہے، نہ تمہیں جواب طلبی کیلئے اپنے حضور حاضر کر سکتا ہے، نہ تمہارے نیکوں اور بروں میں امتیاز پیدا کر سکتا ہے اور نہ وہ زمین کے دور دراز گوشے میں ایک ایک آدمی کا احتساب کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھتے ہوئے ان غلط فہمیوں کا کوئی جواز نہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے انسان کی خلقت میں جو بے پناہ احسانات کیے، ہونا تو یہ چاہئے کہ انسان اس بارِ احسان سے کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ اور ساری زندگی اس کے شکر میں گزارے۔ یہی عقل کا تقاضا اور یہی اخلاق کی پکار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمہاری عقل اور تمہاری اخلاقی قوت کبھی ان باتوں کا ادراک نہ کرتی ہو، بلکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ اصل میں پانی کہیں اور مرتا ہے۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ﴿٩﴾

(ہرگز نہیں! بلکہ تم جزاء کو جھٹلاتے ہو۔ ۹)

مکذبینِ قیامت کو تنبیہ

ہرگز نہیں سے مراد یہ ہے کہ تم نے جن مصنوعی اسباب اور اعذار کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے بارے میں کچھ تصورات قائم کر رکھے ہیں اور جن شبہات و اعتراضات کی بنیاد پر تم قیامت کے آنے سے انکار کرتے ہو، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان کا جواب خود انسان کی اپنی ذات اور اپنی تخلیق میں موجود ہے۔ اگر ان پر غور کرے تو وہ کبھی اس فریبِ نفس کا شکار نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہاری بیماری کچھ اور ہے جسے تم ان مصنوعی باتوں میں چھپانا چاہتے ہو۔ وہ بیماری یہ ہے کہ تم جزاء و سزا کو ماننا نہیں چاہتے۔ یعنی تمہارا اصل انکار قیامت سے نہیں، اور تمہارے اشتباہات دوبارہ جی اٹھنے اور تمام اعمال کی جواب دہی کے بارے میں سراسر ایک دھوکا اور تصنع ہے۔ تمہیں اصل میں یہ بات گوارا نہیں کہ کبھی تم سے تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے، کیونکہ تم خوب جانتے ہو کہ تم نے آج تک کیسے زندگی گزاری ہے اور کیسے مکروہ اعمال کا ارتکاب کرتے رہے ہو۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿١٢﴾

(حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں۔ ۱۰) معزز کاتب۔ ۱۱) وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۱۲)

Marfat.com

مکذبین کی غلطی کا ازالہ

یعنی تمہارا یہ خیال کہ دنیا کے دار العمل کے بعد کوئی دار الجزاء نہیں۔ اس لئے ہمیں جزاء وسزا کے بارے میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جارہا ہے کہ تم چاہے کیسے بھی تصورات رکھو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذمہ دار حیثیت سے دنیا میں بھیجا ہے، تمہیں شتر بے مہار بنا کر نہیں بھیجا۔ تمہاری اس حیثیت کو جانچنے کیلئے اس نے تم پر کچھ نگران مقرر کر رکھے ہیں۔ قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد دو ہے جو ہر آدمی کے دونوں کندھوں پر بٹھائے گئے ہیں جو دائیں بائیں دونوں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔ اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تقسیم کار یہ ہے کہ ایک نیکیاں لکھنے پر مامور ہے اور دوسرا بدیاں لکھنے پر۔ اور سورۃ ق سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ زبان سے نکالتا ہے ایک مستعد نگران اس کے پاس موجود ہوتا ہے، یعنی وہ فوراً اسے لکھ لیتا ہے۔ پھر ان کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دونوں فرشتے انتہائی معزز اور بزرگ ہیں۔ یعنی نہ کسی سے ذاتی محبت رکھتے ہیں اور نہ عداوت۔ اس لئے نہ کسی کی بے جا رعایت کرتے ہیں اور نہ کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر قول اور ہر عمل نہایت ذمہ داری سے قلمبند کرتے ہیں۔ کسی کا بڑا یا چھوٹا ہونا ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ چونکہ خود بہت معزز ہیں اس لئے ایک بادشاہ بھی ان کے سامنے مؤثر حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کی کرامتِ نفس میں یقیناً دیانت وامانت بھی شامل ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خائن بھی نہیں ہیں۔ اپنی حاضری اور فرض کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ کسی کی یہ مجال نہیں کہ ان پر اثر انداز ہو کر ریکارڈ میں تبدیلی کروا سکے۔ مزید فرمایا کہ جو کچھ تم کرتے ہو، وہ سب جانتے ہیں۔ جاننے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت ہر شخص کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ نیکیاں لکھنے والے کی نظر اس کی نیکیوں پر رہتی ہے اور بدیاں لکھنے والا بدیوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ انسان تنہائی اور تاریکی میں جب کوئی اسے دیکھنے والا نہ ہو یہ سمجھ کر گناہ کرتا ہے کہ میں ہر طرح محفوظ ہوں۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے دائیں بائیں دونوں کندوں پر دو نگران موجود ہیں جو ہر وقت اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مرتب کیا ہوا ریکارڈ ایسا مکمل ریکارڈ ہوگا کہ جس میں کوئی بات بھی درج ہونے سے رہ نہیں جائے گی۔ اس لئے سورۃ کہف میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب مجرمین کو ان کے نامۂ اعمال دیئے جائیں گے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اس نامۂ اعمال میں ہر چھوٹی بڑی بات موجود ہے۔ کوئی بات درج ہونے سے رہی نہیں۔ بلکہ جو کچھ انہوں نے کیا ہوگا وہ بالکل ویسے ہی ان کے سامنے موجود ہوگا۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾

(بیشک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ ۱۳) اور بیشک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ ۱۴)

اللہ تعالیٰ کے نظامِ احتساب کا نتیجہ

اللہ تعالیٰ نے اعمال کی حفاظت کا جو حیران کن انتظام کر رکھا ہے یہ اس کا نتیجہ ہے کہ جن لوگوں نے شریعت کے احکام کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کیلئے نیکوکاری کی زندگی اختیار کی ہوگی وہ عیش کی زندگی میں ہوں گے اور انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی بجائے فسق وفجور میں اپنے آپ کو مبتلا رکھا ہوگا اور شیطان کی پیروی میں زندگی

Marfat.com

گزاری ہوگی، وہ جہنم میں ہوں گے۔اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت چونکہ دارالجزاء اور عدل کی جگہ ہے اس لئے وہاں اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ ایک جیسا سلوک نہیں فرمائے گا۔ نیکوں کے ساتھ اور سلوک ہوگا اور برے لوگوں کے ساتھ اور۔ اسی سے ان لوگوں کی حماقت بھی واضح ہو جاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ اور اگر کوئی زندگی ہوئی تو وہ اپنی شفاعت کرنے والوں کے زور سے اچھی زندگی حاصل کرلیں گے۔ انہیں چاہئے کہ وہ اپنے رویئے کی اصلاح کریں۔ کیونکہ اس کائنات کا خالق نیکی اور بدی کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں کہ وہ سب کے ساتھ ایک ہی طرح کا سلوک کرے۔ وہ عادل ہے اس لئے وہ انصاف سے کام لے گا۔ اس نے اس دنیا کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے تو وہ اس کو اندھیر نگری نہیں بننے دے گا۔

يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾

(وہ جزاء کے دن اس میں داخل ہوں گے۔ ۱۵) اور پھر اس سے وہ غائب ہونے والے نہیں۔ ۱۶)

گزشتہ آیت میں فرمایا کہ نیک لوگ عیش میں ہوں گے اور برے لوگ جہنم میں۔ پیشِ نظر آیت میں دنیا میں عیش کی زندگی گزارنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اصل حقیقت یہی ہے کہ آرام اور عیش نیکی کی جزاء ہے۔ اور سزا بدی کی۔ لیکن یہاں لوگوں نے اسے الٹ سمجھ رکھا ہے۔ جزاء کا دن چونکہ انصاف کا دن ہوگا اس لئے اس دن تمام نابکار اور بدکار جہنم میں داخل ہوں گے۔ اور یہ چونکہ مہلتِ عمل ختم ہونے کے بعد جزاء کی دنیا ہوگی اس لئے وہاں سے انہیں ایک پل کیلئے بھی ادھر ادھر ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ اور یہ اس بات کا ازالہ فرمایا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہاں سے نکل بھاگنے کا کوئی موقع ہو۔ اس لئے فرمایا کہ وہ یہ خیال دل سے نکال دیں۔ اس میں داخلے کا راستہ ہے، نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۱۸﴾

(اور تم کیا جانتے ہو کہ جزاء کا دن کیا ہے۔ ۱۷) ہاں تمہیں کیا خبر کہ وہ جزاء کا دن کیا ہے۔ ۱۸)

چونکہ کفارِ مکہ جزاء کے دن یعنی قیامت کا انکار کرتے، بلکہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کے سامنے اس دن کی عظمت و اہمیت کو واضح کرنے کیلئے ان میں سے ایک ایک شخص کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آج تو تم اس دن کا مذاق اڑاتے ہو، تم کیا جانو کہ وہ دن کیسا ہے۔ اگر تمہیں اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہوتا تو تم کبھی اس کا انکار نہ کر سکتے۔ پھر اس کی تکرار نے اس کی ہولناکی اور ہیبت میں مزید اضافہ کر دیا اور انہیں جھنجوڑنے کیلئے واحد کے صیغے سے خطاب فرمایا۔

یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا ؕ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

(اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کیلئے کچھ نہ کر سکے گی، فیصلہ اس دن بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔ ۱۹)

گزشتہ دو آیتوں میں سوال چونکہ جواب کیلئے نہیں بلکہ محض قیامت کی ہولناکی اور ہیبت کو دلوں میں راسخ کرنے کیلئے تھا اس لئے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی اس کا جواب دیا کہ کافروں نے قیامت کے بارے میں جو گمان کر رکھا ہے کہ اولاً تو اس کے آنے کا

Marfat.com

کوئی امکان نہیں۔اور اگر وہ آ ہی گئی تو ہم نے جنہیں اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے اور جنہیں ہم اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا سفارشی اور شفیع سمجھتے ہیں اور جن کے ہم دامن گرفتہ ہیں وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں ہماری سفارش کریں گے اور ہمیں اس کے عذاب سے بچالیں گے۔

فرمایا وہ دن ایسا نہیں، اس دن کوئی کسی کے کام نہ آ سکے گا۔کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ وہ دم مار سکے۔اس دن ہر معاملے اور ہر فیصلے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔اس لئے کوئی اس کے فیصلے میں حائل تو خیر کیا ہو سکے گا کچھ کہنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوگا۔بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر نظر کرم فرمائے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِیْنَ

(۸۳)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْمُطَفِّفِيْنَ ہے جو اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول:۔ یہ سورۃ مکہ معظمہ میں آپؐ کی دعوتی زندگی کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں بھی دیگر مکی سورتوں کی طرح آخرت کے عقیدہ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کے قبول کر لینے کے بعد عملی زندگی میں جو تبدیلی آتی ہے اس سے اسلام کی دعوت کو قبول کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ ایسا شخص ایمان سے کسی طرح دور نہیں رہ سکتا۔ اس سورۃ کے مندرجات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نزول کے وقت اہلِ مکہ کی جانب سے ظلم و ستم اور ایذا رسانی میں ابھی شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی دعوت کا مذاق تو اڑایا جاتا، مجلسوں میں مسلمانوں پر آوازے بھی کسے جاتے اور ان کی توہین و تذلیل بھی کی جاتی۔ لیکن جسمانی ایذاؤں تک ابھی نوبت نہیں پہنچی تھی۔ بعض مفسرین نے اس سورۃ کو مدنی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے جس کا سبب حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں کم ناپنے اور کم تولنے کا مرض بری طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل کی۔ اور لوگ ناپ تول میں احتیاط کرنے لگے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ کیونکہ صحابہ اور تابعین کا عام طریقہ یہ تھا کہ جو آیت جس معاملے پر چسپاں ہوتی اس کے متعلق وہ عام طور پر کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس آیت سے فلاں معاملہ پر روشنی پڑتی ہے۔ مدینہ منورہ میں جب آنحضرت ﷺ نے ناپ تول میں کمی کا عام چلن دیکھا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؐ نے یہ سورۃ ان کو پڑھ کر سنائی۔ اور اس سے ان کے معاملات درست ہو گئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ سورۃ اسی وقت نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ اگر ناپ تول میں کمی اس سورۃ کے نزول کا سبب ہے تو اس کی ضرورت مدینہ سے مکہ معظمہ میں زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ لوگ تجارت پیشہ تھے، ان میں ناپ تول کی ضرورت بھی زیادہ تھی اور ان میں یہ مرض بھی یقیناً زیادہ پایا جاتا تھا۔ اہلِ مدینہ زراعت پیشہ تھے، ان میں یہ مرض بھی یقیناً ہوگا لیکن اہلِ مکہ سے کم۔ اس لئے قیاس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس سورۃ کو مکی قرار دیا جائے۔

Marfat.com

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

پہلی چھ آیتوں میں ان لوگوں کے حال پر تنبیہ کی گئی ہے جنہوں نے کاروبار میں بے ایمانی کو رویہ بنا رکھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ جب وہ دوسروں کو ناپ تول کے دیتے تھے تو کم دیتے تھے، لیکن جب خود کوئی چیز لیتے تھے تو ٹھیک ٹھیک ناپ تول کے لیتے تھے۔ اولاً تو ناپ تول میں کمی بیشی بجائے خود ایک برائی ہے۔ لیکن لینے اور دینے کے دو الگ الگ باٹ صرف برائی ہی نہیں ناانصافی پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اس سے معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص خود تو اپنے ساتھ کمی بیشی کرنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن دوسروں کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے پرواہ نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر اس برائی کو برائی سمجھتا ہے۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی اس کے اندر سے نیکی کی حس مری نہیں، کسی نہ کسی حد تک زندہ ہے۔ اسی کو بنیاد بناتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ برائی کو برائی سمجھتے ہیں اور ناانصافی کو ظلم قرار دیتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ برائی ہر حال میں برائی ہے۔ چاہے اس کا شکار دوسرا ہو یا آدمی کی اپنی ذات ہو۔ آج تو وہ چابکدستی سے ان برائیوں پر پردہ ڈال سکتے ہیں لیکن اس وقت کیا کریں گے جب انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہوگا۔ درحقیقت ان کی اصل کمزوری یہ ہے کہ یہ آخرت سے غافل ہیں۔ اگر اس کا احساس ان کے اندر پیدا ہو جائے تو یہ بیماری خود بخود ختم ہو جائے۔

اس کے بعد آیت سترہ تک نہایت مؤثر اور دلنشیں انداز میں جرائم پیشہ لوگوں کے انجام کی تفصیل بیان کی گئی ہے جنہوں نے جزاء و سزا کے دن کو جھٹلایا اور زندگی نافرمانی میں گزاری۔

پھر آیت اٹھائیس تک نیک لوگوں کا بہترین انجام بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے مقام و مرتبہ کو واضح کرتے ہوئے ان کے اعمال ناموں کے محل کی عظمت بیان کی گئی ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نہایت مقرب فرشتے محض ان کی بلندیِ درجات کی وجہ سے ان اعمال ناموں پر نگران مقرر کیے گئے ہیں۔

آخر میں اہلِ ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ تم آج پہنچنے والی تکلیفوں کو یوں سمجھو کہ یہ آخرت کے دن کی کامیابیوں کا پیغام ہیں۔ اس دن تمہیں جو فیروزمندی نصیب ہونے والی ہے آج تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور ساتھ ہی کافروں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ آج جو لوگ ایمان لانے والوں کی تذلیل کر رہے ہیں اور اہلِ ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں آخرت کے دن یہ اپنی اس روش کا بہت برا انجام دیکھیں گے۔ اہلِ ایمان اپنی کامیابیوں پر شاداں اور فرحاں ہوں گے اور کفار کی ذلت و نامرادی کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑائیں گے، جس طرح کفار دنیا میں ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٣٦	سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ مَكِّيَّةٌ (٨٣)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ﴿١﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿٢﴾ۖ
وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴿٣﴾ؕ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ
مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ﴿٤﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٥﴾ۙ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦﴾ؕ
كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿٧﴾ؕ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿٨﴾ؕ
كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٩﴾ؕ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ
بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿١١﴾ؕ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۙ﴿١٢﴾ اِذَا
تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾ؕ كَلَّا بَلْ ۫ رَانَ
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٤﴾ كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿١٥﴾ؕ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿١٦﴾ؕ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ
كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٧﴾ؕ كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾ؕ وَ
مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿١٩﴾ؕ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۙ﴿٢٠﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾ؕ
اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ﴿٢٢﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۙ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِيْ
وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾ۚ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ

Marfat.com

مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ
تَسْنِيْمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا
كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿٣٠﴾
وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿٣١﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا
اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ لَضَاۗلُّوْنَ ﴿٣٢﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٣٣﴾ فَالْيَوْمَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْاَرَاۗىِٕكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ﴿٣٥﴾
هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

رکوع: ۱۔ (تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کیلئے۔ ۱) یہ وہ لوگ ہیں جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔ ۲) اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو اس میں کمی کرتے ہیں۔ ۳) کیا یہ گمان نہیں رکھتے کہ یہ لوگ اٹھائے جانے والے ہیں۔ ۴) ایک عظیم دن کی حاضری کیلئے۔ ۵) اس دن لوگ اٹھیں گے رب العالمین کے سامنے حاضری کیلئے۔ ۶) ہرگز نہیں! یقیناً بدکاروں کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے۔ ۷) اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے؟ ۸)۔ وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے۔ ۹) تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۱۰) جو روزِ جزاء کو جھٹلاتے ہیں۔ ۱۱) اور اس روزِ جزاء کو نہیں جھٹلاتا مگر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا اور حق تلفی کرنے والا ہے۔ ۱۲) اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ۱۳) ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ۱۴) ہرگز نہیں! بیشک وہ اپنے رب سے اس سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔ ۱۵) پھر وہ جہنم میں جا پڑیں گے۔ ۱۶) پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ ۱۷) ہرگز نہیں! بیشک نیک آدمیوں کے نامۂ اعمال علیین میں ہوں گے۔ ۱۸) اور تم کیا جانو کہ علیین کیا ہے۔ ۱۹) ایک لکھا ہوا دفتر ۲۰) مقربوں کی نگرانی میں۔ ۲۱) بیشک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ ۲۲) اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے۔ ۲۳) تم ان کے چہروں پر آسائش کی بشاشت محسوس کرو گے۔ ۲۴) انہیں بہترین سربند شراب پلائی جائے گی۔ ۲۵) جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی، جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ ۲۶) اس شراب میں تسنیم کی ملونی ہوگی۔ ۲۷) یہ چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ

Marfat.com

شراب پئیں گے۔ ۲۸) بیشک جو لوگ مجرم رہے ہیں وہ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ ۲۹) اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں سے ان کی طرف اشارے کرتے تھے۔ ۳۰) اور جب اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے۔ ۳۱) جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے یہ بالکل گمراہ ہیں۔ ۳۲) حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ ۳۳) پس آج وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں کفار کے حال پر ہنس رہے ہیں۔ ۳۴) مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں۔ ۳۵) کیا مل گیا کفار کو ان کے کئے کا بدلہ جو وہ کیا کرتے تھے۔ ۳۶)

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١

(تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کیلئے۔ ۱)

مُطَفِّفِيْنَ کا مفہوم

مُطَفِّفِيْنَ ...... یہ اسمِ فاعل ہے اور تطفیف اس سے مصدر ہے۔ طفیف عربی زبان میں چھوٹی اور حقیر چیز کو کہتے ہیں۔ تطفیف چھوٹی موٹی چیزوں میں ہیرا پھیری پر بولا جاتا ہے۔ لیکن اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے کمی کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ چوری چھپے کی کوئی بڑی مقدار میں نہیں ہوتی بلکہ محض تولتے اور ناپتے ہوئے ہاتھ کی صفائی سے ہر خریدار کے حصے میں تھوڑی سے کمی کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اردو زبان میں اسے ڈنڈی مارنا کہتے ہیں۔ یعنی تولنے والا محض ہاتھ کی صفائی سے تولی جانے والی چیز میں کمی کر دیتا ہے اور خریدار کو پتہ نہیں چلنے دیتا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص تھوڑی مقدار میں بددیانتی کرتا ہے اسے اگر موقع ملے تو بڑی مقدار میں بددیانتی کرنے پر اور زیادہ دلیر ہوگا۔ جس طرح آگ کا الاؤ شعلہ ہی سے بھڑکتا ہے اسی طرح چھوٹی بددیانتی بڑی بددیانتی کا باعث ہوتی اور تباہی لاتی ہے۔

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝٢ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝٣

(یہ وہ لوگ ہیں جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔ ۲) اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو اس میں کمی کرتے ہیں۔ ۳)

ان لوگوں پر لعنت جن کے لینے کے باٹ اور، اور دینے کے باٹ اور ہیں

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی دناءت اور خست کو نمایاں کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب یہ دوسرے لوگوں سے کوئی چیز ناپ یا تول کر لیتے ہیں تو پوری پوری لیتے ہیں، اس میں کوئی کمی نہیں ہونے دیتے۔ لیکن جب دوسروں کو دیتے ہیں تو ہاتھ کی صفائی دکھا جاتے ہیں اور کم کر کے دیتے ہیں۔ لیکن خریدار کو پتہ نہیں چلنے دیتے۔ اور پھر یہ کمی کوئی بڑی مقدار میں نہیں ہوتی، کیونکہ ڈنڈی مارتے ہوئے کوئی بڑا دھوکہ نہیں دیا جا سکتا ورنہ دیکھنے والا سمجھ جائے گا۔ تھوڑی سی ہی کمی کی جا سکتی ہے اور یہ ہر خریدار سے تھوڑا تھوڑا کم کر کے اپنے لئے بہت زیادہ جمع کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ لوگ بے ایمان اور بددیانت ہی نہیں بلکہ کمینے اور خسیس بھی ہیں۔

Marfat.com

قرآنِ کریم نے اور بھی کئی مواقع پر اس برائی کی سخت مذمت کی ہے۔ اور انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپنے اور تولنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اور قومِ شعیب کے جس جرم کی وجہ سے عذاب نازل ہوا، اس کو نشان زد کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ناپ تول میں کمی کرنے کا عام مرض ان میں پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی مسلسل نصیحتوں پر بھی کان دھرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ البتہ صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت عمر فاروقؓ کے بعض اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تطفیف کے عمل کو صرف ناپ تول تک محدود نہیں سمجھتے تھے بلکہ جو شخص بھی فرائض کی ادائیگی میں کمی کرتا تھا یا کسی کام کو صحیح طریقے سے ادا نہ کرتا وہ اسے تطفیف قرار دیتے تھے اور اسے ایک بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ کسی شخص کو حضرت عمر فاروقؓ نے جلدی جلدی نماز پڑھتے دیکھا، تو آپؓ نے فرمایا تم نے نماز میں تطفیف کی ہے۔ اس لحاظ سے اس نہایت مہلک جرم میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے جس پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّہُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ④ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ⑤
یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ⑥

(کیا یہ گمان نہیں رکھتے کہ یہ لوگ اٹھائے جانے والے ہیں۔ ۴) ایک عظیم دن کی حاضری کیلئے۔ ۵)
اس دن لوگ اٹھیں گے رب العالمین کے سامنے حاضری کیلئے۔ ۶)

اس خصلتِ بد کا سبب

لوگوں کی اس خصلتِ بد کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک دن وہ اٹھائے بھی جائیں گے۔ کیونکہ وہ اسی دنیا کو اصل زندگی سمجھتے ہیں اور موت کو اس زندگی کا مکمل خاتمہ جانتے ہیں، جس کے بعد کسی نئی زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ مرنے کے بعد ہر شخص مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے تو نئی زندگی کا کیا سوال ہے۔ یہی زندگی ہے جس میں انسان کے راحت و غم کی دنیا پھیلی ہوئی ہے۔ جس شخص کو جو بھی حاصل کرنا ہے اسی زندگی میں کرنا ہے۔ اور جس نے جو کچھ کھو دینا ہے اس زندگی کے بعد اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ یہیں کی خوشیاں حقیقی خوشیاں ہیں اور یہیں کے غم حقیقی غم ہیں۔ اس لئے کسی طرح بھی چاہے وہ طریقہ کتنا بھی غلط کیوں نہ ہو، اگر کوئی فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے تو اسے حاصل کرنا زندگی کی ضرورت ہے۔ اور اس سے اجتناب کرنا اپنی محرومیوں میں اضافہ کرنا ہے۔ اخلاق نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں۔ یہاں تو صرف منفعت کا حصول ہے وہ جیسے بھی میسر آ جائے۔ یہ ہے وہ اصل مرض جس نے انہیں بے ایمان اور بد دیانت بنا رکھا ہے اور اس کیلئے ہر کمینگی ان کے نزدیک گوارا ہے۔

کاش انہیں معلوم ہوتا کہ انہیں ایک عظیم دن کی حاضری کیلئے اٹھایا جانا ہے۔ اور اس کو عظیم دن اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس میں تمام انسانوں اور جنوں کا حساب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں بیک وقت لیا جائے گا۔ وہاں سب حاکم و محکوم، امیر اور غریب اور گورے اور کالے سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔ سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کیلئے حاضر ہونا پڑے گا۔ ہر ایک سے ان کے اعمال کی پرسش ہوگی اور پھر اسی کے مطابق وہ جزاء و سزا پائیں گے۔

Marfat.com

اگر اس تصور کا کوئی شمہ بھی ان کے اندر موجود ہوتا تو یہ کبھی اس طرح کی حرکتیں نہ کر سکتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آخرت کا استحضار ہی انسان کو راہِ راست پر رکھ سکتا ہے۔ جیسے جیسے یہ تصور ماند پڑتا ہے، انسان خواہشِ نفس کا اسیر ہو جاتا ہے۔ مفادات کی ہوس اس کی رہنما بن جاتی ہے اور وہ زندگی کی ہر قدر کو ہوس کی قوت سے پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ آخرت کا تصور ہی انسان کو یقین دلاتا ہے کہ تم ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہو، تمہارے اعمال لکھے جا رہے ہیں، موت تمہارا خاتمہ نہیں کرے گی بلکہ مہلتِ عمل کو ختم کر دے گی پھر تمہیں جوابدہی کیلئے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے جہاں ایک ایک عمل کا حساب ہوگا اور اسی کے مطابق جزاء یا سزا ہوگی۔ یہی وہ تصور ہے جو انسان کے پاؤں کی زنجیر بن سکتا ہے ورنہ اس کے سدھار کی اور کوئی شکل نہیں۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿٧﴾

(ہرگز نہیں! یقیناً بدکاروں کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے۔ ۷)

مخاطبوں کے زعمِ باطل کی تردید

كَلَّآ کا معنی ہے ہرگز نہیں۔ یہ مخاطب کے زعمِ باطل کی تردید کیلئے آتا ہے۔ اور اس میں ایک طرح کی زجر اور ڈانٹ بھی ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے مخاطبین نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ اولاً تو قیامت کے آنے کا کوئی امکان نہیں، اور اگر آ ہی گئی تو ہمارے لئے فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں ہمیں دولت و ثروت سے نوازا ہے، اسی طرح ہمیں قیامت کے دن بھی نوازا جائے گا۔ اور اگر کوئی جواب طلبی ہوئی بھی تو ہم اپنے دیوتاؤں اور شفاعت کرنے والوں کی مہربانی سے چھوٹ جائیں گے۔ اس لئے ہمیں کسی قسم کی جوابدہی کرنا نہیں پڑے گی۔ ان کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم نے جس قسم کے فضول تصورات کے سہارے اپنی عاقبت برباد کر رکھی ہے تمہیں اس خوش فہمی سے نکلنا چاہئے۔ قیامت جزاء کا دن ہے، اور جزاء کی بنیاد ایمان و عمل پر ہوگی۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہاں صاحبِ ایمان و عمل لوگ اور کفار و فجار انجام کے اعتبار سے برابر رکھے جائیں۔ اس دن ان دونوں میں غایت درجہ دوری اور امتیاز ہوگا۔ فجار کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے۔ اور ابرار کے اعمال نامے علیین میں ہوں گے اور اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ جس طرح سجین اور علیین مشرق اور مغرب کی دوری رکھتے ہیں، اسی طرح فجار اور ابرار بھی اس روز الگ الگ انجاموں سے دوچار ہوں گے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿٨﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٩﴾

(اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے؟ ۸) وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے۔ ۹)

Marfat.com

سجین کی تحقیق

سجین، سجن سے ہے، قید خانے کو کہتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے چونکہ اس کے مفہوم کی خود وضاحت کردی ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس سے لغوی معنی مراد نہیں بلکہ وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے جس میں تمام مجرمین کا سارا ریکارڈ بشکلِ تحریر محفوظ کیا جاتا ہے۔ مرقوم سے شاید اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قیامت کو ایک وہم سمجھنے والے یہ مت بھول لیں کہ ان کے اعمال کا سارا ریکارڈ ایسی جگہ پر رکھا گیا ہے جو خود یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ اور دوسری یہ بات کہ اسے تحریری شکل میں رکھا گیا ہے جس میں کسی غلطی اور کمی بیشی کا کوئی احتمال نہیں۔ اور قیامت کے دن چونکہ نہایت عدل کے ساتھ فیصلہ ہوگا ہر ایک شخص کے ہاتھ میں اس کا نامۂ عمل دے دیا جائے گا جسے دیکھ کر وہ خود اندازہ کرے گا کہ میرے جرائم کی فہرست فرضی نہیں بلکہ حقائق وشواہد پر مبنی ہے۔ اور جب اس کو تفصیل سے دیکھے گا تو اسے حیرانی ہوگی کہ یہ کیسا اعمال نامہ ہے لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّآ اَحْصٰھَا ''جس نے نہ کسی بڑی بات کو چھوڑا ہے اور نہ چھوٹی بات کو، ہر ایک چیز کو شمار کرلیا ہے۔''

یہ بھی خیال رہے کہ سجین کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سجین کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ تم کیا جانو، سجین کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوبِ بیان سجین کی ہیبت اور اس کے ہول کو ظاہر کرنے کیلئے اختیار فرمایا گیا ہے کہ تم اسے کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ جس کا نام ہی ڈرا دینے کیلئے کافی ہے اس کے حقیقی خوف کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سجین ایک مقامِ خاص کا نام ہے اور کفار وفجار کی ارواح اسی مقام پہ رکھی جاتی ہیں اور ان کے اعمال ناموں کا مقام بھی یہی ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ مقام کس جگہ ہے، اس کے متعلق حضرت براء بن عازب کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سجین ساتویں زمین کے نچلے طبقہ میں ہے۔ اور علیین ساتویں آسمان میں عرشِ الٰہی کے نیچے ہے۔ (مظہری) بعض روایاتِ حدیث میں یہ بھی ہے کہ سجین کفار وفجار کی ارواح کا مستقر ہے۔ اور علیین مومنین اور متقین کی ارواح کی جگہ ہے۔

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیْنَ یُکَذِّبُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۱۱﴾

(تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کیلئے۔ ۱۰) جو روزِ جزاء کو جھٹلاتے ہیں۔ ۱۱)

سابقہ مضمون کو مزید واضح اور محکم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کو ایک وہم سمجھ کر نظر انداز کرنے اور جھٹلانے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آج تو تم نے اسے مذاق سمجھ رکھا ہے لیکن جب اس دن کا ظہور ہوگا تو اندازہ ہوگا کہ اس دن کے جھٹلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کو کیسی صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تب انہیں معلوم ہوگا کہ ہم جس دن کو جھٹلاتے رہے ہیں وہ درحقیقت جزاء کا دن ہے۔ جس میں اپنے ایک ایک عمل کے بارے میں جوابدہی کرنا ہوگی، اور اسی کے مطابق سزا کا تعین ہوگا۔ اور پھر تا ابد اس سزا میں گرفتار رہنا ہوگا۔ دنیا میں انسان کیلئے آگ کا ایک شعلہ بھی ناقابلِ برداشت ہے، اس روز ان کا کیا حال ہوگا جب وہ اپنے چاروں طرف ایسی آگ دیکھیں گے جسے دنیا کی آگ سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

Marfat.com

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾

(اور اس روزِ جزاء کو نہیں جھٹلاتا مگر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا اور حق تلفی کرنے والا ہے۔ ۱۲)

قیامت کا انکار کرنے والے دو بیماریوں کے مریض ہیں

یوں تو قیامت کا انکار کرنے والے ہر دور میں بہت سے لوگ گزرے ہیں لیکن اس آیتِ کریمہ میں انگلی رکھ کر بتا دیا گیا ہے کہ ان کی تعداد پر نہ جایئے، اصلاً دو بیماریاں ہیں۔ جو لوگ بھی اس کے مریض ہوتے ہیں وہ ہمیشہ روزِ جزاء کا اس لئے انکار کرتے ہیں کہ وہ اس کا سامنا نہیں کر سکتے۔ انہیں خوف اپنی بداعمالیوں کی جوابدہی کا ہوتا ہے، لیکن اس پر پردہ ڈالنے کیلئے قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ اور اپنی بداعمالیوں کا کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود جانتے ہیں کہ ان کے عذرات میں کوئی جان نہیں۔ سورۃ القیامہ میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ''بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے چاہے وہ کتنے ہی عذرات تراشے۔'' وہ دو بیماریاں اعتداء اور اثم ہے۔ اعتداء کہتے ہیں حدود کے پامال کرنے اور ہر پابندی کو توڑ کر نکل بھاگنے کو۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام اور حدود کو توڑنا بھی ہے اور بندوں کے حقوق کو پامال کرنا بھی۔ اور اثم، دوسروں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو دبا بیٹھنے کا نام ہے۔ انسان کی عملی کج روی کی یہی دو علامتیں ہیں جس کی ابتداء ہمیشہ فکری کج روی سے ہوتی ہے۔ جو لوگ ان دو بیماریوں کے مریض ہوتے ہیں وہ چونکہ روزِ جزاء کا سامنا نہیں کر سکتے اس لئے وہ قیامت کا انکار کرتے ہیں۔

یہ بات یاد رہے کہ جزاء و سزا کا تعلق جس کی بنیاد عدل ہے اس کی شہادت ہر انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص دوسروں کے ساتھ ناپ تول میں زیادتی کرتا ہے وہ کبھی اپنے ساتھ اس زیادتی کو پسند نہیں کرتا۔ ہو سکے تو اسے برداشت کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی فطرت میں یہ بات ہے کہ ناپ تول میں کمی بیشی اسی طرح حقوق کی پامالی چونکہ عدل اور انصاف کے خلاف ہے اس لئے یہ نہیں ہونی چاہئے۔ اور جب یہ زیادتی خود اس کے اپنے ساتھ ہوتی ہے تو اس کا یہی احساس احتجاج بن جاتا ہے۔ لیکن دوسروں کے ساتھ جب وہ خود یہ حرکت کرتا ہے تو مفادات کی ہوس اور حُبِ زر اس کی فطرت کیلئے پردہ پوش بن جاتی ہے۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

(اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ۱۳)

مکذبین کا طریقِ تکذیب

قیامت اور روزِ جزاء چونکہ انسانی فطرت کی پکار اور اخلاقیات کا تقاضا ہے۔ اس لئے کوئی شخص بھی جو فطری سلامتی سے محروم نہیں ہو گیا اور اخلاق سے اس کا دامن بالکل خالی نہیں ہو گیا وہ قیامت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے جب بھی قرآنِ کریم کی وہ آیات جن میں قیامت اور روزِ جزاء کی خبر دی گئی ہے اور ان پر دلائل بھی دیئے گئے ہیں اور جن امتوں نے اس کا انکار کیا اور نتیجتاً اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مورد بنیں، ان

Marfat.com

کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ تو قیامت کے انکار کیلئے چونکہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں اس لئے وہ ایک ہی فقرے میں اس کی تکذیب کر دیتے ہیں کہ یہ سب پہلے لوگوں کی باتیں، ان کے قصے اور ان کے افسانے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جس کا جواب دینے کی ضرورت ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ بے سروپا اور نامعقول بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اس کا جواب دینے کی بجائے جو ان کے انکار کی حقیقی وجہ ہے اگلی آیت میں اس سے پردہ اٹھایا ہے۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

(ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ۱۴)

تکذیب کا اصل سبب

رَانَ، رین سے مشتق ہے۔ اس کے معنی زنگ اور میل کے ہیں۔ یعنی ان کے انکارِ قیامت کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے پاس انکار کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ حدود کی پامالی، حق شکنی اور حق تلفی پر مبنی جن اعمال کے عادی ہو چکے ہیں اور انہیں چھوڑنے کا تصور بھی ان کے نزدیک تکلیف دہ ہے ان کے ان اعمال کا زنگ اور میل ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب حق کی کوئی بات ان کے دلوں کے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ زنگ ایسا شدید ہے کہ یہ دلوں کے نور کو بجھاتا اور ان کی صلاحیت کو سلب کر لیتا ہے۔ اور انسان برے بھلے کی تمیز سے محروم ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر اس نے توبہ کر لی اور اس پر نادم ہو کر اپنے عمل کو درست کر لیا تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور دل اپنی اصلی حالت پر منور ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس نے توبہ نہ کی بلکہ اپنے گناہوں پر زیادتی کرتا چلا گیا تو یہ سیاہی اس کے سارے قلب پر چھا جاتی ہے۔ اسی کا نام رَین ہے جو قرآنِ کریم کی اس آیت میں مذکور ہے۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾

(ہرگز نہیں! بیشک وہ اپنے رب سے اس سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔ ۱۵)

مکذبین کی بدنصیبی

یعنی ان کا گمان تو یہ ہے کہ قیامت کے وقوع کا کوئی امکان نہیں۔ اور اگر آ ئی بھی تو ہمارے دیوتا ہمیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچا لیں گے۔ جبکہ ان کی بدنصیبی کا عالم اس دن یہ ہوگا کہ ان کی خواہش ہوگی کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے روبرو جانے کا موقع ملے اور ہم منت سماجت کر کے اور رو دھو کر اپنے جرائم بخشوا لیں۔ لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی دید اور زیارت سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ یہ ایسی اوٹ میں رکھے جائیں گے جہاں اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت، اس کے افضال و عنایات اور اس کے انوار و تجلیات کے مشاہدے سے بالکل محروم رہیں گے۔

Marfat.com

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ انسان بگاڑ کا شکار کیسا بھی ہو جائے اس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور طلب موجود رہتی ہے۔ دنیا کے عوارض اس پر غلبہ پالیتے ہیں تو دنیا میں یہ چاہت مغلوب رہتی ہے۔ لیکن قیامت کے دن جب ہر طرف ہولنا کی کا بسیرا ہوگا اور شفقت کی نگاہ اگر کہیں سے میسر آ سکتی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی۔ اور یہ لوگ یہ چاہیں گے کہ ہمیں آج اللہ تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہونے کا موقع ملے تو شاید ہم اس ہولنا کی سے نکل سکیں۔ لیکن انہیں اس سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾

(پھر وہ جہنم میں جا پڑیں گے۔ ۱۶) پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ ۱۷)

ان بدنصیبوں کا انجام

یہ ان بدنصیبوں کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ پھر وہ جہنم میں جا پڑیں گے، یعنی انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اور جب وہ اپنی سزا کی شدت پر چیخ و پکار کریں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اب کیوں چیختے ہو، یہی تو وہ چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے ہو۔ دونوں آیتوں میں ثُمَّ کی تکرار سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ بات بطورِ خاص ان سے کہی جائے گی تاکہ ان کی سرِ عام رسوائی کا سامان ہو کہ زندگی میں جس چیز کی مخالفت کرتے رہے ہو اب اسی کو دیکھو اور اس کا مزہ چکھو۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾

(ہرگز نہیں! بیشک نیک آدمیوں کے نامۂ اعمال علیین میں ہوں گے۔ ۱۸)

ابرار کا مقام

کَلَّا، سے قیامت کا انکار کرنے والوں کے اس خیال کی تردید کرنا مقصود ہے کہ کوئی جزاء و سزا واقع نہیں ہوگی۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ جزاء و سزا کے واقع نہ ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ نیک اور بد یکساں ہوں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نیک و بد برابر نہیں ہیں بلکہ اوپر ہم پڑھ چکے ہیں کہ فجار کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے۔ تو ان کے اعمال کے اعتبار سے یہی ان کا اصل مقام ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ابرار کو جس شان اور بلندی سے نوازے گا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے اعمال نامے علیین میں ہوں گے۔ یعنی یہ دونوں کسی موقع پر بھی قیامت کے دن ایک جیسے سلوک کے مستحق نہیں ہوں گے۔ ایک ذلتوں کے حصار میں ہوگا تو دوسرے پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نچھاور ہو رہی ہوں گی۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾

(اور تم کیا جانو کہ علیین کیا ہے۔ ۱۹)

Marfat.com

علیین کی تحقیق

علیین کی عظمت وشان کے اظہار کیلئے یہ اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی جگہ ہے یا ایسی چیز ہے جس کی عظمت وشان کا اندازہ اس دنیا میں نہیں کیا جاسکتا۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾

(ایک لکھا ہوا دفتر ۲۰) مقربوں کی نگرانی میں۔ ۲۱)

یعنی علیین کا لغوی مفہوم مراد نہیں بلکہ اس کا ایک اصطلاحی مفہوم ہے اور وہ، وہ ہے جس کی اس آیت میں وضاحت کردی گئی ہے کہ وہ ایک دفتر ہے جس کی ہر چیز ضبطِ تحریر میں آئی ہوئی ہے۔ اور جس کی نگرانی بھی اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب فرشتے کرتے ہیں۔ یعنی ان کے مقام ومرتبہ کا عالم یہ ہے کہ ان کا نامۂ عمل علیین میں ہے جو نہایت مبارک اور مقدس جگہ ہے۔ اور حدیث کے مطابق جو اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے ہے۔ اور اس کی نگرانی بھی مقرب فرشتے کرتے ہیں۔ بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ تمام مومنین کی ارواح کا مستقر بھی یہی ہے۔ اور وہ بعض احادیث سے اس پر استشہاد بھی کرتے ہیں۔ صاحب معارف القرآن نے انسانی روحوں کے مقام کے حوالے سے ایک نوٹ لکھا ہے، ہم افادۂ عام کیلئے اس کو یہاں نقل کر رہے ہیں۔

انسانی روحوں کا مقام کہاں ہے

اس معاملے میں روایاتِ حدیث بظاہر مختلف ہیں، سجین اور علیین کی تفسیر میں جو روایات اوپر مذکور ہوئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواحِ کفار سجین میں رہتی ہیں جو ساتویں زمین میں ہے اور ارواح مومنین علیین میں رہتی ہیں جو ساتویں آسمان پر زیرِ عرش ہے اور مذکور الصدر روایات میں بعض سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارواحِ کفار جہنم میں اور ارواحِ مومنین جنت میں رہیں گی اور بعض روایاتِ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومنین وکفار دونوں کی روحیں ان کی قبروں میں رہتی ہیں جیسا کہ حضرت براء بن عازب کی طویل حدیث میں ہے کہ جب مومن کی روح کو آسمان میں فرشتے لے جاتے ہیں تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ علیین میں لکھ دو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو کیونکہ اس کو میں نے زمین ہی سے پیدا کیا ہے اور مرنے کے بعد اسی میں لوٹاؤں گا اور پھر اسی زمین سے ان کو دوبارہ زندہ کر کے نکالوں گا۔ اس حکم پر فرشتے اس کی روح کو قبر میں لوٹا دیتے ہیں۔ اسی طرح کافر کی روح کیلئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور یہی حکم ہوگا کہ اس کو اس کی قبر میں لوٹا دو۔ امام ابن عبدالبر نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ سب کی ارواح بعد الموت قبر ہی میں رہتی ہیں۔ ان میں پہلی اور دوسری روایات میں جو یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض سے ارواح مومنین کا...... علیین میں رہنا معلوم ہوتا ہے اور بعض سے جنت میں رہنا، غور کیا جائے تو یہ کوئی اختلاف نہیں

Marfat.com

کیونکہ مقام علیین بھی ساتویں آسمان پر زیرِ عرش ہے اور جنت کا بھی یہی مقام خود قرآنِ کریم کی تصریح سے ثابت ہے۔ عند سدرة المنتهٰی عندها جنة المأوىٰ اس میں تصریح ہے کہ جنت سدرۃ المنتہٰی کے پاس ہے اور سدرہ کا ساتویں آسمان میں ہونا حدیث سے ثابت ہے۔ اس لئے مقامِ ارواح جب علیین ہوا تو وہ جنت کے متصل ہے اور ان ارواح کو جنت کے باغات کی سیر نصیب ہے اس لئے ان کا مقام جنت بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کفار کی ارواح سجین میں ہیں اور وہ ساتویں زمین میں ہے اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہنم بھی ساتویں زمین میں ہے اور اہلِ سجین کو جہنم کی تپش اور ایذائیں پہنچتی رہیں گی اس لئے ان کا مقام جہنم میں کہہ دینا بھی صحیح ہے۔

البتہ اوپر جس روایت میں ارواح کا قبروں میں رہنا معلوم ہوتا ہے یہ بظاہر پچھلی دونوں روایتوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی تطبیق بیہقی زمانہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں یہ بیان کی ہے کہ یہ بات کچھ بعید نہیں کہ اصل مستقر ارواح کا علیین اور سجین ہی ہوں مگر ان ارواح کا ایک خاص رابطہ قبروں کے ساتھ بھی قائم ہو۔ اس رابطہ کی حقیقت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا مگر جس طرح آفتاب ماہتاب آسمان میں ہیں اور ان کی شعاعیں زمین پر پڑ کر اس کو روشن بھی کر دیتی ہیں گرم بھی۔ اسی طرح علیین و سجین کی ارواح کا کوئی رابطہ معنویہ قبروں سے ہو سکتا ہے اور ان تمام اقوال کی تطبیق میں حضرت قاضی ثناء اللہ کی تحقیق سورۃ نازعات کی تفسیر میں ابھی گزر چکی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ روح کی دو قسمیں ہیں ایک جسمِ لطیف ہے جو انسان کے بدن میں حلول کرتا ہے اور وہ مادی اور عنصری جسم ہے مگر لطیف ہے نظر نہیں آتا، اسی کو نفس کہا جاتا ہے۔ دوسری روح جو ہر مجرد ہے مادی نہیں، اور وہ روح مجرد ہی روح اول کی حیات ہے، اس لئے اس کو روح الروح کہہ سکتے ہیں، انسان کے جسم سے تعلق تو ان دونوں قسم کی روحوں کا ہے مگر پہلی قسم جسمِ انسانی کے اندر رہتی ہے اس کے نکلنے ہی کا نام موت ہے۔ دوسری روح کا اس پہلی روح سے تعلق قریب تو ہے مگر اس تعلق کی حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ مرنے کے بعد روح اول تو آسمانوں میں لے جائی جاتی ہے پھر قبر میں لوٹا دی جاتی ہے اس کا مستقر قبر ہی ہے اسی پر عذاب و ثواب ہوتا ہے اور روح مجرد علیین یا سجین میں رہتی ہے۔ اس طرح اقوال جمع ہو گئے مستقر ارواح کا جنت یا علیین میں یا اس کے بالمقابل جہنم یا سجین میں ہونا روح مجرد کے اعتبار سے ہے اور ان کا مستقر قبر میں ہونا روح کی قسم اول یعنی نفس کے اعتبار سے ہے جو جسمِ لطیف ہے اور مرنے کے بعد قبر میں رہتا ہے۔ واللہ اعلم

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾
تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ ﴿۲۴﴾

(بیشک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ ۲۲) اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے۔ ۲۳)
تم ان کے چہروں پر آسائش کی بشاشت محسوس کرو گے۔ ۲۴)

Marfat.com

ابرار کی عزت افزائی

اللہ تعالیٰ کے وفادار بندے جنہوں نے اپنی زندگیاں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت، اس کی نعمتوں کا ادائے شکر اور اس کے دین کی سربلندی میں گزاریں، وہ فجار کے انجام کے بالکل برعکس نعمتوں میں گھرے ہوئے ہوں گے۔ ان کی نگاہ جدھر بھی اٹھے گی ہر طرف نعمتیں چھائی ہوئی ہوں گی۔ ایک عیش کی زندگی ہوگی جس سے وہ بہرہ اندوز ہوں گے۔

فجار کو تو اللہ تعالیٰ کی دید سے محروم رکھ کر جہنم کے گڑھوں میں پھینک دیا جائے گا۔ لیکن ابرار کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے تختوں اور بلند مسندوں پر بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کی شانیں اور جلوے دیکھیں گے۔ اور قرآنِ کریم کی بعض دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خواہش پر جہنم میں جلتے ہوئے ان کے دشمنوں کو بھی دکھادیا جائے گا۔ جس سے انہیں اندازہ ہوگا کہ کافروں کے ساتھ وہی حشر ہو رہا ہے جس کے بارے میں انہیں تنبیہ کی جاتی رہی ہے۔

نعمتوں سے سرشاری کی کیفیت یہ ہوگی کہ ہر دیکھنے والا ان ابرار کے چہروں پر تازگی اور بشاشت دیکھے گا۔ نضرۃ تازگی اور بشاشت کو کہتے ہیں۔ جب کوئی خوشی اور مسرت آدمی کے نہاں خانہ میں اتر جاتی ہے تو آدمی کا انگ انگ اس کو محسوس کرتا ہے اور چہرے پر وہ بشاشت بن کر جھلکنے لگتی ہے جس سے دوسروں کو اس کی خوشی کا اندازہ ہوتا ہے۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾
وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢٨﴾

(انہیں بہترین سربند شراب پلائی جائے گی۔ ۲۵) جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی، جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ ۲۶) اس شراب میں تسنیم کی ملونی ہوگی۔ ۲۷) یہ چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے۔ ۲۸)

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو جن نعمتوں سے نوازا جائے گا اور ان کی مجلسی زندگی جن نعمتوں سے معمور ہوگی ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہیں شرابِ خالص اور بہترین شراب کے جام پلائے جائیں گے۔ اور یہ شراب سربمہر ہوگی۔ سب سے پہلے انہی کیلئے کھولی جائے گی۔ اور اس کو سربمہر کرنے کیلئے کسی اور چیز کو نہیں بلکہ مشک اور کستوری کو استعمال کیا جائے گا۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ شراب پینے والے شراب پینے کے بعد اپنے منہ سے کستوری کی خوشبو محسوس کریں گے۔ جبکہ دنیا کی عام شراب صرف مزے میں ہی کڑوی نہیں ہوتی بلکہ اس کی بوتل کھولتے ہی بدبو کے بھپکے نکلتے ہیں۔ لوگ عادت سے مجبور ہو کر یا نشے کی تلاش میں اسے پینے کی خواہش تو پالتے ہیں لیکن یہ وہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک بدذائقہ اور بدبودار چیز ہے۔ وقتی طور پر سرور دیتی ہے لیکن بعد میں خمار بدن شکن بھی واقع ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو مجلسی زندگی کے رکھ رکھاؤ کیلئے جو شرابِ طہور پلائی جائے گی نہ اس میں بدبو ہوگی نہ وہ بدمزہ ہوگی نہ اس میں خمار ہوگا، پینے والا اپنے منہ سے کستوری کی مہک نکلتے ہوئے محسوس کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت کی نعمتوں کا ایک اجمالی تصور بعض نعمتوں کے ذکر سے دینا مقصود ہے۔

Marfat.com

لیکن جنت کی اصل صفات و کیفیات عالمِ آخرت کا معاملہ ہے اور اس کی لطف و لذت بھی دنیا میں قیاس سے ماورا ہے۔ البتہ یہ کہہ کر ترغیب اور تشویق میں اضافہ کر دیا گیا ہے کہ اگر لطف و لذت کی دنیا میں کسی کو محنت کرنے اور جان مارنے کا شوق ہو تو یہ ہیں وہ نعمتیں جن میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دنیا کی حقیر نعمتیں اس قابل نہیں ہیں کہ ایک مومن آخرت کی ان نعمتوں کی فکر کرنے کی بجائے دنیا کی نعمتوں کے حصول میں وقت ضائع کرتا پھرے۔

شراب ہی کے بارے میں مزید فرمایا کہ شراب پینے والے شراب کے کیف میں اضافہ یا اس میں اعتدال پیدا کرنے کیلئے کوئی نہ کوئی چیز ملاتے ہیں اسے ملونی کہتے ہیں اور قرآنِ کریم نے اسے مزاج کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ ملونی اور امتزاج تسنیم کے پانی سے لیا جائے گا۔ تسنیم عام طور پر بلندی سے نیچے اترنے والے چشمے کو کہتے ہیں۔ اور جو لوگ پہاڑوں کے قدرتی مناظر کو دیکھنے کا تجربہ رکھتے ہیں وہ ایسے پہاڑی چشمے کی خوبصورتی کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بلندی سے نیچے آبشار کی صورت میں گر رہا ہو۔ جس چشمے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے اس کی صرف خوبصورتی ہی نہیں بلکہ اس کے لطف و لذت اور اس کے اعتدال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اہلِ جنت اس کا پانی لطف و لذت میں اضافے یا اعتدال کیلئے شراب میں ملونی کے طور پر استعمال کریں گے۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا خاص قرب حاصل ہے وہ اس چشمے سے سیراب بھی ہوں گے۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ آیت اٹھائیس میں بِھَا کی ''ب'' ظرفیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مقرب لوگ اس چشمے کے کنارے بیٹھ کر شراب نوشی کا مزہ اٹھائیں گے۔ کیونکہ مے نوشی کا مزہ جو کسی چشمے یا ندی کے کنارے پر بیٹھ کر آتا ہے وہ کسی کمرے میں بیٹھ کر نہیں آ سکتا۔ یہ مقربین کی مے نوشی ہے یہ بھی اس چشمے کے کنارے پر ہوگی تاکہ لطف و لذت کے حصول میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِیْنَ ﴿۳۱﴾

(بیشک جو لوگ مجرم رہے ہیں وہ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ ۲۹) اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں سے ان کی طرف اشارے کرتے تھے۔ ۳۰) اور جب اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے۔ ۳۱)

اس سے پہلے کی آیات میں فجار اور ابرار کا انجام بیان ہوا ہے۔ اب ایک اور پہلو سے ان دونوں میں تقابل کرتے ہوئے انقلابِ حال کی تصویر کھینچی جا رہی ہے کہ یہ فجار وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں ایک سے ایک بڑا جرم کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے مجرمانہ زندگی گزاری۔ اخلاق کی کوئی قدر ان کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچ نہ سکی۔ اس کے باوجود دولت و ثروت کے نشے میں ان کا حال یہ تھا کہ جو غریب مسلمان ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر جرائم کے اندھیروں میں ایمان اور اخلاق کی مشعل روشن کرنا چاہتا تھا تو یہ اس کی غربت کا مذاق اڑاتے۔ اور اپنی فقرہ بازیوں اور پھبتیوں سے اس کا جینا دوبھر کر دیتے۔ ان کے نزدیک عزت کا معیار چونکہ صرف دولت تھی یا عہدہ و منصب۔ اس لئے کردار کا اجلاپن اور معاملات میں صفائی ستھرائی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے یہ ہر ممکن طریقے سے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جب کبھی وہ غریب مسلمان ان کے پاس سے گزرتے یا یہ فراعنہ صفت لوگ ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں کے اشاروں سے ان کے دلوں پر چرکے لگاتے۔ اور بظاہر ان کی تذلیل کا سامان کرنے کی کوشش کرتے۔ اور ان کرتوتوں کے بعد

Marfat.com

جب اپنے گھر لوٹتے تو اپنے اہلِ خانہ میں بیٹھ کر مزے لے لے کر اپنی حرکتوں کی روداد سناتے کہ آج ہم نے فلاں شخص کو اس طرح پھبتیوں کا نشانہ بنایا، فلاں کے اس طرح لتے لئے، فلاں کے ساتھ اس طرح بدتمیزی کی کہ وہ اپنی شرافت کے ہاتھوں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔ بس کچھ نہ پوچھو آج تو مزہ ہی آ گیا۔ یہ لوگ بھی مدتوں یاد رکھیں گے کہ کس سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ دراصل چاہتے یہ تھے کہ جس طرح گھروں سے باہر کی دنیا مسلمانوں کیلئے عذاب بن گئی ہے اور ہر جگہ ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ہمارے گھروں میں بھی اگلی پیدا ہونے والی نسل ہمارے رویئے کی نمائندہ ہونی چاہئے۔ جب یہ بچے ہر روز اپنے بڑوں کی نفرت کا اظہار دیکھیں گے تو وہ بھی بڑے ہو کر یہی کچھ غنڈہ گردی کریں گے۔ اس طرح سے مسلمانوں کیلئے زندگی مزید عذاب ہو جائے گی۔

وَاِذَا رَاَوۡهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ ﴿۳۲﴾

(جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے یہ بالکل گمراہ ہیں۔ ۳۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کی تمام تر مخالفت کے باوجود مسلمانوں کا حُسنِ کردار اور حُسنِ سلوک دھیرے دھیرے لوگوں پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اور بہت سے لوگوں کے ذہن متاثر ہو رہے تھے۔ لوگ سوچنے لگے تھے کہ جو شخص بھی ایمان قبول کر لیتا ہے آخر اس کے اندر ایسی حیرت انگیز تبدیلی کیوں آنے لگتی ہے کہ اس کی ہر چیز بدل جاتی ہے۔ وہ باقی لوگوں سے الگ تھلگ خوبصورت کردار کی تصویر بن جاتا اور اس کے قول و عمل کا تضاد ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ تبدیلی یقیناً اس دین کی صداقت کی دلیل ہے جس کے یہ لوگ ماننے والے ہیں۔ قریش نے جب اس تأثر کو پھیلتے ہوئے دیکھا اور لوگوں میں پذیرائی نظر آنے لگی تو انہیں فکر ہوئی۔ اور اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ جب بھی مسلمانوں سے آمنا سامنا ہوتا اور ان کے اپنے ہم خیال لوگ بھی موجود ہوتے تو وہ مسلمانوں کے بارے میں تبصرے شروع کر دیتے کہ یہ لوگ انتہائی گمراہ ہیں، انہوں نے اپنے آبائی دین سے انحراف اختیار کیا ہے، یہ ملتِ ابراہیمی کے دشمن ہیں، ان کی وجہ سے ہمارا قومی شیرازہ بکھر رہا ہے۔ بس ان کے پیغمبر نے انہیں کچھ جنت کی ایسی امیدیں دلائی ہیں کہ انہوں نے دنیا کے بہت سے فائدوں اور لذتوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیا ہے۔ اور جہنم سے ایسا ڈرایا ہے کہ ان کے دین کے راستے میں جو مصائب پیش آ رہے ہیں انہیں اس خیال سے یہ خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے ہیں کہ اس کی وجہ سے آخرت میں جہنم سے بچ جائیں گے۔ تو یہ کیسے بھٹکے ہوئے لوگ ہیں جنہوں نے چند موہوم چیزوں کی خاطر اپنی زندگی کو خوشیوں سے محروم کر لیا ہے۔ اس طرح سے وہ لوگوں کو مسلمانوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

وَمَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَيۡهِمۡ حٰفِظِيۡنَ ﴿۳۳﴾

(حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ ۳۳)

اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب مسلمان کفار کے غلط عقائد، غلط خیالات اور غلط اعمال پر تنقید کرتے تھے تو کفار جواب میں یہ کہتے کہ ان لوگوں کو ہمارے رویئے پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے۔ یہ کون ہوتے ہیں ہمارے خیالات پر تبصرے کرنے والے۔ معاشرتی طور پر یہ لوگ اس قابل نہیں کہ انہیں منہ لگایا جائے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے ہر بات پر صحیح اور غلط ہونے کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ اس لحاظ سے یہ آیت کفار ہی کے قول کا ایک حصہ ہے۔ اور دوسرا مطلب

Marfat.com

یہ ہے کہ کفار جو مسلمانوں کو ضال اور مضل ٹھہراتے ہیں اور انہیں بہکا ہوا قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ کفار ان پر کوئی نگران یا اتالیق تو مقرر نہیں کئے گئے۔ انجام کے اعتبار سے دونوں معنوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ بتانا تو صرف یہ ہے کہ کفار ہر وقت مسلمانوں کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے اور عام لوگوں کے سامنے انہیں گمراہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ لوگوں کو مسلمانوں کے اثرات سے بچایا جائے۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

(پس آج وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں کفار کے حال پر ہنس رہے ہیں۔ ۳۴)

دنیا میں کفار کے طرزِ عمل کی تصویر دکھانے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن کس طرح صورتحال بدلے گی کہ دنیا میں جو لوگ مسلمانوں پر ہنستے اور مذاق اڑاتے رہے ہیں آج ان پر ہنسا جائے گا۔ جس طرح وہ مسلمانوں کی بے سروسامانی اور بے چارگی کو تضحیک واستہزاء کا موضوع بناتے تھے آج قیامت کے دن مسلمان ان کی بے بسی پر ہنسیں گے۔ اور جائز طور پر ان کے گزشتہ اطوار کا حوالہ دیتے ہوئے کہیں گے کہ کہاں گیا وہ ٹھاٹ باٹ اور کہاں گیا ان کا وہ فرعون صفت رویہ اور کہاں گیا ان کا وہ نفرت کا اظہار۔ آج کیسے مظلوم بنے ہر ذلت کو برداشت کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو جنت میں بیٹھے ہوئے ہی کفار کا حال بھی دکھایا جائے گا۔ انہیں دیکھ کر ہی ان کا سابقہ رویہ یاد آنے پر اور اب ان کے رویے کو دیکھتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جائے گی۔

عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

(مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں۔ ۳۵)

اہلِ ایمان جب کفار کی گت بنتے ہوئے دیکھ کر اور سابقہ رویہ یاد کر کے بے ساختہ ہنسیں گے اس وقت ان کے مقام ومرتبہ کا حال یہ ہوگا کہ وہ بڑی عالی شان مسندوں پر بادشاہوں کی طرح براجمان ہوں گے۔ ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے کسی شاہی مہمان کی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان پر نثار ہو رہی ہوں گی۔ وہ اپنے اس اعزاز پر خوش وخرم ہوں گے اور ان بدنصیبوں کے برے انجام پر دکھ محسوس کرتے ہوئے ان کے رویے کو یاد کر کے ہنسیں گے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

(کیا مل گیا کفار کو ان کے کئے کا بدلہ جو وہ کیا کرتے تھے۔ ۳۶)

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پروردگار کی طرف سے اصحابِ ایمان سے کفار کا منظر دکھا لینے کے بعد پوچھا جائے گا کہ کیا کفار کو ان کی ان تمام حرکتوں کا پورا پورا بدلہ مل گیا ہے جو وہ دنیا میں تمہارے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان آخرت میں جنت میں تختوں پر بیٹھے ہوئے جہنم میں جلنے والے ان کافروں کا حال دیکھیں گے جو دنیا میں کبر وغرور کا نمونہ تھے، تو اپنے دلوں میں خیال کریں گے کہ انہیں ان کے اعمال کا خوب ثواب مل گیا ہے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس فقرے میں ایک گہرا طنز بھی ہے اور مسلمانوں کیلئے تسلی اور اطمینان کا اظہار بھی۔

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاقِ

(۸۴)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْاِنْشِقَاقِ ہے۔ یہ اس سورۃ کی پہلی ہی آیت اِنْشَقَّتْ سے ماخوذ ہے۔ یہ فعل ماضی ہے اور اِنْشِقَاقِ اس سے مصدر ہے۔

زمانۂ نزول:۔ معنوی اعتبار سے اسے گزشتہ سورۃ سے نہایت مشابہت ہے۔ اندازِ بیان بھی ملتا جلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سورتوں کا زمانۂ نزول قریب قریب ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ کیونکہ ابتدائی سورتوں میں قیامت کے تصور پر بہت زور دیا گیا ہے اور لوگوں کو احساس دلایا گیا ہے کہ ایک دن آنے والا ہے جب تمہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

پہلی پانچ آیتوں میں ظہورِ قیامت کے وقت جو ہلچل برپا ہوگی اس کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے برحق ہونے کی دلیل بھی دی گئی ہے۔ اور یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ قیامت کے دن زمین و آسمان کی یہ مجال نہیں ہوگی کہ وہ اپنے رب کے حکم سے سرتابی کر سکیں۔ اس دن آسمان پھٹ جائے گا، زمین پھیلا کر ہموار میدان بنا دی جائے گی، جو کچھ زمین کے پیٹ میں ہے وہ سب کو نکال کر باہر پھینک دے گی اور بالکل خالی ہو جائے گی۔ زمین و آسمان میں یہ تبدیلیاں اس لئے ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہوگا۔ اور ان کی یہ مجال نہیں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کر سکیں اور ان کیلئے حق بھی یہی ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کریں۔

پھر آیت پندرہ تک انسان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہیں اس کا احساس ہو یا نہ ہو لیکن تم چار و ناچار اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہو، اور وہ منزل قیامت ہے جہاں اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہاں انسان دو حصوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ انسانوں کا ایک حصہ وہ ہوگا جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ اور یہ وہ خوش نصیب ہوں گے جو بغیر کسی قسم کی جوابدہی کے معاف کر دیئے جائیں گے اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں سے جا ملیں گے۔ اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جن کے نامۂ اعمال ان کی پیٹھ کے پیچھے دیئے جائیں گے۔ انہیں اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ ان بدنصیبوں نے

Marfat.com

دنیا میں کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ہماری اصل منزل دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے۔ انہوں نے دنیا ہی کو منزلِ مقصود بنایا اور اصل منزل سے غفلت کی زندگی گزاری۔ انہیں یہ غلط فہمی رہی کہ کبھی اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کیلئے حاضری نہیں ہوگی، حالانکہ ان کا رب ان کے تمام اعمال کو دیکھ رہا تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ سب کچھ دیکھ کر کسی دن باز پرس نہ کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ دنیا کسی حکیم کی تخلیق نہیں بلکہ کسی کھلنڈرے کی تفریح ہے۔ جب اس کا دل چاہے گا اسے ختم کر دے گا۔

اس کے بعد کائنات کے بعض آثار کی اس بات پر شہادت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کے اندر ایک تدریج پائی جاتی ہے۔ اور ہر چیز ہر لحہ خدا کے قانون کی گرفت میں ہے۔ انسان بھی درجہ بدرجہ اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور ایک دن اس کو اس سے دوچار ہونا ہے۔

آخر میں ان لوگوں کو وعید سنائی گئی ہے جو قرآن کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں۔ جو قرآن کو سن کر اللہ تعالیٰ کے آگے جھکنے کی بجائے الٹی تکذیب کرتے ہیں اور ان لوگوں کو بشارت سنائی گئی ہے جو ایمان لا کر عملِ صالح کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ۱	سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ (۸۴)	اٰيَاتُهَا ۲۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۲﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ
مُدَّتْ ﴿۳﴾ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴿۴﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۵﴾
يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنْ
اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿۷﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ﴿۸﴾ وَّيَنْقَلِبُ
اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ
يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِىْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾
اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾
فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قُرِئَ
عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

Marfat.com

رکوع: ا۔ (جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۱) اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا، اور اس کیلئے یہی زیبا ہے۔ ۲) اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ ۳) اور باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے، اور فارغ ہو جائے گی۔ ۴) اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی، اور اس کیلئے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)۔ ۵) اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب ہی کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ ۶) پھر جس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا۔ ۷) اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔ ۸) اور وہ اپنے لوگوں کی طرف نہایت شادمند لوٹے گا۔ ۹) رہا وہ شخص جس کا اعمال نامہ اس کے پیچھے ہی سے پکڑا دیا جائے گا۔ ۱۰) تو وہ موت کو پکارے گا۔ ۱۱) اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ ۱۲) وہ اپنے گھر والوں میں مگن رہا۔ ۱۳) اس نے گمان کر رکھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں۔ ۱۴) ہاں! کیوں نہیں، بیشک اس کا رب اس کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ ۱۵) پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں شفق کی۔ ۱۶) اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ ۱۷) اور چاند کی جبکہ وہ ماہِ کامل ہو جاتا ہے۔ ۱۸) تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف چڑھنا ہے۔ ۱۹) تو پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔ ۲۰) اور جب انہیں قرآن سنایا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔ ۲۱) بلکہ جنہوں نے کفر کیا وہ جھٹلا رہے ہیں۔ ۲۲) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں۔ ۲۳) تو ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔ ۲۴) البتہ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں ان کیلئے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ ۲۵)

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝١ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٢ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝٣
وَاَلْقَتْ مَافِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝٤ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٥

(جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۱) اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا، اور اس کیلئے یہی زیبا ہے۔ ۲) اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ ۳) اور باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے، اور فارغ ہو جائے گی۔ ۴) اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی، اور اس کیلئے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)۔ ۵)

وقوعِ قیامت سے بپا ہونے والی ہلچل

قیامت نام ہی ایک ہمہ گیر انقلاب کا ہے جس میں پہلا جہان مٹ جائے گا اور جہانِ نو وجود میں آئے گا۔ پہلے قوانین کو ختم کر کے نئے نوامیس وقوانین کو رائج کیا جائے گا۔ کائنات کی سب سے بڑی اور مضبوط مخلوق آسمان ہے اس لئے سب سے پہلے اس کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے۔ اہلِ دنیا میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کبھی اتنا بڑا حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ جو لوگ اپنے قلعوں اور محلوں پر مطمئن اور نازاں ہیں وہ کیسے یہ تصور کر سکتے ہیں کہ کبھی آسمان کی چھت بھی ہمارے سروں پر نہیں ہوگی۔ انہیں یہ تصور دیا جا رہا ہے کہ وہ دن کس قدر ہولناک ہوگا جب آسمان کی چھت بھی پھٹ جائے گی تو قلعوں اور گڑھیوں کے نام سے تم نے جو گھروندے بنا رکھے ہیں وہ کہاں باقی رہیں گے۔

Marfat.com

دوسری آیت میں فرمایا کہ آسمان اپنے پھٹنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرے گا۔اور اسے یہی بات زیب دیتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرے۔ اَذِنَ لَہٗ کے معنی ہیں اس نے اس کی بات مان لی، اس کے حکم کی تعمیل کی، اس کے آگے سر جھکا دیا۔

حُقَّ لَہٗ کا معنی ہے کہ اس کیلئے واجب ہے کہ وہ ایسا کرے۔اور اسے یہی بات زیب دیتی ہے کہ وہ یہ کام کرے۔اس سے بتلانا مقصود یہ ہے کہ جب آسمان جیسی بلند، عظیم اور مضبوط چیز کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے بے بس ہے تو اے دنیا کے فراعنہ صفت لوگو! تم کس برتے پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کر رہے ہو۔تمہاری حیثیت تو ایک ذرۂ بے مقدار کی ہے۔تو تم نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے ذرا سوچو اس کا کیا جواز ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں زمین کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب زمین پھیلا دی جائے گی۔پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں جو بہت سی شکنیں اور سلوٹیں ہیں، نشیب و فراز ہیں، وادیاں اور کہسار ہیں، دریا اور سمندر ہیں سب پاٹ دیئے جائیں گے۔سب کی اونچ نیچ برابر کر دی جائے گی۔اور زمین کی تہوں میں جو بے شمار چیزیں چھپی ہوئی ہیں جب اس کی سلوٹیں برابر کر دی جائیں گی اور اس کو ایک چادر کی طرح تان دیا جائے گا تو یہ ساری چیزیں باہر نکل جائیں گی۔اور ان چیزوں کو باہر نکال کر وہ اس طرح فارغ ہو جائے گی جیسے ایک حاملہ وضع حمل کے بعد راحت اور فراغت محسوس کرتی ہے۔اسی کیفیت کو سورۃ طٰہٰ میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو ایک چٹیل میدان بنا دے گا جس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ پاؤ گے۔حاکم نے مستدرک میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''قیامت کے روز زمین ایک دسترخوان کی طرح پھیلا کر بچھا دی جائے گی۔پھر انسانوں کیلئے اس پر صرف قدم رکھنے کی جگہ ہوگی۔'' اس کی وجہ یہ ہوگی کہ جتنے انسان روزِ آفرینش سے لے کر قیامت تک پیدا ہوئے ہوں گے بیک وقت زندہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کئے جائیں گے۔اتنی بڑی تعداد کیلئے موجودہ زمین تو یقیناً بہت چھوٹی ہوگی، اس لئے ضروری ہے کہ سمندر، دریا، پہاڑ، جنگل، گھاٹیاں اور پست و بلند علاقے سب کے سب ہموار کر کے پورے کرۂ زمین کو ایک میدان بنا دیا جائے تاکہ اس پر ساری نوعِ انسانی کے افراد کھڑے ہونے کی جگہ پا سکیں۔

اس سے پہلے جو بات آسمان کے بارے میں فرمائی گئی ہے وہی بات زمین کے حوالے سے کہی جارہی ہے کہ جس طرح آسمان میں تمام تبدیلیاں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں آئی ہیں، اسی طرح زمین بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرے گی اور یہ اطاعت ہی اس کیلئے زیبا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اپنے خالق کی اطاعت سے انحراف نہیں کر سکتی۔لیکن تف ہے انسان پر کہ زمین اور آسمان تو جب تک قائم ہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔اور جب انہیں نئے سرے سے نئی تبدیلیوں کے ساتھ وجود دیا جائے گا تو اس وقت بھی یہ ہر طرح اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کریں گے۔لیکن انسان ان دونوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوئے بھی نافرمانی کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے سمجھانے کے باوجود بھی وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت تو در کنار اس کی بغاوت پر تلا ہوا ہے۔ اسے سوچنا چاہئے کہ اس کا یہ رویہ کہاں تک صحیح ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ۚ﴿۶﴾

(اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب ہی کی طرف چلا جارہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ ۶)

Marfat.com

دنیا کے فریب خوردگان کو تنبیہ

کائنات کی سب سے بڑی دو مخلوقات کی کامل اطاعت وانقیاد اور ان کے حیرت انگیز انجام کو ذکر کرنے کے بعد انسان سے فرمایا جارہا ہے کہ اے انسان! جس طرح زمین و آسمان کو دیکھتے ہوئے کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ یہ دونوں اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں اور آخر ایک روز شکست وریخت کا شکار ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں نئی خدمت تفویض کردے گا۔ لیکن تم نے دیکھا کہ وہ دونوں اپنے انجام سے دوچار ہوئے اور قدرت نے ان سے نئی تبدیلیوں کے ساتھ نیا کام لیا۔ اور ہر قدم پر ان دونوں نے کامل انقیاد کا ثبوت دیا۔ اسی طرح اے انسان! تم بھی اس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہو گے۔ تمہاری یہ قوت وسطوت اور دولت وثروت کے مظاہر اسی طرح ایک روز تباہی کی نذر ہوں گے۔ تم بھی باقی مخلوقات کی طرح ایک انجام کی طرف بڑھ رہے ہو۔ لیکن اپنی دنیوی زندگی کے جھمیلوں اور مسلسل دنیوی کامیابیوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے تمہیں کبھی اپنا انجام یاد نہیں آتا۔ ایک مصروفیت کے بعد دوسری مصروفیت، ایک کامیابی کے بعد دوسری کامیابی اور فتوحات کا مسلسل سفر تمہیں یہ سوچنے کی فرصت نہیں دیتا کہ آخر اس سفر کی کوئی منزل بھی ہے۔ تم خواہی نخواہی اسی منزل کی طرف بڑھ رہے ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ منزل دنیا تو نہیں ہوسکتی کیونکہ دنیا کی صف بھی ایک دن لپیٹ دی جائے گی۔ تمہاری زندگی بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ زندگی کا بھی ایک دن خاتمہ ہوجائے گا۔ وہ منزل یقیناً آخرت ہے جب تمہیں ازسرنو زندہ کرکے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہی کیلئے کھڑا کردیا جائے گا۔ تم اس منزل کے مسافر ہو اور یہ سفر پیدا ہونے کے فوراً بعد شروع ہوجاتا ہے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا، یہ سفر کے مختلف پڑاؤ ہیں۔ یہ سفر کسی توقف کے بغیر جاری رہتا ہے۔ موسم کیسا بھی ہو، حالات کیسے بھی ہوں اس سفر میں انقطاع نہیں۔ انسان قانونِ قدرت کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ وہ اس راہ میں نہ بھی چلنا چاہے، جب بھی چلنے پر مجبور ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کائنات کے سیاروں اور بڑے بڑے کرّوں کو اپنی منزل کا علم اور اس کی فکر ہے۔ لیکن انسان اس سے بالکل غافل ہے۔ اسی غفلت سے نکالنے کیلئے بار بار اس کو تنبیہات کی جارہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کی کتابیں بار بار اسے جھنجھوڑتی ہیں کہ تمہیں بہرحال ایک دن اللہ تعالیٰ ہی سے ملنا ہے۔ اسی سے ملاقات، اسی کے حضور حاضری اور اسی کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی یہی تمہاری منزل اور یہی تمہاری زندگی کا مقصد ہے۔ اور اسی جوابدہی پر تمہارے اچھے یا برے انجام کا دارومدار ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ﴿۷﴾ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ﴿۸﴾

وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۹﴾

(پھر جس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا۔ ۷) اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔ ۸) اور وہ اپنے لوگوں کی طرف نہایت شادمند لوٹے گا۔ ۹)

Marfat.com

قیامت کے روز اصحاب الیمین کا انجام

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کے قبول یا عدمِ قبول کے حوالے سے دو طرح کے لوگ وجود میں آتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو دارالعمل سمجھا اور قیامت کو دارالجزاء جان کر اس کیلئے تیاری کی۔ اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کیلئے تیار کیا۔ اور زندگی اس طرح گزاری جس سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی آسان ہو جائے۔ ایسے گروہ کا انجام ان آیتوں میں بیان فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جن کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ انہوں نے زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت میں گزاری، اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کئے اور بندوں کے بھی، اور فرائض میں بھی حتی المقدور کوتاہی نہیں کی۔ ان کے نامۂ عمل میں چونکہ نیکیوں کا غلبہ ہوگا اور برائیوں مغلوب ہوں گی تو ان کا نہایت آسان حساب لیا جائے گا۔ آسان حساب کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ دیکھا جائے گا کہ ان کے نیک اعمال کا وزن زیادہ ہے تو پھر ان کی معمولی غلطیوں سے درگزر کی جائے گی۔ ان کے ایک ایک عمل کے بارے میں ان سے سوال نہیں ہوگا۔ سورۃ احقاف آیت سولہ میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم ان کے بہتر اعمال قبول کرلیں گے۔ اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی جو تشریح فرمائی ہے اکثر حدیث کی کتابوں میں مختلف الفاظ میں اسے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس سے حساب لیا گیا، وہ مارا گیا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کا نامۂ عمل اس کے دہنے ہاتھ میں دیا گیا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔ حضورؐ نے جواب دیا وہ تو صرف اعمال کی پیشی ہے، لیکن جس سے پوچھ گچھ کی گئی وہ مارا گیا۔

دہنے ہاتھ میں نامۂ عمل کا دیا جانا چونکہ نجات کی علامت ہے اس لئے جس کسی کو دہنے ہاتھ میں نامۂ عمل دیا جائے گا وہ نہایت خوش خوش اپنے اہل و عیال میں لوٹے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے اہل وعیال، رشتہ دار اور احباب وہ ہوں گے جو اسی طرح معاف کئے جاچکے ہوں گے۔ اب وہ اس کے انتظار میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اس پر بھی اپنی مہربانی فرمائے، چنانچہ جیسے ہی اسے یہ خوشی میسر آئے گی تو فوراً اپنے اہل کی طرف لوٹے گا۔

قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے اہل وعیال کی تربیت میں محنت کی اور حتی الامکان انہیں نیکی کے راستے پر چلانے کی کوشش کی تو قیامت کے دن اگر ان کے اعمالِ صالحہ کی مطلوب تعداد میں کسی حد تک کمی بھی رہ گئی تو اللہ تعالیٰ ان کے والدین کی خوشیوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی نیکیوں میں اضافہ فرمادے گا۔ اور اگر والدین اور اولاد کے مراتب میں فرق ہوگا تو اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ان کے مراتب میں یکسانی پیدا فرمادے گا تاکہ وہ جنت کے ایک ہی درجہ میں اکٹھے رہ سکیں۔ اور ایک دوسرے کی محبت و ہم نشینی سے محظوظ ہوں۔ لیکن اس کیلئے کسی کے مقام ومرتبہ میں کمی نہیں کی جائے گی۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾

(رہا وہ شخص جس کا اعمال نامہ اس کے پیچھے ہی سے پکڑا دیا جائے گا۔ ۱۰) تو وہ موت کو پکارے گا۔ ۱۱) اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ ۱۲)

Marfat.com

آخرت سے بے نیاز لوگوں کا انجام

اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہونے والے انسانوں میں دوسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جنہوں نے آخرت سے بالکل بے نیاز رہ کر زندگی گزاری۔ ان کی بدنصیبی کی علامت کے طور پر اور ان کے انجام کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے نامۂ اعمال انہیں پیچھے سے پکڑا دیئے جائیں گے۔ اگرچہ اس آیت میں صراحۃً مذکور نہیں کہ پیچھے سے کس ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ لیکن دو باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ ایک تو اس بات سے کہ جب پہلے گروہ کے بارے میں یہ فرمایا گیا کہ ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے تو ان سے متضاد رویہ رکھنے والے انسانوں کو یقیناً ان کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے تاکہ جس طرح دائیں ہاتھ میں اعمال نامے لینے والے اعمال نامے لیتے ہی خوشی خوشی اپنے اہل وعیال میں جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا مقدر سنوار دیا۔ گویا دائیں ہاتھ میں اعمال ناموں کا ملنا مبارک ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح ان کے مقابل گروہ کو بائیں ہاتھ میں اس لئے اعمال نامے دیئے جائیں گے تاکہ اس برتاؤ ہی سے ان کی بدنصیبی ان پر واضح ہو جائے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ سورۃ الحاقہ آیت ۲۵ میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ''رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا اے کاش! مجھے اعمال نامہ دیا ہی نہ گیا ہوتا'' رہی یہ بات کہ اس آیت میں بائیں ہاتھ کی بجائے پیچھے سے اعمال نامے دینے کا ذکر ہے۔ تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان بدنصیبوں کے ہاتھ عدالت میں مجرموں کی طرح پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے۔ وہ اس قابل نہیں ہوں گے ہاتھ بڑھا کر اپنا نامۂ عمل لے سکیں۔ اس لئے اسی حالت میں پیچھے سے ان کے بائیں ہاتھ میں نامۂ عمل تھما دیا جائے گا۔

دائیں ہاتھ میں نامۂ عمل لینے والے خوش نصیبوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جیسے ہی ان کو ان کا اعمال نامہ ملے گا وہ خوشی خوشی اپنے اہل کی طرف پلٹیں گے۔ لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ان کے پاس کسی کو کچھ بتانے یا کسی کی طرف پلٹنے کیلئے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو اعمال نامہ پکڑتے ہی جان لیں گے کہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔ اب ہمیں ناقابلِ بیان صورتحال سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ اس لئے اپنے انجام کو دیکھتے ہوئے وہ موت اور ہلاکت کی دہائی دینے لگیں گے۔ کیونکہ اس عذاب سے بچنے یا رہائی پانے کی کوئی صورت اس کے سوا ممکن نہیں ہوگی کہ موت انہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ لیکن اب کسی کی فریاد یا دہائی سے موت نہیں آئے گی، موت کا زمانہ گزر گیا۔ اب تو ہمیشہ کی زندگی ہے جو نیک لوگوں کی جنت میں گزرے گی اور برے لوگوں کی جہنم میں۔ چنانچہ ان کی آہ وزاری کرنے سے بجائے اس کے کہ انہیں موت آئے انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اور ایک ایسی سزا شروع ہو جائے گی جس کا کوئی اختتام نہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ فِىْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾

(وہ اپنے گھر والوں میں مگن رہا۔ ۱۳) اس نے گمان کر رکھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں۔ ۱۴)

Marfat.com

اصحاب الشمال کی بدبختی کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے

اصحاب الشمال یہ بدبختوں کا گروہ ہے جو جہنم میں ڈالا جائے گا۔ انہوں نے دہرے جرم کا ارتکاب کیا۔ نہ اپنی فکر کی اور نہ اپنے اہل کی۔ اپنی ذات میں مگن اور اپنی دنیا میں گم یہ سمجھتے رہے کہ دنیا ہی ہماری منزل ہے اور موت آ کر اس سفر کو ختم کردے گی۔ کوئی آخرت نہیں جس کی طرف ہمیں پلٹنا ہو۔ اور یہی تصور انہوں نے اپنے اہل وعیال میں پیدا کیا۔ انہیں بھی دنیوی لذتوں کا رسیا بنایا۔ ان کی دنیوی ضرورتوں کو پورا کیا۔ چاہے اس کیلئے کیسے ہی حرام ذرائع اختیار کرنے پڑے۔ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی عاقبت سے بے نیاز ہو کر اپنی اور اپنے اہل وعیال کی خوشیوں میں مگن رہ کر زندگی گزاری۔ اس لئے خود بھی اور اس کے اہل بھی جہنم کا ایندھن بنے۔

بَلٰٓی ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾

(ہاں! کیوں نہیں، بیشک اس کا رب اس کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ ۱۵)

اصحاب الشمال کی حماقت

بائیں ہاتھ میں نامۂ عمل لینے والے کی اصل بھول یہ تھی کہ اسے کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنا نہیں۔ یہ دنیا کی زندگی ہی اصل زندگی ہے اس کے خاتمے کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ اس پر استدراک کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کیسے پلٹنا نہیں، یہ تصور ہی تو ان کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا رب ہر وقت انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کا کوئی عمل اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا۔ اس کے مقرر کردہ فرشتے برابر ان کا روزنامچہ تیار کر رہے تھے۔ ان کا نامۂ اعمال مرتب ہو رہا تھا۔ تو یہ سب کچھ کیا اس لئے تھا کہ انہیں شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جاتا یا ایک خودرو پودے کی طرح انہیں بے مقصد انجام کے حوالے کر دیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ میں کوئی صفتِ عدالت نہیں۔ نہ اس میں حکمت ہے اور نہ رحمت۔ کیونکہ یہ طرزِ عمل یقیناً اس کی ان صفات کے خلاف ہوتا۔ تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قیامت کا آنا عقل کی بھی دلیل ہے اور اخلاق کا تقاضا بھی۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾

(پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں شفق کی۔ ۱۶) اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ ۱۷) اور چاند کی جبکہ وہ ماہِ کامل ہو جاتا ہے۔ ۱۸) تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف چڑھنا ہے۔ ۱۹)

Marfat.com

قیامت پر تین شواہد

اس سے پہلے قیامت پر جو دلیل پیش کی گئی ہے اس پر یہ تین شواہد پیش کیے گئے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کائنات اور اس کے قانون میں ایک نظامِ تدریج کام کر رہا ہے۔ ایک چیز وجود میں آتی ہے پھر وہ رفتہ رفتہ ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنی منزل کو پہنچتی ہے اور اپنے نتائج کا اظہار کرتی ہے۔ انسان کی زندگی میں بھی یہی تدریج کارفرما ہے کیونکہ انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے۔ شواہد کے طور پر تین چیزوں کو پیش کیا گیا ہے اور مؤکد کرنے کیلئے ان کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اور یہ بات اس سے پہلے واضح کی جاچکی ہے کہ قسم کے بعد آنے والا جملہ جسے مقسم علیہ کہا جاتا ہے اس کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے اور قسم اس پر دلیل ہوتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تین قسمیں دراصل تین شواہد یا تین دلیلیں ہیں اس دعوے کی جو اس کے بعد آ رہا ہے۔ اور قسموں سے پہلے جو ''لا'' کا لفظ آیا ہے اس کی بھی اس سے پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ نہ تو زائد ہے اور نہ اس کا تعلق اس فعل سے ہے جو اس کے بعد آ رہا ہے بلکہ اس کا تعلق مخاطب کے رویئے سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ دنیا ہی تمہاری منزل ہے اور تمہیں کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنا نہیں ہے جہاں تمہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے، یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یعنی متکلم کے نزدیک اس خیال کا بطلان اس قدر واضح اور اس قدر ضروری ہے کہ متکلم نے دلیل کا بھی انتظار نہیں کیا بلکہ پہلے ہی اسے رد کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں قسم کھاتا ہوں شفق کی۔ اور رات کی اور ان چیزوں کی جو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ یعنی غور کیجئے کہ غروبِ آفتاب کے بعد رات کا آغاز شفق کی سرخی سے ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ دن کا اجالا یکلخت اندھیرے میں ڈوب جائے اور پوری طرح فضا پہ رات چھا جائے، بلکہ پہلے شفق کی سرخی ظاہر ہوتی ہے پھر آہستہ آہستہ تاریکی ابھرنے لگتی ہے اور ایک تدریج کے ساتھ رات غالب آجاتی ہے۔ اور کائنات کی وہ چیزیں جو زمین پر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں جن میں حیوانات اور چرند پرند بھی ہیں اور آسمان کے ستارے اور سیارے بھی۔ وہ بھی آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں۔ اکثر مفسرین نے اجرامِ فلکی کے علاوہ زمین پر چلنے پھرنے والے جانور اور دیگر اشیاء مراد لی ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ جس طرح رات ایک تدریج کے ساتھ آتی ہے، اسی طرح یہ تمام جانور بھی آہستہ آہستہ رات کے سکون میں گم ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا یہ عمل بھی تدریج کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم نے اس سے مراد آسمان کے ستارے اور سیارے لئے ہیں اور انہیں دلیل کا ایک جز قرار دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ ستارے بھی آہستہ آہستہ روشن ہوتے اور پھر ایک وقت تک اپنی روشنی بکھیرتے اور آہستہ آہستہ طلوعِ سحر سے پہلے ہی ماند پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ تو یہ بجائے خود تدریج کی ایک دلیل ہے۔ اس کے بعد چاند کو بطور شاہد پیش کیا گیا۔ حالانکہ چاند آسمان کے ستاروں میں ایک اہم ستارہ ہے۔ لیکن جیسے عربی میں عام طور پر عام کے بعد خاص کے ذکر کا ایک اسلوب پایا جاتا ہے، یہاں بھی عام ستاروں کا ذکر کرنے کے بعد بطورِ خاص چاند کا اس کی اہمیت اور خصوصیات کے باعث خاص طور پر ذکر کیا جا رہا ہے کہ چاند کو دیکھو کس طرح ہلال بن کر نکلتا ہے، پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے حتیٰ کہ ماہِ کامل ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں زوال شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ یہ تمام شواہد اس بات کی دلیل ہیں کہ کائنات کے عروج و زوال میں تدریج کا عمل بہت گہرا ہے۔ چنانچہ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح تم کائنات میں ایک تدریج دیکھ رہے ہو، اسی طرح تمہاری اپنی زندگی میں بھی ایک تدریج ہے۔ تم بھی درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف چڑھ رہے ہو۔ بچپن کے بعد

Marfat.com

لڑکپن، لڑکپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا اور پھر بڑھاپے کے بعد موت، یہ ایک مسلسل سفر ہے جس کے یہ مختلف پڑاؤ ہیں۔ تمہیں غلطی یہ لگی ہے کہ تم موت کو سفر کی انتہا یا منزل سمجھ بیٹھے ہو۔ حالانکہ اس سے تو سفر کا انقطاع لازم آتا ہے۔ سفر یہاں رکتا نہیں بلکہ اس کی اگلی منزل برزخ ہے اور اس کے بعد آخرت۔ آخرت کے بعد کوئی منزل نہیں، کیونکہ یہاں سے ابدی زندگی شروع ہو جائے گی۔ البتہ جس مقصد کیلئے یہ زندگی عطا کی گئی تھی آخرت میں اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ تم موت پر رک کر سفر کو نامکمل چھوڑ دیتے ہو حالانکہ یہ سفر آخرت پر ختم ہوتا ہے اور وہاں اس زندگی کا حساب ہوتا ہے جس کیلئے اس سفر کو جاری کیا گیا ہے۔ لیکن تم اس کا انکار کر کے زندگی کے پورے سفر کو بے معنی کر کے رکھ دیتے ہو۔ حالانکہ اس سفر کا منطقی نتیجہ آخرت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا تقاضا بھی آخرت ہے اور کائنات کی مسلسل روایت جسے ہم نظامِ تدریج میں دیکھ چکے ہیں اس کی انتہا بھی آخرت ہے۔ اور انسان کی اخلاقی زندگی میں جب ہم تدبر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ بھی آخرت ہے۔ لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے کہ تم آخرت سے انکار کر دیتے ہو۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿٢١﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٢﴾

(تو پھر ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔ ۲۰) اور جب انہیں قرآن سنایا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔ ۲۱) بلکہ جنہوں نے کفر کیا وہ جھٹلا رہے ہیں۔ ۲۲)

مخالفین کے ایمان نہ لانے پر تعجب کا اظہار

ان شواہد کے ذکر کے بعد اظہارِ تعجب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آخر ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ آخرت میں جزاء وسزا کو ماننے سے انکار کرتے ہیں جبکہ ان کے واضح ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ اور جس قرآن نے ایسے اہم حقائق کو نہایت سادہ دلائل کے ساتھ قریب الفہم بنایا اور واضح کیا ہے اس کی عظمت کے اعتراف اور اس کی بیان کردہ حقیقت کی تصدیق کیلئے بطورِ شکر اپنے رب کے آگے سجدہ میں نہیں گرتے۔ سجدہ میں گرنا ایک تو عظمت کے اعتراف کیلئے ہوتا ہے اور دوسرا اظہارِ تشکر کیلئے۔ عرب اور اہلِ مصر کی یہ روایت تھی کہ جب کسی بات کی عظمت کے سامنے ان کے دل جھک جاتے اور وہ سچے دل کے ساتھ اس کے اعتراف پر مجبور ہو جاتے تو عموماً اسے دیکھتے یا سنتے ہی سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ جس طرح ساحرانِ مصر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کو سمجھ جانے کے بعد سجدہ ریز ہو گئے۔ اور مشہور شاعر لبید کے قصیدے کے ایک شعر پر وقت کے مشہور شعراءِ عرب نے سجدہ کیا۔ قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت تو ان چیزوں سے بدرجہا بلند ہے اور اس نے جن حقائق کا اظہار کیا اور زندگی کی اصلاح کیلئے جن نصیحتوں سے نوازا اور ایک مکمل نظامِ اخلاق اور ضابطۂ حیات دیا اس کے اعتراف کے طور پر تو یقیناً ہر طرف سر جھک جانے چاہئیں تھے۔ لیکن مخالفین کی بدنصیبی کا عجیب حال ہے کہ وہ جھکنے کی بجائے اور اکڑتے اور مذاق اڑاتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ اور آپ ؐ کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ قرآنِ کریم کی مزید تکذیب کر رہے ہیں۔

Marfat.com

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾

(اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں۔ ۲۳)

مخالفین کے معیارِ فکر کی خرابی کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ جن چیزوں کو ہیروں اور جواہر کی طرح قیمتی سمجھ کر جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جلبِ زر کے حریص ہو کر جس طرح دمڑی دمڑی پر جان دے رہے ہیں اور جس طرح دولت و ثروت میں اضافے کیلئے ہر ذلت اٹھانے کو تیار ہیں اسے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک اصل قیمت کس چیز کی ہے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ آخرت میں یہ جن چیزوں کو ہیرے سمجھ رہے ہیں وہ خزف ریزے ثابت ہوں گے۔ اور جن کامیابیوں پر فخر کر رہے ہیں وہ ان کی ذلتوں کا سبب بنیں گے۔ جب ان کا اندوختہ اصل صورت میں سامنے آئے گا تب انہیں اندازہ ہوگا کہ انہوں نے کس چیز کو پھینکا اور کس چیز کے انبار جمع کئے۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

(تو ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔ ۲۴) البتہ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں ان کیلئے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ ۲۵)

انہوں نے جس طرح اپنی فکر اور زندگی کے معیار کو بگاڑا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ انہیں ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں۔ کیونکہ ان کی زندگی جس نہج پر جا رہی ہے اور انہوں نے اپنے اعمال کی صورت میں جو کچھ بویا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ انہیں عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ البتہ اس عذاب سے وہ لوگ بچیں گے جو ایمان اور عملِ صالح کی راہ اختیار کریں جس کی دعوت قرآنِ کریم نے دی ہے۔ ایمان اور عملِ صالح ایک ایسا سکہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے اور اس کے نتیجے میں جو اجر و ثواب ملنے والا ہے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

آیت ۲۱ پر سجدۂ تلاوت نبی کریم ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ امام مالک، مسلم اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے نماز میں یہ سورۃ پڑھ کر اس آیت پر سجدہ کیا۔ اور کہا رسول اللہ ﷺ نے یہاں سجدہ کیا ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْبُرُوْجِ

(۸۵)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْبُرُوْجِ ہے جو اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔

مقامِ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ معظمہ ہی میں نازل ہوئی ہے۔

زمانۂ نزول:۔ اس سورۃ کی آیات پڑھنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ سورۃ مکہ معظمہ کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں پر قریش کے مظالم میں شدت پیدا ہو چکی تھی اور انہیں نہایت تکلیف دہ اذیتوں سے نیا دین چھوڑنے پر مجبور کیا جارہا تھا اور مسلمان نہایت استقامت کے ساتھ اس صورتحال کا مقابلہ کررہے تھے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے چار قسموں کو قیامت کے یقینی وقوع پر دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور اس طرح سے مظالم توڑنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ آج جس طرح طاقت کے نشے میں اندھے ہوکر تم مسلمانوں کو تختۂ مشق بنارہے ہو، قیامت کے دن تمہیں ایک ایک بات کا جواب دینا پڑے گا۔ اور اس کے نتیجے میں جو سزا ہوگی وہ ان تکلیفوں سے بدرجہا بڑھ کر ہوگی۔

اس کے بعد اصحاب الاخدود کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں مسلمانوں اور قریش دونوں کو کچھ باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔
قریش سے یہ کہا گیا ہے کہ تم آج مسلمانوں پر جو مظالم ڈھا رہے ہو یہ کوئی نئی بات نہیں ہر دور میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں نے ایسا ہی کیا ہے، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اصحاب ایمان تو ان مظالم سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے سزاوار ہوجاتے ہیں۔ لیکن مظالم توڑنے والوں کے ساتھ بعض دفعہ دنیا میں بھی ایسی صورتحال پیش آتی ہے جس سے ان کی جڑ کٹ جاتی ہے اور وہ آنے والی دنیا کیلئے عبرت بنا دیئے جاتے ہیں۔ تم نے اگر اپنی روش کو جاری رکھا تو تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔ اور مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ جس طرح اصحاب الاخدود کے مقابلے میں مسلمانوں نے استقامت دکھائی۔ آگ کے گڑھوں میں گر کر جان دے دینا قبول کرلیا، لیکن ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا۔ اسی طرح تمہیں بھی جو اذیتیں پہنچائی جارہی ہیں انہیں صبر و استقامت سے برداشت کرو۔ جس اللہ پر ایمان لانے کے نتیجے میں تمہیں ستایا جارہا ہے وہ بے پناہ قدرتوں کا مالک اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ وہ یہاں بھی تمہاری حفاظت کرے گا اور آخرت میں بھی تمہیں بیش بہا نعمتوں سے نوازے گا۔

Marfat.com

اس کے بعد ان ظالموں کے بارے میں کہا گیا ہے جو اپنی روش سے توبہ نہ کریں کہ ان کیلئے جہنم کا عذاب ہے اور وہ جہنم کی آگ میں جلائے جائیں گے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تیرے رب کی پکڑ بہت شدید ہے، وہ مہلت دیتا ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو اس سے چھڑا کوئی نہیں سکتا۔ البتہ اپنے جرائم سے توبہ کرنے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت بڑی وسیع ہے۔ اور پھر اپنی صفاتِ جلال وجمال کی روشنی میں اس کی وسعت کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد کفار کو خبردار کیا گیا ہے تمہیں اپنی طاقت اور اپنے جتھوں پر بڑا مان ہے اور اپنی طاقت کے نشے میں تم مسلمانوں پر مظالم توڑتے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تم سے پہلے ایسی قومیں گزر چکی ہیں جن کے پاس تم سے زیادہ طاقت تھی اور وہ بڑی فوجوں کے مالک تھے۔ تم فرعون اور ثمود کی طاقت کے قصے سن چکے ہوں۔ ان کے لشکروں کا جو انجام ہوا اس سے سبق سیکھو۔

آخر میں قریش کی بدبختی پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی تبلیغی کاوشوں کے باوجود ابھی تک اپنی تکذیب کی روش پر اڑے ہوئے ہیں اور نشۂ اقتدار میں مست ہیں۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ وہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ قرآنِ کریم کو شاعری اور کہانت جیسی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک نہایت اشرف واعلیٰ کلام ہے۔ اس کی ہر بات اٹل اور شک وشبہ سے بالا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم پیغمبر کے قلبِ اطہر پر اتارا ہے اور اس کا سرچشمہ لوحِ محفوظ ہے جہاں کوئی شخص تغیر وتبدل نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۲۲	سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ (۸۵)	رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴿۳﴾
قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ﴿۵﴾ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا
قُعُوْدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ؕ﴿۷﴾ وَمَا
نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِيْ
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ﴿۹﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ
عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ؕ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ﴿۱۱﴾ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ
يُعِيْدُ ۚ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۙ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۙ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ
لِّمَا يُرِيْدُ ؕ﴿۱۶﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾
بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ﴿۱۹﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ﴿۲۰﴾
بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۱۔ (قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔ ۱) اوراس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ۲) اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی۔ ۳) مارے گئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے۔ ۴،۵) جبکہ وہ اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ۶) اور جو کچھ وہ اہلِ ایمان کے ساتھ کرر ہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ ۷) اوران اہلِ ایمان سے ان لوگوں کی دشمنی صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اوراپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ ۸) جس کیلئے آسمانوں اورزمین کی بادشاہی ہے، اوراللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۹) بیشک جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں پر ظلم وستم توڑا، پھراس سے تائب نہ ہوئے، یقیناً ان کیلئے جہنم کا عذاب ہے اور جلائے جانے کی سزا ہے۔ ۱۰) بیشک جولوگ ایمان لائے اورانہوں نے نیک عمل کئے، ان کیلئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ ہے بڑی کامیابی۔ ۱۱) بیشک آپ کے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ ۱۲) وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ ۱۳) اور وہ بخشنے والا اور پیار کرنے والا ہے۔ ۱۴) عرشِ بریں کا مالک ہے۔ ۱۵) جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے۔ ۱۶) کیا تمہارے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے۔ ۱۷) فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی۔ ۱۸) مگر جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ۱۹) اوراللہ ان کو آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔ ۲۰) بلکہ یہ بلند پایہ قرآن ہے۔ ۲۱) لوحِ محفوظ کے اندر ہے۔ ۲۲)

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾

(قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔ ۱)

لفظِ بروج کی تحقیق

بروج، برج کی جمع ہے۔ یہ لفظ محلات پر بھی بولا جاتا ہے اور قلعوں اور گڑھیوں پر بھی۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں اور بعض دیگر ائمۂ تفسیر نے اس سے وہ محلات اور مکانات مراد لئے ہیں جو آسمان میں پہرے داروں اور نگران فرشتوں کیلئے مقرر ہیں۔ قرآنِ کریم کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی یہ لفظ آسمان کی صفت کے طور پر آیا ہے وہاں اس سے مراد آسمان کے وہ قلعے اور دیدبان ہیں جہاں نگران فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معمور کئے گئے ہیں۔ ان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مملکت میں شیاطین کو ایک خاص حد کے آگے داخل نہ ہونے دیں۔ اگراس حد سے وہ آگے بڑھنے کی جسارت کرتے ہیں تو ان پر اشہبِ ثاقب کی بارش ہوتی ہے۔ اس طرح کوئی جن یا انسان ملأ اعلیٰ کی حدود میں داخل ہو کر غیب کے اسرار کی سن گن نہیں لے سکتا۔

بعض مفسرین نے قدیم علمِ ہیئت کے مطابق بروج سے آسمان کے بارہ برج مراد لئے ہیں۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔

وَالۡيَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّ مَشۡهُوۡدٍ ؕ﴿۳﴾

(اوراس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ۲) اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی۔ ۳)

Marfat.com

قیامت کی قیامت پر قسم

یوم موعود سے مراد روزِ قیامت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ ترمذی کی مرفوع روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور شاہد اور مشہود کی تفسیر میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ بعض ائمہ تفسیر نے ترمذی کی ایک مرفوع روایت سے استدلال کرتے ہوئے شاہد سے جمعہ کا دن مراد لیا ہے اور مشہود سے روزِ عرفہ کا۔ یہ حدیث اگر واقعی پایۂ ثقاہت اور درجۂ استناد کو پہنچتی ہے تو پھر مفسرین کے اقوال میں اختلاف ناقابلِ فہم ہے۔ لیکن یہ اختلاف چونکہ ائمۂ تفسیر سے منقول ہے، اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حدیث میں جس طرح روزِ جمعہ اور روزِ عرفہ کو اس کا مدلول ٹھہرایا گیا ہے وہ بھی اس سے مراد ہے۔ لیکن اس کے علاوہ دیگر چیزیں بھی اس سے مراد لی جاسکتی ہیں۔ اس لئے بعض اہلِ علم نے سیاق و سباق کو دیکھتے ہوئے یہ کہا ہے کہ شاہد سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قیامت کے روز حاضر ہوگا اور مشہود سے مراد خود قیامت ہے جس کے ہولناک احوال کو سب دیکھنے والے دیکھیں گے۔ مجاہد، عکرمہ، ضحاک اور بعض دیگر مفسرین سے یہی تفسیر منقول ہے۔ علاوہ ازیں بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ نکرہ یہاں تعمیم کیلئے ہے۔ جس سے قیامت اور جزاء و سزا کے ان تمام دلائل و شواہد کی طرف اشارہ ہے جو آفاق کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ اس طرح سے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز جو اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت اور دوسری اعلیٰ صفات کی گواہی دیتی ہے وہ اس سے مراد لی جاسکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ چار قسمیں چار دلیلیں ہیں جو جوابِ قسم کے اثبات کیلئے کھائی گئی ہیں۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ جوابِ قسم یہاں محذوف ہے، جس کی طرف ان قسموں کو دیکھ کر ذہن خود بخود منتقل ہوجاتا ہے۔ وہ جوابِ قسم یہ ہے کہ قیامت کا آنا یقینی ہے۔ اور کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں۔ قیامت کے دن ہر شخص اپنے کئے کا انجام دیکھے گا۔

جن لوگوں کو قیامت کے آنے میں شبہ ہے اور وہ اسے خلافِ عقل سمجھتے ہیں ان کے شبہ کا سبب یہ ہے کہ ان کی عقل اس بات کو باور نہیں کرتی کہ ایک دن ساری کائنات تباہ ہوجائے اور پھر ایک دن از سرِ نو یہ بساط بچھے اور تمام انسانوں کو زندہ کر کے میدانِ حشر میں حساب کتاب کیلئے جمع کر لیا جائے۔ کائنات کی ہمہ گیر تباہی وہ بھی ان کے نزدیک خلافِ عقل ہے اور پھر از سرِ نو ہر چیز کا زندہ ہونا یہ اس سے بڑھ کر خلافِ عقل ہے۔ چنانچہ ان کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ جو قادرِ مطلق اس کائنات کو تخلیق کرسکتا ہے اور آسمان جیسی چھت بغیر ستونوں کے ہمارے سروں پر اٹھا سکتا ہے اور پھر آسمان میں بڑے بڑے برج بنا سکتا ہے اور وہاں حفاظت کا ایک حیرت انگیز نظام قائم کرسکتا ہے تو اس کیلئے قیامت کو بپا کر دینا کیا مشکل ہے۔

اس کے بعد قیامت کو قیامت پر دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت ایک بدیہی حقیقت ہے جس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور کوئی عقلمند آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا کیونکہ اس کی شہادت خود انسان کے اندر موجود ہے۔ تو اس کو ثابت کرنے کیلئے کسی خارجی شہادت کی کیا ضرورت ہے۔ ہر انسان کی فطرت انصاف کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر دوسروں پر ظلم کرتا ہے لیکن جب اپنے اوپر ظلم ہوتا ہے تو انصاف اور عدل کی دہائی دیتا ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کی دادرسی ہونی چاہئے۔ یہی وہ فطرت کی پکار ہے جس کا مظہر وسیع سطح پر روزِ قیامت ہے۔ اس لئے خود اس کی قسم کھا کر اسے قیامت پر دلیل بنایا گیا ہے۔ اور پھر شاہد اور مشہود سے ان دلائلِ آفاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کائنات میں جابجا پھیلے ہوئے ہیں اور شاید اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان دنیا میں جو

Marfat.com

کچھ کر رہا ہے وہ قیامت کے دن اس کے سامنے آئے گا اور یہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھے گا۔اس کے اعضاء و جوارح خود اس کے ہر قول و فعل کی گواہی دیں گے۔اور قیامت کی ہولناکی مشہود بن کر اس دن ہر شخص کیلئے قیامت پر سب سے بڑی دلیل ہوگی اور لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہی ہے وہ حقیقت جس کا ہم انکار کرتے رہے ہیں۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝۵ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝۶
وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝۷

(مارے گئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے۔ ۴،۵) جبکہ وہ اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ۶) اور جو کچھ وہ اہلِ ایمان کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ ۷)

قریش کو تنبیہ اور اصحاب الاخدود کی وضاحت

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں بعض تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قریش کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم سے پہلے بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے ایمان والوں پر بے پناہ مظالم کیے حتیٰ کہ ان کو آگ میں جلایا۔لیکن آخر ان کا انجام ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوا۔اور جو قیامت میں انہیں عذاب ہونے والا ہے وہ اس سے ناقابلِ بیان حد تک شدید ہوگا۔

گڑھوں میں آگ جلانے والوں اور پھر ان میں ایمان لانے والوں کو پھینکنے اور آگ کی سزا دینے کے حوالے سے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں۔جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس کی ایک تاریخ ہے۔اور ایسے واقعات متعدد دفعہ وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کے نتائج بھی دیکھے ہیں۔لیکن یہاں ان میں سے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔اسی وجہ سے اہلِ تفسیر میں کسی ایک واقعہ پر اتفاق نہیں پایا جاتا۔صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ ایک سے زیادہ مرتبہ ایسے ظالمانہ واقعات ہوئے ہیں تو کسی ایک کا ذکر کرنے کی بجائے ان سب واقعات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔کیونکہ مقصود نفسِ مضمون اور اس کے حاصل کی طرف توجہ دلانا ہے،کسی واقعہ کی تاریخ بیان کرنا نہیں۔البتہ روایات میں جن کا ذکر آیا ہے،ہم اس کی تفصیل تفہیم القرآن سے نقل کر رہے ہیں۔

> ان میں سے ایک واقعہ حضرت صہیبؓ رومی نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔اس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کر دیا۔مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحبِ کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا، مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اس پر کارگر نہ ہوا۔آخر کار لڑکے نے کہا کہ اگر تو مجھے

Marfat.com

قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمع عام میں بِاسْمِ رَبِّ الْغُلَامِ (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کہ مجھے تیر مار میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکار اٹھے کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے، ان میں آگ بھروائی اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا اس کو آگ میں پھکوا دیا۔ (احمد، مسلم، نسائی، ترمذی، ابن جریر، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، طبرانی، عبد بن حمید)۔

دوسرا واقعہ حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات استوار ہو گئے۔ بات کھلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اس شخص کو پھکواتا چلا گیا جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اسی وقت سے مجوسیوں میں محرمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے۔ (ابنِ جریر)۔

تیسرا واقعہ ابن عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دین حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ان لوگوں کو پھینک دیا جو اس سے انکار کرتے تھے۔ (ابنِ جریر، عبد بن حمید)۔

سب سے مشہور واقعہ نجران کا ہے جسے ابن ہشام، طبری، ابن خلدون اور صاحب معجم البلدان وغیرہ اسلامی مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حمیر (یمن) کا بادشاہ تبان اسعد ابو کرب ایک مرتبہ یثرب گیا جہاں یہودیوں سے متاثر ہو کر اس نے دینِ یہود قبول کر لیا اور بنی قریظہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذونواس اس کا جانشین ہوا اور اس نے نجران پر، جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا، حملہ کیا تا کہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ (ابن ہشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل دین پر قائم تھے)۔ نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دینِ یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ مجموعی طور پر بیس ہزار آدمی مارے گئے۔ اہل نجران میں سے ایک شخص دوس ذو ثعلبان بھاگ نکلا اور ایک روایت کی رو سے اس نے قیصر روم کے پاس جا کر، اور دوسری روایت کی رو سے حبش کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جا کر اس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا، اور دوسری روایت کی رو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑہ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہر حال آخر کار حبش کی ۷۰ ہزار فوج ارياط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی، ذونواس مارا گیا، یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

Marfat.com

اسلامی مؤرخین کے بیانات کی نہ صرف تصدیق دوسرے تاریخی ذرائع سے ہوتی ہے بلکہ ان سے بہت سی مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یمن پر سب سے پہلے عیسائی حبشیوں کا قبضہ ۳۴۰ء میں ہوا تھا اور ۳۷۸ء تک جاری رہا تھا۔ اس زمانے میں عیسائی مشنری یمن میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ اسی کے قریب دور میں ایک زاہد و مجاہد اور صاحب کشف و کرامت عیسائی سیاح فیمیون (Paymiyun) نامی نجران پہنچا اور اس نے وہاں کے لوگوں کو بت پرستی کی برائی سمجھائی اور اس کی تبلیغ سے اہل نجران عیسائی ہو گئے۔ ان لوگوں کا نظام تین سردار چلاتے تھے۔ ایک سید، جو قبائلی شیوخ کی طرح بڑا سردار اور خارجی معاملات، معاہدات اور فوجوں کی قیادت کا ذمہ دار تھا۔ دوسرا عاقِب، جو داخلی معاملات کا نگران تھا اور تیسرا اُسقُف (بشپ) جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ جنوبی عرب میں نجران کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ ٹسر، چمڑے اور اسلحہ کی صنعتیں یہاں چل رہی تھیں۔ مشہور حُلۂ یمانی بھی یہیں تیار ہوتا تھا۔ اسی بنا پر محض مذہبی وجوہ ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی وجوہ سے بھی ذونواس نے اس اہم مقام پر حملہ کیا۔ نجران کے سید حارثہ کو جسے سریانی مؤرخین Arethas لکھتے ہیں، قتل کیا، اس کی بیوی رومہ کے سامنے اس کی دو بیٹیوں کو مار ڈالا اور اسے ان کا خون پینے پر مجبور کیا، پھر اسے بھی قتل کر دیا۔ اسقف پال (Paul) کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا دیں۔ اور آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے، پادری، راہب سب کو پھکوا دیا۔ مجموعی طور پر بیس سے چالیس ہزار تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ آخر کار ۵۲۵ء میں حبشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذونواس اور اس کی حمیری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی تصدیق حصین غراب کے کتبے سے ہوتی ہے جو یمن میں موجود زمانہ کے محققین آثار قدیمہ کو ملا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی متعدد عیسائی تحریرات میں اصحاب الاخدود کے اس واقعہ کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض عین زمانۂ حادثہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سن کر لکھی گئی ہے۔ ان میں سے تین کتابوں کے مصنف اس واقعہ کے ہم عصر ہیں۔ ایک پروکوپیوس، دوسرا کوسماس انڈیکوپلیوسٹس (Cosmos Indicopleustis) جو نجاشی ایلیسبوعان (Elesboan) کے حکم سے اس زمانے میں بطلیموس کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا اور حبش کے ساحلی شہر ادولیس (Adolis) میں مقیم تھا۔ تیسرا یوحنس ملالا (Johannes Malala) جس سے بعد کے متعدد مؤرخین نے اسی واقعہ کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یوحنس افسوسی (Johannaes of Ephesus) متوفی ۵۸۵ء نے اپنی تاریخ کنیسہ میں نصاریٰ نجران کی عذیب کا قصہ اس واقعہ کے معاصر راوی اسقف مارشمعون (Simeon) کے ایک خط سے نقل کیا ہے جو اس نے دیرجبلہ کے رئیس (Abbot von Gabula) کے نام لکھا تھا، اور مارشمعون نے اپنے خط میں یہ واقعہ ان اہل یمن کے آنکھوں دیکھے بیان سے روایت کیا ہے جو اس موقع پر موجود تھے۔ یہ خط ۱۸۸۱ء میں روم سے اور ۱۸۹۰ء میں شہدائے مسیحیت کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔ یعقوبی بطریق ڈایونیسیوس (Patriarch Dionysius) اور زکریا مدلتی (Zacharia of Mitylene) نے

Marfat.com

اپنی سریانی تاریخوں میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ یعقوب سروجی کی کتاب درباب نصاریٰ نجران میں بھی یہ ذکر موجود ہے۔ الرّہا (Edessa) کے اسقف پُولس (Pulus) نے نجران کے ہلاک شدگان کا مرثیہ لکھا جواب بھی دستیاب ہے۔ سریانی زبان کی تصنیف کتاب الحمیر یین کا انگریزی ترجمہ (Book of the Himyarites) ۱۹۲۴ء میں لندن سے شائع ہوا ہے اور رو ہ مسلمان مؤرخین کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اس عہد اور اس سے قریبی عہد کے کچھ حبشی مخطوطات بھی موجود ہیں جو اس قصے کی تائید کرتے ہیں۔ فلبی نے اپنے سفرنامے (Arabian Highlands) میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا تھا۔ ام خرق کے پاس ایک جگہ چٹانوں میں کھدی ہوئی کچھ تصویریں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور کعبۂ نجران جس جگہ واقع تھا اس کو بھی آج کل کے اہلِ نجران جانتے ہیں۔

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت بنائی تھی جسے وہ مکہ کے کعبہ کی جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس کے اساقفہ عمامے باندھتے تھے اور ان کو حرم قرار دیا گیا تھا۔ رومی سلطنت بھی اس کعبہ کیلئے مالی اعانت بھیجتی تھی۔ اسی کعبۂ نجران کے پادری اپنے سید اور عاقب اور اسقف کی قیادت میں مناظرے کیلئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مباہلہ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سورۂ آل عمران آیت ۶۱ میں کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن)

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴿۸﴾

(اور ان اہلِ ایمان سے ان لوگوں کی دشمنی صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ ۸)

کفار کے نزدیک ایمان باللہ سب سے بڑا جرم ہے

یعنی جن ظالموں نے اہلِ ایمان کو آگ کے گڑھوں میں ڈالا اور ان پر وحشیانہ ظلم کیا ان سے ان کی کوئی دشمنی نہ تھی، انہوں نے کوئی ایسا جرم نہ کیا تھا جس کی وجہ سے انہیں ایسی سخت سزا دی جاتی۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لے آئے تھے۔

خونے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشقِ روئے تو گشتہ ایم

حالانکہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ان کی فطرت کی آواز تھی۔ کیونکہ انسانی فطرت اگر بگڑ نہ جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ کبھی نہ کبھی اس کے دل سے اللہ تعالیٰ کی یاد ابھرتی ہے چاہے وہ فریاد بن کر ابھرے اور چاہے وہ ضرورت کا اظہار بنے۔ ہاتھ ہمیشہ اسی کے سامنے پھیلتا ہے اور بے نوا ہمیشہ اسی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ تو ایسی ذات پر ایمان جرم نہیں، خوبی ہے جس کا اعتراف ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہی خوبی ان کا جرم بن گئی۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی صفات

ایک اور پہلو سے اگر دیکھا جائے تو ایمان درحقیقت کسی ذات کی کبریائی اور اپنی عاجزی اور بندگی کا اعتراف ہے۔ یہ صرف اسی کے سامنے ہوسکتا ہے جس میں دو صفتیں پائی جاتی ہوں۔ ایک یہ کہ وہ عزت، قدرت، شان اور عظمت وجلال میں سب سے بالا ہو۔ اسی کو عزیز کہتے ہیں۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور میں نہیں۔ اسی طرح دوسری صفت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہو۔ نہ اس کے حُسن کا جواب ہو، نہ اس کے کمالات کا۔ اس کی جودوسخا کا دسترخوان سب کیلئے کھلا ہو، اس کا فیضان سب کو برابر پہنچتا ہو، ایسی ذات کو حمید کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ایمان کی حقدار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ وہ عزیز بھی ہے اور حمید بھی۔ تو کیسا غضب ہے کہ جن لوگوں نے ایک عزیز وحمید ذات کو مانا اور اس پر ایمان لائے بجائے اس کے کہ انہیں حقیقت اور فطرت کا شناسا کہا جاتا انہیں ایک مجرم قرار دے کر انتہائی عذاب دیا گیا۔

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ؕ ﴿۹﴾

(جس کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۹)

اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا صفات کو مزید نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ وہی ذات ہے جس کیلئے آسمان وزمین کی حکومت اور بادشاہی ہے۔ ہر مخلوق اسی کی مملوک ہے، سب اسی کے فیضان سے زندہ اور قائم ہیں۔ ایسی ذات کے سوا اور کون حقدار ہوسکتا ہے جس پر ایمان لایا جائے۔ تو جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں وہ درحقیقت راہِ معرفت سے آشنا ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے ان ظالموں نے ایمان کی سزا کے طور پر جو کچھ ان بے نواؤں کے ساتھ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہے۔ اور جو کچھ قریش مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں ان سے بھی اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ہے۔ تو جب وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور پھر حکومت بھی اسی کی ہے تو ایسے بدبخت ظالموں کو آخر وہ کب تک گوارا کرے گا۔ اس لحاظ سے ایک تنبیہ ہے جو قریش کو کی جارہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ڈھیل پر مغرور نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے، وہ وقت دور نہیں جب یہ ڈھیل ختم ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی گرفت آجائے۔ پھر وہ اپنے مظلوم بندوں کا اس طرح انتقام لے کہ ظالموں کیلئے کوئی پناہ گاہ نہ رہے۔

صاحبِ تفہیم القرآن نے جو تفصیل بیان کی ہے۔ ابنِ کثیر نے بھی نہایت اختصار کے ساتھ اس کے اصل مضمون کی تائید کی ہے۔ وہ ابنِ ابی حاتم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آگ کی خندق کا واقعہ دنیا میں ایک ہی نہیں بہت مختلف ملکوں اور زمانوں میں ہوئے ہیں۔ پھر ابنِ ابی حاتم نے ان واقعات میں سے تین کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے کہ ایک خندق یمن میں تھی جس کا واقعہ آنحضرت ﷺ سے ستر سال پہلے پیش آیا۔ دوسری خندق شام میں اور تیسری فارس میں تھی۔ مگر قرآنِ کریم نے جس خندق کا ذکر اس سورۃ میں کیا ہے وہ خندق نجران ملکِ یمن کی خندق ہے۔ کیونکہ یہی عرب کے ملک میں تھی، اور اسی پر صاحبِ تفہیم القرآن نے زور دیا ہے۔

ابنِ کثیر نے محمد بن اسحاق کی روایت بیان کی ہے کہ (حضرت صہیب رومی کی روایت میں جس لڑکے کا ذکر ہے اس کا نام عبداللہ ابنِ قامر تھا)۔ یہ لڑکا جس جگہ مدفون تھا اتفاقاً کسی ضرورت سے وہ زمین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں کھودی گئی۔ تو اس میں

Marfat.com

عبداللہ ابنِ قامر کی لاش صحیح سالم اسی طرح برآمد ہوئی کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ اپنی کنپٹی پر رکھا ہوا تھا جہاں تیر لگا تھا۔ کسی دیکھنے والے نے ان کا ہاتھ اس جگہ سے ہٹایا تو زخم سے خون جاری ہوگیا۔ پھر ویسے ہی رکھ دیا تو بند ہوگیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا، اللہ ربی۔ عاملِ یمن نے اس واقعہ کی اطلاع حضرت فاروق اعظمؓ کو دی تو آپ نے جواب میں لکھا کہ ان کو ان کی ہیئت پر انگوٹھی سمیت اسی طرح چھپا دو جیسے پہلے تھی۔ (ابنِ کثیر)

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰

(بیشک جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں پر ظلم و ستم توڑا، پھر اس سے تائب نہ ہوئے، یقیناً ان کیلئے جہنم کا عذاب ہے اور جلائے جانے کی سزا ہے۔ ۱۰)

ظالموں کو وعید

جن لوگوں نے ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کو آگ کی خندقوں میں پھینک کر نہایت سنگدلی سے جلایا تھا، ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ کسی کو ایمان سے پھیرنے کیلئے اذیت دی جائے تا کہ وہ پھر کفر اختیار کرلے، اسی کو فتنہ کہتے ہیں۔ ان ظالموں نے اسی فتنے میں ان بے کس مومنوں کو مبتلا کیا تھا کہ اگر وہ سلامتی چاہتے ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ کا دین چھوڑ کر شیطان کا دین اختیار کرنا چاہئے جس پر وہ پہلے سے چل رہے تھے۔ اور پھر اس جرم میں شدت مزید دو وجہ سے پیدا ہوئی۔ ایک تو اس لئے کہ انہوں نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں پر بھی مظالم توڑے۔ اور ممکن ہے عورتوں پر مظالم زیادہ توڑے گئے ہوں اور ان میں زیادہ تر لونڈیاں شامل ہوں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایمان والوں کو صرف موت کی سزا نہیں دی بلکہ ان کو زندہ جلایا۔ ایسے انتہا درجہ ظالم لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ لوگ اس پر توبہ نہیں کرتے، یعنی اپنے اس فعل پر نادم ہوکر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب نہیں کرتے تو پھر ان کیلئے دو طرح کا عذاب ہے ایک تو جہنم کا عذاب جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور دوسرا آگ کا عذاب ہے۔ حالانکہ جہنم میں بھی آگ ہی کا عذاب ہوگا۔ اس کے باوجود دوبارہ آگ کے عذاب کا ذکر دو مفہوموں کو متضمن ہوسکتا ہے۔ ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ خاص قسم کی آگ ہوگی جس کی تیزی اور تپش جہنم کی آگ سے بھی بڑھ کر اور تکلیف دہ ہوگی۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد دنیا کی آگ ہے۔ یعنی جب ان ظالموں نے ان اصحابِ ایمان کو آگ کی خندق میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خندق میں گرنے سے پہلے وفات دے دی۔ اس طرح سے وہ آگ میں جلنے سے بچ گئے۔ لیکن خندق کی یہ آگ ان کے گرنے سے بھڑک اٹھی اور خندق کی حدود سے نکل کر شہر میں پھیل گئی اور ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے، اس آگ نے جلا دیا اور ان کی آبادیاں بھی تباہ و برباد ہوگئیں۔ صرف بادشاہ یوسف ذونواس بھاگ نکلا۔ اور آگ سے بچنے کیلئے اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ (مظہری)

Marfat.com

عجیب بات یہ ہے کہ جن ظالموں نے اصحابِ ایمان کو زندہ جلایا وہ یقیناً کسی رحم کے مستحق نہیں تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے عذاب تجویز کرتے ہوئے یہ قید بھی لگادی ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا یعنی یہ عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اپنے اس فعل پر نادم ہو کر تائب نہیں ہوئے۔ اس طرح سے ان لوگوں کو توبہ کی طرف دعوت دی گئی۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس جود و کرم کیا کہنا کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو زندہ جلا کر ان کا تماشا دیکھا اور اللہ تعالیٰ اس پر بھی ان کو توبہ اور مغفرت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ (ابنِ کثیر)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ﴿۱۱﴾

(بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، ان کیلئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ ہے بڑی کامیابی۔ ۱۱)

ایمان پر ثابت قدم رہنے والوں کو بشارت

جن لوگوں نے آگ میں کود کر ایمان کی قیمت ادا کی، ان کی پختگی ایمان کا کیا کہنا۔ جو ایمان کو بچانے کیلئے جلنے کا عذاب برداشت کر لیتا ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ سے محبت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہاں ان کے جس ایمان کا ذکر ہو رہا ہے وہ یقیناً عام ایمان نہیں، بلکہ ایسا ایمان ہے جو ایک مومن کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اور یہی حال ان کے اعمال صالحہ کا بھی ہے۔ ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایسے باغات رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ لیکن یہ باغات بھی جنت کے عام باغوں جیسے نہیں یقیناً اپنی قدر و قیمت میں انفرادی شان رکھتے ہوں گے۔ اس میں اہلِ ایمان کو جو بشارت سنائی جا رہی ہے اس کے اصل مخاطب یقیناً وہی ہیں جنہیں آگ کی خندقوں میں پھینکا گیا تھا۔ لیکن ان کے واسطے سے صحابہ کرامؓ کو بھی یہ تسلی دی جا رہی ہے کہ تم اگرچہ قریش کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہو اور ایک ناقابلِ برداشت صورتحال سے تمہیں گزرنا پڑ رہا ہے لیکن اطمینان رکھو ایک بہت بڑا انعام تمہارے انتظار میں ہے۔

آخر میں فرمایا کہ ایمان و عمل کے بدلے میں جنت کا حصول ایسی بڑی کامیابی ہے کہ اسے ہی اصل کامیابی کہا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ''جو شخص جہنم سے ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ ہوا کامیاب۔'' دنیا میں چند دنوں کی آزمائش یقیناً ایک بڑا امتحان ہے لیکن آخرت میں جنت کا حصول ایسی بڑی کامیابی ہے جسے آخرت کی بادشاہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾
ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۶﴾

(بیشک آپ کے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ ۱۲) وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ ۱۳) اور وہ بخشنے والا اور پیار کرنے والا ہے۔ ۱۴) عرشِ بریں کا مالک ہے۔ ۱۵) جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے۔ ۱۶)

Marfat.com

سابقہ صفات کو مؤکد کرنے کیلئے مزید صفات کا تذکرہ

سابقہ آیات میں اہلِ ایمان پر ظلم ڈھانے والوں کو جو دھمکیاں دی گئیں اور اہلِ ایمان کو بیش بہا نعمتوں کا جو مژدہ سنایا گیا اسے مزید مستحکم کرنے کیلئے اپنی مزید صفات ذکر فرمائی گئی ہیں۔

سب سے پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کے رب کی پکڑ بڑی ہی سخت ہے۔ اس میں واحد کا خطاب ہر شخص کو بھی ہو سکتا ہے اور آنحضرت ﷺ کو بھی۔ اگر آپ کو خطاب مانا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ دشمنوں کو تنبیہ کرتے ہوئے اور اہلِ ایمان کو تسلی دیتے ہوئے یہ باور کرائیں کہ آپ کے رب کی پکڑ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کافر اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھیں اور قیامت کے دن اپنے بچاؤ کیلئے کیسے ہی شرکاء وشفعاء پر بھروسہ رکھیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہیں۔ قیامت کے دن بڑے بڑے پیغمبر بھی نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا خوف پیدا ہو گیا اسی کا ہاتھ ظلم سے رک سکتا ہے اور اس پر ایمان لانے والا اس کی بے پناہ قوت کا سہارا لے سکتا ہے۔

دوسری صفت یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ جن کفار نے اہلِ ایمان کو زندہ جلایا گزشتہ آیات میں انہیں جہنم کے عذاب اور آگ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ جبکہ وہ لوگ جہنم کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہیں جہنم محض ایک ڈراوا اور دھمکی معلوم ہوتی ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ مرنے کے نہ کوئی زندگی ہے اور نہ موت۔ حالانکہ تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کائنات کو پیدا کیا اور تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے آباؤ اجداد کو بھی۔ تو اب کیا وہ از سر نو اس کا اعادہ نہیں کر سکتا۔ جب پہلی بار پیدا کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ کیوں پیش آئے گی۔

تیسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ بخشنے والا ہے، محبت کرنے والا ہے۔ یعنی تمہارے کرتوت تو اس قابل ہیں کہ تمہیں ایک لحہ بھی زندگی کا نہ دی جائے اور خورد ونوش کی ہر چیز تم سے روک دی جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے پیار کرتا ہے۔ اور اگر وہ بغاوت اور نافرمانی سے توبہ کر لیں تو انہیں معاف بھی کر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی اس کی محبت کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ وہ عادل بھی ہے اور سلطنتِ کائنات کا فرمانروا بھی اور وہی عرش کا مالک اور عظمت والا ہے۔ تو جب کوئی مظلوم اس کی زنجیر عدل کو حرکت دیتا ہے یا کوئی ظالم اپنے مظالم سے اس کے قانون کو توڑتا ہے یا کوئی طاغوت بن کر اس کی کبریائی کو چیلنج کرتا ہے تو پھر اس کی عدالت اور قدرت حرکت میں آتی ہیں۔ وہ جس طرح اپنوں پر رحم کھاتا ہوا انعامات سے نوازتا ہے، اس طرح ظلم کرنے والوں کو ظلم کی سزا دیتا ہے۔ چونکہ وہی حقیقی اقتدار کا مالک ہے اس لئے وہ اپنے ہر ارادے کو بروئے کار لانے میں مکمل با اختیار ہے۔ نہ اسے کوئی رحم کرنے سے روک سکتا ہے، نہ اسے کوئی سزا دینے میں مزاحم ہو سکتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ کائنات میں کسی کی بھی یہ طاقت نہیں کہ اس کے کسی ارادے میں رکاوٹ بن سکے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾

(کیا تمہارے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے۔ ۱۷) فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی۔ ۱۸)

Marfat.com

سابقہ حقائق پر تاریخ سے استدلال

اوپر جو حقائق بیان کئے گئے ہیں اس کے اثبات کیلئے تاریخ سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ پہلے اجمالی انداز میں فرمایا کہ کیا تمہیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے، یعنی جو قومیں بڑی بڑی سلطنتیں بنانے میں کامیاب ہوئیں اور ان کے پاس فوجوں کی بڑی تعداد تھی اور وہ اپنی اسی قوت کے بل بوتے پر خیر کی کسی بات کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ جس طرح آج تمہیں اپنے طاقتور جتھوں کا زعم ہے اور اسی کے بل بوتے پر تم اللہ تعالیٰ کی زمین میں فساد مچا رہے ہو، آخر وہ لوگ کس انجام سے دوچار ہوئے۔ ظاہر ہے کہ تم بھی ایسے انجام سے بچ نہیں سکو گے۔ پھر اس اجمال کو کھولتے ہوئے فرعون اور ثمود کے لشکروں کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ قریش ان دونوں کی قوت سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ مرعوب بھی تھے۔ قومِ ثمود بڑی توانا اور ہر لحاظ سے طاقتور قوم تھی۔ اور فرعون اپنے دور کا سب سے طاقتور حکمران سمجھا جاتا تھا اور جس کی فوجوں کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے اسے میخوں والا کہا جاتا تھا، لیکن جب ان قوموں نے اللہ تعالیٰ سے سرکشی کا رویہ اختیار کیا اور جبر وظلم کو وطیرہ بنایا اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ اپنی تمام تر قوت وشوکت کے باوجود صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ اور کوئی ان کی مدد نہ کر سکا۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿١٩﴾

(مگر جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ١٩)

اللہ تعالیٰ کی صفات بھی بیان ہوئیں، عقلی دلائل بھی دیئے گئے، کفار کو تنبیہات بھی کی گئیں، تاریخ سے بھی استدلال کیا گیا، تبلیغ و دعوت اور ابلاغ و تفہیم میں کوئی کمی نہیں رہی۔ اس کے باوجود کفار کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں۔ نہ قیامت کو ماننے پر تیار ہیں نہ آنحضرت ﷺ کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں۔

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿٢٠﴾

(اور اللہ ان کو آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔ ٢٠)

یعنی ان بے خبروں کو کچھ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ لیکن جس دیدہ دلیری سے یہ تکذیب کر رہے ہیں اس تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا کوئی خوف نہیں۔ اور ان کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں ہم اتنی بڑی قوت کے مالک ہیں کہ ہم پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور آخر میں ہماری شفاعت کرنے والے ہمیں بچا لیں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے ان کی بے بسی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾

(بلکہ یہ بلند پایہ قرآن ہے۔ ٢١) لوحِ محفوظ کے اندر ہے۔ ٢٢)

Marfat.com

انسانوں کی ہدایت کیلئے آج جو کتاب نازل کی گئی ہے وہ ایک بلند پایہ قرآن ہے۔ اور وہ ایک ایسا بزرگ و برتر کلام ہے جسے شاعروں اور کاہنوں کے کلام پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا سرچشمہ لوحِ محفوظ ہے۔ اس کا ہر حکم اٹل ہے۔ اس کی ہر خبر پوری ہو کر رہنے والی ہے۔ ساری دنیا مل کر بھی اسے باطل نہیں کرسکتی۔ اس لئے تمہیں وہ جس انجام سے آگاہ کر رہا ہے اس سے بچنے کی فکر کرو۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الطَّارِقِ

(٨٦)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الطَّارِقِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الطَّارِقِ ہے جو اس کی پہلی ہی آیت سے ماخوذ ہے۔
مقام نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔
زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ سابق سورۃ کے ساتھ بہت مشابہت رکھتی ہے۔تمہید اور خاتمہ کے پہلو سے دونوں سورتیں ایک معلوم ہوتی ہیں۔البتہ اسلوب بیان اور نہج استدلال میں فرق ہے۔اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کا زمانۂ نزول قریب قریب ہے۔انداز بیان مکہ معظمہ کی ابتدائی سورتوں سے ملتا جلتا ہے۔البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت کفارِ مکہ اسلام کی اٹھتی ہوئی طاقت سے برافروختہ ہو کر اسے کچل ڈالنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے آسمان کے ستاروں کی اس بات پر شہادت پیش کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے کوئی چیز بھی اوجھل نہیں۔اس نے ہر نفس پر پہرے بٹھار کھے ہیں۔جن ہوں یا انسان سب کی نگرانی ہوتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کی نگہبانی کے تحت پھل پھول رہی ہے۔اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اور جس کو چاہے پکڑ سکتا اور سزا دے سکتا، کوئی اس کے قابو سے باہر نہیں۔
اس کے بعد منکرینِ قیامت کو خود انسان کی ذات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کی تخلیق کسی غیر معمولی جوہر سے نہیں جو اللہ تعالیٰ کی دسترس سے باہر ہو۔بلکہ اسے نطفے کی ایک بوند سے وجود میں لایا گیا ہے جو خود اس کے اندر سے نکلا ہے۔جب اس کے اندر سے ٹپکی ہوئی ایک بوند کو اللہ تعالیٰ اپنی قوتِ تخلیق سے انسان بنا دینے پر قادر ہے تو اسے دوبارہ پیدا کرنے پر وہ کیوں قادر نہیں۔
پھر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ہر قول و فعل اور پس پردہ مخفی حقائق سے بھی باخبر ہے۔انسان کا کوئی راز اللہ تعالیٰ کے سامنے راز نہیں۔ایک دن یہ سارے راز پرکھے اور جانچے جائیں گے اور ان کے مطابق جزاء و سزا کا فیصلہ ہوگا اور کسی انسان کے پاس ایسی کوئی قوت و جمعیت نہیں جو اس روز اس کے کام آسکے۔اور نہ اس کے پاس کوئی سعی یا سفارش ہوگی جو اسے نفع پہنچا سکے۔
اس کے بعد آسمان سے بارش کے برسنے اور زمین سے درختوں اور فصلوں کے اگنے کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم اگر اس تخلیق پر غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ نہایت سنجیدہ کام ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت سے بروئے کار آ رہا ہے۔اسی

Marfat.com

طرح قرآن میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں وہ بھی نہایت پختہ اور اٹل باتیں ہیں۔ قیامت اسی کے نتائج کے ظہور کا دن ہے۔ آخر میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور کفار کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ان کی چالیں قرآنِ کریم کی دعوت کو ناکام کر دیں گی۔ انہیں خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی ایک تدبیر کر رہا ہے اور اس کی تدبیر کے آگے کفار کی سب تدبیریں دھری رہ جائیں گی۔ اور آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ کفار جو چالیں چل رہے ہیں آپ ان سے مایوس نہ ہوں۔ ابھی ان کو کچھ دن مہلت دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے استدراج کا جو دام بچھایا ہے یہ اس میں پھنس چکے ہیں اور عنقریب ان کا انجام سامنے آنے والا ہے۔ تب معلوم ہو جائے گا کہ ان کی چالیں قرآن کو نقصان پہنچاتی ہیں یا قرآن وہاں وہاں غالب آتا ہے جہاں انہوں نے چالوں کے جال بچھا رکھے ہیں۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ١٧	سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ (٨٦)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝١ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝٢ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝٣
اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝٤ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝٥
خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝٦ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝٧
اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝٨ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝٩ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّ
لَا نَاصِرٍ ۝١٠ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝١١ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝١٢
اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝١٣ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝١٤ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝١٥
وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝١٦ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝١٧

رکوع: ١۔ (قسم ہے آسمان کی اور رات میں نمودار ہونے والے کی۔ ١) اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے۔ ٢) چمکتا ہوا ستارہ۔ ٣) کوئی جان ایسی نہیں جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو۔ ٤) پس انسان کو غور کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ٥) ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا۔ ٦) جو نکلتا ہے ریڑھ اور پسلیوں کے بیچ سے۔ ٧) بیشک وہ اس کے لوٹا سکنے پر پوری طرح قادر ہے۔ ٨) اس روز ساری چھپی باتوں کی جانچ پڑتال ہوگی۔ ٩) اس وقت انسان کے پاس نہ کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ ١٠) قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی۔ ١١) اور پھٹ جانے والی زمین کی۔ ١٢) کہ یہ دوٹوک بات ہے۔ ١٣) یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں۔ ١٤) وہ چل رہے ہیں ایک چال۔ ١٥) اور میں بھی ایک داؤ چل رہا ہوں۔ ١٦) پس اے پیغمبر! ان کافروں کو مہلت دے دیجئے اور ذرا سی ذرا ان کو چھوڑ دیجئے۔ ١٧)

Marfat.com

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰکَ مَاالطَّارِقُ ﴿۲﴾ اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾

(قسم ہے آسمان کی اور رات میں نمودار ہونے والے کی۔ ۱) اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے۔ ۲) چمکتا ہوا ستارہ۔ ۳)

آسمان اور ستاروں کی قسم

جس طرح گزشتہ سورۃ میں برجوں والے آسمان کی قسم کھائی تھی اسی طرح اس سورۃ میں چمکتے اور دمکتے ہوئے ستاروں کی قسم کھائی گئی ہے۔ اور ہم اس کی ایک سے زیادہ مرتبہ وضاحت کر چکے ہیں کہ قسم مقسم علیہ کیلئے شہادت اور دلیل ہوتی ہے۔ البتہ قرآنِ کریم کا اسلوب ہمارے اسلوب سے جدا ہے کہ ہم دعویٰ پہلے کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کیلئے شہادت یا دلیل بعد میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم قسم کی صورت میں دلیل پہلے دیتا ہے اور مقسم علیہ یعنی دعویٰ کو بعد میں پیش کرتا ہے۔ یہ طریقہ زمین کی تیاری اور تخم ریزی کے مشابہ ہے۔ زمین سے پیداوار لینے کیلئے زمین تیار پہلے کی جاتی ہے اور تخم بعد میں بویا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسانی دل و دماغ کو ہموار کرنے کیلئے دلیل پہلے پیش کی جاتی ہے تاکہ آمادگی پیدا ہو سکے۔ اور دعویٰ تخم پاشی کی طرح بعد میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ تیار زمین اس کو قبول کرلے۔

اس آیت میں طارق کی قسم کھائی گئی ہے۔ طارق کا لغوی معنی شب میں آنے والے کے ہیں۔ رات کو جو مہمان آتا ہے اسے اہلِ عرب طارق کہتے ہیں۔ لیکن یہاں اس سے مراد رات کو نمودار ہونے والے وہ ستارے ہیں جن کی روشنی خود بخود ہم تک پہنچتی ہے اور انہیں دیکھنے کیلئے دوربینوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگلی آیت میں اس کا مفہوم متعین کر دیا ہے کہ اس سے مراد اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ہے یعنی چمکنے والا ستارہ، جو دوسرے ستاروں سے نسبتاً تیز روشنی رکھتا ہے۔ یہ لفظ میں اگرچہ واحد ہے لیکن حقیقت میں اسمِ جنس ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی خاص ستارہ نہیں بلکہ ہر چمکنے والا ستارہ اس سے مراد ہے اور اسے جمع کی صورت میں بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت ستاروں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں۔ جتنے ستارے ہمیں نظر آتے ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ ستارے ہیں جن کی روشنی ہم تک نہیں پہنچتی اور وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ کہنا یہ ہے کہ وہ ستارے جو چمکتے اور دمکتے ہیں اور جن کی روشنی ہمیں فرحت وانبساط بخشتی ہے اور جو آسمان پر مشعلوں کی مانند روشن ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہیں جن کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں کتنے اور ستارے ہیں جو ہماری نگاہوں کی رسائی سے باہر ہیں۔

اِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾

(کوئی جان ایسی نہیں جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو۔ ۴)

اس آیت کے آغاز میں حرف ''اِنْ'' نافیہ ہے۔ اور حرف ''لَمَّا'' اِلاَّ کے معنی میں ہے۔ جو قبیلہ ہذیل کی لغت میں استثناء کا معنی دیتا ہے۔

یہ ہے مقسم علیہ اور دعویٰ۔ اسے ثابت کرنے کیلئے متذکرہ بالا قسم کھائی گئی۔

Marfat.com

یہ مقسم علیہ ہے اور قسم اس پر دلیل ہے

دعویٰ یہ ہے کہ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو۔ اصل نگہبان تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی دیکھ بھال اور حفاظت کر رہی ہے۔ اس نے ہر مخلوق کو زندگی بخشی ہے تو زندگی کی بقاء کے امکانات بھی بخشے ہیں۔ اور جو چیزیں زندگی کو نقصان پہنچا سکتی ہیں ان سے اس کی حفاظت بھی کی ہے۔ وہ جس طرح ہر مخلوق کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو جانتا ہے اور عہد بعہد اس میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگوں کے اعمال کو بھی جانتا ہے۔ کوئی کہاں پیدا ہوا، کہاں مرا اور اس کی خاک کہاں بکھر گئی، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ستاروں کو دیکھو، ان کی ان گنت آنکھیں رات بھر جاگتی اور ٹکٹکی لگائے زمین والوں کو گھورتی رہتی ہیں۔ ہر ستارے کی روشنی تہ بہ تہ فضاؤں کو چیرتی ہوئی زمین تک پہنچ جاتی ہے۔ انسان ہر شب اپنے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی یہ شان دیکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس رب کی شان یہ ہے اس کے بارے میں یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی چیز اس سے اوجھل رہ سکتی ہے۔ اور کون اس کے بارے میں یہ بدگمانی کر سکتا ہے کہ جس نے یہ بیشمار یہ قندیلیں بغیر کسی سہارے کے آویزاں کر رکھی ہیں، وہ قیامت لانے سے عاجز ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝٥ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝٦
يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝٧ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝٨

(پس انسان کو غور کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ۵) ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا۔ ۶) جو نکلتا ہے ریڑھ اور پسلیوں کے بیچ سے۔ ۷) بیشک وہ اس کے لوٹا سکنے پر پوری طرح قادر ہے۔ ۸)

دوسری زندگی پر انسان کے وجود سے استدلال

عالمِ بالا میں اپنی قدرت کی شانوں کی طرف متوجہ کرنے کے بعد اب انسان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ خود اپنی ہستی پر غور کرے تاکہ اسے اندازہ ہو جس ذات کے بارے میں اسے یہ بدگمانی ہے کہ وہ اس عالم کو دوبارہ بسانے کی طاقت نہیں رکھتا، اگر وہ اپنی تخلیق کے بارے میں غور کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت اور اس کی صنعت گری کی ایسی شانیں ظاہر ہوں گی کہ اگر اس کی فطرت میں ذرا سی بھی سلامتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی سے تائب ہو جائے گا۔

سب سے پہلے انسان کی تخلیق کے حوالے سے اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اسے دیکھنا چاہئے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ پانی کی ایک حقیر بوند سے اس کی تخلیق کی ابتداء ہوئی ہے۔ میاں بیوی کا جب اتصال ہوتا ہے تو باپ کے جسم سے جو پانی کی ایک بوند اچھل کے نکلتی ہے اس میں اربوں جرثو میں ہوتے ہیں اور ماں کے جسم سے نکلنے والے بکثرت بیضوں میں سے ایک بیضے کا انتخاب کر کے ان اربوں جرثوموں میں سے ایک جرثومے کے ساتھ اسے جوڑ دیا جاتا ہے اور اس سے استقرارِ حمل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کون کرتا ہے۔ کیا کسی انسان کے بس میں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اربوں جرثوموں میں سے ایک جرثومے کا انتخاب کرے اور بکثرت بیضوں میں سے ایک بیضے کے

Marfat.com

ساتھ اس کا جوڑ ملا دے۔ اور اس طرح سے استقرار حمل ہو جائے۔ پھر اس حمل کے بعد ماں کے پیٹ میں اسے نشوونما دی جاتی ہے۔ پہلے یہ گاڑھے خون کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے، پھر اس کی ہڈیاں وجود میں آتی ہیں، پھر اس پر کھال چڑھتی ہے، پھر اس کا نک سک درست ہوتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے، پھر ناف کے ذریعے سے اسے غذا بہم پہنچائی جاتی ہے، پھر وہ اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ ایک بچے کی شکل میں دنیا میں آسکے۔ سوال یہ ہے کہ رحم مادر میں یہ ساری تبدیلیاں کون کرتا ہے؟ کون اس کی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں میں تناسب پیدا کرتا ہے؟ اور پھر پیدائش سے موت تک کون اس کی مسلسل نگہبانی کرتا ہے؟

مزید فرمایا کہ انسان کو اس اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یعنی اس پانی کا اخراج جسم کے اعضائے رئیسہ سے ہوتا ہے اور وہ سب آدمی کے دھڑ میں واقع ہیں۔ اور جو صلب اور پسلیوں کے درمیان ہیں۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ پانی جس سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے وہ کوئی جوہر نایاب نہیں، اور نہ وہ کسی ایسی ولایت سے آتا ہے جو خدا کی خدائی کی حدود سے باہر ہو۔ بلکہ انسان ہی کی ریڑھ اور اس کی چھاتیوں کے بیچ سے اچھلتا ہے۔ پھر اس عام سے پانی سے اسے وہ شکل وصورت دی جاتی ہے جو مخلوقات میں سب سے بہتر شکل وصورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو پروردگار انسان کو وجود میں لاتا اور استقرار حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی کرتا ہے اور اس کی ضروریات پوری کرتا ہے، کیا اس کے بارے میں یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ دوبارہ انسان کو وجود نہیں دے سکتا۔ اگر وہ پہلی دفعہ انسان کو پیدا کرسکتا ہے تو آخر اب اس کی کیا معقول دلیل ہے کہ دوسری دفعہ اس پر قادر نہیں رہا۔

یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝٩

(اس روز ساری چھپی باتوں کی جانچ پڑتال ہوگی۔ ۹)

قیامت کے پس پردہ محرکات کا بھی حساب ہوگا

یعنی قیامت کے دن جس طرح ہر شخص کے اعمال کا حساب لیا جائے گا اسی طرح اس کے اعمال کے پس پردہ جو محرکات رہے، جو اغراض اور خواہشات کام کرتی رہیں اور جن نیتوں کے ساتھ وہ کام کئے گئے سب کا حساب ہوگا۔ جانچ پڑتال صرف اس بات کی نہیں ہوگی کہ کس شخص نے کیا کچھ کیا، بلکہ اس بات کی بھی ہوگی کس وجہ سے کیا، کس غرض، کس نیت اور کس مقصد سے کیا۔ اور ایک ایسی بات کی بھی جانچ پڑتال ہوگی جسے کرنے والا بھی نہیں جانتا۔ وہ یہ کہ کرنے والے نے جو فعل کیا اس کے دنیا میں کیا اثرات ہوئے، وہ کہاں کہاں پہنچے اور کتنی مدت تک چلتے رہے۔ کسی شخص نے اگر کوئی نیکی کاشت کی تو اس کی فصل کس کس شکل میں کہاں کہاں پھیلی۔ اور کسی نے اگر برائی کاشت کی تو اس کے اثرات کتنی نسلوں تک رہے اور کہاں کہاں انہوں نے فساد برپا کیا۔ ہر چیز کا حساب ہوگا اور ہر چیز کھل کر سامنے آجائے گی۔

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

Marfat.com

فَمَالَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿۱۰﴾

(اس وقت انسان کے پاس نہ کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ ۱۰)

جب انسان کے ہر عمل کی جانچ پڑتال ہوگی تو نہ اس کے پاس کوئی ذاتی قوت ہوگی جس سے وہ مدافعت کر سکے اور نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا، نہ کوئی شفاعت کرنے والا جو اس کی حمایت کیلئے اٹھے۔ انسان بے دست و پا اپنے اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا ہوگا اور صرف اس کے افکار و اعمال کے حوالے سے ایک بے لاگ فیصلہ ہوگا جسے بے چون و چرا قبول کرنا ہوگا۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾
اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾

(قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی۔ ۱۱) اور پھٹ جانے والی زمین کی۔ ۱۲)
کہ یہ دوٹوک بات ہے۔ ۱۳) یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں۔ ۱۴)

قرآن کے قولِ فیصل ہونے پر آفاقی شہادت

رَجْعٌ ...... اس کے لغوی معنی تو پلٹنے کے ہیں، لیکن مجازاً اس لفظ کا استعمال المطر بعد المطر کے معنی میں ہوتا ہے۔ یعنی ایسی بارش جو پے در پے ہو، کہ ایک مرتبہ بارش ہو کر ختم ہو جائے اور پھر لوٹے۔ اس لئے اس میں رجع کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

صَدْعٌ ...... اس کے معنی پھٹنے کے ہیں۔ یعنی جب بارش ہوتی ہے تو زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہے بیج کاشت کرنے کے ایک دو روز بعد زمین پھٹتی اور اس میں دراڑیں پڑتی ہیں۔ یہ دو قسمیں ہیں اور اگلی آیت جوابِ قسم ہے۔ کہنا یہ ہے کہ یہ قرآنِ کریم ایک دوٹوک، جچی تلی اور فیصلہ کن بات ہے۔ اس کی ہر بات اٹل اور اس کا ہر فیصلہ محکم ہے۔ اس کی کسی بات میں ترمیم یا تحریف ممکن نہیں۔ اس کے محرمات اور محللات قطعی اور ابدی ہیں۔ اس میں انسانوں کی کامیابی اور ان کی ناکامی کے جو اصول دیئے ہیں ان میں کسی تبدیلی یا کسی خطا کا کوئی امکان نہیں۔ اس جوابِ قسم یا دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے دو قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ایک بارشوں والے آسمان کی اور دوسری پھٹنے والی زمین کی۔ زمین جب موسم کی حدت سے جل اٹھتی ہے یا سردیوں کی برودت سے ہر چیز پر خزاں طاری ہو جاتی ہے اور زمین میں ہر طرف دھول اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور آسمان اور زمین کے درمیان غبار ہی غبار نظر آتا ہے۔ ایسے حال میں امیدیں دم توڑنے لگتی ہیں، جانور بھوک اور پیاس سے مرنے لگتے ہیں، انسانوں کے پاس اشیائے خورد و نوش کی کمی کے باعث ہر طرف موت کے سائے گہرے ہونے لگتے اور ہر طرف زندگی کے امکانات ڈھلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے حال میں آسمان سے بارانِ رحمت برستی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین کا سینہ نرم ہوتا، اس کے مسام کھلتے اور اس کے اندر سے سبزہ ابلنے لگتا ہے اور زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ ایسے موقعوں پر زندگی سے مایوس لوگ بے تابانہ پانی کی طرف لپکتے ہیں، جوہڑوں کی منڈیریں درست ہوتی ہیں، کھیتوں کو سیراب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، زمین کی نمی سے فائدہ اٹھا کر غلے کی

Marfat.com

کاشت کی جاتی ہے اور جانور پانی کے جوہڑوں پر پیاس بجھاتے اور ہر طرف پھیلے ہوئے سبزے سے شکم سیری کا سامان کرتے ہیں۔ لیکن جو شخص اس بارش کو ایک مذاق سمجھے اور زمین سے ابلتی ہوئی زندگی کو تمسخر کا نشانہ بنائے اس کی حماقت میں دو رائے نہیں ہوسکتیں۔ بالکل اسی طرح لادینیت کی حدت میں جلتی ہوئی آبادیوں پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی صورت میں رحمت کی بارش فرمائی۔ جن جن زمینوں میں قبولیت کی استعداد تھی یا اس بارش کیلئے ان میں طلب پائی جاتی تھی وہ زمینیں لہلہا اٹھیں۔ لیکن جن لوگوں نے اس قرآن کو بارانِ رحمت سمجھنے کی بجائے مذاق اور تمسخر کا نشانہ بنایا، انہوں نے بالکل بے وقوف کاشتکار کی طرح اپنی زندگی کے سروسامان سے محرومی کا فیصلہ کرلیا۔ قرآنِ کریم ان کو توجہ دلا رہا ہے کہ نادانو! بارشوں والے آسمان کی مہربانی دیکھو اور پھٹتی ہوئی زمین کو لہلہاتی ہوئی فصل میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھو۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ اور اچھا کاشتکار وہی ہے جو اس بارش سے فائدہ اٹھائے اور اپنی فصل کاشت کرے۔ سچ کہا اقبال نے:

موسم اچھا پانی وافر مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾

(وہ چل رہے ہیں ایک چال۔ ۱۵) اور میں بھی ایک داؤ چل رہا ہوں۔ ۱۶)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

ان آیاتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپؐ کی دعوت کے مخالفین اور اللہ تعالیٰ کے دین کا انکار کرنے والے آپؐ کی دعوت کو ناکام کرنے کیلئے مختلف قسم کی چالیں چل رہے ہیں۔ کہیں لوگوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں تاکہ وہ سراسیمہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے دین کو چھوڑ دیں اور جاہلیت کی طرف پلٹ جائیں۔ اور کہیں لوگوں کے دلوں میں مختلف قسم کے شبہات پیدا کئے جارہے ہیں۔ ایک سے ایک جھوٹا الزام تراش کر کبھی آپؐ پر لگایا جارہا ہے اور کبھی آپؐ کے ساتھیوں پر۔ وسائلِ رزق پر پابندیاں لگا کر مسلمانوں کیلئے زندگی دشوار کی جارہی ہے تاکہ وہ پیٹ کی بھوک سے تنگ آکر پرانے دور کی طرف لوٹ جائیں۔ غرضیکہ جو ان کے بس میں ہے وہ آپؐ کی دعوت کو ناکام کرنے اور اسلام کی راہ کو روکنے میں صرف کررہے ہیں۔ لیکن آپؐ اس کی پرواہ نہ کریں، میں ان کی ہر تدبیر کو ناکام کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا داؤ چلنے سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے کسی داؤ اور کسی چال کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ وہ وقتی طور پر ایسی صورتحال پیدا کردے گا کہ مخالفین یہ سمجھیں گے کہ ان کی تدبیریں اور ان کے فریب کامیاب ہورہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ان کا فریبِ نظر ہوگا۔ اسلام کی دعوت چاروں طرف انہیں اپنے گھیرے میں لے رہی ہوگی لیکن وہ اپنی مسندوں پر براجمان اور اپنے دائرۂ کار میں رسوخ کے مالک ہونے کی وجہ سے یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم اپنی تدبیروں میں کامیاب ہورہے ہیں۔ یہ درحقیقت استدراج کا ایک پھندا ہے جو انہیں اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ جتنی ان کی رسی دراز ہوتی جارہی ہے اتنی ہی اس کی گرفت مضبوط ہورہی ہے۔ لیکن ایک دن آئے گا جب اسلام کا سورج پوری طرح اس سرزمین پر روشن ہوگا اور ان لوگوں کی ہر تدبیر ناکام ہوچکی ہوگی۔

Marfat.com

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾

(پس اے پیغمبر! ان کافروں کو مہلت دے دیجئے اور ذرا سی ذرا ان کو چھوڑ دیجئے۔ ۱۷)

چونکہ یہ لوگ ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے گھیرے میں آ چکے ہیں۔ ان کو جتنی بھی مہلت دی جائے یہ اس گھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ وہ ہزار سمجھتے رہیں کہ ہم اپنی کارروائیوں میں آگے بڑھ رہے ہیں اور ہم نے اسلام کا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بری طرح ناکام ہو گئے ہیں۔ تو جب صورتحال یہ ہے کہ تو آپؐ کافروں کو ڈھیل دے دیجئے۔ یعنی وہ آپؐ کو طعنے دیں، مطالبات سے پریشان کریں، اذیت رسانی سے مسلمانوں کا جینا مشکل کر دیں، آپؐ کسی بات سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ سے عذاب نازل کرنے کی دعا نہ کریں۔ یہ بجھتے ہوئے دیئے کی آخری لو ہے اور یہ اسے اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔ اور مزید یہ فرمایا کہ ہم جو مہلت اور ڈھیل دینے کی سفارش کر رہے ہیں تو یہ سفارش کسی غیر محدود مدت کیلئے نہیں، بس ذرا سی ان کی رسی دراز کر دی جائے تاکہ یہ جو کھل کھیلنا چاہتے ہیں وہ کھیل لیں، بہت جلد ان کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

اس آخری آیت میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ پروردگار نبی کریم ﷺ کو ہدایت کر رہے ہیں کہ آپؐ انہیں تھوڑی سی اور مہلت دے دیجئے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کی قسمت کی باگ درحقیقت آپؐ کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔ کیونکہ عموماً یہ ہوتا رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا رسول مخاطب قوم کی طرف سے دعوت کی قبولیت کے حوالے سے مایوس ہو جاتا ہے اور دشمن قوم اللہ تعالیٰ کے رسول کو مزید برداشت کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو رسول ان پر عذاب بھیجنے کی درخواست کرتا ہے، جو قبول کر لی جاتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا اس پر شاہد ہے۔ ویسے بھی جس قوم میں اللہ تعالیٰ کا رسول مبعوث ہوتا ہے اس قوم کی زندگی کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو قبول کرتی ہے یا نہیں۔ اسی اصول کے تحت ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر آ ٹھہرا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت کی ہے کہ آپؐ ان کو تھوڑی سی ڈھیل اور دے دیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْاَعْلٰی

(۸۷)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْاَعْلٰی ہے جو اس کی پہلی ہی آیت سے لیا گیا ہے۔

مقامِ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے، مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت چھ میں فرمایا گیا ہے کہ ہم تمہیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب نبی کریم ﷺ کو وحی اخذ کرنے کی ابھی اچھی طرح مشق نہیں ہوئی تھی۔ قرآنِ کریم کی بعض دوسری آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے ابتدائی دور میں آنحضرت ﷺ کو برابر یہ خیال رہتا تھا کہ قرآنِ کریم کلام اللہ ہے اس کے ایک ایک لفظ کے لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ ممکن ہے میں وحی کے کسی لفظ کو بھول جاؤں اور اس طرح سے قرآنِ پاک کی حفاظت اور اس کے ابلاغ میں کوتاہی رہ جائے۔ اس لئے جیسے ہی حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آپؐ کے سامنے قرآنِ کریم پڑھتے تو آپؐ جلدی جلدی اسے دہرانے کی کوشش کرتے۔ خاص طور پر جب کوئی طویل سورۃ نازل ہوتی تو اس کے بارے میں آپ زیادہ اندیشے میں مبتلا ہوتے۔ لیکن یہ ابتدائی دور کی باتیں ہیں، اس کا قرآنِ کریم میں تین جگہ ذکر آیا ہے۔ ایک تو اس آیت میں، دوسرا سورۃ قیامہ میں اور تیسرا سورۃ طٰہٰ میں۔ اس کے بعد پھر کہیں آپ کو ایسی ہدایت نہیں دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وحی اخذ کرنے کی مشق ہو گئی تو پھر ایسی کسی ہدایت کی ضرورت نہ رہی۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

اس مختصر سورۃ میں تین موضوع بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) توحید (۲) نبی کریم ﷺ کو ہدایات (۳) آخرت۔

سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسے ناموں سے یاد کیا جائے جو اس کی شان کے لائق ہیں۔ اور ایسے کسی نام سے یاد نہ کیا جائے جو اپنے اندر کسی قسم کے نقص، عیب، کمزوری یا مخلوق سے تشبیہ کا کوئی پہلو رکھتا ہو۔ توحید کے حوالے سے قوموں میں جتنے مفاسد پیدا ہوئے ہیں اس کی بنیاد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے متعلق کسی نہ کسی غلط تصور پر رہی ہے۔ اور اس تصور نے رفتہ رفتہ غلط نام کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس لئے توحید کی اصلاح کیلئے یہ تاکید بہت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان اسمائے حسنیٰ سے یاد کیا جائے جو اس کی شان کے لائق ہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی چار صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ تخلیق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت۔ اور ان صفات کی ادنیٰ مصداق کے طور پر نباتات کی تخلیق کا ذکر فرمایا اور پھر اس کے انجام کے حوالے سے اس کے خس و خاشاک کر دینے کا بھی ذکر کیا۔

پھر اس کے بعد دو آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ جب وحی نازل ہو رہی ہو تو آپؐ کو یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپ قرآنِ کریم کے کسی لفظ کو بھول جائیں گے۔ جس طرح قرآنِ کریم کے نزول کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے انسانوں کی ہدایت کیلئے اپنی ذمہ داری بنالیا ہے، اسی طرح اس نے اس بات کی بھی ذمہ داری خود قبول فرمائی ہے کہ وہ اس کو آپؐ کے حافظے میں محفوظ کر دے گا اور آپؐ اس میں سے کسی لفظ کو بھول نہیں پائیں گے، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کے برعکس کوئی فیصلہ کر لے، یا اس کے کسی حصے کو منسوخ کر دے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو آپؐ کی ذمہ داری کی حدود سے آگاہ کیا گیا کہ آپؐ پر ذمہ داری ہر ایک کو راہِ راست پر لانے کی نہیں ہے، بلکہ آپؐ کا کام بس حق کی تبلیغ کر دینا ہے۔ اور تبلیغ کا سیدھا سادھا طریقہ یہ ہے کہ جو نصیحت سنے اور قبول کرنے کیلئے تیار ہو، اسے نصیحت کی جائے۔ اور جو سننا نہ چاہے اس کو سنانا آپؐ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ آپؐ کی نصیحت صرف وہ لوگ سنیں گے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت سے ڈرنے والے ہیں۔ اور جو محروم القسمت ہیں وہ اس سے گریز ہی کریں گے اور اپنا انجام دیکھیں گے۔

اس کے بعد ان لوگوں کو فوز و فلاح کی بشارت دی گئی ہے جنہوں نے اپنے آپ کو پاک کیا اور اپنے رب کو یاد کیا اور اس کی نماز پڑھی۔

آخر میں کفار کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہاری اصل بیماری یہ ہے کہ تم دنیا کے آرام و آسائش اور فائدوں اور لذتوں کی فکر میں رہتے ہو۔ یہی تمہاری ترجیح ہے۔ حالانکہ اصل فکر آخرت کی ہونی چاہئے کیونکہ دنیا فانی اور آخرت باقی رہنے والی ہے۔ اور آخرت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ یہ حقیقت صرف تمہیں ہی نہیں بتائی جا رہی بلکہ پہلی امتوں کو بھی یہی ہدایت کی گئی تھی کہ ترجیح آخرت کو دینا، دنیا کو نہیں۔ آخرت کی زندگی ہی اصل مقصود ہے۔ یہ بات حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں بھی بتائی گئی ہے۔

Marfat.com

اٰیَاتُهَا ١٩	سُوْرَةُ الْاَعْلٰی مَكِّيَّةٌ (٨٧)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿١﴾ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ۙ﴿٢﴾ وَالَّذِيْ
قَدَّرَ فَهَدٰى ۪ۙ﴿٣﴾ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۪ۙ﴿٤﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَاۗءً اَحْوٰى ۭ﴿٥﴾
سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ﴿٦﴾ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا
يَخْفٰى ۭ﴿٧﴾ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ښ﴿٨﴾ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۭ﴿٩﴾
سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۙ﴿١٠﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ﴿١١﴾ الَّذِيْ يَصْلَى
النَّارَ الْكُبْرٰى ۚ﴿١٢﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۭ﴿١٣﴾ قَدْ اَفْلَحَ
مَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۭ﴿١٥﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا ښ﴿١٦﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ﴿١٧﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ
الْاُوْلٰى ۙ﴿١٨﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۧ﴿١٩﴾

رکوع: ۱۔ (اپنے ربِ برتر کے نام کی تسبیح کیجئے۔ ۱) جس نے پیدا کیا اور پھر اس کا تناسب قائم کیا۔ ۲) اور جس نے تقدیر بنائی پھر اس نے ہدایت بخشی۔ ۳) جس نے نباتات اگائیں۔ ۴) پھر کر ڈالا اس کو کوڑا سیاہ۔ ۵) ہم آپ کو پڑھائیں گے تو پھر آپ نہیں بھولیں گے۔ ۶) سوائے اس کے جو اللہ چاہے، وہ علانیہ کو بھی جانتا ہے اور اس کو بھی جو چھپا ہوتا ہے۔ ۷) ہم آپ کو آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں۔ ۸) پس آپ نصیحت

Marfat.com

کریں اگر نصیحت نفع پہنچائے۔ ۹) نصیحت قبول کرے گا وہ شخص جو ڈرتا ہے۔ ۱۰) (اور گریز کرے گا وہ جو بدبخت ہوگا۔ ۱۱) وہ پڑے گا بڑی آگ میں۔ ۱۲) پھر نہ اس میں مرے گا، نہ جئے گا۔ ۱۳) کامیاب ہوا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ ۱۴) اور اپنے رب کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی۔ ۱۵) مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ ۱۶) حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ ۱۷) بیشک یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی ہے۔ ۱۸) (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔ ۱۹)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی ۝

(اپنے ربِ برتر کے نام کی تسبیح کیجئے۔ ۱)

اللہ تعالیٰ کی یاد کی اہمیت

تسبیح کا معنی پاک کرنا ہوتا ہے۔ اس لفظ میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے۔ یعنی اس کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے پاک اور برتر قرار دیا جائے جو اس کی اعلیٰ شان کے منافی ہیں۔ یعنی اسے ایسے ناموں سے نہ پکارا جائے جو اپنے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے اس کیلئے موزوں نہیں ہیں۔ یعنی ان میں کوئی نقص، گستاخی یا شرک کا پہلو نکلتا ہے۔ اس کیلئے وہی نام استعمال کئے جائیں جو اس کی شان کے لائق ہوں۔ اور بہتر یہ ہے کہ جنہیں خود قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے یا دوسری زبان میں ان کا صحیح ترجمہ ہوں۔ صاحبِ معارف القرآن نے بعض احادیث کی روشنی میں اور قرطبی سے استفادہ کرتے ہوئے چند مسائل تحریر فرمائے ہیں ہم انہیں یہاں نقل کر رہے ہیں۔

مسئلہ:۔ علماء نے فرمایا ہے کہ قاری جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی کی تلاوت کرے تو مستحب ہے کہ یہ کہے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی، صحابہ کرام حضرت عبداللہ بن عباس، ابنِ عمر، ابنِ زبیر، ابوموسیٰ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی معمول تھا کہ جب یہ سورۃ شروع کرتے تو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہا کرتے تھے۔ (قرطبی) یعنی نماز کے سوا جب تلاوت کریں تو ایسا کہنا مستحب ہے۔

مسئلہ:۔ حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ جب سورۃ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اجعلوھا فی سجودکم یعنی یہ کلمہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی اپنے سجدہ میں کہا کرو۔ تسبیح کے معنی پاک رکھنے اور پاکی بیان کرنے کے ہیں۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے رب کے نام کو پاک رکھئے۔ مراد یہ ہے کہ رب کے نام کی تعظیم و تکریم کیجئے اور جب اللہ کا نام لیں تو خشوع و خضوع اور ادب کا لحاظ رکھئے اور ہر ایسی چیز سے اس کے نام کو پاک رکھئے جو اس کے شایان نہیں، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان ناموں سے پکاریئے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بتلائے ہیں ان کے سوا کسی اور نام سے اس کو پکارنا جائز نہیں۔

Marfat.com

مسئلہ:۔ اسی طرح اس حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ جو نام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے وہ کسی مخلوق کیلئے استعمال کرنا اس کی تنزیہہ وتقدیس کے خلاف ہے اس لئے جائز نہیں۔ (قرطبی) جیسے رحمٰن، رزاق، غفار، قدوس وغیرہ۔ آج کل اس معاملے میں غفلت بڑھتی جا رہی ہے، لوگوں کو ناموں کے اختصار کا شوق ہے۔ عبدالرحمٰن کو رحمٰن، عبدالرزاق کو رزاق، عبدالغفار کو غفار بے تکلف کہتے رہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا کہنے والا اور سننے والا دونوں گنہگار ہوتے ہیں اور یہ گناہ بے لذت رات دن بلا وجہ ہوتا رہتا ہے اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ اسم سے مراد خود مسمّٰی کی ذات مراد لی ہے اور عربی زبان کے اعتبار سے اس کی گنجائش بھی ہے اور قرآنِ کریم میں بھی اس معنی کیلئے استعمال ہوا ہے اور حدیث میں جو رسول اللہ ﷺ نے اس کلمہ کو نماز کے سجدے میں پڑھنے کا حکم دیا ہے اس کی تعمیل میں جو کلمہ اختیار کیا گیا وہ سُبْحَانَ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی نہیں بلکہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسم اس جگہ مقصود نہیں خود مسمّٰی مراد ہے۔ (قرطبی) واللہ اعلم۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۲﴾ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ﴿۳﴾

(جس نے پیدا کیا اور پھر اس کا تناسب قائم کیا۔ ۲) اور جس نے تقدیر بنائی پھر اس نے ہدایت بخشی۔ ۳)

تکوینِ وجود کے چار مراتب

خالق کائنات نے ان آیات میں تکوینِ وجود کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں۔ خلق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت۔ کائنات کی ہر مخلوق کا عدم سے وجود میں آنا اس کی صفت خلق کا اظہار ہے۔ مگر ہر مخلوق کا اس طرح پیدا کیا جانا جس طرح اسے ہونا چاہئے تھا اور اس کے نک سک کا درست ہونا اور اس میں انتہا درجہ کا تناسب پایا جانا اور ہر طرح سے اپنے ماحول سے اس کا مناسبت رکھنا اور ماحول کا اس کے ساتھ مناسب ہونا یہ وہ چیز ہے جس کو تسویہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ہر مخلوق اپنے وجود کے اعتبار سے اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس کا جسم اور اس کا ماحول باہم دگر ایک دوسرے کیلئے معاون و مددگار بن گئے ہیں۔ پرندے ہوا میں اڑتے ہیں انہیں پَر عطا کئے گئے ہیں۔ مچھلیاں پانی میں پیدا ہوتی ہیں تو انہیں تیرنا سکھایا گیا ہے۔ حشرات الارض کوڑا کرکٹ میں پیدا ہوتے ہیں تو انہیں رینگنا سکھایا گیا۔ مچھلی خشکی میں پیدا نہیں کی گئی۔ پرندے پانی میں پیدا نہیں کئے گئے اس لئے کہ ان کا جسمانی تناسب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر مخلوق کیلئے یہ پہلے سے طے کر دیا گیا کہ اسے کس طرح کا کام انجام دینا ہے؟ اس کی حدود کار کیا ہوں گی؟ اس کی قوتِ عمل کس طرح کی ہوگی؟ اسے کب تک کس حال میں رہنا ہے؟ اور کس حد تک اپنے کام کو انجام دینا ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور اس مقصد کو بروئے کار لانے کیلئے اسے کون سی صلاحیت درکار ہے؟ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کریم میں تقدیر کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورج کو پیدا کیا گیا تو اس کا مقصدِ وجود مقرر کر دیا گیا۔ چاند کو پیدا کیا گیا تو اس کے عمل کا ایک دائرہ ٹھہرا دیا گیا۔ ستارے بنائے گئے تو انہیں ان کی ڈیوٹیاں سمجھا دی گئیں۔ نباتات سے لے کر آسمان کی ہر مخلوق تک ہر ایک کیلئے ایک تقدیر بنا دی گئی۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج اپنے دائرہ کار سے باہر نکل جائے اپنے مقصد وجود یعنی کائنات کو روشنی دینے اور گرمی پہنچانے سے رک جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ چاند اپنی حلاوت سے اہل زمین کو محروم کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ستارے جھلملانا چھوڑ دیں۔ یہ ناممکن ہے کہ پھول خوشبو دینے اور پانی پیاس بجھانے سے انکار کر دے۔ ہر ایک اپنے

Marfat.com

اپنے کام پر لگا ہوا ہے اور انہیں اپنا مقصود وجود اور دائرہ کار اچھی طرح معلوم ہے اور اگر شعور کی آنکھ سے مزید کام لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تمام مخلوقات کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ تمہیں اپنے اپنے فرائض کس طرح انجام دینا ہیں۔ مچھلی کو اگر پانی میں تیرنے کا حکم دیا گیا تو ایسا نہیں کہ اسے تیرنا نہ سکھایا گیا ہو۔ پرند کیلئے ہوا میں اڑنا مقدر کیا گیا تو ایسا نہیں ہے کہ اسے اڑنے کی تعلیم نہ دی گئی ہو۔ سورج، چاند اور ستاروں کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ انہیں اس کی ہدایت نہ دی گئی ہو۔ قرآن کریم کہتا ہے:

لَا الشَّمْسُ يَنۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ (یٰسین. ۳۶.۴۰)

''سورج کی مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور رات کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے، ہر ایک کا اپنا دائرہ کار ہے اور اپنے دائرے میں مصروف عمل ہے۔''

اس کی ہدایت کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ اسے وجود ملا ہو اور وہ غایت وجود سے بے خبر ہو اور پھر اس کو روبعمل لانے سے بے بہرہ ہو۔ اس نے کلیوں کو پیدا کیا تو انہیں چٹکنا بھی سکھایا۔ اس نے پھول کو پیدا کیا تو اس کو مہکنا بھی سکھایا۔ اس نے درختوں کو پیدا کیا تو انہیں لہکنا بھی سکھایا۔ اس نے ستاروں کو پیدا کیا تو انہیں جھلملانا اور ٹمٹمانا بھی سکھایا ہے۔ اس نے بادل کو پیدا کیا تو اسے کڑکنا بھی سکھایا۔ اس نے رعد کو گرجنا اور بجلی کو کوندنا بھی سکھایا۔ اس نے پرندے کو چہکنا اور ہوا کو لہکنا بھی سکھایا۔ اس نے آگ کو جلانا اور پانی کو بہنا سکھایا۔ اس نے حُسن کو مچلنا اور عشق کو پگھلنا سکھایا۔ غرضیکہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جسے اس نے تقدیر کے ساتھ ساتھ ہدایت سے نہ نوازا ہو۔

البتہ جس طرح مخلوقات کی کئی قسمیں ہیں اور ہر ایک کی معیشت کی راہ دوسرے سے مختلف ہے اور ہر ایک کی زندگی کے تقاضے دوسری مخلوقات سے جدا ہیں۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو اصولی طور پر ہدایت سے تو نوازا لیکن ہدایت کا طریقہ ان کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ مختلف ہوتا رہا۔ لیکن انسان ان تمام مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی برترین قسم ہے۔ اس کی زندگی دو حیثیتوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنے اندر حیوانیت رکھتا ہے اور حیوانیت کے تقاضوں سے اس کی ہدایت کی وہی ضرورت ہے جو حیوانات کی ہے۔ چنانچہ حیوانی ہدایت کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اسے جبلی رہنمائی بھی دی گئی ہے، اس کے اندر وجدان کی قوت بھی رکھی ہے اور اسے حواس بھی عطا کئے گئے ہیں۔ اور اس کی زندگی کی دوسری حیثیت وہ ہے جسے انسانیت کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے جوہرِ عقل سے نوازا گیا ہے، اسے شعور کی دولت عطا کی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے تکلیفِ شرعی سے مکلّف کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی ضرورت نہ حیوانی ہدایت سے پوری ہوتی ہے اور نہ انسانی ہدایت سے۔ اسے نہ صرف تکوینی ہدایت کفایت کرتی ہے، نہ جبلی ہدایت، نہ عقل کی رہنمائی اس کیلئے کافی ہے اور نہ تجربہ اس کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اسے اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے میری زندگی کا مقصد عبادت قرار دیا ہے اس عبادت کی حدود کیا ہیں؟ میرا آقا کون ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟ میری بندگی کا طریقہ کیا ہے؟ اور بندگی کا حق ادا کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے مجھے کون سی شریعت اور کون سا قانون دیا ہے؟ وہ کون سی کتاب ہے جس میں میرے لئے اصولِ ہدایت واضح کئے گئے ہیں اور میری زندگی کا آئیڈیل اور رہنما کون ہے جس کی پیروی میرے مقصدِ حیات کیلئے رہنما ہو سکتی ہے۔ یہ وہ تشریعی ہدایت ہے جسے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت ﷺ کے زمانے تک ہر دور میں ہر پیغمبر پر اللہ تعالیٰ نے ہر دور کے انسانوں کی رہنمائی کیلئے نازل کیا ہے۔ چنانچہ آیتِ کریمہ میں ہدایت کی ان تمام اقسام کی طرف اشارہ ہے اور ہم اسے سورۃ فاتحہ میں تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔

Marfat.com

وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۝ فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحْوٰی ۝

(جس نے نباتات اگائیں۔ ۴) پھر کر ڈالا اس کو کوڑا سیاہ۔ ۵)

مَرْعٰی …… چارے کو بھی کہتے ہیں اور چراگاہ کو بھی۔ لیکن سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف چارہ نہیں ہر قسم کی نباتات مراد ہیں جو زمین سے اگتی ہیں۔

غُثَآءً …… اس کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں جو پانی کے سیلاب میں اوپر آجاتا ہے۔ مکھن کے جھاگ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اَحْوٰی، حُوَّۃٌ سے مشتق ہے۔ گہری سبزی میں جو ایک قسم کی سیاہی آجاتی ہے اس کو حُوَّۃٌ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر دلیل

یعنی اس اللہ کی تسبیح کرو جس نے زمین سے نباتات کو اگایا، جس کی ابتداء نازک سی سوئی سے ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کو تنے اور پودے میں تبدیل کر دیا، اور کہیں بیلوں کی شکل میں بچھا دیا، کہیں قدآور درختوں کی شکل میں اٹھا دیا۔ یعنی نباتات کی جتنی قسمیں ہیں ان کی تازگی اور شادابی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جنہیں دیکھ کر انسان خوش ہوتا ہے اور زمین پر بہار کا منظر دیکھتا ہے۔ لیکن یہ سرسبزی اور شادابی دیر تک نہیں رہتی۔ موسم بدلتے ہی پروردگار اسے زرد خشک اور سیاہ کر کے ایسا کوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں اور سیلاب خس و خاشاک کی صورت میں بہا لے جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی بے جان علت یا لگے بندھے قانون کی کارفرمائی نہیں بلکہ قادرِ مطلق کی قدرت کا اظہار ہے۔ وہ جب چاہتا ہے زمین پر بہار لے آتا ہے اور جب چاہتا ہے اسے خزاں میں بدل دیتا ہے۔ اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ انسانوں کو اپنی جوانیوں، خوشحالیوں اور کامیابیوں پر مغرور نہیں ہونا چاہئے۔ زندگی کی یہ بہار پائیدار نہیں۔ کچھ پتہ نہیں کب خزاں کا حملہ ہو جائے اور سب کچھ جاتا رہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ عطا بھی کرتا ہے اور چھین بھی لیتا ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس نے کائنات کی بساط بچھائی ہے اور آج ہر طرف ہمیں وجود کی کارفرمائی اور عمل کی ہماہمی دکھائی دے رہی ہے اس کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں کہ ایک دن کائنات کی بساط لپیٹ دے۔ اور سب کچھ ختم کرنے کے بعد پھر دوبارہ نئی زندگی لائے اور انسانوں کو ان کے مرقدوں سے نکال کر حشر کے میدان میں لاکھڑا کرے۔

بعض اہلِ علم کو اصرار ہے کہ اَحْوٰی ہرگز اس سیاہی کیلئے نہیں آتا جو کسی شے میں اس کی کہنگی، بوسیدگی اور پامالی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ اس سیاہی مائل سرخی یا سبزی کیلئے آتا ہے جو کسی شے پر اس کی تازگی، شادابی، زرخیزی اور جوشِ نمو کے سبب سے نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح غُثَـآءً صرف کوڑا کرکٹ اور خس و خاشاک کیلئے ہی نہیں بولا جاتا بلکہ اس سبزے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو زمین کی زرخیزی کے سبب سے اچھی طرح گھنا اور سیاہی مائل ہو گیا ہو۔ اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ اس اللہ کی پاکیزگی بیان کرو جو نباتات کو زمین سے نازک سوئیوں کی شکل میں نکالتا ہے، پھر ان کو گھنی اور سیاہی مائل سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے۔ ناچیز کا خیال یہ ہے کہ الفاظ میں دونوں معنوں کیلئے گنجائش ہے، کسی ایک پر اصرار مناسب نہیں۔ اور مفہوم کے اعتبار سے پہلے معنی کے اعتبار سے انسان کی بے ثباتی اور قیامت کے وجود پر دلیل معلوم ہوتی ہے اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت کا ظہور ہے۔

Marfat.com

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝٦ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝٧

(ہم آپ کو پڑھائیں گے تو پھر آپ نہیں بھولیں گے۔ ۶) سوائے اس کے جو اللہ چاہے، وہ علانیہ کو بھی جانتا ہے اور اس کو بھی جو چھپا ہوتا ہے۔ ۷)

وحی کے بارہ میں ایک وضاحت

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار اور اس کی عنایات کا بیان ہے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ انسانوں کی ہدایت کیلئے وحی کا نزول اور آپ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور اس کی قدرت کا ظہور ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وحی کے نزول کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار نہ فرمائے اور اپنے اس احسان کی حفاظت اور تکمیل کیلئے آپ کو کسی پریشانی میں مبتلا ہونے دے۔ اس لئے ہم نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے کہ ہم آپ پر جب وحی نازل کریں گے اور ہمارا فرشتہ آپ کے سامنے جب وحی کے الفاظ پڑھے گا تو ہم اسے اس طرح آپ کے قلبِ اطہر میں پیوست کر دیں گے کہ آپ اسے کبھی نہیں بھولیں گے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا کوئی لفظ میرے حافظے سے محو ہو جائے یا میں اسے ٹھیک طرح سے اخذ نہ کر سکوں۔ حاکم نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے اور ابنِ مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرآن کے الفاظ کو اس خوف سے دہراتے جاتے تھے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ مجاہد اور کلبی کہتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی سنا کر فارغ نہ ہوتے تھے کہ حضورؐ بھول جانے کے اندیشے سے ابتدائی حصہ دہرانے لگتے تھے۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ اطمینان دلایا کہ جس پروردگار نے یہ عظیم احسان فرمایا ہے اس نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے بس وحی کے نزول کے وقت آپ خاموشی سے سنتے رہیں، اس کا کوئی لفظ آپ کے حافظے میں محفوظ ہونے سے رہ نہیں سکے گا۔ آپ کو اس کے بھول جانے کا کبھی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔ قرآنِ کریم میں سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۴ اور سورۃ قیامۃ آیت ۱۶ تا ۱۹ میں بھی آپ کو وحی اخذ کرنے کا طریقہ سکھایا گیا اور اطمینان دلایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآنِ کریم معجزے کے طور پر آپ پر نازل کیا گیا ہے، اسی طرح معجزے کے طور پر ہی اس کا لفظ لفظ آپ کے حافظے میں محفوظ بھی کر دیا گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بعض سورتیں جو بہت طویل بھی ہیں اور ایک ہی نشست میں آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی ہیں اور آپ نے نزولِ وحی کی کیفیت ختم ہوتے ہی انہیں از اول تا آخر لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنایا، اور پھر کاتبانِ وحی کو لکھوایا۔ اور نمازوں میں ان کی تلاوت بھی فرمائی۔ سورۃ یوسف جیسی طویل سورۃ ایک ہی نشست پر آپ پر نازل ہوئی، اور آپ نے اسے اسی وقت لوگوں کے سامنے اسے پیش بھی فرما دیا۔ ایک ہی دفعہ سن کر ایسی طویل سورۃ کو محفوظ حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کر دینا انسانی حافظے کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک معجزہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ ہاں جو اللہ چاہے۔ یعنی آپ قرآن کی کوئی چیز بھولیں گے نہیں۔ بجز اس کے کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ ہی اپنی حکمت اور مصلحت کی بنا پر آپ کے ذہن سے محو کر دے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے منسوخ کر دے اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مصلحت اور حکمت کی بناء پر عارضی طور پر کوئی آیت آپ کے ذہن سے بھلا دے اور پھر آپ کو یاد آ جائے یعنی آپ مستقل نہ بھولنے پائیں۔ اس مفہوم کی تائید صحیح بخاری کی ایک روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے آپ قرأت کے دوران ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت ابی ابنِ کعب نے پوچھا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں، میں بھول گیا تھا۔ تو اس استثناء کا مطلب یہ ہے کہ وقتی اور عارضی طور پر تو کسی آیت کو آپ بھول سکتے ہیں، لیکن مستقل آپ کبھی نہیں بھولیں گے۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

اسی تسلی اور اطمینان کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ تبلیغ ودعوت کے سلسلے میں مخالفین کی طرف سے جس طرح کے حالات سے دوچار ہیں آپ کا رب ان سے بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ تو ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو ظاہر ہیں اور ان باتوں سے بھی آگاہ ہے جو پوشیدہ ہیں۔ اس لئے جو پریشانیاں کبھی آپ کی زبان پر نہیں آئیں، اللہ تعالیٰ ان سے بھی آگاہ ہے اور جو دعاؤں کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوگئیں، اللہ تعالیٰ ان سے بھی واقف ہے۔ دشمن جو کھلی ہوئی شرارتیں کر رہا ہے اور جو مخفی سازشیں کر رہا ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ تو جب وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت اور اختیار بھی رکھتا ہے تو آپ اطمینان رکھیں ہر ضرورت کے مطابق آپ کی رہنمائی بھی کرے گا اور آپ کو نصرت وتائید سے بھی نوازے گا۔

سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کو قرآن پڑھ کر سناتے ہیں اور آپ ان کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اور بھول جانے کے جس خوف سے آپ ایسا کر رہے ہیں وہ احساس بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اور وہی بے پایاں علم کا مالک آپ کو تسلی دے رہا ہے کہ آپ نازل ہونے والی وحی میں سے کبھی کچھ نہیں بھولیں گے۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ﴿٨﴾ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿٩﴾

(ہم آپ کو آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں۔ ۸) پس آپ نصیحت کریں اگر نصیحت نفع پہنچائے۔ ۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یُسر کی بشارت

آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے سلسلے میں جس مشکل صورتحال سے دوچار تھے، سیرت وتاریخ کا ہر طالب علم اور قرآنِ کریم کا ہر قاری اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ آپ ایسے ایسے جانگسل مراحل سے گزرے ہیں کہ ان کی تفصیل پڑھ کر پتہ پانی ہوتا ہے۔ چنانچہ پروردگار اس صورتحال سے کامیابی وکامرانی سے نکلنے کی آپ کو بشارت دے رہا ہے۔ اور ساتھ ہی آپ کے حدودِ کار کو متعین فرما کر آپ کیلئے آسانی پیدا فرما رہا ہے۔ جہاں تک آپ کی کامیابی وکامرانی کا تعلق ہے اس میں غیر متوقع طور پر پروردگار نے جس طرح آپ کو نوازا وہ تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک ایسا ہمہ گیر انقلاب جس نے نہ صرف جغرافیہ بدلا اور حکومتیں تبدیل کیں بلکہ انسانی عقائد بدلے۔ انسانی سیرت وکردار میں حیرت انگیز تبدیلیاں کیں۔ انسانی اہداف یکسر بدل گئے۔ قبائل میں بٹی ہوئی انسانوں کی بھیڑ ایک منضبط اور مستحکم امت میں تبدیل ہوگئی۔ عہدہ ومنصب کا تصور بدل گیا۔ دنیا طلبی کی بجائے آخرت طلبی زندگی کا مقصد بن گئی اور چند ہی سالوں میں بارہ لاکھ مربع میل علاقے پر اس دین کا پرچم لہرانے لگا کہ جس کا نام سننے کے بھی عرب کے لوگ روادار نہ تھے۔ اور جہاں تک آپ کے فریضۂ منصبی کے حدودِ کار کا تعلق ہے اس سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے تبلیغ ودعوت کا جو بارِ عظیم آپ پر ڈالا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بہروں کو سنائیں اور اندھوں کو راہ دکھائیں۔ اور جو لوگ آپ کی بات سننے کے روادار نہ ہوں آپ ہر ممکن طریق سے ان تک اپنی بات پہنچائیں۔ بلکہ ہم نے اس میں یہ آسانی پیدا کی

Marfat.com

ہے کہ آپ کا کام نصیحت کرنا ہے۔ جہاں آپ نصیحت کو نافع ہوتا دیکھیں وہاں نصیحت کریں۔ اور جہاں آپ محسوس کریں کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے تیار نہیں اور لوگوں نے اپنے کان اور دل اس کیلئے بند کر لئے ہیں تو آپ بھی ان کے در پے نہ ہوں۔ آپ مسلسل تبلیغ جاری رکھیں لیکن اس کے ذریعے سے ان لوگوں کو تلاش کریں جو اس سے فائدہ اٹھانے کے متمنی ہوں۔ اور ان لوگوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیں جو آپ کی نگاہِ التفات کے مستحق ہوں۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو سورۃ عبس کی ابتدائی آیات میں کہی گئی ہے۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿۱۰﴾

(نصیحت قبول کرے گا وہ شخص جو ڈرتا ہے۔ ۱۰)

ہدایت وضلالت کے باب میں سنت الٰہی

یعنی تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں آپ کو تجربہ ہو جائے گا کہ جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے وہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اور جنہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری زندگی کا کوئی مقصد ہے یا نہیں۔ ہر چیز کا ایک انجام ہے تو کیا میری زندگی کا کوئی انجام نہیں۔ اگر واقعی آخرت ہوئی تو میں نے اس کیلئے کیا تیاری کر رکھی ہے۔ ایسے شخص سے کسی بہتری کی امید رکھنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے آپ بھی اس پر جان نہ ماریں۔ لیکن جس دل میں سنجیدگی ہو اور جس دماغ میں سلامتی ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی سے ڈرتا ہو اور جسے اپنے انجام کی فکر ہو، یہ وہ شخص ہے جو آپ کی نصیحت کا مستحق ہے اور آپ کی نصیحت اسے فائدہ دے سکتی ہے۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿۱۱﴾ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾

(اور گریز کرے گا وہ جو بد بخت ہوگا۔ ۱۱) وہ پڑے گا بڑی آگ میں۔ ۱۲) پھر نہ اس میں مرے گا، نہ جئے گا۔ ۱۳)

آپ کی تمام تر مساعی کے باوجود جو لوگ آپ کی تبلیغ و دعوت سے فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ ہر ممکن طریقے سے آپ کی دعوت کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کی دعوت میں کوئی کجی ہے یا آپ کے طریقِ دعوت میں کوئی کمزوری ہے، یا آپ کے اندر اخلاص و دردمندی کی کمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل انتہائی محروم القسمت لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنی قسمت پھوڑ لی ہے۔ یہ لوگ ہیں جو آپ کی دعوت قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا مقدر یہ ہے کہ یہ ایک بڑی آگ میں پڑیں گے یعنی انہیں جہنم کا سخت ترین عذاب ہوگا۔ اور ان بدنصیبوں کا حال یہ ہوگا کہ نہ انہیں موت آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائیں اور نہ یہ زندوں کی طرح زندہ رہیں گے کہ زندگی کے لطف سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص دل میں ایمان رکھتا ہے لیکن اعمال کی خرابی کے باعث جہنم میں ڈالا گیا۔ وہ اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتنے کے بعد موت کا شکار ہو جائے گا۔ اور پھر شفاعت سے اس کی لاش کو باہر نکال کر جنت کی نہروں میں کسی نہر کے کنارے ڈال دیا جائے گا اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ تم اس لاش پر پانی ڈالو، تو وہ پانی پڑنے سے اس طرح اگنا شروع ہوگی جیسے برسات کے موسم میں دانے اگتے ہیں۔ لیکن جو لوگ دین دشمنی اور ایمان سے محرومی کے باعث جہنم میں جائیں گے وہ سخت ترین عذاب کے باعث موت کی تمنا کریں گے، لیکن موت نہیں آئے گی۔ ان کی کھالیں جل کر جھڑیں گی تو نئی کھالیں پہنا دی جائیں گی تا کہ وہ نئے عذاب کا مزہ چکھیں۔ بظاہر یہ لوگ زندہ ہوں گے لیکن حقیقی زندگی سے محروم ہوں گے۔

Marfat.com

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾

(کامیاب ہوا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ ۱۴) اور اپنے رب کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی۔ ۱۵)

فلاح کے مستحق کون ہیں اور اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

تَزَكّٰى ...... زکوٰۃ سے مشتق ہے۔ اس کے اصل معنی پاک کردینے کے ہیں۔ مال کی زکوٰۃ کو بھی اس لئے زکوٰۃ کہتے ہیں کہ وہ باقی مال کو انسان کیلئے پاک کردیتی ہے۔ یہاں لفظ تَزَكّٰى کا مفہوم عام ہے جس میں ایمانی اور اخلاقی تزکیہ اور طہارت بھی داخل ہے اور مال کی زکوٰۃ بھی۔ اور سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی تبلیغ و دعوت اور تذکیر سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو کفرو شرک کی آلودگی سے پاک کرلیا۔ اور ہر اس گندگی سے بچے جس کا تعلق عقیدے سے تھا یا عمل سے۔ اور آنحضرت ﷺ کی تعلیم و تربیت نے اس سے بچنے کی ترغیب دی تھی تو ایسے لوگ دنیا میں بھی فلاح سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی اپنے رب کی رحمت سے نوازے جائیں گے۔

اپنے آپ کو پاک وصاف کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایسا شخص اپنے رب کا نام لیتا اور اس کو یاد کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام لینا تزکیہ کیلئے اس لئے ضروری ہے کہ تمام علم کا سرچشمہ درحقیقت اسمائے الٰہی ہیں۔ ان ہی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے رب کی صفات کیا ہیں۔ پھر انہیں سے عقائد کا علم حاصل ہوتا ہے اور یہیں سے حقوق و فرائض کی روشنی ملتی ہے۔ اور مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ کا نام اور اس کی ذات و صفات کا یقین صفائیِ قلب کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ کیونکہ دل تمام تصورات، خیالات اور عقائد کا مرکز ہے۔ اور تمام اعمال اسی کے تابع ہیں۔ جیسا عقیدہ دل میں بیٹھ جاتا ہے ویسے اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر دل میں برے تصورات جگہ بنالیں تو دل نہ صرف گندا ہو جاتا ہے بلکہ برے اعمال کو پیدا بھی کرتا ہے۔ اسی لئے لادینی قوتوں اور شیطانی طاقتوں کا اصل حملہ ہمیشہ دل کے خیالات کی تبدیلی اور ان کو بگاڑ کے راستے پر ڈالنے کیلئے ہوتا ہے۔ جب ایک دفعہ فکر بگڑتی، ذوق میں تبدیلی آتی اور نہج پراگندہ ہوتی ہے تو ساری زندگی منتشر ہو کے رہ جاتی ہے اور شخصیت کا تاروپود بکھر جاتا ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کی بنیاد پر پروردگار نے فلاح و کامرانی کیلئے اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے اسماء کے ذکر کو اساس ٹھہرایا ہے۔ اور پھر اس کی علامت کے طور پر نماز کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ جب ایک شخص اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر اللہ تعالیٰ کی تحمید کرتا، اسی سے استعانت کرتا اور اسی سے صراطِ مستقیم کی دعا کرتا ہے تو وہ گویا اس بات کا عہد کرتا ہے کہ جس اللہ کی ذات پر وہ ایمان لایا ہے وہ اس کی اطاعت اور اس کی بندگی کیلئے عملاً تیار ہے اور نماز کے ذریعے اس کو ہمیشہ یاد کرنے کا اہتمام کررہا ہے۔ اور یہ پانچ وقتوں کی یاددہانی اسے اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی اطاعت و بندگی سے اس طرح وابستہ کردیتی ہے کہ تمام شیطانی وساوس اس کے سامنے دم توڑ جاتے ہیں۔ اس کا دل تمام شیطانی خیالات اور برے تصورات سے پاک ہو جاتا ہے اور وہ ہر آلودگی سے لاتعلق ہو کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ساتھ یکسو ہو جاتا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾

(مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ ۱۶) حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ ۱۷)

Marfat.com

مخالفین کی مخالفت کا اصل سبب

اس آیتِ کریمہ میں مخالفین کے بڑے بڑے لیڈروں کی مخالفت کا اصل سبب منکشف فرمایا گیا ہے۔ یعنی یہ لوگ جو قیامت پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں اور آنحضرت ﷺ کی دعوت ان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں تو اس کا سبب یہ نہیں کہ اس مخالفت کیلئے ان کے پاس کوئی معقول دلیل موجود ہے بلکہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی فکر پوری طرح حبِ دنیا میں ڈوب چکی ہے۔ وہ اس عقیدے کو قبول کر کے ناجائز دنیوی مفادات کو قربان کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ان کی زندگی کا ہدف راحت و آسائش اور دنیا کی لذتیں حاصل کرنا ہے۔ دنیا میں ترقی اور دولت دنیا کی فراوانی اور عہدہ و منصب میں بلندی اور زیادہ سے زیادہ خوشیوں کا حصول، یہ چیزیں ان کیلئے حاصلِ زندگی ہیں۔ جس شخص نے زیادہ سے زیادہ انہیں حاصل کر لیا اس نے کامیاب زندگی گزاری۔ اور جو انہیں حاصل کرنے میں ناکام رہا اس کی زندگی ناکامیوں کی نذر ہوگئی۔ اور یہ وہ شخص ہے جو اصل نقصان اور خسران کا شکار رہا۔ ان تصورات نے ان لوگوں کو آخرت سے دور رکھا ہے اور وہ کسی طرح بھی یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ یہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت میں یہاں کیے ہوئے ہر عمل کا جواب دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فریب نظر کا شکار تھے۔ آخرت کے مقابلے میں دنیا کسی اعتبار سے بھی قابلِ ذکر نہیں۔ چہ جائیکہ اسے آخرت پر ترجیح دی جائے۔ کیونکہ آخرت میں ملنے والی راحتیں اور لذتیں دنیا کی راحتوں اور لذتوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ اور دوسری یہ بات کہ دنیا فانی ہے یہاں کسی کو قرار نہیں۔ ہر شخص کم و بیش چند سال لے کر آتا ہے اور اسی میں اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے جبکہ آخرت فانی نہیں، باقی ہے۔ اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس کی نعمتیں پائیدار اور اس کی خوشیاں بھی نہ ختم ہونے والی ہیں۔ تو آخر اس میں کیا معقولیت ہے کہ ایک فانی اور ناپائیدار چیز کو باقی اور ابدی نعمت پر ترجیح دی جائے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾

(بیشک یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی ہے۔ ۱۸) (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔ ۱۹)

ایک ہی حقیقت کی سب کو تلقین کی گئی

یعنی آنحضرت ﷺ قریش اور دیگر مخالفین کو جن حقائق سے آگاہ فرما رہے ہیں وہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں۔ کیونکہ عام طور پر نئی باتیں جلدی قبول نہیں کی جاتیں، بلکہ یہ تو وہ حقائق ہیں جو ان صحیفوں میں بھی نازل کیے گئے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیے گئے اور آج بھی اسفارِ تورات میں موجود ہیں۔ یہ دوسرا مقام ہے جہاں قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے پہلے سورۃ نجم رکوع تین میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

(۸۸)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْغَاشِيَةِ ہے جو اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔

مقام نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔

زمانۂ نزول:۔ سورۃ کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نبوت کے ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ اس زمانہ میں آنحضرت ﷺ بالعموم توحید اور آخرت پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ اس سورۃ میں بھی ان ہی باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ سورۃ کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نزول کے وقت اہلِ مکہ کی جانب سے ابھی شدید ردِ عمل کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ مخالفت جاری تھی لیکن اس میں ابھی شدت پیدا نہ ہوئی تھی۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے وہ لوگ جو قیامت سے بے فکر ہو کر زندگی گزار رہے تھے قیامت کا اچانک ذکر کر کے انہیں چونکایا گیا ہے۔ اور قیامت کا ذکر سوال کے انداز میں کر کے انہیں پوری طرح متوجہ کیا گیا ہے۔ اور پھر اسے اَلْغَاشِيَةِ کا نام دے کر اس کی ہیبت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ پھر اس کے مابعد قیامت سے دوچار ہونے والے لوگوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک وہ جو جہنم میں جائیں گے اور انہیں ہونے والے عذاب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اور دوسرے وہ جو جنت میں جائیں گے اور انہیں عطا ہونے والی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

قیامت کے ذکر اور اس سے دوچار ہونے والے اچھے اور برے لوگوں کے تذکرے کے بعد اچانک مخالفین سے سوال کیا جاتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور آخرت کی باتوں سے گریز ہے لیکن کیا وہ اپنے سامنے کی چیزوں کو نہیں دیکھتے جن سے انہیں ہر وقت سابقہ پیش آتا ہے۔ کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے جن پر ان کی صحرائی زندگی کا بہت حد تک انحصار ہے کہ کیسے انہیں ان ہی خصوصیات کے مطابق پیدا کیا گیا ہے جیسی صحرائی سفر میں ان کی ضرورت تھی۔ پھر جب یہ گھر سے نکلتے ہیں تو انہیں آسمان سر پر نظر آتا ہے، پہاڑ سامنے اور زمین قدموں میں بچھی ہوئی۔ کبھی ان تین چیزوں پر ان لوگوں نے غور کیا ہے کہ یہ آسمان کی چھت کیسے تنی ہوئی ہے، پہاڑ کیسے استادہ ہیں اور زمین کس طرح بچھونے کی طرح بچھ گئی ہے۔ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مطلق صانع حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے۔ اور اگر انہیں تسلیم ہے کہ ایک خالق نے بڑی حکمت اور بڑی قدرت کے ساتھ ان چیزوں کو بنایا ہے اور پھر انہیں انسان کی خدمت میں لگا دیا ہے، کوئی دوسرا نہ ان کی تخلیق میں شامل ہے۔ نہ ان کی

Marfat.com

صفات وخصائص کے بنانے میں۔تو آخران کے پاس کیا معقول دلیل ہے جس کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کو قیامت لانے پر قادر نہیں سمجھتے۔اور نہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ انہیں دوبارہ پیدا کرسکتا ہے۔

آخر میں نبی کریم ﷺ کو تلقین کی گئی ہے کہ آپ ؐجس چیز سے لوگوں کو ڈرارہے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت ہے،اس کی نشانیاں بالکل واضح ہیں۔اگر کچھ لوگ اپنی ہٹ دھرمی کے باعث ماننے سے انکار کرتے ہیں تو آپؐ اس کی پرواہ نہ کریں۔آپ کا فرض صرف لوگوں تک حق کو پہنچا دینا ہے۔آپ ان پر جبار بنا کر تو مسلط نہیں کیے گئے کہ زبردستی انہیں منوا کر ہی چھوڑیں۔لوگوں کے کفر وایمان کے باب میں آپ مسؤل نہیں ہیں۔جو آپ کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کیجئے۔بالآخران کی واپسی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہونی ہے۔اس وقت وہ ان سے پورا پورا حساب لے گا اور نہ ماننے والوں کو سخت سزا دے گا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٢٦	سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ (٨٨)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ﴿١﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾ عَامِلَةٌ
نَّاصِبَةٌ ﴿٣﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿٥﴾ لَيْسَ
لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿٦﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿٧﴾
وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾
لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيْهَا سُرُرٌ
مَّرْفُوْعَةٌ ﴿١٣﴾ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿١٤﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّزَرَابِيُّ
مَبْثُوْثَةٌ ﴿١٦﴾ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ
كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ
كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ
بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ
الْاَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿٢٦﴾

Marfat.com

رکوع: ۱۔ (کیا تمہیں چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے۔ ۱) کچھ چہرے اس دن خوفزدہ ہوں گے۔ ۲) سخت مشقت میں نڈھال، تھکے ہارے ہوں گے۔ ۳) وہ دہکتی آگ میں پڑیں گے۔ ۴) اور کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پلایا جائے گا۔ ۵) ان کے کھانے کو صرف جھاڑ کانٹے ہوں گے۔ ۶) جو نہ موٹا کریں گے اور نہ بھوک ہی کو مٹائیں گے۔ ۷) کچھ چہرے اس دن شگفتہ ہوں گے۔ ۸) اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے۔ ۹) عالی مقام جنت میں ہوں گے۔ ۱۰) جس میں وہ کوئی بے ہودہ بات نہیں سنیں گے۔ ۱۱) اس میں چشمے رواں ہوں گے۔ ۱۲) اس کے اندر اونچی مسندیں ہوں گی۔ ۱۳) آبخورے قرینے سے رکھے ہوں گے۔ ۱۴) اور گاؤتکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی۔ ۱۵) اور نفیس فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔ ۱۶) کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنائے گئے۔ ۱۷) اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیسے اٹھایا گیا۔ ۱۸) اور پہاڑوں پر نظر نہیں ڈالتے کہ کیسے جمائے گئے۔ ۱۹) اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی۔ ۲۰) پس آپ نصیحت کیجئے، آپ بس نصیحت ہی کرنے والے ہیں۔ ۲۱) آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں۔ ۲۲) رہا وہ شخص جو منہ موڑے اور انکار کرے۔ ۲۳) تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ ۲۴) بیشک ہماری ہی طرف ہے ان کا پلٹنا۔ ۲۵) پھر ہمارے ہی ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔ ۲۶)

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱

(کیا تمہیں چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے۔ ۱)

قیامت اور احوالِ قیامت کی تصویر

یہاں ضمیر واحد سے خطاب آنحضرت ﷺ کو بھی ہو سکتا ہے اور ہر مخاطب کو بھی۔ آنحضرت ﷺ کو اگر خطاب مانا جائے تو تب بھی روئے سخن کفار ہی کی طرف ہے جو قیامت کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اور اگر ہر فرد کو اس کا مخاطب سمجھا جائے تو پھر براہِ راست منکرینِ قیامت سے خطاب ہے۔ مقصود دونوں صورتوں میں سوال کا جواب طلب کرنا نہیں بلکہ قیامت کی عظمت وشان کا اظہار اور اس کی ہیبت کو نمایاں کرنا ہے۔

غَاشِيَة کے معنی ڈھانک لینے والی اور چھا جانے والی کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ قیامت کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ غَاشِيَة کے لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت بپا ہوتے ہی ایک آفت کی طرح سارے جہان پر چھا جائے گی۔ اس میں نظامِ عالم کے درہم برہم ہو جانے اور پھر نئے نظام کے بپا ہونے، تمام انسانوں کے دوبارہ اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت سے جزاء وسزا پانے تک تمام مراحل مراد ہیں اس پوری مدت میں انسان اس کے خیال سے فارغ ہو کر کسی اور طرف متوجہ نہیں ہو سکے گا، بلکہ یہ بری طرح انسانی خیالات، تصورات اور گردوپیش کے ماحول پر چھائی ہوئی ہوگی۔

Marfat.com

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿٣﴾

(کچھ چہرے اس دن خوفزدہ ہوں گے۔ ۲) سخت مشقت میں نڈھال، تھکے ہارے ہوں گے۔ ۳)

قیامت کے منکرین کا حال

چہروں سے مراد چہروں والے ہیں۔ لیکن انہیں چہروں سے یاد فرما کر درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ان کے چہروں سے ان کے اندر کا خوف اور غم پوری طرح نمایاں ہوگا۔ ویسے بھی انسان کے جسم کی نمایاں ترین چیز اس کا چہرہ ہے۔ اس لئے چہرہ بول کر اس کی پوری شخصیت مراد لی جاتی ہے۔ دنیا میں یہ لوگ قیامت کا نام سننے کے روادار نہ تھے۔ اور آج قیامت آ جانے کے بعد ان کے چہروں پر وہ احساسات پڑھے جاسکتے ہیں جو ان پر گزر رہے ہیں۔

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿٥﴾

(وہ دہکتی آگ میں پڑیں گے۔ ۴) اور کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پلایا جائے گا۔ ۵)

اوپر جن لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کے چہرے بری طرح اداس اور اترے ہوئے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چہروں کے بگاڑ کا سبب یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں گزاری ہوئی زندگی کے احوال پر جب غور کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا انجام جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور پھر انہیں حشر میں پیش آنے والے معاملات سے بھی پوری طرح اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ تو اس خوف کی وجہ سے جو ان کی اندرونی کیفیت ہوگی اس کا عکس ان کے چہروں پر پڑ رہا ہوگا۔ چنانچہ ان بدنصیبوں کے ذکر کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دہکتی آگ میں پڑیں گے۔ یعنی ان کا احساس جو ان کا اپنے انجام کے بارے میں تھا وہ غلط نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے احساس کے عین مطابق دہکتی آگ میں پڑیں گے اور انتہائی کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پلایا جائے گا۔

اٰنِيَةٍ، عَيْنٍ کی صفت ہے۔ اس کا معنی ہے انتہائی کھولتا ہوا، جس کی گرمی اپنے آخری نقطہ پر پہنچی ہوئی ہو۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿٦﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿٧﴾

(ان کے کھانے کو صرف جھاڑ کانٹے ہوں گے۔ ۶) جو نہ موٹا کریں گے اور نہ بھوک ہی کو مٹائیں گے۔ ۷)

ضَرِيْعٍ، ایک خاردار زہریلی جھاڑی ہے جس کو کوئی جانور نہیں چھوتا۔

اہلِ جہنم کی غذا

ان بدنصیبوں کو پینے کو کھولتے ہوئے چشمے کا پانی ملے گا اور کھانے کو صرف جھاڑ کانٹے ملیں گے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قرآنِ کریم کے بیان میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سورۃ دخان میں فرمایا گیا ہے کہ ان شجرۃ الزقوم ○ طعام الاثیم ''بیشک زقوم کی جھاڑی گنہگاروں کی غذا ہوگی۔'' سورۃ الحاقہ میں فرمایا گیا ہے ولا طعام الا من غسلین لا یاکلہ الا الخاطئون ''اور ان کی غذا زخموں کا

Marfat.com

دھوون ہوگی جس کو صرف گنہگار ہی کھاسکیں گے۔" یہ تینوں آیتیں بظاہر ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں زقوم کھانے کو دیا جائے گا۔اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ غسلین ان کا کھانا ہوگا۔اور پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ضَرِيعٍ کو ان کی خوراک بتایا گیا ہے۔درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ جہنم کے مختلف درجات ہوں گے جن میں جرائم کے اعتبار سے مجرم رکھے جائیں گے۔اور مختلف قسم کی انہیں سزائیں دی جائیں گی۔ان کی غذائیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی۔کہیں زقوم کھانے کو دیا جائے گا اور کہیں غسلین اور کہیں خاردار جھاڑی۔یہ کہنے کو غذائیں ہوں گی لیکن حقیقت میں اہلِ جہنم کے سوا کوئی انہیں نگل نہیں سکتا۔غذا کے اصل فائدے دو ہی ہوتے ہیں کہ وہ توانائی دیتی ہے اور بھوک کی اذیت کو رفع کرتی ہے۔لیکن ان کی یہ غذائیں صرف چبانے اور نگلنے کی اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔نہ ان سے بھوک رفع ہوتی ہے اور نہ جسم میں توانائی آتی ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿۸﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿۹﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۱۰﴾

(کچھ چہرے اس دن شگفتہ ہوں گے۔ ۸) اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے۔ ۹) عالی مقام جنت میں ہوں گے۔ ۱۰)

قیامت کے دن اہلِ ایمان کا حال

قیامت کے دن دوسرا گروہ اہلِ ایمان کا ہوگا۔اب ان کا حال بیان کیا جارہا ہے۔ان کے چہرے تروتازہ اور شگفتہ ہوں گے۔وہ جب یہ دیکھیں گے کہ انہوں نے دنیا میں آخرت کا یقین پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی میں جس طرح زندگی گزاری اور انہوں نے دنیا میں آخرت کیلئے جو کمائی کی، آج اس کا حاصل ان کے سامنے ہے تو وہ اپنے سعی و عمل کے بہترین نتائج کو دیکھ کر نہایت خوش اور مطمئن ہوں گے۔اور ان کے چہرے خوشی کی وجہ سے کھل اٹھیں گے۔اللہ تعالیٰ ایسے خوش نصیبوں کیلئے جنت میں جو مستقر ٹھہرائے گا وہ نہایت بلند درجہ ہوگا۔ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا مستقر ایک بلند باغ میں ہوگا۔یعنی وہ باغ بلندی پر ہوگا اور اس کے حاشیے پر کھجوروں کے درخت ہوں گے تاکہ وہ دیکھنے کو خوبصورت بھی لگے اور بادِ سموم اور سیلاب وغیرہ سے محفوظ بھی رکھے۔اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ان کو ایسا بلند مرتبہ دیا جائے گا جو عام اہلِ جنت میں بھی نہایت نمایاں ہوگا۔

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿۱۱﴾

(جس میں وہ کوئی بے ہودہ بات نہیں سنیں گے۔ ۱۱)

اہلِ جنت کی مجلس نہایت شائستہ ہوگی

اہلِ جہنم کے بارے میں قرآنِ کریم میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے کہ ہم ان کی وجہ سے آج جہنم میں ہیں۔پیچھے چلنے والے اپنے رہنماؤں کے بارے میں دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے اور ان کے لیڈر ان کی ہر بات سے انکار کریں گے۔اور انہیں خود اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔لیکن اہلِ جنت کا حال بالکل برعکس ہوگا کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ایک دوسرے کا خیر مقدم

Marfat.com

تحیت وسلام سے کریں گے۔ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے،نہایت گرم جوشی سے ایک دوسرے ساتھ اٹھیں بیٹھیں گے۔اوران کی ہر مجلس محبت واخلاص کا نمونہ ہوگی۔اور چونکہ وہ نہایت مہذب اور ہر طرح کی اخلاقی کمزوری سے مبرا اور ہر طرح کے جسمانی عارضہ سے پاک ہوں گے۔اس لئے وہاں کسی لغو اور بے ہودہ بات کا گزر نہیں ہوگا۔معلوم ہوتا ہے صالح ذوق کیلئے جہاں اچھی نعمتوں کی ضرورت ہے وہاں اچھا ماحول اور اچھے ہمنشین اس سے بھی بڑھ کر ضروری ہیں۔

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ﴿۱۴﴾
وَّنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ﴿۱۵﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴿۱۶﴾

(اس میں چشمے رواں ہوں گے۔ ۱۲) اس کے اندر اونچی مسندیں ہوں گی۔ ۱۳) آبخورے قرینے سے رکھے ہوں گے۔ ۱۴) اور گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی۔ ۱۵) اور نفیس فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔ ۱۶)

اہلِ جنت کی آرائش وزیبائش کی تصویر

اہلِ جنت جس طرح کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوں گے اور جیسی لطف ولذت سے بھرپور نعمتوں سے محظوظ ہوں گے ان میں سے چند ایک کو بیان فرمایا گیا ہے۔سب سے پہلی جو چیز بیان فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایک رواں چشمہ ہوگا،یعنی ایسا چشمہ جو ہر وقت ابلے گا اور بہے گا۔اور اگر اسے اسمِ جنس مانا جائے تو پھر مراد یہ ہے کہ جنت کے سرسبز لانوں میں یا اس کے اندر سے گزرتی ہوئی نہروں میں جابجا چشمے ابلتے ہوں گے۔ممکن ہے اس سے باغ کی سیرابی کا بھی کام لیا جاتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صرف منظر کی خوبصورتی میں اضافے کیلئے جابجا پھیلا دیئے گئے ہوں۔ہم اس زمین پر بھی خوبصورت باغوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کی گزرگاہوں میں چشمے ابلتے اچھلتے دکھائی دیتے ہیں اور یا ان میں ایسے حوض بنائے گئے ہیں جن کے کناروں پر چشمے ابل رہے ہیں اور ان کی وجہ سے منظر کی خوبصورتی میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا ہے۔سورۃ دہر میں ایک سے زیادہ چشموں کا ذکر ہے۔پھر ان سے نکلتی ہوئی متعدد شاخوں کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ممکن ہے کہ اسی کو سمیٹ کر یہاں واحد کے لفظ سے ان کا ذکر کیا جا رہا ہو۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے ہر چشمہ اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہو۔اس میں سے ابلتے ہوئے پانی کی خصوصیات،اس کا مزہ،اس کی شیرینی ہر ایک کی دوسرے سے مختلف ہو۔اور شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کیلئے پروردگار نے کہیں اسے واحد کے طور پر ذکر فرمایا اور کہیں جمع کے طور پر۔

اس کے بعد اہلِ جنت کے مساکن اور ان کی رہائش گاہوں میں جو سامانِ آرائش وزیبائش رکھا گیا ہے اس کی کچھ تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔اور یہ تفصیل صرف اسی سورۃ میں نہیں اور بھی متعدد سورتوں میں مختلف الفاظ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔کہیں اجمال سے کام لیا گیا ہے اور کہیں تفصیل سے۔بعض مقامات پر ہم ان عطا کردہ نعمتوں میں کچھ تفاوت بھی پاتے ہیں،لیکن یہ تضاد کی قسم کی چیز نہیں بلکہ اس کا تعلق اہلِ جنت کے درجات ومراتب سے ہے۔کیونکہ ایمان وعمل کے اعتبار سے اہلِ جنت برابر نہیں ہوں گے۔اور اسی لحاظ سے ان کے جنت میں مدارج بھی ہوں گے۔تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کے جنتی کو وہی کچھ دیا جائے جو عام جنتی کو دیا جائے گا۔البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ ہر جنتی کو جو نعمتیں ملیں گی دنیا میں اس کا تصور بھی محال ہے۔لیکن بایں ہمہ اہلِ جنت میں مرتبے اور بخشش کے لحاظ سے یقیناً مختلف

Marfat.com

مدارج کا فرق ہوگا۔ ایک اور بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے وہ یہ کہ جنت اور اس کی نعمتیں عالمِ غیب کی حقیقتیں ہیں جن کا صحیح ادراک اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اس لئے بالعموم انہیں تمثیل کے انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اور ان کیلئے وہی الفاظ مستعار لئے گئے ہیں جو انہیں قریب الفہم بنا سکتے ہیں۔ حقیقی تعبیر ہمارے الفاظ میں ممکن نہیں۔

اہلِ جنت کے سامانِ آرائش وزیبائش میں سب سے پہلے جس چیز کو بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ جنت عام لوگوں کی طرح نہیں بلکہ بلند پایہ لوگوں کی طرح بڑی بلند مسندوں پر فائز ہوں گے۔ اسی کا ترجمہ تخت بھی کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ بادشاہ تخت پر فروکش ہوتے ہیں اور یہ ان کی عظمت کی علامت ہے۔ اس سے مقصود صرف اہلِ جنت کے عزوشرف کو نمایاں کرنا ہے۔ ورنہ جہاں تک آرائش وزیبائش یا نشست گاہوں کی حیثیت کا تعلق ہے اس کی تشکیل اور اس کی آراستگی ہر جنتی کے اپنے ذوق اور چاہت کے مطابق ہوگی۔

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ...... اکواب، کوب کی جمع ہے۔ آپ اس کا ترجمہ پیالے سے بھی کر سکتے ہیں، آبخورے سے بھی اور جام سے بھی۔ اور مَوْضُوْعَةٌ کا معنی ہے قرینے سے رکھے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کے مشروبات مختلف قسموں کے ہوں گے اور ہر مشروب کے ساتھ مناسب جام رکھا جائے گا۔ اس کی ساخت مشروب کے مطابق ہوگی اور وہ مشروب کے اتنا قریب ہوگا کہ کسی جنتی کو اسے حاصل کرنے میں اکتاہٹ نہیں ہوگی۔ اور پھر ان کی ترتیب میں ایسے قرینے سے کام لیا گیا ہوگا جس سے خوبصورتی میں اور اضافہ ہوجائے گا۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس سے آدابِ معاشرت کے ایک اہم باب کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ پانی پینے کے برتن پانی کے قریب مقررہ جگہ پر رہنے چاہئیں۔ وہاں سے اِدھر اُدھر ہوجائیں اور پانی پینے کے وقت تلاش کرنا پڑے یہ تکلیف کی چیز ہے۔ اس لئے ہر شخص کو اس کا اہتمام چاہئے کہ ایسی استعمالی چیزیں جو سب گھر والوں کے کام میں آتی ہیں اور ان کی جگہ مقرر رہتی ہے۔ استعمال کے بعد انہیں مقرر جگہ پر رکھنا چاہیے تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے۔

وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ...... نمارق، نمرق کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق قالینوں اور غالیچوں پر بھی ہوتا ہے اور گاؤتکیوں پر بھی۔ اور مَصْفُوْفَةٌ کا مطلب یہ ہے کہ ایک ترتیب اور قرینے کے ساتھ قطاروں میں گاؤ تکئے لگے ہوئے ہوں گے۔ بیٹھنے والا جہاں بھی بیٹھے وہ اس کیلئے آسائش کا باعث ہوں گے۔ اہلِ عرب میں چونکہ فرشی نشست ہوتی تھی اس لئے زمین پر قالین اور پشت پر گاؤ تکئے لگائے جاتے تھے۔ انہیں کے ذوق کے مطابق جنت کی نعمتوں کو تعبیر دی گئی ہے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تہذیب اور معاشرت بدلتی رہتی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور طریقے بھی بدل جاتے ہیں۔ آج چونکہ صوفوں کا دور ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان پر گدیاں اور تکئے لگے ہوئے ہوں گے۔

وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ...... زرابی، زربیۃ کی جمع ہے۔ یہ نہالچوں کو بھی کہتے ہیں اور تکیوں کو بھی۔ اور بعض اہلِ لغت اس سے مخمل کے نہالچے مراد لیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اہلِ جنت کے بیٹھنے اور لیٹنے کیلئے نہایت قیمتی فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾
وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾

(کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنائے گئے۔ ۱۷) اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیسے اٹھایا گیا۔ ۱۸) اور پہاڑوں پر نظر نہیں ڈالتے کہ کیسے جمائے گئے۔ ۱۹) اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی۔ ۲۰)

Marfat.com

قیامت پر سامنے کی چیزوں سے استدلال

قیامت کے ذکر کے ضمن میں پہلے اہلِ جہنم کا تذکرہ کیا گیا اور پھر اہلِ جنت کا۔ اور دونوں جس طرح جزاء و سزا سے گزریں گے اس کی منظر کشی کی گئی۔ ان باتوں کا تذکرہ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے سامنے کیا گیا جو قیامت کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ اور ان کے انکار کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ وقوعِ قیامت کو مستبعد از عقل سمجھتے تھے اور ہر بات کا جواب صرف یہ دیتے تھے کہ تم جو قیامت کا تصور پیش کرتے ہو اور آخرت کے بارے میں جو کچھ کہتے ہو یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کسی بات کو بھی عقل تسلیم نہیں کرتی۔ ایسے لوگوں کو آفاق کی بعض نہایت نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ انہیں اگر قیامت کی ہر بات خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے اور وہ بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی باتوں کا وقوع پذیر ہونا ممکن نہیں، تو سوال یہ ہے کہ جب وہ اپنے گرد و پیش میں آفاق کی نشانیاں دیکھتے ہیں اگر وہ ان کے سامنے موجود نہ ہوتیں اور انہیں کہا جاتا کہ ایسا ہوا ہے یا ہوگا تو یہ کبھی اسے تسلیم نہ کرتے۔ لیکن اب جبکہ وہ وجود میں آچکی ہیں تو انہیں ان کے ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر جو چیزیں ان کے تجربے اور مشاہدے میں ابھی نہیں آئی ہیں ان کے بارے میں وہ بے تکلف فیصلہ کر دیتے ہیں کہ ان کا ہونا ممکن نہیں ہے۔

چنانچہ ایسی ہی نشانیوں میں سے چار نشانیوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن میں سے سب سے پہلے اونٹ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کے بعد آسمان کی طرف، پھر پہاڑوں کی طرف اور آخر میں زمین کی طرف۔ سبب ان کی طرف توجہ دلانے کا یہ ہے کہ یہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے تقریباً عرب میں رہنے والے ہر شخص کا سابقہ پڑتا ہے۔ مثلاً اس ماحول میں رہنے والا کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کے پاس اپنا اونٹ نہ ہو۔ جب وہ اونٹ پر سوار ہو کر نکلتا تھا تو سر پر اسے آسمان کی تنی ہوئی چھت دکھائی دیتی تھی۔ اور اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑ نظر آتے تھے اور نیچے زمین بچھونے کی طرح بچھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ انہیں باتوں کی طرف جو ہر شخص کا روز کا معمول تھیں توجہ دلاتے ہوئے سب سے پہلے اونٹ کا ذکر فرمایا۔ کہ کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کس طرح بنایا گیا اور کیسا بنایا گیا ہے اور کن صفات و خصوصیات کے ساتھ اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اونٹ ایک عظیم الجثہ جانور ہے اور طویل قد و قامت رکھتا ہے اور نہایت طاقتور ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی ضروریات کو اس طرح کا بنایا ہے کہ غریب سے غریب آدمی بھی اس کو رکھنے میں دشواری محسوس نہیں کرتا۔ مالک اگر اسے چارہ خرید کر نہیں ڈال سکتا تو وہ اسے چھوڑ دے وہ اپنا پیٹ خود بھر لے گا۔ اونچے درختوں کے پتے توڑنے کی زحمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں، یہ خود درختوں کی شاخیں کھا کر گزارا کر لیتا ہے۔ اپنی تمام جسامت اور طاقت کے باوجود اس کی ناک میں نکیل ڈال کر اسے جہاں چاہو لے جاؤ، وہ بے چون و چرا اپنے مالک کی اطاعت کرتا ہے۔ اتنا وفادار ساتھی ہے کہ حضر میں، سفر میں اور صحرا میں ہر جگہ اپنے مالک کا ساتھ دیتا اور سفینے کی طرح اس کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ عرب میں پانی بہت کم ہوتا ہے۔ قدرت نے اس کے پیٹ میں ایک ریزروٹینکی ایسی لگادی ہے کہ سات آٹھ روز کا پانی پی کر یہ اس ٹینکی میں محفوظ کر لیتا ہے اور تدریجی رفتار سے وہ اس کی پانی کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اتنے اونچے جانور پر سوار ہونے کیلئے سیڑھی نہیں لگانا پڑتی بلکہ قدرت نے اس کے پاؤں کو تین تہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یعنی ہر پاؤں میں دو گھٹنے بنا دیئے ہیں کہ جب وہ تہ کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اس پر چڑھنا اترنا آسان ہو جاتا ہے۔ کسی بڑی سے بڑی مشقت سے بھی انکار نہیں کرتا۔ اس کا گوشت پوست دودھ ہر چیز مالک کے کام آتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا بول و براز بھی رائیگاں جانے والی چیز نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اتنے گوناگوں فوائد اور مصالح کے ساتھ یہ جانور آپ سے آپ پیدا ہو گیا اور انسان نے اس کو اتفاق سے پکڑ کر اپنے لئے سازگار بنالیا ہے۔ یا رب کریم نے اپنی قدرت یا حکمت سے اس کو پیدا کیا اور اس کو انسان کی خدمت میں لگا

Marfat.com

دیا۔ ظاہر ہے کہ عقل اس دوسری بات ہی کی گواہی دیتی ہے۔ اور اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا انسان پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بن کر زندگی گزارے جس نے اس کیلئے بغیر کسی استحقاق کے زندگی کی یہ آسائشیں فراہم کی ہیں۔ ورنہ ایک دن اپنے رب کے آگے جوابدہی اور اپنے کفرانِ نعمت کی سزا بھگتنے کیلئے تیار رہے۔

اس کے بعد آسمان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ دیکھو اسے کیسا بلند کیا گیا اور کیسے اٹھایا گیا ہے۔ اس کی بلندی اور اس کی وسعت کا کوئی اور چھور نہیں۔ لیکن اتنی بڑی چھت کیلئے کوئی ستون نظر نہیں آتا۔ پھر اس سے بھی بڑی عجیب بات یہ ہے کہ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ کب سے قائم ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود کوئی ماہر سے ماہر انجینئر بھی اس میں کسی معمولی سے معمولی رخنہ یا خلاء کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ مزید حیران کن بات یہ ہے کہ زمین سے انتہائی دور ہونے کے باوجود اس کے سورج، چاند، ستارے اور سیارے زمین کی رونق اور اس کیلئے روشنی، حرارت اور زندگی کا ذریعہ ہیں۔ اسی سے بارش نازل ہوتی ہے، اسی کے سورج سے اہلِ زمین کے چولہے جلتے ہیں، اسی سے اناج میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور اہلِ زمین کی روزی کا بہت حد تک اس پر انحصار ہے۔

انسان ذرا غور کرے کہ جس خالق کی قدرت وحکمت کا یہ حال ہے کہ وہ آسمان جیسی حیرت انگیز مخلوق پیدا کر سکتا ہے تو کیا اس کیلئے انسانوں کو از سرِ نو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے بعض جگہ براہِ راست انسان سے سوال کیا کہ ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ''کیا تمہیں پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا۔''

اس کے بعد پہاڑوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ دیکھو انہیں کیسے گاڑ دیا گیا ہے۔ یہ کس طرح رنگ برنگ کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لئے ہوئے جمے کھڑے ہیں۔ وہ کس طرح زمین کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں، کس طرح ہواؤں اور بادلوں کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔ وہ خود پتھر کے ہیں لیکن قدرت نے ان کے اندر سے مخلوق کی سیرابی کیلئے شیریں پانی کے سوتے جاری کر رکھے ہیں۔ وہ اپنے اندر قیمتی خزانے لئے ہوئے امین کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ان میں ایسے پہاڑ بھی ہیں جو ناقابلِ عبور ہیں لیکن قدرت نے ان کے اندر درے اور راستے نکال دیئے ہیں۔

اس کے بعد زمین کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ زمین کیسے بچھ گئی ہے جس پر انسان رہتا اور بستا ہے، جس کی پیداوار سے اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کنوؤں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔ اس کی مسطح سطح پر انسانوں کی آبادیاں ہیں، میدانوں میں ان کے کھیت اور باغ وچمن ہیں۔ ان کے چوپایوں اور گلوں کیلئے پیٹ بھرنے کے غیر محدود وسائل موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مطلق حاذق حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے۔ یہ تمام نشانیاں انسان کو یہ بتانے کیلئے کافی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پناہ ہے۔ اس کی حکمت نے ہر چیز کو کسی نہ کسی مقصد کا پابند کیا ہے۔ اس کی سب سے اشرف مخلوق انسان ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کو بے شمار صلاحیتیں دے کر عقل اور شعور سے نواز کر اور اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعے نیکی اور بدی کے دونوں راستوں کو کھول کر شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ دے۔ اور کبھی اس کو اپنے حضور میں حاضر کر کے اس کے اعمال کی جواب طلبی نہ کرے۔ نہ اس کی نیکی کی جزاء دے اور نہ اس کی نافرمانی پر سزا دے۔

فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾

(پس آپ نصیحت کیجئے، آپ بس نصیحت ہی کرنے والے ہیں۔ ۲۱) آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں۔ ۲۲)

Marfat.com

دلائل سے اثباتِ مدعا کے بعد آنحضرت ﷺ کو تسلی

بعض دلائلِ آفاق سے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ربوبیت وقدرت اور اس کی حکمت وعظمت سے استدلال کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ ان دلائل کے بعد اصل موضوع کی وضاحت میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ اس پر بھی کچھ ہٹ دھرم اگر ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں اور وہ آپ کی تمام تبلیغی کاوشوں کا نہ صرف انکار کررہے بلکہ مذاق اڑا رہے ہیں، تو آپ اس کی بالکل پرواہ نہ کریں۔ آپ جو تذکیر ودعوت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، بس اسے جاری رکھئے۔ کیونکہ آپ کی اصل حیثیت مذکر کی ہے، مصیطر کی نہیں۔ آپ کا کام لوگوں کو نصیحت کرنا ہے اور نصیحت قبول نہ کرنے والوں کو انذار کرنا ہے اور یہ کام بفضلہٖ تعالیٰ آپ نہایت حُسن وخوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس پر بھی اگر لوگ ماننے کو تیار نہیں تو آپ انہیں زبردستی ایمان دینے کے مکلّف نہیں ہیں۔ نہایت نرمی بردباری اور خیرخواہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت اور برے انجام سے انذار صرف آپ کا فریضہ ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت ہے وہ آپ کی نصیحت کو ضرور قبول کریں گے۔ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ''جو اللہ سے ڈرتا ہے وہی نصیحت قبول کرتا ہے۔'' اور جن کے دلوں میں مسلسل انکار کی وجہ سے سختی آچکی ہے وہ نہ نشانیوں اور دلائل سے فائدہ اٹھائیں گے اور نہ آپ کی ہمدردی وخیرخواہی ان کے دلوں میں نرمی پیدا کرسکے گی۔ اس لئے آپ ان کے ردوقبول سے بے نیاز ہوکر تذکیر ودعوت کے کام کو جاری رکھیں اور اپنے دل میں کبھی اس فکر کو پیدا نہ ہونے دیں کہ ان ایمان نہ لانے والوں کے بارے میں آپ سے پوچھا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایمان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا کہ ایمان نہ لانے والوں کی پرسش آپ سے ہو۔

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿٢٤﴾

(رہا وہ شخص جو منہ موڑے اور انکار کرے۔ ٢٣) تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ ٢٤)

آپ کی تمام تبلیغی مساعی کے باوجود جو شخص حق سے منہ پھیرے گا اور حق کو قبول کرنے سے انکار کرے گا تو اولاً تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ دنیا ہی میں عذاب کا شکار ہوجائے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کی وجہ سے وہ دنیا میں عذاب سے بچا رہا تو آخرت کا عذاب جو عذابِ جہنم ہے وہ تو اس کیلئے لازمی ہوگا۔ اس لئے کہ دنیا میں تو بعض دفعہ پروردگار اپنی حکمت کی وجہ سے ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ لیکن آخرت چونکہ دارالجزاء اور دارالعدل ہے۔ وہاں نیک عمل کی جزاء بھی ضرور ہوگی اور برے عمل پر سزا بھی ضرور ہوگی۔ ایمان کا صلہ ملے گا، اور کفر پر سخت عذاب ہوگا۔

اَلْعَذَابَ الْاَكْبَرَ سے مراد جہنم کا عذاب ہے۔ اسے عذابِ اکبر اس لئے کہا گیا ہے کہ دنیا کا کوئی عذاب بھی اپنی شدت میں جہنم کے عذاب کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور نہ کوئی عذاب ہمیشگی اور پائیداری میں اس کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اس لئے سابق سورۃ میں اس کی شدت کی طرف اضافہ کرتے ہوئے اسے النَّارُ الْكُبْرٰى سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر عذابِ اکبر ہی کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ، وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ، اس میں دنیا کے عذابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آخرت کے عذاب کو اکبر فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ دنیا میں جس قوم پر عذاب آیا ہے اس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔ بعض دفعہ ان کی دھرتی الٹ دی گئی ہے اور وہ تاریخ میں عبرت بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن ان عذابوں کے مقابلے میں آخرت کے عذاب کو عذابِ اکبر قرار دینا ایسا تصور پیدا کرتا ہے جس سے پتہ پانی ہونے لگتا ہے۔

Marfat.com

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿٢٦﴾

(بیشک ہماری ہی طرف ہے ان کا پلٹنا۔ ۲۵) پھر ہمارے ہی ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔ ۲۶)

ان دونوں آیتوں میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ پہلی آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آج جو لوگ جہنم کے ذکر سے بھی بدمزہ ہوتے ہیں اور انہیں کبھی بھول کر بھی احساس نہیں ہوتا کہ کبھی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری دینے کا وقت بھی آئے گا۔ اور ان کی زندگی کے رویئے کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے یہاں ہمیشہ رہنے کا یقین ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں، موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے یہ بچ نہیں سکتے۔ اور مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کی طرف واپسی ہے۔ اس لئے یہ آج کیسی ہی سرکشی کا رویہ اختیار کریں۔ انہیں بہر حال موت کے شکنجے میں پھنسنا ہے اور پھر ان کی روح اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق وہیں جائے گی جہاں اس کا جانا مقدر کر دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی ہے کہ جب ہم سب لوگوں کو دوبارہ اٹھائیں گے تو سب سے حساب لیں گے۔ ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزاء و سزا دیں گے۔ اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال اور ایک بے مقصد کارخانہ ہے۔ اور محض اس کے خالق نے بچوں کے گھروندے بنانے کی طرح محض تفریح کی خاطر اسے پیدا کیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی ہو، یا اس سے کسی عبث کام کا صدور ہو۔ اس لئے پروردگار نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے کہ میں اپنے بندوں میں سے ہر ایک کا ایک نہ ایک دن حساب لوں گا۔ اور یہی وہ حساب کا دن ہے جسے یوم الدین اور یوم آخر کہا گیا ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

(۸۹)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الفَجرِ ہے جو اس سورۃ کا پہلا ہی لفظ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ اس سورۃ میں عاد وثمود اور فرعون کے انجام سے اہلِ مکہ کو خبردار کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول جن قوموں کی طرف مبعوث ہوتا ہے جب وہ اس رسول کی تکذیب پر اڑ جاتی ہیں اور رسول کے قتل یا اسے ملک سے نکال دینے کی منصوبہ بندی کرنے لگتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسی قوموں کو مٹا دیتا ہے۔ اور اس سلسلے میں عاد وثمود اور فرعون کی مثالیں دی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ عاد وثمود اور فرعون نے اپنی طرف مبعوث ہونے والے رسولوں کے ساتھ کیا تھا وہی کچھ اہلِ مکہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ گویا یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس سورۃ کے نزول کے وقت مسلمانوں پر اذیت رسانی کا عمل شروع ہو گیا تھا اور ظلم کی چکی چلنا شروع ہو گئی تھی۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سورۃ کے آغاز میں آفاق کی بعض نشانیوں کے ذکر سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کی باگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے ہر چیز کو کچھ فرائض کی ادائیگی کا پابند کر رکھا ہے۔ کسی چیز کی مجال نہیں کہ وہ اس کے مفوضہ امور کی ادائیگی سے سرتابی کر سکے۔ ایک ایسا مضبوط نظام تشکیل دے دیا گیا ہے جس میں ہر چیز اپنے اپنے وقت کے مطابق اپنی ذمہ داری ادا کرتی نظر آتی ہے۔ اور پھر سوال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے اس حکیمانہ نظام کو دیکھنے کے بعد کیا اس امر کی شہادت دینے کیلئے کسی اور چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ نظام جس پروردگار نے قائم کیا ہے اس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ آخرت برپا کرے اور اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی بازپرس کرے۔

اس کے بعد تاریخ کی بعض عظیم قوموں کے حوالے سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جب بھی کوئی قوم حد سے گزر جاتی اور زمین میں فساد مچاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا اس پر برستا ہے۔ جب وہ قوم اپنے اختیارات سے غلط فائدہ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی حدود کو لانگنے کی کوشش کرتی ہے تو پروردگار اسے ایک خاص حد تک ڈھیل دیتا ہے، اس کے بعد لازماً اس کی پکڑ ہوتی ہے۔ اور وہ پکڑ ایسی شدید ہوتی ہے کہ اس کی تمام عظمت وشوکت دھری رہ جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کائنات کا نظام کچھ اندھی بہری طاقتیں نہیں چلا رہیں، نہ یہ دنیا کسی

Marfat.com

چوپٹ راجہ کی اندھیر نگری ہے، بلکہ ایک فرمانروائے حکیم ودانا اس پر حکمرانی کر رہا ہے۔اس کی حکمت وعدل کا یہ تقاضا ہے کہ قوموں کو حدِ اعتدال سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دے۔بار بار تاریخ میں اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

انسان کی بڑائی کے سارے دعوؤں کے باوجود اس کی پستی اور گمراہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے عام رویئے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے کہ اس کا حال یہ ہے کہ اس کو کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اس کو اپنا حق سمجھتا ہے اور پھر فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت مقبول آدمی ہے۔اسی وجہ سے اس کی عزت افزائی کی گئی ہے۔اور اگر وہ نعمت سے محروم کر دیا جاتا ہے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ناقدری کی ہے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نعمت کا ملنا یا رزق میں تنگی کا پیش آنا یہ دونوں ہی حالتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہیں۔نعمت کی صورت میں اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ کیا انسان نعمت پا کر شکر ادا کرتا اور بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے یا اکڑنے لگتا اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے لگتا ہے اور رزق کی تنگی کی صورت میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے رب کی تقسیم پر قناعت اور صبر کا پیکر بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہتا ہے یا اللہ تعالیٰ سے مایوس، شاکی اور پست ہمت بن جاتا ہے۔اور کبھی بھی اپنے اعمال کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کرتا۔

اسی سلسلے میں لوگوں کے اس طرزِ عمل کو بھی بیان کیا گیا ہے جس میں یتیم بچہ باپ کے مرتے ہی ان کے ہاں کسمپرسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔غریبوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، جس کا بس چلتا ہے مردے کی ساری میراث سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور کمزور حقداروں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔اور مال کی حرص لوگوں کو ایک ایسی نہ بجھنے والی پیاس کی طرح لگی ہوئی ہے کہ خواہ کتنا ہی مال مل جائے ان کا دل سیر نہیں ہوتا۔اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ دنیا کی زندگی میں جن انسانوں نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے کیا یہ انصاف کا تقاضا نہیں کہ ان کا محاسبہ ہو۔

آخر میں حتمی انداز میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ محاسبہ ضرور ہوگا اور وہ اس روز ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی۔آج جو لوگ جزاء وسزا کا انکار کرتے ہیں اس وقت ان لوگوں کو یہ بات سمجھ آ جائے گی کہ جزاء وسزا کیوں ضروری ہے۔مگر اس وقت اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔کیونکہ یہ دن جزاء کا دن ہوگا اور عمل کا زمانہ ختم ہو چکا ہوگا۔اس وقت قیامت کا منکر انتہائی تأسف کے ساتھ ہاتھ ملتا ہوا یہ کہے گا کہ کاش میں نے دنیا میں اس دن کیلئے کوئی سامان کیا ہوتا۔مگر یہ ندامت اسے اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچا نہیں سکے گی۔البتہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو قبول کیا، ایمان لائے اور اس کا حق ادا کیا اور پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ ایمان کے تقاضوں کو ادا کیا تو اس دن اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اجر سے راضی ہوں گے۔انہیں نہایت پیار سے دعوت دی جائے گی کہ وہ اپنے رب کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہو جائیں اور جنت میں داخل ہو جائیں۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٣٠	سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ (٨٩)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۙ﴿١﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ﴿٢﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ﴿٣﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ﴿٤﴾
هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ؕ﴿٥﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۪ۙ﴿٦﴾
اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۪ۙ﴿٧﴾ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۪ۙ﴿٨﴾ وَثَمُوْدَ
الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۪ۙ﴿٩﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۪ۙ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ
طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۪ۙ﴿١١﴾ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۪ۙ﴿١٢﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ
سَوْطَ عَذَابٍ ۚۙ﴿١٣﴾ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ؕ﴿١٤﴾ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا
ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ؕ﴿١٥﴾ وَاَمَّاۤ
اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ۚ﴿١٦﴾ كَلَّا
بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ﴿١٧﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ﴿١٨﴾
وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ﴿١٩﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ؕ﴿٢٠﴾ كَلَّاۤ
اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ﴿٢٢﴾
وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ
الذِّكْرٰى ؕ﴿٢٣﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۚ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ

Marfat.com

عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾

رکوع: ۱۔ (قسم ہے فجر کی۔ ۱) اور دس راتوں کی۔ ۲) اور جفت اور طاق کی۔ ۳) اور رات کی جب وہ چل کھڑی ہو۔ ۴) کیا اس میں کوئی قسم ہے کسی عقل والے کیلئے۔ ۵) کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے کیا برتاؤ کیا عاد کے ساتھ۔ ۶) ستونوں والے ارم کے ساتھ۔ ۷) ان جیسی کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔ ۸) اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشیں۔ ۹) اور میخوں والے فرعون کے ساتھ۔ ۱۰) انہوں نے ملکوں میں سرکشی کی۔ ۱۱) اور ان میں بہت فساد مچایا۔ ۱۲) تب آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ ۱۳) بیشک آپ کا رب گھات میں رہتا ہے۔ ۱۴) لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا پروردگار اسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کو عزت و نعمت بخشتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے۔ ۱۵) اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔ ۱۶) ہرگز نہیں! بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے۔ ۱۷) اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو اکساتے ہو۔ ۱۸) اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو۔ ۱۹) اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔ ۲۰) ہرگز نہیں! جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی۔ ۲۱) اور آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے۔ ۲۲) اور جہنم اس روز سامنے لے آئی جائے گی، اس دن انسان سوچے گا مگر اس وقت اس کے سوچنے کا کیا حاصل؟ ۲۳) وہ کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی کیلئے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا۔ ۲۴) پھر اس دن نہ اس کا سا کوئی عذاب دے سکتا ہے۔ ۲۵) اور نہ اس کا سا باندھنا کوئی باندھ سکتا ہے۔ ۲۶) نفسِ مطمئن!۔ ۲۷) چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ ۲۸) شامل ہو جا میرے بندوں میں۔ ۲۹) اور داخل ہو جا میری بہشت میں۔ ۳۰)

وَالْفَجْرِ ﴿١﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿٢﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿٣﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ﴿٤﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿٥﴾

(قسم ہے فجر کی۔ ۱) اور دس راتوں کی۔ ۲) اور جفت اور طاق کی۔ ۳) اور رات کی جب وہ چل کھڑی ہو۔ ۴) کیا اس میں کوئی قسم ہے کسی عقل والے کیلئے۔ ۵)

Marfat.com

ان پانچ قسموں کا مفہوم اور جوابِ قسم کا تعین اور مفہوم

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ قسم عموماً قرآنِ کریم میں کسی دعویٰ کی گواہی یا دلیل کے طور پر آتی ہے جس سے اس دعویٰ کو ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔اور دعویٰ جسے مقسم علیہ کہا جاتا ہے قسم کے بعد آتا ہے تاکہ قسم کے ذریعے پہلے دل و دماغ کی زمین ہموار کی جائے اور اس کے بعد دعویٰ کی تخم ریزی کی جائے۔ان آیات میں پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔سوال یہ ہے کہ ان کا مقسم علیہ یعنی دعویٰ کیا ہے جسے قسموں کے بعد محذوف رکھا گیا ہے۔بعض مفسرین کے نزدیک ان ربک لبالمرصاد دعویٰ اور جوابِ قسم ہے۔جو آگے چل کر مذکور ہے اور یہاں اسے اس کی نسبت سے محذوف کہا جاسکتا ہے۔لیکن دیگر حضراتِ مفسرین دعویٰ کے تعین میں باہم گر اختلاف رکھتے ہیں۔ان کی نظر بعد میں آنے والی پوری سورۃ پر ہے۔اس کے مجموعی مضمون سے جو تاثر ذہن میں پیدا ہوتا ہے اسے اگر سمیٹ کر کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جزاء و سزا اور قیامت کا اثبات ہے۔کیونکہ اس سورۃ کے نزول کے وقت آنحضرت ﷺ کی دعوت کے دو بنیادی موضوع تھے جس پر آپ سب سے زیادہ زور دے رہے تھے۔ایک توحید اور دوسرا قیامت۔اور قیامت کے تصور کو قبول کرنا اہلِ مکہ کیلئے سب سے زیادہ دشوار ہو رہا تھا۔وہ اس پر قسم قسم کے اعتراضات کر رہے تھے اور اسے خلافِ عقل قرار دے رہے تھے۔چنانچہ اسی کے اثبات کیلئے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔لیکن جب تدبر کی نگاہ سے اس سورۃ کو پڑھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی موضوع تو یقیناً آخرت اور قیامت ہی ہے لیکن اس کے اثبات کیلئے اللہ تعالیٰ کی جن صفات پر ایمان لانا ضروری ہے اور جن کا منطقی نتیجہ آخرت کا یقین ہے ان قسموں سے ان پر بھی دلیل قائم کی گئی ہے۔یعنی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔اس کی باگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔کسی چیز کا ظہور اور نمود اور کسی چیز کا اوجھل ہوجانا اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت سے ممکن ہے۔اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ساری کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔اس کا کوئی کام بے تکا، بے مقصد، بے حکمت اور بے مصلحت نہیں ہوتا۔یہاں ہمیں ہر طرف تغیر کارفرما دکھائی دیتا ہے لیکن ہر تغیر کے پیچھے اس کی قدرت اور حکمت کام کر رہی ہے۔یہاں اس کا فطری قانون بھی کارفرما ہے اور اس کا اخلاقی قانون بھی۔اس کے اخلاقی قانون کے تحت افراد اور قوموں کے فیصلے ہوتے ہیں۔وہ جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔کوئی شے اس کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔یہ قسمیں اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات پر ایسے دلائل فراہم کر رہی ہیں جنہیں سمجھ لینے کے بعد کوئی عقلمند آدمی آخرت اور قیامت کا انکار نہیں کرسکتا۔

جوابِ قسم متعین ہوجانے کے بعد اب سوال یہ ہے کہ ان قسموں کا مفہوم کیا ہے۔اور ان سے مراد کیا ہے۔مفسرین نے اس بارے میں بہت اختلاف کیا ہے۔اور ہر چیز کے بارے میں ان کے بہت سے اقوال ہیں۔یہ اختلاف بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ سے ان آیات کی کوئی تفسیر ثقہ روایات سے ہم تک پہنچی ہوتی تو پھر اختلاف کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔اس لئے ہر مفسر نے اپنے فہم اور ذوق کے مطابق اس کی تفسیر کی ہے۔اور یہ اختلاف عہدِ صحابہؓ سے شروع ہوگیا تھا کیونکہ حضرت ابنِ عباسؓ کے اقوال حضرت علیؓ کے قول سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔البتہ اس سلسلے میں دو مرفوع حدیثیں بھی روایت کی جاتی ہیں۔ایک حضرت جابرؓ کی اور دوسرا عمران بن حصینؓ کی۔ لیکن ان کے بارے میں حافظ ابنِ کثیر کی رائے یہ ہے کہ ’’وھذا اسناد رجالہ لاباس بھم وعندی ان المتن فی رفعہ نکارۃ۔‘‘ اور دوسری کی نسبت فرماتے ہیں ’’وعندی ان وقفہ علی عمران ابن حصین اشبہ۔‘‘ واللہ علم۔

Marfat.com

اب ہم ایک ایک قسم پر غور کرتے ہیں۔ سب سے پہلے فرمایا، فجر کی قسم۔ فجر پو پھٹنے کو کہتے ہیں۔ جب تاریکی کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے اور عالم ایک نیا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ رات کی تاریکی میں سے دن کی ابتدائی روشنی مشرق کی طرف ایک سفید دھاری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑے تغیر کا پیغام ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تاریکی کی تنی ہوئی چادر کبھی ہٹے گی بھی یا نہیں۔ اب چونکہ انسان اس تجربے کے عادی ہو گئے ہیں اس لئے انہیں اس میں کوئی اچنبھا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کسی شخص کو رات کے وقت دنیا میں اتار دیا جائے اور تاریکی ایسی گہری ہو کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو، اندازہ کیجئے اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ روشنی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اور کوئی اگر اسے یہ کہے کہ اسی تاریکی سے روشنی کی لہر پھوٹے گی تو وہ کبھی ماننے کو تیار نہیں ہوگا۔ اس لئے فجر کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں فرمانروائی کا تصور دیا گیا۔ پھر فجر کے طلوع ہونے سے اس کی قدرت کا ایک ہلکا سا نمونہ دکھایا گیا۔ اور اس تمثیل میں قیامت کا منظر دکھاتے ہوئے واضح کیا گیا کہ قیامت بھی اسی طرح ایک دن ظہور پذیر ہوگی۔ یہ دنیا رات کی مانند ہے۔ جس کی تاریکی صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ جس طرح رات کے بعد فجر ایک متعین نظام الاوقات کے تحت نمودار ہوتی ہے، اسی طرح ایک وقت آئے گا جب قیامت اچانک وارد ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ لوگوں کے مطالبے پر قیامت کا ظہور ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت نے جس طرح فجر کے طلوع کا ایک وقت مقرر کیا ہے اور وہ اسی وقت وقوع پذیر ہوتی ہے، اسی طرح قیامت بھی اپنے وقت پر آئے گی۔ اور اس کا آنا اسی طرح اٹل ہے جیسے فجر کا طلوع ہونا۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ انسان ہر روز فجر کی تمثیل میں قیامت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ رات کو سوتا ہے اور صبح کو آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے۔ اسی طرح مر جانے کے بعد جب صور پھونکا جائے گا اور قیامت کی صبح طلوع ہوگی تو قبروں میں سونے والے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھیں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ من بعثنا من مرقدنا "کس نے ہمیں ہمارے مرقد سے اٹھایا" مرقد نیند کو بھی کہتے ہیں اور سونے کی جگہ یعنی بستر کو بھی۔ اقبال نے اسی طرح طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

ہے اگر آئینِ ہستی کہ ہو یہاں ہر شام صبح
مرقدِ ہستی کا آخر کیوں نہ ہو انجام صبح

وَلَیَالٍ عَشْرٍ...... دس راتوں کی قسم۔ سورۃ کے عمود اور مرکزی مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں۔ پہلی دس راتوں میں چاند ایک باریک ناخن کی شکل سے شروع ہو کر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتوں میں رات کا بڑا حصہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتوں میں چاند چھوٹے سے چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور رات کا بیشتر حصہ تاریک سے تاریک تر ہوتا جاتا ہے۔ چاند ایک کُرّہ ہے جو اپنے طلوع و غروب اور اپنے عروج و زوال میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ صدیوں پہ صدیاں گزر گئیں لیکن اس کی روش میں کبھی تبدیلی نہ آئی۔ لوگ عید کے چاند کیلئے کیسی کچھ کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک دن پہلے نظر آ جائے لیکن چاند ایک لگے بندھے نظام کا پابند ہے، اسے لوگوں کے شوق و اضطراب کی پرواہ نہیں۔ اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ چاند مسلسل تغیر پذیر ہوتا ہے۔ ہر آنے والا دن اس کی حالت کو پہلے دن سے مختلف دکھاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اپنے طلوع و غروب اور عروج و زوال میں اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہے، اسی طرح اس کے اندر تغیرات بھی اللہ تعالیٰ ہی کے احکام سے ہوتے ہیں اور ان میں قدرت نے ایک تدریج رکھی ہے۔ جس سے وہ نہ کبھی آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ پیچھے رہ سکتا ہے۔

Marfat.com

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ...... اور جفت اور طاق کی قسم۔ جفت اس عدد کو کہتے ہیں جو دو برابر کے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ جیسے دو، چار، چھ، آٹھ وغیرہ۔ اور طاق اس عدد کو کہتے ہیں جو تقسیم نہیں ہوتا۔ جیسے ایک، تین، پانچ، سات وغیرہ۔ بعض اہلِ علم نے تو جفت سے مراد ساری مخلوق لی ہے اور طاق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات لی ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی جوڑا نہیں، باقی ہر مخلوق کا کوئی نہ کوئی جوڑا ہے۔ لیکن سلسلۂ بیان کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد تغیرِ ایام ہے، کہ مہینے کی تاریخیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوتی جاتی ہیں اور ہر تغیر ایک نئی کیفیت لے کے آتا ہے۔ اور یہی وہ تغیر ہے جو انسانی حساب کی بنیاد ہے۔ اسی سے مہینے وجود میں آتے ہیں، اسی سے سال بنتے ہیں، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ کون سا کام کب شروع ہوا اور کب ختم ہوگا۔ موسموں کے تغیرات کا تعین بھی اسی سے ہوتا ہے۔ یہ دنوں کا پھیر اور شب و روز کی باقاعدگی کیا یہ بتانے کیلئے کافی نہیں کہ یہ زبردست نظم و ضبط کسی قادرِ مطلق کا قائم کیا ہوا ہے۔ اور اس کے قیام سے اس مخلوق کی بیشمار مصلحتیں وابستہ ہیں جسے اس نے زمین پر پیدا کیا ہے۔

دس راتوں کے بعد جفت اور طاق کا ذکر درحقیقت یہ بتانے کیلئے ہے کہ ہر چیز کی باگ ڈور اللہ وحدہ لاشریک کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے کہ بعض مہینوں میں یہ راتیں جفت ہوتی ہیں، بعض میں طاق۔ لیکن کسی کے امکان میں نہیں کہ وہ جفت کو طاق یا طاق کو جفت بنا دے خواہ اس کی کتنی ہی تمنا رکھتا ہو۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ...... اور رات کی قسم جب وہ چل پڑے۔ یعنی وہ تاریکی جو سورج غروب ہونے کے بعد سے دنیا پر چھائی ہوئی تھی، قریب الاختتام ہو۔ اور طلوعِ سحر ہونے والی ہے۔ جو لوگ حقیقت کا علم نہیں رکھتے وہ رات کے آخری حصے میں تھکی ہوئی نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ یہ رات کبھی ختم نہیں ہوگی۔ انہیں کوئی ہزار سمجھائے کہ تغیر اس دنیا کی ایک حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت نے تغیر کے ظہور کو ایک تدریج کا پابند ٹھہرایا ہے۔ اس قانون کے تحت یہ رات بھی ختم ہوگی اور دن کا اجالا پھیلے گا۔ اس سے درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے شب و روز کے معمولات اور تمہاری خواہشات کی بھرمار اور تمہارے افکار کا فساد اور زندگی کے بارے میں تمہارے غلط تصورات تاریک رات کی مانند تم پر چھائے ہوئے ہیں جو تمہیں صبحِ قیامت کے طلوع پر یقین پیدا نہیں ہونے دیتے۔ حالانکہ یہ ایسی چلتی ہوئی رات ہے جسے بہرحال ایک منزل پر پہنچنا ہے اور وہ منزل قیامت ہے۔ جس میں ہر شخص کو نیکی کی جزاء اور برائی کی سزا ملے گی۔

یہ چار قسمیں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی حکمت، اس کی کائنات پر فرمانروائی اور ایسی ہی دوسری متعدد صفات پر استدلال کیا گیا ہے۔ اور اس کے منطقی نتیجے کو اثباتِ قیامت کی دلیل ٹھہرایا ہے۔ اور آخر میں فرمایا کہ کیا اتنی واضح شہادات اور دلائل کے بعد بھی کسی عقل والے کیلئے کسی اور قسم کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

حِجر اور عقل دونوں کا لغوی مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے۔ ان دونوں ہی کے اندر روکنے اور باندھنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ عقل انسان کو ان چیزوں سے باز رکھنے کیلئے ایک باطنی لگام ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کو حِجر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن جو عقل خواہشات کی اسیر ہو جاتی ہے وہ اپنی عملی استعداد کھو دیتی ہے۔ وہ کسی چیز کا اقرار یا انکار خواہشات کے تابع رہ کر کرتی ہے جس میں فیصلہ اس کا اپنا نہیں ہوتا بلکہ خواہشات کا ہوتا ہے۔ اس لئے ہدایت کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ نے قلبِ سلیم کو شرط قرار دیا ہے جس سے عقلِ سلیم مراد ہے جو خواہشات کے اثرات سے محفوظ ہو۔ ایسی عقل کا حامل شخص یقیناً ان قسموں کو اپنے لئے مکمل رہنما سمجھے گا۔ اور اس کو کسی اور رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوگی۔

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ ۝٨

(کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے کیا برتاؤ کیا عاد کے ساتھ۔ ۶) ستونوں والے ارم کے ساتھ۔ ۷)
ان جیسی کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔ ۸)

آفاق کی شہادت کے بعد تاریخ سے استدلال

گزشتہ آیات میں قسموں کی صورت میں آفاق کی نشانیوں کی شہادت کے بعد قوموں کی تاریخ سے استدلال کیا جارہا ہے، کیو انسانوں کی فکری کوتاہی یہ ہے کہ وہ آفاق وانفس کی نشانیوں کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ لیکن تاریخی شواہد اور وہ بھی اپنے جیسے انسانو براہِ راست انسانوں پر اثر کرتے ہیں اور بالعموم ان کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اب چند ایسی قوموں کے انجا طرف توجہ دلائی جارہی ہے عرب جن کے بارے میں خوب باخبر تھے۔ سینہ بہ سینہ پوری قوم تک ان کے حالات پہنچ چکے تھے۔ ان کے طر اوران کے انجام کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اس دنیا کا خالق اس میں ابھرنے والی قوموں کے رویئے سے بے خبر نہیں رہتا، برابر اس کی ان کے تعاقب میں رہتی ہے۔ جب وہ سرکشی کا رویہ اختیار کرتیں اور زمین میں فساد مچانے لگتی ہیں تو ایک خاص مدت تک ان کو مہلت ضرور ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کرلیں، لیکن اگر وہ اصلاح کی بجائے سرکشی میں آگے ہی بڑھتی چلی جاتی ہیں تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ان مہلتِ عمل ختم ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا ان پر برس جاتا ہے۔ لوگ بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں صرف قانونِ فطرت کام کر رہا اور وہ ایک ایسا اندھا بہرہ قانون ہے جسے لوگوں کی اخلاقی کیفیت سے کوئی سروکار نہیں۔ ان شواہد سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کائنات کسی اند بہرے قانونِ فطرت کے تحت نہیں چل رہی بلکہ خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے اور اس کی خدائی میں صرف وہی ایک قانون کارفرما نہیں ج قانونِ فطرت سمجھتے ہو بلکہ ایک قانونِ اخلاق بھی کارفرما ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزاء وسزا ہے۔ اس قانون کا اصل اظہ قیامت کی صورت میں ہوگا لیکن اس کی کارفرمائی کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہو کر اصحابِ عقل کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا جو نظام چلا رہا ہے اس نظام کا مزاج کیا ہے۔ اس میں تدبر کرنے سے صاف معلوم ہوتا کہ جن قوموں نے آخرت سے بے فکر ہو کر اور جزاء وسزا سے بے خوف ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار فاسد ومفسد بن کر رہیں اور قوموں کا انجام تباہی وبربادی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ جو شخص بھی اس حقیقت پر غور کرے گا اسے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہوگا کہ اگر اس زمین کو سے بچانا ہے اور انسانوں کو جامۂ انسانیت میں رہ کر زندگی گزارنے پر مجبور کرنا ہے تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انسانوں کے اندر آخر کا عقیدہ راسخ کیا جائے۔ کیونکہ آخرت کا انکار ہمیشہ انسانوں کے بگاڑ کی صورت میں نکلا ہے۔ اور اسی طرح یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ میں ہمیشہ قوموں کی سرکشی اور حد سے بڑھے ہوئے فساد کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔ اور اس عذاب سے پہلے بار بار انسانوں کو ڈھیل دی جاتی ہے لیکن جب ان کا پیمانہ بھر جاتا ہے تو پھر عذاب کا کوڑا برس جاتا ہے۔ لیکن یہ فساد اور بگاڑ کی آخری حد ہے جس کے بعد تعالیٰ کا عذاب آتا ہے یہ اچانک کبھی نہیں آتا، اس سے پہلے کئی نسلیں اس فساد کے اضافے میں شریک رہ چکی ہوتی ہیں لیکن اس کی انتہا

Marfat.com

پہنچتے پہنچتے یہ دنیا سے چلی جاتی ہیں۔اس طرح عذاب سے بچ جاتی ہیں اور صرف وہ نسل عذاب کا شکار ہوتی ہے جو فساد کو آخری حد پر پہنچانے والی ہوتی ہے۔سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے صدیوں تک اس کی تخم ریزی کی، اس کی آبیاری کی، مسلسل اپنی عملی خرابیوں سے اس کو تقویت دیتے رہے۔ان کی بداعمالیوں کی سزا ملنا بھی تو ضروری ہے۔لیکن انہیں دنیا میں ایسی کوئی سزا نہیں ملی اور وہ موت کی آغوش میں چلے گئے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جب یہ سب لوگ اپنی بداعمالیوں اور اپنی سرکشیوں کی سزا پائیں۔اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ یہاں فطری قانون کے ساتھ ساتھ ایک قانونِ اخلاق بھی ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزاء وسزا ہے۔

پہلی شہادت قومِ عاد کے حالات سے

تاریخی شواہد کے سلسلے میں سب سے پہلی شہادت قومِ عاد کے حالات سے پیش کی جارہی ہے۔قومِ عاد دو ناموں سے پکاری جاتی ہے ایک کو عادِ ارم یا عادِ اولیٰ کا نام دیا گیا ہے۔اور دوسری کو عادِ اخریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔عادِ ارم یا عادِ اولیٰ سے مراد وہ قدیم قومِ عاد ہے جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔یہ قوم چونکہ ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد تھی، اس لئے ارم کی طرف اسے منسوب کیا جاتا تھا۔اسی شاخ کی کئی دوسری ضمنی شاخیں تاریخ میں مشہور ہیں جن میں سے ثمود کا ذکر اس کے بعد آرہا ہے۔ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی اور تکذیب پر اڑے رہے تو آخر اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو تباہ و برباد کردیا۔اور جو لوگ انہیں کی نسل سے ہونے کے باوجود ایمان لانے کے باعث یا کسی اور علاقے میں قیام کی وجہ سے عذاب سے بچ گئے اور بعد میں پھلے پھولے انہیں عادِ اخریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

عاد کو ذات العماد کہا گیا ہے جس کا معنی ہے ستونوں والے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلی قوم ہے کہ جنہوں نے بڑی بڑی عمارتیں بڑے اونچے ستونوں پر اٹھائیں۔اور یہ طریقہ سب سے پہلے انہوں نے ایجاد کیا۔اس لئے انہیں ذات العماد کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ان کی تعمیری ترقیات کی تعبیر کیلئے ایک کنایہ ہو۔اور انہیں بلند عمارتیں اور بلند جگہوں پر یادگاریں اٹھانے کا چونکہ غیر معمولی شوق تھا اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔قرآنِ کریم نے سورۃ الشعراء میں حضرت ہود علیہ السلام کی زبان سے ان کی اس روش پر تنقید بھی نقل کی ہے۔حضرت ہود نے فرمایا اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ”کیا تم ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بناڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو۔گویا تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔

مزید فرمایا کہ تعمیری ترقیوں کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنے قدوقامت اور زور وقوت کے لحاظ سے بھی نہایت نمایاں تھے۔اس وقت کوئی قوم دنیا میں ان کی ٹکر کی نہ تھی۔سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا گیا فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ”رہے عاد تو انہوں نے زمین میں کسی حق کے بغیر تکبر اور گھمنڈ کیا اور کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔“

وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ ۹

(اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشیں۔ ۹)

Marfat.com

دوسری شہادت قومِ ثمود کے حالات سے

ثمود بھی سامی نسل کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ عاد ہی کے بقایا میں سے ہیں۔ اور انہیں بھی اپنے پیشروؤں کی طرح بلند و بالا عمارتیں اٹھانے کا بہت شوق تھا۔ یہاں وادی سے مراد القریٰ ہے، یہ وادی ان کا مسکن تھی۔ انہوں نے اس وادی میں چٹانیں تراش تراش کر اپنے لئے وسیع عمارتیں بنائی تھیں اور غالباً تاریخ میں یہ پہلی قوم ہے جس نے چٹانوں کے اندر اس طرح کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور آج بھی ان کے بعض آثار موجود ہیں۔

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ﴿۱۰﴾

(اور میخوں والے فرعون کے ساتھ۔ ۱۰)

تیسری شہادت فرعون سے

قومِ عاد اور قومِ ثمود کی تباہی کے بعد فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کا ذکر فرمایا۔ ذوالاوتاد کا معنی ہے میخوں والا۔ سورۃ ص میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ لیکن یہاں اوتاد کنایہ کے طور پر فرعون کی فوجوں کی تعبیر کیلئے آیا ہے۔ کیونکہ جس دور میں فرعون ہوا ہے اس دور میں اور اس کے بعد بھی صدیوں تک مستقل فوجیں رکھنے کا رواج نہ تھا۔ حملہ یا دفاع کی ضرورت کیلئے قبیلوں اور خاندانوں کے نوجوان اپنی خدمات پیش کرتے تھے اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد منتشر ہو جاتے تھے۔ لیکن تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے ملک کی حفاظت کیلئے مستقل فوج قائم کی جو ملک کے مختلف حصوں میں رکھی جاتی۔ ان جگہوں کو آج کی چھاؤنیاں سمجھ لیجئے۔ اور عمالِ حکومت کو بھی پابند کیا جاتا تھا کہ وہ ایک خاص تعداد میں فوج تیار رکھیں اور ضرورت پڑنے پر حکومت کو فراہم کریں۔ شاید اسی وجہ سے فرعون کو ذوالاوتاد کہا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ فراعنہ کی عظمت و شوکت کے وہ آثار جو آج بھی زمین پر جمے کھڑے ہیں وہ اہرامِ مصر ہیں۔ ممکن ہے ذوالاوتاد سے ان کی طرف اشارہ ہو۔

الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾

(انہوں نے ملکوں میں سرکشی کی۔ ۱۱) اور ان میں بہت فساد مچایا۔ ۱۲) تب آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ ۱۳)

قومِ عاد اور قومِ ثمود جیسی طاقتور قومیں اور فرعون جیسا صاحبِ جبروت حکمران یہ سب اپنے اپنے وقت میں قوت و طاقت ہیبت و جبروت اور دولت و ثروت میں بے مثال تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی قوت اور وسائل کو اللہ تعالیٰ کی عطا اور نعمت جاننے کی بجائے اپنی ذاتی کاوش کا نتیجہ سمجھا۔ اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہوئے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے یہ ہماری ذاتی قابلیت اور کارکردگی کا کرشمہ ہے، کسی کا احسان نہیں۔ اور یہ سب کچھ ہمیشہ ہمارے پاس رہے گا، اسے کبھی زوال نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہر طرح کی جوابدہی اور مسؤلیت سے بالا سمجھا۔ اور حدودِ بندگی سے نکل کر خدائی کا صور پھونکنے لگے۔ اور اس سرکشی میں یہاں تک بڑھے کہ زمین کو فساد سے

Marfat.com

بھر دیا۔ ہر طرف ظلم کا دور دورہ ہو گیا۔ کتنی کمزور قومیں تھیں جن کو انہوں نے اپنا غلام بنا لیا۔ جس کو اپنے سے کمزور جانا اس پر اس طرح ہاتھ ڈالا جس طرح ظالم ہاتھ ڈالتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے نہایت اختصار کے ساتھ ان کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ''اور تم نے جب کسی پر ہاتھ ڈالا جبار بن کر ڈالا'' اور فرعون کے ظلم کا حال یہ تھا کہ وہ جب کسی کو سزا دیتا تو اس کے ہاتھ اور پاؤں میں میخیں ٹھونک دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی سرکشی کوئی چند دنوں کی بات نہ تھی نہ جانے قدرت انہیں کتنے عرصے تک مہلت دیتی رہی۔ آخر جب ان کا پیمانہ بھر گیا اور مہلتِ عمل ختم ہو گئی اور وہ حد آ گئی جس کے آگے اللہ تعالیٰ انہیں بڑھنے نہیں دینا چاہتا تھا تو پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا برسا۔ اس کی تفصیل دوسری آیات میں موجود ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾

(بیشک آپ کا رب گھات میں رہتا ہے۔ ۱۴)

خلاصۂ بحث

گھات اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی کے انتظار میں اس غرض کیلئے چھپا ہوا ہو کہ جب وہ زد پر آئے تو اس پر حملہ کر دے۔ لیکن جس کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے اسے کچھ خبر نہیں کہ کوئی اس کیلئے انتظار میں ہے۔ وہ انجام سے بے خبر اور بے فکری کے ساتھ اس مقام کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور اچانک شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی کو نظر نہیں آتی۔ اس کی نشانیاں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں لیکن لوگ ان کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ لیکن وہ سب کو دیکھتا ہے اور ان کے اعمال کا جائزہ لیتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کے بعد کسی گوشے میں بیٹھ گیا ہے اب ہم اپنی من مرضی کرنے میں آزاد ہیں اس لئے وہ نہایت اطمینان اور بے فکری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے وسائل کو اپنی کاوشوں کا نتیجہ سمجھ کر اور ہر طرح کی مسؤلیت سے بے نیاز ہو کر زمین میں ظلم بھی کرتے ہیں اور ہر طرح کی خباثتوں سے زمین کو بھر دیتے ہیں۔ چونکہ ہر چیز کی باگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس لئے وہ لوگوں کو سمجھانے بجھانے اور تنبیہ کرنے کیلئے مصلحین کو بھی بھیجتا ہے اور حالات کے ذریعے بھی متوجہ کرتا ہے لیکن پکڑنے میں کبھی جلدی نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے یہ اندیشہ نہیں کہ یہ لوگ بچ کے نکل جائیں گے۔ وہ مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے لیکن جب وہ مقرر حد آ جاتی ہے جسے لانگنے کی وہ اجازت نہیں دیتا تو قوم جب اسے لانگنا چاہتی ہے تو وہ فوراً اس کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ اور پھر کسی میں یہ طاقت نہیں کی اس کی گرفت سے بچ کے نکل سکے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں بلکہ ایک حکیم وقدیر کا بنایا ہوا کارخانہ ہے جس نے اس کا ایک مقصد رکھا ہے ایک غایت رکھی ہے۔ اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ ایک روزِ جزاء وسزا ظہور میں آئے اور اس دن ہر شخص جس نے اپنی زندگی اپنے رب کے احکام کے تحت گزاری ہے اپنے رب کی خوشنودی سے نوازا جائے۔ اور جس نے اس کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس میں فساد مچایا وہ اپنے کیئے کی سزا بھگتے۔

Marfat.com

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾
وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾

(لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا پروردگار اسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کو عزت و نعمت بخشا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے۔ ۱۵) اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔ ۱۶)

انسان کی فکری کجی

گزشتہ آیات میں قوم عاد، قوم ثمود اور فرعون کی سرکشی اور فساد اور پھر ان کے انجام کے ذکر کرنے کے بعد اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ انسان عزت اور نعمت پا کر سرکش کیوں ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہی عزت اور نعمت اس سے چھن جاتی ہے تو وہ مایوسی و نامرادی کا شکار کیوں ہو جاتا ہے کیونکہ متذکرہ بالا آیات میں جن قوموں کا ذکر کیا گیا ہے اور آج بھی ہم جب دنیا کی بیشتر قوموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو کردار ہمارے سامنے آتے ہیں کہ کچھ لوگ ہیں جو اقتدار کی مسندوں پر فائز ہیں اور دولت وحشمت ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ وہ جاہ واقتدار اور دولت وحشمت کو اگر اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں، تو اس کی رضا کی علامت سمجھتے ہیں اور انہیں گمان یہ ہوتا ہے کہ ہم یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہے۔ اگر وہ ہمارے طور اطوار سے خوش نہ ہوتا تو نہ ہمیں جاہ واقتدار میسر آتا اور نہ ہم دولت وحشمت کے مالک ہوتے۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔ نہ انہیں دولت میسر ہے اور نہ اقتدار کی کوئی کرسی۔ وہ اس صورتحال کو اپنے لئے محرومی کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ان کو دنیا کی ذلتیں جھیلنے کیلئے چھوڑ دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حالت بدلنے کیلئے کچھ کرنے کی بجائے مایوسی اور نامرادی کا شکار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان پر ظلم ہوتا ہے، وہ تو اسے اپنی قسمت سمجھ کر خاموش رہتے ہیں۔ صحیح زندگی اختیار کرنے کیلئے جس حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے تہی دامن ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ان میں کچھ لوگ قسمت آزمائی کرنے کی ہمت کرتے ہیں تو وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور ظلم کے مقابلے میں ظلم کی راہیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں غلط رویوں نے اللہ تعالیٰ کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہے۔ ظالم کا ظلم بڑھتا جا رہا ہے اور مظلوموں کی بے حسی انہیں اور حوصلہ دلاتی جا رہی ہے۔ ان آیات میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جاہ واقتدار یا دولت وحشمت اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا معیار نہیں۔ اور دولت وحشمت اور جاہ واقتدار سے محرومی ذلت کی علامت نہیں۔ یہ دونوں چیزیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو دنیا میں کچھ دیا ہے آزمائش کیلئے دیا ہے کہ وہ دولت اور طاقت پا کر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بنتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ اور جسے مفلس اور تنگ حال بنایا ہے۔ اس کا بھی امتحان ہے کہ وہ صبر اور قناعت کے ساتھ راضی برضا رہتا ہے اور حالات کے مقابلے کیلئے مضبوط اور استوار اور اپنے کردار میں پختہ اور پائیدار ثابت ہوتا ہے یا حوصلہ ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ انسان کے صبر و شکر کی پختگی ہی پر اس کے تمام دین کی پختگی کا انحصار ہے۔ ایک جیسی حالت کبھی نہیں رہتی۔ اس لئے ان دونوں چیزوں کا مختلف وقتوں میں امتحان ہوتا رہتا ہے۔ جس نے یہ دونوں صفات

Marfat.com

اپنے اندر پیدا کرلیں وہ ہر طرح کے حالات میں وہ زندگی اختیار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اور جس نے ان دونوں میں یا کسی ایک میں کمزوری دکھائی تو وہ غیر متوازن زندگی کا شکار ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ایسا شخص جو خوشحالی میں شکر گزار ہو اور بدحالی میں صابر اور حالات کا مقابلہ کرنے والا، اسی کو نفس مطمئنہ کی دولتِ گراں مایہ حاصل ہوتی ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿١٨﴾
وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾

(ہرگز نہیں! بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے۔ ۱۷) اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو اکساتے ہو۔ ۱۸) اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو۔ 19) اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔ ۲۰)

فکری کجی کا ازالہ

كَلَّا ...... ہرگز نہیں۔ یہ دراصل کفار کے ان خیالات کی تردید ہے جس کا ذکر سابقہ دو آیتوں میں گزرا۔ وہ مال و دولت کو عزت اور ذلت کا معیار سمجھتے تھے۔ انہیں کسی کے سیرت و کردار سے کوئی غرض نہ تھی۔ جس کے پاس دولت زیادہ ہے یا وہ بڑی طاقت رکھتا ہے وہ ان کے نزدیک عزت والا ہے اور اس قابل ہے کہ اسے اہم مناصب پر فائز کیا جائے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ دولت یا جاہ و اقتدار یہ عزت یا ذلت کی علامت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے کہ تم عزت اور اقتدار ملنے پر شکر ادا کرتے ہو یا ناشکری کرتے ہو۔ اور غربت اور محکومیت میں تم صبر کرتے ہو یا حوصلہ ہار دیتے ہو۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم دولت مند ضرور ہو اور اپنی قبائلی ریاست میں تم جاہ و اقتدار بھی رکھتے ہو۔ لیکن جہاں تک اس کردار کا تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ اعتبار اور اجر و ثواب کے لائق ہے اس سے تم بالکل محروم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دولت اور عہدہ و منصب بطور آزمائش کے دیا تھا تم اس میں بالکل ناکام ہوگئے ہو۔ دولت پر شکر کا تقاضا یہ تھا کہ تم یتیموں کا اکرام کرتے اور غریبوں اور مسکینوں کی ضروریات پر اپنی دولت خرچ کرتے۔ لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم نے دولت کو اپنی کلغی سجانے اور سر اونچا کرنے کیلئے استعمال کیا ہے۔ پھلدار شاخ ہمیشہ جھکتی ہے لیکن تم ایسے پھلدار ہو کہ جن کے پھل کڑوے ہوچکے ہیں اور جن کے پھلوں میں کسی غریب کا کوئی حصہ نہیں۔ یتیم کے اکرام کا مفہوم یہ ہے کہ یتیم کے حقوق کا صرف یہی تقاضا نہیں کہ اس کے پیٹ کی آگ بجھنے کا انتظام کیا جائے بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس سوسائٹی میں اس کو عزت کا مقام ملے، لوگ اسے احترام سے دیکھیں، لوگ اس کی غربت پر نہیں اس کے کردار پر نظر رکھیں، اگر وہ صاحب کردار آدمی ہے تو یتیمی اس کے راستے میں حائل نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن تمہاری خست کا عالم یہ ہے کہ تم یتیموں اور مسکینوں کو حقوق کیا دو گے اور ان کا اکرام کیا کرو گے تم تو نہ انہیں خود کچھ دینے کو تیار ہو اور نہ کسی اور کو اس پر اکساتے ہو۔ بلکہ تمہاری خواہش یہ ہے کہ کوئی اور بھی کسی یتیم اور مسکین کی ضرورت پوری نہ کرے تاکہ تمہارے بخل پر پردہ پڑا رہے۔

اسلام صرف اسلامی معاشرے کے افراد سے صرف اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ وہ خود یتیموں اور مسکینوں کی ضروریات کو سمجھیں اور ادا کریں، بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ افرادِ معاشرہ میں ایک ایسا احساس پیدا ہوجانا چاہیے جو انہیں ایک دوسرے کو یتیم اور مسکین کی مدد کرنے پر

Marfat.com

اکسانے پر مجبور کرے۔ جس طرح بیٹا بھوکا ہو یا بیوی فاقے سے ہو تو بیٹے کے باپ اور بیوی کے شوہر کو چین نہیں آتا۔ وہ اِدھر اُدھر کوشش کرے گا کہ ان کی ضروریات کا کسی حد تک مداوا ہو سکے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں میں اسی طرح کی فکرمندی پیدا کر دی تھی۔ جب لوگ فجر کی نماز پڑھ کر گھروں کی طرف آتے تھے تو کوئی نہ کوئی آدمی اپنی چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کرتا تھا کہ لوگو! اپنے گردوپیش میں غور سے دیکھو کہیں رات کوئی بھوکا تو نہیں سویا۔ اگر ایسا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نازل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بلکہ لوگوں کے تصورات میں اس حد تک تبدیلی آ گئی تھی کہ جو شخص غریب لوگوں کی مدد کے احساس سے تہی دامن تھا لوگ اسے آدمی نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک آدمیت کا تقاضا ہے کہ دوسرے آدمی سے حُسنِ سلوک سے پیش آنا اور امکانی حد تک دوسروں کی مدد کرنا ہے۔ سعدی نے بجا کہا:

تو کز محنتِ دیگراں بے غمی
نہ شاید کہ نامت نہند آدمی

اور جگر مرادآبادی نے اس کے نتائج کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بالکل ٹھیک کہا:

جب تک کہ غمِ انساں سے جگر انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دنیا لیکن جنت سے جہنم دور نہیں

مزید فرمایا کہ سیم وزر اور درہم و دینار سے تمہاری محبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے اور اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جاتا ہے تو تم میں جو طاقتور لوگ ہیں وہ اس مرحوم کی وراثت اور چھوڑا ہوا مال سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ''لَـمّ'' کے معنی جمع کرنے اور سمیٹنے کے ہیں۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ تم مرحوم کے مال میں دست درازی کرتے ہو بلکہ تم مرحوم کا سارا ترکہ جمع کر کے اور سمیٹ کر اس طرح ہڑپ کر جاتے ہو کہ کسی کیلئے کچھ نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ مرنے والا تمہارا کوئی عزیز ہے اور اس کی اولاد تمہارے قریبی عزیز کی اولاد ہے اور تم رشتوں میں ان کے چچا، ماموں اور بڑے بھائی جیسے محترم رشتوں سے منسوب ہو۔ بایں ہمہ دولت کی محبت نے تمہیں ایسا اندھا کر رکھا ہے کہ تمہیں سارے رشتے بھول جاتے ہیں اور دولت کی ہوس تم پر غالب آ جاتی ہے۔ ویسے بھی دورِ جاہلیت میں وراثت کا ضابطہ جیسا بھی ہو لیکن ان کی روایت یہ تھی کہ وہ وراثت میں صرف اس بیٹے کو حصہ دیتے تھے جو کمانے، لڑنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہو چکا ہوتا۔ لڑکیوں کو وراثت کے قابل نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سے مرنے والے کی وراثت میں حصہ صرف وہ لے سکتا تھا جو زور و اثر رکھتا ہو، ورنہ ہرگز نہیں۔ اور اس ساری خرابی کی بنیاد یہ تھی کہ تم مال سے بے انتہاء محبت رکھتے تھے۔ انسانیت، شرافت، عدل اور رحم جیسی جتنی اقدار بھی ہیں وہ سب اس کے نیچے دب کر دم توڑ چکی تھیں۔

كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾
وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۚ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ ﴿٢٣﴾
يَقُولُ يَٰلَيْتَنِى قَدَّمْتُ لِحَيَاتِى ﴿٢٤﴾

(ہرگز نہیں! جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی۔ ۲۱) اور آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے۔ ۲۲) اور جہنم اس روز سامنے لے آئی جائے گی، اس دن انسان سوچے گا مگر اس وقت اس کے سوچنے کا کیا حاصل؟ ۲۳) وہ کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی کیلئے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا۔ ۲۴)

Marfat.com

مال کے پرستاروں کو تنبیہ

مال ہی کو سب کچھ سمجھنے والوں، اور اسے زندگی کا حاصل سمجھنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم نے اپنی زندگی کے جو طور اطوار اختیار کر رکھے ہیں اور تم جس طرح شب و روز لہو و لعب اور منکرات میں زندگی گزار رہے ہو اور جزاء و سزا سے غافل ہو کر تم نے زندگی کو جس ڈگر پر ڈال رکھا ہے یہ سب کچھ ہمیشہ نہیں رہے گا، یہ تمہاری خیالی جنت ایک دن فنا ہو جائے گی۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ہر چیز نیست و نابود کر دی جائے گی۔ جس زمین پر تم درانہ وار چل پھر رہے ہو اسے توڑ پھوڑ کر اس کے تمام نشیب و فراز اور اونچ نیچ برابر کر دیئے جائیں گے۔ میدانِ حشر برپا ہوگا، عدالت قائم ہوگی۔ اب تک پروردگار نے پسِ پردہ بیٹھ کر انسانوں کے معاملات دیکھے اور محفوظ کئے تھے۔ اب وہ اپنے فرشتوں کے جلو میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوگا۔ آج جو لوگ آخرت کا انکار کر رہے ہیں اس دن انہیں بھی سمجھ آ جائے گی کہ ہم ایک حقیقت کا انکار کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب اس اعتراف اور نصیحت حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس دن ہر شخص نہایت حسرت اور ندامت کے ساتھ یہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی زندگی کیلئے کچھ اچھے اعمال کا ذخیرہ کر رکھا ہوتا تو آج میرے کام آتا۔ لیکن یہ سب باتیں اس دن حسرت و ندامت کا باعث بننے کے سوا اور کسی کام نہ آئیں گی۔ کیونکہ عمل کی مہلت ختم ہو چکی، دار العمل سے دار الجزاء کا دور شروع ہو گیا اب کسی چیز کی تلافی ممکن نہیں۔

یہ جو فرمایا گیا کہ پروردگار اس دن فرشتوں کے جلو میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا اور جہنم کو قریب لایا جائے گا۔ ان تمام باتوں کا تعلق احوالِ آخرت سے ہے جس کی تفصیلات متشابہات میں داخل ہیں۔ جن کی تاویل کو جاننے کے درپے ہونا فتنہ میں پڑنا ہے۔ لیکن ان پر اجمالی ایمان لانا ضروری ہے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾

(پھر اس دن نہ اس کا سا کوئی عذاب دے سکتا ہے۔ ۲۵) اور نہ اس کا سا باندھنا کوئی باندھ سکتا ہے۔ ۲۶)

گزشتہ آیات میں آخرت کے جس دن کا ذکر کیا گیا ہے پیشِ نظر آیات میں اس دن کے عذاب کی شدت اور بے پناہی کا بیان ہے۔ انسانوں کے ذہنوں میں یقیناً ہر چیز کا وہی تصور ہوتا ہے جو اس کے تجربے نے دکھایا یا جسے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تو دنیا میں انسان جس طرح کی تکلیفیں دیکھتا ہے اور جس طرح کی سزاؤں کا تصور رکھتا ہے اس کے بارے میں اسے یہ یقین ہے کہ وہ سزائیں فانی ہوتی ہیں، ابدی نہیں ہوتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی شدت میں بھی کمی آ جاتی ہے۔ اور اگر کوئی سزا زندگی بھر کیلئے ہے تو موت کا ایک حملہ اسے ختم کر دیتا ہے۔ لیکن آخرت کی سزائیں ان سے بالکل مختلف ہوں گی۔ نہ مرورِ ایام کا ان پر اثر پڑے گا، نہ کبھی ان پر کہنگی کی گرد جمے گی اور نہ ان کی شدت میں کمی آئے گی، عذاب میں مبتلا شخص موت مانگے گا، اسے موت کبھی نہیں آئے گی۔ پروردگار اس طرح کا باندھنا باندھے گا کہ جس میں صرف بیرونی دنیا سے تعلق ہی منقطع نہیں ہوگا بلکہ خیالات اور تصورات اور احساسات تک سے علاقہ ٹوٹ جائے گا۔ کاش دنیا میں آدمی ایسے ہولناک تصور کا یقین پیدا کر لے تو وہ اس طرح کی زندگی گزارنے سے بچ سکتا ہے جو اسے اس عذاب میں مبتلا کر سکتی ہے۔

Marfat.com

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ
عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾

(اے نفسِ مطمئن!۔ ۲۷) چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ ۲۸) شامل ہو جا میرے بندوں میں۔ ۲۹) اور داخل ہو جا میری بہشت میں۔ ۳۰)

اللہ تعالیٰ کے دین پر مکمل ایمان اور تقویٰ رکھنے والوں کو براہِ راست بشارت

اس سے پہلے کی آیات میں ان کفار کا حال بیان ہوا ہے کہ وہ اس قدر تنگ ظرف اور تھڑدلے واقع ہوئے ہیں کہ جب ان کو اللہ تعالیٰ نے نعمت عطا فرمائی وہ بہک گئے اور اترانے اور فخر کرنے لگے۔ اور جب ذرا تنگی آئی تو دل شکستہ ہو کر بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ سے شکایت کرنے لگے۔ ان کا انجام جہنم ہے جسے بیان کیا گیا۔ اب ان کے بالکل مقابل ان لوگوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے جو کسی شک وشبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے رب پر ایمان لائے۔ انبیاء کے لائے ہوئے دینِ حق کو اپنا دین قرار دیا۔ حالات کیسے بھی رہے ہوں وہ جادۂ حق سے کبھی برگشتہ نہ ہوئے۔ جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے ملا اسے سراسر حق مانا، نعمت ملی تو اس کا شکر ادا کیا، تنگی اور ترشی سے واسطہ پڑا تو صبر کی تصویر بن گئے، اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کیلئے ہر قسم کی قربانی پیش کی، ہر طرح کے عسر و یسر اور نرمی اور سختی میں اپنے رب سے راضی اور مطمئن اور صابر اور شاکر رہ کر زندگی گزاری۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے ہر شخص کا نفس، نفسِ مطمئنہ ہے۔ یعنی جو ہر حال میں اپنے رب سے راضی اور مطمئن ہے۔ جب موت کا وقت آئے گا تو روح قبض کرنے والے فرشتے، اور اسی طرح جب وہ میدانِ حشر میں آئیں گے تو حشر میں استقبال کرنے والے فرشتے، اور جب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی عدالت کے ذمہ دار فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے اور انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہیں گے کہ اے نفسِ مطمئن اپنے رب کی طرف چل، کہ تو زندگی بھر اس سے راضی رہا، آج اس کا انعام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہونے کی نوید سنا رہا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئے گی کہ اے میرے بندے اب تو میرے خاص بندوں کے زمرے میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

(۹۰)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام البَلَدِ ہے۔ یہ لفظ اس کی پہلی آیت میں مذکور ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، بیس آیتیں، بیاسی کلمے، تین سو بیس حروف ہیں۔

مقامِ نزول اور زمانہ نزول:۔ یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اور اس کی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب کفارِ مکہ رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں پوری طرح کھل گئے تھے۔ اور انہوں نے آپ ؐ کیخلاف ہر ظلم وزیادتی کو اپنے لئے حلال کرلیا تھا۔ اور آنحضرت ﷺ نے بھی اشرافِ قریش کے کردار کی خرابیوں پر تنقید کرنا شروع کردی تھی۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے ''لا'' کہہ کر ان غلط خیالات کی تردید کی گئی ہے جن میں اس وقت لوگ مبتلا تھے۔ ان کی زندگیوں پر حُبِ مال اور حُبِ جاہ کی حکومت تھی۔ جب انہیں مال وجاہ کی نعمت ملتی تو وہ اس کو اپنی تدبیر وتدبر کا کرشمہ سمجھ کر اس پر اتراتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بلند مرتبہ ہیں۔ اور اگر ان سے یہ نعمت چھن جاتی تو یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ذلیل کردیا ہے۔ اس لئے دولت ورفاہیت ہم سے واپس لے لی گئی ہے۔ ''حرف لا'' سے ان کے غلط خیالات کی تردید کی گئی ہے اور پھر قسموں کے ذریعے سے دنیا میں انسان کی اور انسان کیلئے دنیا کی صحیح حیثیت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ انسان کو دنیا میں عیش وآرام کرنے کیلئے نہیں بھیجا گیا بلکہ اس کی زندگی نہایت مشقت کی زندگی ہے۔ ماں کے پیٹ میں استقرارِ حمل سے لے کر درجہ بدرجہ انسان کی صورت اختیار کرنے، پھر دنیا میں آنے اور پھر عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مسلسل اپنی محنت سے وسائلِ زندگی فراہم کرنے اور اپنے مسائل کو حل کرنے کی مسلسل ایک تگ ودو ہے جس سے انسان گزرتا ہے۔ پھر اس پر سرزمینِ حرم اور بنی اسماعیل کی ابتدائی تاریخ سے شہادت مہیا کی گئی ہے۔

یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے سعادت اور شقاوت کے دونوں راستے کھول دیئے ہیں۔ انہیں دیکھنے اور ان پر چلنے کیلئے وسائل بھی فراہم کردیئے ہیں۔ اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لئے اپنے فضل و احسان سے نوازا ہے تاکہ وہ اس کا شکرگزار ہو اور اس کے غریب بندوں کیلئے ہمدرد و مددگار بنے۔ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جائے تو وہ انفاق کرنے کی بجائے نام و نمود اور شہرت کیلئے ڈھیروں مال اڑا دیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ گویا اس کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شہ خرچیوں کو دیکھتا نہیں۔ اس طرح سے وہ کسی بالاتر طاقت کا استحضار نہیں رکھتا جو اس پر ہر طرح کی قدرت رکھتا ہو۔

پھر ان زر پرستوں کو ملامت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آنکھیں دی تھیں کہ ان سے عبرت حاصل کرتے، زبان اور ہونٹ دیتے تھے کہ ان سے لوگوں کو یتیموں اور مسکین کی اعانت پر ابھارتے، نیکی اور بدی کا امتیاز دیا تھا کہ بدی کی ترغیبات کا مقابلہ کر کے نیکی کا کام کرتے، یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرتے، لیکن وہ یہ سب کچھ پا کر اپنے رب کا شکرگزار بننے کی بجائے اپنے نفس اور مال کے پرستار بن کر رہ گئے۔

انسان کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ وہ ہے جو اخلاق کی پستیوں کی طرف جاتا ہے اور دوسرا راستہ اخلاق کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے جو ایک دشوار گزار گھاٹی کی طرح ہے کہ اس پر چلنے کیلئے آدمی کو اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اس گھاٹی پر چڑھنے کی بہ نسبت کھڈ میں لڑھکنے کو ترجیح دیتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے گھاٹی کی وضاحت فرمائی ہے جس سے گزر کر آدمی بلندی کی طرف جا سکتا ہے۔ اس مقصد کیلئے جو اعمالِ حسنہ ناگزیر ہیں ان کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ مثلاً غلاموں کو آزاد کرنا، قحط سالی کے دنوں میں فاقہ زدہ لوگوں کی خوراک کا اہتمام کرنا، یتیموں اور مسکینوں پر شفقت کرنا، اس کے ساتھ ساتھ ایمان کے چراغ کو روشن رکھنا، خود صبر کرنا اور دوسروں کو صبر اور ہمدردی کی تلقین کرنا۔ یہ وہ اعمال ہیں جن کے ذریعے انسان اپنی منزل پا لیتا ہے۔ لیکن جو غریبوں کی مادی ضروریات کو استطاعت کے باوجود پورا کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا وہ جہنم کا ایندھن بن کے رہے گا۔

Marfat.com

اٰیَاتُهَا ٢٠	سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّیَّةٌ (٩٠)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿١﴾ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿٢﴾ وَوَالِدٍ
وَّمَا وَلَدَ ﴿٣﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ﴿٤﴾ اَیَحْسَبُ اَنْ
لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ﴿٥﴾ یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ﴿٦﴾
اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ﴿٧﴾ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ ﴿٨﴾ وَلِسَانًا
وَّشَفَتَیْنِ ﴿٩﴾ وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ ﴿١٠﴾ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾ وَمَآ
اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ
مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾ ثُمَّ
كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا
بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ﴿١٨﴾ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا
بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿١٩﴾ عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٢٠﴾

رکوع: ا۔ (نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ ۱) اس حال میں کہ آپ کو اس شہر میں حلال کرلیا گیا ہے۔ ۲) اور قسم ہے باپ کی اور اس کی ذرّیت کی۔ ۳) ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ ۴) کیا وہ یہ گمان رکھتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پاسکے گا۔ ۵) کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال اڑادیا۔ ۶) کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے

Marfat.com

نہیں دیکھا۔ ۷) کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ ۸) اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے۔ ۹) اور دونوں نمایاں راستے اسے نہیں دکھا دیئے۔ ۱۰) پس وہ داخل ہی نہیں ہوا عملِ خیر کی دشوار گھاٹی میں۔ ۱۱) اور آپ کیا سمجھے کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔ ۱۲) غلامی سے گردن چھڑانا۔ ۱۳) یا کھانا کھلانا بھوک کے دن میں۔ ۱۴) کسی قریبی یتیم کو۔ ۱۵) یا خاک نشین مسکین کو۔ ۱۶) پھر وہ ایمان والوں میں سے ہو جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کی۔ ۱۷) یہی خوش بخت لوگ ہیں۔ ۱۸) اور جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا وہ کم بختی والے ہیں۔ ۱۹) ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی۔ ۲۰)

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۱

(نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ ۱)

قسم سے پہلے ''لا'' کا مفہوم اور قسم کی وضاحت

آیت کے آغاز میں ''لا'' قسم کا حصہ نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے مخاطب لوگ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے جواب میں جس طرح اپنے آپ کو برسرِ حق قرار دیتے تھے اور اپنے طرزِ عمل کے صحیح ہونے کی جو توجیہ کرتے تھے اور اپنی مادہ پرستی کی روش کو جس طرح حق بجانب ٹھہراتے تھے اور دولت و رفاہیت کو جس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند اور کامیابی کی علامت قرار دے رکھا تھا اور اس کے مقابلے میں آنحضرت ﷺ کی باتوں کا جس طرح مذاق اڑاتے تھے، ان تمام باتوں کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ بالکل غلط ہے۔ بات وہ نہیں جو تم نے سمجھ رکھی ہے بلکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ پھر مختلف قسموں سے اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے۔ سب سے پہلی قسم اس شہر یعنی مکہ معظمہ کی کھائی گئی۔ مکہ معظمہ کی قسم کھانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ مکہ اس شہر کا پس منظر اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ یہ لق و دق صحرا تھا اور بے آب و گیا وادی تھی جہاں زندگی کے آثار ڈھونڈے سے نہیں ملتے تھے۔ لیکن انہیں سنسان پہاڑوں کے درمیان حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ایک بیوی اور شیر خوار بچے کو لا کر بے سہارا چھوڑا اور پھر کس طرح شیر خوار بچے کے پاؤں کے نیچے سے زمزم کا سوتا پھوٹا۔ پھر کس طرح حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے یہاں اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کیا اور اس حال میں حج کی منادی کی کہ دور دور تک اس منادی کو کوئی سننے والا نہ تھا۔ پھر کس طرح یہ شہر عرب کا مرکز بنا۔ اور آہستہ آہستہ بہت بڑی آبادی کی صورت اختیار کر گیا۔ اور ایسا حرم قرار پایا کہ صدہا برس تک عرب کی سرزمینِ بے آئین میں اس کے سوا کوئی امن کی جگہ نہ تھی۔ کیا اس شہر کی یہ تاریخ تمہارے طرزِ عمل کو غلط ثابت کرنے کیلئے کافی نہیں۔

وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۲

(اس حال میں کہ آپ کو اس شہر میں حلال کر لیا گیا ہے۔ ۲)

Marfat.com

آیت کے مختلف مفاہیم اور جوابِ قسم کے مناسب مفہوم

مفسرین نے اس کے تین مفہوم بیان کئے ہیں۔ایک یہ کہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں۔یعنی اس شہر کی تاریخ جاننے کیلئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔آپ اور دیگر قریش جو یہاں کے رہنے والے ہیں سب جانتے ہیں کہ اس شہر کی تاریخ کیا ہے۔اس شہر کی تاریخ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس شہر کی معاشرتی، معاشی اور روحانی حالت کن مراحل سے گزری ہے۔اور یہاں کے رہنے والے کیسے حالات سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔اس سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ مقسم علیہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ کس قدر صحیح ہے۔دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ یہ شہر اگرچہ حرم ہے اور حرم میں لڑنا اور کسی کو قتل کرنا یکسر حرام ہے۔حتیٰ کے باپ کے قاتل کو بھی یہاں پکڑا نہیں جاسکتا۔لیکن ایک وقت آئے گا جب کچھ دیر کیلئے یہاں جنگ کرنا اور دشمنانِ دین کو قتل کرنا آپ کیلئے حلال ہو جائے گا۔اور تیسرا معنی یہ ہے کہ اس شہر کے حرم ہونے کی وجہ سے جنگل کے جانور تک یہاں مامون ہیں۔کسی جانور کو مارنا اور درختوں تک کو کاٹنا اہلِ عرب کے نزدیک حرام ہے۔اور ہر ایک کو یہاں امن میسر ہے۔لیکن حال یہ ہے کہ اے پیغمبر! آپ کو یہاں امن نصیب نہیں۔آپ کو ستانے کی ہر وقت کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔حتیٰ کہ آپ کے قتل کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔گویا آپ کو یہاں حلال کرلیا گیا ہے۔الفاظ میں اگرچہ ان تینوں معنوں کی گنجائش ہے لیکن جب ہم جوابِ قسم پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دونوں معنی اس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔اور تیسرا مفہوم قسموں سے مطابقت رکھتا ہے۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾

(اور قسم ہے باپ کی اور اس کی ذرّیت کی۔ ۳)

جوابِ قسم میں چونکہ انسان کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لحاظ سے یہ قرینہ ہے اس بات پر کہ یہاں والد سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔اور ما ولد سے مراد وہ تمام انسان ہیں جو نسلِ آدم سے پیدا ہوئے۔جو اس سے پہلے دنیا میں موجود تھے، آج موجود ہیں اور قیامت تک پائے جائیں گے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾

(ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ ۴)

یہ جوابِ قسم ہے اس کی وضاحت

یہ جوابِ قسم ہے۔ كَبَدٍ کا معنی مشقت اور شدت کے ہیں۔آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اس دنیا میں انسان کو آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے اور چین کی بنسری بجانے کیلئے نہیں بھیجا بلکہ ہم نے اسے مشقت میں پیدا کیا ہے۔یعنی اس کی زندگی کا سفینہ طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے بنایا گیا ہے۔خطرات و مصائب اور اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ذرا غور کرو کہ جس شہر میں تم رہ رہے ہو اس شہر کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ کے ایک بندے نے اپنی بیوی اور اکلوتے بچے کو وادیٔ غیر ذی ذرع میں ٹھہرایا۔پھر کس طرح یہ شہر بسا

Marfat.com

اور پھر کیسے اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعمیر ہوئی۔ جو لوگ یہاں آباد ہوئے ان کی زندگی کیسی خانہ بدوشانہ اور مشقت کی تھی اور معاش کا انحصار غلہ بانی پر تھا۔ نہ یہاں زندگی کے امکانات وافر تھے اور نہ حفاظت کا کوئی انتظام تھا۔ کوئی نظام اور کوئی قانون موجود نہ تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کے دو عظیم پیغمبروں کی محنت سے اللہ تعالیٰ کا یہ گھر مرکزِ توحید بنا اور ان کی دعاؤں کی قبولیت کے ثمرے میں امن بھی ملا، تجارت کی راہیں بھی کھلیں اور ان کی معاشی حالت رفاہیت اور خوشحالی میں تبدیل ہوگئی۔ تو گویا اس گھر کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان کو ناموافق حالات سے لڑنے کیلئے پیدا کیا گیا اور اس کی زندگی مشقت کی زندگی ہے۔

اسی طرح آج تم دیکھ رہے ہو کہ اسی شہر مکہ میں محمد ﷺ کس طرح صعوبتیں اٹھا کر اور مصیبتیں برداشت کر کے لوگوں کو ان کے مقصدِ زندگی سے آشنا کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ لیکن اس کے جواب میں وہ جس مشقت سے گزر رہے ہیں اسے بھی تم جانتے ہو۔ جنگل کے جانوروں کیلئے یہاں امان ہے مگر ان کیلئے نہیں۔ ان کے مال، ان کے احترام اور ان کی زندگی تک کو خطرات میں ڈال دیا گیا ہے۔

اسی طرح نسلِ آدم کے ایک ایک فرد کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کی آخری سانس تک اس بات پر گواہ ہے کہ اس کو قدم قدم پر تکلیف، مشقت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب تک وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس کی زندگی ہر وقت خطرات کی زد میں ہوتی ہے۔ زچگی کے وقت اس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ پیدا ہوتا ہے تو اتنا بے بس کہ کوئی سنبھالنے والا نہ ہو تو سسک سسک کر مر جائے۔ بچپن دوسروں کے سہارے گزرتا ہے، پھر لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے تک ہر تغیر اپنے ساتھ خطرات کی ایک دنیا لے کے آتا ہے۔ عملی زندگی میں چاہے وہ کتنا بڑا آدمی بھی بن جائے اس کی زندگی خطرات سے محفوظ نہیں ہوتی۔ بادشاہ ہے تو سازش کے اندیشوں میں مبتلا رہتا ہے۔ جرنیل ہے تو اپنے ہی سپہ سالاروں کی بغاوت کا دھڑکا لگا رہتا ہے، بڑے سے بڑا دولت مند بھی دولت لٹ جانے اور اس کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ غرضیکہ زندگی کا ہر مرحلہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انسان کو مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا انسان جسے قدم قدم پر ناموافق صورتحال سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کی زندگی کا کارواں کسی وقت بھی لٹ جانے سے مامون نہیں ہوتا کیا اس کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ کسی گھمنڈ میں مبتلا ہو اور یہ سمجھے کہ میں اپنی زندگی کے فیصلے کرنے میں مکمل اختیارات رکھتا ہوں۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝٥

(کیا وہ یہ گمان رکھتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا۔ ۵)

یعنی جو انسان اس قدر مشقتوں میں گھرا ہوا، اس قدر تغیرات میں محصور اور اس قدر ارادوں کی بجا آوری میں کمزوریوں کا شکار ہے، کیا اسے یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ یہ گمان کرے کہ اس پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا اور کوئی اس کا سر نیچا کرنے والا نہیں۔ حالانکہ وہ قدم قدم پر دیکھ رہا ہے کہ اس کی تقدیر پر کسی اور کی فرمانروائی ہے۔ زلزلے کا ایک جھٹکا، ہوا کا ایک طوفان اور سیلاب کا ایک ریلا اسے یہ بتا دینے کیلئے کافی ہے کہ وہ اپنی سرکشی کے باوجود حقیقت میں کتنا کمزور ہے۔ بڑے سے بڑے حکمران کو حالات کی ایک لہر عرش سے فرش پر گرا دیتی ہے۔ بڑا تنومند انسان ایک حادثے میں اپاہج ہو جاتا ہے، عاد و ثمود جیسی ترقی یافتہ قومیں اللہ تعالیٰ کے لشکروں کے مقابلے میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ اس نے نہ جانے یہ کیسے سمجھ لیا ہے کہ کوئی اس پر قابو نہیں پا سکتا۔

Marfat.com

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝٦

(کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ ٦)

انسان کی مزید کج فہمی

جس طرح اس سے پہلے کی آیتِ کریمہ میں اس کی کج فہمی کو واشگاف کرتے ہوئے فرمایا کہ باوجود اس کے کہ وہ تغیرات اور مصائب میں گھرا ہوا ہے لیکن پھر بھی یہ سمجھتا ہے کہ کوئی اس پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اس کی مزید کج فہمی کی دلیل یہ ہے کہ اسے خوب معلوم ہے کہ مال جن اعضاء و جوارح اور جن صلاحیتوں کی مدد سے اور ذہن کی جن توانائیوں کے نتیجے میں کمایا جاتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی دَین ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کو نہ اس نے پیدا کیا اور نہ اس کا مالک ہے۔ اس کے باوجود بر خود غلط ہونے کا حال یہ ہے کہ بجائے اس مال و دولت کو امانت سمجھنے کے اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور اس کو بے دریغ لٹاتا ہے گویا خزف ریزوں کا ڈھیر اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔ آیت میں جو تعبیر اختیار کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرے پاس اس قدر بے پایاں دولت ہے کہ اس کے مقابلے میں جو ڈھیروں مال میں نے خرچ کیا ہے بلکہ اڑایا ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور نہ اسے یہ پرواہ ہے کہ جن مصارف میں، میں نے یہ مال خرچ کیا ہے ان مصارف کی حقیقت کیا ہے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے پیشِ نظر دولت کی نمائش اور اپنی بڑائی کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ تعریف کرنے والوں کو بے دریغ نوازنا، شادی اور غمی کی رسموں میں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا، اور مختلف طریقوں سے شان و شوکت کا اظہار کرنا صرف اس لئے ہوتا ہے تاکہ لوگوں میں ان کی تعریفوں کے ڈنکے بجیں اور ہر طرف ان کی شہ خرچیوں کے چرچے ہوں۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝٧

(کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ ٧)

شیخی بگھارنے والوں کا محاسبہ

ایسے شیخی بگھارنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ کیا یہ شخص گمان کرتا ہے کہ اسے اس طرح مال اڑاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ یعنی اس کا خیال یہ ہے کہ اوپر کوئی خدا نہیں۔ حالانکہ وہ جانتا ہے اور اس کی زندگی کا ہر مرحلہ گواہی دیتا ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حصار میں ہے۔ جا بجا اس کی قدرتوں کی نشانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی دی ہوئی امانت میں کس طرح خیانت کی جا رہی ہے اور اس کے عطا کردہ اعضاء و جوارح اور ذہنی رعنائیوں کو کس طرح غلط کاموں میں کھپایا جا رہا ہے۔ وہ نیتوں کا حال بھی جانتا ہے اور جن مقاصد کے تحت یہ دولت خرچ کی جا رہی ہے وہ بھی اس سے مخفی نہیں۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے گرد و پیش میں صدہا غریب و مسکین ضروریاتِ زندگی کیلئے ترستے رہے اور تم اپنے نام و نمود کیلئے دولت کو لٹاتے رہے۔

Marfat.com

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿٨﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿٩﴾ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾

(کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ ۸) اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے۔ ۹)
اور دونوں نمایاں راستے اسے نہیں دکھا دیئے۔ ۱۰)

نعمتوں کا صحیح مصرف

یہ کم ظرف لوگ جو مال و دولت پا کر اسی کے ہو کر رہ گئے حالانکہ ہم نے انہیں اس سے بھی بڑی نعمتیں عطا فرمائیں۔ اگر یہ ان کے قدردان ہوتے تو مال و دولت کی ہوس میں پڑ کر اپنی راہ کھوٹی نہ کر لیتے۔ اگر انہیں ذرا بھی احساس ہوتا تو وہ اسی مال و دولت کے ذریعے سے اپنی آخرت سنوار سکتے تھے۔ فرمایا کہ کیا ہم نے ان کو دو آنکھیں عطا نہیں کیں تاکہ وہ اپنے گرد و پیش میں معاشرے کے ضرورتمندوں کو دیکھ سکیں، بے نوا اور بے کس لوگوں کے حالات کا جائزہ لے سکیں اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق سے ان کی مدد کر سکیں۔ لیکن جو شخص ان آنکھوں کو گائے بھینس کی آنکھوں کی طرح سمجھتا ہے جو صرف پانی اور چارے کو دیکھتی ہیں وہ تو یقیناً دولت ہی کو ان آنکھوں سے دیکھے گا۔ لیکن جو ان آنکھوں کو علم اور عقل کے ذرائع میں سے اہم ترین ذرائع سمجھتے اور انہیں حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو وہ یقیناً ان کے ذریعے سے صحیح اور غلط اور اچھائی اور برائی میں فرق کر سکتے ہیں۔ وہ انہیں آنکھوں سے عبرت نگاہی اور اثر پذیری کا کام لے سکتے اور ان لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آنکھیں نہیں دیں اور اس طرح سے شکر گزاری کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔

مزید فرمایا کہ ہم نے انسان کو ایک زبان اور دو ہونٹ بھی عنایت فرمائے تاکہ وہ جو کچھ دیکھے اور محسوس کرے اس پر خود بھی عمل پیرا ہو اور اپنی زبان سے دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دے۔ کیونکہ انسان کو صرف نیکی کرنے کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ اس کی یہ ذمہ داری بھی ٹھہرائی گئی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی اس پر مائل کرنے کی کوشش کرے۔ اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو اس کی نیکی ادھوری رہ جائے گی۔ زبان اور ہونٹوں سے جس طرح بولنے کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح کھانے اور پینے کی خدمت بھی لی جاتی ہے۔ لیکن یہ ضمنی خدمتیں ہیں زبان کا اصل کام جس نے اس کو سب سے بڑھ کر اہمیت دی ہے وہ اظہارِ مافی الضمیر ہے۔ تبلیغ و دعوت اور بھلائی کی اشاعت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، دلجوئی اور دلدہی ہے، خیر خواہی اور ہمدردی ہے۔ اس جامعیت کی وجہ سے اسے اللہ تعالیٰ نے دو ہونٹوں کی حفاظت میں رکھا ہے۔ کیونکہ جو چیز جتنی ہی قیمتی، جتنی ہی اثر آفرین اور جتنے ہی گہرے اور دور رس نتائج پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ اتنی ہی احتیاط سے محفوظ کی جاتی ہے۔ اور اس کے استعمال میں نہایت ذمہ داری کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ زبان بھی ایک شمشیرِ جوہردار کی طرح ہے۔ اس لئے قدرت نے اس کو میان میں چھپا کر انسان کو پکڑا دیا ہے تاکہ وہ اس کو وہیں میان سے باہر نکالے جہاں وہ ضرورت پیش آئے۔

مزید فرمایا کہ ہم نے انسان کو محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے بلکہ مشاہدہ و شعور اور نطق و بیان کی صلاحیت دینے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان پر یہ فضل بھی فرمایا کہ اس کو دونوں راستے بھی دکھا دیئے۔ یعنی اس کے سامنے بھلائی اور برائی اور نیکی اور بدی کے دونوں راستے نمایاں کر دیئے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کرے۔ چنانچہ

Marfat.com

یہی بات سورۃ الدہر میں ان الفاظ میں فرمائی گئی اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ''ہم نے اس کو راہ بھی دکھا دی چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا ناشکرا بنے۔'' حضرت قتادہؓ نبی کریم علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ ارشاد فرمایا کرتے تھے یاایھاالناس انما ھما النجدان نجدالخیر ونجدالشر فلم تجعل نجدالشر احب الیک من نجدالخیر۔ (قرطبی) ''اے لوگو تمہارے لئے دو راستے ہیں ایک بھلائی کا راستہ، ایک برائی کا راستہ، پس تم کیوں برائی کے راستے کو نیکی کے راستے سے زیادہ پسند کرتے ہو۔''

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾

(پس وہ داخل ہی نہیں ہوا عملِ خیر کی دشوار گھاٹی میں۔ ۱۱) اور آپ کیا سمجھے کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔ ۱۲)

اِقْتَحَمَ، اس کا مصدر ہے اِقْتِحَامَ۔ اس کا معنی ہے اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقت طلب کام میں ڈالنا۔ چڑھائی چڑھنے یا کوئی مشکل کام کرنے کو بھی اِقْتِحَام کہتے ہیں۔

اَلْعَقَبَة کے معنی گھاٹی کے بھی ہیں اور اس دشوار گزار راستے کے بھی جو بلندی پر جانے کیلئے پہاڑوں میں سے گزرتا ہے۔

نعمتوں کی ناقدری پر افسوس کا اظہار

آیت کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعور وادراک نطق وبیان اور ہدایت کی روشنی سے نوازا۔ تو اس کا حق یہ تھا کہ یہ جھوٹی ناموری حاصل کرنے کیلئے اپنی دولت کو یوں نہ لٹاتے، بلکہ جب ان کے سامنے بھلائی اور برائی کے راستے واضح کردیئے گئے تو وہ اس حقیقی راستے پر چلتے جو حقیقی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ اگرچہ وہ راستہ کٹھن ہے اور اس کو طے کرنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن یہ اپنی زر پرستی اور پست ہمتی کے سبب سے یہ حوصلہ نہ کرسکے۔ بلکہ ان کا مال ان کیلئے زنجیرِ پا بن گیا۔ کیونکہ مال کی محبت پر قابو پانا اور اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے اور شیطان کی ترغیبات سے لڑ کر چلنا ایک مشکل کام ہے۔ اور نفس کی ترغیبات کے مطابق چلنا ایک آسان راستہ ہے۔ اس لئے لوگوں نے آسان راستہ اختیار کرکے نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ یہ پستیوں کی طرف لڑھکتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنے بھی اعلیٰ کام ہیں وہ سب ایثار وقربانی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور اس کیلئے محنت اور کاوش سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور نفس کی نقد لذتوں سے منہ موڑ کر بالکل مختلف سمت میں چلنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے وہ بہت شاق گزرتے ہیں۔ اس کے برعکس ادنیٰ کاموں کی لذتیں نقد ہیں۔ اس وجہ سے نفس ان کی طرف فوراً چل پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو سیدنا مسیح علیہ السلام نے یوں واضح فرمایا ہے کہ ''نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے، اور بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں۔''

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ''آپ کیا جانیں کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔'' یہ بظاہر سوال ہے لیکن حقیقت میں ایک اسلوب ہے جو کسی چیز کی عظمت کو اجاگر کرنے یا اس کی ہولناکی کو نمایاں کرنے کیلئے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی مقصد قرآنِ کریم کے مخاطبوں کو یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور اس کی رضا کے حصول کیلئے چند رسوم کا ادا کردینا کافی نہیں بلکہ اس تک پہنچنے کیلئے گھاٹیاں سر کرنی پڑتی ہیں، ایثار وقربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر کوئی یہ مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہم بتاتے ہیں کہ اس کا طریقہ کیا ہے، اور وہ گھاٹیاں کون سی ہیں جنہیں سر کرنا ضروری ہے۔

Marfat.com

فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾

(غلامی سے گردن چھڑانا۔ ۱۳) یا کھانا کھلانا بھوک کے دن میں۔ ۱۴) کسی قریبی یتیم کو۔ ۱۵) یا خاک نشین مسکین کو۔ ۱۶)

چند مشکل الفاظ:۔ مَسْغَبَةٍ مصدر میمی ہے سَغَبَ سے۔یہ لفظ عام بھوک پر بھی بولا جاتا ہے لیکن امام راغب نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے هُوَ الْجُوْعُ مِنَ التَّعَبِ بھوک اور تھکن دونوں کے مجموعے کو مَسْغَبَةٍ کہتے ہیں۔یعنی ایسے دنوں میں کھانا کھلانا جب ہر طرف قحط کا دور دورہ ہو۔

مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ...... مَتْرَبَةٍ بھی مصدر میمی ہے۔یعنی جب وہ اتنا محتاج ہو جائے کہ مٹی کے ساتھ مل جائے۔

عقبہ کی وضاحت

ان آیات میں اس کٹھن راستہ کی تفصیل بتائی گئی ہے جس راستے پر انسان کو چلنا زیب دیتا ہے۔یہ راستہ اس راستے سے مختلف ہے جس راستے میں دولت لٹائی جاتی ہے۔ان میں سب سے پہلا مصرف جس میں مال خرچ کرنا انسان کیلئے باعثِ سعادت ہے۔لیکن اس میں نفس کیلئے کوئی لذت نہیں بلکہ آدمی کو اس کیلئے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار و قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔وہ مصرف یہ ہے کہ آدمی اپنی دولت کسی غلام کی آزادی میں صرف کرے۔یہ سورۃ چونکہ ان سورتوں میں سے ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئیں۔اس وقت دنیا بھر میں غلامی کا چرچا تھا اور غلاموں پر انتہائی مظالم ڈھائے جاتے تھے۔اس لئے اسلام نے اپنی دعوت کے بالکل ابتدائی دور ہی میں اس انسانی خدمت اور آزادی کو اپنی سرفہرست نیکیوں میں شامل کر لیا۔غلام کو آزاد کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ کسی غلام کو خرید کر آزاد کر دے۔اور ایک صورت یہ ہے کہ اگر وہ اپنے آقا سے مکاتبت کر چکا ہے تو وہ اس کی مالی مدد کرے تا کہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر سکے۔آج اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ غلامی باقی نہیں رہی۔لیکن آج بھی کتنے لوگ ہیں جو قرض کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں، کتنے ہاری اور مزارع ہیں جنہیں زمینداروں نے غلام بنا رکھا ہے اور کتنے ایسے بے کس لوگ ہیں جو سودی قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ایسے بے وسیلہ لوگوں کی مدد کرنا یہ بھی اسی میں شامل ہے۔دوسرا مصرف یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم،یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم کو کھانا کھلائے۔یتیم جس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے اس کی کسی طرح کی بھی مدد کرنا بہت اجر و ثواب کا باعث ہے۔یہاں کھانا کھلانے سے مراد صرف روٹی کے چند نوالے نہیں بلکہ ہر طرح کی ضروریات کی کفالت ہے۔اور اگر عام قحط سالی کا زمانہ ہو اور غذائی اجناس کی نایابی پریشان کن ہو، یا مہنگائی نے کمر توڑ دی ہو تو کھانا کھلانے یا دیگر ضروریات میں کفالت کرنے کا اجر و ثواب اور بڑھ جاتا ہے۔اور اگر یہ یتیم قریبی رشتہ دار بھی ہو تو ایسی صورت میں مدد کرنا دہرے ثواب کا باعث ہے۔اس میں ایک تو یتیم کے حق کی پاسداری ہے اور دوسرا حقِ قرابت کا لحاظ ہے۔آنحضرت ﷺ نے اس سلسے میں بہت فضائل بیان فرمائے ہیں۔

یتیم کی طرح مسکین کی مدد کرنا بھی عقبہ میں شامل ہے۔بالخصوص ایسے مسکین کو کھانا کھلانا جو خاک نشین ہو۔یعنی اس کی ضرورتوں نے اسے فاقہ کشی تک پہنچا دیا ہو اور اس کیلئے زمین سے اٹھنا مشکل ہو۔اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص بیوہ اور مسکین کی مدد کیلئے دوڑ دھوپ کرے وہ ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔

Marfat.com

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾

(پھر وہ ایمان والوں میں سے ہو جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کی۔ ۱۷)

عقبہ سر کرنے والوں کے مزید اوصاف

اللہ تعالیٰ جن کی نگاہوں میں عبرت نگاہی اور دلوں میں اثر پذیری پیدا کر دیتا ہے ان میں وہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جن کا اوپر کی آیات میں ذکر کیا گیا۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان اوصاف کا اعتبار اللہ تعالیٰ کے یہاں اس وقت ہوتا ہے جب ان کے ساتھ آدمی مومن بھی ہو۔ کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل، عملِ صالح نہیں بنتا، اور نہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جا بجا نیک اعمال کے ساتھ مومن ہونے کی شرط لگائی ہے۔ سورۂ نحل میں فرمایا مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ”جو شخص نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔“ بغیر ایمان کے عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی قدر و قیمت کا حامل نہیں چاہے وہ عمل کیسا ہی شاندار کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ملتا ہے اور وہی اس کی اتھارٹی ہے۔ جو شخص اسے تسلیم نہیں کرتا یا اس کے قانون کی اطاعت نہیں کرتا تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی ملک کی اتھارٹی اور اس کی حیثیت کو قبول کئے بغیر ملک میں رہ کر اچھے کام بھی انجام دے۔ تو اولاً تو ایسے شخص کو ملک میں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ ملک کی حیثیت کو قبول نہ کر کے شہری حقوق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے کسی دشمن نے کوئی اچھا کام کیا ہو۔ اسی طرح ایسے لوگوں کی دو مزید صفات بیان کی گئی ہیں جنہیں اسلامی معاشرے کی خصوصیات کہنا چاہئے۔ جن میں سے ایک صفت یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص راہِ حق میں پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کو نہ صرف خود برداشت کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اس پر صبر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ سنگدل نہیں ہوتے کہ ایک دوسرے کی تکلیفوں سے بے نیاز رہیں۔ بلکہ ان میں سے ہر فرد اپنے آپ کو امتِ اسلامیہ کا ایک ایسا غیر منفک حصہ سمجھتا ہے جس طرح جسم کے اعضاء ہوتے ہیں۔ ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں میں اگر مشرق کے بھائی کے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے تو مغرب میں بسنے والا کلمہ گو بیتاب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا باہمی رشتہ رحمت و شفقت کا ہے۔ گویا یہ لوگ رحمت و شفقت کی ایسی مضبوط لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ ہر نرمی اور سختی میں ایک دوسرے، ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کی باہمی ہم آہنگی اور ہم رنگی انہیں ایک ایسی سیسہ پلائی دیوار بنا دیتی ہے جو کبھی شکست نہیں ہوتی۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾

(یہی خوش بخت لوگ ہیں۔ ۱۸) اور جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا وہ کم بختی والے ہیں۔ ۱۹)
ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی۔ ۲۰)

Marfat.com

اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَةِ اور اَصۡحٰبُ الۡمَشۡئَمَةِ میں فرق

گزشتہ آیت میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے نفس کی ترغیبات، شیطان کے بہلاووں اور خواہشات کی پیروی سے منہ موڑ کر عَقَبَۃ پر چڑھنے کا فیصلہ کرلیا یعنی خیر اور نیکی کے اس راستے پر چل پڑے جو ایثار اور قربانی کا راستہ ہے اور انہوں نے اپنے دلوں کو ایمان کے نور سے منور بھی کرلیا اور اپنے اندر صبر اور ہمدردی جیسی صفات بھی پیدا کرلیں، تو یہ وہ لوگ ہیں جو خوش نصیب ہیں۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ نفس، شیطان اور خواہشات کی پیروی کرتے رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کمبختی والے ہیں۔ جن کا بخت سو گیا ہے اور جنہوں نے اپنی قسمت پھوڑ لی۔ قیامت کے دن ان کا حشر یہ ہوگا کہ ان کو آگ کی وادی میں پھینک کر دروازے بند کردیئے جائیں گے۔ مُؤْصَدَۃٌ کا معنی ہے مغلقۃ۔ اوصد الباب کا معنی ہے دروازہ بند کردیا۔ ان پر آگ بند کردی جائے گی۔ یعنی آگ کو روکنے والے دروازے بند کردیئے جائیں۔ یہ روئیں گے اور چیخیں گے، لیکن کوئی ان کی آواز سننے کو تیار نہ ہوگا۔ اور نہ انہیں نکلنے کیلئے کوئی راستہ ملے گا۔

الْمَیْمَنَۃِ ...... یمین سے بھی ہوسکتا ہے اور یُمن سے بھی۔ اگلی آیت میں چونکہ الْمَشْئَمَۃِ آرہا ہے جو شوم سے ہے جس کا معنی ہے نحوست اور بدبختی۔ اس کی مناسبت سے پہلی آیت میں لفظ میمنہ کو یُمن سے لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے ترجمے میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے ان خوش قسمت لوگوں کو جنہیں جنت میں بھیجا جانے والا ہوگا اصحاب الیمین قرار دیا ہے۔ اور اہلِ جہنم کو اصحاب الشمال کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نیکوں کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے اور بروں کے ان کے بائیں ہاتھ میں۔ تو دہنے ہاتھ میں اعمال نامے لینے والے خوش نصیب ہوں گے اور بائیں ہاتھ میں اعمال نامے لینے والے بدبخت اور محروم ہوں گے۔ اس لحاظ سے انجام اور مآل کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

صدق الله العظيم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ
کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

(۹۱)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الشَّمْسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الشَّمْسِ ہے جو اس سورۃ کا پہلا ہی لفظ ہے۔اس میں ایک رکوع، پندرہ آیتیں، چون کلمات اور دوسوسینتالیس حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ اس کے مضمون اور اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور قومِ ثمود کا انجام جس طرح ذکر فرمایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب رسول اللہ ﷺ کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔

مضامین:۔ سب سے پہلے آفاق کی چند نمایاں چیزوں کی قسمیں کھا کر یہ بتایا گیا ہے کہ ان عظیم مخلوقات کو دیکھو ان کے درمیان اضداد کا تخالف پایا جاتا ہے۔ان میں سے ہر چیز دوسرے کی ضد ہے۔سورج، چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور اپنے آثار ونتائج میں متضاد ہیں۔انہیں دیکھتے ہوئے یہ کائنات اضداد کی ایک رزم گاہ معلوم ہوتی ہے۔لیکن جب ہم ان کی فیض رسانی اور کارگزاری کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس کام کی انجام دہی میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہا ہے جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔زمین میں کاشتکار اگر غلہ اگانا چاہتا ہے تو جس طرح زمین اپنا سینہ اس کے سامنے پیش کر دیتی ہے اور اپنی روئیدگی کی تمام قوتوں کو اس کے حوالے کر دیتی ہے اسی طرح آسمان آبیاری کے وقت اپنی خدمات پیش کرنے میں پس وپیش نہیں کرتا۔اس کی گرمی غلے کو پکانے میں کوتاہی نہیں کرتی، چانداس میں نرمی اور گداز پیدا کرنے میں اپنا فرض ادا کرنا نہیں بھولتا۔اس طرح سے یہ اضداد باہم متضاد ہونے کے باوجود جس طرح ایک دوسرے سے توافق سے کام لیتے ہیں حالانکہ ان کی تخلیق میں تخالف شامل ہے۔اس سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ خالقِ کائنات نے جس عظیم مقصد کیلئے ان کو پیدا کیا ہے اس کے حکم اور قانون نے اس مقصد کی بجا آوری کیلئے ان کو باندھ رکھا ہے۔اور ان کی زندگی اور بقاء اسی میں رکھی گئی ہے کہ وہ اپنا فرض انجام دینے میں کوتاہی نہ کریں۔ورنہ یہ کارخانہ قدرت چشم زدن میں تباہ وبرباد ہوسکتا ہے۔

اس سے استشہاد کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ نفسِ انسانی کو بھی جسے عالمِ اصغر کہا جاتا ہے عالمِ اکبر ہی کی طرح خیر وشر کے متضاد داعیات ومحرکات دے کر پیدا کیا گیا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے خیر وشر میں امتیاز کی قوت بھی بخشی ہے اور خیر سے محبت اور شر سے نفرت کا ذوق بھی عطا فرمایا ہے۔اس کے مستقبل کا انحصار سورج، چانداور زمین کی طرح اس بات پر ہے کہ اس کے اندر تمیز ارادے اور فیصلے کی جو قوتیں اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہیں ان میں وہ عدمِ توازن نہ پیدا ہونے دیں۔شر کے داعیات کو خیر کے داعیات پر غلبہ نہ پانے دیں۔ورنہ جس طرح آسمانی کُرّے اپنے محور اور معمل سے تجاوز کر کے تباہی اور بربادی کا شکار ہوسکتے ہیں، اسی طرح انسان بھی اگر اس حد سے متجاوز ہوگا جو خالقِ کائنات نے اس کیلئے مقرر فرما دی ہے تو وہ اسے بھی تباہ وبرباد کر دے گا۔

Marfat.com

دلائلِ آفاق کی شہادت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق تاریخ سے بھی استدلال کیا ہے۔اس سلسلے میں اس نے قومِ ثمود کو پیش کیا ہے کیونکہ اہلِ عرب قومِ ثمود کی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے اس کی شوکت وصولت بھی ان کے علم میں تھی اور اس کے طعیان وفساد کا ذکر بھی ان کے لٹریچر میں موجود تھا۔اس واقعہ کے ضمن میں یہ بتایا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی کا جو الہامی علم انسانی فطرت میں رکھا گیا ہے وہ بجائے خود انسان کی ہدایت کیلئے کافی نہیں۔اس لئے اس کی تکمیل اور تسہیل کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور کتابیں بھیجتا ہے۔رسول کی بعثت کے بعد اس کی ذات اور اس کا پیغام قوم کی بقاء اور ہلاکت کیلئے فیصلہ کن بن جاتا ہے۔اگر اس کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو بچ جاتے ہیں اور اگر اس کی تکذیب کر کے اس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا عذاب انہیں تباہ و برباد کر دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو قومِ ثمود کی ہدایت کیلئے بھیجا۔ان کے مطالبہ کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام نے معجزہ دکھایا۔لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چٹان پھٹی اور اس سے ایک جیتی جاگتی اونٹنی نمودار ہوگئی۔پیغمبر نے انہیں تنبیہ کی کہ اگر تم نے اس اونٹنی کو نقصان پہنچایا تو تم باقی نہیں رہ سکو گے۔لیکن انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا، بجائے اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لانے اور ان کی تنبیہ پر توجہ دینے کے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے غضب کو چیلنج کیا۔جس کے نتیجے میں ساری قوم تباہ و برباد ہوگئی۔

قریش کو قومِ ثمود کا یہ واقعہ سنا کر ان کے سامنے آئینہ رکھ دیا گیا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی طرح آنحضرت ﷺ تمہاری طرف مبعوث ہو چکے ہیں اور تم ان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کر چکے ہو جو قومِ ثمود نے کیا تھا۔قدرت نے تمہیں مہلت دے رکھی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ تمہارا انجام بھی قومِ ثمود سے مختلف نہ ہوگا۔(یہ وہ بات ہے جو اس واقعہ سے خود بخود مترشح ہوتی ہے۔)

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ١٥	سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ (٩١)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝١ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلٰهَا ۝٢ وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا ۝٣
وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰهَا ۝٤ وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا ۝٥ وَالْأَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝٦
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝٧ فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝٨ قَدْ
أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝٩ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝١٠ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ
بِطَغْوٰهَا ۝١١ إِذِ انْبَعَثَ أَشْقٰهَا ۝١٢ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ
نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝١٣ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ
رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا ۝١٤ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝١٥

رکوع: ۱۔ (قسم ہے آفتاب کی اوراس کی دھوپ کی۔ ۱) اور چاند کی قسم جبکہ اس کے پیچھے آتا ہے۔ ۲) اور قسم ہے دن کی جب آفتاب کو روشن کردے۔ ۳) اور قسم ہے رات کی جب وہ اسے ڈھانک لے۔ ۴) اور قسم ہے آسمان کی اور جیسا کچھ اس کو بنایا۔ ۵) اور قسم ہے زمین کی اور جیسا کچھ اس کو بچھایا۔ ۶) اور قسم ہے نفس کی اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ ۷) پھر اس کے دل میں ڈال دی، اس کی نافرمانی اور اس کی پرہیزگاری۔ ۸) یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔ ۹) اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبادیا۔ ۱۰) ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ ۱۱) جبکہ اٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے زیادہ بدبخت۔ ۱۲) تو اللہ کے رسول نے ان لوگوں سے کہا کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری سے خبردار۔ ۱۳) مگر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں تو اللہ نے ان کے گناہ کی پاداش میں ان پر ایسی آفت توڑی کہ ان کا ستھراؤ کردیا۔ ۱۴) اور وہ نہیں ڈرتا ان کے تباہ کن انجام سے۔ ۱۵)

Marfat.com

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ﴿۱﴾

(قسم ہے آفتاب کی اور اس کی دھوپ کی۔ ۱)

قسموں کی وضاحت

ضُحٰی ...... امام مبرد کے نزدیک اس کی اصل الضِّحُّ ہے۔اس کا معنی ہے آفتاب کی روشنی۔ دوسری ''حا'' کو ''الف'' سے بدل دیا گیا ہے۔ (قرطبی)

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ سے اس کا یہ معنی نقل کیا ہے کہ اس سے سورج کی روشنی اور حرارت دونوں مراد ہیں۔اور روشنی کے ساتھ ساتھ حرارت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سورج بلند ہو جاتا ہے۔اسی لئے اس کا ترجمہ چاشت کا وقت بھی کیا جاتا ہے۔اور مزید یہ بات کہ چاشت کے وقت میں روشنی کے ساتھ حرارت اس وقت وجود میں آتی ہے جب دھوپ تیز ہوتی ہے۔اس لئے بعض اہلِ علم کے نزدیک اس کا ترجمہ دھوپ سے اگر کیا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ﴿۲﴾

(اور چاند کی قسم جبکہ اس کے پیچھے آتا ہے۔ ۲)

تیسری قسم چاند کی کھائی جا رہی ہے جب وہ سورج کے غروب ہونے کے بعد طلوع ہوتا ہے۔قمری مہینہ کے ابتدائی پندرہ دنوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔اِدھر سورج غروب ہوتا ہے اُدھر چاند نمودار ہو جاتا ہے۔اور آخری نصف میں چاند پہلے طلوع ہوتا ہے اور سورج اس کے بعد نمودار ہوتا ہے۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ﴿۳﴾

(اور قسم ہے دن کی جب آفتاب کو روشن کر دے۔ ۳)

اس ترجمے کے مطابق جَلّٰهَا میں ضمیر کا مرجع آفتاب ہے۔یعنی جیسے جیسے دن چڑھتا جاتا ہے سورج کی روشنی بھی تیز ہوتی جاتی ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ﴿۴﴾

(اور قسم ہے رات کی جب وہ اسے ڈھانک لے۔ ۴)

رات کی اصل حقیقت یہ ہے کہ سورج افق سے نیچے اتر جاتا ہے۔چنانچہ اس کی روشنی زمین کے جس حصے تک نہیں پہنچ سکتی وہاں رات طاری ہو جاتی ہے۔اور یہ رات اس وقت تک رہتی ہے جب تک سورج افق سے نمودار نہیں ہو جاتا۔اسی کو رات کے سورج کو ڈھانک لینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

یہ قسمیں آفاق کی ایسی نشانیاں ہیں جو زوجین کی نسبت رکھتی ہیں

ان قسموں میں آفاق کی ایسی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو آپس میں زوجین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی سورج اور چاند ایک دوسرے کا جوڑا ہیں۔ اور دن اور رات ایک دوسرے کیلئے زوج ہیں۔ اس سے قرآنِ کریم نے کئی جگہ توحید اور آخرت اور جزاء وسزا پر استدلال کیا ہے۔ یعنی اگر دنیا ایک حقیقت ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا جوڑا پیدا کیا ہے تو ضروری ہے کہ اس کا جوڑا آخرت بھی کبھی ظہور میں آئے۔ اس کا انکار اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا انکار ہے۔ لیکن یہاں ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ سورج اور چاند اور رات اور دن بالکل ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ نہ یہ شکل وصورت میں باہم دگر متشابہ ہیں، نہ ظہور کے طریقے میں یکساں ہیں، نہ ان کا مزاج ایک جیسا ہے، نہ کائنات پر ان کے اثرات ملتے جلتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کائنات، اضداد کی رزم گاہ ہے لیکن جب ہم ان میں ہم آہنگی دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ بظاہر ان میں تضاد نظر آتا ہے اور ان کی حقیقت میں تخالف دکھائی دیتا ہے لیکن ان کی کارکردگی میں قدم قدم پر توافق نظر پڑتا ہے۔ ان میں کہیں باہم تصادم نہیں ہوتا۔ یہ اپنے اپنے دائروں میں اپنے اپنے فرض کے مطابق رات دن سرگرم رہتے ہیں۔ نہ سورج چاند کی حدود میں مداخلت کرتا ہے نہ چاند اپنے وقت سے پہلے ظہور میں آنے کیلئے زور لگاتا ہے۔ سورۃ یٰسین میں فرمایا گیا لَا الشَّمْسُ يَنۢبَغِىْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ ''نہ سورج کیلئے مناسب ہے کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ رات ہی دن سے سبقت کرنے والی ہے، تمام اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔''

یہ صورتحال دو چیزوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ایک یہ کہ آفاق کی ان نشانیوں میں باہمی سازگاری ہی پر ان کی بقاء کا انحصار ہے۔ اگر یہ تعمیلِ ارشاد کی بجائے طغیان وسرکشی کا رویہ اختیار کریں تو چشمِ زدن میں تباہ وبرباد ہو جائیں۔ اور دوسری یہ بات کہ ان کی تخلیق میں توافق اور سازگاری نہیں بلکہ تضاد اور تخالف ہے۔ اس کے باوجود خالقِ کائنات نے ان کو توافق پر مجبور کر رکھا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے مقرر کر رکھی ہیں۔ ان قسموں کے ذریعے انسان کو ان دونوں باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح آفاق کی مخلوق تکوینی قانون کی پابند ہے اسی طرح تم تشریعی قانون کے پابند ہو۔ جس طرح تکوینی قانون کی مخالفت تباہی کا باعث ہو سکتی ہے اسی طرح تشریعی قانون کی مخالفت اور ان حدود کی پامالی بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا باعث ہو سکتی ہے جو قانون اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نازل فرمایا اور جو حدود تمہارے لئے وضع کی ہیں۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶

(اور قسم ہے آسمان کی اور جیسا کچھ اس کو بنایا۔ ۵) اور قسم ہے زمین کی اور جیسا کچھ اس کو بچھایا۔ ۶)

ان قسموں سے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات پر توجہ دلائی گئی ہے

ان قسموں سے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات پر توجہ دلائی گئی ہے کہ قسم ہے آسمان کی ذرا اس کی بلندی کو دیکھو اور قسم ہے زمین کی ذرا اس کی فیض بخشی کی طرف توجہ کرو۔ آسمان ایک نیلگوں چھت کی طرح ہم پر تنا ہوا ہے۔ نہ اس میں کوئی ستون نظر آتا ہے اور نہ کہیں کوئی شگاف دکھائی دیتا ہے۔ یہ اس کے بنانے کی عظیم قدرت، بے نہایت حکمت اور خوبصورت صنعت پر دلالت کر رہا ہے۔ اسی طرح زمین جو ربوبیت کا خزانہ

Marfat.com

ہے جس کی عاجزی اور فروتنی نے آغوشِ مادر کا کام کیا ہے اور جو اپنے اندر نہ جانے کیسے قیمتی خزانوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ کوئی شخص اس کے بنانے والے کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کا اندازہ کر سکتا ہے جس نے زمین جیسی مخلوق پیدا فرمائی۔ جو ذات ایسی ہمہ گیر قدرتوں کی مالک اور ایسی بے پایاں حکمتوں کی حامل ہو کیا اس کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس نے انسان جیسی انمول مخلوق جس کی مخلوقات میں کوئی نظیر نہیں بے مقصد پیدا کی ہو گی اور اسے یہ گوارا ہو گا کہ وہ شترِ بے مہار بن کر زمین پر زندگی گزارے اور وہ جو چاہے کرتی پھرے، کبھی اس کے رویئے کے مطابق نہ جزاء ہو نہ سزا۔ اگر اس نے واقعی ایسا کیا ہے تو پھر تو اس کی تمام قدرت و حکمت اور ربوبیت و رحمت بے معنی اور کائنات کا سارا کارخانہ ایک کارِ عبث بن کر رہ جائے گا۔

پیشِ نظر آیات میں ''ما'' کے متعلق سوال کیا جاتا ہے کہ یہ مصدریہ ہے یا موصولہ۔ بعض اہلِ علم نے اسے موصولہ مان کر ''من'' کے معنی میں لیا ہے اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لی ہے، لیکن اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ان آیات میں قسمیں خدا کی نہیں بلکہ اس کی آیاتِ قدرت و حکمت کی کھائی گئی ہیں۔ اور اگر ان قسموں میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو مراد لیا جائے تو اس سے پہلے کی قسموں سے ان کی نوعیت بالکل مختلف ہو جائے گی۔ یعنی پہلی چار قسمیں اللہ تعالیٰ کی آیات کی گواہی دیں گی اور دوسری قسموں میں اللہ تعالیٰ کو مراد لے کر کس پر گواہی قائم کریں گے۔ لازماً اسے تعظیم و تقدیس کے مفہوم میں لینا پڑے گا جس کا یہاں کوئی محل نہیں۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''ما'' کو موصولہ کی بجائے مصدریہ قرار دیا جائے۔ ہم نے اسی لئے اس کو مصدریہ قرار دے کر اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ﴿٧﴾

(اور قسم ہے نفس کی اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ ۷)

آفاقی شہادتوں کے بعد نفسیاتی شہادت

آفاقی شہادتوں کے بعد نفسیاتی شہادت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے نفسِ انسانی کی قسم کھائی گئی ہے۔ لیکن خاص طور پر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کو پیدا فرمایا تو اس کا تسویہ بھی فرمایا۔ یعنی اسے ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست اور اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کیلئے موزوں ترین تھا۔ اسے حواس کی دولت عطا فرمائی جو اپنے تناسب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر علم کا بہترین ذریعہ بن سکتے تھے۔ پھر اسے جوہرِ عقل سے نوازا، فکری قوت عطا فرمائی، دل و دماغ کی رعنائیاں بخشیں، قوت ارادی اور اقدامی قوتوں سے بہرہ ور فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی داخلی صلاحیتوں کو ایسا ہموار کیا کہ جس سے پیدائشی گنہگار ہونے کا تصور یکسر ختم ہو کر رہ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں اس کی وضاحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت کے سوا کسی اور چیز پر پیدا ہوتا ہو، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جانور کے پیٹ سے پورے کا پورا صحیح و سالم بچہ پیدا ہوتا ہے کیا تم ان میں کسی کا کان کٹا ہوا پاتے ہو؟ (بخاری) یعنی یہ مشرکین ہیں جو بعد میں اپنے اوہامِ جاہلیت کی بناء پر جانوروں کے کان کاٹتے ہیں۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿٨﴾

(پھر اس کے دل میں ڈال دی، اس کی نافرمانی اور اس کی پرہیزگاری۔ ۸)

Marfat.com

الہام کی وضاحت

علامہ ابنِ منظور الہام کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں اللَّھْمُ: الابتلاع لَھَمَ الشی لَھْمًا وَلَھَمًا وَتَلَھَّمَه وَالتَھَمَه ابتلعه مرۃ ''یک بارگی کسی چیز کو نگل جانا، اسی سے الہام مشتق ہے۔ والالھام: مایلقی فی الروع ''دل میں کسی چیز کو ڈال دینا''

علامہ راغب اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں الالھام: القاء الشی فی الروع ویختص ذلک لما کان من جھة اللہ تعالیٰ اومن جھة الملاء الاعلیٰ (المفردات) ''یعنی الہام کسی چیز کے دل میں ڈالنے کو کہتے ہیں اور الہام اس خیال کیلئے مخصوص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو یا ملاء اعلیٰ کی طرف سے۔''

اہلِ لغت کی ان وضاحتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ الہام دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصور یا کسی خیال کو بندے کے دل و دماغ میں اتار دینے کا نام ہے۔ اور قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کی ایک ہی صورت نہیں بلکہ ایک فطری الہام ہے جو اللہ تعالیٰ ہر مخلوق پر اس کی حیثیت اور نوعیت کے لحاظ سے کرتا ہے، اسی کو قرآنِ کریم نے ہدایت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ مثلاً مچھلی تیرتی ہے، پرندہ اڑتا ہے، شہد کی مکھی چھتہ بناتی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو فطرت کے ذریعے انہیں الہام کیا جاتا ہے۔ انسان چونکہ مختلف حیثیتوں کا جامع ہے اس کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے۔ اسے وجدان کے ذریعے الہام کیا جاتا ہے کہ ماں کے سینے سے کس طرح دودھ چوسنا ہے اور بھوک لگے تو رونا ہے۔ اسی طرح وہ ایک عقلی وجود بھی ہے۔ چنانچہ جیسے جیسے وہ عقلی وجود میں آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے الہامی رہنمائی بھی کی جاتی ہے۔ انسان نے جتنے اکتشافات کئے ہیں اور جتنی ایجادات کی ہیں جن کی وجہ سے تمدن کو ترقی ملی ہے ان کے پیچھے کسی غور و فکر کا نہیں، الہام کا ہاتھ ہے۔ نیوٹن کے ذہن میں سیب کو گرتے دیکھ کر کشش ثقل کا تصور عقلی نہیں الہامی ہے۔ سیب کو گرتے اس نے بارہا دیکھا لیکن یہ تصور اس کے ذہن میں اس وقت آیا جب اسے الہام کیا گیا۔ اسی طرح انسان کی ایک اور حیثیت بھی ہے کہ وہ اخلاقی وجود ہے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اسے فجور اور تقویٰ کا الہام کیا ہے۔ یعنی اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات اور میلانات رکھ دیئے ہیں۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیئے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز برائی۔ اچھے اخلاق اور اعمال اور برے اور اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں۔ فجور یعنی بدکرداری ایک بری چیز ہے۔ اور تقویٰ یعنی برائیوں سے اجتناب ایک اچھی چیز ہے۔ یہ برے بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر انسان کو عطا کر دی گئی ہے۔ اور اسی بات کو سورۃ البلد میں دو راستوں کی ہدایت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور سورۃ الدہر میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو اس کا راستہ دکھا دیا خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر۔ یہ خیر و شر کا امتیاز ایک ایسی عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر و شر کے تصورات سے خالی نہیں رہا۔ ہر زمانے میں اس کا پایا جانا اور ہر تہذیب و تمدن میں اس کا وجود اس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے۔ اور اس بات کا بھی کہ ایک خالقِ حکیم و دانا نے اسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ کیونکہ جن اجزاء سے انسان مرکب ہے اور جن قوانین کے تحت دنیا کا مادی نظام چل رہا ہے ان کے اندر کہیں اخلاق کے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔

ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر ہونے اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر ودیعت کیا ہے۔ لیکن یہ الہام ایک اجمالی احساس پیدا کرتا ہے کبھی عقلِ سلیم کے ذریعہ سے اور کبھی فطرتِ صحیحہ کے راستہ سے۔ لیکن یہ احساس ایسا نہیں ہوتا جو خواہشات کی اپیل اور حالات کے دباؤ کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے تفصیلی طور پر اللہ تعالیٰ نے

Marfat.com

انبیاء ورسل کی زبانی اسے کھول کر بیان فرمایا کہ یہ راستہ بدی کا ہے اور یہ پرہیزگاری کا۔ البتہ اس کے واسطے سے قلب میں جو نیکی کا رجحان یا بدی کا میلان پیدا ہوتا ہے ان دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ نیکی کا القاء فرشتہ کے واسطہ سے ہوتا ہے اور بدی کا القاء شیطان کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ پھر یہ رجحان اور میلان کبھی بندہ کے قصد واختیار سے مرتبۂ عزم تک پہنچ کر صدورِ فعل کا ذریعہ بن جاتا ہے جس کا سبب اللہ تعالیٰ اور کاسب بندہ ہے۔ اسی کسب وخیر پر مجازات کا سلسلہ بطریقِ تسبیب قائم ہے۔ (المستفاد من فوائدِ عثمانی)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰

(یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔ ۹) اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔ ۱۰)

یہ جوابِ قسم ہے

یہ ہے جوابِ قسم جس کیلئے ان چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئی ہیں۔ ہم گزشتہ آیات کی وضاحت میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنی جن نشانیوں کا ذکر کیا ہے ان میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے متضاد اور نسبتِ تخالف رکھتی ہیں۔ سورج اور چاند اپنے ظہور اور فروغ اور اپنے اثرات ونتائج کے اعتبار سے بالکل ایک دوسرے سے متضاد اور ایک دوسرے کے متخالف ہیں۔ رات اور دن دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں میں انسانوں کے مفادات بالکل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ آسمان بلندیوں سے عبارت ہے اور زمین پستیوں سے۔ اور دونوں کے کوائف اور دونوں کے فرائض بالکل ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اسی طرح نفسِ انسانی بھی خیر وشر کے میلانات ورجحانات اور محرکات کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ مجموعۂ اضداد بھی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی وسیع تر حکمتِ نظام کے تحت وہ جس طرح کائنات کے نظام میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور ایک دوسرے سے معاون ہیں اور کبھی ان میں نہ تخالف ہوتا ہے اور نہ تخلف۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مکمل طور پر فرمانبردار اور وفادار ہیں۔ وہ کبھی اس تکوینی قانون کی مخالفت کا سوچ بھی نہیں سکتے اور کبھی اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑائی نہیں جتاتے۔ اور جس کام پر انہیں لگا دیا گیا ہے اس سے سر مو انحراف نہیں کرتے یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی کامیابی کے اس رشتے کو پکڑ لے تو اسے اس راز کو پالینا چاہیے۔

تزکیۂ نفس کا مطلب

اس کیلئے قرآنِ کریم نے تزکیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورتحال کیلئے اس سے بہتر لفظ ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ تزکیہ کا معنی ہوتا ہے پاک کرنا، ابھارنا اور نشوونما دینا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو شخص فلاح کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ اپنے افکار کو فکری گمراہیوں سے پاک کرے، اپنے اعمال کو نافرمانیوں کی آلودگی سے بچائے اور اپنے اخلاق کو ہر طرح کی ناپاک خواہشات سے بچا کے رکھے۔ اس طرح سے اس کے اندر بھلائی نشوونما پائے گی اور آہستہ آہستہ وہ تقویٰ کی سیڑھیوں پر چڑھتا چلا جائے گا۔

Marfat.com

اس کی فطرتِ سلیمہ نشوونما کے مراحل طے کرے گی اور اس کی قوت و توانائی میں اضافہ ہو جائے گا۔ نتیجتاً ایسا شخص اپنے اندر ایسا عزم اور ہمت محسوس کرے گا کہ مشکل سے مشکل کام کرنے کیلئے بھی آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے اندر ایثار و قربانی کی مشعلیں جلیں گی، اس کی روحانی قوتیں بیدار ہوتی چلی جائیں گی۔ آخر وہ ایسی منزل پر جا پہنچے گا کہ شریعت کے تقاضے اس کے طبعی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا عشق اور دین کی وارفتگی اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے گی۔

اس کے برعکس وہ شخص ناکام و نامراد ہوگا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رجحانات کو ابھارنے اور نشوونما دینے کی بجائے اس کو فسق و فجور کے ڈھیر کے نیچے دبا دے گا۔ نفس کے غلط میلانات کو بڑھا کر ناشکری کی انتہا تک پہنچ جائے گا۔ ایسے شخص کی ناکامی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اہلِ لغت کہتے ہیں کہ دَسّٰهَا اصل میں دَسَّسَهَا ہے۔ یہ تدسیس سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو دوسری چیز میں چھپا دینا۔ اس کے آخری سین کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔

یاد رہے کہ بندہ صرف تقویٰ اور تزکیہ کی خواہش ہی کر سکتا ہے اور اس کیلئے محنت کرتا ہے۔ لیکن اس کا نصیب بن جانا یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ زبردستی کسی نفس کو آلودہ نہیں کرتا، مگر بندہ جب اس کا تہیہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے تقویٰ اور تزکیہ کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے اور وہ اسے شیطانوں کیلئے چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کو اپنی سواری بنائے پھریں۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝۱۲ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝۱۳ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ۬ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝۱۴ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝۱۵

(ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ ۱۱) جبکہ اٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے زیادہ بدبخت۔ ۱۲) تو اللہ کے رسول نے ان لوگوں سے کہا کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری سے خبردار۔ ۱۳) مگر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں تو اللہ نے ان کے گناہ کی پاداش میں ان پر ایسی آفت توڑی کہ ان کا ستھراؤ کر دیا۔ ۱۴) اور وہ نہیں ڈرتا ان کے تباہ کن انجام سے۔ ۱۵)

ایک تاریخی شہادت

آفاقی و انفسی شواہد کے بعد ایک تاریخی شہادت اس دعوے کے ثبوت کیلئے پیش کی گئی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ جو قوم نیکی کے رجحانات کو ترقی دے کر برائی کے محرکات پر غالب نہیں کرتی اور تقویٰ کے ذریعے برائی کے سوتوں پر بند نہیں باندھتی، وہ بالعموم ایسی صورتحال سے دوچار ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت بھی انہیں بدلنے سے عاجز رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اتمامِ حجت کیلئے مہلت عطا فرماتا ہے لیکن بالآخر وہ قوم تباہ کر دی جاتی ہے۔ قومِ ثمود کو اسی حقیقت کے طور پر یہاں بیان فرمایا گیا ہے۔ اور ثمود کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ تباہ شدہ قوموں میں جس قوم کا علاقہ اہلِ مکہ کے قریب ترین تھا وہ یہی قوم تھی۔ شمالی حجاز میں اس کے تاریخی آثار موجود تھے جن سے اہلِ مکہ شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں ہمیشہ گزرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس آگاہی کی وجہ سے جب قرآنِ کریم نے اس سورۃ کے اشارات میں ثمود کا

Marfat.com

ذکر فرمایا تو قریش کے سامنے ان کی پوری تاریخ نکھر کر آ گئی۔ یہ عرب بائدہ میں سے ہیں جن کی روایات وراثت میں اہلِ عرب تک پہنچیں۔ ان سے متعلق بہت سی امثال اور تلمیحات اہلِ عرب کے ادب کا حصہ بنیں۔ ان کے شعراء اور خطباء بڑی بے تکلفی سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ اور وہ ان کے بڑے بڑے لیڈروں سے بھی واقف تھے اس لئے اپنے اشعار میں ان کا تذکرہ بھی کرتے تھے۔

پہلی آیت میں ان کی اصل بیماری کا ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ و برباد کیا۔ اس بیماری کو طغویٰ کے نام سے یاد فرمایا گیا ہے۔ اس کا معنی سرکشی اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے کھلم کھلا بغاوت ہے۔ خاص طور پر وہ سرکشی جس کی مرتکب کوئی قوم اس وقت ہوتی ہے جبکہ حق اس پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہو۔ قریش کو ان کی سرکشی کے حوالے سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ تم آج جس سرکشی میں مبتلا ہو ثمود ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں کسی قوم کی سرکشی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد لازماً اسے تباہی کا نشانہ بناتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نزول کے وقت قریش کی سرکشی بھی اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے قتل کی منصوبہ بندی کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان حالات میں خاص طور پر اس واقعہ کو ذکر فرمایا کہ جب انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے ایک اونٹنی کی فرمائش کی تھی جو بطور معجزہ ان کے سامنے ظاہر ہو تو آپ نے ایک اونٹنی معجزانہ طور پر ان کے سامنے لا پیش کی اور ان سے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے یہ زمین میں جہاں چاہے گی چرتی پھرے گی۔ ایک دن کنویں سے سارا قبیلہ پانی پیئے گا اور دوسرا دن اس اونٹنی کیلئے مخصوص ہوگا۔ خبردار اس اونٹنی کو کوئی نقصان نہ پہنچاوے، ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تمہیں تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ اس پر وہ کچھ مدت تک ڈرتے رہے، پھر انہوں نے اپنے سب سے زیادہ شریر اور سرکش سردار کو جس کا نام قدار بن سالف تھا کو پکارا کہ وہ اونٹنی کا قصہ تمام کر دے۔ وہ اس کا کام تمام کرنے کا ذمہ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یعنی وہ بپھر کے اٹھا کہ اسے ساری قوم کی تائید حاصل تھی اور اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں جس سے وہ اونٹنی مر گئی۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ اونٹنی کو مارنے کے بعد ثمود کے لوگوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے کہا اب لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے۔ اور سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں تین دن اپنے گھروں میں اور مزے کر لینے کو کہا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یہ ایسی تنبیہ ہے جس کے غلط ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ان پر ایسا عذاب آیا جس نے اس کو نیست و نابود کر دیا اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑا۔

فَدَمْدَمَ ...... علامہ قرطبی اس کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں **الدَّمْدَمَۃ اهلاک باستيصال فدمدم عليه ای اهلكهم فجعلهم تحت التراب** ”کسی کی جڑ اکھاڑ کر تباہ کر دینا کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے یعنی ان کو نیست و نابود کر دیا گیا ان کا نام و نشان تک بھی باقی نہ رہا۔“

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اپنے اسی قانون کے مطابق کرتا ہے جو اس نے غلط کار قوموں کیلئے ٹھہرا رکھا ہے۔ اسے اس بات کا اندیشہ نہیں ہوتا کہ نتیجہ کے اعتبار سے اس کے اس فیصلہ میں کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ اور نہ اسے یہ خوف ہوتا ہے کہ کوئی اس کو چیلنج کر سکتا ہے۔ اس کی قدرت بے پناہ اور اس کے فیصلے ہر طرح کے چیلنج سے بالا ہیں۔ وہ نہ کسی کے آگے مسؤل ہے اور نہ کوئی زور دے کر اس سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الَّيْلِ

(۹۲)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الَّیْلِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الَّیْلِ ہے جو اس سورۃ کا پہلا لفظ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۲۱ آیتیں، ۷۱ کلمے اور ۳۱۰ حروف ہیں۔
مقامِ نزول:۔ مکہ معظمہ ہے۔
زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ اپنے مضامین کے اعتبار سے بالکل سورۃ الشمس کی توأم معلوم ہوتی ہے، صرف اسلوب کا فرق ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے رات اور دن اور مذکر اور مونث کی تخلیق کی قسموں سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کا سفر دو مختلف راستوں پر ہے اور وہ دونوں اپنے انجام اور نتائج کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ جس طرح رات اور دن اور مذکر اور مونث اپنی صفات اور خصوصیات کے اعتبار سے بالکل ایک دوسرے کے متضاد ہیں، اسی طرح نوعِ انسانی کے افراد اقوام اور گروہ دنیا میں جو کچھ بھی کر رہے ہیں ان میں گہرا اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ لیکن اس اختلاف اور تضاد کو اگر سمیٹا جائے تو اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ہر ایک کی کچھ خصوصیات ہیں۔ چنانچہ اس سورۃ میں مکی سورتوں کے انداز کے مطابق نہایت اختصار سے دونوں گروہوں کی تین تین خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ خصوصیات کا استقصاء نہیں بلکہ ایک نمونہ ہے جس سے اس گروہ کی سعی و عمل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور ان کے طرزِ عمل کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

پہلے گروہ کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ انفاق کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور پرہیزگاری کی زندگی اختیار کرتا ہے اور بھلائی کو بھلائی مانتا ہے۔ دوسری قسم کی خصوصیات اس کے بالکل برعکس ہیں کہ وہ بجائے انفاق کے بخل سے کام لیتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا یا ناراضی کی کوئی پرواہ نہیں۔ اور وہ ہر بھلائی کی بات کو جھٹلاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ ان دونوں خصوصیات کے حامل لوگوں کا طرزِ عمل اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ جس طرح ان کی خصوصیات ایک دوسرے کے متضاد ہیں اسی طرح ان کے نتائج بھی ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ پہلے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی زندگی کے راستے کو سہل کردے گا۔ اس کیلئے نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہوجائے گا۔ وہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں جیسے جیسے آگے بڑھتا جائے گا ویسے ویسے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اس کا راستہ روشن کرتی چلی جائے گی۔ اور دوسرے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ اس کے دل کا نور بجھ جائے گا۔ بھلائی کا ہر کام

Marfat.com

اسے اجنبی معلوم ہوگا اور برائی سے اس کی دلچسپی بڑھتی چلی جائے گی۔ وہ بد سے بدتر کام کیلئے ہر طرح کا ایثار کرنے کیلئے تیار ہو جائے گا۔ اور نیکی کی کوئی بات اس کے دل و دماغ میں راہ نہیں پاسکے گی۔ وہ دنیا طلبی کو اپنا مقصدِ زندگی بنالے گا، لیکن دنیا کا مال اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاکت کے گڑھے میں جاگرے گا کیونکہ قبر میں تو کوئی چیز ساتھ نہیں جائے گی۔

اس کے بعد نہایت اختصار کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف طرزِ عمل کے باوجود اور افکار و عمل کے تصادم کے باوصف میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر یہ کرم کیا ہے کہ اس نے انسان کو صحیح راستے سے باخبر کیا ہے۔ اس کیلئے عقل بھی دی ہے اور اپنے رسول بھی مبعوث کئے ہیں اور کتابیں بھی نازل فرمائی ہیں۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتا ہے یا اپنی نفسانی خواہشات کا اتباع کرتا ہے۔ اور یہ بھی واضح کردیا ہے کہ دنیا بھی ہماری ہے اور آخرت بھی ہماری۔ اس لئے ہم سے جو مانگو گے ہم تمہارے اخلاص کے مطابق تمہیں دیں گے۔

مزید فرمایا کہ جو شخص بھلائی کو جھٹلائے گا جسے اللہ تعالیٰ کا رسول لے کر آیا ہے اس کیلئے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ کی خبر دی ہے اور وہی شخص سب سے بڑا بدبخت شخص ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب کرے گا اور منہ پھیرے گا۔ لیکن جس شخص نے اس سے برعکس رویہ اختیار کیا کہ وہ اپنا مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس لئے دل کھول کر خرچ کرتا ہے تاکہ حُبِ مال کی آلودگیوں سے دل کو پاک کرلے۔ یہ شخص سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی کا احسان اتارنے کیلئے ایثار نہیں کرتا بلکہ اس کے پیشِ نظر محض اپنے رب کی رضاجوئی ہوتی ہے۔ ایسے شخص سے اس کا رب راضی ہوگا اور اسے اتنا دے گا جس سے وہ نہال ہو جائے گا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٢١	سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ (٩٢)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ
وَالْاُنْثٰٓى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ﴿۵﴾
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ
وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾
وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ﴿۱۲﴾
وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ﴿۱۴﴾
لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ﴿۱۵﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ﴿۱۶﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا
الْاَتْقَى ۙ﴿۱۷﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ
مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ﴿۲۰﴾
وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾

رکوع: ا۔ (اورقسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے۔ ۱) اورقسم ہے دن کی جبکہ وہ چمک اٹھے۔ ۲) اورقسم ہے نرومادہ کی آفرینش کی۔ ۳) بیشک تمہاری کوششیں مختلف نوعیت کی ہیں۔ ۴) تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اوراللہ کی نافرمانی سے پرہیز کیا۔ ۵) اوراس نے بھلائی کی تصدیق کی۔ ۶) تو ہم اس کو آسان کردیں گے

Marfat.com

یُسۡرٰی کیلئے۔ ۷) اور جس نے بخل کیا اور بے نیاز بنا رہا۔ ۸) اور بھلائی کو جھٹلایا۔ ۹) پس ہم آسان کردیں گے اس کو عُسۡرٰی کیلئے۔ ۱۰) کیا کام آئے گا اس کے اس کا مال جبکہ وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا۔ ۱۱) بیشک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے۔ ۱۲) اور یقیناً آخرت اور دنیا کے ہم ہی مالک ہیں۔ ۱۳) پس میں نے خبردار کردیا ہے تمہیں بھڑکتی آگ سے۔ ۱۴) اس میں نہیں جلے گا مگر وہ انتہائی بدبخت۔ ۱۵) جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔ ۱۶) اور اس آگ سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار۔ ۱۷) جو اپنا مال دیتا ہے اپنے دل کو پاک کرنے کیلئے۔ ۱۸) اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ ۱۹) بجز اس کے کہ وہ اپنے پروردگار کی خوشنودی کا طلبگار ہے۔ ۲۰) وہ ضرور اس سے خوش ہوگا۔ ۲۱)

وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰٓى ۙ﴿۳﴾
اِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾

(اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے۔ ۱) اور قسم ہے دن کی جبکہ وہ چمک اٹھے۔ ۲) اور قسم ہے نر و مادہ کی آفرینش کی۔ ۳) بیشک تمہاری کوششیں مختلف نوعیت کی ہیں۔ ۴)

تخالف اور تضاد کے باوجود ان میں قدرِ مشترک سے استدلال

ہم کئی دفعہ یہ بات واضح کرچکے ہیں کہ قسم بالعموم قرآنِ کریم میں دلیل اور گواہ کے طور پر آتی ہے اور اس کے بعد کا جملہ جوابِ قسم اور دعویٰ ہوتا ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس سورۃ میں بھی پروردگار نے تین قسمیں کھائی ہیں۔ رات کی جب وہ چھا جائے اور دن کی جب وہ چمک اٹھے اور نر و مادہ کی آفرینش کی۔ ان تینوں میں جو حقائق مضمر ہیں ان کا استقصاء تو انسانی دل و دماغ کیلئے ممکن نہیں۔ لیکن معمولی تدبر سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تینوں قسموں میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنی شکل وصورت، اپنے اشغال و اعمال، اپنے اثرات و نتائج اور اپنی خصوصیات میں یکساں نہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک دوسری سے تضاد کی نسبت رکھتی ہے۔ البتہ ایک چیز ان میں قدرِ مشترک ہے وہ یہ کہ یہ ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع اور اس کے مفوضہ امور کو سرانجام دینے میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی یہ مخلوقات ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے متضاد اور نتائج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح اے انسانو! تم بھی اپنے فکر و عمل اور طور اطوار میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو۔ تم زندگی کی مختلف راہوں کے مسافر ہو، تمہاری زندگیوں کے مقاصد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ تمہارے فکری اختلاف نے دنیا کو مختلف دھڑوں میں تقسیم کر رکھا ہے، تمہاری تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں، تمہاری نام نہاد وحدتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ اگر تمہارے اختلافات اور تمہارے تضادات کو سمیٹا جائے تو انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جنہیں

Marfat.com

اگلی آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا الناس غادیان، فمبتاع نفسه فمعتقها وبائع نفسه وموبقها "لوگ جب صبح کرتے ہیں تو ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں، کچھ لوگ اپنے نفس کو خرید کر اس کو آزاد کر دیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے نفس کو فروخت کر کے اس کو ہلاک کر دیتے ہیں۔"

چوتھی آیت میں شَتّٰی کا لفظ آیا ہے یہ شَتِیتٌ کی جمع ہے یعنی متفرق اور منتشر۔ نحو کے اعتبار سے شَتّٰی کی بجائے شَتِیتٌ آنا چاہئے تھا کیونکہ سعی واحد ہے اور وہ اِنَّ کا اسم ہے۔ اور یہ اِنَّ کی خبر ہے۔ لیکن شتی میں معنی کی رعایت کی گئی ہے۔ کیونکہ سعی مسلسل جدوجہد کو کہتے ہیں جو متعدد اعمال وافعال پر مشتمل ہوتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿٦﴾

(تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کیا۔ ۵) اور اس نے بھلائی کی تصدیق کی۔ ۶)

نیکوں کی صفات

اوپر جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے پہلے گروہ کی مساعی اور جدوجہد کی تفصیلات کو سمیٹتے ہوئے تین چیزوں کا ذکر فرمایا گیا اور یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جو تمام خوبیوں کی جامع ہیں۔ جن میں پہلی چیز یہ ہے کہ حُبِ مال اور زر پرستی جو انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے یہ لوگ اس میں مبتلا ہونے کی بجائے کھلے دل سے اپنا مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، بندوں کے حقوق ادا کرتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں اور خلقِ خدا کی خدمت میں ان کا ہاتھ ہمیشہ آگے رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے وہ اسے اپنی ملکیت سمجھنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھتے ہیں اور اس کا حق ادا کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کرتے۔ اور دوسری خوبی ان کی یہ ہے کہ ان کا دل ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے دھڑکتا ہے، وہ ہر کام کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضا اور ناراضی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اپنے اعمال واخلاق میں شریعت کی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتے، ایک فکرمند اور محتاط آدمی کی طرح زندگی کے سفر میں بچ بچ کر چلتے ہیں۔ اور تیسری خوبی ان کی یہ ہے کہ وہ بھلائی کی ہر بات کی تصدیق کرتے ہیں یعنی ان کے دل میں خواہشات کی فصل نہیں اگتی، بلکہ بھلائیوں کا ذخیرہ رہتا ہے۔ ان کا طبعی میلان بھلی باتوں کی طرف ہوتا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بھلائی ایک وسیع المعنی لفظ ہے جس میں عقیدہ، اخلاق اور اعمال تینوں شامل ہیں۔ عقیدے میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی شرک اور دہریت اور کفر کو چھوڑ کر توحید، آخرت اور رسالت کو برحق مانے۔ اور اخلاق واعمال میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ ان کے ہر عمل کے پیچھے حُسنِ نیت اور ہر اخلاقی قدر کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے رسول کا اسوہ موجود ہو۔ یہ درحقیقت ان خوبیوں کا نچوڑ ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿٧﴾

(تو ہم اس کو آسان کر دیں گے یُسْریٰ کیلئے۔ ۷)

Marfat.com

علامہ آلوسی نے فَسَنُیَسِّرُہٗ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تیسیر یُسر سے باب تفعیل کا مصدر ہے۔اس کا اصل معنی آسانی اور سہولت ہے۔لیکن یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کام کیلئے کسی کو مستعد اور تیار کر دینا۔عرب جب گھوڑے پر زین ڈال کر اور اس کے منہ میں لگام دے کر سواری کیلئے بالکل تیار کر دیتے ہیں تو کہتے ہیں یَسَّرَ الْفَرَسَ لِلرُّکُوْبِ اِذَا اَسْرَجَھَا وَ اَلْجَمَھَا

یُسْرٰی ...... آسان راستے کو بھی کہتے ہیں اور جنت پر بھی بولا جاتا ہے۔چونکہ یہ مونث ہے اس لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا موصوف مقدر ہے۔وہ اعمالِ صالحہ،اخلاقِ حسنہ،رضائے الٰہی اور دخولِ جنت سب اس کے موصوف ہو سکتے ہیں۔

نیکیوں کا انعام

یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہے جس کا یہاں ذکر فرمایا گیا اور اس سے ایک بڑا پیچیدہ نفسیاتی مسئلہ بھی سلجھ جاتا ہے۔وہ انعام یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کیلئے اور اس کے احکام کی اطاعت کے جذبے سے نیکی کے کاموں میں جُت جاتا ہے تو وہ مراحل جنہیں قرآنِ کریم نے عقبہ سے تعبیر کیا ہے وہ آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔بعض اہلِ علم نے اسے توفیق سے تعبیر کیا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ ان کی توفیق دیتا چلا جاتا ہے۔دل کی کیفیت نیکی کی طرف میلان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔پھر یہی میلان چاہت اور محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اور آخری مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ شرعی تقاضے طبعی تقاضے معلوم ہونے لگتے ہیں۔اس طرح وہ اعمال جو کبھی انسانی طبیعت پر بہت گراں گزرتے ہیں نہ صرف آسان ہو جاتے ہیں بلکہ انسان کی طلب بن جاتے ہیں اور شریعت کا وہ راستہ جس پر چلنا مشکل معلوم ہوتا تھا وہ آسان ہو جاتا ہے۔اور اگر یُسْرٰی کا ترجمہ جنت کیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنت جو آزمائشوں میں گھری ہوئی ہے اور جس کا حاصل کرنا آسان نہیں ہے،اللہ تعالیٰ اس جنت کا حصول آسان بنا دیتے ہیں۔اس لئے جن اہلِ علم نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ہم سہج سہج اسے یُسْرٰی تک پہنچا دیتے ہیں وہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹

(اور جس نے بخل کیا اور بے نیاز بنا رہا۔ ۸) اور بھلائی کو جھٹلایا۔ ۹)

بروں یعنی اہلِ شقاوت کی خصوصیات

اس سے پہلے کی آیات میں انسانی مساعی کی پہلی قسم کو بیان فرمایا گیا ہے جو درحقیقت اہلِ سعادت کی خصوصیات ہیں۔اور اب اس کے مقابل اور اس کے بالکل برعکس انسانی مساعی کی دوسری قسم بیان کی گئی ہے جو درحقیقت اہلِ شقاوت کی خصوصیات یا ان کی قبیح عادات ہیں۔ان میں سے سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مال و دولت کو اپنی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ اور اپنی ملکیت سمجھنے کی وجہ سے کسی ایسی جگہ خرچ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے جہاں ان کے نزدیک کسی منفعت یا کسی بدلے کے ملنے کی امید نہ ہو۔ان کے بخل کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ ایک ایک پیسہ سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اسے خرچ کرنے کی ان میں ہمت نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ پیسے سے پیسہ کمانے کے عادی ہیں اور سرمائے کے

Marfat.com

ذریعے سے سرمایہ بڑھاتے ہیں، اسی طرح وہ شہرت، نام ونمود، حکام رسی یا اور کسی قسم کی منفعت پیشِ نظر ہو تو وہ پانی کی طرح پیسہ بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔ وہ اپنے پیسے کے بدلے میں نفعِ عاجل اور محسوس منفعت پر یقین رکھتے ہیں جہاں انہیں نفعِ آجل کا یقین دلایا جائے اور آخرت میں بدلے کی امید دلائی جائے۔ یہ ان کے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ یا ان سے یہ کہا جائے کہ تم غریبوں، مسکینوں اور بیواؤں کی مدد کرو اور اس طرح خرچ کرو کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہ ہو۔ اسے وہ پاگل پن سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح سے ایک دھیلا خرچ کرنے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔ میت کی تکفین و تدفین کیلئے بھی ان سے قرض مانگا جائے تو وہ اس پر بھی سود کا مطالبہ کریں گے۔ کیونکہ حُبِ مال اور زر پرستی یہ درحقیقت ان کے بخل کے اسباب ہیں۔ ان کی موجودگی میں فی سبیل اللہ انفاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہی وہ بخل ہے جو ان کی اہم ترین خصلت ہے۔

دوسری خصلت ان کی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے حصول، بے غرض خدمت اور بے لوث انفاق سے بالکل مستغنی ہیں۔ وہ چونکہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اس لئے دنیوی مفادات، دنیوی مناصب اور شہرت و ناموری کے سوا کسی اور چیز کے در پے ہونے کو وہ ضیاعِ وقت سمجھتے ہیں۔ وہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا سے بے نیاز ہیں اسی طرح انہیں اپنے انجام کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دولت یہ وہ گوہرِ مقصود ہے جس کے حصول کی ہر وقت ان کے دماغ میں فکر رہتی ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ ہر چیز سے بے نیاز ہیں۔

تیسری خصلت ان کی یہ ہے کہ بھلائی کی ہر بات سے انہیں تنفر اور اسے قبول کرنے سے انکار ہے۔ جس طرح کتے کا کاٹا پانی سے ڈرتا ہے اور تپِ محرقہ میں مبتلا منہ کے ذائقے سے محروم ہو جاتا ہے اور اسے شہد بھی کڑوا لگتا ہے اسی طرح یہ دنیا کے باولے اور ہر روحانی اور معنوی احساس سے محروم کسی اچھائی اور کسی بھلائی کی بات کو قبول کرنا تو در کنار سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کی دلآویز شخصیت، اس کی زبانِ فیض ترجمان سے معجزانہ کلام کی تلاوت بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ ایسی عادات اور خصلتوں کے حامل اور ایسی خصوصیات سے متصف لوگ یقیناً اپنے انجام کے اعتبار سے ان لوگوں سے مختلف صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں جن کا ذکر پہلی آیات میں کیا گیا ہے۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰

(پس ہم آسان کردیں گے اس کو عُسریٰ کیلئے۔ ۱۰)

برے اعمال کی سزا

عُسریٰ سے مراد بعض اہلِ علم کے نزدیک جہنم ہے۔ اور نحوی اعتبار سے یہ صفت مونث ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے جو اعمالِ سیئہ، اخلاقِ قبیحہ یا جہنم سب اس کے موصوف ہو سکتے ہیں۔ ویسے اس کا معنی لغوی طور پر ''مشکل'' ہوتا ہے۔ برے اعمال و افعال اور برے اخلاق کو عُسریٰ اس لئے کہا گیا ہے کہ ان کرتوتوں کو کرتے ہوئے آدمی کو اپنی فطرت اور اپنے مزاج سے جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ بار بار اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ اس کا نفسِ لوامہ ہر بری بات پر ٹوکتا ہے۔ ان تمام رکاوٹوں کی وجہ سے ان گناہوں کا ارتکاب ایک خاص وقت تک مشکل ہوتا ہے۔ اور جہنم تو ہے ہی مشکلات کی جگہ۔ لیکن یہی اعمالِ بد ہیں جو انسان کو جہنم میں لے جاتے ہیں اور ان کے نتیجے میں جہنم اس کیلئے آسان ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

جہاں تک تیسیر کا تعلق ہے ایک تو اس کا معنی آسان کر دینا ہے۔ تو اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جب کوئی شخص نیکی کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اس کے سامنے نیکی کے امکانات کھول دیتے ہیں اور نیکی کے راستے پر چلنے کیلئے آسانیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن جو شخص برائی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے اس کی فطرت اس سے ابا کرتی ہے، اس کا ضمیر اسے روکتا ہے۔ لیکن وہ مسلسل زور لگاتا ہے کہ مجھے اسی راستے پر چلنا ہے۔ تو پھر ہم آہستہ آہستہ اس سے نیکی کا ذوق اور خیر کا جذبہ سلب کر لیتے ہیں۔ اسے نیکی پر چلنے کی توفیق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ برائی کے دروازے اس پر کھول دیئے جاتے ہیں اور اس کے اسباب و وسائل اس کیلئے فراہم کر دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اس طرح اسے برائی محبوب ہو جاتی ہے اور نیکی اجنبی بن جاتی ہے۔ جس طرح گدھ عقاب کی طرح بلندی پر اڑتا ہے لیکن اسے شکار سے کوئی رغبت نہیں، وہ جب بھی اترتا ہے مردار پر اترتا ہے، گندگی کا کیڑا ہمیشہ گندگی میں جیتا ہے۔ یہی حال برائی کے راستے پر چلنے والے کا ہوتا ہے کہ وہ برائی سے پیار کرتا ہے اور برائی ہی کو اپنی منزل سمجھتا ہے۔ اور یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں برے شخص کیلئے ایک سزا ہے جو بالآخر اسے جہنم تک پہنچا دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو واشگاف فرمایا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ "جس شخص کیلئے اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جس بدنصیب کیلئے ارادہ فرماتا ہے کہ اسے گمراہ کرے تو اس کے سینے کو بہت تنگ کر دیتا ہے، گویا وہ زبردستی آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے۔"

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ﴿١١﴾

(کیا کام آئے گا اس کے اس کا مال جبکہ وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا۔ ۱۱)

حُبِ مال اور بخل کا انجام

گزشتہ آیات میں وہ بدبخت جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے باعث نیکی کے جذبے سے محروم کر دیئے جاتے ہیں، ان کا دیگر جرائم کے ساتھ سب سے بڑا جرم یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مال و دولت کی محبت میں اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ جائز اور ناجائز اور حلال اور حرام کے درمیان فرق کرنے کا ذوق ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ وہ مال ہی کو اپنا معبود سمجھتے ہیں اور اس کے اسیر ہو کر اخلاق کی ہر قدر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ پیشِ نظر آیت میں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ آخر ایک روز موت کا شکار انہیں بھی ہونا ہے اور قبر کا گڑھا ان کا بھی مدفن بننے والا ہے۔ اور آخرت میں انجام ان کا یہ ہوگا کہ یہ جہنم کے گڑھے میں گرا دیئے جائیں گے۔ تو جس شخص کا انجام یہ ہو اسے مال کی محبت سے کیا ملے گا اور یہ مال اس کے کس کام آئے گا۔ دنیا کی کوئی چیز قبر میں ساتھ لے کے نہیں جا سکیں گے۔ اور آخرت میں عذاب سے بچنے کیلئے اپنی دولت کو معاوضے کے طور پر بھی نہیں دے سکیں گے۔ تو پھر ایسی دولت سے ان کی محبت آخر ان کے کس کام آئے گی۔ دنیا میں بھی دولت مندوں پر جب زوال آتا ہے تو کوئی ان کی مدد کو نہیں پہنچتا اور آخرت میں بھی ان کی سب فریادیں صدا بصحرا ثابت ہوں گی۔

Marfat.com

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿۱۲﴾ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾

(بیشک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے۔ ۱۲) اور یقیناً آخرت اور دنیا کے ہم ہی مالک ہیں۔ ۱۳)

انسانوں کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے

ہم چونکہ جن وانس کے خالق ہیں تو جس طرح تخلیق کے بعد ہم نے ان کی جسمانی ضرورتوں کو اپنی ذمہ داری بنالیا ہے اور ہماری ربوبیت کا فیضان اسی ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے ہمیشہ ان کو سیراب کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ان کی معنوی اور روحانی ضرورتوں کیلئے ہم نے ان کی رہنمائی کو اپنی حکمت، اپنے عدل اور اپنی رحمت کی بنا پر اپنی ذمہ داری بنالیا ہے۔ جن چیزوں کی رہنمائی حواس اور عقل سے ممکن نہیں وحی کے ذریعے سے ہم نے مہیا فرمائی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی کی رہنمائی کیلئے کتابی صورت میں اصول وضوابط دیئے ہیں اور اس کی عملی تشکیل اور اجمال کی وضاحت کیلئے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ اس طرح سے ہم نے اپنی رہنمائی کا حق ادا کیا ہے اور اب اپنے آخری رسول اور اپنی آخری کتاب کے ذریعے قریش اور دیگر لوگوں پر اتمامِ حجت بھی کیا ہے اور رہنمائی بھی عطا فرمائی ہے۔ کیونکہ یہ ہماری رحمت اور عدل کا تقاضا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ کوئی اسے مانتا ہے یا نہیں مانتا اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے یا نہیں، یہ کام بندوں کا ہے، پروردگار کا نہیں۔ اور اسی حوالے سے وہ قیامت کے دن جواب طلبی بھی کرے گا۔ اور ساتھ ہی ایک بات کو مزید واضح فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ حیاتِ دنیا اور دولتِ دنیا میں مستغرق ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ اپنے دست وبازو اور اپنے مال و دولت سے ہوسکتا ہے۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کے مالک بھی ہم ہیں اور آخرت کے مالک بھی ہم ہیں۔ دنیا کی ہر چیز ہماری گرفت میں ہے اور آخرت میں بھی ہماری ہی حکومت ہوگی۔ تمہیں جو کچھ مل سکتا ہے دنیا اور آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مل سکتا ہے، اپنی کاوشوں سے نہیں۔ تمہاری اپنی ساری قوتیں بھی اللہ تعالیٰ کی دین ہیں۔ اس قارونی فکر نے ہمیشہ انسان کو تباہ کیا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میری اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ قارون سے بھی جب کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر اور اپنی دولت سے اللہ تعالیٰ کا اور بندوں کا حق ادا کر۔ تو اس نے جواب میں کہا تھا اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ۔ انہیں بھی اسی فکر نے گمراہ کیا۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾

(پس میں نے خبردار کردیا ہے تمہیں بھڑکتی آگ سے۔ ۱۴)

قریش کو تنبیہ

معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں براہِ راست خطاب قریش سے ہے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے ہدایت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے اپنی آخری کتاب نازل کردی ہے اور اپنا آخری رسول مبعوث کردیا ہے۔ اس طرح سے تم پر اتمامِ حجت کردی گئی ہے۔ اب تم میں سے جو شخص بھی اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے تکذیب کرتا اور منہ پھیرتا ہے وہ نہایت خطرناک صورتحال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس لئے میں نے تمہیں بروقت خبردار کردیا ہے کہ ایسے شخص کا انجام ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے جس کی شدت اور ہلاکت کا اندازہ دنیا

Marfat.com

کی آگ سے نہیں کیا جاسکتا جبکہ دنیا کی آگ بھی انسان کیلئے ناقابلِ برداشت ہے۔اس کا ایک شعلہ بھی قیامت برپا کردیتا ہے چہ جائیکہ اس کی بھڑکتی آگ کا سامنا کیا جائے۔تو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالے جانے کا تصور ہی پتہ پانی کردینے کیلئے کافی ہے۔

لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾ الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۶﴾

(اس میں نہیں جلے گا مگر وہ انتہائی بدبخت۔ ۱۵) جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔ ۱۶)

قریش اور دیگر آنحضرت ﷺ کے مخالفین بدترین انجام سے دوچار ہوں گے

قریش اور آنحضرت ﷺ کے دیگر مخاطبین کو چونکہ بروقت خبردار کردیا گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان نہیں لاؤ گے اور اس کی تکذیب کرو گے تو تمہیں ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے واسطہ پڑے گا۔اور آنحضرت ﷺ کی تبلیغ و دعوت کی وجہ سے ان پر اتمامِ حجت بھی کردیا گیا ہے، تو اب ان کی حیثیت عام کافروں جیسی نہ رہی بلکہ معاند اور بدترین کافروں جیسی ہوگئی۔جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول کو دیکھنے والا اور انتہائی نامساعد حالات میں ایمان لانے والا مقربین کی فہرست میں شامل ہوجاتا ہے اور بعد کے آنے والے لوگ اس کے برابر نہیں ہوسکتے۔اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کے رسول کی تبلیغ و دعوت کے باوجود تکذیب کرتا اور روگردانی کرتا ہے وہ صرف شقی نہیں بلکہ اشقیٰ ہوجاتا ہے۔اس لئے یہاں اشقیٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی براہِ راست دعوت پر ایمان لانے کی بجائے آپ کی تکذیب کی اور انتہائی شقاوت کا شکار ہوگئے۔اس طرح سے یہ اشقیٰ اسمِ تفضیل کے معنی میں نہیں کہ یہ بحث اٹھائی جائے کہ اس سے کم درجہ کافر لوگ بھی جہنم میں جائیں گے یا نہیں۔اور یا وہ لوگ جنہوں نے تکذیب تو نہیں کی، البتہ اپنی بدعملی کے باعث جہنم میں جانے کے سزاوار ٹھہرے۔کیونکہ مقصود اس میں دوسروں سے تقابل کرنا نہیں بلکہ ان کی شقاوت کو واضح کرنا ہے جنہوں نے آنحضرت ﷺ جیسی دلآویز شخصیت کو دیکھا، آپ کی زبانِ مبارک سے براہِ راست قرآنِ کریم سنا اور آپ کے حُسنِ کردار کو خود دیکھنے کا موقع ملا۔لیکن ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی بجائے وہ اپنی شقاوت میں بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ بدترین شقی ثابت ہوئے۔کیونکہ دوسری آیتِ کریمہ میں جوان کا جرم ذکر کیا گیا ہے کہ یہ شقی وہ شخص ہے جس نے تکذیب کی اور روگردانی کی تو یہ وہ جرم ہے جس کا ارتکاب ہر کافر نے کیا ہے۔تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوال اس جرم کا نہیں بلکہ سوال اس بات کا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کو دیکھا، ان کی زبان سے دعوت کو سنا، ان کے معجزات کو دیکھا، قدم قدم پر ان کی سچائی کے حوالے دیکھے اور پھر بھی اپنے رویئے میں تبدیلی پیدا نہ کی تو اس درجے کا بدبخت اور کون ہوسکتا ہے۔

اگر بالفرض یہ سوال اٹھا ہی لیا جائے کہ اس آیت کے اسلوب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف کافر ہی جہنم میں جائے گا حالانکہ قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص اس پر شاہد ہیں کہ مومن بھی اگر اپنے کبائر کے ارتکاب پر توبہ نہیں کرتا تو وہ بھی جہنم میں جائے گا۔البتہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا اور پھر اپنے ایمان کی برکت سے جنت میں داخل ہوجائے گا۔تو اس طرح اس آیت اور نصوص میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔تو اس کی توجیہ کرتے ہوئے بعض اہلِ علم نے یہ بات کہی ہے کہ یہاں دخولِ جہنم سے مراد وہ دخول ہے جو ہمیشہ کیلئے ہو۔ اور ایسا دخول صرف کافر کے ساتھ مخصوص ہے، مومن ہمیشہ کیلئے جہنم میں نہیں جائے گا۔

Marfat.com

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾

(اور اس آگ سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیز گار۔ ۱۷) جو اپنا مال دیتا ہے اپنے دل کو پاک کرنے کیلئے۔ ۱۸)

کفار سے برعکس صفات رکھنے والا جنت کا مستحق ہوگا

آنحضرت ﷺ کو نبوت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے سلسلے میں جس طرح ان اشقیاء سے واسطہ پڑا جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات اور ناقابلِ برداشت اذیتوں میں اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو قبول کیا۔ جنہوں نے تقویٰ کے اعلیٰ ترین مقام کو اپنی منزل بنایا اور دعوتِ حق کو کامیاب کرنے کیلئے بصد مسرت و افتخار اپنا مال ومتاع قربان کرنے کیلئے کمربستہ ہوگئے۔ اور اپنا مال ودولت انہوں نے کسی نام ونمود کیلئے نہیں بلکہ صرف اس لئے خرچ کیا تاکہ وہ اپنے دل کو گناہوں کی ہر آلودگی سے پاک کردیں۔ ان میں سے ہر شخص کو اتقیٰ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ جن حالات سے انہیں واسطہ پڑا تھا ان حالات میں ایمان لانا اور پھر اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کیلئے سب کچھ کر گزرنا یہ عام درجہ کے لوگوں کا کام نہیں۔ اس سیرت وکردار کے ہر شخص کو اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے بچائے گا۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾

(اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ ۱۹) بجز اس کے کہ وہ اپنے پروردگار کی خوشنودی کا طلبگار ہے۔ ۲۰)

سابقہ آیت کی وضاحت

یہ سابقہ آیت کی وضاحت ہے کہ یہ اقلیمِ تقویٰ کا تاجدار اپنا مال اس لئے خرچ نہیں کررہا کہ وہ کسی کا احسان اتارنے کی فکر میں ہے یا وہ کسی کے حُسنِ سلوک کا معاوضہ دینا چاہتا ہے بلکہ اس کا یہ ایثار اور سخاوت ہر طرح کی آلائشوں سے پاک، ہر طرح کی کمزوریوں سے بالا ہے۔ اس کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد ہے کہ وہ اپنے بزرگ وبرتر رب کی خوشنودی کو حاصل کرسکے۔

شانِ نزول کے مطابق اس آیت کا مصداق حضرت صدیق اکبرؓ ہیں

آیت کے الفاظ تو عام ہیں۔ جو شخص بھی ایمان کے ساتھ رضائے خداوندی کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس کیلئے یہی بشارت ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کے اصحاب سب انہیں صفات سے متصف تھے۔ لیکن شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظِ اتقیٰ سے حضرت صدیقِ اکبرؓ مراد ہیں۔ ابنِ ابی حاتم نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے کہ سات مسلمان ایسے تھے جو مکہ کے بعض کفار کے غلام تھے۔ جب وہ مسلمان ہوگئے تو ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی جانے لگیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنا بڑا مال خرچ کرکے ان کو کفار سے خرید کر آزاد کردیا۔ حضرت ابنِ عباسؓ سے یہ قول مروی ہے کہ جب حضرت بلال نے اسلام قبول کرلیا تو ان کے مالک امیہ بن خلف نے ان کو

Marfat.com

طرح طرح سے ستانا شروع کردیا۔ایک روز وہ آپ کو اذیت دے رہا تھا، آپ بار بار غش کھا رہے تھے،لیکن آپ کی زبان سے احد احد کی آواز آرہی تھی۔اس اثناء میں رحمت عالم ﷺ کا گزر ہوا۔فرمایا اَحَـدٌ یُنْـجِیْـکَ ''جس احد کا تم نام لے رہے ہو، وہی تمہیں اس ظلم سے نجات دے گا۔'' آنحضرت ﷺ نے صدیق اکبرؓ سے بلال کی یہ کیفیت بیان کی۔رازدانِ نبوت آنحضرت ﷺ کے اشارے کو سمجھ گئے۔اسی وقت گھر آئے نصف سیر سونا لے کر امیہ بن خلف کے پاس پہنچے اور پوچھا کیا تو بلال کو بیچنا چاہتا ہے۔اس کے اقرار کرنے پر آپ نے منہ مانگی قیمت دے کر حضرت بلالؓ کو خریدا اور آزاد کردیا۔اس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

آپ کے والد ابوقحافہ کو جب علم ہوا کہ ان کا بیٹا ابوبکر کمزور اور نحیف غلاموں اور باندیوں کو خرید کر آزاد کر رہا ہے، تو انہوں نے کہا میرے بیٹے تم ضعیف اور کمزور لوگوں کو آزاد کرتے ہو، اگر تم طاقتور اور بہادر غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے تو وہ کسی مشکل کے وقت تمہارے کام آتے۔آپ نے فرمایا ای ابت انما ارید ماعندالله (ابنِ کثیر) ''ابا جان میرا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔''

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿٢١﴾

(وہ ضرور اس سے خوش ہوگا۔ ۲۱)

یَـرْضٰـی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور صدیقِ اکبر دونوں ہو سکتے ہیں۔اگر فاعل اللہ تعالیٰ ہو تو جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ابوبکر پر راضی ہو جائے گا۔اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے جس طرح اس نے اپنا سب کچھ قربان کردیا ہے اس کی رضا اس کو حاصل ہو جائے گی۔اور اگر فاعل ابوبکر صدیق ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کی ایسی بارش فرمائیں گے کہ ابوبکر اپنے ربِ کریم کے لطف و کرم اور جود و عطاء کو دیکھ کر نہال ہو جائیں گے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الضُّحٰی

(۹۳)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوۡرَةُ الضُّحٰی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الضُّحٰی ہے اور یہی اس سورۃ کا پہلا لفظ ہے۔اس میں ایک رکوع، ۱۱ آیتیں، ۴۰ کلمے ۱۷۲ حروف ہیں۔

مقامِ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔

زمانۂ نزول:۔ اس سورۃ کا زمانۂ نزول متعین کرنا مشکل ہے۔اس کے مضامین میں بعض ایسے قرآئن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ آنحضرت ﷺ کو اخذِ وحی کی پوری طرح مشق نہیں ہوئی تھی۔لیکن بعد کی آیات سے گمان ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی ہے جبکہ مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی اور آنحضرت ﷺ اسلام کے مستقبل کے حوالے سے بہت متفکر تھے۔چنانچہ آپ کو تسلی دیتے ہوئے بعض پیشگوئیاں فرمائی گئی ہیں جن کے وقوع کا اس وقت کوئی امکان دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔اور انہیں کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے بعض احسانات کا ذکر فرمایا ہے۔

آغاز میں دن اور رات کی قسمیں کھا کر مخالفین کے بعض اعتراضات کا قوانینِ فطرت کی روشنی میں جواب دیا گیا ہے۔نیز اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح کائنات کی بقاء کیلئے دن کی روشنی اور رات کا سکون ایک فطری ضرورت ہے اور دن کی روشنی کو دیکھ کر کوئی شخص بھی یہ گمان نہیں کرتا کہ رات نہیں آئے گی۔یا رات کے چھا جانے کے بعد کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی کہ دن کا اجالا نہیں پھیلے گا۔اسی طرح نزولِ وحی کا چند دنوں کیلئے رک جانا رات کے سکون کی مانند ہے۔اور وحی کا نزول دن کے اجالے کی طرح ہے۔نزولِ وحی کے انقطاع سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو مراد لینا ایسا ہی ہے جیسے رات کی تاریکی سے دن کے اجالے کے بارے میں بدگمانی کرنا۔مزید فرمایا گیا ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دور میں آپ کو جن مشکلات سے سابقہ پیش آ رہا ہے یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔کامیابیوں کی سحر طلوع ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔آپ کیلئے ہر بات کا دور پہلے دور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش کی ایسی بارش ہوگی کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔پھر ان پیشگوئیوں کو محسوس شکل میں دکھاتے ہوئے ان احسانات کا ذکر فرمایا ہے جو اس سے پہلے آنحضرت ﷺ پر پروردگار نے فرمائے تھے۔آپ یتیم پیدا ہوئے تھے۔اللہ تعالیٰ نے محض اپنی رحمت سے آپ کی پرورش اور خبرگیری کا بہترین انتظام فرما دیا۔آپ حالات کے بگاڑ پر کڑھتے تھے اور لوگوں کی گمراہیوں سے دلگرفتہ ہوتے تھے۔لیکن آپ صحیح راستہ سے بے خبر تھے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس راستے سے باخبر کیا اور نبوت عطا فرمائی۔آپ نادار تھے،اللہ تعالیٰ نے آپ کی مالداری کے اسباب پیدا فرما دیئے۔اس کے بعد آپ کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کا طریقہ سکھایا گیا اور اس کی ترغیب دی گئی۔اور خلقِ خدا کے ساتھ آپ کو کیا برتاؤ کرنا چاہئے،اس کا بھی سلیقہ عطا فرمایا گیا۔اور مزید جو نعمتیں آپ پر ہونے والی ہیں ان پر بھی ادائے شکر کی تلقین کی گئی۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۱۱	سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ (۹۳)	رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾ وَ
لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ﴿۴﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ؕ﴿۵﴾
اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۠﴿۶﴾ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۠﴿۷﴾ وَ
وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ؕ﴿۸﴾ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا
السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ؕ﴿۱۰﴾ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ؑ﴿۱۱﴾

رکوع: ۱۔ (قسم ہے روزِ روشن کی۔ ۱) اور رات کی جب وہ سکون کے ساتھ چھا جائے۔ ۲) نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔ ۳) اور یقیناً آنے والی گھڑی آپ کیلئے پہلی سے بہتر ہے۔ ۴) اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔ ۵) کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا۔ ۶) اور آپ کو بے خبر پایا اور پھر ہدایت بخشی۔ ۷) اس نے آپ کو نادار پایا تو غنی کر دیا۔ ۸) پس کسی یتیم پر سختی نہ کیجئے۔ ۹) اور سائل کو مت جھڑ کئے۔ ۱۰) اور اپنے رب کی نعمت کو کھول کر بیان کیجئے۔ ۱۱)

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾

(قسم ہے روزِ روشن کی۔ ۱) اور رات کی جب وہ سکون کے ساتھ چھا جائے۔ ۲)

Marfat.com

ضُحٰی اور سَجٰی کا مفہوم

ضُحٰی چاشت کے وقت کو کہتے ہیں کیونکہ اس وقت سورج پوری آب وتاب سے چمکنے لگتا ہے۔لیکن جب اس کا استعمال رات کے مقابلہ میں کیا جائے تو اس وقت اس سے مراد صرف چاشت کا وقت نہیں بلکہ سارا دن ہوتا ہے۔اہلِ لغت بھی اور اکثر آئمہ تفسیر بھی اسی کی تائید میں ہیں۔اور قرآنِ کریم نے بھی سورۃ الاعراف میں اسی معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ارشاد ہے اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا بَیَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًی وَّهُمْ یَلْعَبُوْنَ ''کیا بستی کے باشندے اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آئے جب وہ سو رہے ہوں، کیا بستی کے باشندے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن کے وقت آئے جبکہ وہ کھیل رہے ہوں۔'' اس آیت میں ضُحیٰ سے چاشت کا وقت نہیں بلکہ سارا دن مراد ہے۔

دوسری آیت میں الَّیْلِ کے بعد سَجٰی کا لفظ آیا ہے۔اس کا معنی صرف تاریکی کا چھا جانا نہیں بلکہ ہر سو آرام وسکون کا پھیل جانا ہے۔علامہ ابنِ منظور کی یہی رائے ہے اور فراء بھی اسی کی تائید میں ہے۔ان دونوں آیتوں میں دن کی اور رات کی جب وہ پوری طرح پرسکون ہو جائے قسم کھائی گئی ہے۔اور اس کے بعد آنے والی آیت جوابِ قسم ہے۔اور ان قسموں سے اس جوابِ قسم کے مضمون پر استدلال کیا گیا ہے۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی ﴿۳﴾

(نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔ ۳)

یہ جوابِ قسم ہے اس کی وضاحت

ان آیات کے شانِ نزول میں روایات کا اختلاف پایا جاتا ہے۔لیکن یہ اختلاف حقیقت میں نہیں، تعبیر میں ہے۔مقصود دونوں سے نزولِ وحی کے انقطاع سے پیدا ہونے والی صورتحال ہے۔شیخین کی روایت تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ علالتِ طبع کے باعث دو تین روز سحری کے وقت بیدار ہو کر مصروفِ عبادت نہ ہوئے۔ابولہب کی بیوی ام جمیل جس کا مکان حضورؐ کے پڑوس میں تھا اور وہ آپ کی چچی بھی لگتی تھی۔وہ آئی اور کہنے لگی مااری شیطانک الا قد ترکک لم اره قربک منذ لیلتین او ثلاث ''میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے، دو تین رات سے میں نے اس کو تمہارے نزدیک آتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک رسول ﷺ پر وحی کا نزول بند رہا۔مختلف روایات میں یہ مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔رسول اللہ ﷺ اس پر سخت غمگین ہوئے۔وہ کان جو کلامِ الٰہی سننے کے عادی ہو چکے تھے، وہ دل جوارشادِ ربانی کا خوگر ہو چکا تھا اس کیلئے وحی کی بندش ناقابلِ برداشت تھی۔آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ آپ پر جو نئی سورۃ نازل ہوتی تھی اسے آپ لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔لیکن جب کئی روز تک کوئی نئی وحی آپ نے لوگوں کو نہیں سنائی تو مخالفین نے طعنہ زنی شروع کر دی کہ محمد (ﷺ) کو ان کے خدا نے چھوڑ دیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو گیا ہے۔قتادہ اور ضحاک کی مرسل روایات میں بھی قریب قریب یہی مضمون بیان ہوا ہے۔آنحضرت ﷺ کو اس سے یہ گمان گزرا کہ شاید مجھ سے کوئی ایسی کوتاہی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے میرے محبوب کی طرف سے عدمِ التفات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور

Marfat.com

اس وقت دشمنوں کی شماتت نے آپ کے غم میں اور اضافہ کیا۔ اس صورتحال کی وضاحت اور آنحضرت ﷺ کو تسلی دینے کیلئے یہ آیات نازل ہوئیں جس میں روشن دن اور پرسکون رات سے استدلال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا خاموش اور پرسکون ہونا اس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت ان سے ناراض ہو جاتا ہے۔ بلکہ دن کی روشنی اور رات کی پرسکون تاریکی دونوں کارِ جہاں چلانے کیلئے ناگزیر ہیں۔ اور یہ دونوں حالتیں اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے تحت طاری ہوتی ہیں۔ اسی طرح آپ پر بھی کبھی وحی کا نزول اور کبھی اس کا انقطاع اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشی یا ناراضگی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دن کی روشنی اگر طویل ہو جائے تو وہ انسان کے اعصاب کو تھکا دے بلکہ اعصاب ٹوٹ کر رہ جائیں۔ اس لئے انسانی اعمال واشغال اور کائنات کی ہماہمی کو باقی رکھنے کیلئے روشن دن کو بھی لایا جاتا ہے اور اس کے بعد رات بھی طاری کی جاتی ہے تاکہ انسانی اعصاب کو سکون ملے۔ اسی طرح وحی کی روشنی اگر مسلسل آپ پر پڑتی رہتی تو آپ کے اعصاب اسے برداشت نہ کر پاتے۔ اس لئے وحی کا نزول جس طرح دینی اور روحانی زندگی کی ضرورت ہے اسی طرح وقتاً فوقتاً اس کا رک جانا یہ بھی آپ کی قوتِ کارکردگی کی بحالی کیلئے ضروری ہے۔ اس طرح سے وحی کا نزول روزِ روشن کی مانند ہے۔ اور زمانہ انقطاع سکونِ شب کی مانند ہے۔ اور یہ دونوں ہی انسانوں کی اصلاح اور تبلیغ ودعوت کیلئے ضروری ہیں۔

وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ﴿۴﴾

(اور یقیناً آنے والی گھڑی آپ کیلئے پہلی سے بہتر ہے۔ ۴)

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور بشارت

یعنی دشمن یہ طعنہ دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چھوڑ دیا ہے لیکن ہم آپ کو خوشخبری سناتے ہیں کہ ہر آنے والی گھڑی آپ کی گزشتہ گھڑیوں سے بہتر ہوگی۔ ہر آنے والی ساعت گزری ہوئی ساعت سے بہتر پیغام لے کر آئے گی۔ یہ خوشخبری ایسے وقت میں دی جارہی ہے جب گنتی کے چند افراد نے اللہ تعالیٰ کا دین قبول کیا تھا۔ باقی تمام اہلِ مکہ آپ کے خون کے پیاسے تھے۔ وہ یہ تہیہ کر چکے تھے کہ توحید کے چراغ کو بجھا کے دم لیں گے۔ اس وقت کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہ دین چند سالوں میں اس ملک کی تاریخ بدل دے گا اور اس کی وجہ سے ہر گھر میں روشنی پہنچے گی۔ اور آج جو لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں کل یہی لوگ آپ کے اشارۂ ابرو پر جانیں قربان کرنا سعادت سمجھیں گے۔ لیکن حالات نے ثابت کر دیا کہ اس کے بعد ہر آنے والا دور پہلے دور سے بہتر ثابت ہوا۔ آپ کی قوت، آپ کی عزت و شوکت، آپ کی قدر و منزلت اور آپ کی محبوبیت بڑھتی چلی گئی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس خوشخبری میں صرف دنیوی سرافرازیاں ہی شامل نہیں بلکہ آخرت میں جو مقام و مرتبہ آپ کو ملنے والا تھا وہ بھی شامل ہے۔ اور دنیا میں بھی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہونے والا تھا ابنِ عباس کی روایت کے مطابق وہ سب کی سب فتوحات نبی کریم ﷺ کو دکھائی گئیں جسے دیکھ کر آنحضرت ﷺ بہت مسرور ہوئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔

Marfat.com

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴿٥﴾

(اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔ ۵)

سابقہ مضمون کی مزید وضاحت

اس سے پہلے کی آیت میں تو فرمایا کہ آپ کی آنے والی ہر گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہوگی اور اب اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آنے والا دور آپ کیلئے اس قدر امید افزاء اور فرحت بخش ہوگا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے انعامات پر شاداں و فرحاں ہو جائیں گے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق اسے وقوع پذیر ہونے میں ایک وقت لگے گا لیکن ''سوف'' نے یہ بات متعین کر دی کہ یہ وقت طویل نہیں ہوگا، چند سالوں میں ایک حیرت انگیز انقلاب برپا ہوگا۔ ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ یہاں وعدہ صرف آپ کو خوش کرنے کا کیا گیا ہے لیکن یہ بڑی کوتاہ فکری ہوگی اگر یہ سمجھا جائے کہ آپ کی خوشی آپ کی ذات تک محدود ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کیلئے مبعوث فرمایا یعنی آپ دینِ حق کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کرنے کیلئے تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے نام اور پیغام کو عام کرنا آپ کے پیشِ نظر تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس مقصد کو پورا کیے بغیر آپ کی خوشیاں تمام ہو جائیں۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ چند ہی سالوں میں سارا ملکِ عرب جنوبی سواحل سے لے کر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر مغرب میں بحرِ احمر تک آپ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ عرب میں بسنے والی قوم تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک قانون اور ضابطے کی پابند ٹھہری۔ آپ کی تعلیم و تربیت نے ایک ایسی مضبوط جماعت تیار کی جو آپ کے مقصد اور پیغام کی خاطر ہر قوت سے ٹکرا گئی اور جس کلمے کو حضور لے کے آئے تھے اس سے پورا ملک گونج اٹھا۔ مشرکین اور طاغوتی قوتوں نے ہر چند زور لگایا کہ آپ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں، لیکن جو طاقت بھی آپ سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی۔ آپ کے سامنے صرف سر ہی نہیں جھکے بلکہ دل بھی مسخر ہو گئے۔ اور عقائد اخلاق اور اعمال میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ علامہ آلوسی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کریمانہ وعدہ ہے جو ان تمام عطیات کو شامل ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے حضور کو دنیا میں سرفراز فرمایا۔ یعنی کمالِ نفس، اولین و آخرین کے علوم، اسلام کا غلبہ، دین کی سربلندی، فتوحات جو عہدِ رسالت میں ہوئیں اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہوئیں یا دوسرے مسلمان بادشاہوں نے حاصل کیں اور اسلام کا دنیا کے مشارق و مغارب میں پھیل جانا، نیز یہ وعدہ ان عنایات اور عزت افزائیوں کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم کیلئے آخرت کیلئے محفوظ رکھی ہیں جن کی حقیقت اور نہایت کو اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں جان سکتا۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰى ﴿٦﴾

(کیا اس نے آپ کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا۔ ٦)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی زندگی کے بعض حالات سے استدلال

دشمن یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چھوڑ دیا ہے اور وہ آپ سے ناراض ہو گیا ہے، کیا انہیں معلوم نہیں کہ ہمارا آج تک آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیسا محبت کا تعلق رہا ہے۔ آپ شکمِ مادر میں تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پیدا ہوئے تو آپ یتیم تھے۔ والد ماجد نے کوئی ایسی میراث نہ چھوڑی تھی جو آپ کی پرورش کا ذریعہ بن سکتی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دن بھی آپ کو بے سہارا نہ چھوڑا۔ چھ سال کی عمر تک والدہ ماجدہ نے آپ کی پرورش کی۔ ان کی شفقت سے محروم ہوئے تو آٹھ سال کی عمر تک جدِ امجد کی غیر معمولی شفقت کے سائے میں پروان چڑھے۔ دادا کو نہ صرف آپ سے بے انتہا پیار تھا بلکہ انہیں آپ پر فخر بھی تھا۔ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا ایک دن دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ جب وہ بھی داغِ مفارقت دے گئے تو آپ کے حقیقی چچا ابو طالب نے آپ کی کفالت اپنے ذمہ لی۔ انہوں نے تادمِ واپسی اس خدمت کو اس حُسن وخوبی سے انجام دیا کہ اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ حتیٰ کہ نبوت کے بعد جب ساری قوم آپ کی دشمن ہو گئی تھی اس وقت بھی دس سال تک وہی آپ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿۷﴾

(اور آپ کو بے خبر پایا اور پھر ہدایت بخشی۔ ۷)

گزشتہ مضمون کی وضاحت اور ضَآلٌ کا مفہوم

ضَآلًّا ...... ضلالت سے اسمِ فاعل ہے۔ عام طور پر ضلالت کا جو مفہوم سمجھا جاتا ہے وہ ہے راہِ راست سے بھٹک جانا، گمراہ ہو جانا، عقیدہ وعمل میں غلط راستہ اختیار کرنا، لیکن قرآن وسنت اور تاریخ وسیرت سے آنحضرت ﷺ کے جو حالات ثقہ ذرائع سے ہم تک پہنچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے عقیدہ وعمل میں ضلالت کا شائبہ تک نہ تھا۔ آپ اعلانِ نبوت سے پہلے بھی عقیدہ وعمل کی ہر کجی سے پاک تھے۔ آپ کبھی بت پرستی، شرک یا دہریت میں مبتلا نہیں ہوئے۔ زمانۂ جاہلیت کی لغویات سے آپ کا دامن ہمیشہ محفوظ رہا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے آپ کی قبل از نبوت کی زندگی کو آپ کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ وَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖٓ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ''میں نے اپنی عمر اس سے پہلے تمہارے درمیان گزاری ہے کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔''

ضلالت کا لفظ اور بھی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ گمراہی کے معنی میں جیسا کہ عرض کیا گیا ہے آنحضرت ﷺ کیلئے استعمال کرنا خلافِ واقعہ بھی ہے اور خلافِ عقل بھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے معنوں میں سے کون سا معنی ایسا ہے جو اس آیت کے سیاق وسباق اور آنحضرت ﷺ کی زندگی سے مطابقت رکھتا ہے۔ علامہ قرطبی نے آیت کی وضاحت کرتے ہوئے جو معنی مراد لئے ہیں وہ آیت کے مفہوم سے عین مطابقت رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ضلالت کا لفظ غفلت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسَى ''میرا رب نہ کسی چیز سے غافل ہوتا ہے اور نہ کسی چیز کو فراموش کرتا ہے۔'' مذکورہ آیت میں ضَآلًّا غافل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی آپ قرآن اور احکامِ شرعیہ کو پہلے نہیں جانتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کا علم بھی بخشا اور احکامِ شرعیہ کی تفصیلات سے بھی آگاہ فرمایا۔

Marfat.com

تفسیر کبیر کے مصنف فرماتے ہیں کہ ضَالٌّ ایسے درخت کو کہتے ہیں جو کسی وسیع صحرا میں تنہا کھڑا ہو اور مسافر اس کے ذریعے اپنی منزل کا سراغ لگائیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جزیرۂ عرب ایک سنسان ریگستان تھا جس میں کوئی ایسا درخت نہ تھا جس پر ایمان وعرفان کا پھل لگا ہو۔ صرف آپ کی ذات جہالت کے اس صحرا میں ایک پھلدار درخت کی مانند تھی۔ پس ہم نے آپ کے ذریعہ سے مخلوق کو ہدایت بخشی۔

بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ جویائے راہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آپ نے رسوم وروایات اور خاندان کے بزرگوں سے دین کی جو وراثت پائی تھی آپ کی فطرتِ سلیمہ ایک لحہ کیلئے اس پر مطمئن نہ ہو سکی۔ اور عرب معاشرے کی حالت اور ان کا بڑھتا ہوا بگاڑ بجائے خود اس بے اطمینانی میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔ مذاہب کے دعویدار کوئی ایسی راہ نہ دکھا رہے تھے جس سے حق کے متلاشی کو سکون اور اطمینان ملتا۔ آپ اپنی فطرتِ سلیم کے باعث فطرت کی بدیہیات پر پوری طرح عامل تھے۔ عقائد واعمال کی وہ باتیں جو فطرت کی راہ سے ملتی ہیں آپ کی زندگی میں روشن تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے چونکہ آپ کو معصوم پیدا فرمایا تھا اس لئے عقیدہ وعمل کی کوئی خرابی آپ کے اندر راہ نہیں بنا سکی۔ بااین ہمہ آپ اس بات پر مضطرب تھے کہ میں جس اللہ کو مانتا ہوں اس کی صفات اور ان صفات کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں، اس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے ہیں اور انہیں کس طرح ادا کرنا ہے، زندگی کی ایسی ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ زندگی کا ہر گوشہ اللہ تعالیٰ کی پسند میں ڈھلتا چلا جائے۔ ان سوالات کا جواب ڈھونڈنے کیلئے آپ خلوت وجلوت کے ہر گوشے میں فکر وجستجو کی ہر صلاحیت کو صرف کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ غارِ حرا کی تنہائیوں میں اسی فکر میں مستغرق تھے کہ وحی الٰہی کے نور نے ان تاریکیوں کو روشن کر دیا۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿۸﴾

(اس نے آپ کو نادار پایا تو غنی کر دیا۔ ۸)

مزید وضاحت

عَآئِلٌ کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) تنگدست، (۲) اہل وعیال والا۔ آپ دونوں معنوں میں عَآئِلٌ تھے۔ کیونکہ آپ کے والد ماجد نے میراث میں صرف ایک اونٹنی اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔ اس طرح آپ کی زندگی کی ابتداء افلاس کی حالت میں ہوئی۔ دادا کی زندگی میں تو آپ کیلئے کوئی مالی پریشانی نہ تھی، لیکن ان کی رحلت کے بعد جب آپ کی کفالت کی ذمہ داری حضرت ابو طالب نے قبول کی تو بلاشبہ انہوں نے آپ کی حفاظت وصیانت اور آپ کی مدد اور دستگیری میں کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ تاریخ کی گواہی ان کے بارے میں یہ ہے کہ هو قليل المال و كثير العيال ''کہ وہ تنگدست اور کثیر العیال تھے۔'' اسی وجہ سے ان کے ایک بچے عقیل کی پرورش حضرت عباسؓ نے کی۔ اور حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ کے زیر کفالت رہے۔ اس لئے آپ نے لڑکپن میں بکریاں چرائیں اور اپنی ضروریات کا بوجھ خود اٹھایا۔ لیکن شعور کی عمر کو پہنچتے ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے راہِ تجارت کو آسان کر دیا۔ آپ پہلے اپنے محترم چچا کے ساتھ اور پھر تنہا تجارت کیلئے نکلے۔ آپ کی کامیابی کی خبر سن کر حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے جو مکہ کی نہایت مالدار خاتون تھیں اپنا تجارتی قافلہ لے جانے کی پیشکش کی۔ اس طرح سے آپ ان کی تجارت میں

Marfat.com

شریک ہو گئے۔ ان کو جیسے ہی آپ کی ذاتی خوبیوں کا اندازہ ہوا تو انہوں نے بڑوں کے واسطے سے آپ کے ساتھ شادی کر لی۔ اس طرح سے ان کا تمام تجارتی کاروبار آپ نے سنبھال لیا۔ اور آپ نہ صرف مالدار ہو گئے بلکہ رشک کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ لیکن یہ تو وہ غنا اور مالداری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسباب و وسائل کی دنیا میں آپ کو عطا فرمائی۔ لیکن فقر و غنا کا تعلق صرف ظاہری اسباب ہی سے نہیں قلب کے احوال سے بھی ہے۔ آدمی کا سینہ ایمان سے خالی ہو تو وہ محتاج ہوتا ہے اگرچہ اس کے پاس قارون کا خزانہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر اس کا سینہ ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت و عشق سے مامور ہو تو وہ غنی ہے اگرچہ وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی طرح کمبل کی پوشاک پہنتا اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارا کرتا ہو۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ یہاں جس غنا کا ذکر ہے اور جس سے آنحضرت ﷺ کو مالا مال کیا گیا اس کا تعلق صرف مال و دولت سے نہیں بلکہ یہ وہ دولت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سینے میں اتاری اور اس سے آپ کو وہ آسودگی اور استغناء نصیب ہوا جو سیم و زر کی فراوانی سے کبھی نہیں ہوتا۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ ۹

(پس کسی یتیم پر سختی نہ کیجئے۔ ۹)

اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے پہلے احسان کا حق

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر جو احسانات کئے جن کا اوپر کی آیات میں ذکر ہوا ہے پیشِ نظر آیت اور بعد کی آیات میں ان انعامات و احسانات کا حق بیان فرمایا گیا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ آپ یتیم تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے کفالت و شفقت کا غیر معمولی انتظام فرمایا۔ اس انعام کا حق یہ ہے کہ آپ کسی یتیم پر سختی نہ فرمائیں۔ آپ کی بے پایاں شفقت و محبت کا دروازہ کھلا رہنا چاہئے۔ چنانچہ اسی ہدایت کا نتیجہ ہے کہ آپ کی ذات ہر یتیم و مسکین کیلئے سرتاپا شفقت و رحمت تھی۔ حتیٰ کہ غیر مسلموں نے بھی اسے تسلیم کیا۔ ہری چند اختر کا شعر ہے:

جس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِّ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

آپ نے اپنی امت کے ہر صاحب حیثیت شخص کو یتیموں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا حکم دیا اور اس کے اس حد تک فضائل بیان کئے کہ صاحب حیثیت لوگوں کے گھر یتیموں کے اپنے گھر بن گئے۔ اور آپ نے اس گھر کے بارے میں جس میں کوئی یتیم پرورش نہ پاتا ہو، ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ فضیلت کے حوالے سے بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا **انا و كافل اليتيم فى الجنة كهاتين و اشار بالسبابة و الوسطى** "میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں ساتھ ساتھ ہوں گے، پھر اپنی انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا۔" حضرت ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جب یتیم روتا ہے تو خداوندِ رحمٰن کا عرش لرزنے لگتا ہے۔

Marfat.com

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿١٠﴾

(اور سائل کو مت جھڑکیے۔ ۱۰)

دوسرے احسان کا حق

سائل کے دو معنی ہیں (۱) مدد مانگنے والے حاجت مند کو کہتے ہیں، (۲) دین کی کوئی بات پوچھنے والا یا شریعت کا کوئی حکم معلوم کرنے والا۔ یہاں دونوں ہی مراد ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جو حاجت مند آپ کے دروازے پر مدد مانگنے کیلئے آئے آپ اس کی مدد کر سکتے ہیں تو کر دیجئے۔ اور اگر حالات ایسے ہیں کہ آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے تو نرمی کے ساتھ معذرت کر دیجئے۔ مگر کسی حال میں بھی اسے ڈانٹ ڈپٹ نہ کیجئے اور جھڑک کر دور نہ ہٹائیے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے شکر کے طور پر ہے کہ آپ نادار تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مالدار کر دیا۔ چنانچہ اس ہدایت کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ نے زندگی بھر کبھی کسی سائل کو خالی نہیں لوٹایا۔ پاس ہوا تو عطا کر دیا اور نہ ہوا تو فرمایا کہ میرے نام پر قرض لے لو، میں ادا کر دوں گا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ اپنی چادر دے دی یا قمیض اتار کر نذر کر دی۔ "لا" آپ کی زبان پر کبھی نہ آیا۔ جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو ڈھیروں مال آپ کی خدمت میں پہنچنے لگا لیکن آپ کا حال ہمیشہ یہ رہا:

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اور اپنا یہ حال کہ ہے چولھا بجھا ہوا

ترمذی شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ بحرین سے نوے ہزار درہم آئے۔ آپ نے مسجد میں ایک چٹائی بچھا کر ان کا ڈھیر لگا دیا۔ نماز فجر ادا کرنے کے بعد ان کو بانٹنا شروع کیا اور ظہر تک ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔ جب سب درہم بانٹ دیئے گئے تو اتفاقاً ایک سائل آ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اب تو کوئی چیز باقی نہیں رہی، البتہ تم کسی دکاندار کے پاس چلے جاؤ، تمہیں جس چیز کی ضرورت ہے اس سے لے لو اور اسے کہو کہ وہ میرے نام لکھ دے میں اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ جو شخص کوئی حکمِ شریعت معلوم کرنے آئے وہ کیسا ہی جاہل اور اجڈ ہو اور کیسی ہی نامعقولیت سے سوال کرے آپ بہرحال شفقت کے ساتھ اسے جواب دیجئے۔ اور یہ اس احسان کا حق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ آپ راہ سے بے خبر تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت بخشی۔ چنانچہ اس احسان پر شکر کا نتیجہ تھا کہ اجڈ سے اجڈ بدو نہایت اکھڑ پن سے آپ سے سوال کرتے لیکن آپ مسکراتے ہوئے انہیں جواب دیتے۔ حتیٰ کہ ایک بدو نے آپ کے سامنے مسجد میں پیشاب کر دیا، آپ نے اسے ڈانٹنے کی بجائے پاس بلا کر سمجھایا۔ اور وہ زندگی بھر لوگوں سے یہ کہتا رہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں نے آپ سے بڑھ کر کوئی شفیق معلم اور مربی نہیں دیکھا۔

Marfat.com

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾

(اور اپنے رب کی نعمت کو کھول کر بیان کیجئے۔ ۱۱)

نعمت کی وضاحت

آیتِ کریمہ میں جس نعمت کا ذکر فرمایا گیا ہے سوال یہ ہے کہ وہ نعمت کونسی ہے۔ روح المعانی میں علامہ آلوسی فرماتے ہیں اس نعمت سے مراد وہ گوناگوں نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک ﷺ پر فرمائیں۔ جن میں سے چند وہ ہیں جن کا ذکر ابھی اوپر ہو چکا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو بے شمار احسانات کئے اور جن بے پایاں نعمتوں سے نوازا وہ بھی مراد ہیں اور وہ نعمتیں بھی مراد ہیں جن سے قیامت کے دن آپ کو نوازا جائے گا۔ دنیا کی نعمتوں کو تو لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن اخروی نعمتوں کا ذکر حضور خود فرماتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیتے تھے کہ یہ میرے اللہ کی دین ہیں اور اس کی عطا ہے۔ حضرت ابوسعید کہتے ہیں اور اسے مشکوٰۃ شریف اور ترمذی میں روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا۔ میں یہ بات فخریہ نہیں کہہ رہا بلکہ حقیقت کا اظہار ہے۔ اس روز پرچم میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں اس پر فخر نہیں کرتا۔ اس دن تمام نبیوں کو میرے پرچم کے نیچے پناہ ملے گی اور قیامت کے دن سب سے پہلے زمین سے میں باہر آؤں گا اور میں اس پر فخر نہیں کرتا۔ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے اس میں سب سے بڑی نعمت حکمت اور شریعت کی دولت ہے جس کے بارے میں قرآنِ کریم خود کہتا ہے وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ''اور جس کو حکمت دے دی گئی اس کو خیرِ کثیر کا خزانہ بخشا گیا۔'' یہی حکمت کی نعمت ہے جو حدیث اور سنت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اور آپ کا وہ اسوہ جس نے عملی شکل میں انسانوں کو انسانیت کا درس دیا اور وہ قربِ الٰہی کی کیفیات جنہیں کبھی صرف محسوس کیا جا سکتا تھا عملی شکل میں صحابہ کے سامنے آئیں اور زندگی کے ہر میدان میں جس نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کے احکام کو حالات کے تناظر اور رضائے خداوندی کی روشنی میں تنفیذ و تشکیل کے مراحل سے گزارا۔ ان تمام نعمتوں کے ذکر کا آپ کو حکم دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور ادائے شکر کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ انہیں لوگوں کے سامنے بیان فرمائیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اعلان بھی فرمائیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے ورنہ کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ اور مزید یہ کہ آپ نے ہر نعمت کا شکر اس طرح ادا کیا کہ اس نعمت کے حوالے سے جو آپ پر حق عائد ہوتا تھا وہ ادا فرمایا۔ نعمتِ نبوت کا حق تبلیغ و دعوت کی صورت میں ادا کیا۔ نعمتِ قرآن کا حق آپ نے اس طرح ادا فرمایا کہ اس کے الفاظ و معنی اور اس کے مفہوم و مدلول کو لوگوں کے ذہنوں میں بھی اتارا اور اس کی عملی تشکیل بھی فرمائی۔ نعمتِ ہدایت کا حق ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ دکھایا اور اس راہ میں آنے والی تلخیوں اور ترشیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ غرضیکہ اس مختصر سی آیت میں اپنی نعمتوں کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی دی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ان کے ذکر و اظہار کا حکم بھی دیا گیا تاکہ اہلِ دنیا کو اندازہ ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اور آپ نے اپنی عملی زندگی سے اس کے ذکر و اظہار کی صورتیں بھی متعین فرما دیں۔

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ اَلَمْ نَشْرَحْ

(۹۴)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُورَۃُ اَلَمْ نَشْرَحْ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلاِنْشِرَاحْ ہے جو اَلَمْ نَشْرَحْ سے بابِ انفعال کا مصدر ہے۔اس سورۃ کو اَلَمْ نَشْرَحْ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔اس میں ایک رکوع، آٹھ آیتیں، ستائیس کلمے اور ایک سو تین حروف ہیں۔

مقامِ نزول:۔ اس کا نزول مکہ معظمہ میں سُوْرَۃُ الضُّحٰی کے مابعد ہوا ہے۔

سورۃ کے مضامین:۔ یہ سورۃ سابق سورۃ کی مثنیٰ معلوم ہوتی ہے۔سابق سورۃ میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی تھی، یہاں اسی مضمون کی تکمیل فرمائی گئی ہے۔تسلی کا مضمون استفہامی شکل میں ادا فرمایا گیا ہے تاکہ آپ پر جو اللہ تعالیٰ کے احسانات ہوئے ہیں ان کا پوری طرح استحضار ہو جائے۔اس کی ضرورت شاید اس لئے محسوس فرمائی گئی ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی ہے آپ اس وقت نہایت منفعل اور انتہاء درجہ پریشان تھے۔کیونکہ دعوتِ اسلامی کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی آپ کو غیر متوقع صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔آپ کو کبھی اس بات کا خیال بھی نہ گزرا تھا کہ جس معاشرے کے لوگ میرے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں اور جہاں چھوٹے بڑے، غریب اور امیر میری عزت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں وہ نبوت کے اعلان کے ساتھ ہی میری دشمنی پر تل جائیں گے۔میرے قرابتدار، میرے اہلِ قبیلہ اور میرے احباب سب نظریں پھیر لیں گے اور قدم قدم پر میرے لئے مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں گے۔آپ نے حالات کی اس تبدیلی کو بہت محسوس فرمایا۔چنانچہ ان حالات میں آپ کی تسلی اور تشفی کیلئے سورۃ الضحیٰ سے آگے تک مسلسل کئی سورتیں آپ پر نازل فرمائیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان و اکرام اور آپ کے فضائل کو ذکر فرمایا۔چنانچہ پیشِ نظر سورۃ بھی اسی تناظر میں نازل فرمائی گئی جس میں خاص طور پر اپنے تین انعامات کا ذکر فرمایا۔ (۱) شرح صدر کی نعمت، (۲) یہ نعمت کہ آپ کی کمر سے وہ بوجھ اتار دیا گیا جو آپ کی کمر کو توڑے ڈال رہا تھا، (۳) رفعِ ذکر کی نعمت۔

اس کے بعد یہ کہہ کر آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ ہر تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے۔آپ کی مشکلات جو درحقیقت اس راستے کی لازمی سنت ہے اس کا دور ختم ہونے والا ہے۔تعلیم و تربیت اور صدق و کذب کے حوالے سے مشکلات سے گزارنا بہت ضروری ہوتا ہے۔لیکن صبر و استقامت سے مقابلہ کرنے والوں کیلئے یہ دور بہت طویل نہیں ہوتا۔رات ضرور طاری ہوتی ہے لیکن طلوعِ سحر بہت دور نہیں ہوتا۔مشکلات کا یہ دور بہت جلد ختم ہو جائے گا۔

آخر میں آپ کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے آپ کو جس طاقت کی ضرورت ہے وہ سرچشمۂ طاقت و قدرت کے ساتھ بیش از بیش وابستگی سے میسر آئے گی۔اس لئے جیسے ہی آپ اپنے مشاغل سے فارغ ہوں چاہے وہ مشاغل عبادت سے متعلق ہوں یا دعوت و تبلیغ سے یا اپنے ناگزیر ذاتی کاموں سے، تو پھر ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنے رب سے لو لگا لیں۔اگرچہ تبلیغ و دعوت بھی ایک عبادت ہے لیکن اس میں علاقہ چونکہ بندوں سے ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کامل یکسوئی نہیں ہوتی۔اس سے فراغت کے بعد ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں، وہیں سے تازہ بہ تازہ وہ توفیق میسر آئے گی جو نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور طاقت دیتی ہے۔

Marfat.com

رُکُوعَاتُھَا ۱	سُوْرَۃُ اَلَمْ نَشْرَحْ مَکِّیَّۃٌ (۹۴)	اٰیَاتُھَا ۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝۲ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝۳ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۶ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝۷ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝۸

رکوع: ۱۔ (اے نبی کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کھول نہیں دیا۔ ۱) اور ہم نے اتار دیا ہے آپ سے آپ کا بوجھ۔ ۲) جو آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ ۳) اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کر دیا۔ ۴) پس یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ۵) بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ۶) اور جب آپ فارغ ہوں تو کمربستہ ہو جائیں۔ ۷) اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جائیں۔ ۸)

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝۱

(اے نبی کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کھول نہیں دیا۔ ۱)

شرح صدر کا مفہوم

اعلانِ نبوت کے بعد آپ کو تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آئیں اس کا سبب ایک تو قریش اور دیگر اہلِ مکہ کے خیالات کا جمود اور اپنے اعتقادات پر خطرناک حد تک تعصب تھا کہ وہ ان سے مختلف بات سننے کے روادار تک نہ تھے۔ اور دوسری یہ بات کہ مسلسل جہالت اور جاہلیت نے ان کے دل و دماغ کے سانچے ایسے بنا دیئے تھے کہ ان کی کجیوں کو درست کرنا اور ان کے پھرے

Marfat.com

ہوئے زاویوں کو راست کرنا انتہائی مشکل کام ہو گیا تھا۔ وہ سہل سے سہل بات اور سیدھی سے سیدھی بات بھی آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اور مزید مشکل یہ تھی کہ انہیں یہ بھی برداشت نہ تھا کہ اس معاشرے میں ان کے خیالات اور اعتقادات کیخلاف کوئی بات کہی جائے اور وہ خاموش رہیں، بلکہ وہ تو مشتعل ہو کر ہر ایسی زبان کو خاموش کر دینے کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ ایسا ہمہ جہت قسم کا بگاڑ اور ایسی مشکل قوم کا سدھار چونکہ نہایت تکلیف دہ کام تھا اس لئے آنحضرت ﷺ کی طبیعت پر بہت گراں گزر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو آسان کرنے کیلئے آپ پر جو احسانات فرمائے ان میں سے پہلا احسان یہ ہے جسے سوالیہ انداز میں آپ سے کہا جا رہا ہے کہ کیا ہم نے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ سینہ کھول دینا جسے شرح صدر سے تعبیر کیا گیا ہے اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے دو طرح سے استعمال کیا ہے۔ جس سے اس کے دو مفہوم متعین ہو جاتے ہیں۔ سورۃ انعام آیت ۱۲۵ میں ارشاد فرمایا فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ''جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام جو اعتقادات پیش کرتا ہے، جن بنیادی حقائق پر اصرار کرتا ہے، تمدن و تہذیب کے جن اصولوں کو پیش کرتا ہے اور اخلاق کی جن بنیادوں کو استوار کرتا ہے اور تحلیل و تحریم کے حوالے سے جو احکام دیتا ہے اسلام لانے والے کے دل و دماغ میں ان کی سچائی اور حقانیت اتر جاتی ہے۔ اس کے دل و دماغ میں شک و شبہ کی پرچھائیں تک باقی نہیں رہتی۔ آنحضرت ﷺ کا شرح صدر کرنے کا یہ بھی ایک مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو شریعت آپ کو دی اور آپ نے دین کے جن حقائق کو پیش کیا آپ نے لوگوں کو جن اعتقادات کی دعوت دی، آپ نے معاشرت، معیشت، سیاست، حکومت، اخلاق، تہذیب اور تمدن کے جن اصولوں کو لوگوں کے سامنے پیش کیا ان میں سے ایک ایک چیز کا یقین آپ کے دل و دماغ میں حق الیقین تک پہنچ گیا۔ ایک مومن کیلئے ان اصولوں پر علم الیقین کافی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے رسول کو صرف ان بنیادی حقائق کی تعلیم ہی دینا نہیں ہوتی بلکہ آپ اس اطمینان کی کیفیت کو بھی ان کے دلوں میں انڈیلنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے اور خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ایک پیغمبر کیلئے صرف علم الیقین کافی نہیں ہوتا بلکہ وہ عین الیقین سے گزر کر حق الیقین تک پہنچ جاتا ہے۔ شریعت کے مطالبات اس کے نزدیک طبیعت کے مطالبات بن جاتے ہیں اور یہی وہ شرح صدر ہے جس سے آپ کو نوازا گیا تھا۔

قرآنِ کریم نے دوسری جگہ اسے ایک اور مفہوم میں بھی پیش کیا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے عظیم منصب پر مامور فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ فرعون کے پاس جائیں اور اس کی عظیم سلطنت اور اقتدار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے صاف صاف اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا دین پیش کریں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ ''میرے رب میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے۔'' چنانچہ اس کے تدارک کیلئے سورۃ طٰہٰ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ''میرے رب میرا سینہ میرے لئے کھول دے اور میرا کام میرے لئے آسان کر دے۔'' یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوت کا کارِ عظیم سنبھالنے اور تنِ تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے اور کسی بڑی سے بڑی مہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں اسے تامل نہ ہو۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کے سینہ کھول دینے سے یہ دوسرا معنی بھی مراد ہوسکتا ہے کہ آپ کو جن فرعونوں سے واسطہ پڑا ان میں سے ایک ایک شخص اپنی ذات کے پندار میں اس طرح غرق تھا کہ اپنے خیالات سے مختلف بات سننا اسے گوارا نہ تھا۔ طائف کے سرداروں نے آپ کی دعوت کے جواب میں جو کچھ کہا اس کا ایک ایک لفظ اس پر شاہد ہے۔ اشرافِ قریش بھی آنحضرت ﷺ کی دعوت کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ آپ کو ہر طرح کی اذیت پہنچائی گئی۔ لیکن آپ کے قتل کی منصوبہ بندی میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ وہ جانتے تھے کہ آپ کے قتل کی صورت میں قبائل میں لڑائی چھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کا اس طرح سے شرح صدر فرمایا کہ ان تمام فرعونوں کو آپ کی نگاہوں میں کٹ پتلیاں بنا دیا۔ آپ ان کی ثروت و وجاہت سے مرعوب ہونا تو دور کی بات ہے آپ ان کو خاطر میں لانے کیلئے بھی تیار نہ تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے وہ حوصلہ، وہ ہمت، وہ اولوالعزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرمائی جو اس منصبِ عظیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کیلئے درکار تھی۔ آپ تنِ تنہا ان کے مقابلے کیلئے اٹھے پھر آہستہ آہستہ ایک قافلے کی صورت بنتی گئی۔ آخر آپ نے ان تمام جتھوں کو توڑ ڈالا جو اسلام کی راہ میں مزاحم تھے۔ اور اس راستے میں مخالفت کے بڑے بڑے طوفان اٹھے، دشمنی نے نہایت ہولناک صورتیں اختیار کیں۔ لیکن آپ ہر طرح کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر نہایت اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنے راستے پر آگے بڑھتے گئے۔

اس کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ نفس کو قوتِ قدسیہ اور انوارِ الٰہیہ سے اس طرح منور کر دیا جائے کہ وہ معلومات کے قافلوں کیلئے میدان بن جائے، ملکات کے ستاروں کیلئے آسمان بن جائے اور گوناگوں تجلیات کیلئے عرش بن جائے۔ جب کسی کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو اس کو ایک حالت دوسری حالت سے مشغول نہیں کر سکتی۔ یہاں صدر کا یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں اس میں علوم و معارف کے سمندر اتار دیئے اور لوازمِ نبوت اور فرائضِ رسالت برداشت کرنے کو بڑا وسیع حوصلہ دیا۔

آنحضرت ﷺ کی ساری زندگی اس آیت کی آئینہ دار ہے۔ آپ نے جس بلند حوصلگی اور اولوالعزمی سے فرائضِ نبوت کو ادا کیا، جس صبر اور شکر کے ساتھ اس راہ میں آنے والی مشکلات کو برداشت کیا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرح صدر کے بغیر ممکن نہ تھا۔ پھر آپ نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے علم کے نور سے منور کیا۔ اس کو بھی شرح صدر کی برکت کے بغیر اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿٢﴾ الَّذِيٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿٣﴾

(اور ہم نے اتار دیا ہے آپ سے آپ کا بوجھ۔ ۲) جو آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ ۳)

نبوت اور نزولِ قرآن نے آپ کے شدید احساس کا بند تالا کھول دیا

نبوت سے پہلے اپنی طبع سلیم اور خداداد معصومیت کے باعث نہ صرف کہ کسی ایسے کام کے قریب نہیں جاتے تھے جن کاموں میں آپ کی قوم ملوث تھی، بلکہ آپ ان کاموں سے ایسی گھن محسوس کرتے تھے جس طرح ایک صاف ستھرا اور مہذب آدمی گندگی سے گھن محسوس کرتا ہے۔ آپ دیکھتے تھے کہ بے جان بتوں کو پوجا جا رہا ہے، شرک اور مشرکانہ اوہام اور رسوم کا بازار گرم ہے، اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، قمار بازی اور شراب نوشی میں اپنی صحت و دولت کو برباد کیا جا رہا ہے، غریبوں پر ظلم توڑے جا رہے ہیں اور ان کے حقوق کو پامال کیا

Marfat.com

جارہا ہے، لڑکیاں زندہ دفن کی جارہی ہے، قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے ہیں، باہمی جنگ وجدال اور قتل وغارت، اخلاقی پستی، معاشی بدحالی اور سیاسی ابتری کو دیکھ کر حضور کا دل کڑھتا تھا۔ اور آپ کا یہ اضطراب روز بہ روز بڑھتا جارہا تھا۔ لیکن آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس صورتحال کو کس طرح بدلا جائے۔ اس بگاڑ کو دور کرنے کی آپ کو کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہی فکر تھی جو آپ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا، آپ کو ایک صحیفۂ رشد وہدایت عطا فرمایا، دینِ اسلام جیسا جامع اور مکمل نظامِ حیات مرحمت فرمایا اور توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان کی شہ کلید دے کر انسانی زندگی کے ہر بند تالے کو کھولنے کا امکان پیدا کر دیا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا کہ اس سے انسانوں کی قسمت بدلی جاسکتی ہے اور پوری نوع انسانی کی ان خرابیوں کو دور کیا جاسکتا ہے جس نے انسانوں کی قسمت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس بوجھ کو ہلکا کر دیا جس نے آپ کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور آپ کو گراں بار کر دیا تھا۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾

(اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کر دیا۔ ۴)

آپ کے نام اور آپ کے لائے ہوئے دین کا چار دانگِ عالم میں چرچا کر دیا

جس زمانہ میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے کوئی شخص سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کبھی ایسا ممکن بھی ہوسکتا ہے کیونکہ اس وقت نبی کریم ﷺ چند ساتھیوں کے ہمراہ چھپ کر نمازیں ادا کر رہے تھے۔ آپ کا چرچا اور آپ کا آوازہ وہ بھی مخالفانہ انداز میں مکے کی حدود تک محدود تھا۔ اہلِ مکہ کی پوری کوشش تھی کہ باہر سے آنے والا کوئی شخص آپ سے ملنے نہ پائے تاکہ آپ کی دعوت باہر نہ پہنچے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں دشمنوں کو اس کا ذریعہ بنا دیا۔ حج کے موقع پر تمام عرب سے لوگ مکہ معظمہ میں جمع ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں کفار کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک خطرناک شخص محمد (ﷺ) نام کا ہے جو لوگوں پر جادو کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں ہر گھر میں ایک لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ باپ بیٹے سے الجھتا ہے اور بیٹا باپ سے۔ ماں بیٹی سے الگ ہو جاتی ہے اور بیٹی ماں سے۔ خاندان کا شیرازہ بکھرتا جارہا ہے۔ ہم تو ایک مصیبت میں مبتلا ہیں، تم اس آدمی سے بچ کے رہنا تاکہ اس کا اثر تمہارے قبیلوں تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپ کا نام پہنچ گیا۔ اور تمام قبائل میں آپ کی دعوت کو جاننے کیلئے سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ لوگوں میں یہ خواہش توانا ہونے لگی کہ معلوم تو کیا جائے کہ آخر وہ شخص کیا کہتا ہے۔ اس طرح سے آپ کی دعوت اور آپ کا پیغام دور دراز قبیلوں میں پہنچنا شروع ہو گیا۔ پھر جیسے جیسے لوگوں کو آپ کے اخلاق اور آپ کی سیرت وکردار کا حال معلوم ہوا اور بعض لوگوں نے چھپ چھپ کر آپ کی دعوت کے بارے میں آگاہی حاصل کی، آپ سے قرآنِ کریم سنا تو وہ ایمان کی دولت لے کر اپنے قبیلوں میں پہنچے۔ پھر ہجرت کے بعد اس دعوت کی اشاعت میں اور تیزی آئی۔ اب کوئی قبیلہ ایسا نہ رہ گیا جس کا کوئی نہ کوئی آدمی اسلام کی دعوت سے متاثر نہ ہوا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب واقعہ یہ ہوا کہ ہجرت سے پہلے تو صرف مشرکینِ مکہ ہی رسول اللہ ﷺ کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے اور اس طرح سے آپ کی شہرت پھیل رہی تھی، لیکن ہجرت کے بعد منافقین اور یہود بھی اس کام میں شریک ہو گئے اور اس طرح سے حضور کے نام کو اور شہرت ملی اور ساتھ

Marfat.com

ہی ساتھ مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست جو خدا پرستی، خداترسی، زہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حُسنِ معاشرت، انسانی مساوات، جود و کرم، غریبوں کی خبر گیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راست بازی کا عملی نمونہ پیش کر رہی تھی اس کے اثرات بھی روز بروز پھیلنے لگے اور دلوں کی تسخیر کا کام آگے بڑھنے لگا، جس کا نتیجہ چند ہی سالوں میں یہ نکلا کہ ہر جگہ اسلام غالب آتا گیا، کفر مغلوب ہوتا گیا اور ہر جگہ مسلمانوں نے اپنی درخشاں سیرت و کردار کے نقوش چھوڑے۔ مکہ جیسا مرکزی شہر سرنگوں ہوگیا۔ دس سال کے اندر آنحضرت ﷺ کا نامِ نامی اور آپ کا پیغامِ گرامی اس طرح عرب بھر میں پھیلا کہ اس کا گوشہ گوشہ اشھد ان محمد رسول الله کی صدا سے گونج اٹھا۔ اور پھر دینی نقطۂ نگاہ سے اللہ تعالیٰ نے اس رفعِ ذکر کا جو انتظام فرمایا اس سلسلے میں حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَتَانِیْ جِبْرَئِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَقَالَ اِنَّ رَبَّکَ یَقُوْلُ اَتَدْرِیْ کَیْفَ رَفَعْتُ ذِکْرَکَ قُلْتُ اللّٰهُ تَعَالیٰ اَعْلَمُ قَالَ اِذَا ذُکِرْتُ ذُکِرْتَ مَعِیْ ”حضرت جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہا، آپ کا رب کریم پوچھتا ہے کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ کے ذکر کو کس طرح بلند کیا ہے، میں نے جواب دیا اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کے رفعِ ذکر کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں میرا ذکر کیا جائے گا وہاں آپ کا بھی میرے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔“

علامہ آلوسی فرماتے ہیں اور اس سے بڑھ کر رفعِ ذکر کیا ہوسکتا ہے کہ کلمۂ شہادت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ اپنے محبوب کا نام ملا دیا، حضور کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا، ملائکہ کے ساتھ آپ پر درود بھیجا اور مومنوں کو درودِ پاک پڑھنے کا حکم دیا اور جب بھی خطاب کیا معزز القاب سے کیا، پہلے آسمانی صحیفوں میں بھی آپ کا ذکرِ خیر فرمایا، تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے وعدہ لیا کہ وہ آپ پر ایمان لے آئیں۔ آج دنیا کا کوئی آباد ملک ایسا نہیں جہاں روز و شب میں پانچ بار حضور کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو۔

علاوہ ازیں نمازوں میں آپ پر دورد بھیجا جاتا ہے، جمعوں کے خطبوں میں آپ کا ذکر خیر کیا جاتا ہے، پانچ مرتبہ اذان میں باآوازِ بلند آپ کی رسالت کا اعلان کیا جاتا ہے اور سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضور کا ذکر مبارک نہ ہو رہا ہو۔ حیرت ہوتی ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے کوئی شخص اس کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ اس شان سے آپ کا ذکر بلند ہوگا۔ حضور کے سوانح پر جتنی کتابیں اپنوں اور بیگانوں نے لکھی ہیں دنیا کے کسی نبی، مصلح، فاتح اور سلطان کے بارے میں نہیں لکھی گئیں۔ حتیٰ کہ دشمنوں نے بھی آپ کی عظمت کو تسلیم کیا۔ جن لوگوں نے آپ کو نبی تسلیم نہیں کیا آپ کے ہمہ گیر اثرات کو محسوس کرتے ہوئے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بات کو آج جھٹلانے کی کوشش بھی کامیاب نہیں ہوسکتی کہ آپ کے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں۔

وہ جس کا ذکر ہوتا ہو زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں موذن کی اذانوں میں

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝٦

(پس یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ۵) بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ۶)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون

یہی وہ اصل حقیقت ہے جو اوپر کے بیان کردہ شواہد کی روشنی میں بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک مستقل قانون ہے کہ ہر یسر کا دامن عسر کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ یعنی آسانی ظاہر ضرور ہوتی ہے لیکن آزمائش کے دور سے گزرنے کے بعد۔ آنحضرت ﷺ کو تسلی دینے کیلئے اسے دومرتبہ دہرایا گیا ہے کہ جن سخت حالات سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں۔ ان کے جلدی بعد اچھے حالات آنے والے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کی بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کئے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی چلا آ رہا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہو کہ یہ عسر اور یسر دونوں اس دنیا میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک گھاٹی کسی نے پار کرلی تو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی نئی گھاٹی سے اس کو سابقہ پیش آنے والا نہیں ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آسکتی ہے۔ چاہئے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی قائم رکھے۔ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس جہان میں ہر مسافر کو نشیب و فراز سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان سے گزرنے کے بعد ہی کوئی راہ رو منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ حق کے راستہ پر چلنے والوں کے ساتھ بھی ہے۔ جو لوگ اس راستے پر چلنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کیلئے یہ نہیں ہوتا کہ راہ سے تمام عقبات خود بخود دور ہوجائیں بلکہ ان کو دور کرنے کیلئے خود ان کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کیلئے یہ ضمانت ضرور ہے کہ اگر وہ راہ کی رکاوٹوں کے علی الرغم ہمت نہیں ہاریں گے تو وہ ان کیلئے ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرے گا۔ اور ایک کے بعد دوسری مشکل سے لڑتے اور اس کو سر کرتے ہوئے بالآخر منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔

صاحبِ معارف القرآن نے اس آیت کو سلجھاتے ہوئے لکھا:

> عربی زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کلمہ کے شروع میں الف لام ہوتا ہے جس کو اصطلاح میں لام تعریف کہتے ہیں۔ اگر اسی کلمہ کو الف لام ہی کے ساتھ مکرر لایا جائے تو اس کا مصداق وہی ہوتا ہے جو پہلے کلمہ کا تھا اور اگر بغیر الف لام تعریف کے مکرر لایا جائے تو دونوں کے مصداق الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس آیت میں العسر جب مکرر آیا تو معلوم ہوا کہ اس سے وہ پہلا ہی عسر مراد ہے کوئی نیا نہیں۔ اور لفظ یُسْرًا دونوں جگہ بغیر الف لام کے لایا گیا، اس سے معلوم ہوتا کہ یہ دوسرا یسر پہلے یسر کے علاوہ ہے تو اس آیت میں اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کے تکرار سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہی عسر و مشکل کیلئے دو آسانیوں کا وعدہ ہے اور دو سے مراد بھی خاص دو کا عدد نہیں بلکہ متعدد ہونا مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک عسر یعنی تنگی اور مشکل جو آپ کو پیش آئی یا آئے گی اس کے ساتھ بہت سی آسانیاں آپ کو دی جائیں گی۔

حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو اس آیت سے بشارت سنائی اور فرمایا لن یّغلب عُسْرٌ یُّسْرَیْنِ یعنی ایک عسر دو یسروں پر (ایک مشکل دو آسانیوں پر) غالب نہیں آسکتی۔ چنانچہ تاریخ و سیرت کی سب کتابیں جو اپنوں اور غیروں، مسلم و غیر مسلم نے لکھی ہیں وہ اس پر شاہد ہیں

Marfat.com

کہ جو کام مشکل سے مشکل بلکہ لوگوں کی نظر میں ناممکن نظر آتے تھے آپ کیلئے وہ سب آسان ہوتے چلے گئے۔ روایتِ مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں العسر کا الف لام عہد کیلئے ہے اور مراد آنحضرت ﷺ اور صحابہ ؓ کرام کا عسر ہے، یعنی یہ وعدہ کہ ہر مشکل کے ساتھ بہت سی آسانیاں دی جائیں گی آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کیلئے ہے جس کو حق تعالیٰ نے ایسا پورا فرمایا کہ دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب اگر دنیا میں کسی شخص کو عسر کے بعد یسر نصیب نہ ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، البتہ عادۃ اللہ اب بھی یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور سچے دل سے اللہ پر اعتماد رکھے اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی سے لو لگائے اور اسی کے فضل کا امیدوار رہے اور کامیابی میں دیر ہونے سے آس نہ توڑ بیٹھے تو ضرور اللہ تعالیٰ اس کے حق میں آسانی کردے گا۔ (فوائد عثمانیہ) بعض روایاتِ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿٧﴾ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿٨﴾

(اور جب آپ فارغ ہوں تو کمربستہ ہوجائیں۔ ۷) اور اپنے رب کی طرف راغب ہوجائیں۔ ۸)

آخری منزل کیلئے جدوجہد

فَانْصَبْ، نَصَبَ سے امر ہے۔ اس کا معنی ہے ایسا کام کرنا جس کے کرنے سے تھکاوٹ ہوجائے۔ اس لئے اس کا ترجمہ جدوجہد اور محنت کیا جاتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب آپ اپنے مشاغل سے فارغ ہوجائیں وہ مشاغل دعوت وتبلیغ سے متعلق ہوں یا مسلمانوں کی تعلیم وتربیت سے، یا ان کا تعلق دینوی کاموں سے ہو تو اس فراغت میں آپ کا کام ستانا اور آرام کرنا نہیں بلکہ ایک کام سے فارغ ہونے کے بعد اس کے شکر کے طور پر دوسرے کام میں لگ جانا ہے۔ آپ دعوت وتبلیغ سے فارغ ہوتے ہیں تو تعلیم وتربیت کے کام میں لگ جائیے، اس سے فرصت ہوتی ہے تو عبادت میں مصروف ہوجائیے۔ اسی کی تائید میں علامہ ابنِ جریر طبری نے حضرت ابنِ عباس ؓ سے اس کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ جب آپ نماز ادا کرنے سے فارغ ہوجائیں تو بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ دعا مانگنا شروع کردیں۔ گویا آنحضرت ﷺ کے واسطے سے امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تمہاری زندگی جدوجہد اور محنت سے عبارت ہے۔ نہ فضول کاموں میں اشتغال آپ کو زیب دیتا ہے اور نہ فارغ بیٹھ رہنا مومن کی شان ہے۔ اسی لئے حضرت فاروقِ اعظم ؓ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہوں کہ میں تمہیں نکما بیٹھے ہوئے دیکھوں کہ نہ تم دنیا کا کام کر رہے ہو اور نہ تم اپنی آخرت کو سنوار رہے ہو۔" اور کام بھی ایسا ہونا چاہئے فَانْصَبْ کا لفظ جس پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی ایسا کام جو ایک فرد کرے تو اسے تھکا دے اور جماعت کرے تو وہ بھی مشقت کے مراحل سے گزرے۔ ظاہر ہے یہ وہ کام ہیں جو اولوالعزمی سے کئے جاتے ہیں۔ اور یہ وہ مہمیں ہیں جو بڑی محنت اور ریاضت سے سر کی جاتی ہیں اور جن کیلئے جگر پاشیوں اور شب بیداریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ تربیت تھی جس نے مسلمانوں کو محنتی، جفاکش اور اولوالعزم بنایا تھا اور جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر ہوا کی طرح پھیل گئے اور بہار بن کے چھا گئے۔

Marfat.com

دوسری آیت میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق نہایت اخلاص سے جب آپ اور آپ کے صحابہ محنت و ریاضت اور جدوجہد کے کاموں سے فارغ ہو جائیں یعنی جب وہ مرحلہ آ جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت بے نقاب ہو جائے، مکہ فتح ہو جائے اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگیں۔ تو پھر آپ آخرت کی تیاری کیلئے کمر بستہ ہو جائیں۔ اگرچہ پیغمبر کا کوئی کام آخرت کی تیاری سے غیر متعلق نہیں ہوتا، لیکن ان کاموں میں بہر حال اللہ تعالیٰ کے بندوں سے واسطہ رہتا ہے اور کبھی لادینی قوتوں سے کشمکش رہتی ہے۔ لیکن یہ کشمکش جب اپنے انجام کو پہنچ جائے یعنی لادینیت گھٹنے ٹیک دے تو پھر اللہ تعالیٰ کے رسول کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب آپ اپنے فرائض کے حوالے سے آخری منزل پر پہنچ گئے ہیں لیکن یہ وقت کمر کھول دینے کا نہیں بلکہ اپنے رب سے ملاقات کی منزل کی طرف تیاری کیلئے مزید اہتمام کا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو سورۃ النصر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمائی گئی ہے۔ وہاں اس کی مزید وضاحت آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

صدق الله العظيم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ التِّیْنِ

(۹۵)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ التِّيْنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام التِّيْنِ ہے جو اس سورۃ کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس میں ایک رکوع، آٹھ آیتیں، چونتیس کلمے اور ایک سو پانچ حروف ہیں۔

مقام نزول اور زمانۂ نزول:۔ مقامِ نزول کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے مدنی قرار دیتے ہیں اور بعض مکی کہتے ہیں، لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ سورۃ مدنی نہیں مکی ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل اس کی چوتھی آیت هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (یہ پرامن شہر) ہے کیونکہ اگر اس کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا ہوتا تو ''یہ پرامن شہر'' کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ هٰذَا کے اشارے نے اس کا مکی ہونا متعین کر دیا ہے۔ جہاں تک زمانۂ نزول کا تعلق ہے اس سورۃ کے مضمون کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکی دور کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ کیونکہ اس کا اندازِ بیان ابتدائی مکی سورتوں کی طرح نہایت مختصر اور دلنشین ہے۔ اور قیامت کے اثبات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ اس سورۃ کی آیات میں ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی جس سے اندازہ ہو سکے کہ اس وقت کفر و اسلام میں کشمکش برپا ہو چکی تھی۔

مضامین:۔ ابتدائی چار آیات میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ البتہ ان چیزوں کے مصداق میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے تین اور زیتون، طورِ سینا اور مکہ معظمہ ہی کو ان آیات کا مصداق قرار دیا ہے اور پھر ان کے فوائد اور فضائل بیان کئے ہیں۔ بعض اہل علم نے پہلی تین آیتوں سے تین پہاڑوں کے نام مراد لئے ہیں اور چوتھی آیت سے مکہ معظمہ مراد لیا ہے۔ پھر ان سے بعض مصادیق کا تعین کیا ہے اور انہیں قسم قرار دیا گیا ہے۔ اور بعض مفسرین نے تین اور زیتون سے ان کے منابت مراد لئے ہیں اور طور سینین سے کوہِ طور اور بلد الامین سے مکہ معظمہ مراد لیا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد وہ انبیاء ہیں جن کا یہاں ظہور ہوا ہے۔ ان قسموں سے درحقیقت ان انبیاء کی طرف اشارہ ہے اور پھر ان سے استدلال کرتے ہوئے پانچویں آیت جو درحقیقت جوابِ دعویٰ اور مقسم علیہ ہے کو ثابت کیا گیا ہے۔

جوابِ قسم یہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا۔ اگرچہ قرآنِ کریم میں اس حقیقت کو اور بھی متعدد مواقع پر بیان فرمایا گیا ہے جس سے انسان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں خاص طور پر انبیاء کے مقاماتِ ظہور کی قسم کھا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کی جسمانی ساخت کی خوبصورتی اور اس کی معنوی خصوصیات کی بلندی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن انسان کی بہترین ساخت کی دلیل یہ ہے کہ اس کے اندر نبوت جیسے بلند ترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے ہیں اور یہ عظیم منصب کسی اور مخلوق کو عطا نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اصل عظمت قربِ الٰہی اور رضائے خداوندی کے حصول میں کامیابی اور سیرت و کردار اور طور و اطوار میں انبیائے کرام کا صحیح عکس ہے جس کا آخری اور جامع ترین نمونہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ یوں تو انسانوں میں صفات وخصوصیات، حسب ونسب، رنگ ونسل، زبان وبیان اور مال ودولت کے اعتبار سے کئی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ اور اسی حوالے سے انسان مختلف طبقات میں تقسیم ہو گیا ہے۔ لیکن سیرت وکردار، اعمال واخلاق اور اعتقادات وخیالات کے اعتبار سے انسان میں صرف دو ہی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ قسم ہے جو برائی کی پیکر اور اخلاقی پستی کا نمونہ ہے جس کی گراوٹ کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے اعمالِ شنیعہ وظلم اور طغیان میں حیوانوں سے بھی نیچے گر جاتی ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو درحقیقت انسانی ساخت کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ، وہ ہے جو ایمان اور عملِ صالح کا پیکر اور مکارمِ اخلاق کی صحیح تصویر ہے۔ نوعِ انسانی کا ان دو قسموں میں تقسیم ہو جانا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو زمین پر فساد پسند نہیں اور وہ انسانی رشتوں کی پامالی کو برداشت نہیں کرتا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں جزائے اعمال کا تصور ایمان کا حصہ ہے جس کی مکمل صورت قیامت اور آخرت ہے۔ کیونکہ اگر پستی میں گرنے والوں کو کوئی سزا نہ ملے اور بلندی پر چڑھنے والوں کو کوئی جزاء نہ ملے اور انجام دونوں کا یکساں ہو تو اس کا مفہوم اس کے سوا اور نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی مملکت میں کوئی انصاف نہیں۔ اس کے نزدیک نیکی اور بدی دونوں برابر ہیں۔ کانٹے بونے والا اور پھول کھلانے والا اپنے اعمال کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ چراغ روشن کرنے والا اور اندھیروں کا کاروبار کرنے والا دونوں ایک ہی طرح کے انجام سے دوچار ہوں گے، تو اس سے بڑی اندھیر نگری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگر اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دنیا میں اندھیر نگری کا کوئی جواز پیدا ہو۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ۸	سُوْرَةُ التِّیْنِ مَکِّیَّةٌ (۹۵)	رُکُوْعَاتُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ﴿۱﴾ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ﴿۲﴾ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ﴿۳﴾
لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۡ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ
سٰفِلِيْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ
غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ﴿۶﴾ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ؕ﴿۷﴾ اَلَيْسَ اللّٰهُ
بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ؑ﴿۸﴾

رکوع: ۱۔ (قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔ ۱) اور قسم ہے طورِ سینین کی۔ ۲) اور اس پر امن سرزمین (مکہ) کی۔ ۳) ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ ۴) پھر ہم نے اس کو پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا۔ ۵) بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کیلئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ ۶) پس، (اے پیغمبر) آپ کو کون جھٹلا سکتا ہے اس کے بعد جزاء وسزا کے معاملہ میں۔ ۷) کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے۔ ۸)

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ﴿۱﴾

(قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔ ۱)

Marfat.com

چار قسموں کی وضاحت

ہم متعدد مواقع پر یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں قسموں کے بعد آنے والا جملہ جوابِ قسم یا مقسم علیہ کہلاتا ہے۔ اور عام معنوں میں اسے دعویٰ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اور قسم اور جوابِ قسم میں رشتہ دلیل اور دعویٰ کا ہوتا ہے۔ یعنی جن چیزوں کی قسم کھائی جاتی ہے وہ درحقیقت اپنے دعوے کے اثبات کی دلیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے قسم اور جوابِ قسم میں کسی ایسی مناسبت کا ہونا ضروری ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ قسم کس حیثیت سے جوابِ قسم کو ثابت کر رہی ہے۔ چنانچہ یہی وہ مناسبت ہے جس سے قسموں کے مفہوم اور مدلول کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، پھر اس کے بعد جوابِ قسم کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان چاروں قسموں کا مفہوم متعین کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس بات کو دیکھیں کہ کیا جوابِ قسم اور قسموں میں دلیل کی مطابقت بھی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہی وہ اصول ہے جس سے الفاظِ قسم کا معنی متعین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

تین کا معنی انجیر کیا گیا ہے جسے پھل کے طور پر اور مختلف فوائد کے حصول کیلئے لوگ بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ اور زیتون کا ترجمہ زیتون کا تیل بھی کیا گیا ہے اور زیتون کا درخت بھی۔ اور متعدد مفسرین نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول بھی اس کی تائید میں ہے۔ انہوں نے ان دونوں پھلوں کے خواص اور فوائد بھی بیان کئے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے ان دونوں پھلوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے بعد جو دو قسمیں کھائی گئی ہیں ان میں اور ان میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ اور مزید یہ کہ اس کے بعد جو جوابِ قسم آ رہا ہے یہ قسمیں دلیل کے طور پر اس کا اثبات نہیں کرتیں۔

بعض دیگر مفسرین جن میں بعض سلف بھی شامل ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول بھی اس کی تائید میں ہے وہ تین سے ایک خاص پہاڑ مراد لیتے ہیں جس میں انجیر کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ پہاڑ اس نام سے موسوم ہو گیا ہے۔ تین سے حضرت نوح علیہ السلام کی مسجد بھی مراد لی جاتی ہے اور جو انہوں نے جودی پہاڑ پر بنائی تھی۔ اور زیتون سے جبلِ زیتون مراد ہے جو حضرت مسیح کی دعوت اور عبادت کے مرکز کی حیثیت سے معروف ہے۔ یہاں زیتون کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی تھی اس وجہ سے عربوں نے اپنی روایت کے مطابق اسے زیتون کے نام سے موسوم کر دیا تھا۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ جو پھل کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا تھا اس علاقے کو وہ بسا اوقات اس پھل کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ اس لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب ان کے نزدیک وہ علاقہ ہے جہاں تین اور زیتون کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے۔ اور وہ شام و فلسطین کا علاقہ ہے۔ کیونکہ نزولِ قرآن کے وقت اہلِ عرب میں یہی علاقہ انجیر اور زیتون کی پیداوار کیلئے مشہور تھا۔

دوسرے اور تیسرے قول سے یہ بات تو مستفاد ہوتی ہے کہ تین اور زیتون سے پہاڑ مراد لئے جائیں یا شام و فلسطین۔ مقصود دونوں سے وہ علاقہ ہے جہاں تین اور زیتون کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے اور ان علاقوں کے ذکر سے اشارہ ان انسانوں کی طرف ہے جن کی پیدائش، جن کی تبلیغ و دعوت یا جن کی تدفین کی وجہ سے یہ علاقے معروف ہوئے۔

Marfat.com

وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣

(اور قسم ہے طورِ سینین کی۔ ۲) اور اس پر امن سرزمین (مکہ) کی۔ ۳)

طُوْرِ سِيْنِيْنَ ...... سِيْنِيْنَ، جزیرہ نما سینا کا دوسرا نام ہے۔اس کو سَینا اور سِینا بھی کہتے ہیں۔قرآنِ کریم کی سورۃ المومنون میں طُوْرِ سَيْنَاءَ مونث کی صورت میں آیا ہے۔اور یہاں جمع سالم کی شکل میں۔

اور بَلَدِ الْاَمِيْنِ سے مکہ مکرمہ مراد ہے۔طورِ سینین کی شہرت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ہے۔اور بلد الامین کی پہچان بیت اللہ، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل علیہم السلام اور آنحضرت ﷺ ہیں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝٤

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ ۴)

تقویم کا مفہوم

تقویم کا لغوی معنی تو کسی چیز کو سیدھا کرنا ہے۔مثلاً قَوَّمْتُ الرُّمْحَ فَاسْتَقَامَ ''میں نے نیزے کو سیدھا کیا تو وہ سیدھا ہو گیا۔'' پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی چیز کو اس کے مقصدِ تخلیق، اس کے فرائض اور اس کے مزاج کے مطابق اور موزوں بنانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔امامِ قرطبی ابنِ عربی کا قول نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز پیدا نہیں کی۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے ان عظیم صفات سے متصف فرمایا۔یعنی حی، عالم، بااختیار، بااراده، متکلم، شنوا، مدبر اور حکیم۔ان کی ساخت اور اس کی صلاحیتوں پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صوری اور معنوی حُسن و کمال میں کوئی چیز بھی انسان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔اس کو وہ اعلیٰ درجہ کا جسم عطا کیا گیا ہے جو کسی جاندار مخلوق کو عطا نہیں کیا گیا۔اور اسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئیں۔بڑے سے بڑا جسیم، طاقتور، قوی اور پر ہیبت جانور بھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔نوامیسِ فطرت کو وہ اپنی علمی قوت سے مسخر کر کے ان سے اپنی چاکری کرا رہا ہے۔اپنے فکر و نظر اور قوتِ ایجاد و اختراع سے اس نے دنیا کو مالا مال کر دیا ہے۔اس کے علم و عرفان کی رفعتوں کا حال یہ ہے کہ ملائکہ بھی اس کی اطاعت بجا لاتے ہیں۔اس نے اپنے سفلی جذبات، نفسانی خواہشات اور طبعی مفادات کو قابو میں رکھ کر ایثار کی ایسی شمعیں روشن کی ہیں جسے دیکھ کر عقل انگشت بدنداں ہے۔انسان درحقیقت اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے حُسنِ تخلیق کا شاہکار ہے۔علامہ قرطبی نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی کی اپنی بیوی کے ساتھ شدید محبت تھی۔ایک دن اس نے اس سے کہا انت طالق ثلاثا ان لم تکونی احسن من القمر ''اگر تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہ ہو تو تجھے تین طلاقیں۔'' بیوی نے جب اپنے خاوند کی بات سنی تو اٹھ کر پردے میں چلی گئی اور کہا کہ آپ نے مجھے طلاق دے دی ہے، اب ہمارا ازدواجی تعلق منقطع ہو گیا ہے۔عیسیٰ نے بڑی مشکل سے رات بسر کی، صبح سویرے خلیفہ منصور کے پاس پہنچا۔اسے اس واقعہ کی اطلاع دی اور بڑی گھبراہٹ اور ندامت کا اظہار کیا۔خلیفہ نے فقہاء کو اپنے دربار میں بلایا اور ان سے فتویٰ پوچھا۔سب نے کہا کہ طلاق واقع ہو گئی ہے۔لیکن امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے ایک

Marfat.com

صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ منصور نے پوچھا آپ کیوں چپ ہیں، کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ انہوں نے سورۃ التین کی ابتدائی پانچ آیات پڑھیں۔ اور کہا اے امیر المومنین اس ارشادِ الٰہی کے مطابق انسان سب چیزوں سے حسین ہے۔ منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ سے کہا کہ اس شخص نے جو کچھ کہا ہے، درست کہا ہے تم اپنی بیوی کے ساتھ رہ سکتے ہو، اور اس کی بیوی کو بھی کہلا بھیجا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ انسان کے بہترین ساخت پر پیدا ہونے کی سب سے بڑی شہادت اور سب سے بڑی دلیل کیا ہے؟ کیونکہ عام انسانوں کو دیکھ کر تو اتنی بڑی شہادت قائم کرنا آسان نہیں۔ اقبال نے تو اس پر عجیب تبصرہ کیا:

یہی انساں ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا

یہ جوابِ قسم ہے اس کی وضاحت

لیکن انسانوں کی ایک نوع ایسی ہے جسے بے جھجک انسان کے احسنِ تقویم ہونے پر بطور شاہد اور دلیل کے پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ نوع انسانیت کی معراج اور فضل و کمال کا سب سے زیادہ بلند نمونہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ جو صورت و سیرت، فضل و کمال، علم و دانش، قربِ الٰہی، قناعت و استقامت، بے غرضی اور بے لوثی، حکمت و تدبر اور رحمت و مؤدت میں بے مثال و بینظیر ہیں۔ چنانچہ پروردگار نے ان کے احسنِ تقویم ہونے کی شہادت میں ان مقامات کی قسم کھائی ہے جو اس کے پیغمبروں سے نسبت رکھتے ہیں۔ شام و فلسطین میں متعدد جلیل القدر پیغمبر تشریف لائے۔ اور کتنے عظیم رسول وہاں مدفون ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی فلسطین کے علاقہ میں مبعوث ہوئے اور کوہِ طور وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی۔ رہا مکہ معظمہ تو اس کی بناء ہی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں پڑی۔ انہیں کی بدولت وہ عرب کا مقدس ترین مرکزی شہر بنا۔ اس شہر کے پرامن ہونے کی دعا بھی آپ ہی نے مانگی۔ اس دعا کی قبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس وقت سارا جزیرۂ عرب غارت گری، خونریزی اور لوٹ مار کا میدان بنا ہوا تھا اس وقت بھی مکہ مکرمہ فتنہ و فساد کی آگ سے محفوظ تھا۔ کسی کے باپ کا قاتل بھی اگر حرم میں پناہ لیتا تو کوئی اس سے تعرض نہ کرسکتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس خطہ پر مزید کرم یہ فرمایا کہ اسے اپنے محبوب ﷺ کی جائے ولادت بنایا اور آپؐ کی نبوت کا اعلان بھی یہیں سے ہوا اور یہ وہ شرف ہے جس کے باعث مکہ کی عظمت کو چار چاند لگ گئے اور یہ وہ شہادت ہے جو ان چار قسموں کے ذریعے انسان کی حیثیت و عظمت پر قائم کی گئی ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝۵

(پھر ہم نے اس کو پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا۔ ۵)

Marfat.com

دین سے انحراف آدمی کو پست ترین حالت میں پہنچا دیتا ہے

جو چیز جتنی بلندی سے گرتی ہے اتنی ہی زیادہ شکست و ہلاکت کا شکار ہوتی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتوں اور خصوصیتوں سے نوازا۔ اسے ایسے ملکات دیئے گئے جن کے سامنے تمام مخلوقات جھک گئیں، اسے ایسی بلند عزمی عطا کی گئی کہ بلندیاں اس کے سامنے ہیچ ہوگئیں، اس کے عشق کی آگ نے ہر آگ کو سرد کر دیا، اس کے قلب و دماغ کی وسعتوں کے سامنے سمندروں کی وسعتیں سمٹ گئیں۔ چنانچہ جب تک وہ اپنی ان صلاحیتوں سے صحیح کام لیتا رہا اللہ تعالیٰ نے فضل و کمال کا ہر دروازہ اس کے سامنے کھول دیا۔ لیکن جب اس نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی ناقدری کی اور اپنی عدیم النظیر صلاحیتوں کا غلط استعمال کیا اور ہوائے نفس کی پیروی میں اندھا ہوگیا، اپنے خالق و رازق کی فرمانبرداری سے منہ موڑ لیا اور اس کے رسول کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آیا۔ فضل و کمال کے سارے دروازے اس کے سامنے بند کر دیئے گئے، انسانیت کی تمام عظمتیں اس سے چھین لی گئیں، نیچے لڑھکتا ہوا حیوانوں سے بھی بدتر ہوگیا۔ اس سے ان حرکتوں کا صدور ہوا جو کسی حیوان سے بھی کبھی نہ بن پڑیں، اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بچیوں کو زندہ درگور کیا، اپنے بھائیوں کا گلا کاٹا۔ حرص، طمع، خودغرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی ہی دوسری بری خصلتوں کا شکار ہوگیا۔ درندے صرف اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے درندگی کرتے ہیں، اس درندے نے محض شوق کی تسکین کیلئے بستیاں اجاڑیں، اپنے ہم جنسوں کا قتلِ عام کیا، حیوان اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے، اس نے ہلاکت کے وہ اسباب اور ہتھیار بنائے کہ جس کا تصور ہی کپکپی پیدا کرنے کیلئے کافی ہے۔ عزت و عفت کے ایسے چراغ گل کئے اور ہوس کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کے بارے میں حیوان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس طرح سے وہ بدترینِ خلائق بنتا چلا گیا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اس نے خود اللہ تعالیٰ کے قانون کو حرکت دی۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝٦

(بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کیلئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ ۶)

یہ لوگ احسنِ تقویم کے مصداق ہیں

اللہ تعالیٰ کے عظیم رسولوں کا نمونہ سامنے رکھ دینے کے بعد یہ واضح فرما دیا کہ جو اشخاص اور جو گروہ بھی ان نفوسِ قدسیہ کے پیش کردہ حقائق سے منہ موڑتے ہیں اور ان کے کھولے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کو اپنا چلن بنا لیتے ہیں اور دنیا ہی کو زندگی اور حاصلِ زندگی سمجھ کر زندگی گزارتے ہیں وہ بالآخر بدترینِ خلائق بنے بغیر نہیں رہتے۔ لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی پیروی کو اپنا شعار بناتے، انسانیت کی لاج رکھتے اور ان کے دامنِ شرف پر کوئی داغ نہیں لگنے دیتے وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے دلوں کو بیدار رکھتے اور ایمان و عمل کی شمع سے اپنے راستے کو روشن کرتے ہیں اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ زندگی اصل زندگی نہیں بلکہ یہ تو دارالعمل اور آخرت کی تیاری کا موقع ہے، اصل زندگی تو دوسری زندگی ہے اور وہ اسی کی تیاری میں لگے رہتے ہیں۔ اور وہ اپنے حسنِ تقویم کے شرف پر

Marfat.com

کبھی آنچ نہیں آنے دیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کو ایسے اجر سے نوازے گا جو کبھی ختم نہ ہونے والا ہوگا۔ جب تک وہ اس دنیا میں زندہ رہیں گے ان پر ان کے رب کی رحمت نازل ہوتی رہے گی۔ اور جب یہاں سے رختِ سفر باندھنے لگیں گے تو انہیں غیب سے رضائے خداوندی کی نوید سنائی دے گی اور جب قیامت کے دن قبروں سے اٹھیں گے تو فرشتے ہجوم در ہجوم ان کا استقبال کریں گے۔ اور جب انہیں دخولِ جنت کی عزت بخشی جائے گی تو سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ سے ان کا استقبال کیا جائے گا۔

فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۷﴾

پس، (اے پیغمبر) آپ کو کون جھٹلا سکتا ہے اس کے بعد جزاء و سزا کے معاملہ میں۔ ۷)

متذکرہ بالا حقیقت کے قبول کر لینے کے بعد روز جزا کی تکذیب کا کیا موقع ہے

امامِ قرطبی نے اس آیت کا ایک مفہوم قتادہ اور فراء سے نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ قیامت کے برپا ہونے اور اس روزِ نیک و بد کو جزاء و سزا کا جو نظریہ آپ نے پیش کیا ہے، کون عقل مند اس کی تکذیب کر سکتا ہے۔ یعنی جب ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھ رہی ہے اور ہر سوچنے والا دماغ اندازہ کر رہا ہے کہ نوعِ انسانی میں سے جس گروہ نے بھی انبیائے کرام کے طریقے کو چھوڑ کر خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کو اپنا وطیرہ بنایا۔ اور رب العالمین کی بندگی سے اعراض کر کے غیر اللہ اور طاغوت کی بندگی کو اپنا چلن بنایا۔ تو وہ سیرت و کردار کے اعتبار سے حیوانوں سے بھی نیچے گرتا چلا گیا۔ اس نے انسانیت کی ہر قدر کو پامال کر کے رکھ دیا۔ لیکن اس کے برعکس جس شخص اور جس گروہ نے بھی ایمان اور عملِ صالح کا راستہ اختیار کیا، تقویٰ کی زندگی اختیار کی، صراطِ مستقیم پر چلنے کو اپنے لئے سعادت سمجھا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کو ہمیشہ یاد رکھا اس کی زندگی کامیابی اور کامرانی کی ضمانت بن گئی۔ اس نے سیرت و کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ وہ جب تک زندہ رہا دوسروں کیلئے بھلائی کا عنوان بنا رہا۔ اور انسانیت ہمیشہ اس پر فخر کرتی رہی۔ زندگی کے یہ دو طریقے اور انسانوں کے یہ دو گروہ کیا برابر ہیں اور کیا انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان دونوں کو برابر سمجھا جائے جو اسفل السافلین میں گر چکا ہے اسے کوئی سزا نہ دی جائے اور جس نے نہایت پاکیزہ زندگی گزاری اسے کسی انعام کا مستحق نہ سمجھا جائے۔ سورۃ الجاثیہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ سَآءَ مَا یَحۡكُمُوۡنَ ''کیا برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، بہت برا حکم ہے جو لوگ لگاتے ہیں۔''

اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِیۡنَ ﴿۸﴾

(کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے۔ ۸)

Marfat.com

اس سوال کے جواب میں ہدایت مضمر ہے

ہر احساس اور عقل رکھنے والا شخص دنیا میں چھوٹے سے چھوٹے حاکم سے بھی یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اپنی حکومت میں عدل وانصاف سے کام لے۔ وہ اچھے کام کرنے والوں کو صلہ دے اور برے کام کرنے والوں کو سزا دے۔ جو قانون توڑے اس پر قانون شکنی کا مقدمہ قائم ہو اور اس کے جرم کی اسے سزا دی جائے۔ اور جو قانون کا احترام اور اطاعت کرے اسے اس کی جزاء ملے۔ تو اگر یہ توقع اور یہ مطالبہ چھوٹے سے چھوٹے حاکم سے حق اور عقل کا مطالبہ ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ سب سے بڑا حاکم نہیں، کیا اس کی مملکت سے بڑھ کر بھی کسی کی مملکت اور حکومت ہے۔ اگر چھوٹے سے چھوٹے حاکم سے بھی تم عدل کی توقع رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ سے تم نے کیسے امید باندھ رکھی ہے کہ وہ ظالم کو ظلم کی سزا نہ دے اور مظلوم کو کبھی اس کی مظلومیت کا صلہ نہ دے۔ لوگ اس کے عدل کو پکارتے رہیں اور وہ کبھی مظلوم کی دادرسی نہ کرے۔ تو پھر اس کی حکومت اور مملکت کا کیا فائدہ؟ اور اس کی حاکیت سے اس کی مخلوق کو کیا فائدہ پہنچا؟۔ اور اگر وہ سب سے بڑا حکمران ہونے کے باوجود دنیا کو انصاف نہ دے سکا تو پھر دنیا کو انصاف کہاں سے ملے گا۔ اگر بدترین افعال کرنے والے اور اس کی خاطر قربانیاں دینے والے بلکہ جانیں قربان کرنے والے سب برابر ہوں تو اس سے بڑھ کر بے انصافی اور کیا ہوگی۔ اور کیا اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی حاکم بھی ہے جس سے اس بے انصافی کی فریاد کی جاسکے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم اس سورۃ کی تلاوت ختم کرو تو کہو بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ ''ہاں، اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔'' بعض روایات میں ہے کہ حضورؐ جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے سُبْحَانَکَ فَبَلٰی (روح المعانی)

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْعَلَقِ

(٩٦)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْعَلَقِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْعَلَقِ ہے،اسے اِقْرَأْ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ الْعَلَقِ کالفظ اس سورۃ کی دوسری آیت میں مذکور ہے۔اس میں ایک رکوع،انیس آیتیں،بانوے کلمے اور دو سو اسی حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ اس سورۃ کے دو حصے ہیں۔پہلا حصہ پانچ آیتوں پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ بعد کی آیات پر۔اس کے پہلے حصے کے متعلق یعنی پانچ آیتوں کے بارے میں صحیحین اور دوسری معتبر روایات اور جمہور سلف وخلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وحی کی ابتداء ان ہی پانچ آیات سے ہوئی۔بعض حضرات نے سورۃ المدثر کو سب سے پہلی سورۃ قرار دیا ہے اور بعض نے سورۃ الفاتحہ کو۔امام بغوی فرماتے ہیں کہ جمہور سلف وخلف کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ سب سے پہلے سورۃ اقرأ کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔جن حضرات نے سورۃ المدثر کو پہلی سورۃ قرار دیا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے بعد ایک طویل عرصہ تک وحی کا سلسلہ رکا رہا جسے زمانۂ فترت کہتے ہیں۔اس زمانے کے اختتام کے بعد جو پہلی وحی آئی وہ سورۃ المدثر کی آیات تھیں۔اور اس کے بعد مسلسل نزولِ وحی شروع ہوگیا۔اس سے اس غلط فہمی کو پیدا ہونے کا موقع ملا کہ شاید سب سے پہلی وحی سورۃ المدثر کی صورت میں نازل ہوئی ہے۔اور جن لوگوں نے سورۃ الفاتحہ کو پہلی سورۃ قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی مکمل سورۃ،سورۃ الفاتحہ ہی نازل ہوئی ہے۔سورۃ العلق کی تو پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔

صحیحین کی ایک طویل حدیث میں نبوت اور وحی کی ابتداء کا واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی۔اس کی کیفیت یہ تھی کہ جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے اس کے مطابق واقعہ پیش آتا اور اس میں کسی تعبیر کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ایسا معلوم ہوتا کہ آپ نے دن کی روشنی میں ایسا دیکھا ہے۔اس کے بعد آپ تنہائی پسند ہوگئے۔مخلوق سے یکسوئی اور خلوت میں عبادت کرنے کا داعیہ قوی پیش آیا،جس کیلئے آپ نے غارِ حرا کو منتخب فرمایا۔اس عبادت کیلئے حضرت عائشہؓ نے تحنث کا لفظ استعمال کیا ہے،جس کی صحیح کیفیت کا تعین ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔غارِ حرا مکہ معظمہ کے قبرستان جنت المعلیٰ سے کچھ آگے ایک پہاڑ پر ہے جسے جبل النور کہا جاتا ہے۔اس کی چوٹی دور سے نظر آتی ہے۔حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر غار میں چند روز گزارتے،پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس واپس آتے اور وہ مزید چند روز کیلئے سامان آپ کیلئے مہیا کر دیتیں۔غارِ حرا میں خلوت گزینی کی مدت میں علماء کا اختلاف ہے۔صحیحین کی روایت ہے کہ آپؐ نے ایک ماہ یعنی پورا ماہِ رمضان اس میں قیام فرمایا۔ابنِ اسحاق نے سیرت میں اور زرقانی نے شرح مواہب میں فرمایا کہ اس سے زیادہ مدت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ایک روز جبکہ آپ غارِ حرا میں

Marfat.com

تھے اچانک آپؐ کے پاس حضرت جبرائیلِ امین وحی لے کر نازل ہوئے اور آپ سے کہا اقرأ پڑھو۔ آپ نے فرمایا مَاأنَا بِقَارِیٍٔ یعنی "میں تو پڑھا ہوا نہیں۔" اس پر جبرائیلِ امین نے آپؐ کو آغوش میں لے کر اتنا دبایا حضور فرماتے ہیں کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر فرشتے نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے دوبارہ مجھے بھینچا۔ اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے تیسری بار مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ "پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔" یہاں تک کہ وہ فرشتہ مَالَمْ یَعْلَمْ تک پہنچ گیا۔

قرآن پاک کی یہ سب سے پہلی پانچ آیتیں لے کر آپ ﷺ گھر واپس تشریف لائے۔ آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے پاس آ کر فرمایا زملونی زملونی "مجھے اڑھاؤ مجھے اڑھاؤ" چنانچہ آپ کو اڑھا دیا گیا۔ یہاں تک کہ خوفزدگی کی یہ کیفیت دور ہوگئی۔ تو آپ نے فرمایا، اے خدیجہ! یہ مجھے کیا ہو گیا۔ پھر سارا قصہ آپ نے ان کو سنایا اور فرمایا کہ اس سے مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی ہے کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہو گیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آپ خوش ہو جائیے، اللہ کی قسم پروردگار آپ کو کبھی ناکام نہ ہونے دے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بوجھ میں دبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، بیروزگار آدمی کو کسب پر لگاتے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کی امداد کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ آپ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے۔ جو زمانہ جاہلیت ہی میں بت پرستی سے تائب ہو کر نصرانی ہو گئے تھے۔ عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے۔ بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا کہ میرے چچازاد بھائی ذرا اپنے بھتیجے کی بات سنو۔ ورقہ بن نوفل نے آنحضرت ﷺ سے حال دریافت کیا تو آپ نے غارِ حرا میں جو کچھ دیکھا تھا بیان کر دیا۔ ورقہ نے سنتے ہی کہا کہ یہ تو وہی ناموس یعنی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھیجا تھا۔ کاش میں آپ کی نبوت کے زمانے میں قوی ہوتا، اور کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جبکہ آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکالے گی۔ آنحضرت ﷺ نے تعجب سے پوچھا، کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ ورقہ نے کہا، ہاں۔ کیونکہ جب بھی کوئی آدمی وہ پیغامِ حق لے کر آیا ہے جو آپ لائے ہیں تو اس کی قوم نے اس کو ضرور ستایا ہے۔ اور اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ مگر ورقہ اس کے چند ہی روز بعد انتقال کر گئے۔

اس پوری صورتحال کو سرسری نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو بہت سی باتیں ذہنی افق پر روشن ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بات جو سب سے پہلے ذہن پر ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس فرشتے کے آنے سے پہلے تک آپ کے ذہن میں نبوت کا تصور تک نہ تھا۔ آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آپ کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ پیش آئے گا۔ آپ کیلئے یہ واقعہ ایک حادثے کے طور پر پیش آیا اس لئے آپ نے اس سے وہی اثر قبول کیا جو کسی حادثے کے پیش آنے پر آدمی محسوس کرتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ نبوت کے اعلان اور اسلام کی دعوت کے آغاز کے بعد اہلِ مکہ نے آپ پر طرح طرح کے الزام لگائے، لیکن کوئی کہنے والا یہ نہ کہہ سکا کہ ہمیں پہلے ہی شبہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں۔ اور قریب زمانے میں نبی بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

Marfat.com

اس واقعہ سے فوری طور پر ایک اور بات بھی ذہنی افق پر ابھرتی ہے اور یہ آپ کی صداقت کی بہت بڑی دلیل بھی ہے کہ جیسے ہی آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا جو پندرہ سال کے طویل عرصے سے آپ کے شب و روز کی گواہ تھیں اور مزید یہ کہ وہ نہایت دانشمند، سرد و گرم چشیدہ اور عمر رسید ہونے کی وجہ سے انسانی حساسات کا گہرا علم بھی رکھتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون بھی تھیں۔ اس لئے دوسری کتابوں کا اگر علم بھی رکھتی ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ انہوں نے سنتے ہی کسی قسم کے شک کا اظہار کئے بغیر آنے والے کو فرشتہ قرار دیا اور آپ کو اپنے بارے میں جن اندیشوں نے پریشان کر رکھا تھا انہیں دور کرنے کیلئے آپ کے سیرت و کردار کے ان گوشوں کو کھولا جو کسی بھی انسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ کمال کے حصول کیلئے کافی ہو سکتے تھے۔

بیوی چونکہ زندگی کی سب سے زیادہ رازدار اور شوہر کے حُسن و قبح کو جاننے والی ہوتی ہے، اس لئے بالعموم بیویاں اپنے شوہروں کے کمالات کا اعتراف مشکل ہی سے کیا کرتی ہیں۔ لیکن حضرت خدیجہؓ کا رویہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں ایک ایسی شہادت ہے جو کسی نبی ہی کے بارے میں دی جا سکتی ہے۔

اس سورۃ کی ابتدائی پانچ آیتوں کے بعد بہت دنوں تک خاموشی رہی۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس سورۃ کا دوسرا حصہ جو چھٹی آیت سے شروع ہوتا اور آخر سورۃ پر ختم ہوتا ہے، کب نازل ہوا۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کفار اور آنحضرت ﷺ کے درمیان کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کشمکش تبلیغ و دعوت کا نتیجہ تھی یا محض اس بات کا کہ آپ نے تبلیغ و دعوت کے آغاز سے پہلے اسلامی طریقے پر نماز پڑھنی شروع کر دی تھی۔ اور جب بھی موقع ملتا آپ حرم میں سب کے سامنے نماز پڑھتے تھے۔ دوسرے عمائدینِ قریش اسے ایک نئی بات سمجھ کر تعجب سے دیکھتے لیکن نظر انداز کر دیتے تھے۔ البتہ انہیں یہ خیال ضرور گزرتا کہ آنحضرت ﷺ میں کوئی تبدیلی آ رہی ہے۔ مگر جیسے ہی ابو جہل نے آپ کو یہ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کی رگِ جہالت پھڑک اٹھی اور اس نے آپ کو دھمکانا شروع کر دیا۔ اور لوگوں کے سامنے دعویٰ کیا کہ اگر میں نے محمد (ﷺ) کو سجدہ ریز ہوتے دیکھا تو میں زمین پر اس کا سر رگڑے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا تاکہ آپ کی گردن پر پاؤں رکھ دے، مگر لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں جب محمد (ﷺ) کے قریب ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز ہے اور کچھ پَر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو ملائکہ اس کے چیتھڑے اڑا دیتے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو جہل نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر نہایت بدتمیزی سے روکا اور آپ سے پوچھا کہ کیا میں نے تمہیں اس نماز پڑھنے سے روکا نہ تھا۔ تو آپ نے نہایت سختی سے اس کو جھڑک دیا۔ اس پر اس نے اپنے حمایتیوں کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کو ڈرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان آیات میں اس کے اصل مرض کی نشاندہی کی گئی ہے اور پھر اس کی دھمکیوں کا جواب دیا گیا ہے۔ اور اسے وارننگ دی گئی ہے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑیں گے اور اس کا انجام ایسا ہولناک ہوگا جسے دنیا دیکھے گی۔ اور آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ آپ اس کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کریں، اللہ تعالیٰ سے زیادہ سے زیادہ لو لگانے اور اس کے دین کی سربلندی کیلئے کوشش فرمائیں۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ۱	سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ (۹۶)	اٰيَاتُهَا ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿۲﴾
اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴿۵﴾ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴿۷﴾
اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿۸﴾ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰى ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا
صَلّٰى ﴿۱۰﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ﴿۱۲﴾
اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۱۳﴾ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰى ﴿۱۴﴾
كَلَّا لَىٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ ﻻ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ ﴿۱۵﴾ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ
خَاطِئَةٍ ﴿۱۶﴾ فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ ﴿۱۸﴾ كَلَّا
لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ ۩ ﴿۱۹﴾

رکوع: ۱۔ (اے پیغمبر، پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ ۱) پیدا کیا انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے۔ ۲) پڑھئے، اور آپ کا رب بڑا ہی کریم ہے۔ ۳) جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ ۴) انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔ ۵) ہرگز نہیں، بیشک انسان سرکشی کرتا ہے۔ ۶) اس بناء پر کہ وہ اپنے آپ کو

Marfat.com

بے نیاز دیکھتا ہے۔ ۷) بیشک آپ کے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۸) ذرا دیکھوتو اس کو جوروکتا ہے۔ ۹) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ ۱۰) بھلا دیکھوتو اگر وہ (عبد) ہدایت پر ہوا۔ ۱۱) یا نیکی کا حکم دینے والا ہوا۔ ۱۲) تمہارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا شخص حق کو) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو۔ ۱۳) کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ ۱۴) ہرگز نہیں! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کو گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بالوں سے۔ ۱۵) جھوٹی گنہگار پیشانی۔ ۱۶) پس وہ بلالے اپنے ہمنشینوں کو۔ ۱۷) ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلائیں گے۔ ۱۸) ہرگز نہیں! آپ اس کی بات نہ مانیں اور سجدہ کریں اور اپنے رب کا قرب حاصل کریں۔ ۱۹)

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۞

(اے پیغمبر، پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ ۱)

شانِ نزول اور آیت کا مفہوم

آنحضرت ﷺ غارِ حرا کی تنہائی میں اہلِ دنیا سے بالکل کٹ کر اللہ تعالیٰ سے لو لگائے گہرے تفکر میں مستغرق تھے کہ اچانک فرشتہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے کہا، اقرأ ''پڑھئے'' آپ نے فرمایا مَااَنَابِقَارِئٍ ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' کیونکہ فرشتے کے کہنے سے آپ پر یہ بات واضح نہ ہوسکی کہ وہ کیا چیز پڑھنے کیلئے آپ سے کہہ رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ لکھی ہوئی آیات آپ کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ لیکن ان روایات کی سند پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ اس پر فرشتے نے آپ کو اپنی آغوش میں لے کر زور سے بھینچا اور پھر کہا کہ پڑھئے۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تین دفعہ کی تکرار کے بعد فرشتے نے زور دے کر آپ کو پڑھنے کیلئے کہا اور یہ پہلی آیت آپ کے سامنے پڑھی۔ اس کا ایک مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے آپ کو یہ تاثر دیا کہ آپ کو اپنے اُمی ہونے کا احساس ہے اور اس احساسِ اُمیت کی وجہ سے آپ پڑھنے سے عذر کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کو خوب معلوم ہے کہ بچپن سے لے کر آج تک اللہ تعالیٰ نے جس طرح غیر معمولی طریقے سے آپ کی تربیت کا سامان کیا اور ناموافق حالات میں آپ کو حُسنِ کردار کا نمونہ بنایا اور بگڑے ہوئے ماحول میں آپ انسانی صفات کا قابلِ فخر پیکر بنے۔ اور آپ ایک غیر معمولی شخصیت کی صورت میں ہر دل و دماغ میں اتر گئے۔ اس طرح سے آپ کی زندگی کا ایک ایک دور اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی غیر معمولی کام لینا چاہتا ہے۔ اُمی ہونے کے باوجود محض اس کی تربیت اور قدرت سے آپ کا سینہ علوم و معارف کا مخزن بن جائے گا۔ اس لئے آپ اسی کے نام سے پڑھئے جو آپ کا رب ہے اور جس نے غیر معمولی طریقے سے آپ کی آج تک تربیت کی ہے، اب بھی اسی تربیت کے عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے آپ پر علوم و معارف کا دروازہ کھولے گا۔

اشارۃً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس وحی کے نزول سے پہلے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتے بھی تھے اور جانتے بھی تھے۔ اسی لئے آپ کو رب کا تعارف نہیں کرایا گیا بلکہ رب کے نام سے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اگر آپ کو رب کی معرفت نہ ہوتی اور آپ کا اس پر ایمان نہ ہوتا تو یقیناً سب سے پہلے رب کی حقیقت آپ کے سامنے واضح کی جاتی۔ مزید اس بات کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا

Marfat.com

ہے کہ آپ کو ادب سکھایا جا رہا ہے کہ آپ جب بھی قرآنِ کریم کو پڑھیں جس کا نزول آپ پر شروع ہو گیا ہے تو اللہ کے نام سے، یعنی بسم اللہ کہہ کر پڑھیں۔ اور جب بھی کوئی جائز کام کریں تو اسے بھی اللہ کے نام سے کریں۔

اس آیتِ کریمہ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور بعض اہلِ علم نے یہی مطلب مراد لیا ہے کہ اِقْـرَاْ کا لفظ صرف پڑھنے کے مفہوم ہی میں نہیں آتا بلکہ دوسروں کو پڑھ کے سنانے یا دعوت دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا گیا وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ ''اور جب آپ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک مخفی پردہ کھڑا کر دیتے ہیں۔'' قرینہ دلیل ہے کہ یہاں قَرَاْتَ کا معنی پڑھ کے سنانا ہے، صرف پڑھنا نہیں۔ کیونکہ آگے کفار کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ اس وقت ہوتی تھی جب آنحضرت ﷺ انہیں قرآنِ کریم پڑھ کر سناتے تھے، اس کے احکام سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے بیان کردہ عقائد کو واضح فرماتے تھے۔

اس معنی کے لحاظ سے اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ اس قرآنِ کریم کو اپنے اس رب کے نام سے پڑھ کر سنائیں جس نے کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ یہاں خَلَقَ کا مفعول محذوف ہے اور وہ یقیناً كُلَّ شَيْءٍ ہے۔ یعنی آپ کا وہ رب جس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور جس کا فرمان واجب الاذعان ہے، جس کے احکام سے سرتابی دنیا و آخرت کا خسران ہے۔ یہ میرا کلام نہیں بلکہ میرے رب کا کلام ہے۔ اس کا انکار محض کسی نصیحت کا انکار نہیں بلکہ ربِّ کائنات کے حکم کا انکار ہے۔ اور ربِّ کائنات کے حکم کی مخالفت سے جس طرح آخرت تباہ ہوتی ہے اسی طرح دنیا میں عذاب بھی آ سکتا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲

(پیدا کیا انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے۔ ۲)

انسان کی تخلیق سے اس کے مقصدِ زندگی کی یاددہانی

پہلی آیت میں کائنات کی عام تخلیق کا ذکر فرمانے کے بعد خاص طور پر انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ انسان ہی اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے۔ خلافتِ ارضی کا تاج اسی کے سر پر رکھا گیا ہے۔ اسی کے ذریعے سے زمین پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ اور تنفیذ ہوتی ہے۔ اور اسی کی بھلائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری رسول بھیجا اور یہ کتاب نازل کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کی بے بصری کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو بھول کر غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ وہ عناصرِ کائنات اور وہ مظاہرِ قدرت جو اس کی خدمت اور ضروریات کی فراہمی کیلئے پیدا کیے گئے ہیں انہیں مختلف ناموں سے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا اور ان کی بندگی بجا لاتا ہے۔ اگر یہ اپنے مادۂ تخلیق پر غور کرے کہ وہ پانی کے ایک حقیر قطرے سے جمے ہوئے خون کی شکل اختیار کرتا ہے اور یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور پھر اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور آخر ایک وقت آتا ہے جب وہ ایک خوبصورت انسانی بچے کی شکل میں تخلیق کے مراحل سے گزرتے ہوئے ماں کی آغوش میں آتا ہے۔ اور پھر بچپن، لڑکپن اور جوانی کے مراحل سے گزرتے ہوئے ایک سمیع و بصیر اور علیم و فعیل انسان کی شکل میں دنیا میں اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی کی

Marfat.com

ابتداء اور بتدریج عہد بعہد ہونے والی تبدیلیوں اور مراحل پر غور کرے تو اسے کبھی اس میں اشتباہ پیدا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اسے دوبارہ پیدا کرسکتا ہے۔ وہ جیسے جیسے اللہ تعالیٰ کی حکمت وقدرت کا مراقبہ کرے گا تو اس کے دل ودماغ میں یہ بات مستحضر ہوتی جائے گی کہ میں اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے کس قدر ذلیل اور حقیر حیثیت کا حامل ہوں اور وہ ذات کس قدر عظیم ہے جس نے مجھے ایک حقیر قطرے سے تخلیق فرمایا اور کائنات کا گلِ سرسبد بنادیا۔ تو کیا اس ذات کے سامنے سرکشی مجھے زیب دیتی ہے۔ کبریائی صرف اس کی شان ہے، میری شان تو بندگی ہے۔ تو میں آخر اپنی حدود سے تجاوز کیوں کرتا ہوں۔

اسی طرح اس آیت سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ جما ہوا خون جس میں نہ سمع ہے نہ بصر اور نہ روح نہ احساس۔ وہ ایک جمادِ لایعقل ہے۔ اس سے اگر اللہ تعالیٰ ایک انسانِ عاقل پیدا کرسکتا ہے تو اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک ایسا کامل پیدا کرے جو اُمی ہوتے ہوئے اولین وآخرین کے علوم ومعارف کا جامع ہو۔

اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾

(پڑھیے، اور آپ کا رب بڑا ہی کریم ہے۔ ۳) جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ ۴)

سابقہ مضمون کی تاکید اور اللہ تعالیٰ کے ایک احسان کا تذکرہ

یہ اقرأ سابق اقرأ سے بدل کے طور پر آیا ہے اور یہ اسی حکم کی تاکید ہے جو اوپر دیا گیا ہے۔ البتہ اس میں اظہارِ احسان کا پہلو غالب ہے۔ خطاب چونکہ آنحضرت ﷺ کو ہے اس لئے براہِ راست آپ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام لوگوں کو پڑھ کر سنائیے اور ساتھ ہی اس بات کا احساس توانا رکھئے کہ جس طرح پروردگار نے آپ کی غیر معمولی تربیت کے ذریعے آپ کے اندر بے پناہ صلاحیتوں کا خزانہ رکھ دیا ہے اور تمام نفسانی آلائشوں سے پاک کرکے روحانی اور الٰہی ملکات سے آپ کے دل کو سیراب کردیا ہے۔ اسی طرح آپ کے رب نے جود وکرم کا خزانہ لٹاتے ہوئے آپ کے بے پایاں علم کو صرف علم سے نہیں بلکہ قلم سے بھی وسعت دی ہے۔ پہلی کسی امت کو یہ اعزاز نہیں بخشا گیا۔ تورات کے احکامِ عشرہ کے علاوہ باقی سب تاریخی روایات کی تدوین ہے جس میں کلامِ خداوندی کا پہچاننا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر یہ احسان فرمایا ہے کہ آپ پر اترنے والی وحی قلم کے ذریعے محفوظ کردی جائے گی۔ اور نسلاً بعد نسلاً قیامت تک انسان اس سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ اگرچہ امت کے علماء وصلحاء کے سینے بھی اس سے معمور رہیں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اہلِ عرب جو امی کہلاتے ہیں انہیں کے ہاتھوں کتابوں کا ایک خزانہ وجود میں آئے گا۔ اور سلف کے تمام علوم خلف تک نہایت محفوظ حالت میں پہنچیں گے۔ اور آنحضرت ﷺ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور آپ کی ذات سے صادر ہونے والا ہر عمل کلامِ خداوندی کی تفصیل وتشریح یا عمل بنا کر قلم کے ذریعے محفوظ کردیا جائے گا۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴿۵﴾

(انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔ ۵)

Marfat.com

مزید ایک احسان کا ذکر

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں اپنے مزید ایک احسان کا ذکر فرمایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسان کی ایک غلط فہمی کو بھی دور کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان یہ ہے کہ انسان درحقیقت جب دنیا میں آیا تو وہ کچھ نہ جانتا تھا۔ حتیٰ کہ جن ماں باپ کے اتصال سے اس کی تخلیق ہوئی وہ انہیں پہچانتا تک نہ تھا، وہ اپنی غذا کے سرچشمے سے بے خبر تھا، اسے رونے اور بھوک کے احساس کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے آہستہ آہستہ حواس عطا فرمائے۔ پھر آگے چل کر عقل سے نوازا۔ تو پھر وہ یہ سمجھنے لگا کہ میری زندگی کا ہر شعبہ شاید عقل کی حدود میں شامل ہے اس لئے اسی کی رہنمائی میرے لئے کفایت کرتی ہے۔ چنانچہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اسے ایسی باتوں کی خبر دی جن کا دائرہ محسوسات اور معقولات سے ماوراء تھا تو اس میں وہ الجھ کر رہ گیا۔ اور اپنی عقل کو چونکہ علم کا سرچشمہ سمجھ چکا تھا اس لئے پیغمبروں کے علوم کو بھی عقل کے ترازو میں تولنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے احسان جتلاتے ہوئے انسان کو یہ آگاہی دے رہا ہے کہ انسان کو جو کچھ بھی اطلاع اور آگاہی ہوئی ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ حواس بھی اسی نے دیئے اور جوہرِ عقل سے بھی اسی نے نوازا۔ لیکن جب اخلاقی اقدار کو جاننے، عالمِ غیب کو پہچاننے، اللہ تعالیٰ کی صفات کا ادراک کرنے اور اس کی رضا اور ناراضی کو سمجھنے کا مرحلہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں۔ تو اس طرح سے انسان کو جس علم کی ضرورت تھی اور جس سے ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی مل سکتی تھی اس کی تکمیل فرما دی۔ اور یہ اس نے اس لئے کیا کہ وہ نہایت کریم اور بندوں پر نہایت مہربان ہے۔

آیتِ کریمہ میں ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان نے ایجادات و اکتشافات کی صورت میں جتنی بھی ترقی کی ہے اسے وہ اپنی ذات کا کرشمہ اور احسان سمجھتا ہے جبکہ اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ انسان نے اس حوالے سے بھی جتنا سفر کیا ہے اس کا ہر دروازہ اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے۔ اور اپنی جس علمی دریافت کو انسان اپنا کارنامہ سمجھتا ہے اس کا سراغ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہے۔ نیوٹن نے سیب کے باغ میں بارہا سیبوں کو گرتے ہوئے دیکھا، لیکن اس کے دماغ نے کبھی یہ سوال نہ اٹھایا کہ ٹہنی سے ٹوٹنے والا سیب زمین ہی کی طرف کیوں آتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا اور بجلی کی کوندے کی طرح کششِ ثقل کا چراغ اس کے دماغ میں جل اٹھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی علوم کے حوالے سے بھی انسان نے جتنا سرمایہ جمع کیا ہے اس کی کلید ہمیشہ قدرت نے اس کے ہاتھ میں دی ہے۔

یہ پانچ آیات وہ ہیں جو پہلی وحی کی صورت میں میں آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ایک طویل وقفہ رہا جسے فترت الوحی کہا جاتا ہے۔ اس کا دورانیہ کتنا تھا۔ اہلِ علم میں اختلاف کی وجہ سے حتمی رائے دینا مشکل ہے۔ آگے آنے والی آیات اس وقفہ کے اختتام پر نازل ہوئیں۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ﴿٦﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴿٧﴾

(ہرگز نہیں، بیشک انسان سرکشی کرتا ہے۔ ۶) اس بناء پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔ ۷)

Marfat.com

احسانات کے جواب میں قریش کا رویہ اور اس کا سبب

ان آیات میں اشرافِ قریش کے اس رویئے کا بیان ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کے بدلے میں اختیار کیا جو آیاتِ بالا میں مذکور ہوئے۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت اور آپ پر نازل ہونے والی وحی اہلِ عرب کیلئے خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کیلئے عموماً اللہ تعالیٰ کی نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ ان نعمتوں کا مورد چونکہ براہِ راست قریش اور ان کا شہر بنا، اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والے اور سب سے زیادہ شکر گزار ہوتے۔ لیکن انہوں نے جس طرح آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کیا اور پھر جس طرح اس کا تمسخر اڑایا اور اس کو ہلکا کرنے کیلئے جیسی کچھ سخن سازیاں کیں اس کا جواب صرف ایک لفظ ''كَلَّا'' سے دیا گیا ہے کہ تمہارا یہ رویہ اور تمہاری یہ سخن سازیاں ہرگز کوئی استحقاق نہیں رکھتیں۔ کوئی شریف آدمی اس کی توقع بھی نہیں کر سکتا کہ ان نعمتوں اور انعامات کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ تم جو کچھ اس سلسلے میں کہہ رہے ہو، وہ حقیقت کا اظہار نہیں، بلکہ تمہارا اصل مرض اور ہے۔ وہ مرض یہ ہے کہ اشرافِ قریش کو عام اہلِ عرب سے زیادہ محض بیت اللہ کی وجہ سے جو تجارتی مراعات حاصل ہیں اور جس کے نتیجے میں انہیں دوسروں سے زیادہ مال و دولت میسر آ گیا ہے اس نے انہیں بر خود غلط بنا دیا ہے۔ دولت کی فراوانی نے ان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے نیازی پیدا کر دی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ سے انہیں ملنا تھا وہ مل چکا ہے، اب وہ کسی چیز کیلئے اس کے محتاج نہیں۔ اس لئے دنیا اور دولتِ دنیا ان کا ہدف بن کے رہ گئی ہے۔ یہی ان کی منزل ہے اور یہی ان کا محبوب ہے۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ایک دن ہر چیز تباہ ہو جائے گی، ہمیں از سرِ نو زندہ کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ اسی غلط فہمی نے انہیں دولت اور اپنی قوت کے پندار میں مبتلا کر دیا ہے۔

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی ﴿۸﴾

(بیشک آپ کے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۸)

رُجْعٰی ...... بشریٰ کے وزن پر مصدر ہے۔ اس کا معنی رجوع کرنا اور لوٹنا ہے۔

قریش کی نادانی پر تنبیہ

کاش پندارِ دولت کے ان مریضوں کو اس بات کا احساس ہوتا کہ لوٹنا تو انہیں بہرحال اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔ موت سے کسے رستگاری ہے۔ سب اکڑی ہوئی گردنیں فرشتۂ اجل کے سامنے ٹوٹ جائیں گی۔ شاہجہاں اور جہانگیر کہلانے والے بھی موت کے ہاتھ سے بے بس ہوں گے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری ہوگی تو وہاں ایمان و عمل کے سوا کوئی سہارا نہ ہوگا۔ تب انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کی سرکشی ان کیلئے کتنی مہنگی ثابت ہوئی ہے۔ اور آج جن قوتوں کے سہارے آخرت سے بے نیاز بنے ہوئے ہیں اور جن مزعومہ شرکاء کی شفاعت کے وہم میں مبتلا ہیں ان کی حقیقت بھی اس دن کھل جائے گی، اس دن بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی اور اس کی پکڑ سے پناہ دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ﴿۱۰﴾

(ذرا دیکھو تو اس کو جو روکتا ہے۔ ۹) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ ۱۰)

Marfat.com

قریش کے رویئے کی ایک مثال

اَرَءَیْتَ ...... یہ گفتگو کا ایک اسلوب ہے۔ اس اسلوب میں بات اس وقت کی جاتی ہے جب کسی شخص کی نہایت نامناسب حرکت پر لوگوں کو توجہ دلانا یا اس پر نکیر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے ہم اپنی زبان میں کسی شخص کی نہایت مکروہ حرکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ذرا اس کو تو دیکھو، تم نے ذرا اس کا حال دیکھا۔ اسی طرح یہاں بھی اشرافِ قریش میں سے کسی کی نہایت نازیبا حرکت پر اظہارِ نفرین کیا جارہا ہے اور دوسرے لوگوں کو اس پر توجہ دلائی جارہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس حرکت کے کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں اور اس کا بھی امکان قوی ہے کہ یہ حرکت ابوجہل لعین نے کی ہو۔ کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت ہے کہ ابوجہل نے لات وعزیٰ کی قسم کھا کر کہا کہ اگر اس نے پھر محمد (ﷺ) کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو (العیاذ باللہ) وہ آپ کی گردن کو روند دے گا اور آپ کے منہ کو خاک آلود کردے گا۔ ایک دن اس نے حضور کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھا تاکہ اپنی قسم پوری کرے۔ جب وہ آپ کے قریب پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنے ہاتھوں سے کسی چیز کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کررہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا، کیوں پیچھے ہٹے ہو؟ کہنے لگا جب میں نزدیک ہوا تو مجھے ان کے اور اپنے درمیان ایک خندق دکھائی دی جو آگ سے بھری ہوئی ہے اور اس سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ حضور نے ارشاد فرمایا اگر وہ میرے نزدیک آنے کی جرأت کرتا تو فرشتے اس کے چیتھڑے اڑا دیتے۔ اس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

قرآنِ کریم نے ابوجہل کی جس حرکت پر اظہارِ نفرت کرتے ہوئے تعجب کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کو نماز پڑھنے سے روک رہا تھا جبکہ نماز اللہ تعالیٰ کی بندگی کا سب سے پہلا اظہار ہے۔ اور کسی مذہب نے اس سے انکار نہیں کیا۔ عمل میں کوتاہیاں ہوئیں لیکن اس کی اہمیت سے کبھی صرفِ نظر نہیں کیا گیا۔ ادائیگی کے طریقے بھی مختلف رہے لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہر مذہب کا شعار سمجھا گیا۔ لیکن ابوجہل کے بگاڑ کا اندازہ کیجئے اور اس کے ہم جلیس دوسرے اشراف کا حال دیکھئے کہ انہیں سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی نماز پر غصہ ہے۔ اور جب حضور زمین پر سر رکھتے ہیں تو انہیں آگ سی لگ جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی انسانیت سے گری ہوئی اس حرکت پر اس آیتِ کریمہ میں توجہ دلائی گئی ہے۔

عبد سے مراد

اس پر بھی غور کیجئے کہ اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کیلئے عبد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ نماز پڑھنے والے عبد سے یہاں آپ ہی مراد ہیں۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں غیر خدا کی عبدیت یعنی غلامی سب سے بڑی لعنت ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا عبد ہونا، سب سے بڑا اعزاز ہے۔ مختلف انبیائے کرام کو جو اعزازات بخشے گئے ہیں ان میں سے کوئی اعزاز اس سے بڑھ کر نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندے، تمام اولیاء اور تمام انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں۔ لیکن اس عبدیت میں بے انتہا مراتب ہیں جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس لئے جب وہ کسی کو سب سے بڑے اعزاز سے یاد کرتا ہے تو اسے عبدہ کہہ کر یاد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلمہ شہادت میں آپ کو رسول سے پہلے عبدہ قرار دیا گیا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اسی لفظ سے آپ کو نوازا گیا ہے۔ حسی معجزات

Marfat.com

میں سب سے بڑا معجزہ معراج ہے۔اس میں بطورِ خاص آپ کو عبدہ فرمایا گیا ہے۔تو یہ چونکہ آپ کے سب سے بڑے اعزاز کا حوالہ ہے اس لئے نکرہ ہونے کے باوجود آپ کے سوا اس سے کوئی اور مراد نہیں ہو سکتا۔اقبال نے ٹھیک کہا:

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر

اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْهُدٰۤی ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ﴿۱۲﴾

(بھلا دیکھو تو اگر وہ (عبد) ہدایت پر ہوا۔ ۱۱) یا نیکی کا حکم دینے والا ہوا۔ ۱۲)

امکانات پر غور کی ترغیب

اوپر کی آیت میں جس شخص کی احمقانہ حرکت پر اظہارِ نفرت کیا گیا اور لوگوں کو اس کی شناعت پر توجہ بھی دلائی گئی،اسی کے حوالے سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جس شخص نے یہ حرکت کی اور جن لوگوں نے اس پر اظہارِ تحسین یا رضامندی کا اظہار کیا،انہیں ایک لحہ کیلئے اس پر سوچ لینا چاہئے تھا کہ آخر امکان تو اس بات کا بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہدایت پر ہو۔یا وہ تبلیغ و دعوت کے ذریعے لوگوں کو تقویٰ کی راہ دکھا رہا ہو۔تو پھر اس شخص نے اسے نماز سے روک کر جو کچھ کیا ہے اس کے پاس اس کا جواز کیا ہے۔یعنی اس کے اپنے برحق ہونے کی اس کے پاس دلیل کیا ہے۔

اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۱۳﴾

(تمہارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا شخص حق کو) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو۔ ۱۳)

کوئی ہوش و خرد رکھنے والا تعصب سے دور اور غیر جانبدار شخص اس صورتحال پر غور کرے اور پھر بتائے کہ جو شخص ایسی عظیم شخصیت کو جو تقویٰ کا حکم دیتی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے کو روکتا اور سجدے سے منع کرتا ہے اگر خود اس کا اپنا یہ حال ہو کہ وہ حق کی تکذیب کرتا اور حق سے منہ موڑنے والا ہو تو ایسے شخص کا انجام کیا ہونا چاہئے۔یقیناً ایسا شخص اس قابل ہے کہ اسے جہنم کا ایندھن بنایا جائے کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے عظیم بندے کو نماز سے روکا اور خود تکذیب کا راستہ اختیار کر کے اپنے ہی ہاتھوں جہنم کا دروازہ کھولا ہے۔یہاں الفاظ میں جوابِ شرط محذوف ہے۔لیکن جو شخص بھی معنی پر غور کرے گا تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں جوابِ شرط کا محذوف ہونا درحقیقت اس شخص کے انجام کی سنگینی کو نمایاں کر رہا ہے۔اور قرآنِ کریم نے بعض جگہ اس جواب کو کھول کر اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔سورۃ اللیل میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ لَا یَصْلٰهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَی ۝ الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ''جہنم میں وہی بدبخت پڑے گا جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا'' اس آیتِ کریمہ میں جھٹلانے اور منہ موڑنے والے کا انجام واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ﴿۱۴﴾

(کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ ۱۴)

Marfat.com

بدتمیزی کرنے والے کے عقیدہ کے حوالے سے اسے خود فیصلہ کرنے کی دعوت

ایسے شخص کی بدنصیبی کی کیا انتہاء ہے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر شخص کی حرکات وسکنات کو دیکھتا اور جانتا ہے۔لیکن اس کی بدنصیبی نے اس کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے اور دماغ کو ایسا ماؤف کر دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عظیم بندے کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے اور حق کے معاملے میں جیسا کچھ اس کا رویہ ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ جانتا ہے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر آگاہی اشراف قریش کے عقیدے میں پہلے سے شامل تھی۔اس لئے اسے بے خبری کا فائدہ نہیں دیا جاسکتا۔یقیناً اس کی بدنصیبی ہے جس نے اسے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا ۢ بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾
فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾

(ہرگز نہیں! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کو گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بالوں سے۔ ۱۵) جھوٹی گنہگار پیشانی۔ ۱۶) پس وہ بلا لے اپنے ہمنشینوں کو۔ ۱۷) ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلائیں گے۔ ۱۸)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ لَنَسْفَعًا، اصل میں لَنَسْفَعَنْ ہے۔یہ فعل مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔اس کے آخر میں ''ن'' تاکید خفیفہ ہے۔لیکن قرآنِ کریم کے رسم الخط کا اتباع کرتے ہوئے اسے لَنَسْفَعًا کی صورت میں لکھا گیا ہے۔یہ سفع سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو مٹھی میں پکڑ کر کھینچنا اور گھسیٹنا۔

نَاصِيَةِ ...... پیشانی اور پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں۔چہرہ اور پیشانی آدمی کی ذات کے سب سے اشرف حصے ہیں۔ اس وجہ سے ان سے بعض اوقات پوری شخصیت مراد لی جاتی ہے۔

نَادِيَهُ ...... ہمنشین، اہلِ مجلس اور پارٹی پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

زَبَانِيَةَ ...... بعض اہلِ لغت کے نزدیک یہ اسمِ جمع ہے۔جیسے ابابیل اور عبادید۔لیکن اکثر اہلِ لغت اسے جمع قرار دیتے ہیں لیکن پھر اس کے واحد کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ابوعبیدہ کے نزدیک اس کا واحد زِبْنِيَةٌ ہے۔اس کے اصل معنی تو دفاع کرنے والے کے ہیں۔اس لئے اس پولیس پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو افسروں کی اعانت پر مقرر رہتی ہے۔یہاں یہ ملائکہ عذاب کے معنی میں ہے۔

ان آیات کا شانِ نزول

ان آیات کے شانِ نزول کے حوالے سے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایک روز مقامِ ابراہیم پر نماز ادا کر رہے تھے کہ ابوجہل کا وہاں سے گزر ہوا اور گستاخانہ لہجے میں کہنے لگا، کیا میں نے تمہیں نماز پڑھنے سے روکا نہیں، تم پھر وہی کام کر رہے ہو۔ آپ نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔اس پر ابوجہل بولا اے محمد (ﷺ) تم مجھ سے دھمکی آمیز لہجے میں بات کیسے کر سکتے ہو، کیونکہ اعوان وانصار کی جتنی جمعیت میرے پاس ہے بطحا کی ساری وادی میں کسی رئیس کے پاس نہیں۔ایک آواز دوں تو ساری وادی میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ رہے۔اس وقت حضرت جبرائیل امین علیہ السلام یہ آیات لے کر نازل ہوئے۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور سرکشوں کو دھمکی

ان آیات میں سب سے پہلے کَلَّا کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ اس نانہجار کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کریں۔ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ اس پر عمل نہیں کر سکے گا اور آپؐ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور ساتھ ہی اسے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ نابکار اپنی گستاخیوں سے باز نہ آیا تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹیں گے۔ وہ اپنے تئیں کیسی ہی غلط فہمی میں مبتلا کیوں نہ ہو اور لوگ اسے چاہے کچھ بھی سمجھتے ہوں لیکن اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس کی پیشانی ایک خطا کار پیشانی ہے اور جھوٹی پیشانی ہے۔ یعنی وہ ایک خطا کار اور جھوٹا آدمی ہے۔ ایسے شخص کی پیشانی اس قابل ہے کہ اسے مٹی میں رگڑا جائے اور اسے ذلت کی تصویر بنا دیا جائے۔ وہ آپ کو اپنے حمایتیوں اور مددگاروں سے ڈراتا ہے، اسے چاہئے کہ وہ اپنے ہمنشینوں، ہم مجلسوں، ہم خیالوں اور اعوان و انصار کو بلا لے۔ ہم بھی دوزخ کے سزا دینے والے فرشتوں کو بلاتے ہیں۔ تب معلوم ہو جائے گا کہ جس قوت پر اسے ناز ہے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اس کی حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ ابوجہل اور دیگر اشراف قریش اپنی بہت بڑی جمعیت لے کر نہایت تکبر کے ساتھ قوت کا اظہار کرتے ہوئے میدانِ بدر میں پہنچے۔ اور پیشِ نظر یہ تھا کہ آج ہم مسلمانوں کو بتا دیں گے کہ ہماری قوت کا عالم کیا ہے۔ اور پورا عرب بھی جو پہلے ہی ہماری عظمت کو تسلیم کرتا ہے ہماری قوت سے مزید مرعوب ہو جائے گا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کے بلائے ہوئے عذاب کے فرشتوں اور سرہنگوں سے واسطہ پڑا تو قریش کی پوری جمعیت ان کے سامنے غبار بن کر اڑ گئی۔

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ ﴿١٩﴾

(ہرگز نہیں! آپ اس کی بات نہ مانیں اور سجدہ کریں اور اپنے رب کا قرب حاصل کریں۔ ۱۹)

آنحضرت ﷺ کو ہدایت

یہ جھوٹا اور خطا کار شخص جو آپؐ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے اور سجدہ سے منع کرتا ہے، آپؐ ہرگز اس کی بات کی پرواہ نہ کریں اور اس کی حرکت کو خاطر میں نہ لائیں۔ آپ کو جب بھی موقع ملے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کی جناب میں ہمیشہ سجدہ کرتے رہیں اور کثرتِ سجود سے اس کا قرب حاصل کرتے رہیں۔ حضرت ثوبانؓ فرماتے ہیں کہ مجھے سرورِ عالم ﷺ نے نصیحت فرمائی علیک بکثرة السجود فانه لاتسجد لله تعالیٰ سجدة الارفعک الله بها درجة وحط عنک بهاخطیئة ''اے ثوبان! کثرت سے سجدہ کیا کرو، کیونکہ جب تو اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ ہر سجدے کے ساتھ تیرا ایک درجہ بلند کر دے گا اور تیری ایک خطا معاف کر دے گا۔'' اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ بندہ اپنے رب کے نزدیک سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہ روایت بھی صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب یہ آیت پڑھتے تو سجدہ تلاوت ادا فرماتے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ سجدہ سے نماز مراد لی جائے۔ کیونکہ نماز ہی کو صبر و عزیمت اور فتح بابِ نصرت کی کلید بتایا گیا ہے۔ اور سجدہ نماز کا سب سے اعلیٰ رکن ہے۔ اور یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ آپؐ کو اس چیز سے روک دے جو آپ کی زندگی کی غائت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کا واحد وسیلہ ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ

(۹۷)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْقَدْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْقَدْرِ ہے اور یہ نام اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔ اس میں ایک رکوع، پانچ آیتیں، انیس کلمے اور ایک سو بارہ حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ سورۃ کے نزول کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں۔ ابوحیان اندلسی نے اپنی تفسیر بحرِ محیط میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ سورۃ مدنی ہے۔ علامہ واحدی کا قول ہے کہ یہ پہلی سورۃ ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اکثر علماءِ تفسیر کا خیال ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ امام الماوروی اسی کے قائل ہیں۔ اور امام سیوطی نے بھی اتقان میں یہی بات لکھی ہے۔ اور سورۃ کا مضمون بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے کہ اس سورۃ کو مکی ہونا چاہئے۔ اس کے مدنی ہونے کے بارے میں سورۃ کی آیات میں ہمیں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اور جن روایات سے تائید حاصل کی جاتی ہے وہ سند کے اعتبار سے قابلِ اعتبار نہیں۔

مضمون:۔ اس سے پہلے سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا ہے۔ اور ان آیات میں قرآنِ کریم کے نزول کو اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانِ عظیم کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ پیشِ نظر سورۃ میں اسی احسانِ عظیم یعنی قرآنِ کریم کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔ اور قرآنِ کریم کی عظمت کو ظاہر کرنے کیلئے اس رات کی اہمیت و عظمت کو بیان کیا گیا ہے جس میں قرآنِ پاک نازل کیا گیا ہے۔ وہ رات ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں قدر و منزلت والی رات ہے۔ اور پھر اس رات کی عظمت کو دو حوالوں سے بیان فرمایا گیا ہے۔ ایک تو اس حوالے سے کہ وہ رات ایسی عظیم القدر ہے جس میں تقدیروں کے فیصلے کئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اسے نظامِ عالم کے امورِ مہمہ کی تقسیم و تنفیذ کیلئے مخصوص فرمایا ہے۔ اور اس کی قدر و منزلت کا عالم یہ ہے کہ یہ رات ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اس رات میں قرآن کا نزول ایک ایسا عظیم واقعہ ہے کہ جو دنیا کی تقدیر بدل کر رکھ دے گا اور دنیا کی تاریخ میں ہزار مہینوں میں کوئی ایسا تاریخ ساز کام نہیں ہوا جو اس رات میں ہوا ہے۔ اور اس کی خیرات و برکات کا حال یہ ہے کہ اس رات میں غروبِ آفتاب سے لے کر طلوعِ سحر تک فرشتوں کی آمد اور رحمتوں کے نزول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور سلامتی کی بشارتیں برستی رہتی ہیں۔

اس میں قرآنِ کریم کے مخاطبوں کو متنبہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اس کتاب کے بارے میں کوئی رویہ اختیار کرنے سے پہلے وہ یہ ضرور سوچ لیں کہ یہ کتاب کسی شخص کی ذاتی امنگ یا محنت کا نتیجہ نہیں، بلکہ اسے خود اللہ تعالیٰ نے انسانی بھلائی کے عظیم فیصلے کے حوالے سے خود اپنے اہتمام میں اتارا ہے۔ اس لئے نہایت زور دے کر اسے اِنَّآ سے شروع کیا گیا ہے۔

کوئی رات شیطانی شرور سے محفوظ نہیں ہوتی۔ خیر کی قوتیں بھی کام کرتی رہتی ہیں اور شر کی قوتیں بھی۔ لیکن یہ رات نزولِ قرآن کی برکت سے ایسی رات ہے جس میں شیطانی قوتوں کو بے بس کر دیا گیا ہے۔ یہ کامل سلامتی کی رات ہے۔ اس میں روح القدس اور ملائکہ اہلِ دنیا کیلئے خیر و برکت کی بشارت بن کر نازل ہوتے ہیں۔ اور اس رات میں ان لوگوں کی قسمت سنور جاتی ہے جو قرآنِ کریم سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ لوگ محروم رہتے ہیں جو اس کتابِ مقدس سے رشتہ کاٹ لیتے ہیں۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ۵	سُوْرَۃُ الْقَدْرِ مَکِّیَّۃٌ (۹۷)	رُکُوْعَاتُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ
الْقَدْرِ ۥ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵

رکوع: ۱۔ (ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے۔ ۱) اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ ۲) شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ ۳) اس میں فرشتے اور روح القدس اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے، ہر امر کیلئے۔ ۴) یہ (رات) سراسر سلامتی ہے، یہ طلوع فجر تک ہے۔ ۵)

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱

(ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے۔ ۱)

ضمیر کا مرجع قرآنِ کریم ہے جو کسی کی ذاتی امنگ کا نتیجہ نہیں

اَنْزَلْنٰهُ میں ضمیر مفعول کا مرجع ذکر نہیں کیا گیا، حالانکہ ضمیر کا ذکر مرجع کے ذکر کے بغیر کلام کا عیب ہے۔ اور قرآنِ کریم چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یہ ہر عیب سے پاک ہے۔ اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ مرجع کا ذکر کئے بغیر ضمیر کو لانا اس وقت عیب ہوتا ہے جب مرجع پر کوئی قرینہ دلالت نہ کر رہا ہو، جبکہ یہاں ایسا نہیں۔ یہاں دو قرینے موجود ہیں۔ ایک اس سورۃ کا پہلا لفظ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ ہم نے نازل کیا ہے۔ نزول کا لفظ یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ یہاں ضمیر مفعول کا مرجع قرآنِ کریم ہے۔ کیونکہ یہی وہ کتاب ہے جو تیئس سال تک اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر پر نازل فرماتا رہا ہے۔ اور دوسرا قرینہ یہ ہے کہ سورۃ العلق جو قرآنِ کریم کی ترتیب میں سورۃ القدر سے پہلے ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ نزول میں بھی یہی ترتیب ہوگی۔ اس سورۃ کی پہلی پانچ آیات جو قرآنِ کریم کا ایک جز ہیں اور جن کے نزول سے قرآنِ کریم کے نزول کا آغاز ہوا ہے۔ اسی قرآنِ کریم کو ضمیر کا مرجع بنا کر اس کے نزول کی بات کی جا رہی ہے۔ یہ قرینہ بجائے خود ضمیر مفعول کے مرجع کو متعین کر دیتا ہے۔

Marfat.com

اس سورۃ کا پہلا لفظ اِنَّـآ دو باتوں کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ایک تو یہ کہ اس کتاب کو ہم نے نازل کیا ہے یہ کسی کی ذاتی امنگ یا اپج کا نتیجہ نہیں۔اس میں کسی شیطانی تحریک یا وسوسہ کا کوئی دخل نہیں۔اسے چونکہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور اس کا کلام ہے اس لئے اس کی ہر بات حتمی، یقینی اور نارسائی کے عیب سے پاک ہے۔

اور دوسری اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے چونکہ اسے نازل کیا ہے تو اس کے اقرار اور انکار سے پہلے اس کا مراقبہ ضرور کرو کہ ہم کون ہیں؟ ہماری بات کے انکار کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟ اور ہماری بات کا اقرار کن فوائد و فیوض کا حامل ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ جس رات میں اس قرآن کو نازل کیا گیا جسے لیلۃ القدر فرمایا گیا ہے۔وہ لیلۃ القدر کیا ہے یعنی اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کی عظمت کا کیا عالم ہے، اس کیلئے تو سورۃ الدخان کی پہلی آیت کا حوالہ کافی ہوگا۔جس آیت کو یہاں لیلۃ القدر فرمایا گیا ہے وہاں اسے لیلۃ مبارکہ کہا گیا ہے۔اس میں ارشاد فرمایا گیا ہے اِنَّـآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ O فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۔ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّـآ كُنَّا مُرْسِلِيْنَ O ''ہم نے اس قرآن کو نہایت مبارک رات میں اتارا، بیشک ہم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کرنے والے ہیں، اسی رات میں تمام حکیمانہ امور کی تقسیم کی جاتی ہے، خاص ہمارے حکم سے، بیشک ہم رسول بھیجنے والے تھے۔''

لَيْلَةِ الْقَدْرِ سے متعلق چند باتیں

اس آیتِ کریمہ سے ہمیں لَيْلَةِ الْقَدْرِ کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رات کس حیثیت کی حامل ہے۔پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ قدر و منزلت والی رات سرتاپا برکت ہے۔اس رات کو پانے والے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے مورد بن جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ رات ایسی عظیم القدر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات کو اس کام کیلئے مخصوص فرمایا ہے کہ وہ تمام امور جو اس عالم میں نازل ہونے والے ہوتے ہیں اور جو انسانوں کیلئے بے حد اہمیت کے حامل ہوتے ہیں انہیں اس رات میں ملائکہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے تا کہ وہ انہیں نافذ کریں۔

اور تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت، قرآن کا نزول اور قریش کو انذار ان اہم امور میں سے ہے جن کی تنفیذ کا کام اس مبارک رات میں فرشتوں کے حوالے ہوا ہے۔جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی اہم سکیموں اور عظیم منصوبوں میں سے ہے۔اس لحاظ سے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یہ کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچے۔

رہی دوسری بات کہ یہ رات کون سی ہے جس میں قرآن پاک نازل کیا گیا ہے۔تو اس حوالے سے ہم سورۃ البقرۃ میں دیکھتے ہیں کہ یہ فرمایا گیا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآنِ کریم کو نازل کیا گیا۔'' اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ جس رات میں پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ غارِ حرا میں نبی کریم ﷺ کے پاس وحی لے کر آیا وہ ماہِ رمضان کی ایک رات تھی اور اسی کو شبِ قدر اور اسی کو لیلۃ مبارکہ کہا گیا ہے۔اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہی وہ رات ہے جس میں پورا قرآنِ کریم حاملِ وحی فرشتوں کے حوالے کیا گیا اور پھر وہیں سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حالات و واقعات کے مطابق وقتاً فوقتاً تیئس سال کے دوران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام لے کر آتے

Marfat.com

رہے۔اس لحاظ سے قرآنِ کریم کے دو نزول ہیں۔ایک لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر جو رمضان کی ایک ہی رات میں ہوا ہے۔اور اسی رات میں اسے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام اور حاملینِ وحی کے حوالے کیا گیا ہے۔اور دوسرا نزول وہ ہے جس کا آغاز غارِ حرا میں ہوا اور تکمیل تیئس سال میں ہوئی۔لیکن جب اس کا آغاز ہوا تو وہ رمضان کا مہینہ اور رات کا وقت تھا۔اور اسی رات کو لَیْلَةِ الْقَدْرِ کہا گیا ہے۔

لَیْلَةِ الْقَدْرِ کون سی رات ہے

اب اس سوال کا ایک جز باقی رہتا ہے کہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ رات رمضان کی رات تھی،لیکن یہ سوال باقی ہے کہ وہ رات کون سی تھی؟اس کا جواب دینا آسان نہیں،اس لئے کہ اس میں اہلِ علم نے بہت اختلاف کیا ہے۔لیکن علماءِ امت کی عظیم اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ یہ رات رمضان کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک طاق رات تھی۔اور ان میں بھی زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔اس معاملہ میں جو معتبر روایات منقول ہوئی ہیں ہم انہیں تفہیم القرآن سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات ہے (ابوداؤد طیالسی)۔دوسری روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ ہے کہ وہ رمضان کی آخری رات ہے (مسند احمد)۔

حضرت ابی بن کعب سے زِرّ بن حبیش نے شب قدر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے حلفاً کہا اور استثناء نہ کیا کہ وہ ستائیسویں رات ہے (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان)۔

حضرت ابوذر سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمر، حضرت حذیفہ اور اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے (ابن ابی شیبہ)۔

حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے۔اکیسویں یا تیئسویں یا پچیسویں یا ستائیسویں یا انتیسویں یا آخری (مسند احمد)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو جب کہ مہینہ ختم ہونے میں نو دن باقی ہوں یا سات دن باقی ہوں یا پانچ دن باقی ہوں (بخاری)۔ اکثر اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضورؐ کی مراد طاق راتوں سے تھی۔

حضرت ابوبکرہ کی روایت ہے کہ نو دن باقی ہوں یا سات دن یا پانچ دن یا تین دن یا آخری رات۔مراد یہ تھی کہ ان تاریخوں میں لَیْلَةِ الْقَدْرِ کو تلاش کرو (ترمذی، نسائی)۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات میں تلاش کرو (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی)۔حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تازیست رمضان کی آخری دس راتوں میں اعتکاف فرمایا ہے۔

Marfat.com

اس معاملہ میں جو روایات حضرت معاویہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں ان کی بنا پر علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شب قدر سمجھتی ہے۔ غالباً کسی رات کا تعین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ شب قدر کی فضیلت سے فیض اٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی ایک رات پر اکتفا نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کمزوروں پر نظر کرم فرماتے ہیں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی نے اس رات میں عشاء اور فجر کی نماز باجماعت ادا کی تو اس نے اس رات کی فضیلت کو پالیا۔ یعنی یوں تو یہ راتیں اپنے مالک وخالق کی محبت میں پگھلنے کی راتیں ہیں، لیکن جو شخص یہ نہیں کرسکتا، اسے کم از کم نماز باجماعت کی پابندی تو کرنا چاہیے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں اس رات کو پالوں تو کیا دعا کروں تو آپؐ نے فرمایا یہ دعا کرنا اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ (اے اللہ تو سراپا معافی ہے، معافی کو پسند کرتا ہے مجھے بھی معاف فرما) غور فرمائیے۔ ایک شخص اپنی بندگی کا سارا اثاثہ اپنے خالق ومالک کے آستانہ پر نچھاور کردیتا ہے۔ رات دن اسی کے عشق میں جلتا اور اسی کی تلاش اور حصول تقرب میں راتوں کو جاگتا ہے تا آنکہ اس کا نصیب یاوری کرتا ہے اور وہ اس رات کو پالیتا ہے۔ اب یہ موقع ہے کہ وہ عشق ومستی کے اس لمحے سے سرشار ہو کر جھوم اٹھے اور اپنے مقدر پر ناز کرے مگر اس موقعہ پر بھی اسے صرف معافی مانگنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یعنی اسے یہ سکھایا جاتا ہے کہ تمہیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ تم ہزار جتن کرو تمہارا عمل کبھی نسیان وخطا سے پاک نہیں ہوسکتا اور تم کبھی اس بارگاہِ عالی کے لائق عمل پیش نہیں کرسکتے۔ اسی لیے اس راستے کے شناور جتنا آگے بڑھتے ہیں اتنا ہی عاجزی وفروتنی کے پیکر بن جاتے ہیں۔ کیونکہ اس راہ کا اصل سرمایہ یہی ہے۔

اس رات سے متعلق بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اختلاف مطالع کی وجہ سے ہر جگہ رات کا ایک وقت میں ہونا تو ممکن نہیں جب مکہ معظمہ میں رات ہوگی اس وقت دنیا کے بہت سے ممالک میں دن ہوگا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس رات کے فضائل اور اس کی برکتوں سے تمام ممالک کے لوگ یکساں فیض یاب ہوسکیں۔ جہاں رات ہوگی وہاں کے لوگ اس رات کی فضیلت کو پاسکتے ہیں اور جہاں دن ہوگا وہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔ اگر غور کیا جائے تو اس کی مختلف توجیہات ممکن ہیں۔ مثلاً رات کی حقیقت کیا ہے؟ زمین کے کسی حصے کا سورج کے سامنے سے ہٹ جانا۔ کیونکہ جب سورج کی کرنیں زمین کے اس قطعہ تک نہیں پہنچیں گی تو وہاں اندھیرا یعنی رات ہوگی اور دن کی حقیقت کیا ہے؟ کسی قطعہ زمین کا سورج کے سامنے آکر سورج کی کرنوں سے منور ہوجانا۔

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ زمین اپنے گرد حرکت کرتی اور گھومتی ہے۔ اس لحاظ سے زمین کا جو حصہ سورج کے سامنے آجاتا ہے وہاں دن طلوع ہوجاتا ہے اور باقی حصوں میں رات ہوتی ہے اور پھر یہ مسلسل گھومنے کی وجہ سے رات پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور دن پھیلتا جاتا ہے اور زمین کے یہ روشن حصے جب زمین کی حرکت کی وجہ سے سورج کے سامنے سے ہٹتے جاتے ہیں تو وہاں رات طاری ہوجاتی ہے۔ اس طرح رات اور دن کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے جسے قرآن کریم يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ سے تعبیر کرتا ہے (یعنی رات دن پر لپٹی آتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے)۔ اس حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مختلف قطعات زمین پر رات کے

Marfat.com

طاری ہونے میں کہیں انقطاع نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کی حرکت ہر دم جاری ہے جیسے جیسے زمین سورج کے سامنے سے ہٹتی جاتی ہے رات میں ڈوبتی جاتی ہے۔ یہ سفر چونکہ مسلسل جاری رہتا ہے اس لیے رات بھی بلا انقطاع مسلسل جاری رہے گی۔ فرض کریں جب لیلۃ القدر مکہ معظمہ میں وارد ہوئی تو یہی لیلۃ القدر زمین کی گردش کے ساتھ مسلسل آگے بڑھتی جائے گی اور زمین اور اہل زمین کو اپنی برکات بانٹتی جائے گی۔ گویا یہ رات ایک ہی ہے البتہ مختلف ممالک کے لوگ اپنی اپنی باری پر اس سے فیضیاب ہوتے جائیں گے۔ گویا یہ خیر و برکت کی ایک ریل ہے یہ ایک ہی ہے البتہ ہر اسٹیشن پر منتظر لوگ اس کے وہاں پہنچنے پر اس میں سوار ہو جائیں گے۔

ابھی آپ نے پڑھا کہ رات دن ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے آتے ہیں ایک دوسرے سے بالکلیہ منقطع نہیں ہوتے۔ اس لیے یہ توجیہہ بھی اہل علم نے کی ہے کہ عربی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے رمضان کی ان تاریخوں میں جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصے میں ہو اس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شب قدر ہو سکتی ہے۔

اور تیسری بات جو سب سے زیادہ مستحکم ہے وہ یہ ہے کہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر قرار پائے گی اس جگہ اسی رات میں شب قدر کی برکات حاصل ہوں گی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَمَآ اَدْرٰکَ مَالَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۝۲

(اور تم کیا جانو کہ شبِ قدر کیا ہے۔ ۲)

لَیْلَۃِ الْقَدْرِ کی عظمت

لَیْلَۃِ الْقَدْرِ کی جلالتِ شان کو نمایاں کرنے کیلئے استفہامیہ اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ یہ قرآنِ کریم کا ایک مخصوص اسلوب ہے کہ وہ ہیبت یا ہولناکی کے اعتبار سے کسی چیز کی شدت کو بیان کرنا چاہتا ہے تو یہ اسلوب اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح کسی چیز کی عظمت واہمیت کو اجاگر کرنا چاہتا ہے تو یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز اتنی عظیم ہے کہ اس کی عظمت کا حقیقی اندازہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ تمہیں اس کا اندازہ اس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ اس کا علم عطا فرمائے گا۔ اور یا اس کے مظاہر کو قیامت کے دن دیکھو گے۔ یہاں بھی یہی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ ایسی باعظمت اور بابرکت رات ہے جس کی عظمتوں اور برکتوں کا کماحقہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کی یہ عظمت وبرکت اس وجہ سے ہے کہ جس طرح سورۃ الدخان میں بیان کیا گیا کہ اس میں اس کائنات سے متعلق بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیا کی حکومتیں ان دنوں کو یادگار بنا دیتی ہیں جن دنوں میں کوئی بڑی اہمیت کا فیصلہ کیا گیا ہوتا ہے یا کوئی بڑا اہم واقعہ پیش آیا ہوتا ہے۔ مثلاً ملک کی آزادی کا دن، کسی جنگ میں کامیابی کا دن۔ یہ رات کائنات کے اہم فیصلوں کے حوالے سے بھی عظیم رات ہے۔ اور اس کی عظمت کا یہ سبب بھی ہے کہ اس میں قرآنِ کریم آسمانِ دنیا پر نازل کیا گیا۔ اور جن وانس کی فلاح وکامرانی کیلئے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا گیا۔

لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ ۝۳

(شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ ۳)

Marfat.com

ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کا مفہوم

جس رات کی عظمت کو پروردگار نے استفہامیہ انداز میں اٹھایا، اس کا جواب چونکہ کسی کے بس میں نہ تھا اس لئے خود ہی اس کا جواب ارشاد فرمایا کہ وہ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بھی افضل ہے۔ کتنی افضل ہے دوگنا، چار گنا یا ہزار گنا۔ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تحدید نہیں فرمائی۔ ویسے بھی ہزار کا لفظ عربوں میں ایسے مواقع پر ایک متعین عدد کیلئے نہیں بولا جاتا بلکہ غیر معمولی کثرت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یعنی وہ رات اپنی فضیلت وشرف میں غیر معمولی اور بے حد وحساب حیثیت کی حامل ہے۔ اس رات میں کیا ہوا عمل اجر وثواب کے اعتبار سے ہمارے اعداد کے پیمانوں میں تو آنے والا نہیں۔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح اس مادی دنیا میں فصلوں، موسموں اور اوقات کا اعتبار ہے۔ ہر فصل کے برگ وبار لانے اور اس کی کاشت کا ایک متعین وقت ہوتا ہے۔ وہ اسی میں پوری طرح افزائش ونمو پاتی ہے۔ اور جس طرح ہر موسم اپنے خصوصی تغیرات اور اثرات رکھتا ہے اور جس طرح مختلف اوقات اپنی تاثیر وتاثر میں امتیاز کے حامل ہیں، اسی طرح روحانی دنیا میں بھی اوقات اور موسموں کا اعتبار ہے، جس میں اعمال کی افزونی، قبولیت اور اثر ونفوذ اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، یہ رات بھی ایک ایسی ہی رات ہے جس میں کیا جانے والا نیک عمل اپنے اجر وثواب، تغیر احوال اور اثر ڈالنے میں بینظیر ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴

(اس میں فرشتے اور روح القدس اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے، ہر امر کیلئے۔ ۴)

اس رات کا اصل کام

اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اس رات کے لیلۃ القدر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ رات تقدیرِ امور یا تقسیمِ امور کی رات ہے۔ یعنی اس سال میں جتنے اہم کام کائنات کے حوالے سے ہونے والے ہوتے ہیں یا جن وانس کی بھلائی کیلئے جو فیصلے کئے جاتے ہیں ان کی تنفید اور بروئے کار لانے کیلئے انہیں فرشتوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اسی بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس میں ملائکہ اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ان تمام معاملات میں جو زمین میں نافذ ہونے والے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی منظوری لے کر اترتے ہیں۔ اسی بات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سورۃ الدخان میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس رات میں فرشتے اترتے ہیں اور ان کا ذکر قرینہ ہے اس بات کا کہ یہاں روح سے مراد حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ ملائکہ کے سردار اور مطاع ہیں۔ انہیں کی زیرِ سرکردگی فرشتوں کا ایک جمِ غفیر اترتا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت انسؓ سے ایک روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا اِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ يَنْزِلُ جِبْرَئِيْلُ فِيْ كَبْكَبَةٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ اَوْ قَاعِدٍ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ ''لیلۃ القدر کو جبرائیل فرشتوں کے جمِ غفیر کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں اور ملائکہ کا یہ گروہ ہر اس بندے کیلئے دعائے مغفرت اور التجائے رحمت کرتا ہے جو کھڑے ہوئے یا بیٹھے ہوئے اللہ بزرگ وبرتر کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے۔'' کتنا خوش نصیب اور بلند اقبال ہے وہ بندہ کہ جو اس رات کو اپنے پروردگار کی یاد میں بسر کرتا ہے۔ جبرائیل اور فرشتے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں اور اس کی مغفرت وبخشش کیلئے دعائیں مانگتے ہیں۔

Marfat.com

فرشتوں کا یہ نزول از خود نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اترتے ہیں یا اللہ تعالیٰ انہیں حکم دیتا ہے کہ زمین پر جاؤ اور اس کے اطراف میں گھومو، جہاں کہیں میرا کوئی بندہ میرے ذکر کی شمع روشن کر کے بیٹھا ہے اس کے پاس پہنچو اور اسے ہماری طرف سے رحمت کی بشارت دو۔ اور اس سے مصافحہ کرو اور اس کیلئے مغفرت کی دعائیں مانگو۔

سَلٰمٌ ۛ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝٥

(یہ (رات) سراسر سلامتی ہے، یہ طلوعِ فجر تک ہے۔ ۵)

یہ رات سرتاپا سلامتی ہے، طلوعِ فجر تک رہتی ہے

سَلٰمٌ ، یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ اصل میں یہ هِیَ سَلَامٌ ہے۔ خبر پر پوری توجہ مرکوز کرنے کیلئے مبتداء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس آخری آیت میں لیلۃ القدر کے محفوظ و مامون ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ یہ امن و سلامتی کی رات ہے۔ اس مبارک رات میں شیاطین پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو پریشان نہیں کر سکتے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس رات میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کیلئے عبادت و ریاضت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستے کھول دیئے جاتے ہیں۔ آدمی خود شیطان بن جائے یا اپنے نفس کو کھلی چھٹی دے دے تو اس کی شرانگیزی سے اللہ تعالیٰ حفاظت کا انتظام نہیں فرماتا۔ لیکن وہ شرور و فسادات جو شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور ان کی کارگزاریوں سے وجود میں آتے ہیں ان پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ وہ اس اہم رات کے اسرار معلوم کرنے کیلئے کوئی نقل و حرکت نہیں کر سکتے۔ اور نہ اس مبارک شب کی برکتوں میں خلل انداز ہونے کی جرأت کر سکتے ہیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃِ

(۹۸)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْبَیِّنَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْبَیِّنَة ہے جو اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔ لَمْ یَکُنِ کے نام سے بھی یہ سورۃ پکاری جاتی ہے۔ اور یہ بھی اس سورۃ کی پہلی آیت کا پہلا لفظ ہے۔ اس میں ایک رکوع، ۸ آیتیں، ۹۴ کلمے اور ۳۹۹ حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ اس کے بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں اور دونوں قول جمہور کی طرف منسوب ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ علامہ آلوسی نے ایک روایت بیان کرنے کے بعد اس کے مدنی ہونے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ابو حیان اندلسی اور صاحب احکام القرآن اس کے مکی ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں تک سورۃ کے مضامین کا تعلق ہے ان میں بظاہر کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی جو اس کے مکی یا مدنی ہونے کو ترجیح دیتی ہو۔ البتہ قرآنِ کریم کی ترتیب کو دیکھتے ہوئے یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ سورۃ شاید مکی ہو۔ کیونکہ سورۃ قدر اور سورۃ علق کے ساتھ اس کی گہری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ سورۃ العلق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ اور سورۃ القدر میں اس رات کی قدر و منزلت بیان کی گئی ہے جس میں یہ کتاب نازل ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سورۃ العلق میں نزولِ کتاب کا آغاز ہے اور سورۃ القدر میں کتاب کی قدر و منزلت کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس سورۃ میں رسالت کی ضرورت کو بیان فرمایا جا رہا ہے۔ تینوں سورتوں کا اس طرح سے معنوی اتصال رہنمائی دیتا ہے کہ یہ تینوں سورتیں یکے بعد دیگرے نازل ہوئی ہیں۔

مضامین:۔ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کے ہمہ گیر بگاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اہلِ دنیا کی اصلاح کی بظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی حالانکہ اہلِ کتاب کے پاس ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کی کتابیں موجود تھیں۔ اور کتابوں کو سمجھنے والے علماء و مشائخ کی بھی کمی نہ تھی۔ اور مشرکین بھی کوئی کتاب نہ رکھتے ہوئے بھی بعض نسبتوں پر فخر کرتے تھے۔ اس بگاڑ کو صلاح سے بدلنے کی صرف ایک صورت تھی کہ ایک ایسی روشن دلیل رسول کی شکل میں بھیجی جائے جو ہر طرح کی ظلمتوں میں روشنی کا سامان کرے جس کی ذات اور جس کا کردار اس کی دعوت کی صداقت کی روشن دلیل ہو۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں ایسے صحیفے لے کر آئے جن میں حق کو اس کی اصلی صورت میں باطل کی تمام آمیزشوں سے پاک پیش کیا گیا ہو۔ اس کے الفاظ، معنی، مفہوم اور مدلول تک ہر چیز سابق آسمانی کتابوں سے انتہائی بلند اور ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک ہو۔

اس کے بعد اہلِ کتاب کی گمراہیوں کے متعلق وضاحت کی گئی ہے کہ ان کے راہِ راست سے بھٹکنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی رہنمائی نہیں بلکہ ان کے بھٹکنے کا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر مصلحتوں کا شکار ہو گئے تھے اور خود

Marfat.com

اپنی شخصیات اور اپنے گروہی تعصّبات کو اصل ہدف بنا چکے تھے۔ اور ان ہی عصبیتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کے ہاتھوں تحریف اور ترمیم سے پاک نہیں رہ سکی تھی۔

مزید فرمایا گیا ہے کہ جتنے نبی اور رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کئے گئے ہیں اور جتنی کتابیں اتاری گئی ہیں ان سب کی ایک ہی دعوت تھی کہ سب طریقوں کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کی بندگی کا طریقہ اختیار کیا جائے اور پورے خلوص اور یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی، اطاعت اور پرستش نہ کی جائے۔ نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ یہی وہ سیدھا اور مضبوط دین ہے جس کی دعوت ہر نبی نے دی ہے۔ اسی دعوت سے ہٹنے کے نتیجے میں اہلِ کتاب میں شرک کی مختلف صورتوں نے جنم لیا۔ اب اللہ تعالیٰ کا آخری رسول اسی اصل دین کی طرف پلٹنے کی دعوت لے کر آیا ہے۔

اس کے بعد انسانوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک وہ قسم ہے جو اللہ تعالیٰ کے اصل دین کی پرستار، اسی کی عبادت گزار اور اسی کی اطاعت گزار ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہترینِ خلائق ہیں۔ اور قیامت کے دن ان کو صلہ یہ ملے گا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے۔ اور دوسری قسم انسانوں کی وہ ہے جو رسول کو ماننے سے انکار کریں گے، اللہ تعالیٰ کی بندگی میں دوسروں کو شریک کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے دین میں نئی نئی باتیں نکالیں گے۔ ان میں اہلِ کتاب بھی ہوں گے اور مشرکین بھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بدترینِ خلائق ہیں۔ ان کے طرزِ عمل کی سزا ان کو یہ ملے گی کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٨	سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ (٩٨)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ
مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ ﴿١﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا
صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ ﴿٢﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ ﴿٣﴾ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ؕ ﴿٤﴾ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا
لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ؕ ﴿٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ
هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ ﴿٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ
اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ؕ ﴿٧﴾ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ
عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ
اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴿٨﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ا۔ (نہیں تھے باز آنے والے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، یعنی اہلِ کتاب اور مشرکین، جب تک کہ ان کے پاس ایک روشن دلیل نہ آ جائے۔ ۱) یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔ ۲) جس میں لکھی ہوں سچی اور درست تحریریں۔ ۳) اور نہیں تفرقہ برپا ہوا ان لوگوں میں جن کو کتاب دی گئی تھی، مگر اس کے بعد کہ آ گئی ان لوگوں کے پاس روشن دلیل۔ ۴) حالانکہ انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں، اسی کیلئے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔ ۵) بیشک اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہی لوگ بدترین خلائق ہیں۔ ۶) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے وہ ساری مخلوق سے بہتر ہیں۔ ۷) ان کا صلہ ان کے رب کے پاس ہیشگی کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، وہ ان میں تا ابد رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، یہ صلہ اس کیلئے ہے جو اپنے رب سے ڈرا۔ ۸)

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۱

(نہیں تھے باز آنے والے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، یعنی اہلِ کتاب اور مشرکین، جب تک کہ ان کے پاس ایک روشن دلیل نہ آ جائے۔ ۱)

اہلِ کتاب اور مشرکین کا جمود اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کی دلیل

نبی کریم ﷺ کی بعثتِ طیبہ سے پہلے انسان کا ہمہ جہتی بگاڑ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ قرآنِ کریم نے دوسری جگہ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ لوگوں کی کرتوتوں کے باعث ہر سطح کا فساد بر و بحر میں پھیل گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی شدت کا یہ عالم کہ اصلاح کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ پوری دنیائے انسانیت کے لوگ بالعموم اور جزیرۂ عرب کے لوگ بالخصوص دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ وہ تھا جنہیں اہلِ کتاب کہا جاتا تھا۔ اس سے مراد وہ تمام افراد تھے جو کسی نہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے انہیں اپنے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب رکھنے کا دعویٰ تھا۔ حالانکہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اللہ تعالیٰ کی محفوظ کتاب نہ تھی۔ کوئی تحریف نذر ہو چکی تھی اور کسی کی حقیقت جا و بیجا ترمیموں کے ذریعے بگاڑ دی گئی تھی۔ انہیں اگرچہ توحید کے پرستار ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ اصل دین توحید ہی کو مانتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود شرک کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو ان میں نہ پائی جاتی تھی۔ بایں ہمہ انہیں مشرک کہلانے سے انکار تھا۔ لیکن دوسرا گروہ وہ تھا جو توحید کو اصلِ دین ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ اصلِ دین شرک ہی کو قرار دیتے تھے۔ اس لئے پہلے گروہ کو اہلِ کتاب کے نام سے یاد کیا گیا اور دوسرا گروہ بطورِ اصطلاح مشرک کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان دونوں گروہوں میں یہ فرق صرف اصطلاح ہی میں نہیں بلکہ شریعت کے احکام میں بھی ہے۔ اہلِ کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کیلئے حلال کیا گیا ہے، اگر وہ صحیح طریقے سے جانور

Marfat.com

ذبح کریں۔اوران کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔اس کے برعکس مشرکین کا ذبیحہ حرام ہے اوران کی عورتوں سے نکاح کی بھی اجازت نہیں۔دونوں میں اس اصطلاحی فرق کے باوجود دونوں کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔اسلام دونوں کو کافر قرار دیتا ہے اور ان پر کفر کے احکام جاری کرتا ہے۔لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثتِ طیبہ سے پہلے کفر کی یہ تاریکی اس قدر مہیب ہو چکی تھی اور کفر کا رویہ اس قدر راسخ ہو چکا تھا کہ کہیں سے بھی اس کے اندر روشنی کی کوئی کرن پھوٹنے کی امید نہ تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اصلاح کی ہمیشہ دو ہی صورتیں رہی ہیں۔ایک تو یہ کہ انسانی قلوب میں قبولیتِ حق کی استعداد باقی رہے۔خیر وشر کا امتیاز بالکل ختم ہو کر نہ رہ جائے، اچھائی اور برائی اپنی پہچان نہ کھودے۔تو امید کی جاسکتی ہے کہ کوئی اچھی نصیحت، کوئی دل ہلا دینے والا واقعہ، کوئی ارضی وسماوی آفت اور کوئی بڑی آزمائش اصلاح کا سبب بن سکتی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے گردوپیش میں ایسی نشانیاں رکھی ہیں جو انسان کو بار بار اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔اور انسان اگر قبولیتِ حق سے بالکل محروم نہ ہو گیا ہو تو اس سے فائدہ اٹھانا اس کیلئے کوئی مشکل نہیں ہوتا۔لیکن اگر اس کے دل کا فانوس بجھ چکا ہے اور قبولیتِ حق کی صلاحیت سلب ہو گئی ہے تو پھر بڑے سے بڑا محرک بھی بیکار ثابت ہوتا ہے۔ٹھیک کہا شاعر نے:

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے
مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بو نے

اصلاح کی دوسری صورت یہ ہے کہ مذہبِ حق اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ زندہ اور کارفرما ہو۔اس کے مبلغ ومنادا اخلاص اور تنومندی کے ساتھ اسے لوگوں کے دل ودماغ میں اتارنے کی محنت کر رہے ہوں۔اور لوگوں کی عقلیں اس قدر بانجھ نہ ہوئی ہوں کہ وہ حق سے دشمنی پر اتر آئیں۔تب امید کی جاسکتی ہے کہ شاید انسانی اصلاح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے انسانوں کے دلوں کے گھروندے مسمار ہو چکے تھے۔عقلیں مسموم ہو چکی تھیں اور دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہ تھا جس کی بنیاد وحیِ الٰہی پر ہو۔اور جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب اپنی صحیح حالت میں موجود ہو۔اور علم اور مشیخیت کے دعویدار انسانی اصلاح کی فکر رکھتے ہوں۔اس صورتحال کے پیشِ نظر فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کے بگاڑ میں اصلاح کی کوئی صورت پیدا ہونے کی امید نہ تھی۔اوران کے اس حالتِ کفر سے نکلنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی، بجز اس کے کہ ایک روشن دلیل آکر انہیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلافِ حق ہونا واضح کر دے۔جن تاریکیوں نے ان کا محاصرہ کر رکھا تھا کوئی معمولی روشنی اس محاصرہ کو توڑ نہیں سکتی تھی۔اس تاریکی کا طلسم توڑنے کیلئے ایک قوی اور تابندہ دلیل کی ضرورت تھی جس کی کرنیں تاریکیوں کا سینہ چاک کر کے رکھ دیتیں، اور شکوک وشبہات کے غبار کو یکسر ناپید کر دیتیں۔جس طرح طلوعِ آفتاب سے زمین کا گوشہ گوشہ چمکنے لگتا ہے، ضرورت تھی کہ ہدایت کا کوئی ایسا آفتاب طلوع ہو جو ان کے قلب واذہان کے کونے کونے میں اجالا بکھیر دے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴿۲﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴿۳﴾

(یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔ ۲) جس میں لکھی ہوں سچی اور درست تحریریں۔ ۳)

رَسُوْلٌ، الْبَيِّنَةُ سے بدل ہے۔

Marfat.com

اَلْبَیِّنَةُ کی وضاحت

انسانی ہدایت کیلئے جس اَلْبَیِّنَةُ یعنی روشن دلیل کی ضرورت تھی وہ روشن دلیل نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔اور آپ کی ذات کو ہدایت کی روشن دلیل اور بلند مینار دو چیزوں نے بنایا ہے۔ایک آپ کی نبوت سے پہلے کی زندگی اور آپ کا حُسنِ کردار۔اور دوسرا آپ کا اُمی ہونے کے باوجود ایک ایسی کتاب کو پیش کرنا جو اپنے اندر ہمہ جہتی اعجاز رکھتی ہے۔جس کے الفاظ، جس کی تراکیب، جس کے جملے، جس کے محاورے، جس کی ضرب الامثال اور جس کی تلمیحات اس وقت بھی لاجواب تھیں اور آج بھی پہلے کی طرح شاداب اور لاجواب ہیں۔جس کی مضمون آفرینی، جس کی معنوی چستی، جس کی دلیل کی گرفت، جس کی مثالوں کا انطباق، جس کی اخبار، جس کے محاکے، جس کے معقول عقائد، جس کی نہایت موثر عبادات، جس کا اخلاقی نظام اور انسانی زندگی کیلئے جس کے بہترین اصول واحکام کی تعلیم اور جس کا منضبط ضابطہ حیات ایک ایسی روشن اور حیرت انگیز دلیل ہے اور اس پر ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں ایک صالح انقلاب اس کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔انہی صفات کی حامل کتاب کو یہاں صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے تعبیر کیا گیا ہے۔صحف، صحیفہ کی جمع ہے۔لغت کے اعتبار سے لکھے ہوئے اوراق کو کہا جاتا ہے۔لیکن قرآنِ کریم کی اصطلاح میں انبیائے کرام پر نازل ہونے والی کتابوں کیلئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔اور مطہرة کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں کسی قسم کے باطل، کسی طرح کی گمراہی اور ضلالت اور اخلاق سے گری ہوئی کسی بات کی آمیزش نہیں۔اور اس کی مزید وضاحت یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ ان صحیفوں میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ہم نے کتب کا ترجمہ تحریریں کیا ہے۔لیکن علامہ قرطبی نے کتب سے مراد احکام لئے ہیں اور قَیِّمَةٌ سے مراد ہے راست، درست اور مستحکم۔اس سے مراد ہے کہ اس کا کوئی حکم، اس کی کوئی نصیحت اور اس کی کوئی بات حق وصداقت اور عقلِ سلیم کے خلاف ہے اور نہ اخلاقی اعتبار سے کمزور ہے۔قرآنِ کریم کے ان اوصاف کی قدر آدمی کو اس وقت ہوتی ہے جب آدمی بائیبل اور دوسرے مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کتابوں میں جابجا اسے ایسی باتیں دکھائی دیتی ہیں جو نہ صرف عقلِ سلیم کیخلاف ہیں۔اور حق وصداقت کے پیمانوں میں تلنے سے قاصر ہیں۔بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی بہت گری ہوئی ہیں۔تب اسے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کتنی پاک اور مطہر کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۴

(اور نہیں تفرقہ برپا ہوا ان لوگوں میں جن کو کتاب دی گئی تھی، مگر اس کے بعد کہ آ گئی ان لوگوں کے پاس روشن دلیل۔ ۴)

اہلِ کتاب کی تاریخ سے ان کی بدنصیبی پر استشہاد

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کو ایک طرح کی تنبیہ کی گئی ہے کہ بلاشبہ انسان میں خیر وصلاح کی صورت پیدا نہیں ہوتی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی روشن دلیل نازل نہیں کی جاتی۔یعنی کوئی رسول نہیں آتا اور اس پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوتی۔لیکن اہلِ کتاب کی بدنصیبی یہ ہے کہ ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول آئے، ان کی طرف کتابیں نازل کی گئیں۔بجائے اس کے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف

Marfat.com

سے اس بَيِّنَةِ کی قدر کرتے، ان کتابوں کو ضابطۂ حیات بناتے اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی سنت کو زندگی کا وظیفہ بناتے، یہ قبائلی عصبیت، مال وجاہ کی محبت اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی وجہ سے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیا۔ تحریف وترمیم سے کام لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی تعلیمات کا حلیہ بگاڑ ڈالا۔ اور اس طرح سے ان پر یہ حجت تمام ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک روشن دلیل اتاری تھی لیکن انہوں نے اس کی روشنی میں چلنے کی بجائے اپنی لئے تاریکیاں پسند کیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو بگاڑ ڈالا۔ اس طرح سے اپنی گمراہی کے خود ذمہ دار بنے۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ اور کرم فرمایا ہے اور ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول اور قرآنِ کریم روشن دلیل کی حیثیت سے آچکے ہیں اور ٹھیک ٹھیک تعلیمات ان تک پہنچ چکی ہیں، اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ پھر ان پر حجت تمام کردی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ تفرقے کا شکار رہے اور فرقوں میں بٹے رہے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کو اپنا رہنما بنانے سے انکار کردیا اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کی پیروی کی بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کی تو اس گمراہی کی ذمہ داری خود انہی پر ہوگی۔ اور قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی حجت پیش نہ کرسکیں گے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝٥

(حالانکہ انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں، اسی کیلئے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے بالکل یکسو ہوکر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔ ۵)

اہلِ کتاب میں تفرقہ کا سبب

اہلِ کتاب میں جو تفرقہ پیدا ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے دین کی بنیادی چیزوں کو چھوڑ دیا۔ ان میں کوئی چیز ایسی باقی نہ رہی جس پر یہ اپنے آپ کو قائم اور استوار رکھ سکیں۔ انہیں بھی اور دنیا کی دوسری قوموں کو بھی ہمیشہ دو ہی باتوں کی تلقین کی گئی۔ اور انہی دونوں باتوں کی پابندی کا حکم دیا گیا۔ پہلی بات یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کریں، اس کی عظمت کے گن گائیں، اسی کی اطاعت اور اسی کی پرستش کریں۔ تحلیل وتحریم صرف اسی کا حق سمجھیں۔ اپنے جسم وجان، اپنے علائق اور اپنے مال ودولت کو اسی کی امانت سمجھیں۔ اور اسی پر قیام وثبات کیلئے عبادات کو اپنا وظیفہ بنائیں۔ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ کو اپنا چلن بنائیں۔ لیکن انہوں نے دین کی یہ بنیادی تعلیم برباد کردی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں عجل پرستی کے مرتکب ہوئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ بنالیا اور اپنے علماء وفقہاء کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ قرار دیا۔ جادو اور اعمالِ سفلیہ ان کی دلچسپی کا مرکز بن گئے۔ اسی طرح نماز اور زکوٰۃ کے احکام بھی بگاڑ دیئے۔ نماز تو بالکل ضائع کردی۔ یہاں تک کہ تورات میں اب اس کا ذکر بھی باقی نہ رہا۔ زکوٰۃ کسی حد تک رسمی طور پر باقی رہی، لیکن اس کے اصلی حقدار غرباء وفقراء کی جگہ بنی لاوی کے علماء وفقہاء بن گئے۔ اس طرح سے انہوں نے پورا دین تباہ کرڈالا۔ حالانکہ اصلاحِ عقائد اور اصلاحِ اعمال کا یہی وہ جامع نظام تھا جسے یہاں دِيْنُ الْقَيِّمَةِ فرمایا گیا ہے۔ اسے انہوں نے غارت کردیا۔ الْقَيِّمَةِ کے

Marfat.com

بارے میں کئی اقوال ہیں اَلْقَيِّمَةِ صفت ہے۔ اس کا موصوف اَلْمِلَّةِ مقدر ہے۔ عبارت یوں ہے ذٰلِکَ دِيْنُ الْمِلَّةِ الْقَيِّمَةِ یعنی "یہ ایک راست روملت کا دین ہے۔" دوسرا قول یہ ہے جو زیادہ واضح اور پسندیدہ ہے۔ اَلْقَيِّمَةِ کے آخر میں "تا" تانیث کی نہیں بلکہ مبالغہ کی ہے۔ جیسے علّامۃ فھّامۃ اور دین جو موصوف ہے اس کو صفت کی طرف مضاف کر دیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝۶

(بیشک اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہی لوگ بدترین خلائق ہیں۔ ۶)

آنحضرت ﷺ کی مخالفت کا نتیجہ

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد جو لوگ آپ کی اور قرآنِ کریم کی تکذیب پر اڑے رہے اور برابر آپ کی مخالفت کرتے رہے چاہے وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، یہ دونوں نام بطور علَم کے استعمال ہوئے ہیں، یعنی ان کا تعلق چاہے اہلِ کتاب سے ہو یا مشرکین سے وہ آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی تکذیب کر کے کفر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اس جرم کے باعث جہنم میں جائیں گے، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ وہ اپنے اس جرم کے باعث بدترینِ خلائق ہیں۔ کیونکہ جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے عقل اور قوتِ امتیاز نہیں دی۔ اس لئے وہ تکلیفِ شرعی کے مکلف نہیں اور یہ عقل رکھتے ہوئے بھی جب اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کا انکار کرتے ہیں تو اس لحاظ سے یقیناً تمام مخلوقات سے بدتر ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝۷

(بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے وہ ساری مخلوق سے بہتر ہیں۔ ۷)

ایمان لانے والوں کا اعزاز

یوں تو ایمان اور عملِ صالح، یہی ایک انسان کا حقیقی سرمایہ ہے، اسی سے اسے عرفانِ ذات کی دولت ملتی ہے اور اسی سے اسے اللہ تعالیٰ کا معرفت نصیب ہوتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اس کی زندگی میں خوش اطواری پیدا کرتی اور ایک مومن کی زندگی کے طور اطوار ابھارتی ہے۔ اس سے پہلے کی آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ان تمام حقائق کو ماننے سے انکار کرتے ہیں جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئے ہیں۔ انسانوں کی یہی تقسیم حقیقی تقسیم ہے۔ کفر انسان کو اس کے حقیقی مرتبے سے گرا کر اسفلِ السافلین میں پہنچا دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ شخص تمام مخلوقات سے بدترین ٹھہرتا ہے۔ اور ایمان و عملِ صالح انسان کو وہ مرتبہ عطا کرتا ہے جس سے برتر کوئی مرتبہ نہیں۔ اور انسان تمام مخلوق سے افضل اور برتر ٹھہرتا ہے۔ یہ انسان کی گراوٹ کی انتہاء ہے اور وہ انسان کے رفعت کی انتہاء ہے۔ جگر نے ٹھیک کہا:

Marfat.com

گھٹے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

یہ تو ایک مومن کی عام حالت کا بیان ہے، لیکن آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والے جنہیں ہم صحابہ کرامؓ کے نام سے یاد کرتے ہیں ان کی عظمت و رفعت کا تو اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس وقت ایمان کا تصور بھی کپکپی پیدا کرنے کیلئے کافی تھا۔ جو لوگ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے انہوں نے جان و تن کا سودا کیا۔ اور زندگی کی صعوبتوں اور اذیتوں کو دعوت دی۔ اور اس کی برداشت اور مقابلے کیلئے استقامت کا پیکر بن کر کھڑے ہوگئے۔ اور پھر اس راستے میں جو بھی قربانی دینا پڑی انہوں نے اس سے دریغ نہیں کیا۔ تو ان کی عظمتوں کا شمار کس سے ممکن ہے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ قرآنِ کریم میں اس طرح کی آیات کا نزول ان وفا شعار مسلمانوں کے حق میں جو اذیتوں کے ساتھ ساتھ اشرافِ قریش کی توہین آمیز باتوں کے چرکے بھی برداشت کرتے تھے، کس قدر حوصلہ افزا اور کس قدر ان کی سربلندی کا باعث ہوتا ہوگا۔ یہ لوگ یقیناً بہترینِ خلائق تھے اور انہوں نے اپنے ایمان و عمل سے اپنے آپ کو اس قابل ثابت کیا۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا کہ یہ پاکیزہ لوگ فرشتوں سے بھی افضل تھے۔ کیونکہ فرشتے نافرمانی کا اختیار نہیں رکھتے۔ اس لئے وہ بندگی کا جتنا بڑا حق بھی ادا کریں وہ ان کی مجبوری ہے۔ لیکن انسان نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود جب فرمانبرداری کرتا ہے بلکہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت بھی ادا کرتا ہے تو پھر اس کے سب سے اشرف و اعلیٰ ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴿٨﴾

(ان کا صلہ ان کے رب کے پاس ہمیشگی کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، وہ ان میں تا ابد رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، یہ صلہ اس کیلئے ہے جو اپنے رب سے ڈرا۔ ۸)

اصحابِ ایمان کا صلہ اور انعام

ایسے وفاداروں اور جانثاروں کا صلہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سدا بہار باغات ہیں جن کے نیچے ندیاں رواں ہوں گی۔ جہاں کا ہر پھول، ہر کلی ان کی محبت کے رنگ میں رنگی ہوگی۔ لیکن ان سے بھی بڑا اعزاز اور بڑی نعمت ان کیلئے یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوجائے گا۔ اور وہ نیازمند اپنے کریم رب کی بے پایاں عنایات سے بہرہ ور ہو کر اس سے راضی ہوجائیں گے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو پکاریں گے۔ وہ جواب میں عرض کریں گے۔ اے ہمارے پروردگار، ہم حاضر ہیں۔ ساری سعادتیں اور بھلائیاں تیرے دستِ قدرت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ دریافت کریں گے کہ اب تم راضی ہو، وہ عرض کریں گے، اے ہمارے رب! ہم تجھ پر راضی کیوں نہ ہوں جبکہ تو نے ہمیں ایسی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے جو کسی مخلوق کو نصیب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں اس سے ایک اعلیٰ انعام

Marfat.com

عطانہ کروں۔ وہ کہیں گے الٰہی! اس سے افضل اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ میں تمہیں اپنی رضا اور خوشنودی سے اس طرح سرفراز کر دوں کہ اس کے بعد میری ناراضگی کا تمہیں کوئی اندیشہ نہ رہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہ اعزاز اور مقامِ بلند ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا، یہ شرف ان سعادتمندوں کا حصہ ہے جو زندگی بھر اس خیال سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ ہم کبھی کوئی ایسا کام نہ کر گزریں جس سے ہمارا مالک ہم سے ناراض ہو جائے۔ وہ کبھی حکم عدولی کی جرأت نہیں کرتے۔ ہاں اگر بھولے سے کوئی لغزش ہو جائے تو اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے سامنے روتے اور استغفار کرتے رہتے ہیں جب تک دل میں قبولیت کی ٹھنڈک اتر نہیں جاتی۔

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے سو بار ندامت ہوتی ہے

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ

(۹۹)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کو اِذَا زُلْزِلَت اور الزِّلْزَال کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔اس میں ایک رکوع، ۸ آیتیں، ۳۵ کلمے اور ۱۳۹ احروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ اس کے زمانۂ نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔حضرت ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ اور عطاءؒ کے نزدیک یہ مکی ہے۔قتادہ اور مقاتل نے اسے مدنی قرار دیا ہے۔اور اس کے مدنی ہونے پر حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جو ابنِ ابی حاتم نے ان سے نقل کی ہے کہ جب یہ آیتیں نازل ہوئیں فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ تو حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، کیا میں اپنا عمل دیکھنے والا ہوں؟ حضور نے فرمایا، ہاں۔میں نے عرض کیا یہ بڑے بڑے گناہ؟ آپؐ نے جواب دیا ہاں۔میں نے عرض کیا اور یہ چھوٹے چھوٹے گناہ بھی؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں۔اس پر میں نے کہا پھر تو میں مارا گیا۔حضور نے فرمایا خوش ہو جاؤ اے ابوسعید کیونکہ ہر نیکی اپنے جیسی دس نیکیوں کے برابر ہو گی۔حضرت ابوسعید خدری چونکہ مدینے کے رہنے والے تھے اور غزوۂ احد کے بعد سنِ بلوغ کو پہنچے تھے، تو جو سورۃ ان کے سامنے نازل ہوتی ہے وہ یقیناً مدنی کہلائے گی۔اس لئے اس سورۃ کے مدنی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔لیکن ہم پیچھے کہیں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ کسی سورۃ کے نزول سے متعلق صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل مخصوص تھا۔وہ جب کسی سورۃ یا آیت کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ وہ اس وقت نازل ہوئی ہے بلکہ اس کا یہ مطلب بھی ہوتا تھا کہ فلاں موقع پر یا فلاں واقعہ پر اس سورۃ کا انطباق ہوتا ہے۔حضرت ابوسعید خدری کا یہ کہنا کہ یہ آیتیں میری موجودگی میں نازل ہوئیں، اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ میں نے جب پہلی دفعہ انہیں سنا تو مجھ پر یہ اثر ہوا اور میں نے آنحضرت ﷺ سے یہ سوالات کئے۔جہاں تک زمانۂ نزول کا تعلق ہے تو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر اس سورۃ کو پڑھے گا وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سورۃ مکی ہے۔کیونکہ اس کا اندازِ بیان نہ صرف مکی سورتوں والا ہے بلکہ ان مکی سورتوں والا ہے جو مکہ کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں۔جب نہایت مختصر اور انتہائی دلنشیں طریقہ سے اسلام کے بنیادی عقائد لوگوں کو سمجھائے جاتے تھے۔

مضامین:۔ یہ پوری سورۃ دو مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ایک مقصد تو یہ ہے کہ قیامت کے منکرین بالعموم تین اسباب کے تحت قیامت کا انکار کرتے تھے۔ایک سبب یہ تھا کہ زمین و آسمان کا درہم برہم ہو جانا اور کائنات کا شکست و ریخت کا شکار ہو جانا ان کے نزدیک بعید از عقل بات تھی۔دوسرا سبب یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن تمام انسانوں کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔اولاً تو یہ بات ہی ممکن

Marfat.com

دکھائی نہیں دیتی کہ ابتدائے آفرینش سے تا قیامت جتنے لوگ مر چکے ہیں اور جن میں سے بیشتر کا کوئی نشان تک موجود نہیں ان کے مردہ اجسام کہاں سے نکالے جائیں گے اور پھر انہیں زندہ کر کے محشر میں جمع کر دیا جائے گا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہر انسان دنیا میں لاکھوں افعال کرتا ہے اور اس کے اقوال اس سے بھی بڑھ کر ہوتے ہیں، ایسے لاتعداد اقوال و افعال کا بھلا کون احاطہ کر سکتا ہے کہ حساب تک نوبت پہنچے؟ اور تیسرا سبب یہ تھا کہ اگر بفرض محال قیامت آ ہی گئی تو جب بھی ان کیلئے اندیشہ کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ جن قوتوں کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے وہ انہیں اپنی سفارش سے ہر آفت سے بچالیں گی۔ اس سورۃ میں انہیں تینوں مغالطوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔

دوسرا مقصد اس سورۃ کے نزول کا یہ ہے کہ انسان زمین اور اس کے گردوپیش کے بارے میں یہ تصور رکھتا ہے کہ زمین کا ذرہ ذرہ، اس میں اگنے والے درخت، اس میں جابجا گرے ہوئے پتھر اور اس پر کھڑی چھوٹی بڑی عمارتیں یہ سب گونگی بہری ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کو بات کا احساس تک نہیں۔ اس لئے انسان بڑی بے باکی اور بے حیائی سے زمین کے گوشے گوشے کو اپنے گناہوں سے گندا کرتا رہتا ہے، بلکہ بسا دفعہ اپنے گناہوں کیلئے انہیں اوٹ بنالیتا ہے۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت آئے گی تو زمین کا گوشہ گوشہ اور اس پر واقع وہ تمام جگہیں جن میں اور جن پر انسانوں نے گناہ کئے وہ اس کیخلاف گواہی دیں گی۔ اس طرح سے انسان کو اس کے تغافل سے بیدار اور ہوشیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سب سے پہلے اس ہلچل اور برہمی کی تصویر کھینچی گئی ہے جو قیامت کے دن اس زمین پر برپا ہوگی اور جس کے نتیجے میں زمین وہ سب کچھ اگل ڈالے گی جو اس کے اندر مدفون ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے اوپر ہونے والی ایک ایک بات کی کہانی سنائے گی اور ایک ایک راز کو کھولے گی، اور ان تمام دفینوں کو اچھال دے گی جو انسانوں نے اپنی بداعمالیاں چھپانے کیلئے دفن کر رکھے ہوں گے۔ پھر انسان زمین کے گوشے گوشے سے گروہ در گروہ اپنے مرقدوں سے نکلیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ کسی شخص نے کوئی ذرہ بھر نیکی کی ہوگی تو اسے بھی دیکھے گا اور ذرہ بھر برائی کی ہوگی تو وہ بھی نگاہوں کے سامنے ہوگی۔ نیکیوں کا صلہ پائے گا اور برائی کی سزا سے بچ نہ سکے گا۔

Marfat.com

رُكُوعَاتُهَا ١	سُورَةُ الزِّلْزَالِ مَدَنِيَّةٌ (٩٩)	اٰيَاتُهَا ٨

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ﴿۱﴾ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ﴿۲﴾
وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ
رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ؕ﴿۵﴾ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا
اَعْمَالَهُمْ ؕ﴿۶﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾ وَمَنْ
يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾

رکوع: ۱۔ (جب تھرتھرانے لگے گی زمین پوری شدت سے۔ ۱) اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔ ۲) اور انسان پکار اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ ۳) اس دن وہ بیان کر دے گی اپنے سارے حالات۔ ۴) کیونکہ آپ کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ۵) اس روز لوگ پلٹ کر آئیں گے متفرق حالت میں تا کہ ان کو ان کے اعمال دکھا دیئے جائیں۔ ۶) اور جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا۔ ۷) اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی، وہ بھی اسے دیکھے گا۔ ۸)

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ ﴿۱﴾

(جب تھرتھرانے لگے گی زمین پوری شدت سے۔ ۱)

Marfat.com

ایک ہمہ گیر اضطراب اور ہلچل، مراد قیامت ہے

زلزلہ، پے در پے زور زور سے حرکت کرنے کو کہتے ہیں۔ علامہ راغب لکھتے ہیں التزلزل، الاضطراب وتکریر حروف لفظہ تنبیہ علی تکریر معنی الزلل یعنی تزلزل مضطرب ہونے کو کہتے ہیں اور حروف کا تکرار جھٹکوں کے تکرار پر دلالت کرتا ہے۔

زِلْزَالَهَا...... تاکید اور شدت وقوت کے اظہار کیلئے ہے۔ یعنی جب زمین زوردار جھٹکوں کے باعث پوری قوت کے ساتھ تھر تھرانے لگے گی اور یہاں چونکہ زمین کو ہلانے کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین کا کوئی مقام یا کوئی حصہ یا علاقہ نہیں بلکہ پوری کی پوری زمین ہلا ماری جائے گی۔ اور اس کے ہلانے میں ایسی شدت ہوگی جس کی وضاحت کیلئے آج کوئی مثال نہیں دی جاسکتی۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہ زلزلہ ہے جس سے قیامت کے پہلے مرحلے کا آغاز ہوگا۔ یعنی ساری مخلوق ہلاک ہو جائے گی اور جس کے باعث پہاڑ، لمبے لمبے درخت اور بڑے بڑے محلات اور سنگین قلعے ریزہ ریزہ ہو کر پیوند زمین ہو جائیں گے۔ لیکن بیشتر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہ زلزلہ ہے جو نفخۂ ثانیہ سے آئے گا، جس سے قیامت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔ یعنی تمام اگلے پچھلے انسان دوبارہ زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ بعد کا سارا مضمون اسی کی تائید کر رہا ہے۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴿۲﴾

(اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔ ۲)

اَثْقَالُ سے مراد

اَثْقَالُ ثِقل کی جمع ہے۔ بار اور بوجھ کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کا سب سے پہلا مصداق تو وہ مردے ہیں جو زمین میں دفن ہیں۔ وہ جسم کی حالت میں ہوں یا ان کے اجزا منتشر ہو کر زمین کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہوں، قیامت کے دن زمین سب کو نکال باہر کرے گی۔ لیکن اثقال کا لفظ چونکہ عام ہے اس وجہ سے اس سے وہ خزانے اور دفینے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور ان جرائم کی یادگاریں بھی جن کا مجرموں نے ارتکاب کیا اور زمین میں ان کو چھپا دیا۔ اسی طرح جتنی معدنیات اور جتنے خزانے اور ذخائر اس میں مدفون ہیں سب ظاہر کر دیے جائیں گے۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿۳﴾

(اور انسان پکار اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ ۳)

منکرین کی بدحواسی

یہاں انسان سے مراد وہ انسان ہے جو دنیا میں قیامت کا شدت سے انکار کیا کرتا تھا۔ وہ جب اس برہمی اور اضطراب کی کیفیت کو دیکھے گا اور یہ بھی دیکھے گا کہ زمین سب کچھ اپنے اندر سے باہر پھینک رہی ہے وہ فرطِ حیرت سے چیخ اٹھے گا کہ زمین کو کیا ہو گیا ہے، اس کی حرکت رکنے میں کیوں نہیں آ رہی اور اس کے اندر کی ہر مستور چیز باہر کیوں پھینکی جا رہی ہے۔ وہ چونکہ زندگی میں شدت سے وقوعِ قیامت کا انکار کرتا

Marfat.com

رہا،اب جب اسے اپنے سامنے برپا ہوتے دیکھے گا تو وہ انتہائی حیران اور پریشان ہوگا۔لیکن اہلِ ایمان جنہیں قیامت کے آنے کا یقین تھا ان پر یہ حیرانی اور پریشانی طاری نہیں ہوگی۔سورۃ یٰسین میں بتایا گیا ہے کہ جب منکرینِ قیامت یہ کہیں گے کہ کس نے ہماری قبروں سے ہمیں اٹھا دیا ہے تو وہ نہایت اطمینان سے جواب دیں گے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا۔اور خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں نے سچ کہا تھا۔اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کا علم الیقین اب عین الیقین تک پہنچ جائے گا۔

اسی طرح کی گھبراہٹ مجرموں پر اس وقت بھی طاری ہوگی جب ان کے اعمال کا رجسٹر کھلے گا۔وہ کہیں گے مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ''عجیب ہے یہ کتاب،کوئی چھوٹا یا بڑا عمل ایسا نہیں ہے جو اس کی گرفت سے باہر رہ گیا ہو۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝٤ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝٥

(اس دن وہ بیان کردے گی اپنے سارے حالات۔ ۴) کیونکہ آپ کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ۵)

زمین سب کے اسرار کھول دے گی

انسان زمین کی سطح پر زندگی گزارتا ہے۔کوئی جھونپڑے میں رہے یا محل میں،پہاڑوں کی بلندی پر اس کا قیام ہو یا زمین کی پستی میں۔ اس کا رشتہ بہرحال زمین سے رہتا ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ جس طرح اس کے جسمانی اعضاء کو اس کے اعمال پر گواہ بنائے گا،اسی طرح زمین کے جس حصے پر اس نے کوئی اچھا یا برا عمل کیا ہوگا،زمین کا وہ حصہ اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گا۔اور یہی وہ حالات ہیں جنہیں زمین بیان کرے گی۔انہی کو یہاں اخبار سے تعبیر کیا گیا ہے۔حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر پوچھا، جانتے ہو اس کے وہ حالات کیا ہیں؟لوگوں نے عرض کیا،اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے۔فرمایا وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اس عمل کی گواہی دے گی جو اس نے اس کی پیٹھ پر کیا ہوگا۔وہ کہے گی کہ اس نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا۔یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی۔ (مسند احمد،ترمذی،نسائی)

حضرت سیدنا علیؓ کا یہ طریقہ تھا کہ آپ بیت المال کا سب روپیہ حقداروں میں تقسیم کردیتے تھے۔جب وہ خالی ہوجاتا تو اس میں دو نفل پڑھتے اور پھر فرماتے،اے بیت المال کے در و دیوار،تمہیں گواہی دینی ہوگی کہ میں نے تمہیں حق کے ساتھ بھرا اور حق کے ساتھ خالی کردیا۔

جدید دور سے پہلے لوگ اس بات پر حیران ہوتے تھے کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی؟اس لئے اس طرح کی آیات کی مختلف تاویلیں کی جاتیں۔لیکن سائنس کی محیر العقول ایجادات نے ان سب سوالات کا علمی جواب بہم پہنچا دیا ہے۔آج علومِ طبیعی کے انکشافات سنیما،لاؤڈ اسپیکر،ریڈیو،ٹیلیویژن،ٹیپ ریکارڈ،الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔سائنسی ایجادات نے اب یہ بات سمجھنا آسان کردی ہے کہ زمین کا ذرہ ذرہ ایک خاموش تماشائی کی طرح ہماری کارستانیوں کو دیکھ رہا اور اس کا ریکارڈ مرتب کر رہا ہے۔قیامت کے روز ہماری زندگی کی پوری فلم پوری تفصیل سے ہمیں دکھا دی جائے گی۔پھر کسی میں یہ ہمت نہیں ہوگی کہ وہ ان چیزوں کا انکار کرے۔دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ زمین خود بخود اپنے حالات

Marfat.com

بیان نہیں کرے گی بلکہ اسے اللہ تعالیٰ ایسا کرنے کا حکم دے گا۔ جس طرح اس کے حکم سے جسم کے اعضاء بولیں گے ہماری کھالوں کو قوت گویائی ملے گی۔ اسی طرح زمین کو بھی اس کا حکم پہنچے گا اور وہ اس کی تعمیل کرے گی۔ سورۃ انشقاق میں زمین ہی سے متعلق ارشاد ہے وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ''اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کیلئے یہی زیبا ہے۔''

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝۶

(اس روز لوگ پلٹ کر آئیں گے متفرق حالت میں تا کہ ان کو ان کے اعمال دکھادیئے جائیں۔ ۶)

اس دن ہر شخص اپنی جواب دہی خود کرے گا

يَصْدُرُ کا اسمِ فاعل صادر ہے۔ اس سے ملتا جلتا دوسرا لفظ ہے وارد۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ وارد کہتے ہیں نئے آنے والے کو، اور صادر کہتے ہیں لوٹ کر آنے والے کو۔ یہاں ان لوگوں کا تذکرہ ہو رہا ہے جو اپنی طبعی عمر گزار کر جا چکے، اب قیامت کے دن وہ جوابدہی کیلئے پلٹ کر آئیں گے۔ اَشْتَاتًا یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) متفرق اور جدا جدا، (۲) گروہ در گروہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دونوں ہی مفہوم مراد ہیں، کہ جب لوگ جوابدہی کیلئے قبروں سے نکل کر آئیں گے تو الگ الگ، جدا جدا اور تنہا تنہا ہوں گے۔ کسی کے ساتھ نہ اس کے خاندان کے لوگ ہوں گے، نہ اعزہ واقرباء، نہ اس کا جتھا ساتھ ہوگا نہ خدم وحشم، نہ اعوان وانصار، نہ مزعومہ شرکاء وشفعاء بلکہ ہر ایک تنہا اپنے رب کے حضور جوابدہی کیلئے حاضر ہوگا۔ سورۃ مریم میں ہے كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ''اور ان میں سے ہر ایک اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگا تنہا۔'' اور سورۃ انعام میں ہے وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ''تم آئے ہو ہمارے پاس تنہا تنہا جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔''

اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ گروہ در گروہ آئیں گے۔ نیک نیکوں کے ساتھ، نمازی نمازیوں کے ساتھ، غازی غازیوں کے ساتھ، شہید شہیدوں کے ساتھ اور اسی طرح چور چوروں کے ساتھ۔ گنہگار گنہگاروں کے ساتھ، قاتل قاتلوں کے ساتھ۔ اور یہ گروہ کسی ایک دور، کسی ایک جگہ کے نہیں ہوں گے بلکہ ابتدائے آفرینش سے لے کر وقوعِ قیامت تک پوری زمین پر پھیلے ہوئے مختلف ادوار کے لوگ زمین کے گوشے گوشے سے گروہوں کی شکل میں حاضر ہو جائیں گے۔

یہ لوگ سب اس لئے حاضر کئے جائیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھا دیئے جائیں۔ بعض جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں ان کے نامۂ اعمال دیئے جائیں گے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ نامۂ اعمال میں بھی وہ اپنے اعمال ہی دیکھیں گے۔ اور ویسے بھی ان کے سامنے ایک پکچر کی شکل میں ان کے اعمال لائے جائیں گے۔ زمین اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی۔ حق وباطل کی کشمکش ان کی نگاہوں کے سامنے رکھ دی جائے گی۔ جس شخص نے حق کی حمایت یا اس کی مخالفت میں کام کیا ہوگا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ حمایت کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کی تقریریں، دوڑ بھاگ، تحریریں اور کاوشیں سب کچھ نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔ اہل ایمان پر کفار نے جو مظالم کئے وہ بھی دکھائے جائیں گے۔ اور جس طرح مظلوموں نے صبر کیا وہ بھی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ ہزار پردوں میں چھپ کر کیا ہوا کام بھی آج بالکل نمایاں کر کے سامنے لایا جائے گا۔

Marfat.com

یہاں لٹی تھی کسی کی عصمت، وہاں گرا تھا لہو کسی کا
یہاں جلائے گئے تھے انساں، ہر اِک شے کا حساب ہو گا

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿٧﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿٨﴾

(اور جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا۔ ۷) اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی، وہ بھی اسے دیکھے گا۔ ۸)

ہر چھوٹا بڑا عمل سامنے آجائے گا

اس آیت کے مفہوم کا ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق ہر شخص کے احساسِ ذمہ داری سے ہے۔ اور دوسرا اس کا مفہوم وہ ہے جس کا تعلق اسلام کے قانونِ جزا و سزا سے ہے۔ جہاں تک احساس کا تعلق ہے اس حوالے سے یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے جو اپنے ہر اچھے یا برے کام کیلئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہے۔ جسے لپیٹ کر ایک جگہ یوں بیان کیا گیا ہے اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ''تمہارے کان، آنکھیں اور تمہارا دل سب سے باز پرس کی جائے گی۔'' یعنی جو کام تم اپنے حواس یا عقل کے ذریعے سر انجام دیتے ہو اور جسم ظاہر ہے انہی کے تابع ہے سب کا حساب لیا جائے گا۔ اس لحاظ سے تمہیں اپنے کسی عمل کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ معمولی سے معمولی نیکی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک مقام رکھتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی اور برائی ایک اثر رکھتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ دونوں کو پورے اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ کبائر سے اجتناب چھوٹی نیکیوں کی بخشش کا سبب بن جائے گا۔ اور کفر اور شرک پر مبنی زندگی میں گناہوں کا شمار نہیں ہوگا۔ لیکن ایک مومن کیلئے بہر صورت دونوں کا احساس بہت ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اعرابی بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ آپؐ نے اسے یہی سورۃ پڑھ کر سنائی۔ کہنے لگا آپؐ کے رب کی قسم مجھے اب اس سے زیادہ نصیحت کی ضرورت نہیں رہی اور رخصت لے کر واپس جانے لگا تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص کامیاب ہو کر جا رہا ہے۔ کیونکہ اس نے ایک چھوٹی بات کی نصیحت کو پوری زندگی کی تبدیلی کا ذریعہ بنا لیا۔

ایک دوسرے موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسبِ حلال سے ایک کھجور بھی صدقہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے قبول کر کے اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ پھر اس کی نشو و نما کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی طرح بڑا ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے مومن اور منافق کے درمیان امتیاز کرتے ہوئے فرمایا کہ مومن وہ ہے جو چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو یوں سمجھتا ہے کہ جیسے پہاڑ میرے اوپر گر گیا ہے۔ اور منافق وہ ہے جو بڑے سے بڑے گناہ کو بھی یوں محسوس کرتا ہے کہ مکھی بیٹھی اور اڑ گئی۔

جہاں تک اس کے قانونی پہلو کا تعلق ہے ان میں سے صرف چند باتیں پیشِ خدمت ہیں۔

۱۔ اعمال کی قبولیت کیلئے ایمان شرط ہے۔ جس طرح نماز کی قبولیت کیلئے وضو شرط ہے۔ وضو کے بغیر نماز پڑھی جائے تو شرط مفقود ہونے کی وجہ سے نماز نہیں ہوگی۔ اسی طرح کفار و مشرکین اور منافقین کے اعمال قیامت کے دن اپنا کوئی اجر نہیں پائیں گے۔ ان کا اگر کوئی اجر ہے بھی تو وہ دنیا ہی میں ان کو مل جائے گا، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

Marfat.com

۲۔ بدی کی سزا اتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی ہے۔ مگر نیکیوں کی جزاء اصل فعل سے زیادہ دی جائے گی۔ زیادتی کا تناسب اخلاص کے تناسب سے ہوگا۔ عام طور پر ہر نیکی کا اجر اس سے دس گنا ہے، لیکن یہ بڑھتے بڑھتے بے حد و بے حساب بھی ہو سکتا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر کبائر سے اجتناب کرنے والوں کے چھوٹے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ مومنِ صالح سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔ یعنی اس کی برائیوں سے درگزر کیا جائے گا اور اس کی نیکیوں کا اس کے بہترین اعمال کے لحاظ سے اجر دیا جائے گا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایک مومن کے ساتھ فی الجملہ رحمت و مروت کا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ خدمت میں حاضر تھے اور کچھ کھا رہے تھے۔ یہ آیت سن کر کھانا چھوڑ دیا۔ عرض کیا کہ کیا ہم اپنے تمام نیک و بد اعمال کو دیکھیں گے۔ حضور نے فرمایا، اس دنیا میں جو تمہیں تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہاری خطاؤں کا نتیجہ ہے اور تمہاری نیکیاں محفوظ رکھی جائیں گی اور قیامت کے دن تمہارے حوالے کر دی جائیں گی۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰتِ

(۱۰۰)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْعٰدِيٰتِ ہے جو اس کا پہلا لفظ ہے۔اس میں ایک رکوع، ۱۱ آیتیں، ۴۰ کلمات اور ۱۶۳ احروف ہیں۔

مقامِ نزول:۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں۔حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت حسن بصریؒ اور حضرت عکرمہؒ اسے مکی قرار دیتے ہیں۔حضرت انس ابنِ مالکؓ اور حضرت قتادہؓ کے خیال میں یہ مدنی ہے۔حضرت ابنِ عباسؓ سے دو قول منقول ہیں۔ایک یہ کہ یہ سورۃ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ یہ مدنی ہے۔لیکن سورۃ کے مضمون اور اس کے اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی دور میں نازل ہوئی ہے جب سورۃ الزلزال نازل ہوئی ہے۔کیونکہ دونوں سورتوں کے مضمون میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

مضامین:۔ سورۃ کے آغاز میں جنگی گھوڑوں کی پانچ صفات کی قسم کھائی گئی ہے جس سے یہ تأثر دیا گیا ہے کہ وہ جنگی گھوڑے جو انسانوں کی تخلیق نہیں اور نہ ان کا رزق انسانوں کا پیدا کردہ ہے۔بایں ہمہ یہ اپنے مالکوں کی اطاعت و خدمت میں جان لڑا دیتے ہیں۔وہ دوڑتے ہوئے ہانپ ہانپ جاتے ہیں۔تیز رفتاری کی وجہ سے ان کے سموں سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔نہ صبح دیکھتے ہیں اور نہ شام غبار اڑاتے ہوئے مجمعوں میں گھس جاتے ہیں اور ان کی یہ وفا شعاری اور جانثاری اس مالک کیلئے ہے جس نے انہیں نہ جسم دیا ہے، نہ جان دی ہے، نہ صحت بخشی ہے، نہ وہ ان کے رزق کا خالق ہے، صرف چند گھاس کے تنکے اور پانی کے چند گھونٹ انہیں پلاتا ہے اور وہ اس کے شکریئے کے طور پر جان لڑا دیتے ہیں۔اس کے بعد جوابِ قسم کو ذکر کیا گیا ہے کہ انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے کیونکہ احسان کے شکر کی کم از کم صورت یہ ہے جو جنگی گھوڑوں سے ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔لیکن اس کے مقابلے میں انسان جس کا سب کچھ خدا کی دَین ہے لیکن اس کا حال کیا ہے؟ کہ اسے اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کہ وہ بھی کسی مالک کا مملوک ہے اور کسی رب کا مربوب ہے اور کسی آقا کا غلام ہے۔اس پر بھی اپنے آقا کی بندگی اور اطاعت لازم ہے، بلکہ وہ ناشکری کرتے ہوئے مال و دولت کی محبت میں اس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ اسے یہ تک یاد نہیں کہ اسے موت آئے گی اور پھر ایک دن ایسا آئے گا جب اسے از سرِ نو زندہ کیا جائے گا اور آج جو کچھ اس نے زمین میں دفن کر رکھا ہے وہ اس کے سامنے لا رکھا جائے گا۔اور جن ارادوں اور محرکات کے تحت اس نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی تھی وہ اس کے دل و دماغ سے کھینچ لئے جائیں گے اور اس کے اندر مخفی برائی اور بھلائی کے جذبات کو الگ الگ کر دیا جائے گا۔تب سب کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا رب ان کے ظاہر و باطن سے کتنا باخبر ہے۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ۱۱	سُوْرَةُ الْعٰدِیٰتِ مَکِّیَّةٌ (۱۰۰)	رُکُوْعَاتُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾
فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ
لَکَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۭ﴿۸﴾
اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾
اِنَّ رَبَّہُمْ بِہِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾ؑ

رکوع: ۱۔ (قسم ہے تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی، جب وہ سینہ سے آواز نکالتے ہیں۔ ۱) پھر ٹاپوں کی ٹھوکر سے چنگاریاں نکالتے ہیں۔ ۲) پھر اچانک صبح کے وقت حملہ کرتے ہیں۔ ۳) پھر اس موقع پر گرد وغبار اڑاتے ہیں۔ ۴) پھر اسی حالت میں دشمن کے لشکر میں جا گھستے ہیں۔ ۵) بیشک انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے۔ ۶) اور وہ خود اپنے رویئے پر گواہ ہے۔ ۷) اور بیشک وہ مال و دولت کی محبت میں بڑا سخت ہے۔ ۸) تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب نکال لیا جائے گا جو کچھ قبروں میں ہے۔ ۹) اور ظاہر کر دیا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے۔ ۱۰) بیشک ان کا رب اس روز ان سے خوب باخبر ہوگا۔ ۱۱)

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ﴿۳﴾
فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا ﴿۵﴾

(قسم ہے تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی، جب وہ سینہ سے آواز نکالتے ہیں۔ ۱) پھر ٹاپوں کی ٹھوکر سے چنگاریاں نکالتے ہیں۔ ۲) پھر اچانک صبح کے وقت حملہ کرتے ہیں۔ ۳) پھر اس موقع پر گرد وغبار اڑاتے ہیں۔ ۴) پھر اسی حالت میں دشمن کے لشکر میں جا گھستے ہیں۔ ۵)

Marfat.com

پانچ قسموں کا مفہوم

آیات میں صفات کا ذکر کیا گیا ہے، موصوف کا نہیں۔ یعنی یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ یہ صفات کن کی ہے۔ گھوڑوں کی ہیں یا اونٹوں کی۔ اس لئے مفسرین کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ ان صفات کے موصوف کون ہیں۔ صحابہ اور تابعین میں سے ایک گروہ نے اس سے گھوڑے مراد لئے ہیں۔ جبکہ ایک دوسرا گروہ اس سے اونٹ مراد لیتا ہے۔ لیکن آیات کے الفاظ اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ اس سے اونٹ مراد لئے جائیں۔ کیونکہ پہلی ہی آیت میں عادیات کی جس خوبی کو ذکر کیا گیا ہے اسے ضَبْحً سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ضبح اس خاص آواز نکالنے کو کہتے ہیں جو گھوڑے ہانپتے ہوئے اپنے نتھنوں سے نکالتے ہیں۔ یہ آواز ہنہنانے وغیرہ سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ ہانپنے کا یہ خاص انداز گھوڑوں کا ہے، اونٹوں کا نہیں۔ اس لئے ابن جریر نے کہا کہ دونوں اقوال میں سے یہ قول ہی قابلِ ترجیح ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں کیونکہ اونٹ ضبح نہیں کرتا، گھوڑا ہی ضبح کیا کرتا ہے۔ اور امام رازی فرماتے ہیں کہ ان آیات کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مراد گھوڑے ہیں کیونکہ ضبح کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی۔

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ...... مُوْرِيٰتِ، اِيْرَاء سے ہے۔ پتھر سے آگ نکالنے کو ایراء کہتے ہیں۔

قَدْح ...... دو سخت چیزوں کا آپس میں ٹکرانا، جس سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔ گھوڑے جب رات کے وقت دوڑتے ہیں، گھوڑوں کے چونکہ آہنی نعل ہوتے ہیں تو ان کی سموں کی ٹھوکر سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ اپنے مالکوں کی رضا جوئی میں آگ کے انگاروں پر دوڑ رہے ہیں۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ...... مُغِيْرٰتِ، اَغَارَ سے ہے۔ کسی پر اچانک حملہ کر دینا۔ اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر انہیں چھاپہ مارنا ہوتا تو وہ رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے تا کہ دشمن خبردار نہ ہو سکے۔ صُبْحًا کی قید سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ وہ لوگ رات بھر دشمن قبیلے کی طرف سفر کرتے اور پھر صبح کے وقت شب خون مارتے، تا کہ صبح کی روشنی میں ہر چیز نظر آ سکے۔ اور ویسے بھی صبح کے وقت کی نیند گہری ہوتی ہے، اچانک حملہ صبح کے وقت زیادہ تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ...... یہ اثارۃ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اٹھانا اور ابھارنا۔ نَقْعًا غبار کو کہتے ہیں۔ بِهٖ میں ضمیر کا مرجع صُبْحًا کو قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ صبح کو غارت گری کرتے ہیں تو اس وقت وہ گرد و غبار کا طوفان اٹھا دیتے ہیں۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ...... جَمْعٌ کا معنی ہے جتھہ، انبوہ، لشکر۔ اس میں ضمیر کا مرجع نَقْعًا ہے۔ یعنی وہ اسی آندھی اور طوفان کے ساتھ دشمن کے انبوہ اور لشکر میں گھس جاتے ہیں۔ انہیں نہ دشمن کی افرادی قوت کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ ان کے اسلحہ کی۔ وہ اپنے مالک کی خوشنودی کیلئے ہر خطرے سے لڑ جاتے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝٦ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝٧

(بیشک انسان اپنے رب کا نہایت ناشکرا ہے۔ ٦) اور وہ خود اپنے رویے پر گواہ ہے۔ ٧)

Marfat.com

یہ ہے جوابِ قسم جس کے اثبات کیلئے قسمیں کھائی گئی ہیں

یہ ہے وہ جوابِ قسم، یعنی وہ اصل بات جس پر گزشتہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ اور قسموں کے الفاظ گواہی دیتے ہیں کہ ان سے مراد اہلِ عرب کے وہ وفادار، جانثار اور فداکار گھوڑے ہیں جو اپنے مالک کا حقِ اطاعت و خدمت ادا کرتے ہوئے اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف بڑھتے ہیں کہ ان کے سینوں اور ان کے نتھنوں سے تیز سانس کی آوازیں نکلتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ہانپتے ہوئے جان دے دیں گے لیکن مقصد کو پورا کیے بغیر ٹلیں گے نہیں۔ اور اس تیز رفتاری میں نہایت تیزی سے جب ان کے قدم پتھریلی زمین پر پڑتے ہیں تو ان کے سموں کی ٹھوکر سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔ اور غارت گری کا چونکہ سب سے موزوں وقت صبح کا وقت ہوتا ہے تو وہ بغیر کہیں ستائے صبح کے وقت دشمن پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ ان کی اس تیز رفتاری سے اس قدر غبار اڑتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غبار کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے اور ساری فضاء گرد و غبار میں اٹ گئی ہے۔ اور وہ بے خوف و خطر دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں اور ان کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ گھوڑوں کی اپنے مالک کیلئے ان وفاداریوں، جانثاریوں اور فداکاریوں کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے۔ سوال یہ ہے کہ گھوڑوں کی ان صفات سے یہ بات کیسے ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ سرسری نگاہ میں تو یہ بات شاید ذہن میں نہ آئے۔ لیکن اگر آپ تدبر کی نگاہ سے دیکھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ انسان کو نہایت عملی انداز میں ایک بات سمجھائی جا رہی ہے کہ جن مالکوں کی خاطر گھوڑے نہ اپنی جان کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ اپنی صحت کی۔ نہ انہیں اپنی نیند عزیز ہے اور نہ آرام۔ وہ اپنے مالکوں کی مخلوق نہیں۔ انہیں اپنے مالکوں سے صرف بھوسہ اور دانہ کھانے کو ملتا ہے اور پانی کے چند گھونٹ پینے کو۔ اور وہ اس کے بدلے میں اظہارِ تشکر اور اظہارِ ممنونیت کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ لیکن انسان جو اپنے اللہ کی مخلوق بھی ہے اور مملوک بھی۔ اور وہ اس کا مربوب بھی ہے اور ممنون بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ عنایات کی ہیں جو کسی اور مخلوق پر نہیں کیں۔ اور اسے ان نعمتوں سے نوازا ہے کہ دوسری مخلوقات جن کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ بایں ہمہ اس کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ نہ جانے کس کس کو شریک کرتا ہے۔ وہ اس سے نعمتیں حاصل کرتا ہے لیکن اس کا حق ادا کرنے کے بارے میں سوچنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔ نعمتوں کی ناقدری اور احسانات کی طرف سے بے نیازی اس کا معمول ہے۔ اس نے بیشمار آستانے بنا رکھے ہیں جہاں وہ اس سر کو جھکاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عظمت دے رکھی ہے۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کی اطاعت کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے جی بھی چراتا ہے اور انکار بھی کرتا ہے۔ ایسے انسان کے بارے میں مذکورہ قسموں سے استشہاد کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے۔ سر اس کو کسی نے دیا ہے، جھکتا کسی کے سامنے ہے۔ عقل کسی اور کی دین ہے لیکن خدمت کسی اور کی بجالاتی ہے۔ اسے جسمانی توانائیاں اور ذہنی رعنائیاں کسی اور نے بخشی ہیں، لیکن صرف کسی اور کی خدمت میں ہو رہی ہیں۔ اور اس کیلئے کہیں سے دلیل لانے کی ضرورت نہیں، انسان اگر خود اپنا مراقبہ اور احتساب کرے تو خود اس کا اپنا وجود، اپنا چلن اور اپنا رویہ اس بات کی گواہی کیلئے کافی ہے کہ وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝٨

(اور بیشک وہ مال و دولت کی محبت میں بڑا سخت ہے۔ ٨)

Marfat.com

انسان کی اصل بیماری کا ذکر

اس آیتِ کریمہ میں انسان کی اصل بیماری کی نشاندہی فرمائی گئی ہے۔ اور انسان کی ناشکر گزاری پر دلیل بھی قائم کی گئی ہے کہ انسان کی اصل بیماری یہ ہے کہ وہ خیر کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔ خیر سے مراد یہاں نیکی اور بھلائی نہیں بلکہ مال و دولت ہے۔ یہ لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ البتہ اس بات کا تعین کہ کب وہ کس معنی میں استعمال ہوتا ہے سیاق و سباق سے کیا جاتا ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق سے خود ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس میں خیر مال و دولت کے معنی میں ہے، نیکی اور بھلائی کے معنی میں نہیں۔ اور بلاشبہ یہی ناشکر گزار انسان کی اصل بیماری ہے۔ آپ گناہوں کے اسباب تلاش کریں یا مظالم کی وجوہ ڈھونڈیں بندہ و آقا کی کشمکش کا سبب معلوم کریں یا ملک اور قوموں کے بگاڑ کے اسباب کا کھوج لگائیں۔ یا دین اور ضمیر کے کاروبار کا احوال معلوم کریں تو آپ کو ہر ایک کے پیچھے درہم و دینار کی محبت کارفرما دکھائی دے گی۔ اس کے مقابلے میں نہ دوستی ٹھہرتی ہے، نہ اخوت کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ تمام تعلقات تمام دوستیاں تمام رشتہ داریاں دولت کے طلسم ہوشربا کے سامنے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جب تک انسان کے دل میں مال و دولت کی محبت کم نہیں ہوتی اور اس کا اصل مقام اسے نہیں ملتا اور اس کی اصل حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی کبریائی، رسول سے محبت، دین کی حرمت اور انسانی اقدار کی بقاء کا سامان ممکن نہیں۔ انسان جسے اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے اور جسے جوہر عقل سے نوازا گیا ہے اس کے اندر جنگی گھوڑوں جیسی خوبیاں پیدا نہیں کی جاسکتیں، جب تک اس کے محبت کے رشتوں میں فرقِ مراتب قائم نہیں کیا جائے گا۔ اور اس بات کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ کون سا وہ اصل رشتہ ہے جس کی گہری مناسبت اور جس کی حرمت ہمیشہ کیلئے باقی رہنے والی ہے۔ وہ کون سا آستانہ ہے جس پر سب رشتوں کو جھکنا اور سب کو قربان ہونا ہے۔ تو جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ناشکر گزار ہیں ان کی ناشکر گزاری کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ سیم و زر اور درہم و دینار کی محبت میں حدود سے گزر گئے ہیں۔

اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾

(تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب نکال لیا جائے گا جو کچھ قبروں میں ہے۔ ۹) اور ظاہر کر دیا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے۔ ۱۰)

سیم و زر سے محبت کرنے والوں کو تنبیہ

سیم و زر کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے انجام کو بھول جاتا ہے۔ اسے فکر ہر وقت اپنے سیم و زر اور درہم و دینار کی رہتی ہے۔ اسے لوگوں سے اور بعض دفعہ خدا سے بھی چھپانے کیلئے زمین کے نیچے دفن کر دیتا ہے اور کبھی اور کسی طرح کے پردوں میں چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے یہ ہرگز گمان تک نہیں ہوتا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے کوئی جانتا بھی ہے۔ اور وہ دولت کی محبت میں ایسا اندھا ہوتا ہے کہ اسے یہ کبھی خیال نہیں گزرتا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ جو کچھ قبروں میں ہے سب کچھ اگلوا لیا جائے گا۔ یعنی مرے ہوئے انسان جہاں جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے ان کو زندہ انسانوں کی شکل میں نکالا جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے مال و دولت سے گہری محبت پر تنقید کی گئی ہے اس سیاق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے دفینے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی جس طرح مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکالا جائے گا اسی طرح دفینوں کو بھی زمین سے نکالا جائے گا۔ پھر ان دفینوں کا جائزہ لے کر واضح کر دیا جائے گا کہ اس میں کن کن لوگوں کے حقوق دفن کیے گئے تھے۔

Marfat.com

اعمال کے محرکات کا بھی حساب ہوگا

اور دوسری آیت میں مزید فرمایا گیا کہ دفینوں کی طرح سینوں کے سارے راز بھی اگلوائے جائیں گے۔ انسانوں کے اعمال بھی اکٹھے کئے جائیں گے اور ان کے باطنی محرکات کو بھی جانچ پڑتال کیلئے کھول دیا جائے گا۔ دلوں میں جو برے ارادے پلتے رہے، فاسد نیتیں پروان چڑھتی رہیں اور خیالات وافکار کا بگاڑ پنپتا رہا، ہر چیز کھول کر سامنے رکھ دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ صرف ظاہر کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا بلکہ ہر عمل کے پیچھے اور ہر ارادے کے پس منظر میں اور خیالات وافکار کے بگاڑ کے اسباب میں گہری نظر سے جانچ پڑتال کی جائے گی۔ تب پروردگار کی طرف سے فیصلہ صادر ہوگا، جس میں اعمال کے ظاہر پر گرفت باطن کے تجزیئے کے بعد ہوگی۔ اور یہ تجزیاتی قوت جسے تحصیل کہا گیا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ کسی انسان اور کسی عدالت کے بس کی بات نہیں۔ لادینی قوانین اگرچہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی شخص کو اس کے ظاہری فعل کی بنا پر سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس نے کس نیت سے وہ فعل کیا ہے۔ لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکیں۔

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے ہر عمل کا جواز پیدا کرنے کیلئے بہتر سے بہتر محرک کی تلاش میں رہتا ہے جس سے وہ اپنے ضمیر کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسروں کی رائے کو اپنے خلاف ہونے سے روکتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں انسان کی اسی کمزوری اور ہوشیاری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شاطر انسانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ ساتھ ان کے محرکات کا سارا ریکارڈ بھی ان کے اور ان کے رب کے سامنے ہوگا۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾

(بیشک ان کا رب اس روز ان سے خوب باخبر ہوگا۔ ۱۱)

اللہ تعالیٰ کا علم حدود وقیود سے ماوراء ہے

اعمال اور محرکات کے ریکارڈ کے سلسلے میں کسی کو یہ خیال نہ گزرے کہ محرکات کا دارومدار عموماً اندازوں پر ہوتا ہے، اور اندازوں میں غلطی کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ ممکن ہے قیامت کے دن بھی کوئی شخص اندازوں کی غلطی سے کسی برے انجام سے دوچار ہو جائے۔ اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن ایسی کسی غلطی کا امکان نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ آج بھی لوگوں کے اعمال اور ان کے محرکات سے پوری طرح باخبر ہے اور قیامت کے دن بھی باخبر ہوگا۔ اس لئے وہاں محرکات کی تحقیق اندازوں کی بنیاد پر نہیں، علم کی بنیاد پر ہوگی۔ البتہ آج اور قیامت میں فرق یہ ہے کہ آج یعنی دنیا میں ہر چیز کو آشکارا کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اور قیامت کے دن اس کی حکمت اور عدل کا تقاضا ہوگا کہ ہر چیز کو نمایاں کر کے سامنے رکھ دیا جائے، تاکہ عمل کرنے والا اور دوسرے لوگ بھی جان لیں کہ ان کے بارے میں جو فیصلہ جا رہا ہے وہ انصاف کے مطابق اور مبنی برحق ہے۔

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْقَارِعَۃِ

(۱۰۱)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْقَارِعَةِ ہے۔اس میں ایک رکوع، آٹھ آیتیں، چھتیس کلمے اور ایک سو باون حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ باتفاقِ علماء مکی ہے۔ بلکہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔

مضامین:۔ اس سورۃ کا موضوع قیامت اور آخرت ہے۔لیکن یہاں قیامت کو جس نام سے یاد کیا گیا ہے اور پھر اس کے بارے میں لوگوں سے استفسار کیا گیا ہے اس سے ایک تو اس کی ہولناکی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور دوسری یہ بات کہ جس قیامت سے ڈرایا جا رہا ہے اس کا وقت اگر چہ کسی کو نہیں معلوم، لیکن اس کا آنا یقینی ہے۔ جس طرح کوئی اچانک آ کر دروازے پر دستک دیتا ہے، اسی طرح وہ اچانک آ دھمکے گی۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہے۔اس کے بعد دو فقروں میں قیامت کے آنے کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے کہ آج جو لوگ نہایت بے نیازی سے اور بڑھ چڑھ کر اس کا انکار کرتے ہیں یہ سب اس روز بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح بھاگے بھاگے پھریں گے اور اپنی قبروں سے الگ الگ متفرق اور پراگندہ حالت میں نکلیں گے۔ کسی کے پاس کوئی قوت اور جمعیت نہیں ہوگی۔ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔اور جن پہاڑوں کو مشرکین ابدی سمجھتے ہیں وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور وہ دھنکی ہوئی اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی اور اس میں ہر شخص کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔اور اس فیصلے کا دارومدار لوگوں کے اعمال پر ہوگا۔ میزانِ عمل میں نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا تو جنت کی عیشِ جاوداں نصیب ہوگی۔اور اگر بدیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو اس گہری کھائی میں پھینک دیا جائے گا جو آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔

Marfat.com

آیَاتُهَا ۱۱	سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ (۱۰۱)	رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ۝١ مَا الْقَارِعَةُ ۝٢ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝٣ يَوْمَ
يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝٤ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ
الْمَنْفُوْشِ ۝٥ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٦ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ
رَّاضِيَةٍ ۝٧ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝٩
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝١٠ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝١١

رکوع: ۱۔ (کھٹکھٹانے والی۔ ۱) کیا ہے کھٹکھٹانے والی۔ ۲) اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی۔ ۳) جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے۔ ۴) اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے۔ ۵) پھر جس شخص کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ ۶) وہ دلپسند عیش میں ہوگا۔ ۷) اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ ۸) تو ان کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ ۹) اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ ھاویہ کیا ہے۔ ۱۰) دہکتی ہوئی آگ۔ ۱۱)

اَلْقَارِعَةُ ۝١

(کھٹکھٹانے والی۔ ۱)

Marfat.com

یہ قیامت کے ناموں میں سے ہے، اس کی وضاحت

قیامت کے مختلف ناموں میں سے، یہ بھی ایک نام ہے۔ اس کا معنی ہے ٹھونکنے والی، کھٹکھٹانے والی، کھڑکھڑا دینے والی۔ یہ لفظ قرع سے بنا ہے۔ قرع الباب کا معنی ہوتا ہے، اس نے دروازے کو ٹھونکا یا کھٹکھٹایا۔ اس نام سے تین تصورات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱) جس طرح اچانک آنے والا مہمان آ کر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، اسی طرح قیامت اچانک آئے گی۔ اسی لئے اس کے آنے کا کوئی وقت نہیں بتایا گیا۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کب آ دھمکے۔ اس سے تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ ہر وقت تمہیں اس کا کھٹکا لگا رہے۔

(۲) علامہ قرطبی لکھتے ہیں واهل اللغة يقولون تقول العرب قرعتهم القارعة وفقرتهم الفاقرة اذا وقع بهم امر فظيع ''علمائے لغت کہتے ہیں کہ جب کوئی قوم کسی حادثۂ فاجعہ سے دوچار ہو اور کسی عظیم مصیبت میں مبتلا ہو تو عرب کہتے ہیں قرعتهم القارعة وفقرتهم الفاقرة'' یعنی فلاں قبیلے یا لوگوں پر سخت آفت آ گئی ہے۔ قرآنِ کریم نے بعض دیگر مواقع پر بھی یہ لفظ کسی قوم پر بڑی مصیبت نازل ہونے کیلئے استعمال کیا ہے۔ قیامت کیلئے اس لفظ کو استعمال کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ یوں تو وہ اچانک آئے گی جیسے کوئی مہمان آ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ لیکن اس کا اچانک آنا سارے عالم کیلئے ایک بہت بڑی آفت ثابت ہوگا۔ ایک عام ہلچل برپا ہو جائے گی، اجرامِ فلکی آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، فلک بوس پہاڑ ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ پورے عالم کے تہ و بالا ہونے سے جو روح فرسا صورتحال پیدا ہو گی وہ ظاہر ہے کہ ایک ناقابلِ بیان آفت ہو گی۔

(۳) ایک ایسی مصیبت اور آفت جس کی ہولناکی ناقابلِ بیان اور جس کی تباہ کاری ناقابلِ تصور ہے پھر بے خبری کے عالم میں اس کا آنا اس مصیبت کی شدت میں اور اضافہ کر دے گا۔ کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اتنی بڑی تباہی سے دوچار ہونے والے ہیں لیکن انہیں اس کا احساس تک نہیں۔ اگر وہ خودکشی کا فیصلہ نہیں کر چکے تو انہیں ابھی سے اس آفت سے بچنے کی سبیل کرنی چاہئے۔

مَا الْقَارِعَةُ ۚ ﴿۲﴾

(کیا ہے کھٹکھٹانے والی۔ ۲)

ہیبت میں اضافہ

الْقَارِعَةُ کے نام سے دلوں میں جس خوف اور دہشت کو پیدا کیا گیا تھا اس سوال نے اس خوف اور دہشت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ یعنی جو لوگ اسے معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے ہیں ان کے ذہنوں میں یہ بات آنی چاہئے کہ وہ کھٹکھٹانے والی کتنی بڑی آفت اور تباہی ہے جو اچانک تمہارے سروں پر آ دھمکے گی۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۗ ﴿۳﴾

(اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی۔ ۳)

Marfat.com

سامع کی غفلت پر چوٹ

یہ قرآنِ کریم کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ اس میں بظاہر سوال کو دہرایا گیا ہے لیکن اصل میں زور سامع کی غفلت اور ناعاقبت اندیشی پر ہے کہ ایک طرف تو اس اچانک آنے والی مصیبت کی ہولنا کی بے پناہ ہے اور دوسری طرف مخالفین کی غفلت اور بلادت پتھروں کی سنگینی کو مات کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک ایک کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ نادانو! تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ کتنی بڑی مصیبت سے تم دوچار ہونے والے ہو۔ تمہاری بے نیازی اور تمہارا تمسخر تمہیں بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کرنے والا ہے۔

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵

(جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے۔ ۴) اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے۔ ۵)

وقوعِ قیامت کے پہلے مرحلے کی تصویر

اس آیت میں وقوعِ قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہو رہا ہے کہ جیسے ہی قیامت کے برپا ہونے کا آغاز ہوگا تو لوگ اس کی ہولنا کی سے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے، دماغی توازن برقرار نہیں رہے گا، لوگ گھبراہٹ کی حالت میں اس طرح بھاگے بھاگے پھریں گے جس طرح بکھرے ہوئے پروانے سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہوتے ہیں۔ اس دن کسی کے ساتھ نہ اس کا خاندان اور قبیلہ ہوگا نہ کسی کی کوئی جماعت۔ اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ان کی پشت پر ہوں گے جن کے اعتماد پر یہ لوگ عجیب و غریب حرکتیں کرتے تھے۔

اس دن ہر شخص پر نفسی نفسی کی جو حالت طاری ہوگی اس کی تصویر سورۃ معارج میں یوں کھینچی گئی ہے۔

وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُــْٔوِيْهِ ۝ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝ (المعارج۔ ۷۰:۱۰۔۱۴)

"اور اس دن کوئی دوست اپنے دوست کو نہ پوچھے گا باجودیکہ وہ ان کو دکھائے جائیں گے، مجرم چاہے گا کہ کاش! وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اس خاندان کو، جو اس کو پناہ دیتا رہا ہے، فدیہ میں دے کر اس دن کے عذاب سے اپنے کو چھڑا لے جائے۔"

Marfat.com

نظامِ عالم کی برہمی کا ذکر

قیامت کے برپا ہونے سے نظامِ عالم کی برہمی کا ذکر کرتے ہوئے بطورِ خاص پہاڑوں کا ذکر فرمایا کہ پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔ کیونکہ قیامت کے منکرین پہاڑوں کو غیر فانی خیال کرتے تھے۔ اس لئے جیسے ہی آنحضرت ﷺ قیامت آنے پر نظامِ عالم کے درہم برہم ہونے کا ذکر کرتے تو وہ لوگ مذاق اڑاتے ہوئے پوچھتے تھے کہ کیا پہاڑ بھی اس دن اکھاڑ پھینکے جائیں گے۔ یعنی آپ کی بات کے غلط ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ پہاڑ جن کے اکھڑنے اور ٹوٹنے پھوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، آپ یہ کہتے ہیں کہ وہ بھی شکست وریخت کا شکار ہوجائیں گے اوران کا ذرہ ذرہ پراگندہ ہوجائے گا۔

الْعِهْنِ ، الصوف المصبوغ یعنی رنگی ہوئی اون۔ الْمَنْفُوْشِ دھنی ہوئی اون۔ یعنی پہاڑوں کا ذرہ ذرہ جدا جدا ہوجائے گا اور وہ ہوا میں رنگدار دھنی ہوئی اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔ پہاڑوں کے رنگ چونکہ مختلف ہوتے ہیں، اس لئے جب وہ ریزہ ریزہ ہوکر اڑتے ہوئے ایک دوسرے سے مل جائیں گے تو ایسا لگے گا جیسے اسے رنگ دیا گیا ہو۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٦﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾

(پھر جس شخص کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ ۶) وہ دلپسند عیش میں ہوگا۔ ۷)

قیامت روزِ جزا بھی ہے اور روزِ عدل بھی

آیتِ کریمہ میں مَوَازِيْنُ کا لفظ جمع ہے جس کا واحد موزون بھی ہوسکتا ہے اور میزان بھی۔ پہلی صورت میں مَوَازِيْنُ سے مراد نیک اعمال ہوں گے۔ اور دوسری صورت میں مَوَازِيْنُ کا معنی ترازو کے دو پلڑے ہوں گے جن میں ایک میں نیکیاں رکھی جائیں گی اور دوسرے میں برائیاں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ میزان کا لفظ وزن کے معنی میں ہے۔ تینوں صورتوں میں مدعا اور مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جس شخص کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اور برائیاں کم ان کو ایسی زندگی عطا کی جائے گی کہ جس میں آرام و آسائش کے ہزاروں سامان ہوں گے۔ حزن و ملال کا نام ونشان تک نہ ہوگا۔ اسے جن نعمتوں سے نوازا جائے گا انہیں اپنی توقع سے بہت زیادہ پاکر وہ نہایت مسرور ہوگا۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٨﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾

(اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ ۸) تو ان کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ ۹)

یعنی جن کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوا یعنی برائیوں کے مقابلے میں اوپر اٹھ گیا اور برائیوں کا پلڑا جھک گیا، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ دونوں آیتوں میں مَنْ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو لفظ کے اعتبار سے واحد ہے لیکن معنی کے اعتبار سے واحد اور جمع دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اور قرآنِ کریم نے دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم ترجمے میں واحد سے بھی ترجمہ کرسکتے اور جمع سے بھی۔

Marfat.com

الھَــاوِیَۃُ دوزخ کے طبقات میں سے ایک طبقہ کا نام ہے جو اتنا گہرا ہوگا کہ اس کی گہرائی کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوگا۔ (مظہری) اس لئے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ گہری کھائی یا کھڈ کیا ہے۔

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ترازو نصب کر دیئے جائیں گے، پھر اہلِ صلوٰۃ کو بلایا جائے گا اور ان ترازوؤں پر تول کر ان کو اجر دیا جائے گا۔ اسی طرح حجاج کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا جائے گا۔ لیکن جب اہلِ بلا کی باری آئے گی تو نہ ترازو نصب کیا جائے گا، نہ ان کے اعمال نامے کھولے جائیں گے بلکہ ان پر اپنی رحمتوں کی بغیر حساب بارش کی جائے گی، جس طرح قرآنِ مجید میں ہے اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ''صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا'' علامہ پانی پتی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں لعل المراد باھل البلاء ھھنا ایضا بلاء العشاق المحبین للہ تعالی لرضائھم بالبلاء کرضائھم بالعطاء ''شاید اہلِ بلا سے مراد اللہ تعالیٰ کے عاشق اور محبّ ہیں جو اس کی نازل کی ہوئی مصیبتوں پر بھی اسی طرح راضی رہتے ہیں جس طرح اس کی نعمتوں پر وہ راضی رہتے ہیں۔''

وَمَآ اَدْرٰکَ مَاھِیَهْ ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِیَةٌ ﴿۱۱﴾

(اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ ھاویہ کیا ہے۔ ۱۰) دہکتی ہوئی آگ۔ ۱۱)

ھاویہ میں عذاب کی شدت کو مزید واضح کرتے ہوئے سوال کی شکل دی گئی ہے۔ کیونکہ کسی ہولناک چیز کو بیان کرنے کے بعد جب اس کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو اس کی ہولناکی متشکل ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ تو پھر خود ہی اس کا جواب ارشاد فرمایا کہ وہ ایک دہکتی ہوئی اور بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ یعنی ایک ایسی گہری کھائی ہے جو بھڑکتی ہوئی اور دہکتی ہوئی آگ سے بھری ہوئی ہے۔

مَاھِیَهْ میں ''ہ'' سکتہ کی ہے جو قافئے کی رعایت سے آئی ہے۔ اصل لفظ مَاھِیَ ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ

(۱۰۲)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ التَّکَاثُر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام التَّکَاثُر ہے۔ یہ پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس میں ایک رکوع، آٹھ آیتیں، اٹھائیس کلمات اور ایک سو بیس حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ اس کے زمانۂ نزول کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین اسے مکی قرار دیتے ہیں اور بعض مدنی۔ اور وہ تائید میں بعض روایات کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتی ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ کیونکہ اس کا اندازِ بیان اور جچے تلے الفاظ میں ایک مکمل پیغام اور فصاحت و بلاغت میں ڈھلا ہوا ایک زوردار شاہکار خود بول رہا ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے۔ رہیں وہ روایات جن سے مدنی ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت صحابہ کرام ؓ کے شانِ نزول کی روایات کے بارے میں جو ایک مخصوص اسلوب ہے اس کو پیشِ نظر نہ رکھنے کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔

مضمون:۔ انسان کی اس بنیادی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو بہت سارے مفاسد کا سبب بنتی ہے۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر ہر چیز میں تکاثر کا خواہشمند ہے۔ اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر آدم زاد کے پاس دو وادیاں بھر کر مال ہو تو وہ تیسری وادی کی تمنا کرے گا۔ ابنِ آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کسی چیز سے نہیں بھر سکتا۔ پھر اس تکاثر کا کوئی ایک میدان نہیں۔ انسان مال و دولت میں کثرت کا خواہشمند ہے، عہدہ و اقتدار میں سب سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے، اولاد کی بھی کثرت چاہتا ہے تاکہ دوسروں پر اپنی قوت کا اظہار کر سکے۔ معیارِ زندگی کی مسابقت میں وہ سب کو پیچھے چھوڑ جانا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کاروباری میدان میں کوئی اس کا حریف نہ رہے۔ اسے اس امر پر غور کرنے کی کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ آگے ایک یقینی مرحلہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا بھی آنے والا ہے۔ اس کثرت کی خواہش نے اسے زندگی کے حُسن اور صفات کے کمال سے محروم کر دیا ہے۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ جن نعمتوں پر وہ جان دے رہا ہے وہ اس کیلئے سامانِ آزمائش بھی ہیں۔ ان میں سے ہر نعمت کے بارے میں آخرت میں جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ جہنم سے واسطہ پڑنے والا ہے تو وہ کبھی اپنے اوقات کا قیمتی خزانہ اس بیدردی سے نہ لٹاتا۔ اپنا ہر سانس اور ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، ابدی نعمتوں اور لافانی راحتوں کے حصول کیلئے وقف کر دیتا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٨	سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ (١٠٢)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿١﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿٢﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٣﴾
ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ﴿٥﴾
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ﴿٦﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ﴿٧﴾ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ
يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿٨﴾

رکوع: ۱۔ (تم کو کثرتِ مال کی خواہش نے غافل رکھا۔ ۱) یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ ۲) ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لو گے۔ ۳) پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لو گے۔ ۴) ہرگز نہیں! اگر تم یقین کے ساتھ جانتے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ ۵) تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ ۶) پھر تم آخرت میں دوزخ کو یقین کی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ ۷) پھر ضرور اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ۸)

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿١﴾

(تم کو کثرتِ مال کی خواہش نے غافل رکھا۔ ۱)

لہو اور تکاثر کا مفہوم اور تکاثر سے مراد

اَلْهٰكُمْ لہو سے ہے۔ یوں تو اس کا معنی کھیل کود اور غفلت سے کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک اسلامی اصطلاح ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس کام پر ہوتا ہے جس کی مشغولیت اور دلچسپی مقصدِ زندگی یا فرائض سے غافل کر دے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ لهو باطل اذا شغله عن طاعة الله "یعنی ہر لہو جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غافل کر دے تو وہ باطل یعنی گناہ ہے۔" الھیٰ

Marfat.com

سے فعل ماضی ہے۔ اس کا معنی ہے اس نے غافل کر دیا۔ اور "کم" ضمیر مفعول ہے۔ التَّكَاثُرُ یہ اسمِ فاعل ہے۔ یعنی تمہیں تکاثر نے غفلت میں رکھا۔ تکاثر کا اطلاق تین چیزوں پر ہوتا ہے۔ (۱) زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرنا، (۲) کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، (۳) کثرت حاصل ہو جانے کی صورت میں دوسروں پر فخر جتانا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف کثرت کا خواہش مند نہیں بلکہ وہ ایسی کثرت کا خواہش مند ہے جو اسے دوسروں پر بڑائی کا موقع دے دے۔ اور وہ اس کثرت سے دوسروں پر فخر جتا سکے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں یہ تصریح نہیں فرمائی گئی کہ تکاثر میں کس چیز کی کثرت مراد ہے۔ اور نہ یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ یہاں خطاب کن لوگوں سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تکاثر کے مفہوم میں بھی وسعت پائی جاتی ہے اور اَلْهٰكُمُ کے مخاطب بھی محدود نہیں بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اس کے مخاطب ہیں۔ یعنی نہ تو کثرت کے متعلقات کی کوئی انتہا ہے اور نہ یہ بیماری نوعِ انسانی میں سے کسی خاص گروہ کو لاحق ہے بلکہ پوری نوعِ انسانی اس کی مریض ہے۔ اس کی تائید ایک چھوٹے سے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ علامہ اسد ایک نومسلم ہیں جن کا اصل نام لیو پولڈ تھا۔ جرمن کے رہنے والے اور مذہباً یہودی تھے اور پیشہ ان کا صحافت تھا۔ انہیں اور ان کی بیوی کو بعض حالات کی بناء پر اسلام کے بارے میں تجسس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے عرب ملکوں کے سفر کئے۔ ایک دن اچانک انہیں لوگوں سے ملنے ملانے کے بعد احساس ہوا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت پریشانیوں کا شکار ہے۔ جسے دیکھئے محسوس ہوتا ہے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ گمان اپنی بیوی کے سامنے رکھا۔ انہوں نے بھی انسانی چہروں کے مطالعے کے بعد اس کی تصدیق کی۔ اب دونوں نے تجسس شروع کیا کہ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ لیکن یہ عقدہ ان کیلئے روز بروز لاینحل ہوتا گیا۔ ایک دن اچانک لیو پولڈ نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے اس راز کو پالیا ہے اور اس انکشاف کی وجہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اسلام ایک سچا دین ہے۔ بیوی نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ تو لیو پولڈ نے قرآنِ کریم کا ایک نسخہ اٹھایا اور قرآنِ کریم کی یہی سورۃ جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے اپنی بیوی کے سامنے رکھ دی۔ اس نے کہا ذرا غور سے دیکھو یہ کتاب آج سے صدیوں پہلے نازل ہوئی۔ اور جس عظیم شخصیت پر نازل ہوئی اس نے عرب کے باہر کی دنیا کو بہت کم دیکھا تھا۔ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوگئی کہ صدیوں بعد بھی انسان ایک ایسی کیفیت کا شکار ہوگا جو اس کیلئے مستقبل میں پریشانی بن جائے گی اور وہ اسی کیفیت میں مبتلا ہونے کی حالت ہی میں موت کی نذر ہو جائے گا۔ لیکن کبھی وہ اس سے جان نہیں چھڑا سکے گا۔ اور وہ کیفیت کیا ہے کثرت کے حصول کی کوشش اور دوسروں سے اس کثرت میں آگے بڑھنے کی خواہش۔ اور پھر اس میں دوسروں پر فخر جتانے کی آرزو۔ یہی وہ چیز ہے جس نے آج کے انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس مال و دولت کی نہ صرف فراوانی ہو بلکہ دوسروں سے بڑھ چڑھ کر مال میرے پاس ہو۔ اور وہ اسی کو اپنے لئے نام و نمود اور عزت و شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ آئے روز بہتر سے بہتر منصب اور عزوجاہ کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس کے نزدیک مال و دولت اور منصب و اقتدار ضرورت کی چیز نہیں۔ اور نہ کوئی ذمہ داری ہے۔ بلکہ بجائے خود یہ ایسا مقصدِ زندگی ہے جس کا زیادہ سے زیادہ حصول زندگی بھر ایک حقیقت بن کر اس کے دماغ پر سوار رہتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت قبائلی زندگی میں جس طرح کثرتِ مال ان کا ہدف ہوتا تھا اسی طرح کثرتِ اولاد کیلئے بھی وہ کوشاں رہتے تھے۔ کیونکہ قبیلے کا سردار وہ شخص بنتا تھا جس کے نوجوان بیٹے اس کے قوتِ بازو ثابت ہوتے تھے۔ اور قبیلہ دوسرے قبائل پر تب فوقیت حاصل کرتا تھا جب ان کے پاس افراد کی بھی کثرت ہوتی اور مال کی بھی کثرت ہوتی۔ لیکن آج کثرتِ اولاد کو

Marfat.com

اجتماعی زندگی کے بدلے ہوئے نظام اور خاص طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے تصور نے معیارِ زندگی کے رجحان میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج ہر شخص معیارِ زندگی اونچا کرنے کی دھن میں مصروف اور پریشان ہے۔ پھر اس معیارِ زندگی کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں۔ اور چونکہ اس کا سارا انحصار مال و دولت پر ہے اس لئے مال و دولت کی کثرت کی بھی کوئی حد نہیں۔ جیسے جیسے زندگی کا معیار اونچا ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے مال کی تونس بڑھتی جاتی ہے۔ اسی کو قرآنِ کریم نے تکاثر کے نام سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ اس تکاثر کی دھن نے انسان کو نہ صرف مقصدِ زندگی سے تہی دامن کیا بلکہ اخلاقی حدود اور اخلاقی پابندیوں سے بھی اسے بے تعلق کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حوالے سے عائد ہونے والے فرائض مال و دولت کی ہوس کی نذر ہو گئے۔ اقدارِ انسانیت ہی پامال نہیں ہوئیں بلکہ قرابت کے تمام حقوق نظرانداز ہو گئے۔ دولت، طاقت اور عزت زندگی کی کامیابی کے عنوان بن گئے۔ حکومتوں اور ملکوں کی سطح پر زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر، چھوٹے ملکوں کی تجارت پر غلبہ اور ان کے پاس قدرتی وسائل پر قبضہ ترقی کی علامت بن گیا۔ اور اس میں تخصیص غیر مسلم کی نہیں، امتِ مسلمہ بھی اسی کا شکار ہو گئی۔ جسے دیکھو معیارِ زندگی کے بت کی پرستش کر رہا ہے۔ حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: **ازهد في الدنيا يحبك الله وازهد فيما ايدي الناس يحبك الناس** ''دنیا سے بے رغبت ہو جا، اللہ تجھ سے پیار کرے گا، جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جا، لوگوں کے دلوں میں اللہ تیرا احترام پیدا کرے گا۔''

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢

(یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ ۲)

کثرت کی خواہش موت تک جاری رہتی ہے

یعنی کثرتِ مال کی کوشش، پھر دوسروں سے آگے بڑھنے کی ہوس اور دوسروں کے مقابلے میں فخر جتانے کی خواہش میں تمہاری پوری زندگی گزر گئی۔ مثال کے طور پر تم میں سے ایک نے چاہا کہ میرے پاس ایک خوبصورت مکان ہونا چاہئے۔ مکان بن گیا۔ اور جب دوسرے نے بھی اسی خواہش کے تحت ویسا ہی مکان بنا لیا تو پھر بے چینی اور بڑھی تو اس کو نیچا دکھانے کیلئے دوسری منزل اٹھالی گئی۔ اس نے بھی مقابلے میں دوسری منزل بنالی۔ اس کی کثرت کی خواہش نے اسے تیسری منزل اٹھانے پر مجبور کیا۔ اور دوسرے کی تکاثر کی ہوس نے بھی تیسری منزل اٹھالی۔ حتیٰ کہ دونوں مقابلے میں دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنے سر کی کلغی کو بلند کرنے کیلئے منزلوں پر منزلیں اٹھاتے رہے۔ آخر ایک وقت آیا کہ یہ منزلیں دونوں کو ساتھ لے کر زمین بوس ہو گئیں۔ اس ایک مثال سے زندگی کی تمام جہتوں کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح زندگی کی قدریں، زندگی کی صلاحیتیں، دل و دماغ کی رعنائیاں صرف ایک ہوس کی نذر ہوتی جارہی ہیں۔ اور نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ لوگ قبروں میں پہنچ جاتے ہیں لیکن انہیں منزل نصیب نہیں ہوتی۔ ایک دوڑ ہے جس سے کوئی نکلنا پسند نہیں کرتا۔ اکبر نے ٹھیک کہا:

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے

بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

Marfat.com

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٣﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤﴾

(ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لوگے۔ ۳) پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لوگے۔ ۴)

تکاثر کی ہوس کامیابی نہیں

یعنی تم متاعِ دنیا کی کثرت اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانے کو کامیابی اور ترقی سمجھتے ہو۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے۔ تمہیں عنقریب اندازہ ہو جائے گا۔

یہ مال و دولتِ دنیا ، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

تم نے متاعِ دنیا میں اضافے کیلئے کارخانوں پہ کارخانے لگائے، ملوں پر ملیں لگائیں۔ اور اپنے بچوں کو دیکھنے کیلئے کبھی وقت نہ نکال سکے۔ بیوی کی دلجوئی کیلئے کبھی تمہارے پاس چند ساعتیں نہ نکل سکیں۔ تم اپنے رحمی رشتوں کا کبھی حق ادا نہ کر سکے۔ کیونکہ تمہارے پاس ان باتوں کے سوچنے کا وقت ہی نہیں ہے۔ لیکن تمہیں بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ اس روش کا کیا انجام ہوگا۔ جب تمہاری بیوی تم سے متنفر ہو جائے گی۔ تمہاری اولاد جوان ہو کر نافرمان ہو جائے گی۔ اپنے بیگانے ہو جائیں گے اور تمہارا وجود عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہارے لئے بوجھ بن جائے گا اور تمہیں سہارا دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ تمہاری تنہائیاں تمہیں کاٹیں گی۔ تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ تکاثر کی ہوس ایک ایسی آگ تھی جس نے تمہارا سب کچھ جلا ڈالا۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک عنقریب سے مراد آخرت بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جس ہستی کی نگاہ ازل سے ابد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے اس کیلئے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اسی طرح سے مراد موت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو ہر وقت انسان کے قریب ہے۔ موت کے وقت بھی اور آخرت میں بھی انسان کو اندازہ ہو جائے گا کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھو کے آیا ہے وہ آج اس کیلئے سعادت کا باعث بنتے ہیں یا بدبختی کا۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ﴿٥﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ﴿٦﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ﴿٧﴾
ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿٨﴾

(ہرگز نہیں! اگر تم یقین کے ساتھ جانتے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ ۵) تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ ۶) پھر تم آخرت میں دوزخ کو یقین کی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ ۷) پھر ضرور اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ۸)

Marfat.com

غفلت کا اصل سبب

تمہارا یہ طرزِ عمل کہ تم نے زندگی کا اصل ہدف مال و دولت کی کثرت، عہدہ و منصب کی بہتات اور معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کی ہوس کو اس طرح بنایا ہے کہ ساری زندگی اسی کے حصول میں کھپ جاتی ہے حتیٰ کہ موت کا بلاوا آ جاتا ہے، لیکن تمہیں کبھی اپنے طرزِ عمل پر نظرثانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ (جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہے) کہ تمہارے اندر یہ یقین پیدا نہیں ہو رہا کہ کبھی آخرت بھی آئے گی۔ اور تمہیں اپنی زندگی کے ہر عمل کا حساب دینا ہوگا۔ جوابدہی کے تصور کی طرف سے بے یقینی نے تمہیں دنیا طلبی کا مریض بنا دیا ہے۔ کاش تمہارے اندر یقین کی کچھ بھی رمق پیدا ہوتی تو تمہاری غفلت کے پردے اتنے دبیز نہ ہوتے۔ کیونکہ:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

لَوْ تَعْلَمُوْنَ کا جواب محذوف ہے لَمَا تَكَاثَرْتُمْ اور عِلْمُ الْيَقِيْن کا معنی ہے عِلْمًا كَعِلْمِ الْاَمْرِ الْمُتَيَقَّنْ (مظہری)
''یعنی ایسا علم جو ایک یقینی بات کا ہوتا ہے۔''

اس کے بعد کی آیات کا مفہوم دو طرح سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ کو لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ کے مفعول کے محل میں لیا جائے۔ یعنی اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ تم جہنم کو لازماً دیکھو گے۔ اور پھر آخرت میں جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے جو ظاہر ہے علم الیقین کا دوسرا درجہ ہے۔ اور پھر تمہیں یقین ہوتا کہ آخرت میں تمہیں ایک ایک نعمت کے بارے میں جوابدہی کرنا ہے تو یقیناً تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا، اور تم اپنے آپ کو اس طرح برباد نہ کر لیتے۔

اور مفہوم کو متعین کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ کو جملہ متانفہ قرار دیا جائے۔ تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اقرار کرو یا انکار امر واقعہ یہ ہے کہ تم جہنم کو ایک نہ ایک دن دیکھ کے رہو گے۔ اور پھر قیامت کے دن تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ مومن بھی اسے دیکھیں گے اور کافر بھی دیکھیں گے۔ لیکن دونوں کے دیکھنے میں بڑا فرق ہوگا۔ کفار تو اسے گھر کے طور پر دیکھیں گے اور وہیں ٹھہریں گے۔ اور مومنوں کیلئے محض گزرگاہ ہوگی۔ کچھ تو بجلی کی سرعت کے ساتھ گزر جائیں گے اور کوئی پرندوں کی طرح اپنے اپنے درجات کے مطابق ان کے گزرنے کی رفتار ہوگی۔ اور آج تم جن نعمتوں پر اترا رہے ہو اس دن ہر نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ انسان کو جتنی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کی گئی ہیں اور جو وسائل اور ذرائع بخشے گئے ہیں وہ سب نعیم میں داخل ہیں۔ آدمی ان میں سے ہر نعمت پر شکر ادا کرنے کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ اور ہر نعمت کے شکر کا مطلب یہ ہے کہ اس نعمت کو اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر بتائے گئے طریقے کے مطابق صرف کیا جائے۔ اگر کسی نعمت کے استعمال میں حدود سے تجاوز کیا گیا یا اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کیا گیا یا استعمال میں غلط طریقہ اختیار کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس پر سزا دے گا۔ وہ جس بات کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جس پر چاہے گا گرفت فرمائے گا۔ لیکن اس کا اندازہ ایک حدیث سے کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوگئی۔ آپؐ نے فرمایا اس وقت تم دونوں اپنے گھروں سے باہر کس مقصد سے نکلے ہو؟ دونوں نے کہا، الجوع رسول اللہ۔ حضور سخت

Marfat.com

بھوک لگی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا بخدا میں بھی اسی وجہ سے باہر نکلا ہوں۔ حضورؐ دونوں کو ہمراہ لے کر ایک انصاری کے گھر تشریف لے گئے۔ دوسری روایت میں ان کا نام مالک بن التیہان درج ہے۔ لیکن وہ گھر میں موجود نہ تھے۔ ان کی بیوی نے جب حضورؐ کو دیکھا تو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ حضورؐ نے پوچھا تمہارا شوہر کہاں ہے۔ اس نے کہا پانی لینے گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ انصاری تشریف لے آئے۔ جب حضور اور آپ کے ساتھیوں کے دیکھا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اپنی باغ کی طرف گئے اور کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ کر لے آئے۔ جس میں پختہ، نیم پختہ اور تر کھجوریں تھیں۔ خدمتِ اقدس میں رکھا اور تناول فرمانے کی التجا کی۔ پھر چھری پکڑی۔ حضورؐ نے فرمایا ایاک والحلوب یعنی شیر دار بکری کو ذبح نہ کرنا۔ پس انہوں نے ایک بکری ذبح کی، اسے پکایا اور ان معزز مہمانوں نے اس کا گوشت بھی تناول فرمایا اور کھجوریں بھی کھائیں اور ٹھنڈا پانی بھی پیا۔ جب سیر ہو گئے تو آپ نے ان دونوں دوستوں سے فرمایا اس خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے روزِ قیامت تم سے آج کی نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ فاقہ نے تم کو اپنے گھروں سے نکالا اور تم ان نعمتوں سے شادکام ہو کر واپس جا رہے ہو۔

اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروردگار اپنی ان نعمتوں سے متعلق بھی باز پرس کرے گا جو شدید ضرورت کے بعد بھی میسر آئی ہوں۔ چہ جائیکہ وہ نعمتیں جو تکلفات اور تلذذات میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح کی نعمت پر شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

صدق الله العظيم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْعَصْرِ

(۱۰۳)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْعَصْرِ ہے جو پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع، تین آیات، چودہ کلمات اور اڑسٹھ حروف ہیں۔

زمانہ نزول:۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ سورۃ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔اور اس کا مضمون یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی تا کہ لوگ فصاحت و بلاغت میں ڈھلے ہوئے اس کے مختصر اور دلنشین فقروں سے نہایت اختصار کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو اخذ کر سکیں اور یہ آسانی سے زبانوں پر چڑھ جائے۔

شانِ نزول:۔ تفسیر عزیزی میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اس کا شانِ نزول یہ بیان فرمایا ہے کہ کلاہ بن اسید جس کی کنیت ابوالاسدین تھی عہد جاہلیت میں حضرت ابوبکرؓ سے اس کی بڑی دوستی تھی۔حضرت ابوبکرؓ مشرف بہ اسلام ہوئے تو یہ ناصح مشفق بن کر آپ کو سمجھانے آیا۔کہنے لگا کہ اے ابوبکر، تمہاری قابلیت اور دانشمندی ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی، کاروبار میں تمہارا کوئی ہمسر نہ تھا، اپنی تاجرانہ مہارت کے باعث تمہارا ہر سودا نفع بخش ہوا کرتا تھا، بایں فہم و دانش تم نے اپنے آباؤ اجداد کا طریقہ چھوڑ دیا، لات وہبل تک کی عبادت ترک کر دی اور ان کی شفاعت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، تم سے ایسی نادانی کی توقع ہرگز نہ تھی، آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ جو شخص حق کو قبول کر لیتا ہے اور ثابت قدمی سے راہِ راست پر گامزن ہو جاتا ہے وہ زیاں کار نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی جس سے حضرت صدیقِ اکبرؓ کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

ربط:۔ سابق سورۃ التکاثر میں ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی گئی ہے جن لوگوں نے ساری عمر اسی دنیا کے مال و متاع جمع کرنے میں گنوا دی۔انہیں کبھی اس بات کا احساس نہ ہوا کہ زندگی کے قیمتی لمحات کیا ان خزف ریزوں کو جمع کرنے کیلئے دیئے گئے ہیں، کیا ہماری زندگی کا کوئی عظیم مقصد نہیں۔پیشِ نظر سورۃ میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ عمر عزیز انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سب سے عظیم نعمت ہے۔اسی کے صحیح استعمال پر اس کی دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا انحصار ہے اور اسی کے غلط استعمال پر ناکامی و نامرادی انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔پھر اس کو واضح کرنے کیلئے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے۔پھر نہایت جچے تلے فقروں میں چند اصول بیان کئے گئے ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنے سے زندگی میں

Marfat.com

اصل قدر و قیمت پیدا کی جاسکتی ہے۔اور انہی اصولوں کو نظر انداز کرنے سے زندگی خسران کی تصویر بن جاتی ہے۔بظاہر یہ ایک مختصر سورۃ ہے، لیکن حقیقت میں اس صراطِ مستقیم کا نشان دے دیا گیا ہے جس پر چل کر انسان کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔امر واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ایک سو چودہ سورتوں میں جس بات کو نہایت وضاحت سے سمجھایا ہے وہ بات اس سورۃ میں تین آیتوں میں سمودی گئی ہے۔اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امامِ شافعیؒ فرمایا کرتے تھے لَوْتَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةُ لَوَسِعَتْهُمْ کہ لوگ اگر تنہا اسی سورۃ پر غور کریں تو ان کیلئے کفایت کرے۔اس لئے صحابہ کرامؓ کا حال یہ تھا کہ جب بھی ان میں سے دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ العصر نہ سنا لیتے۔ (طبرانی)

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٣	سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ (١٠٣)	رُكُوْعَاتُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ۙ﴿١﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ﴿٢﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿٣﴾

رکوع: ا۔ (قسم ہے زمانے کی۔ ا) بیشک انسان خسارے میں ہے۔ ۲) بجز ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔ ۳)

وَالْعَصْرِ ۙ﴿١﴾
(قسم ہے زمانے کی۔ ا)

قسم کی وضاحت

ہم اس سے پہلے بھی متعدد مواقع پر اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس لفظ یا جملے پر واؤ قسمیہ آتی ہے اسے قسم کہتے ہیں اور اس کی حیثیت دلیل کی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد جو جملہ آتا ہے اسے جوابِ قسم کہتے ہیں اور اس کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے۔ گویا قسم دلیل بن کر اس دعوے کا اثبات کرتی ہے۔ اور کبھی اسی قسم کو شاہد یعنی گواہ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ شاہد جوابِ قسم کے اثبات کیلئے گواہی دیتا ہے۔

عصر کا مفہوم

یہاں زمانے کی قسم کھائی گئی ہے۔ زمانہ کا لفظ عام طور پر تین معنوں پر بولا جاتا ہے ماضی، حال اور مستقبل۔ زمانے کے مجموعے پر تو دہر کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن عصر زمانے کے اجزاء پر دلالت کرتا ہے۔ زمانے کا چونکہ غالب حصہ ماضی ہی ہے اس لئے جو آن کہنے کو اس وقت حال ہے وہ گزر کر ماضی بنتی جا رہی ہے۔ اور جو مستقبل ہے اس کی ہر گزرتی ہوئی گھڑی حال بن کر ماضی میں اتر جاتی ہے۔ گویا زمانہ جس کو عصر کہا

Marfat.com

گیا ہے اور جس کی قسم کھائی گئی ہے اس کا غالب استعمال گزرے ہوئے زمانے پر ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ ماضی بن چکا ہو یا وہ حال کی شکل میں ماضی کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اقبال نے اس کو ٹھیک تعبیر دی:

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

اور بعض اہلِ علم کے نزدیک مستقبل صرف امید کا نام ہے۔ زمانے درحقیقت دو ہیں۔ ایک وہ زمانہ جو ماضی بن چکا ہے اور ایک وہ جسے ہم حال سمجھتے ہیں لیکن وہ تیزی سے ماضی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں دونوں طرح کے زمانوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے اور وہ نقصان میں رہا ہے بجز ان لوگوں کے جنہوں نے اپنے اندر متذکرہ چار صفات پیدا کرلی ہیں۔ تاریخ نے ماضی میں نافذ ہونے والے ان فیصلوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے تحت انسانوں کے اعمال وافعال پر صادر کیے گئے۔ وہ قومیں چاہے عاد وثمود ہوں یا قومِ لوط، قومِ نوح ہوں یا قومِ ہود ہوں تاریخ نے ان کے اعمال پر ہونے والے فیصلوں کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور پھر اسی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے گزرتے ہوئے زمانے کو دلیل بنایا گیا ہے جس میں ایک تو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ زمانہ تیز رفتاری سے گزر رہا ہے اور یہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ افراد ہوں یا قومیں وہ زمانے کی تیز رفتاری میں عروج وزوال کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ لیکن زمانے کی تیز رفتاری میں کہیں کمی نہیں آتی۔ ہم اس کی تیز رفتاری کا صحیح تعین تو نہیں کر سکتے البتہ کسی حد تک اندازہ کرنے کیلئے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اس میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا راستہ طے کر لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ افراد اور قوموں کی قسمتوں میں ایک سیکنڈ میں کتنے تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ لیکن گزرتے ہوئے زمانے سے انسان کو اپنی زندگی بنانے کیلئے جو وقت دیا گیا ہے وہ درحقیقت اس کی عمر ہے۔ ایک فرد بھی اپنی عمر میں جو بن سکتا ہے، سو بنتا ہے۔ اور قومیں بھی ایک عمر پاتی ہیں اور وہی ان کی اجل ہے اور اسی پر ان کے بقاء وزوال کا دارومدار ہے۔ اس کو سمجھنے کیلئے اس وقت کا تصور کیا جا سکتا ہے جو امتحان گاہ میں ایک طالب علم کو پرچہ حل کرنے کیلئے دیا جاتا ہے۔ اس طالب علم کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اس مہلتِ عمل اور اس مدتِ وقت سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے یا اسے ضائع کرتا ہے۔ اسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کی قسم ہے جو تمہیں پرچہ حل کرنے کیلئے دیا گیا ہے۔ گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کو دیکھو کہ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اگر تم نے اسی تیزی سے کام نہ کیا تو تمہیں خسارے یعنی ناکامی سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ اسی طرح انسان کو بھی زمانے اور اس کی تیز رفتاری کی طرف متوجہ کرکے کہا گیا ہے کہ تمہاری عمر یہی مہلتِ عمل ہے اور یہ اس طرح ڈھل رہی ہے، جس طرح برف پگھلتی ہے۔ اگر اس کے پگھلنے سے پہلے تم نے اس سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا تو تمہیں ناکامی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
رفتہ رفتہ لحظہ لحظہ دم بدم
سانس ہے اک رہروِ ملکِ عدم
دفعتاً اک روز یہ جائے گا تھم

Marfat.com

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝۲

(بیشک انسان خسارے میں ہے۔ ۲)

یہ ہے جوابِ قسم

یہ ہے وہ جوابِ قسم جس کو ثابت کرنے کیلئے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ یعنی عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہی زمانہ ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ اس کو اگر ضائع کر دیا جائے اور صحیح صفات سے متصف کرنے کی بجائے اسے غلط کاموں میں صرف کر ڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے جس پر گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھائی گئی ہے۔

انسان کا لفظ اگر چہ واحد ہے لیکن اس سے مراد کوئی ایک انسان نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد کی آیت میں ان لوگوں کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار صفات سے متصف ہیں۔ اور ان لوگوں کو بغیر کسی تحدید کے ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں انسان کا لفظ اسمِ جنس کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام اور پوری نوعِ انسانی پر یکساں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس انسان کے خسارے کی بات ہو رہی ہے وہ کوئی ایک انسان نہیں، نہ کسی خاص قبیلے سے اس کا کوئی تعلق ہے نہ وہ کسی گروہ کا نام ہے نہ کسی خاص علاقے کا رہنے والا ہے بلکہ اس سے مراد نوعِ انسانی کا ہر فرد ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ واحد ہو یا جمع۔ وہ اس وقت تک خسارے میں رہے گا جب تک وہ ان چار صفات کو اختیار نہیں کر لیتا جو آگے بیان کی جا رہی ہیں۔

خسر کا مفہوم

اس آیت میں جو ''خسر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے خسارہ کیا ہے اس کا استعمال کسی محدود معنی میں نہیں ہوا۔ اس سے مراد نہ تجارتی خسارہ ہے نہ زرعی خسارہ نہ ملازمت کا نقصان نہ کسی اتفاقی حادثے سے پیش آنے والا نقصان، بلکہ یہ ایسا خسارہ ہے جو قرآنِ کریم فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے اور یہ واضح ہے کہ قرآنِ کریم کا دیا ہوا تصورِ فلاح کسی دنیوی خوشحالی تک محدود نہیں بلکہ اس میں دنیوی اور اخروی دونوں کامیابیاں شامل ہیں۔ ایک شخص پُر ہیبت اقتدار کے تخت پر فائز ہے لیکن اس کی زندگی متذکرہ چار باتوں کے نور سے خالی ہے تو اس کی زندگی ایک ناکام زندگی ہے۔ لیکن ایک شخص جھونپڑے میں رہتا ہے، نانِ شبینہ کا محتاج ہے لیکن وہ ایمان و عملِ صالح کی دولت سے مالا مال ہے اور ہر حال میں حق پر استقامت اور دوسروں کی خیر خواہی اس کا وطیرہ ہے تو وہ ایک کامیاب انسان ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳

(بجز ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔ ۳)

Marfat.com

خسارے سے بچنے والوں کی چار صفات

قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ کہ ساری دنیا کے انسان خسارے میں پڑے ہوئے ہیں سوائے ان لوگوں کے جن میں آگے بیان کی جانے والے چار صفات موجود ہوں۔ ضروری ہے کہ ان چار صفات میں سے ایک ایک کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

ایمان کا مفہوم

ان میں سب سے پہلی صفت ایمان ہے۔ ایمان کا لفظ اَمِــنَ سے بنا ہے۔ یہ لغت میں مختلف معنی کیلئے بولا جاتا ہے۔ اس کا ابتدائی معنی اگر چہ زبانی اقرار ہے۔ اور قرآنِ کریم نے بھی بعض جگہ اسے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت کا تحقق اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس کے ان تمام معانی کا استقصاء نہ کیا جائے جن معانی میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اٰمَــنَـهٗ، ای اعطاہ امنا ''اس کو امن دیا'' اٰمَنَ لَهٗ کے معنی ہیں صَدَّقَـهٗ وَاعْتَمَدَ عَلَيْهِ ''اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا'' اور اٰمَنَ بِهٖ اس کے معنی ہیں اَيْقَنَ بِهٖ ''اس پر یقین کیا'' قرآنِ کریم انہی معنوں میں ایمان کے لفظ کو استعمال کرتا ہے اور اسی کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں جابجا انہیں معنوں میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا ''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ڈٹ گئے۔''

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ ''پس نہیں، اے نبی! آپ کے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ بھی آپ فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔''

قرآنِ کریم کی یہ آیات اور اس کی ہم معنی دیگر آیات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان کا آغاز اگر چہ زبانی اقرار سے ہوتا ہے لیکن اس میں حقیقت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا اعتبار نہیں ہوتا جب تک اس میں یقین کی قوت پیدا نہ ہو۔ یعنی ایک ایمان لانے والا دینِ اسلام کی جن باتوں کو قبول کرتا ہے دل سے ان کی تصدیق بھی کرے۔ اور اس کا اعتماد عقل یا تجربے پر نہیں بلکہ وحیِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی ذات پر ہو۔ اس کا علم اور اس کی دانش اور وقت کا چلن چاہے اسے قبول کرنے سے انکار کردے لیکن اس کے دل میں انکار یا تشکک کی خراش بھی نہ آنے پائے۔ اور پھر یقین کے ساتھ خشیتِ الٰہی اور توکل علی اللہ کے تمام لوازم و شرائط بھی پائے جائیں۔ اور وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے فیصلوں پر راضی رہے تو یہ وہ ایمان ہے جس کی طرف اس آیتِ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس سورۃ مبارکہ میں مطلق ایمان کا ذکر فرمایا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ ایمان کن چیزوں پر لانا مراد ہے۔ لیکن قرآن و سنت کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کون کون سی چیزیں ہیں جن پر ایک مومن کو ایمان لانا ضروری

Marfat.com

ہے۔سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے۔کیونکہ ایمان باللہ تمام ایمانیات کی جڑ ہے۔یہی بنیاد ہے جس پر باقی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔اور اس ایمان سے مراد محض اس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اس طرح ماننا ہے جس کی تفصیل اوپر ایمان کے معنی میں گزر چکی ہے۔حالی مرحوم نے نہایت خوبصورتی سے اجمالاً اس کا ذکر کیا ہے:

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم
اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم
اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

۲۔ رسول کو ماننا، اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسے معصوم بنایا ہے۔اس کی زبان سے کبھی جھوٹ سرزد نہیں ہوتا۔اس کا ہر قول و فعل اور تقریر حجت ہے، اسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی لے کے آیا ہے وہ برحق اور واجب التسلیم ہے۔اور وہ خاتم النبیین ہے کہ اس کے بعد کوئی تشریعی، ظلی یا بروزی نبی نہیں آئے گا۔اسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاء، کتبِ الٰہیہ اور قرآنِ کریم پر بھی ایمان لانا شامل ہے۔

۳۔ آخرت کو ماننا، اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی مکمل زندگی نہیں بلکہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ ہونا ہے۔اور دنیا میں جو کچھ اس نے کیا اور جو کچھ کہا ہر قول و عمل کا حساب دینا ہے۔نیک اعمال پر جزاء ملے گی اور برے اعمال پر سزا۔آدمی جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے فرشتے اسے محفوظ کر لیتے ہیں۔پروردگار کی نگاہ ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہتی ہے۔وہ ہر وقت اسے دیکھتا ہے۔یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کرتا ہے۔اور جس میں یہ عقیدہ سرے سے موجود نہ ہو یا کمزور ہو اس کے ایمان، اخلاق اور سیرت و کردار کیلئے کوئی مضبوط حصار نہیں۔

Marfat.com

صالحات پر عمل

دوسری چیز جو انسان کو خسارے سے بچانے کیلئے ضروری ہے وہ صالحات پر عمل کرنا ہے۔اس میں دو لفظ ہیں، عمل اور صالحات۔اسلام اگر محض ایک فلسفے کا نام ہوتا تو چند بنیادی حقائق کو تسلیم کر لینا اوران پر یقین لے آنا کافی ہوتا۔لیکن اسلام چونکہ ایک دین ہے، زندگی کا رویہ ہے، ایک طرزِ عمل ہے۔اس لئے چند بنیادی حقائق کو تسلیم کرانے کے بعد وہ زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں احکام دیتا ہے اوران پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔کیونکہ اس کے احکام کی اصل روح اللہ تعالیٰ کی بڑائی کو تسلیم کرنا اس کو مطاعِ مطلق جاننا اور اپنے آپ کو اس کی اطاعت کے حوالے کر دینا ہے۔اس روح کا تحقق ظاہر ہے اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ان باتوں پر عمل کو لازم نہ کیا جائے جن کو صالحات کہا گیا ہے۔ایمان درحقیقت ایک بیج ہے جو دلوں کی زمین میں کاشت کیا جاتا ہے اوراس سے پیدا ہونے والی پیداوار اعمالِ صالحہ ہیں۔اگر کسی بیج سے کوئی پودا پیدا نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیج زمین میں دفن ہو کے رہ گیا ہے۔بالکل اسی طرح جس ایمان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ظہور اعمالِ صالحہ کی شکل میں نہیں ہوتا تو وہ ایمان ایک مردہ بیج ہے جس کی تجدید ہونی چاہئے۔یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم بار بار عملِ صالح کے ساتھ ایمان کا ذکر کرتا ہے۔اور ایمان کے بعد عملِ صالح کا بھی ذکر کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔حقیقی ایمان کی تائید عملِ صالح سے ہوتی ہے۔جس طرح صالح بیج کی تائید اس سے نکلنے والے پودے سے ہوتی ہے۔اسی طرح عملِ صالح وہ ہے جس کی تہ میں ایمان کارفرما ہو۔جس طرح خودرو پودوں پر اعتماد نہیں ہوتا، اسی طرح جو عمل ایمان سے وابستگی نہیں رکھتا اوراس کی جڑ میں ایمان موجود نہیں اور وہ اس ہدایت کی پیروی میں نہیں کیا جاتا جو اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول نے دی ہے تو اسے عملِ صالح نہیں کہا جاسکتا۔

دوسرا لفظ صالحات ہے، نیک کاموں کو کہتے ہیں۔اس سے مراد وہ تمام نیکیاں ہیں جن کا حکم شریعت نے دیا ہے، جو شریعت کے مزاج نے پیدا کی ہیں، جنہیں شرعی احکام اور شرعی مزاج نے ناپسند نہیں کیا، جنہیں امتِ اسلامیہ کا معروف ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔یہ ایمان کا ثمر بھی ہیں اور ایمان اور امتِ مسلمہ کی علامت اور شناخت بھی۔

اعمالِ حسنہ کی صالحات سے تعبیر اس بات کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہے کہ انسان کی تمام ظاہری وباطنی، دینی ودنیوی، شخصی واجتماعی، جسمانی وعقلی، صلاح وترقی کا ذریعہ اعمالِ صالحہ ہی ہیں۔اور یہ وہ اعمال ہیں جو ایک مومن کی زندگی اور نشوونما کا سبب بن سکتے ہیں۔اور جن کے ذریعے سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتا ہے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔

ایمان وعمل جن کا تذکرہ ہم نے کیا ہے یہ وہ دو صفتیں ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہئیں۔ان دونوں صفات کے پیدا ہونے سے انفرادی طور پر ایک مومن تیار ہو جاتا ہے۔اس کے اندر اسلام کی بنیادی صداقتوں کے ساتھ گہری وابستگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اوراس کی سیرت و کردار کیلئے مضبوط بنیاد بھی فراہم ہو جاتی ہے۔اوران کے نتیجہ میں اس کے اندر حُسنِ سیرت اور کردار کی بلندی کا نور جگمگانے لگتا ہے۔اس کے دل ودماغ بھی روشن ہوتے ہیں اوراس کی زندگی کا ہر شعبہ اوراس کے رویئے کا ہر پہلو طاہر اور مطہر ہو جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ایک سپاہی تیار ہو جاتا ہے جو لادینی قوتوں کے مقابلے میں اور شیطانی ارادوں کے علی الرغم ہر محاذ پر استقامت کی تصویر بن کر کھڑا رہ سکتا

Marfat.com

ہے۔ وہ ایک ایسی مشعلِ نور کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ جس سے ماحول کی تاریکیاں دور کی جا سکتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام صرف اچھے افراد تیار کرنے کیلئے تو نہیں آیا اس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی زمین کو ہر طاغوتی طاقت، ہر شیطانی استبداد اور ہر برائی اور گمراہی کو ختم کر کے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کرنا تھا۔ بلاشبہ اسے صالح افراد بھی تیار کرنے ہیں کیونکہ وہ کشتی کبھی مضبوط نہیں ہوتی جس کے تختے دیمک زدہ ہوں۔ تختوں کی باہم پیوستگی اگر چہ ان کی طاقت کو بڑھا دیتی ہے لیکن اس کیلئے ہر تختے کا مضبوط ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

لیکن افراد کو ملت بننے کیلئے ضروری ہے کہ اس مشعل کی روشنی دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ اس دریا سے صحراؤں اور چٹیل میدانوں کو سیراب کرنے کا کام لیا جائے۔ اس سپاہی کو میدانِ عمل اور میدانِ حرب میں اتارا جائے۔ اسی سے ملت بھی وجود میں آئے گی اور اللہ تعالیٰ کی زمین غیر اللہ کی چیرہ دستی سے آزاد ہو جائے گی۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس لئے مزید دو باتوں کا حکم دیا گیا۔

تواصی بالحق

پہلا حکم وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں۔ حق اصل میں اس فیصلہ کن امر کو کہتے ہیں جو اپنی ذات اور اپنی صداقت کی قوت سے قائم ہو۔ اس حقیقی معنی کے اعتبار سے وہ باطل کی ضد ہے۔ لیکن اس کا استعمال مختلف معنوں میں ہوتا ہے اور وہ سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

۱۔ وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔

۲۔ جو عقل کے نزدیک مسلم ہو اور علم و دانش کے بدلتے ہوئے پیمانے اسے غلط ثابت کرنے سے عاجز ہوں۔

۳۔ ایک ایسی بات جو صحیح اور سچی اور عدل و انصاف کے مطابق اور حقیقت کے مطابق ہو۔ اس کا تعلق عقیدہ و ایمان سے ہو یا دنیا کے معاملات سے۔

۴۔ وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو خدا کے حق کے طور پر یا بندوں کے حق کے طور پر یا نفس کے حق کے طور پر۔ اور بندوں کے حقوق میں فقراء اور مساکین کے وہ تمام حقوق داخل ہیں جو خوشحال لوگوں پر لازم ہیں۔

اس حق سے وابستگی ایمان و عمل کا لازمی تقاضا ہے۔ لیکن اس وابستگی میں شکست و ریخت سے بچاؤ کی صرف ایک صورت ہے کہ حق پر ایمان رکھنے والا اور اس سے گہری وابستگی رکھنے والا شخص اتنا حساس ہو کہ باطل کی پرچھائیں بھی اس پر نہ پڑ سکے۔ جس طرح آنکھ میں اگر غبار پڑ جائے تو آنسو آ کر اسے دھوڈالتا ہے۔ اسی طرح اگر کبھی مومن پر پراپیگنڈے کے نتیجے میں یا خواہشات کے ہجوم میں یا بگڑے ہوئے ماحول

Marfat.com

کے زیرِ اثر کبھی کوئی گناہ کا چھینٹا ایمان پر پڑ ہی جائے تو اس وقت تک وہ بے قرار رہے جب تک اسے دھو نہ ڈالے۔ اور اگر کہیں دامن بھیگ جائے تو ہاتھوں میں ایسی قوت ہونی چاہئے کہ اسے نچوڑ ڈالے۔ اس گہرے احساس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد دوسرے فرد کو جگائے رکھتا ہے اور ہر فرد دوسرے کی نگرانی کرتا ہے کہ کوئی غلط بات کسی مومن پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ کرے۔ اور اسلامی معاشرے کا ہر فرد حق پرستی اور راست بازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حقداروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفانہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اسی طرزِ عمل کی نصیحت کرتا رہے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال کے انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اور اگر اس کی طرف سے بے اعتنائی اور بے حسی پیدا ہو جائے تو پھر خسران سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اس سے تہی دامن لوگ اگر اپنی ذات میں حق پر قائم بھی رہیں مگر معاشرے کو حق پر قائم رکھنے کی کوشش نہ کریں اور لادینی قوتوں کے خلاف دیوار نہ بنیں تو ایسے پاکیزہ لوگ معاشرے کو غیر اسلامی تصورات سے بچا نہیں سکتے۔ بلکہ جب لادینیت کا طوفان اٹھے گا تو یہ بھی اس میں بہہ جائیں گے۔ باپ اپنے بیٹے کی طغیانی کی نذر ہو جائے گا اور ماں اپنی بیٹی کی تہذیبی رعونت میں بہہ جائے گی۔ قرآنِ کریم میں جابجا ایسی قوموں پر تنقید کی گئی ہے کہ جن کے نیک اور اہلِ علم لوگ دوسروں کو برے افعال سے روکتے نہیں تھے۔ سورۃ المائدہ میں اسی جرم کے باعث بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے لعنت کی گئی ہے۔ اور سبت کے احکام کی خلاف ورزی کے نتیجے میں ان لوگوں پر بھی عذاب نازل کر دیا گیا جو خود اس جرم میں شریک نہیں تھے لیکن دوسروں کو روکنے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کیا گیا ہے۔

تواصی بالصبر

آخری چیز جو اہلِ ایمان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کیلئے لازمی قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی اطاعت میں اگر مشکلات پیش آئیں تو گھبرانے کی بجائے صبر و استقامت کی تصویر بن جائیں۔ اسلام نے جن باتوں کی پابندی کا حکم دیا ہے انہیں بجالانے پر صبر کریں یعنی اطاعت میں کمزوری نہ آنے دیں اور اپنے طریقے پر جمے رہیں۔ ہر چند کہ معاشرہ گناہوں پر ہر ممکن طریقے سے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر اس کی ترغیبات اور اس کے پریشرز پر صبر کریں یعنی گناہوں سے اجتناب کریں۔ اور اگر نیکی پر عمل کرتے ہوئے کسی نقصان یا سزا کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر صبر کریں یعنی اسے برداشت کریں۔ یعنی صبر علی المصائب، صبر علی الطاعات اور صبر عن المعصیات کا پیکر بن جائیں۔ جب ایک امت ان صفات سے متصف ہو کر میدانِ عمل میں نکلے گی تو باطل ان کا راستہ روک نہیں سکے گا۔ اور جب تک وہ ان صفات سے متصف رہے گی تو حق کا پرچم سربلند رہے گا اور کوئی طوفان ان کو سرنگوں نہ کر سکے گا اور کوئی آندھی ان کی روشن کی ہوئی شمع کو بجھا نہ سکے گی۔ عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ کے شب و روز اس کی زندہ گواہی ہیں۔ اور تاریخ کبھی اس سے انکار نہیں کر سکتی۔

مختصر یہ کہ زمانہ اس بات کا گواہ ہے کہ عہدِ ماضی میں وہ قومیں ہمیشہ شکست و ریخت کا شکار ہوئیں جنہوں نے ایمان و عمل، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور راہِ حق میں آنے والی مشکلات میں صبر سے کنارہ کشی کی۔ اور گزرتا ہوا زمانہ بھی اس بات پر شاہد ہے کہ امتِ مسلمہ جو کبھی اس دھرتی کی سب سے بڑی قوت تھی اور جس نے زندگی کے ہر میدان میں سچائی اور راستی کی شمع روشن کی تھی اور

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کے چراغ جلائے تھے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا عنوان بن کر رہی تھی آج وہ زوال کے انتہائی دور سے گزر رہی ہے۔لادینی قوتیں اس طرح اس پر حملہ آور ہیں جیسے بھوکے دستر خوان پر حملہ آور ہوتے ہیں۔اور وہ اپنی افرادی قوت کی بے پناہی کے باوجود اپنا دفاع کرنے پر قادر نہیں۔وجہ اس کی صرف ایک ہی ہے کہ ان کے ایمان اور عمل میں خرابیوں کی ہر قسم در آئی ہو۔وہ ایمان کی بجائے تشکک اور ارتیاب کی تصویر بن گئے ہیں۔ان کا علم اور دانش غیروں کے ایجنٹ اور اپنوں کے دشمن بن گئے ہیں۔ان کی قوتِ حاکمہ لادینی قوتوں کی آلہ کار بن کر رہ گئی ہیں۔انہیں نہ آخرت کا یقین ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بھروسہ ہے۔ان کے اعمال بدترین قسم کی بداعمالیوں کی تصویر بن گئے ہیں۔بدعملی اور بے عملی کا ہر روگ ان میں پایا جاتا ہے۔مسجدیں نمازیوں کی کمی پر مرثیہ خواں ہیں۔اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والے اپنوں کے ہاتھوں سے ادھیڑے کھدیڑے جا رہے ہیں۔تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا ایک ایک ٹانکا ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔لیکن پیشِ نظر سورۃ مبارکہ کا سبق یہ ہے کہ ہم جب تک عہدِ رفتہ کی طرف نہیں لوٹیں گے اور اس صورت میں بیان کردہ حقائق کو مشعلِ راہ نہیں بنائیں گے اس وقت تک خسارے سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ہم جیسے جیسے اندھیروں کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں ویسے ویسے روشنی کی ضرورت فراواں ہوتی جا رہی ہے۔

یہ بزمِ آب و گل جتنی کہ برہم ہوتی جاتی ہے
محمدؐ کی شریعت اور محکم ہوتی جاتی ہے

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

(۱۰۴)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْهُمَزَة ہے جو اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔اس میں ایک رکوع، نو آیات، تیس کلمات اور ایک سو تیس حروف ہیں۔تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔اور اس کے مضمون اور اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

مضامین:۔ عقیدے کی خرابیوں نے جس طرح مشرکین کا اخلاق تباہ کیا تھا، ان میں سے بڑی بڑی خرابیوں کے ذکر سے ہٹ کر ایسی برائیوں کا تذکرہ اس سورۃ میں کیا جا رہا ہے جو کسی بھی معاشرے میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ معاشرہ اخلاقی انحطاط کی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے۔ سارے عرب میں مختلف قبائل آباد تھے لیکن قریش ان میں سب سے مضبوط، فہم و دانش رکھنے والا اور بہت ساری اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کا حامل قبیلہ تھا۔ایک طرف تو ان کی تجارتی سرگرمیوں میں وسعت کی وجہ سے بعض ایسی اخلاقی خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں جو مختلف ملکوں کے سفر اور مختلف قوموں کے افراد سے میل جول کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔اور دوسری طرف بیت اللہ کے متولی اور ملتِ ابراہیمی کے پاسدار ہونے کی وجہ سے ایسے طریقوں کو اختیار کرنا پڑتا تھا جو دوسرے قبائل پر ان کی برتری کی علامت بھی تھے اور تحمل، بردباری اور برداشت کے غماز بھی۔لیکن جب سے آنحضرت ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کا آغاز کیا اور ان کے عقائد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاقی مفاسد پر تنقید شروع کی تو یہ لوگ اپنے تمام تر اخلاقی تفوقات کو چھوڑ کر دشمنی اور مخالفت کی اس سطح پر اتر آئے جو کسی کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہ تھی، وہ نبی کریم ﷺ جیسی شخصیت پر جن کے دامن کی پاکیزگی، اخلاق کی بے عیبی اور سیرت و کردار کی بلندی کا ہر طرف اعتراف پایا جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان پر ایمان لانے والوں پر بھی نئے سے نئے ایسے بہتانات اور الزامات کے طومار باندھنے لگے جن کا تصور بھی دوسروں کیلئے تکلیف دہ تھا۔وہ حرکتیں جو کبھی معززین کے قریب بھی نہیں پھٹکتی تھیں ان کا ارتکاب ان کا معمول بن گیا۔ایسی ہی اخلاق سے گری ہوئی ان کی حرکتوں کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا ہے کہ ان بدبختوں کا حال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اور مخلص مسلمانوں کے پسِ پشت عیب جوئی ان کا معمول بن گیا ہے۔اور ان میں کئی ایسے بے حیاء بھی ہیں جو منہ پر طعن و تشنیع سے باز نہیں آتے۔آنکھوں سے اشارے کرنا یا کسی کے سامنے طعنے دینا یہ بازاری لوگوں کی حرکتیں ہیں۔لیکن ان معززین نے مخالفت میں اپنے آپ کو اسی حد تک گرا لیا تھا۔سبب اس کا صرف یہ تھا کہ ان میں سے ایک ایک شخص جسے حالات نے دولت مند بنا دیا ہے وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔مال و دولت کی ہوس نے ان کو ہوش و خرد سے اس حد تک عاری کر دیا ہے کہ موت جس کے آنے میں کچھ شبہ ہی نہیں اسے بھی بھول چکے ہیں۔

مال و دولت کی محبت، عہدہ و منصب کی ہوس، دنیا میں ہمیشہ رہنے کی تمنا اور دولت ہی کو سب کچھ سمجھ لینے کا سودا ایسا نشہ ہے جو وعظ و نصیحت سے اترنے والا نہیں، جب تک انہیں اس حقیقت کا ادراک نہ ہو جائے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب وہ اپنے عقیدہ و عمل کی گمراہی کے نتیجے میں ایسی آگ میں ڈالے جائیں گے جس کی شدت کا اس دنیا میں اندازہ ممکن نہیں۔اسی وجہ سے قرآنِ کریم بار بار انہیں قیامت کے تصور سے آگاہ کرتا ہے، اس کی ہولناکی کا نقشہ کھینچتا ہے تاکہ وہ لوگ اپنے انجام کی فکر سے بہرہ ور ہو کر اپنے عقیدہ و عمل کی خرابیوں کو دور کرنے کیلئے تیار ہو جائیں اور اس طرح سے اپنے برے انجام سے بچ جائیں۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ۹	سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَکِّیَّةٌ (۱۰۴)	رُکُوْعَاتُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾
يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۖ﴿۴﴾ وَ
مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى
الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿۸﴾ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۠﴿۹﴾

رکوع: ۱۔ (ہلاکت ہے ہر اس شخص کیلئے جو (روبرو) طعنے دیتا ہے اور پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرتا ہے۔ ۱) جس نے مال جمع کیا اور اس کو گنتا رہا۔ ۲) وہ سمجھتا ہے کہ اس کے مال نے اسے لافانی بنادیا ہے۔ ۳) ہرگز نہیں! وہ چور چور کر دینے والی میں پھینک دیا جائے گا۔ ۴) اور تم کیا جانو کہ چور چور کر دینے والی کیا ہے۔ ۵) وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ ۶) جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ ۷) بیشک وہ آگ ان پر بند کردی جائے گی۔ ۸) اس حالت میں کہ وہ اونچے اونچے ستونوں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ ۹)

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾
(ہلاکت ہے ہر اس شخص کیلئے جو (روبرو) طعنے دیتا ہے اور پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرتا ہے۔ ۱)

هُمَزَةٍ اور لُمَزَةٍ کا مفہوم

هُمَزَةٍ اور لُمَزَةٍ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں هُمَزَةٍ کا معنی ہے اشارہ باز، اور لُمَزَةٍ کا معنی ہے عیب جو اور عیب چیں۔ یہ دونوں معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ کبھی دونوں کو ایک ہی معنی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی دونوں ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی هُمَزَةٍ کا معنی عیب جو اور لُمَزَةٍ کا معنی اشارہ باز کیا جاتا ہے۔ یعنی دونوں کے معنی میں گہری مناسبت

Marfat.com

ہے۔اشارہ بازی کا تعلق زیادہ تر حرکتوں اور اداؤں سے ہے۔اور عیب جوئی کا تعلق زبان سے۔ جہاں کسی غریب یا کمزور سے آمنا سامنا ہوتو اس کے منہ پر ایسی حرکتیں کی جاتی ہیں کہ جس سے اشاروں ہی اشاروں میں اس کی توہین کی جاتی ہے۔اور جہاں یہ اندیشہ ہو کہ اگر میں نے اس شخص کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات کہی تو سخت ردِعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔تو پھر سامنے یا تو خاموشی اختیار کی جاتی ہے اور یا تعریف کی جاتی ہے۔اور اس کے چلے جانے کے بعد اس کے عیب تلاش کئے جاتے ہیں اور اس کی غیبت کی جاتی ہے۔ایسی صورت میں چونکہ کسی ردِعمل کا اندیشہ نہیں ہوتا اس لئے یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔امرِ واقعہ یہ ہے کہ معنی کے اعتبار سے دونوں میں فرق بھی ہو جب بھی یہ دونوں ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں اور دونوں کا الگ الگ استعمال کم کم ہی ہوتا ہے۔عموماً ایک سے بات شروع ہوتی ہے تو دوسرے سے بات آگے بڑھتی ہے۔اور پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو شخص اس طرح کی حرکتیں کرتا ہے وہ عام طور پر اس کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر معاملہ اشارہ بازی اور عیب جوئی تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایسے شخص میں وہ تمام خرابیاں جمع ہو جاتی ہیں جو اس وقت مکے کے چھوٹے بڑے لوگوں میں عمومی طور پر اور طبقۂ امراء میں خصوصی طور پر عام ہو چکی تھیں جس کا ذکر قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو ان برائیوں سے بچانے کیلئے ایک ہی آیت میں کیا ہے۔جس کے مصداق بظاہر الگ الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی کردار کے مختلف اظہار ہیں۔سورۃ القلم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِينَ ۝

(اور تم ہر لپاٹیے ذلیل کی بات کا دھیان نہ کرو، اشارہ باز اور لگانے بجھانے والے کا، بھلائی سے روکنے والا، حدود سے تجاوز کرنے والا اور حق کو تلف کرنے والا، اجڈ مزید برآں چاپلوس، بوجہ اس کے کہ وہ مال و اولاد والا ہوا)

جس طرح ہر نیکی کے بطن سے کئی نیکیاں جنم لیتی ہیں، اسی طرح آیت میں مذکور دو برائیوں سے وہ ساری برائیاں پیدا ہوتی ہیں جن کا ذکر سورۃ القلم میں کیا گیا ہے۔اور آنحضرت ﷺ نے بھی اسی طرح کی بعض برائیوں کی مذمت فرمائی ہے جو ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ارشاد فرمایا: شرار عباد الله تعالىٰ المشاء ون بِالنَّمِيمَةِ المفرقون بين الاحبة الباعون البراء العنت ''اللہ کے بندوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں اور دوستوں کے درمیان فساد ڈلواتے ہیں اور بے گناہ لوگوں کے عیب تلاش کرتے ہیں۔''

قریش اور دیگر مخالفین کا معمول یہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ اور دیگر مسلمانوں کا مذاق اڑانے، توہین و تذلیل کرنے اور دوسروں کی نگاہوں سے انہیں گرانے کیلئے کبھی سامنے رو در رو مختلف حرکتوں اور اشاروں سے کام لیتے تھے۔اور کبھی پیٹھ پیچھے ان کی عیب جوئی کرتے۔ قرآنِ کریم نے ان کی اخلاقی برائیوں کو ذکر فرما کر ان کے پراپیگنڈے کو کمزور کرنے کی کوشش فرمائی۔اور ان میں سے جن لوگوں نے بظاہر حُسنِ اخلاق کا نقاب پہن رکھا تھا ان کے چہرے سے ان کا نقاب اتار دیا ہے۔اور یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ ان کی اخلاقی خرابیاں صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ ان کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔

الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝٢

(جس نے مال جمع کیا اور اس کو گنتا رہا۔ ۲)

Marfat.com

متذکرہ بالا اخلاقی خرابیوں کا اصل سبب

اس آیت میں ان کی اخلاقی خرابیوں کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے یعنی جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ توہین و تذلیل کا رویہ اختیار کرتے ہیں اس کا حقیقی سبب یہ ہے کہ انہیں اپنی مالداری کا غرور ہے۔ وہ مال کو حقیقی طاقت سمجھ کر اس کی محبت میں اس طرح ڈوبے رہتے ہیں کہ انہیں سوائے دولت کے جمع کرنے کے اور کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ اور اسے چونکہ طاقت کا حقیقی سبب سمجھتے ہیں اس لئے جن لوگوں کے پاس مال و دولت نہیں اور وہ بظاہر اسبابِ دنیا سے تہی دامن نظر آتے ہیں تو یہ دولت کی طاقت کے زعم میں ان کی تذلیل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اور مال و دولت کے بارے میں ان کا گمان یہ ہے کہ یہ شاید انسان کو دوام بخش دیتی ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت اس کو گنتے رہتے ہیں۔ یعنی ان کے سر پر یہ دھن سوار رہتی ہے کہ میری دولت میں وقت کے ساتھ ساتھ کتنا اضافہ ہوا ہے۔ اور یہ فکر رہتی ہے کہ میرے کسی کاروبار میں کہیں ایسی کمزوری پیدا تو نہیں ہو رہی جس میں مال کے کم ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ مال میں یہی کمی بیشی کا تصور ان کی زندگی بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ اسی کیلئے جیتے اور اسی کیلئے مرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے اندر ایسی خست پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ایک پائی بھی کسی غریب و یتیم کی امداد کیلئے خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ ﴿۳﴾

(وہ سمجھتا ہے کہ اس کے مال نے اسے لافانی بنادیا ہے۔ ۳)

مال و دولت میں گہرے انہماک کا سبب

اس کے مال و دولت میں گہرے انہماک کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کا گمان یہ ہے کہ یہ مال اسے کبھی مرنے نہیں دے گا بلکہ اسے زندہ و جاوید رکھے گا۔ یعنی مال کی محبت ایک ایسا دھوکہ یا ایسا نشہ ہے جو موت جیسی حقیقت کو بھی آنکھوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں کے جنازے اٹھتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اپنی موت اسے کبھی یاد نہیں آتی۔ ٹھیک کہا کسی نے:

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے
مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بو نے

قومیں جب بگڑتی ہیں تو ان کے بگاڑ کا حقیقی سبب یہی مال و دولت میں استغراق ہوتا ہے۔ وہ دولتِ دنیا میں اپنے لئے دوام دیکھنے لگتے ہیں۔ سورۃ شعراء میں اسی ذہنیت کی عکاسی فرمائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ○ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ○ ”کیا تم ہر بلندی پر بیکار یادگاریں تعمیر کرتے رہو گے اور شاندار محل تعمیر کرتے رہو گے گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے“

یعنی جن لوگوں کی زندگی کا عمومی رویہ یہ ہو کہ وہ ہر معاملے میں دولتِ دنیا کو ترجیح دیتے اور دنیا ہی کو اپنی منزل سمجھتے ہوں تو ان کے بارے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ زبان سے کیا کہتے ہیں بلکہ ان کے طرزِ عمل سے ان کی زندگی کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ جو شخص آخرت کا قائل ہوگا اسے تجوریوں کی فکر نہیں ہوگی بلکہ اس کے پیشِ نظر کردار سازی کے محل کی تعمیر رہے گی۔ یہی وہ پیمانہ ہے جس سے کسی قوم کی حقیقت سامنے آتی ہے۔

Marfat.com

كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿۴﴾

(ہرگز نہیں! وہ چور چور کر دینے والی میں پھینک دیا جائے گا۔ ۴)

بخیلوں کو تنبیہ

لَيُنْبَذَنَّ ...... نبذ سے ہے۔ کسی چیز کو حقیر اور بے قیمت سمجھ کر پھینک دینے کیلئے بولا جاتا ہے۔ کافر چونکہ یہ گمان کرتا ہے کہ مال و دولت نے اسے عمرِ دوام عطا کر دی اور اس کے اندر صفتِ خلود پیدا کر دی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور بیش قیمت سمجھتا ہے۔ اس کے اس تصور پر چوٹ لگاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اسے اس طرح پھینک دیا جائے گا جس طرح بے قیمت چیز کو بوجھ سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

حُطَمَةِ ، حَطَمَ کے مادہ سے ہے جس کے معنی چور چور کر دینے کے ہیں۔ اس کے اندر مبالغہ کا معنی پایا جاتا ہے۔ یہ جہنم کی آگ ہے یا کوئی خاص وادی ہے کہ جو اتنی گہری ہے اور اس کی آگ اتنی شدید ہے کہ جو چیز بھی اس میں اوپر سے پھینکی جاتی ہے اسے وہ توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایسے مالدار لوگ جو مال و دولت کے گھمنڈ میں اپنے تئیں دوسروں سے بالاتر اور بیش قیمت سمجھتے تھے انہیں اس وادی میں پھینکا جائے گا۔ جو انہیں بھی اور ان کے مال و دولت کو بھی چور چور کر کے رکھ دے گی۔ اس لفظ میں توہین اور خفت کا پہلو بھی ہے، اور عذاب کی شدت کا بھی۔ اور یہ آگ اور یہ جگہ بخیل مالداروں کیلئے اس لئے منتخب کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بخیل سرمایہ دار اپنی دولت سونے چاندی کی اینٹوں، زیورات، ظروف اور جواہرات وغیرہ کی شکل میں محفوظ کرتے تھے۔ ایسی دولت کا انجام یہی ہونا چاہئے تھا کہ اسے جلا کر اور چور چور کر کے پراگندہ کر دیا جائے اور ان کے مالک جو اپنے تئیں حیاتِ جاوداں کا حامل سمجھتے تھے وہ بھی اس ہولناک عذاب کی نذر کر دیئے جاتے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿۷﴾

(اور تم کیا جانو کہ چور چور کر دینے والی کیا ہے۔ ۵) وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ ۶) جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ ۷)

الْحُطَمَةُ کی خصوصیت

اس چور چور کر دینے والی آگ کی ہولناکی کو نمایاں کرنے کیلئے فرمایا کہ تم کیا جانو وہ چور چور کر دینے والی کیا ہے اور کیسی ہے۔ ظاہر ہے کہ خالق کے سوا اس کا جواب اور کون دے سکتا ہے۔ اس لئے پروردگار نے خود ہی فرمایا کہ وہ ایسی آگ ہے جس میں دو صفتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آگ ہے۔ جہنم کی کسی وادی کی آگ کو اللہ تعالیٰ کی آگ سے تعبیر نہیں کیا گیا۔ صرف اس آگ کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت اس کی ہولناکی، شدت اور تباہ نا کی کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ اور دوسری صفت اس میں یہ ہے کہ وہ صرف جسموں تک محدود نہیں رہے گی بلکہ براہِ راست دلوں پر حملہ کرے گی۔ کیونکہ اطلاع کے لفظ میں جہاں دلوں پر جا چڑھنے کا مفہوم شامل ہے وہیں یہ مفہوم بھی شامل

Marfat.com

ہے کہ وہ دلوں کے حالات سے باخبر ہوگی۔ جب وہ یہ جانے گی کہ ان دلوں میں مال کی محبت ایسی راسخ ہوگئی ہے کہ خدا اور آخرت کی یاد کیلئے کوئی جگہ ان میں باقی نہیں رہی۔ اور اس محبت اور تعلق کے زیرِ اثر ان کے دل برے خیالات، فاسد عقائد، ناپاک خواہشات اور خبیث نیتوں اور ارادوں کا مرکز بن گئے ہیں۔ بنابریں ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس جگہ پر حملہ کیا جائے جو اصل جرائم کی جگہ ہے اور جس کے بگاڑ کی وجہ سے انسانی زندگی اس صورتحال سے دوچار ہوئی ہے۔ دل بظاہر سینے میں دھڑکنے والا ایک لوتھڑا ہے جو خون کو پمپ کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر یا اس کے قرب میں کوئی ایسا مقام بھی ہے جو انسانی اعضاء کے ساتھ ساتھ انسانی شعور وادراک اور عقائد وافکار کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ انسانی اصلاح بھی ہمیشہ اسی کی اصلاح سے وابستہ رہی ہے اور انسانی بگاڑ بھی اسی کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ تو یہ بات نہایت فطری ہے کہ سزا دینے کیلئے بھی سب سے پہلے اسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو جرائم کی آماجگاہ اور پرورش کی جگہ ہے۔ اور اس کے اندر قدرت نے یہ صلاحیت بھی رکھی ہے کہ وہ جہاں مجرموں کو پہچانتی ہے وہاں جرائم کی نوعیت کو بھی سمجھتی ہے۔

اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ﴿۸﴾ فِىۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾

(بیشک وہ آگ ان پر بند کردی جائے گی۔ ۸) اس حالت میں کہ وہ اونچے اونچے ستونوں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ ۹)

مجرموں کی بے بسی

گزشتہ آیات سے ایک تو آگ کی شدت اور اس کی ہولناکی سے دل سہم سہم جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں کی بے بسی بھی دید کے قابل ہوگی کہ انہیں اس وادی میں پھینک کر اوپر سے اس وادی کو ڈھانک کر بند کردیا جائے گا تاکہ اس کی تپش اندر سے باہر نکلنے نہ پائے۔ اور مزید ان کی بے بسی کا حال یہ ہوگا کہ وہ لمبے لمبے ستونوں اور بڑی بڑی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہوں گے۔ اور حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ آگ کی لپٹیں اور اس کے منہ زور شعلے لمبے لمبے ستونوں جیسے ہوں گے۔

مقصود صرف یہ ہے کہ انسان کو جس چیز نے سب سے زیادہ تباہ کیا ہے وہ اس کی زبان کا بگاڑ اور اس کے اخلاق کی پستی ہے۔ اور جس چیز نے انسانیت کو نہ صرف خطرات کی نذر کیا بلکہ حیوانوں سے بھی نیچے گرایا، وہ اس کی مال ودولت سے حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے۔ اور انسان عجیب واقع ہوا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے اسے علم ودانش کا سرمایہ بخشا ہے اور اس کے دل کو عشق کے گداز سے معمور فرمایا ہے اور دوسری طرف اس کی پستی کا عالم یہ ہے کہ مال ودولت کی محبت کا اسیر ہو کر وہ انسانی اقدار تک کو بھول جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ دنیا میں رشتوں ناتوں کی شکست وریخت، رحم ومروت کے جذبات کی تباہی، اخوت ومحبت کا فقدان۔ اور آخرت میں وہ ہولناک انجام ہے جس کا نقشہ اوپر کی آیات میں کھینچا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس تباہی سے محفوظ رکھے۔

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْفِیْلِ

(۱۰۵)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْفِيْلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْفِيْلِ ہے۔اس میں ایک رکوع، ۵ آیتیں، ۲۰ کلمات اور ۹۶ حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور اس کے تاریخی پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ میں عہدِ نبوت کے آغاز میں نازل ہوئی ہوگی۔

تاریخی پس منظر:۔ اس علاقہ کے نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بحراحمر کے دائیں طرف یمن کا ملک ہے اور اس کے بالمقابل دوسری طرف برِاعظم افریقہ کا ملک حبشہ ہے جسے ایتھوپیا یا ابی سینیا بھی کہا جاتا ہے۔ یمن کی خوشحالی کے دور میں یمن کے خوشحال افراد نے یمن سے نقلِ مکانی کر کے ابی سینیا کے ساحل پر اپنی تجارتی منڈیاں اور مراکز قائم کر لئے تھے۔ ایک مدت تک انہوں نے اپنی نسبی اور نسلی خصوصیات کو باقی رکھا۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ افریقہ کے اصلی باشندوں کے ساتھ ان کے شادی بیاہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ خالص سبائی قوم نہ رہے اور نہ خالص افریقی بن سکے بلکہ ایک مخلوط قوم وجود میں آ گئی۔ اسی لئے ان کو حبش کہا جاتا ہے جس کا معنی اختلاط و امتزاج ہے۔ گویا سبائی قوم دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ اپنے اصلی وطن یمن میں اقامت پذیر رہا، انہیں سبائے حمیر کہتے ہیں۔ اور جو لوگ ترکِ وطن کر کے افریقہ میں چلے گئے انہیں سبائے حبش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یمن کے اصل باشندے کواکب پرستی میں مبتلا تھے۔ لیکن اس زمانے میں افریقہ قیصرِ روم کے قبضہ میں تھا۔ رومی عیسائی تھے۔ ان کے حکومتی اثر اور سرگرم تبلیغی کوششوں کے باعث عیسائیت کو یہاں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ حبشہ کے باشندے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی اکثریت نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ یمن میں بھی عیسائی مبلغین کی کوششوں سے نجران کے خطہ میں عیسائیت نے اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ ذونواس حمیر کا آخری بادشاہ عیسائیت کے فروغ کو برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ اس نے عیسائیوں کیلئے تعذیب اور اذیت رسانی کے ایسے ایسے طریقے اختیار کئے جس سے انسانیت بھی کانپ اٹھی۔ اور اس طرح سے اس نے عیسائیت کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اس نے بے شمار لوگوں کو آگ کے گڑھوں میں پھینک کر زندہ جلایا۔ چنانچہ جب اس بہیمانہ ظلم کی داستان حبش میں پہنچی اور نجاشی بادشاہ سے اس کا انتقام لینے کی فریاد کی گئی تو نجاشی نے قیصرِ روم کی مدد سے ایک بحری بیڑہ تیار کیا اور اپنی ۷۰ ہزار فوج اس کے ذریعے یمن کے ساحل پر اتار دی۔ ذونواس نے عدن اور حضرِ موت کے ساحل پر اس فوج کا استقبال کیا اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر نئی تیاری کے ساتھ حبشی لشکر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس دفعہ ذونواس ان کے حملے کی تاب نہ لا سکا۔ ذونواس مارا گیا اور اس طرح یمن پر حبشیوں کا قبضہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جو حبشی فوج یمن پر حملہ

Marfat.com

آ ور ہوئی تھی اس کی قیادت دو امیروں کے ہاتھ میں تھی۔ ایک الیاط اور دوسرا ابرھہ۔ پھر کسی وجہ سے دونوں میں تصادم ہوگیا۔ الیاط مارا گیا اور ابرھہ پورے ملک پر قابض ہوگیا۔ پھر اس نے نہایت عقلمندی سے شاہ حبش کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ رفتہ رفتہ اس نے اتنا عروج حاصل کر لیا کہ وہ یمن کا خود مختار بادشاہ بن گیا مگر برائے نام اس نے شاہ حبش کی بالا دستی بھی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو بادشاہ کا نائب لکھتا تھا۔

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد ابرھہ نے اس مقصد کیلئے کام شروع کر دیا جو اس مہم کی ابتداء سے رومی سلطنت اور اس کے حلیف حبشی عیسائیوں کے پیش نظر تھا۔ یعنی ایک طرف عرب میں عیسائیت پھیلانا اور دوسری طرف اس تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانے میں حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ اس تجارت کے راستوں پر قبضہ کرنا اور بھی ضروری ہوگیا۔ کیونکہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کشمکشِ اقتدار نے بلادِ مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔

ابرھہ نے ان دونوں مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے جو تدبیر اختیار کی وہ بظاہر تو عربوں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے اور نئے قبلہ کی طرف موڑنے کی ایک تدبیر تھی۔ لیکن حقیقت میں ایک تیر سے دونوں مقاصد حاصل کرنا پیش نظر تھا۔ چنانچہ اس نے دار السلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا۔ اور ابن کثیر کی روایت کے مطابق اس نے علی الاعلان اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں ہر صورت میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے وہ لوگ جو بھی اپنے مذہبی معاملات اور جغرافیائی حالات میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہ کرتے تھے انہیں اشتعال دلانا مقصود تھا تاکہ وہ مخالفت میں کوئی ایسی حرکت کریں جس سے کعبۃ اللہ پر حملہ کر کے اسے مسمار کرنا اور عربوں کی دفاعی کوششوں کو پامال کرتے ہوئے سارے علاقے پر قبضہ کے نتیجے میں تجارتی راستوں پر قبضہ کر لینا پیش نظر تھا۔ چنانچہ اس کی یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ کسی عرب نے اشتعال میں آکر اس کے بنائے ہوئے کلیسا میں گھس کر رفعِ حاجت کر ڈالی۔ اور بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق قریش کے بعض نوجوانوں نے اس کلیسا کو آگ لگا دی۔ حقیقت کچھ بھی ہو، ابرھہ کو اس سے مکہ معظمہ پر چڑھائی کرنے کا بہانہ مل گیا حالانکہ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ یہ آگ اس نے خود اپنے آدمیوں کے ذریعے لگوائی ہو۔

چنانچہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں ابرھہ ۶۰ ہزار فوج اور ۹ یا ۱۳ ہاتھی لے کر مکہ کی طرف بڑھا۔ راستے میں دو جگہ اہلِ عرب نے اس لشکر کو روکنے کی کوشش کی، لیکن طاقت کی کمیابی کے باعث وہ ناکام رہے۔ سب سے پہلے یمن کے ایک سردار ذو نفر نے ابرھہ کے لشکر کے مقابلے کی کوشش کی، لیکن شکست کھا کر گرفتار ہوگیا۔ پھر خثعم کے علاقے ایک عرب سردار نفیل بن حبیب خثعمی اپنے قبیلے کو لے کر مقابلے پر آیا، مگر وہ بھی شکست کھا کر گرفتار ہوگیا۔ البتہ بنو ثقیف نے کمزوری دکھائی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہم اتنی بڑی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ ابرھہ سے ملے تو طائف کے قریب ان کے معبود لات کا جو مندر ہے اسے محفوظ رکھنے کی درخواست کی۔ اور اس کے بدلے میں ایک بدرقہ فراہم کرنے کی پیشکش کی جو ابرھہ کی فوج کو مکہ کے راستے بتانے کی خدمت انجام دے گا۔ ابرھہ نے ان کی یہ بات قبول کر لی۔

محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق ابرھہ نے المغمس سے اپنا مقدمۃ الجیش آگے بڑھایا اور وہ قریش اور اہلِ تہامہ کے بہت سے مویشی لوٹ لے گیا جن میں رسول اللہ ﷺ کے دادا عبد المطلب کے بھی ۲۰۰ اونٹ تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایلچی کو مکہ بھیجا اور اس کے

Marfat.com

ذریعے سے اہلِ مکہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا بلکہ اس گھر یعنی کعبہ کو ڈھانے آیا ہوں۔ اگر تم میرے راستے میں حائل نہ ہو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرض نہ کروں گا۔ چنانچہ ایلچی کے ترغیب دینے پر عبدالمطلب اس کے ساتھ ابرھہ کے پاس آئے کیونکہ وہ اس وقت مکہ کے سب سے بڑے رئیس تھے۔ ان کی شخصیت اس قدر بالا بلند اور شاندار تھی کہ ان کو دیکھ کر ابرھہ بے حد متاثر ہوا۔ اور تخت سے اتر کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پھر ان کے آنے کا مقصد پوچھا۔ عبدالمطلب کے جواب سے متعلق دو روایات مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ابرھہ کو ان کے اس مطالبے پر بہت حیرانی ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں تو آپ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کے دینِ آبائی کا مرجع ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور انہیں کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر تو اس کا ایک رب ہے وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔ دوسری روایت حضرت ابنِ عباسؓ سے ہے۔ اس میں اونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ عبدالمطلب خود اس کے پاس گئے جب وہ ابھی عرفات اور طائف کے پہاڑوں کے درمیان تھا اور اس سے کہا کہ آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے، ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ عبدالمطلب نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اس نے آج تک کسی کو اس پر مسلط ہونے نہیں دیا۔ ابرھہ نے جواب دیا کہ میں اس گھر کو منہدم کئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ عبدالمطلب نے ہر چند کوشش کی کہ وہ واپسی پر راضی ہو جائے مگر اس نے آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور عبدالمطلب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ دونوں روایات میں سے کسی ایک کو بھی قبول کر لیا جائے تو اصل بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں کا مفہوم یہ ہے کہ قریش اور اس کے حامی دوسرے قبائل نے ابرھہ کی فوج سے لڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہمارے پاس اتنی بڑی منظم فوج کے ساتھ لڑنے کی کوئی طاقت نہیں۔ اور ویسے بھی حرم کی حدود میں لڑنا ایک بہت بڑی جسارت تھی جس کا ارتکاب قریش کیلئے آسان نہ تھا۔ قریش نے جنگِ احزاب میں تمام مشرک اور یہودی قبائل کو ساتھ ملا کر مسلمانوں پر حملہ کیا تھا تو وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود دس بارہ ہزار سے زیادہ کا لشکر فراہم نہیں کر سکے تھے، تو اب وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے ابرھہ کے پاس سے واپس آ کر قریش سے کہا کہ تم اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں پر چلے جاؤ تا کہ ان کا قتلِ عام نہ ہو۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حرم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر اپنے اللہ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اس وقت بھی کعبہ کے صحن میں ۳۶۰ بت موجود تھے لیکن انہوں نے کسی بت سے استمداد نہیں کی، کسی کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلایا، صرف اللہ واحد کو پکارتے رہے۔

ابرھہ نے صبح سویرے مکہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا۔ ہاتھیوں کے دستے کو آگے بڑھایا۔ سب سے بڑے ہاتھی کا نام محمود تھا۔ جب اس ہاتھی کو مکہ کی طرف پیش قدمی کیلئے ہانکا گیا تو وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ فیل بان نے آنکس سے بڑے کچوکے دیئے اور تبر سے اسے مارا۔ لیکن وہ اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اگر کسی اور سمت اسے چلنے کا اشارہ کیا جاتا تو بغیر کسی توقف کے وہ چلنے لگتا۔ مگر مکہ کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لئے ہوئے آئے اور انہوں نے اس لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دی۔ ان

Marfat.com

سنگریزوں کی مقدار چنے یا مسور کے دانے کے برابر تھی۔ ہر سوار پر ایک پرندہ ایک کنکر مارتا تھا جو اس کے فولادی خود، آہنی زرہ اور اس کے جسم کو چیرتا ہوا زمین میں دھنس جاتا تھا۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اسے سخت کھجلی ہونے لگتی اور کھجاتے ہی جلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ خود ابرھہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ عطاء بن یسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ ابرھہ بھی بلادِ خثعم میں پہنچ کر مرا۔

یہ واقعہ ۵۷۰ء میں محرم کے مہینے میں پیش آیا۔ اور اسی سال ربیع الاول میں رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ اکثریت کا خیال یہ ہے کہ آپؐ کی ولادت اور اس واقعہ میں ۵۰ دن کا فاصلہ ہے۔ اس واقعہ کی وجہ سے اس سال کو عام الفیل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مقصود اس واقعہ کو بیان کرنے سے یہ ہے کہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں ابھی تک مکے میں موجود ہیں۔ اور ان کی روایات سے بچہ بچہ اس واقعہ سے آگاہ ہے۔ اور سب لوگ اس پر متفق ہیں کہ ابرھہ کے اس حملے سے کعبہ کی حفاظت کسی دیوی یا دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اور وہ قریش جو بتوں کی پرستش کرتے تھے انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد کو دیکھ لینے کے بعد چند سال تک قریش نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کی۔ اس واقعہ کی شہرت کی وجہ سے صرف اس واقعہ کا حوالہ دے دینا کافی تھا، کسی تفصیل کی حاجت نہ تھی۔ اور یہ یاد دلا دینا کافی تھا کہ نبی کریم ﷺ آج جس توحید کی دعوت دے رہے ہیں وہ آخر اس کے سوا کیا ہے کہ تمام دوسرے معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ قریش کو سوچنا چاہیے کہ ان کا طرزِ عمل کیا ابرھہ کے حق میں جاتا ہے یا اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہے۔ جس نے غیر معمولی طور پر قریش کی مدد فرمائی اور اپنے گھر کی حفاظت کی۔ اور اس بات کا بھی قریش کو جائزہ لے لینا چاہیے کہ اگر انہوں نے دعوتِ حق کے مقابلے میں اپنا رویہ نہ بدلا تو کیا عجب ہے کہ پھر اصحابُ الفیل کی تاریخ دہرائی جائے۔

Marfat.com

آيَاتُهَا ۵	سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ (۱۰۵)	رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ
فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ
بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵

رکوع: ا۔ (کیاتم نے دیکھانہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ ۱) کیااس نے ان کی تدبیر کواکارت نہیں کردیا۔ ۲) اوران پرجھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے۔ ۳) جوپھینکتے تھے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر۔ ۴) پھراللہ نے ان کوکھائے ہوئے بھس کی طرح کردیا۔ ۵)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱

(کیاتم نے دیکھانہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ ۱)

خطاب کی نوعیت

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی بات اس کا اسلوبِ خطاب ہے۔خطاب صیغۂ واحد سے کیا گیا ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس کے مخاطب ہیں۔لیکن حقیقت میں ایسانہیں، کیونکہ جس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے اس کا ہدف آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی نہیں بلکہ وہ تمام لوگ ہیں جو آنحضرت ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے سے گریزاں ہیں۔رہی یہ بات کہ خطاب کے الفاظ واحد کا مفہوم ادا کرتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خطاب کسی ایک ذات کو کیا جارہا ہے،لیکن مضمون کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا

Marfat.com

ہے کہ خطاب لفظاً واحد ہے لیکن معنی کے اعتبار سے جمع ہے۔اور یہ طرزِ خطاب قرآنِ کریم نے اور بھی متعدد مواقع پر استعمال کیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ خطاب تو سب کو کیا جارہا ہے لیکن واحد کا لفظ لا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ اس سے مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو فرداً فرداً متوجہ کرنا ہے۔دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کیا تم نے نہیں دیکھا۔دیکھنے سے مراد کسی واقعہ کے یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور مراد اس کی وہ شہرتِ عام ہوتی ہے جس نے لوگوں نے اندر یقین کی کیفیت پیدا کی ہوتی ہے۔یہاں بھی یہی کہا جارہا ہے کہ جس واقعہ کی طرف ہم اشارہ کررہے ہیں وہ واقعہ اس قدر مشہور و معروف ہے کہ عرب کے عام لوگ بھی اس سے آگاہ ہیں اور ان میں بہت سے ایسے لوگ زندہ موجود ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ابرھہ اور اس کے لشکر کی تباہی دیکھی۔پھر ان کی متواتر روایات سے ان لوگوں تک یقین کی دولت پہنچی جنہوں نے بچشمِ سر اس واقعہ کو دیکھا تھا۔اور ہم اس سے پہلے خلاصہ میں بھی عرض کرچکے ہیں کہ اس واقعہ کے ۵۰ دن کے بعد آنحضرت ﷺ کی ولادت ہوئی اور عہدِ نبوت کے ابتدائی سالوں میں یہ سورۃ نازل ہورہی ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سورۃ کے نزول کے وقت اس واقعہ کو بیتے ہوئے چوالیس پینتالیس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرتا۔

اصحابُ الفیل کون تھے؟

یہ عظیم واقعہ جن لوگوں کے ساتھ پیش آیا قرآنِ کریم نے ان کی تفصیل بیان کرنے کی بجائے اصحابُ الفیل کہہ کر ان کی طرف اشارہ کردیا ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ اصحابُ الفیل ہی کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور اس سال کو عام الفیل کہا جاتا تھا جس سال میں یہ واقعہ پیش آیا ہے۔اور لوگ ان ہی حوالوں سے اس واقعہ کی ایک ایک خبر کو ذہنوں میں محفوظ رکھے ہوئے تھے۔اس لئے جیسے ہی قرآنِ کریم نے اصحابُ الفیل کی طرف توجہ دلائی تو کسی کیلئے یہ کہنے کا موقع نہ رہا کہ یہ لوگ کون تھے۔کیونکہ مشاہدہ کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ابھی تک موجود تھی جن کی روایت در روایت نے پورے ملک کو اس واقعہ سے آگاہ کررکھا تھا۔

اصحابُ الفیل کے نام سے یہ بات تو معلوم ہوجاتی ہے کہ اس لشکر کے ساتھ ہاتھی بھی تھے۔اور عربوں کیلئے یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے کسی لشکر کے ساتھ ہاتھیوں کو بھی دیکھا تھا۔ورنہ وہ اس جانور کے نام سے واقف تو تھے لیکن اس کے اس کردار سے واقف نہ تھے۔لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی تعداد کیا تھی۔ہاتھی ایک تھا یا زیادہ۔لیکن جتنی روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں ۹ یا ۱۳ ہاتھیوں کا ذکر ہے۔اور اصحاب کے لفظ سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔کیونکہ ہاتھی کو چلانے والا ایک ہی ہوتا ہے۔اور جب ایک سے زیادہ لوگوں کا تذکرہ ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھی ایک سے زیادہ تھے۔اس لئے جن مؤرخین نے ۹ یا ۱۳ کی تعداد کا ذکر کیا ہے وہ زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتا ہے۔

اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ۝۲

(کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کردیا۔ ۲)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے ابرھہ کی تدبیروں کو ناکام کر دیا

کَید کا لفظ کسی شخص کو نقصان پہنچانے کیلئے ظاہر تدبیر پر بھی بولا جاتا ہے اور خفیہ تدبیر پر بھی۔ یہاں دونوں ہی معنی مراد معلوم ہوتے ہیں۔ ابرھہ کی ظاہر تدبیر تو یہ تھی کہ وہ ۶۰ ہزار کا عظیم لشکر کئی ہاتھیوں کے ساتھ لے کر مکہ پر حملہ آور ہوا۔ اور اس نے روانہ ہونے سے پہلے صاف صاف اعلان کیا کہ وہ کعبہ کو ڈھانے جا رہا ہے اور کسی قیمت پر بھی اسے مسمار کئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ البتہ جس چیز کو اس نے اس کا محرک قرار دیا وہ ظاہر نہیں بلکہ خفیہ تھی۔ اس کے اشتعال کی ظاہر وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے صنعاء میں جو کلیسا بنایا تھا عرب کے چند نوجوانوں نے اسے آگ لگا دی تھی۔ لیکن عربوں کے مزاج اور ان کی روایات کو دیکھتے ہوئے یہ بات قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ عرب چھپ کر وار کرنا نہیں بلکہ مردانہ وار لڑنا جانتے تھے۔ وہ تلوار کے دھنی تھے اس لئے بزدلوں والی حرکتیں ان سے بہت بعید معلوم ہوتی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے اور جو قرینِ قیاس بھی معلوم ہوتی ہے کہ ابرھہ نے یہ حرکت اپنے آدمیوں سے کروائی اور پھر اسے بہانہ بنا کر عربوں پر حملہ آور ہو گیا۔ اور دوسری خفیہ تدبیر جس کا اس نے اظہار تک نہیں ہونے دیا وہ یہ تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر قریش کو کچل کر اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتا تھا جو جنوبِ عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔ حبشہ کی حکومت اور رومی حکومت کی سابقہ تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تمام تدبیریں ناکام اور اکارت کر دیں۔ یہ لوگ طاقت کے بل بوتے پر کعبہ کو ڈھانے کیلئے آگے بڑھے اور بظاہر ان کے سامنے کوئی طاقت نہ تھی جو ان کو روک سکے۔ قریش ان کی طاقت سے مرعوب ہو کر پہاڑوں پر جا چڑھے تھے۔ دور دور تک کوئی قوت ان کے راستے میں حائل ہونے والی نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام تدبیروں کو اس طرح ناکام بنایا کہ خود ان کا وجود بھی اس میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ سارا لشکر تباہ ہو گیا اور تین چار سال میں حبشی اقتدار کا یمن سے ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا۔

وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳

(اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے۔ ۳)

ابابیل کا مفہوم

ابرھہ کا لشکر جیسے ہی آگے بڑھا تو سب سے پہلے تو ان کے سب سے اگلے ہاتھی جس کا نام محمود تھا نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جب بھی اسے آگے بڑھانے کی کوشش کرتے، وہ زمین پر بیٹھ جاتا۔ اور جب کسی دوسری طرف جانے کا اشارہ کرتے تو وہ اٹھ کر بھاگنے لگتا۔ ابھی اسی کشمکش میں تھے کہ مختلف سمتوں سے ان کی طرف پرندوں کے لشکر بڑھے۔ ابابیل لفظ جمع کا ہے، مگر اس کا کوئی مفرد مستعمل نہیں ہے۔ یہ کسی خاص جانور کا نام نہیں۔ اردو زبان میں جس خاص قسم کی چڑیا کو ابابیل کہتے ہیں یہاں وہ مراد نہیں۔ عربی زبان میں ابابیل کے معنی ہیں بہت سے متفرق گروہ جو پے در پے مختلف سمتوں سے آئیں۔ عکرمہ اور قتادہ کہتے ہیں یہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بحر احمر کی طرف سے آئے تھے۔ قدیم مفسرین کہتے ہیں کہ اس طرح کے پرندے نہ کبھی پہلے دیکھے گئے اور نہ بعد میں دیکھے گئے۔ یہ نہ نجد کے پرندے تھے، نہ حجاز کے اور نہ تہامہ

Marfat.com

کے۔سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ یہ پرندے کبوتر سے کسی قدر چھوٹے تھے اور کوئی ایسی جنس تھی جو کبھی پہلے نہ دیکھی گئی۔ابنِ عباسؓ کا کہنا ہے کہ ان کی چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کتوں جیسے تھے۔ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا اور پنجوں میں دو دو کنکر تھے۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٤﴾

(جو پھینکتے تھے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر۔ ۴)

سِجِّیْل سے مراد اور اس کی تفصیل

سِجِّیْلٍ یہ لفظ دراصل فارسی کے لفظ سنگ اور گل کا معرب ہے۔اس سے مراد ایسی کنکریاں ہیں جو مٹی کو آگ میں پکانے سے بنتی ہیں۔یعنی ان پرندوں کے پنجوں میں جو پتھر تھے وہ بظاہر تو پکی ہوئی مٹی کے تھے جن میں بظاہر کوئی طاقت والی بات نہ تھی۔لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان میں یہ تاثیر پیدا کر دی گئی تھی کہ کسی طاقتور بندوق کی گولی بھی اس قدر تباہی نہیں مچاتی جس طرح ایک ایک کنکر ہلاکت کا پیغام بن کر رہ گیا تھا۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ ﴿٥﴾

(پھر اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ ۵)

عصف کا مفہوم اور ابرھہ کے لشکر کا انجام

عـــصف بھوسہ کو کہتے ہیں۔اول تو خود بھوسہ ہی منتشر تنکے ہوتے ہیں پھر جبکہ اس کو کسی جانور نے جبا بھی لیا ہو، تو وہ تنکے بھی اپنے حال پر نہیں رہتے۔ابرھہ کے لشکر میں جس پر یہ کنکر پڑی تھی اس کا یہی حال ہو گیا تھا کہ پہلے ان کی کھال جھڑتی تھی، پھر گوشت پگھلتا تھا اور پھر ہڈیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتی تھیں۔اس طرح انسانی جسم بکھر کر رہ جاتا تھا اور بالکل ایسا لگتا تھا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے جو ان کے منہ سے گر گیا ہو۔یہ انجام تھا ان لوگوں کا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے گھر کو مسمار کرنا چاہا۔قریش تاریخ کے اس آئینہ میں اپنے ساتھ ہونے والے انجام کو دیکھ سکتے ہیں کہ اگر انہوں نے دعوتِ حق کو قبول نہ کیا اور ہر ممکن مخالفت سے اس دعوت کا راستہ روکا اور اللہ تعالیٰ کے رسولِ امین کو قتل کرنے کے منصوبے باندھے تو کوئی بڑی بات نہیں کہ ایک دن وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں جس سے ابرھہ کا لشکر دوچار ہوا تھا۔

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ قُرَیْشٍ

(۱۰۶)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام قُرَيْش ہے۔ یہ اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور چار آیتیں ہیں اور اس کے کلمات کی تعداد ۱۷ اور حروف کی تعداد ۷۳ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ ضحاک اور کلبی کے سوا کسی بڑے مفسر نے اس سورۃ کے مکی ہونے سے اختلاف نہیں کیا، بلکہ سب اس پر متفق ہیں۔ مفسرین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اس کا نزول مکہ مکرمہ میں سورۃ الفیل کے بعد جلد ہی ہوا ہے۔ مضمون کی یگانگت اور کلمات کا باہمی تعلق بھی اسی قول کی تائید کرتا ہے۔ اسی مناسبت کی بنا پر سلف میں سے بعض بزرگ اس بات کے قائل ہوئے کہ یہ دونوں الگ الگ سورتیں نہیں بلکہ ایک ہی سورۃ ہے، لیکن یہ رائے صحیح نہیں۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ نے قرآنِ مجید کے جو نسخے سرکاری طور پر لکھوا کر بلادِ اسلام کے مراکز میں بھجوائے تھے ان میں دونوں کو الگ الگ سورۃ کے طور پر لکھا گیا تھا۔ کیونکہ دونوں کے درمیان بسم اللہ درج ہے اور یہ دونوں کے الگ الگ سورۃ ہونے پر دلیل ہے۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں قرآنِ کریم کا جو نسخہ تیار ہوا تھا وہ ان کی ذاتی رائے پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کی ہر بات پر صحابہ کرام کا اجماع بھی تھا۔

اس سورۃ میں پروردگار نے قریش پر اپنے احسانات کا تذکرہ فرمانے کے بعد اپنے رب کریم کی عبادت کی دعوت دی ہے۔ وہ احسانات کیا ہیں جن کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے ان کو جاننے کیلئے ضروری ہے کہ اس سورۃ کا تاریخی پس منظر اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

تاریخی پس منظر

قریش عرب کا ایک مشہور اور معزز ترین قبیلہ ہے۔ اس کا اطلاق نضر کی اولاد پر ہوتا ہے جس کا نسب نامہ یہ ہے نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر۔ بعض علماء کے نزدیک نضر کے پوتے فہد بن مالک کی اولاد کو قریش کہا جاتا ہے۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ قریش کا اطلاق نضر کی اولاد پر ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے بعض ارشادات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ تاریخی حوادث نے اس قبیلے میں انتشار پیدا کیا اور یہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر حجاز کی وسعتوں میں پھیل گیا۔ اس کا یہ انتشار اور مختلف علاقوں میں پھیلنا آنحضرت ﷺ کے جدِ اعلیٰ قصی بن کلاب کے زمانے تک جاری رہا۔ قصی پہلے شخص ہیں جنہوں نے سارے قبیلے کو جو حجاز میں منتشر تھا مکے میں جمع کیا۔ اور پھر بیت اللہ کی تولیت اس قبیلے کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس بنا پر قصی کو مجمع (جمع کرنے والا) کا لقب دیا گیا ہے۔ قصی نے اپنے اعلیٰ درجے کے تدبر

Marfat.com

سے مکہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی۔ قصی کے دو نامور فرزند ہوئے۔ چنانچہ قصی کے بعد ان کے دونوں فرزندوں یعنی عبد مناف اور عبدالدار کے درمیان مکہ کی ریاست کے مناصب تقسیم ہوگئے، مگر دونوں میں سے عبد مناف کو اپنے باپ ہی کے زمانے میں زیادہ ناموری حاصل ہو چکی تھی اور عرب میں اس کا شرف تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ عبد مناف کے چار فرزند تھے ہاشم، عبد شمس، مطلب اور نوفل۔ چاروں بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان میں سے ہاشم جو رسول اللہ ﷺ کے پردادا تھے کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تاکہ راستے کے قبائل ان سے مال خریدیں اور مکے کی منڈی میں اندرون ملک کے تجار خریداری کیلئے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستے سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اس لئے جنوبی عرب سے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ قریش کو کعبہ کے متولی ہونے اور حجاز کی خدمت کی وجہ سے عرب بھر میں احترام کا درجہ حاصل تھا۔ اور اپنی بے لوث خدمت کے باعث عرب کے تمام لوگ ان کے احسان مند تھے۔ اس احترام کی وجہ سے قریش کے قافلے پر کوئی حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا اور نہ راستے کے قبائل ان سے رہ گزر کے وہ بھاری ٹیکس وصول کرتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کئے جاتے تھے۔ ہاشم نے ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے ایک دور رس فیصلہ کیا کہ ہمیں ان تجارتی راستوں پر تجارت کی سہولتیں حاصل کرنے کا انتظام کرنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے تجارت کی ایک سکیم بنائی اور اپنی اس سکیم میں اپنے باقی تینوں بھائیوں کو بھی شامل کیا۔ ہاشم نے شام کے غسانی بادشاہ سے تجارتی مراعات حاصل کیں، عبد شمس نے حبش کے بادشاہ سے اور مطلب نے یمنی امراء سے اور نوفل نے عراق و فارس کی حکومتوں سے تجارتی مراعات اور اجازت نامے حاصل کئے۔ اس طرح انہوں نے حکومتوں کی سطح پر بھی اپنا ایک مقام بنایا اور عرب عوام کے دلوں میں احترام کا مقام وہ پہلے ہی حاصل کر چکے تھے۔ ان ہی روابط کے باعث ان کو اصحاب الایلاف بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہاشم نے اپنے قبیلہ کے ہر خاندان کو تجارت کرنے کی ترغیب دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش سردیوں میں یمن کی طرف اور گرمیوں میں شام کی طرف تجارتی سفر کرتے تھے اور ان کے قافلے بحرِ احمر کی مشرقی بندرگاہوں سے مشرقی ممالک کا آیا ہوا مال اٹھاتے اور اسے شام اور مصر تک پہنچاتے۔ پھر اسی طرح شام سے مال اٹھاتے اور یمن کی بندرگاہوں پر پہنچاتے۔ اس کاروبارِ تجارت سے انہیں جتنا نفع حاصل ہوتا وہ امیر و غریب آپس میں برابر تقسیم کر لیتے۔ اس سے چند ہی سالوں میں سارے قریش کی مالی حالت بہت بہتر ہوگئی۔

مختلف ممالک کے تجارتی سفروں کی وجہ سے ان کے صرف مالی حالات ہی بہتر نہ ہوئے بلکہ انہیں شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث ان کا معیارِ دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ ان کی ٹکر کا نہ رہا۔ انہی وجوہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قریش باقی لوگوں کے لیڈر ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا کہ پہلے عرب کی سرداری قبیلہ حمیر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے سلب کر کے قریش کو دے دی۔ قریش کی ترقی کا سفر جاری تھا کہ ابرھہ نے انہی تجارتی راستوں پر قبضہ کرنے کیلئے اپنے کلیسا کی توہین کا بدلہ لینے کیلئے ایک بہانہ بنایا اور مکہ پر چڑھائی کر دی۔ مقصود صرف یہ تھا کہ اگر قبلہ کو گرا دیا جائے اور عرب اس کو بچا نہ سکیں تو جس سبب سے قریش کو راستوں کا امن

Marfat.com

حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گا اور اس طرح سے تجارتی راستے ان کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ اور اگر وہ مشتعل ہو کر میدان میں نکل آئیں تو انہیں تباہ کرنے کا ایک موقع مل جائے گا جس سے پورے عرب میں ان کی دھاک بھی ختم ہو جائے گی اور انفرادی قوت بھی ماری جائے گی اور اس طرح سے حبش اور رومی حکومت عرب کے تمام علاقوں پر اپنا قبضہ جما لے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ابرھہ اور اس کے لشکر کو تباہ کر کے قریش کی نہ صرف زندگی کا سامان کیا بلکہ ان کے تجارتی کاروبار کے فروغ کے امکانات بھی مزید روشن کر دیئے۔ یہ وہ احسانات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قریش اور اہلِ مکہ پر کیے۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ جس طرح انہوں نے کعبہ کو بچانے کیلئے ایک اللہ سے دعائیں مانگی تھیں اور اپنے کسی بت کے سامنے دستِ دعا نہیں پھیلایا تھا اور پھر سات سال تک انہوں نے ایک ہی اللہ کی پوجا کی تھی، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس گھر کے رب کی دل و جان سے عبادت کرتے جس گھر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سب کچھ عطا کر رکھا ہے۔ چنانچہ ان کی ناشکری پر توجہ دلا کر انہیں صرف ایک اللہ کی عبادت پر ابھارا جا رہا ہے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۴	سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ (۱۰۶)	رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝۲
فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ
وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴

رکوع: ۱۔ (اس لئے کہ اللہ نے قریش کے دلوں میں الفت پیدا کردی۔ ۱) الفت تجارتی سفر کی جاڑے اور گرمی کے موسم میں۔ ۲) اور چاہیئے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ ۳) جس نے انہیں رزق دے کر فاقہ کشی سے نجات بخشی اور ان کو خوف سے امن عطا فرمایا۔ ۴)

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝۲
(اس لئے کہ اللہ نے قریش کے دلوں میں الفت پیدا کردی۔ ۱) الفت تجارتی سفر کی جاڑے اور گرمی کے موسم میں۔ ۲)

ایلاف کا مفہوم اور حرفِ جار کے متعلق کی بحث

پہلی آیت پر حرف لام ترکیب نحوی کے اعتبار سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ کسی سابق فعل سے متعلق ہو یعنی اس کا تعلق کسی سابق مضمون کے ساتھ ہو۔ چنانچہ علماء نے اس کے متعلق کے تعین کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں ایک جملہ محذوف ہے اِنَّا اَهْلَكْنَا اَصْحٰبَ الْفِيْلِ یعنی ہم نے اصحاب الفیل کو اس لئے ہلاک کیا کہ قریشِ مکہ سردی اور گرمی دو سفروں کے عادی تھے۔ ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے، سب کے دلوں میں ان کی عظمت پیدا ہو جائے۔ بعض حضرات کا خیال یہ ہے

Marfat.com

کہ محذوف جملہ اِعْجَبُوْا ہے۔ لیکن علامہ زمخشری لکھتے ہیں یہ الف لام اجلیہ تعلیلیہ ہے اور اس کا متعلق فَلْیَعْبُدُوْا ہے۔ علامہ قرطبی نے بھی اسی توجیہ کو پسند کیا ہے۔ یعنی اس گھر کے پروردگار کی عبادت کریں کیونکہ کسب معاش کیلئے اسی نے ان کے دلوں میں سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کی الفت ومحبت پیدا کی۔

اجمال کے بعد تفصیل

انفرادی اور اجتماعی طور پر انسان کی بنیادی ضرورتیں دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے اپنی بقاء کیلئے جن بنیادی ضرورتوں کی ضرورت ہے اس کے وسائل اسے حاصل ہو جائیں۔ انسان غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کپڑے کے بغیر موسم کی شدت سے نہیں بچ سکتا اور حیاء کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ اور گھر کی چھت کے بغیر آسودہ اور مہذب زندگی نصیب نہیں ہوسکتی۔ اور کہیں آنے جانے کیلئے ایسی سواری بہت ضروری ہے جس کے بغیر آنے جانے کی ضرورت پوری نہ ہوسکتی ہو۔ ان تمام چیزوں کا تعلق کسب واکتساب کے وسائل سے ہے۔ یعنی جن ذریعوں سے کمائی کی جاسکتی اور یہ ضرورتیں حاصل کی جاسکتی ہیں اور ان ذرائع پر تمام انسانوں کو بقدرِ ہمت اور بقدرِ ضرورت رسائی حاصل ہو۔

دوسری چیز جو متذکرہ بالا چیز کی طرح ضروری ہے وہ یہ ہے کہ گھر، شہر اور ملک میں امن حاصل ہو۔ گھر میں رہتے ہوئے کوئی کھٹکا نہ ہو، باہر نکلتے ہوئے کوئی اندیشہ نہ ہو اور تجارتی قافلوں پر یا اِکا دُکا آنے جانے والوں پر کسی حملے کا ڈر نہ ہو۔ اگر کسی معاشرے میں دولت کی فراوانی اور رزق کی بہتات ہے لیکن وہ معاشرہ امن کی دولت سے محروم ہے نہ اس کی جان سلامت ہے اور نہ اس کا مال، نہ اس کی عزت کو تحفظ حاصل ہے اور نہ اس کے دل کے سکون کیلئے کوئی ضمانت ہے۔ تو ایسا معاشرہ سب کچھ رکھتے ہوئے بھی بالکل تہی دامن ہے۔ مکے اور دوسرے بلاد میں انہی دونوں چیزوں کا فقدان تھا۔ نہ وہاں زراعت ممکن تھی اور نہ وہاں پھلوں کی کثرت تھی۔ بدامنی کی وجہ سے نہ گھر سلامت تھے نہ شہر اور نہ کوئی راستہ محفوظ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے اہلِ مکہ کو دونوں نعمتیں عطا فرمائیں۔ حصولِ رزق کیلئے ان کے اندر تجارت کا شوق پیدا کیا۔ لمبے لمبے سفروں سے انہیں مانوس کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے تمام ممالک کی دولت ان کے شہروں میں جمع ہوگئی۔ ہر طرح کا پھل اور ہر طرح کا غلہ وہاں پہنچنے لگا۔ دولت کی فراوانی ہوگئی، غربت کم ہوتی گئی اور امارت بڑھتی گئی۔ لیکن اس راستے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ تھی ملک کے اندر بدامنی۔ اللہ تعالیٰ نے قریش پر یہ احسان کیا کہ بیت اللہ کی تولیت کے باعث اور حجاز کی خدمت کی وجہ سے تمام عرب قبائل کے دلوں میں ان کا احترام پیدا کردیا۔ اشہر حرم کے سوا ملک کے اندر بھی کوئی سفر کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، کیونکہ راستے میں قافلے لوٹ لئے جاتے تھے۔ لیکن بیت اللہ کے احترام کی وجہ سے قریش کے قافلے پر کوئی قبیلہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ نہ راستوں کے ٹیکس وصول کرنے کی کسی میں جرأت تھی۔ بلکہ جب کسی قبیلے کو پتہ چلتا کہ قریش کا قافلہ جا رہا ہے تو وہ ان کیلئے بدرقہ مہیا کرتے۔ اور اگر کوئی اکیلا دوکیلا قریشی بھی ان راہوں سے گزرتا تو لوگ یہ سن کر کہ میں حرم کا رہنے والا ہوں یا میں قریشی ہوں تو اسے لوٹنے کی بجائے تحفظ مہیا کرتے تھے۔ تو قریش کی تجارتی اسفار کے ساتھ دلبستگی اور گرمیوں میں ان کا سرد علاقوں کا سفر یعنی شام اور فلسطین کا اور گرمیوں میں گرم ملکوں کا سفر یعنی یمن وغیرہ کی طرف سفر کا ان کو خوگر بنا دینا یہ اللہ تعالیٰ کا وہ احسان ہے جسے انہیں کبھی نہیں بھولنا چاہئے تھا۔

Marfat.com

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾

(اور چاہیئے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ ۳)

اللہ تعالیٰ کے احسان کا حق

یعنی اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان کا کم سے کم تقاضا یہ تھا کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔ ابرھہ کے حملہ کے وقت وہ خود اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مصیبت میں کوئی کام آنے والا نہیں۔ اور وہی رب ہے ہمارا بھی اور اس گھر کا بھی۔ اس لئے ہمیں بھی وہی بچائے گا اور اس گھر کی بھی وہی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اصحاب الفیل کے حملے سے بچا کر اور اس کی وجہ سے اہلِ عرب کے دلوں میں ان کے احترام کو مزید بڑھا کر یہ ثابت کر دیا کہ تم اپنی زندگی کی بقاء اور اپنے تجارتی سفروں کے تمام تر فوائد کے حصول میں اگر کسی کے مرہونِ منت ہو تو وہ صرف اس رب کی ذات ہے جو اس گھر کا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔

الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

(جس نے انہیں رزق دے کر فاقہ کشی سے نجات بخشی اور ان کو خوف سے امن عطا فرمایا۔ ۴)

متذکرہ بالا احسان کا نتیجہ

یعنی قریش کے دلوں میں سردیوں اور گرمیوں میں سفر کا شوق پیدا فرما کر انہیں تجارت کا خوگر بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ منتشر تھے تو بھوکوں مر رہے تھے لیکن مکے میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر رزق کے دروازے کھول دیئے اور تجارت کرنے کے نتیجے میں ان پر دولت برسنے لگی۔ مزید یہ کہ پورا عرب بدامنی کا جہنم بنا ہوا تھا، کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکیں، کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے قبیلے کے باہر قدم رکھنے کی ہمت کر سکے، کوئی قافلہ ایسا نہ تھا جو اطمینان سے سفر کر سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قریش کو اپنے اس گھر کی برکت سے ہر طرح کی بدامنی سے امن عطا فرمایا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے سورۃ القصص میں ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کیلئے ایک مامون حرم برپا نہیں کیا جس کی طرف ہر قسم کی پیداواریں کھنچی چلی آتی ہیں۔ اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کیلئے ایک مامون حرم بنایا اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ان کے اردگرد سے اچک لئے جاتے ہیں۔''

فائدہ:۔ ابوالحسن قزوینی نے فرمایا کہ جس شخص کو کسی دشمن یا کسی مصیبت کا خوف ہو اس کیلئے یہ سورۃ پڑھنا امان ہے۔ اس کو امام جزری نے نقل کر کے فرمایا کہ یہ عمل آزمودہ اور مجرب ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں اس کو نقل کر کے فرمایا کہ مجھے میرے شیخ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے خوف و خطر کے وقت اس سورۃ کے پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہر بلا اور مصیبت کو دفع کرنے کیلئے اس کا پڑھنا مجرب ہے۔ حضرت قاضی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں نے بھی بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ
کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْمَاعُوْنِ

(۱۰۷)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْمَاعُوْنِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْمَاعُوْنِ ہے جو اس سورۃ کا آخری لفظ ہے۔اس کی ۷ آیتیں،ایک رکوع،۲۵ کلمات اور ۱۲۵ احروف ہیں۔

زمانہ نزول:۔ اس کے زمانہ نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔ابو حیان نے البحر المحیط میں ابن عباس،قتادہ اور ضحاک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اس لئے مدنی ہے۔لیکن جمہور کے نزدیک یہ سورۃ مدنی نہیں بلکہ مکی ہے اور اس کا اندازِ بیان اور مضمون خود اس بات پر شاہد ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور اس میں قریش کے بڑے بڑے لوگوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔رہی یہ بات کہ سلف میں سے بعض لوگوں نے اسے مدنی قرار دیا ہے اور جدید محققین میں سے بھی بعض اہلِ علم کی یہ رائے ہے تو اس کی وجہ دراصل ایک غلط فہمی ہے، وہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں ان نماز پڑھنے والوں کو تباہی اور ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے اور دکھاوے کیلئے نماز پڑھتے تھے۔ایسی نماز ظاہر ہے کہ منافقین کی تھی،صحابہ کرام اور مخلص مسلمانوں سے ایسی نماز کی امید نہیں کی جاسکتی۔اور منافقین کا وجود مکے میں نہیں بلکہ مدینہ میں پایا جاتا تھا کیونکہ وہ لوگ دل سے اسلامی حقائق پر یقین نہیں رکھتے تھے محض اس خیال سے نمازوں میں شریک ہوتے تا کہ صحابہ انہیں مخلص مسلمان سمجھیں اور ہر معاملے میں ان پر اعتماد کریں اور اس طرح سے انہیں معاشرتی حقوق میسر رہیں۔لیکن مکہ معظمہ میں منافقین کی یہ قسم نہیں پائی جاتی تھی کیونکہ وہاں اس کی ضرورت نہ تھی۔وہاں تو جو شخص ایمان لاتا اور دوسروں کے سامنے نماز پڑھنے کی کوشش کرتا اسے اس کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی۔ایسا شخص جو دل سے مسلمان نہیں وہ محض سزا کے شوق میں ایمان لانے کی غلطی تو نہیں کرسکتا۔اس وجہ سے بعض اہلِ علم کو خیال ہوا یہ سورۃ مدنی ہے۔اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ اس سے انہوں نے وہ نماز مراد لی ہے جس کا حکم اسلام نے دیا ہے۔ظاہر ہے کہ وہ نماز تو صرف مسلمان ہی پڑھتے ہیں اور پورے آداب کے ساتھ پڑھتے ہیں۔لیکن جو شخص دل سے مومن نہیں اور حالات کا جبر بھی اسے نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کرتا تو اسے کیا پڑی ہے کہ وہ دکھاوے کیلئے نماز پڑھے۔حقیقت یہ ہے کہ یہاں جس نماز کا ذکر کیا گیا ہے اور جن نمازیوں کیلئے وعید سنائی گئی ہے یہ دراصل وہ نماز ہے جس کے قیام کا حکم حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذرّیت کو بیت اللہ کی تعمیر کے ساتھ ہی دیا گیا تھا۔اور اسی کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا بھی فرمائی تھی۔ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراہیم:۱۴:۳۷) ’’اے ہمارے رب!میں نے اپنی ذرّیت میں سے بعض کو ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے،اے ہمارے رب!تا کہ یہ نماز کا اہتمام کریں۔‘‘ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نماز کے قیام و اہتمام

Marfat.com

کا فریضہ جس طرح ادا فرمایا اس کی شہادت قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ وَكَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ''اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔'' بعد میں آنے والے لوگوں نے اس نماز کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا جس کا قرآنِ کریم نے بعض مواقع پر ذکر فرمایا۔ لیکن نماز کا تصور ان میں ضرور موجود رہا۔ چنانچہ قریش کے سربرآوردہ لوگ، لوگوں پر اپنی نیکی کا رعب جمانے کیلئے بعض دفعہ وہ نماز پڑھتے تھے جس کا طریقہ بھی بگڑ چکا تھا اور جس کی روح بھی بالکل مر چکی تھی۔ یہاں اسی نماز پر تنقید فرمائی گئی ہے۔ اس صورتحال کو سامنے رکھا جائے تو پھر یہ خلجان دور ہو جاتا ہے کہ یہ سورۃ شاید مدنی ہو۔

مضامین:۔ اس سورۃ میں ان لوگوں کے اخلاق و کردار کی تصویر کشی کی گئی ہے جو روزِ جزاء پر ایمان نہیں رکھتے۔ آخرت اور روزِ جزاء کے جھٹلانے کے نتیجے میں جس طرح کے رزائلِ قبیحہ ان کے اندر پیدا ہو گئے تھے ان کا ذکر کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ آخرت کے انکار سے ایسے ہی اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں خاص طور پر قریش کے ایک بڑے آدمی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ہوسِ زر کے نتیجے میں ایسے برے اخلاق کا حامل بن چکا تھا۔ مثلاً وہ یتیموں کو دھکے دے کر اپنے ہاں سے نکال دیتا اور یتیم اور فاقہ کشوں پر نہ خود رحم کھاتا اور نہ دوسرے لوگوں کو ان کی اعانت کی ترغیب دیتا تھا۔ پھر اس کے بعد ان لوگوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے جو بیت اللہ میں آ کر بظاہر نماز کی رسم تو ادا کرتے، لیکن ان کی نماز بالکل بے روح محض ایک قسم کی ایکٹنگ ہوتی۔ اور پیشِ نظر صرف یہ ہوتا کہ لوگوں کو اپنی نمازوں سے یہ تأثر دیا جائے کہ ہم کس قدر اللہ تعالیٰ سے لو لگانے والے لوگ ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کی خست کا حال یہ تھا کہ انفاق تو درکنار روزمرہ ضروریاتِ زندگی کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی کوئی مانگ بیٹھے تو وہ بھی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ بیت اللہ کی تعمیر کے دو ہی مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مرکز ہو اور دوسرا یہ کہ وہ فقراء اور یتامیٰ کی ہمدردی اور خدمت کا ایک مؤثر ادارہ ہو۔ لیکن کعبہ کے متولیوں نے ان دنوں مقاصد کو ضائع کر کے رکھ دیا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۷	سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ (۱۰۷)	رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴
الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶
وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷

رکوع: ۱۔ (تم نے دیکھا اس شخص کو جو (آخرت کی) جزاء وسزا کو جھٹلاتا ہے۔ ۱) (اور یہی وہ (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ ۲) اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں ابھارتا۔ ۳) پس خرابی ہے ان نماز پڑھنے والوں کیلئے۔ ۴) جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ ۵) جو ریاکاری کرتے ہیں۔ ۶) اور معمولی ضرورت کی چیزیں (مانگے بھی) نہیں دیتے۔ ۷)

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱

(تم نے دیکھا اس شخص کو جو (آخرت کی) جزاء وسزا کو جھٹلاتا ہے۔ ۱)

آیت میں خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن حقیقت میں یہ خطاب ہر اس آدمی سے ہے جو عقل رکھتا ہے اور جس کے اندر نصیحت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ اور پھر یہاں دیکھنے سے مراد آنکھوں سے دیکھنا بھی ہے اور جاننا، سمجھنا اور غور کرنا بھی ہے۔ یہ اسلوب کسی کی طرف تعجب اور نفرت کے ساتھ متوجہ کرنے کیلئے آتا ہے۔ اور الدِّین کا معنی جزاء وسزا بھی ہے اور وہ نظامِ زندگی بھی جس کو اسلام کہتے ہیں۔ یہاں دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ تعجب سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم نے دیکھا ہے اس شخص کو جو دین کو جھٹلاتا ہے یا نفرت کے اظہار کیلئے کہا جا رہا ہے کہ تم نے اس شخص کو دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اسلام بطورِ نظامِ زندگی کا انکار یا آخرت کا انکار انسان کے اندر کیسے برے اخلاق پیدا کرتا ہے۔

Marfat.com

فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ﴿۲﴾

(اور یہی وہ (بد بخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ ۲)

قیامت کی تکذیب والوں کے اخلاق

آیت کے شروع میں فَا کا لفظ یہ بتلاتا ہے کہ یہ جملہ جزائیہ ہے اور اس سے پہلے جملہ شرطیہ محذوف ہے۔ تقدیرِ کلام یوں ہوگی هَلْ عَرَفْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالْجَزَاءِ اَوْ بِالْاِسْلَامِ اِنْ لَمْ تَعْرِفْهُ فَذٰلِکَ الَّذِیْ ''یعنی جو روزِ جزاء یا دینِ اسلام کا منکر ہے اگر تم اس کی حالت کو جانتے ہو تو فبھا۔ اور اگر نہیں جانتے ہو تو اب جان لو کہ اس کی اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی یتیم اس کے ہاں رحمت و شفقت کا خواستگار بن کر آتا ہے تو اس کو اس کی خستہ حالی پر ذرا ترس نہیں آتا، وہ یتیم کو بجائے اس کی میراث کا حق دینے کے میراث سے بے دخل کر کے اسے دھکے دے کر نکال دیتا ہے۔ اور اگر یتیم اس سے مدد مانگنے کیلئے آتا ہے تو مدد کرنے کی بجائے اسے دھتکار دیتا ہے۔ اور اگر وہ اپنی انتہائی مجبوری کے باعث امید طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھڑا رہتا ہے تو اسے دھکے دے کر نکال دیتا ہے۔ اور اگر اس کا بس چلے تو وہ یتیم پر ظلم ڈھانے سے بھی باز نہیں آتا۔ اور اس کی اس سنگدلی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسے اس بات کا کوئی کھٹکا نہیں کہ قیامت آئے گی اور اسے اپنے ان مظالم اور ان حرکتوں کا جواب دینا پڑے گا۔ اس سلسلے میں قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب اعلام النبوۃ میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اس حالت میں اس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ نہ دی، اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اس سے کہا کہ محمد (ﷺ) کے پاس جا کر شکایت کر۔ وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بیچارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے؟ اور یہ بدبخت کس غرض کیلئے اسے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپ سے بیان کیا۔ آپ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپ کو دیکھ کر اس نے آپ کا استقبال کیا اور جب آپ نے فرمایا اس بچے کا حق ادا کر دو تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزیدار جھڑپ کی امید کر رہے تھے۔ مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (ﷺ) کے

Marfat.com

دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا، اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کیخلاف حرکت کی۔ اس واقعہ سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معزز قبیلے تک کے بڑے بڑے سرداروں کا یتیموں اور دوسرے بے یارومددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپ کے اس اخلاق کا آپ کے بدترین دشمنوں تک پر کیا رعب تھا۔ (تفہیم القرآن)

اسلام نے اس کے برعکس یتیموں اور مسکینوں اور معاشرے کے بے بس لوگوں کے ساتھ جو رویہ رکھنے کی تعلیم دی ہے اسے قرآنِ کریم نے اکرام سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ "ہرگز نہیں بلکہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے۔" اس کا صحیح مفہوم وہ ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبے سے واضح ہوتا ہے۔ "آپ نے کہا ضعیف اس وقت تک سب سے زیادہ قوی اور بااثر ہے جب تک اس کا حق اس کو نہ مل جائے" اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ان لوگوں کی دل سے عزت کرے جن کے حقوق ابھی ملنے ہیں۔ ان کے حقوق کی حمایت کرنا، ان کو ادا کرنے کی تلقین کرنا اور ان کو حاصل کرنے کیلئے سینہ سپر ہونا ہر باحمیت مسلمان کا فرض ہے۔

وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝٣

(اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں ابھارتا۔ ۳)

یعنی اس شخص کا حال یہ ہے کہ کوئی مسکین یا یتیم اس کے دروازے پر جاتا ہے تو وہ اس کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور دوسروں کو بھی وہ مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ ہوسکتا ہے اس کا یہ حال کسی مجبوری کے باعث ہو، لیکن اگر اس کے اندر انسانیت کی کچھ بھی رمق ہے تو وہ یہ تو کرسکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو مفلوک الحال لوگوں کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ترغیب دے، لیکن آخرت کی تکذیب کرنے والا اس آخری صفت سے بھی محروم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں بعض دفعہ وہ اپنی بخیلی پر پردہ رکھنے کیلئے یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی بخیل بنے رہیں تاکہ کوئی شخص ان کو بخیل کہنے والا نہ رہے۔ اور اگر ان کی خواہش کیخلاف کوئی خرچ کرتا ہے تو وہ الٹے سیدھے نام رکھ کر اسے طعن و تشنیع کا ہدف بنالیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خرچ کرنے والا اپنے خرچ پر نادم ہونے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے شاید کوئی غلطی کی ہے۔ لیکن یہ مفہوم اس صورت میں ہے جب طعام المسکین کو اطعام المسکین کے معنی میں لیا جائے۔ راغب نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے۔ لیکن بعض دیگر علماء نے طعام المسکین سے مراد مسکین کی غذا لی ہے۔ یعنی مسکین کے کھانے یا اس کی امداد کیلئے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ درحقیقت مسکین کا حق ہے جو اس کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ گویا یہ دینے والے کی ملکیت نہیں بلکہ لینے والا اس کا مالک ہے۔ دینے والا دے کر کوئی احسان نہیں کر رہا بلکہ اسی کی چیز اس کو لوٹا رہا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہ درحقیقت دینے والے کو اس بات سے روکنا ہے کہ وہ مسکین کو کچھ بھی دے کر احسان دھرنے کا تصور نہ کرے۔ بلکہ یہ سمجھے کہ احسان اس کا ہے جس نے میری مدد کو قبول کرلیا۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝٤ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝٥

(پس خرابی ہے ان نماز پڑھنے والوں کیلئے۔ ۴) جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ ۵)

Marfat.com

قریش کے سربرآوردہ لوگوں کی نمازیں اوران کے اخلاق

یہ بیت اللہ کے پروہتوں اور قریش کے سربرآوردہ لوگوں کی نمازوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔جن لوگوں نے اس سورۃ کو مدنی قرار دیا ہے انہوں نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ یہ منافقین کی نمازوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پھرانہوں نے منافقین کی نمازوں کی کیفیت بیان کی ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی ہے اوراحادیث میں بھی اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔اوراس پراللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا ہے کہ یہاں عَنْ صَلَاتِهِمْ کالفظ آیا ہے فِيْ صَلَاتِهِمْ کالفظ نہیں آیا۔کیونکہ منافق سرے سے نماز کی اہمیت وعظمت اوراس کی فرضیت کے قائل ہی نہیں ہوتے محض مسلمانوں میں اپنی جگہ بنانے کیلئے کبھی مسلمانوں کے اندراور کبھی الگ تھلگ بیگار سمجھ کرنماز پڑھتے ہیں۔اوراگر فِيْ صَلَاتِهِمْ کہاجاتا تو پھرنماز کے اندرجوبھول چوک ہوجاتی ہے اور کبھی آدمی کا خیال نماز سے ہٹ کرکسی اور چیز کی طرف لگ جاتا ہے تو وہ اس سے مراد ہوتا۔اور یہ وہ کوتاہی ہے جو کبھی نہ کبھی ہرشخص سے ہوتی ہے۔پھرانہوں نے اس کی بھی تفصیل بیان کی اوراحادیث سے اس پراستشہاد بھی کیا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے جس میں نماز کی کیفیت بیان نہیں کی گئی بلکہ اشرافِ قریش جولوگوں میں اپنا تقدس باقی رکھنے کیلئے صحنِ حرم میں نماز پڑھا کرتے تھے اس کا ذکر ہے اور یہ وہ نماز تھی جوحضرت اسماعیل علیہ السلام کی امت پرلازم کی گئی تھی۔قریش اس کی حقیقت اوراس کی ہیئت کو یکسر بھول چکے یابدل چکے تھے۔قرآنِ کریم نے بعض جگہ اس کی طرف اشارے کیے ہیں لیکن ان کے نزدیک اس کی اصل صورت کیا تھی اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔بلکہ اس آیت کو اگرتدبر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف نمازوں سے غافل ہی نہیں تھے بلکہ نماز کی اصل صورت کو بھی بھول چکے تھے۔نماز کا تصوران میں باقی تھا اس لئے جوشخص نماز کی کوئی بھی شکل بنالیتا لوگ اس کو ایک اچھا آدمی سمجھتے تھے۔لیکن بالعموم نمازان کی زندگی سے نکل چکی تھی۔اگراس بات کو قبول کرلیا جائے تو پھران تفصیلات کی ضرورت نہیں رہتی جومنافقین کی نمازوں کے سلسلے میں مفسرین نے بیان فرمائی ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦

(جوریاکاری کرتے ہیں۔ ٦)

ان کی نمازیں دکھاوے کی تھیں

یعنی قریش کے نام نہاد متولی جونمازیں پڑھتے تھے وہ درحقیقت لوگوں کو دکھانے کیلئے ہوتی تھیں۔اس سے مقصود لوگوں میں اپنے لئے ایک اچھا تصور پیدا کرنے کی کوشش تھی، اللہ تعالیٰ کی یاد کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔تو جونماز محض دکھاوے کی ہو اس کا مذہب سے کیارشتہ اوراخلاص سے کیا تعلق۔وہ تو محض شہرت اور نیک نامی کے حصول کی ایک کوشش ہے۔اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ قریش کے بڑے لوگ دنیوی جاہ ومرتبت کے سوا اور کسی چیز کے طلبگار نہ تھے۔حالانکہ ان کے جدِامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی اولاد کو کعبہ کے گردوپیش میں بسایا تھا تو اس کا اصل مقصد نماز کا قیام بتایا گیا تھا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست اپنا تعلق قائم کریں اوراللہ تعالیٰ کے گھر کو اللہ تعالیٰ کی یاد اوراس کے دین کا مرکز بنادیں۔

Marfat.com

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴿٧﴾

(اور معمولی ضرورت کی چیزیں (مانگے بھی) نہیں دیتے۔ ۷)

ان کی طبیعتوں کی خست

ماعون کے متعدد معانی بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن علماءِ تفسیر کی کثیر جماعت نے اس کا معنی روزمرہ استعمال کی چیزیں بتایا ہے جو عام طور پر پڑوسی اپنے پڑوسی سے مانگ لیتا ہے۔ ایک ساتھ کام کرنے والے ایک دوسرے سے مانگ لیتے ہیں اور اس میں امیر و غریب کا بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ کسی امیر گھر والے کو بھی کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ اپنے ہمسائے سے مانگ لیتا ہے۔ مثلاً دیا سلائی، ہنڈیا، ڈول، نمک مرچ، کلہاڑی، ترازو، اس طرح کی چیزیں جو ہر گھر کی ضرورت ہیں لیکن بعض دفعہ امیر گھروں میں بھی اچانک ختم ہو جانے کی وجہ سے دوسرے سے مانگنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ایسا کرنا کوئی شخص اپنے لئے عیب نہیں سمجھتا۔ اور جو شخص اس طرح کی معمولی چیز دینے سے بھی انکار کرے معاشرے کی نظروں میں وہ کمینہ اور لئیم کہلاتا ہے۔

نماز کا اہتمام جس طرح آدمی کے تعلق کو اللہ تعالیٰ سے مضبوط کرتا ہے اسی طرح بندوں سے تعلق میں بھی استواری پیدا کرتا ہے۔ اشرافِ قریش جس طرح نماز کی حقیقت کو بھول چکے تھے، اسی طرح وہ انسانی رشتے کو بھی بھلا چکے تھے۔ کسی انسان کی مدد کرنا تو دور کی بات ہے وہ معمولی سے معمولی چیز کو بھی مانگے سے بھی دینے سے گریز کرتے تھے۔ تو جس قوم کے بڑوں کی خست کا یہ عالم ہو اس قوم کی عام اخلاقی حالت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہ آخرت سے انکار کر چکے ہیں۔ جو بھی قوم آخرت سے انکار کرتی ہے اس میں اسی قسم کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ

(۱۰۸)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْكَوْثَر ہے جو اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ اس سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت حسن بصری، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کو مدنی قرار دیتے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ وہ اس کی تائید میں حضرت انسؓ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم حضورؐ کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ اچانک آپؐ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ حضورؐ کا سر مبارک جھک گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تبسم فرماتے ہوئے اپنے سر کو اٹھایا تو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی مجھ پر یہ سورۃ نازل فرمائی ہے۔ پھر بسم اللہ پڑھ کر اس سورۃ کی تلاوت فرمائی۔ حضرت انسؓ چونکہ مدینہ میں تھے تو اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو سورۃ ان کی موجودگی میں نازل ہوئی ہے وہ یقیناً مدنی ہوگی۔ لیکن ابنِ مردویہ نے حضرت ابنِ عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور جمہور مفسرین بھی اسے مکی قرار دیتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ دراصل ایک غلط فہمی ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی مسئلے پر اظہارِ خیال فرما رہے ہیں کہ اچانک آپؐ پر وحی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور پھر آپ کوئی سورۃ یا آیت پڑھتے ہیں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یا سورۃ اس وقت نازل ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کا نزول پہلے ہو چکا ہے، اب صرف وحی کے نزول سے اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس کی تائید فلاں آیت یا سورۃ سے ہوتی ہے۔ اسی کو بعض دفعہ اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں آیت یا فلاں سورۃ دو مرتبہ نازل ہوئی ہے جبکہ حقیقت میں دوسری مرتبہ اس کا نزول ایک آیت یا سورۃ کے طور پر نہیں بلکہ کسی مضمون کی وضاحت کیلئے ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت انسؓ کی ہی روایات سے جنہیں امام احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابنِ جریر نے نقل کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی یہ نہر جسے کوثر کہا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ کو معراج میں دکھائی جا چکی تھی اور سب کو معلوم ہے کہ معراج ہجرت سے پہلے مکہ میں ہوئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ جب معراج میں آپ کو اس عطیہ کی خبر دی جا چکی تھی بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کرا دیا گیا تھا تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کی خوشخبری دینے کیلئے مدینہ طیبہ میں آپ پر سورۃ کوثر نازل کی جاتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر صحابہ کے اجتماع میں آنحضرت ﷺ نے یہ بات فرمائی ہوتی کہ سورۃ الکوثر ابھی مجھ پر نازل ہوئی ہے تو کس طرح ممکن تھا کہ اکابر صحابہ اس سورۃ کو مکی قرار دیتے۔ اور جمہور مفسرین اس کے مکی ہونے کے قائل ہو جاتے۔ حقیقت وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ سورۃ کے طور پر یہ آیات مکہ ہی میں نازل ہوئی ہیں، البتہ مدینہ طیبہ میں کسی بات کی صراحت کیلئے ان آیات کا نزول ہوا ہے۔

Marfat.com

شانِ نزول:۔ تاریخ وسیر کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ مکہ کی سب سے ہردلعزیز شخصیت تھے۔آپ کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی پاکیزگی اور پھر آپ کی بصیرت کا حوالہ دیا جاتا تھا۔لیکن جیسے ہی آپ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا اور توحید کی دعوت دی تو اہلِ مکہ کے تیور بدل گئے اور پوری قوم آپ کی مخالفت کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی۔آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والے چند مٹھی بھر ساتھیوں کو اجتماعی زندگی سے کاٹ ڈالا گیا۔کاروبار کا مقاطعہ کردیا گیا، مجلسی زندگی میں ان کی شمولیت کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔معاشرتی تعلقات یکسر توڑ ڈالے گئے، قرابتداری اور ہمسائیگی کے تعلقات جو عربوں کی عام روایت تھی کو بھی پامال کردیا گیا۔اور آپ کے بڑے بڑے مخالفین بار بار آپس میں یہ کہنے لگے کہ ہمیں محمد (ﷺ) کے اس دین اور اس کی دعوت سے پریشان نہیں ہونا چاہیے یہ چند دنوں کی بات ہے، جیسے ہی اس کے داعی کو آخرت کا سفر کرنا پڑا تو یہ سب کچھ ہوا ہو کر رہ جائے گا اور اس کے بعد اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہوگا۔اس پر مختلف اوقات میں آنحضرت ﷺ کے اطمینان کیلئے مختلف آیات نازل کی گئیں۔سورۃ الضحیٰ میں فرمایا گیا وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ''عنقریب آپ کا رب آپ کو وہ کچھ دے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔'' اور سورۃ الم نشرح میں کفر کے ارادوں پر چوٹ لگاتے ہوئے فرمایا وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ''اور ہم نے آپ کا آوازہ بلند کردیا۔'' یعنی آپ کی شہرت چاردانگِ عالم میں پھیل جائے گی۔یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا نام لیوا کوئی نہیں ہوگا جبکہ دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ آپ کو پہچانا جائے گا۔

ایسے ہی حالات تھے جبکہ یکے بعد دیگرے آپ کی نرینہ اولاد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سب سے بڑے صاحبزادے قاسم تھے۔ان سے چھوٹی حضرت زینب تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہ تھے پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں ام کلثوم، فاطمہ اور رقیہ تھیں۔ان میں سے سب سے پہلے حضرت قاسم کا انتقال ہوا۔پھر حضرت عبداللہ نے وفات پائی۔اس پر عاص بن وائل نے کہا: محمد (ﷺ) ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں جو ان کا قائم مقام بنے۔جب وہ مرجائیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔عطاء کہتے ہیں کہ جب حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضور کا اپنا چچا ابولہب جس کا گھر بالکل حضور کے گھر سے متصل تھا، مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ خوشخبری دی کہ بَتِرَ مُحَمَّدٌ اللَّیْلَۃَ ''آج رات محمد (ﷺ) لاولد ہو گئے یا ان کی جڑ کٹ گئی۔'' اولاد کی محبت کس باپ کے دل میں نہیں ہوتی اور لڑکپن میں ان کا چل بسنا سنگدل آدمی کو بھی آبدیدہ کردیتا ہے۔ایسے موقع پر بداخلاق سے بداخلاق آدمی بھی ہمدردی کا اظہار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔لیکن آنحضرت ﷺ کے قریبی عزیز بھی ہمدردی کا اظہار تو کیا کرتے اس پر خوشیاں منا رہے تھے کہ آپ کی نرینہ اولاد موت کی نذر ہوگئی۔اس طرح سے آپ کی جڑ کٹ گئی ہے۔ اب آپ کے بعد آپ کا کوئی نام لیوا تک نہیں ہوگا۔اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی اور آپ کے زخمی اور محزون دل کو حوصلہ دینے کیلئے اپنے ان انعامات کا ذکر فرمایا جس کا آج تک کسی انسان نے تصور تک نہیں کیا تھا۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ۳	سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ مَکِّیَّۃٌ (۱۰۸)	رُکُوْعَاتُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ؕ﴿۲﴾ اِنَّ
شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾ ع

رکوع: ۱۔ (بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دیا۔ ۱) پس آپ اپنے رب ہی کیلئے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔ ۲) یقیناً آپ کا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔ ۳)

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ؕ﴿۱﴾
(بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دیا۔ ۱)

اِنَّـآ میں جمع کی ضمیر ہے اس سے مراد کیا ہے

اِنَّآ میں جمع کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ اور اس کے بعد فعل بھی جمع متکلم لایا گیا ہے۔ جمع کا صیغہ عام طور پر کثرت اور تعدد پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی عظمت وشان کے اظہار کیلئے بھی آتا ہے۔ یہاں اسی مقصد کیلئے آیا ہے کہ ہمیں دیکھو، ہماری شان کا اندازہ کرو، ہماری عظمت کا استحضار پیدا کرو اور ہماری صفات پر مراقبہ کرو۔ ہم کائنات کے خالق و مالک اور عروسِ گیتی کو سنوارنے اور نکھارنے والے ہیں، ہمارے جود و کرم کی کوئی انتہا نہیں، ہماری قدرتیں بے پناہ ہیں، ارشاد و ہدایت کے کچھ تقاضے ہیں جس کی وجہ سے مخالفین کو مخالفت کا موقع ملا ہے اور راہِ محبت کی کچھ سنتیں ہیں جس پر آپ اور آپ کے ساتھی چلنے پر مجبور ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حالت طویل ہوتی جائے گی اور ہم آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے، ایسا نہیں۔ وہ عظیم انعامات جو نوعِ انسانی کے گلِ سرسبد کیلئے مخصوص ہو سکتے ہیں وہ ہم نے آپ کو عطا کر دیئے ہیں اسی کو یہاں کوثر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دی ہے۔

Marfat.com

پروردگار نے جس شاہانہ انداز سے اپنا ذکر فرمایا ہے اس کی حقیقی وجہ کیا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن جو بات اس ناچیز کے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ آنحضرت ﷺ کے بے اندازہ کمالات کو دیکھ کر کہیں آپ کو خدا نہ سمجھنے لگیں۔ اس غلط فہمی سے روکنے کیلئے یہ واضح فرمادیا کہ یہ کمالات ان کے ذاتی نہیں بلکہ ہم جو رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہیں یہ ہم نے عطا کئے ہیں۔

کَوْثَر سے مراد

کَوْثَر کثرت سے ماخوذ ہے۔ اس کا وزن فوعل ہے جو مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کا اتنا کثیر ہونا کہ اس کا اندازہ نہ لگایا جاسکے۔ یہاں ایک چیز بڑی غور طلب ہے وہ یہ کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ موصوف اور صفت دونوں کو یکجا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اَلْکَوْثَر جو صفت ہے اسے تو ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کا موصوف مذکور نہیں، اس میں آخر کیا حکمت ہے؟ تھوڑے سے تدبر سے کام لیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی چیز عطا فرما رہا ہے جو اپنی کثرت، اپنی اہمیت، اپنی قیمت اور اپنی عظمت میں جواب نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں جو اس نے زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں کوئی ایک چیز ایسی نہیں جسے موصوف ٹھہرا کر اَلْکَوْثَر کو اس کی صفت بنا دیا جائے۔ کیونکہ کوئی موصوف اپنے اندر نہ وہ کثرت رکھتا ہے اور نہ وہ قیمت جس کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کو کسی ایک موصوف کی صفت قرار نہ دیا جائے، اس لئے مطلقاً صفت کو ذکر فرمایا اور موصوف کو قاری کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا۔ قاری قرآن کے فہم و ادراک میں اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کی استواری میں جیسے جیسے آگے بڑھتا جائے گا اس کو کثرت و اہمیت کے اعتبار سے نئے سے نئے موصوف کا ادراک ہوتا جائے گا۔ اس لحاظ سے وہ کوثر کے مفہوم کو قریب سے قریب تر سمجھ سکے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم، حلم، جود و کرم، عفو و درگزر، اخلاقِ عالیہ، انسانی نفسیات کا فہم، صبر و تحمل، حکمتِ دین، ایک ایسا نظامِ زندگی جو کہیں تصادم کا شکار نہ ہو اور ایک ایسا رفعِ ذکر جس کی پرچھائیں کو بھی کوئی نہ پاسکے، یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس کثرت کے ساتھ آپ کو عطا فرمائی ہیں کہ جو ایک ناپیدا کنار سمندر ہے جس کی حد کو کوئی نہیں پاسکتا۔ اسی کو ہر ایک مفسر اور عالمِ ربانی نے اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق اپنے اقوال کی صورت دی ہے جن میں باہم کوئی اختلاف نہیں بلکہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف پرتو ہیں۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیتے ہوئے کوثر کو کثیر کے معنی میں لے کر خیر کو اس کا موصوف قرار دیا اور فرمایا:

کوثر وہ خیرِ کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عطا فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں دنیا و آخرت کے وہ تمام انعامات جو آنحضرت ﷺ کیلئے مخصوص کئے گئے ہیں شامل ہو جاتے ہیں۔ البتہ کچھ نعمتیں ایسی ہیں جہاں انسانی فہم و ادراک کی رسائی نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور آنحضرت ﷺ کا احسان ہے کہ آپ نے کوثر کی وضاحت کے سلسلے میں ان نعمتوں کا بھی ذکر فرمایا جو قیامت کے دن آپ کو عطا کی جانے والی ہیں۔ ورنہ ان کے جاننے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہ تھا۔ اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات بڑی تعداد میں آپ سے منقول ہیں۔ ان میں سے ہم صرف حضرت انسؓ کی روایت کا ذکر کر رہے ہیں۔ مسلم کے الفاظ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک روز جبکہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہمارے درمیان تھے، اچانک آپ پر ایک قسم کی نیند یا بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ پھر مسکراتے ہوئے آپ نے سر مبارک اٹھایا۔ ہم نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ آپ کے مسکرانے کا سبب کیا ہے؟ تو فرمایا کہ مجھ پر اس وقت ایک سورۃ نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے بسم اللہ کے ساتھ

Marfat.com

سورۃ کوثر پڑھی۔ پھر فرمایا: تم جانتے ہو، کوثر کیا چیز ہے۔ ہم نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ جنت میں ایک نہر ہے جسے میرے رب نے مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے، جس میں خیر کثیر ہے اور وہ حوض ہے جس میں میری امت قیامت کے روز پانی پینے آئے گی۔ اس پر پینے کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے۔ اس وقت بعض لوگوں کو فرشتے حوض سے ہٹا دیں گے تو میں کہوں گا کہ میرے پروردگار یہ تو میری امت میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آپ نہیں جانتے انہوں نے آپ کے بعد کیا نیا دین اختیار کیا۔

ابنِ کثیر نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد مزید لکھا ہے کہ حوض کی صفت میں روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ اس میں دو پرنالے آسمان سے گریں گے اور نہر کوثر کے پانی سے حوض کو بھر دیں گے۔ اس کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کوثر سے مراد خیرِ کثیر ہی ہے لیکن آخرت میں اس خیرِ کثیر میں وہ حوضِ کوثر بھی شامل ہے جو قیامت میں امتِ محمدیہ کو سیراب کرے گا۔ نیز اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصل نہرِ کوثر جنت میں ہے اور یہ حوضِ کوثر میدانِ حشر میں ہوگا۔ اس میں دو پرنالوں کے ذریعے نہرِ کوثر کا پانی ڈالا جائے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حوضِ کوثر پر امت کا ورود دخولِ جنت سے پہلے ہوگا اور حوضِ کوثر سے جو بعض لوگوں کو ہٹا دینے کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے یہ وہ لوگ ہیں بعد میں اسلام سے پھر گئے یا پہلے ہی سے مسلمان نہیں تھے، مگر منافقانہ اظہارِ اسلام کرتے تھے۔

بعض روایات میں اس حوضِ کوثر کے بارے میں آپ نے یہاں تک فرمایا کہ میں اس حوض پر تم سے پہلے پہنچوں گا اور تم پر گواہی دوں گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم میں اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں۔ حوضِ کوثر کے بارے میں اس طرح کی روایات اتنی تعداد میں ہیں کہ جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مختلف روایات میں اس حوض کی وسعت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ ان تمام کو جمع کر کے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ بحرِ احمر ہی کو شاید قیامت کے روز حوضِ کوثر میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بعض روایات میں آنحضرت ﷺ نے اس پانی کی رنگت، مزہ، خوشبو کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور اس نہر کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کی تہہ کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی۔ بعض روایات میں اس کے کناروں کو سونے کا بتایا گیا۔ اور اس کے نیچے سنگریزوں کی جگہ موتی اور جواہر بکھرے ہوئے ہوں گے۔

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ۝۲

(پس آپ اپنے رب ہی کیلئے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔ ۲)

احسان پر شکر کی تلقین

پہلی آیت میں پروردگار نے اپنے رسولِ کریم ﷺ پر اپنی بے پایاں عنایات کا ذکر فرمایا۔ اب پیشِ نظر آیت میں ان انعامات اور احسانات کا شکر ادا کرنے کی تلقین فرمائی جا رہی ہے۔ آپ کو چونکہ کوثر کی شکل میں وہ سب سے بڑی نعمت عطا فرمائی گئی ہے جو نوعِ انسانی میں سے کسی کو نہیں دی گئی۔ اس لئے اس کا شکر بھی سب سے بڑی عبادت سے ہونا چاہئے اور وہ نماز ہے۔ اور

Marfat.com

وَانۡحَرۡ سے تکمیلِ شکر کیلئے جسمانی عبادت کے ساتھ مالی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اس کیلئے جو لفظ اختیار کیا گیا اس میں دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ وہ قربانی کریں جو مشرکین کی قربانیوں کے تصور کی جڑ کاٹ دے۔ مشرکین اپنے بتوں اور مصنوعی معبودوں کے نام پر قربانیاں کرتے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی کریں۔ اور دوسری جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا وہ یہ ہے کہ یوں تو نَحۡرٌ ہر قربانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن عرب میں عموماً اس کا استعمال اونٹ کی قربانی کیلئے ہوتا ہے۔ اور اس میں اہلِ کتاب کی تردید کی گئی ہے کہ انہوں نے اونٹ کی قربانی کو ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اونٹ کی قربانی کا حکم دیا تا کہ ابراہیمی طریقے کو زندہ کیا جائے اور اہلِ کتاب کے تصور کی قباحت کو واضح کیا جائے۔ سابقہ آیت کے مضمون کو دیکھتے ہوئے آیت میں نماز اور قربانی کے حکم کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مشرکین نے اپنے خودساختہ معبودوں کی عبادت کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی کے تصور کو پامال کر ڈالا۔ تمہیں اس نماز یعنی بندگی اور قربانی کے ذریعے یہ ثابت کرنا ہے کہ تمہاری پوری زندگی پر صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا غلبہ ہے اور تمہارے جسم و جان اور مال و دولت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جہاں چاہے گا تم اسے قربان کر دو گے۔ اس لئے قرآنِ کریم میں نماز اور قربانی اور جینے اور مرنے کا ایک ساتھ ذکر کر کے اس تصور کو اجاگر کیا گیا۔ ارشادِ خداوندی ہے: قُلۡ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الۡعٰلَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرۡتُ وَأَنَا أَوَّلُ الۡمُسۡلِمِينَ "اے نبی! کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا ہوں۔" آنحضرت ﷺ کی زندگی پر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا اثر یہ تھا کہ ساری ساری رات کھڑے رہ کر نماز ادا فرماتے، یہاں تک کہ پاؤں متورم ہو جاتے۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں؟ فرمایا: أَفَلَا أَكُونَ عَبۡدًا شَكُورًا "کیا میں اپنے رب کی بے پایاں نعمتوں پر اس کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔" اور قربانی کا حال یہ تھا کہ لاکھوں روپے آپ کے قدموں میں آئے، ایک بہت بڑا ملک آپ کے قبضہ میں آیا، لیکن کبھی زندگی بھر آپ پر زکوٰۃ فرض نہ ہوئی۔ بلکہ حال یہ رہا:

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اپنا یہ حال کہ ہے چولھا بجھا ہوا

بعض لوگوں نے وَانۡحَرۡ کے معنی نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے بعض آئمہ تفسیر کی طرف منسوب کئے ہیں۔ ان کے متعلق ابنِ کثیر نے فرمایا کہ یہ روایت منکر، یعنی ناقابلِ اعتماد ہے۔

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡأَبۡتَرُ ﴿٣﴾

(یقیناً آپ کا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔ ۳)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مخالفین کو تنبیہ

شَانِئٌ ، شنی سے ہے جس کے معنی ایسے بغض اور ایسی عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے جس کے دل میں کسی کیخلاف بغض وعداوت ہو اس کو شَانِئٌ کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس کو دشمن کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد آنحضرت ﷺ کے وہ اندھے مخالفین ہیں جنہوں نے ہر ممکن طریقے سے آپ کو ختم اور آپ کی دعوت کو ناکام کرنے کی کوشش کی۔ اور اس بات سے ہمیشہ محظوظ ہوتے رہے کہ چونکہ آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی، اس لئے آپ کی وفات کے ساتھ ہی آپ کا نام مٹ جائے گا، کوئی آپ کا نام لیوا نہیں ہوگا۔ تو گویا ان کے دلوں میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں جو بغض اور عداوت تھی یہ اس کی انتہا تھی۔ خلاصے میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ان کے بڑے بڑے لیڈر آپ کی اولاد کے زندہ نہ رہنے پر ہمدردی کی بجائے خوشی کا اظہار کرتے تھے کہ اس طرح سے آپ کا نام مٹ جائے گا۔ اور جہاں تک آپ کی دعوت کا تعلق ہے وہ یہ سمجھتے تھے جس طرح اہلِ مکہ نے اس کیلئے اپنے دل بند کر لئے ہیں دوسرے لوگ بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے، اس طرح سے یہ دعوت ختم ہو کے رہ جائے گی۔ اور اس کیلئے انہوں نے ہمیشہ اَبْتَرُ کا لفظ استعمال کیا۔

اَبْتَرُ ، بَتر سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو کاٹ دینا۔ اہلِ لغت کے نزدیک وہ مرد جس کا فرزند نہ ہو، وہ چارپایہ جس کی دم نہ ہو اسے ابتر کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر وہ کام جس کا نیک اثر باقی نہ رہے اس کو بھی ابتر کہتے ہیں۔ (قرطبی)

اللہ تعالیٰ نے آپ کے دشمنوں کی یاوہ گوئی کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہمارے حبیب ابتر نہیں، ابتر تم ہو۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ چند سال میں تمہاری جڑ کٹ جائے گی۔ جو ہمارے رسول کی دعوت کو قبول کرے گا وہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہو جائے گا۔ اور جو مخالفت میں جان دے گا یا زندہ رہے گا، زندگی ہی میں اس کی جڑ کٹ جائے گی، وہ اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہوگا، اس کی دشمنی اس کے گلے کا پھندا بن جائے گی اور اس کی سازشیں اس کیلئے شرمندگی کا باعث ہوں گی۔ آج تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ قرآنِ کریم کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آپ کے دشمن جنگِ بدر میں ایک بڑی تعداد میں مارے گئے۔ ان کی قیادت کی پہلی صف الٹ گئی، دوسری صف نہایت ذلت سے فدیہ دے کر آزاد ہوئی۔ پھر ان میں سے کتنے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے بہرہ ور کیا اور انہوں نے نہایت شوق سے آنحضرت ﷺ کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈالا۔ اور جو مخالفت میں اڑے رہے وہ ذلت کی تصویر بن کر عرب کی سرزمین میں تحلیل ہو گئے یا وہ تلوار کا لقمہ بنے۔ اور اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کے ذکر ہی کو بلند نہیں کیا بلکہ آپ کی دختری اولاد کو وہ برکت عطا فرمائی کہ وہ دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور بڑے بڑے علماء اور اولیاء اللہ تعالیٰ نے ان میں پیدا فرمائے۔ اور جہاں تک آپ کی معنوی اولاد کا تعلق ہے دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس میں ان کی بڑی تعداد موجود نہ ہو اور جو اپنے زوال کے باوجود تاریخ کے ہر دور میں اپنا وزن نہ رکھتے ہوں۔ آپ کے دشمنوں کا آج کوئی نام لینا گوارا نہیں کرتا، لیکن آپ کا دشمن آج بھی جب علمی حیثیت میں آپ کا ذکر کرتا ہے تو آپ کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی قرار دیتا ہے۔ اور جہاں تک شہرتِ دوام کا تعلق ہے کوئی بدترین دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دنیا میں اس قدر کسی کا نام لیا گیا ہوگا اور اس قدر کسی کی تعریف کی گئی ہوگی۔ کتنے ہندو اور سکھ اس ملک میں ایسے ہیں جنہوں نے آپ کی تعریف میں نعتیں کہی ہیں۔ اور دنیا کا گوشہ گوشہ آپ کے ذکر سے گونج رہا ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے:

Marfat.com

وہ جس کا ذکر ہوتا ہے زمینوں آسمانوں میں
فرشتوں کی دعاؤں میں، موذن کی اذانوں میں

اور ایک ہندو شاعر نے کہا:

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں اس کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کردیا

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ

(۱۰۹)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الْکٰفِرُوْن ہے جو اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے:۔ اگرچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اسے مدنی قرار دیا ہے لیکن جمہور مفسرین کی رائے یہی ہے اور اس کا مضمون بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

شانِ نزول:۔ اس سلسلے میں مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ان تمام روایات کا مرکزی مضمون بلاشبہ شانِ نزول کی حیثیت رکھتا ہے۔البتہ کسی ایک روایت کو متعین طور پر اس کا شانِ نزول قرار دینا مشکل ہے۔امرِ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دعوئے نبوت سے شروع شروع میں تو اشرافِ قریش نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔چند بڑے لوگوں کو چھوڑ کر عام طور پر قریش کا رویہ بے اعتنائی کا تھا۔ان کا خیال یہ تھا کہ یہ دعویٰ اور اس کی دعوت چند دنوں کی بات ہے لوگوں کی طرف سے عدمِ قبولیت خود اس کے خاتمے کا باعث بن جائے گی۔لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ یہ دعوت آہستہ آہستہ لوگوں میں پھیل رہی ہے اور دلوں میں نفوذ کر رہی ہے تو اب انہوں نے اس کی مخالفت شروع کی۔کبھی استہزاء سے کام لیا، کبھی تردید کی۔لیکن جب دیکھا کہ ان کی مخالفت کوئی اثر پیدا نہیں کر رہی تو پھر اذیت رسانی کے ساتھ ساتھ مختلف وقتوں میں آنحضرت ﷺ سے سمجھوتے کی کوشش بھی کی۔کبھی آپ کو مکہ کی حکومت، کبھی مال و دولت اور کبھی کسی خوبصورت عورت سے شادی کا لالچ دیا۔ اور جب آپ نے اس کو سختی سے رد کر دیا تو پھر یہ پیشکش کی کہ ایک سال آپ ہمارے لات وعزیٰ کی پوجا کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے۔اس طرح سے آپ کی بات بھی مان لی جائے گی اور ہمیں بھی شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔اور کبھی یہ کہا گیا کہ ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جایا کریں گے۔چنانچہ اس طرح کی پیشکشوں کے جواب میں مختلف وقتوں میں پروردگار نے مختلف آیات نازل فرمائیں۔کبھی سورۃ الزمر کی آیت ۶۴ اور ۶۵ نازل ہوئیں جن کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے کہ اے نادانو! کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں۔'' ''حالانکہ آپ کی طرف اور آپ سے پہلے رسولوں کی طرف یہ بات وحی کی جا چکی ہے کہ اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے عمل ضائع ہو جائیں گے اور آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔'' کبھی یہ جواب دیا گیا کہ تم مجھ سے قرآنِ کریم کو بدلنے یا اور قرآنِ کریم لانے کا مطالبہ کرتے ہو، یہ میرے بس میں نہیں، میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔اسی سلسلے میں ایک موقع پر پیشِ نظر سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ نازل ہوئی۔

Marfat.com

اس سورۃ کے الفاظ اور اس کے لب ولہجہ کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مذہبی رواداری کی تلقین کیلئے نازل نہیں ہوئی بلکہ اس لئے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین، ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی براءت اور لاتعلقی کا اعلان کردیا جائے۔ اور یہ بھی بتا دیا جائے کہ تمہارے نزدیک عبادت صرف پوجا پاٹ کا نام ہے جبکہ اسلام جس عبادت کی دعوت دیتا ہے اس کا تعلق پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت میں دینے سے ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے، اس کا کام بندگی اور غلامی ہے اور بندگی اور غلامی جز وقتی نہیں بلکہ پوری زندگی کا عمل ہے جسے طرزِ عمل یا طرزِ حیات کہنا چاہئے۔ اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی آقا نہیں جس کی غیر مشروط اطاعت کی جاسکے۔ اس کی زندگی کا اصل ہدف صرف رضائے خداوندی کا حصول ہے اور اس کی منزل آخرت ہے۔ دنیا دارالعمل ہے اور آخرت دارالجزاء ہے۔

اس سورۃ کو قرآنِ کریم میں شامل کرکے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کفار کے دین سے لاتعلقی کا اظہار صرف عہدِ نبوت ہی میں نہیں بلکہ ہر دور میں مسلمانوں پر واجب ہے۔ ہر دور کا مسلمان اس بات کا پابند ٹھہرایا گیا ہے کہ دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مداہنت یا مصالحت نہ کرے۔

اس سورۃ کا بنیادی مضمون چونکہ تمام ادیانِ باطلہ سے لاتعلقی کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا فیصلہ کن اعلان ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے مختلف اوقات میں اس کے فضائل اور اس کی اہمیت کو واضح فرمایا، تاکہ ہر مسلمان زندگی کے ہر مرحلے میں اس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

ابنِ کثیر نے متعدد صحابہؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فجر کی سنتوں میں اور مغرب کے بعد کی سنتوں میں بکثرت یہ دو سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ بعض صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہمیں کوئی دعا بتا دیجئے جو ہم سونے سے پہلے پڑھا کریں، تو آپ نے قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ یہ شرک سے براءت ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں وہ کلمہ جو تم کو شرک سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ وہ یہ ہے کہ سوتے وقت قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ٦	سُوْرَةُ الْکٰفِرُوْنَ مَکِّیَّةٌ (۱۰۹)	رُکُوْعَاتُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنْتُمْ
عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنْتُمْ
عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ ﴿٦﴾

رکوع: ۱۔ (اے پیغمبر کہہ دیجئے، اے کافرو! ۔ ۱) میں پرستش نہیں کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو۔ ۲) اور نہ ہی تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ ۳) اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم نے عبادت کی۔ ۴) اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو، جس کی عبادت میں کرتا چلا آرہا ہوں۔ ۵) تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔ ٦)

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے، اے کافرو! ۔ ۱)

قُلْ کا مفہوم اور کٰفِرُوْن کے لفظ سے خطاب کی وجہ

یہاں قُلْ صاف صاف بات کہنے اور اعلان کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ جواب ہے مشرکینِ مکہ کی اس پیشکش کا جو آنحضرت ﷺ سے سمجھوتے کے سلسلے میں انہوں نے کی تھی۔ انہوں نے جب محسوس کیا کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت رفتہ رفتہ دلوں میں اترتی جارہی ہے اور ان کی نام نہاد وحدت میں دراڑیں پڑتی جارہی ہیں تو انہوں نے شروع شروع میں تو آنحضرت ﷺ کی دعوت کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی اور پھر مخالفت کی قوت سے اس کا راستہ روکا۔ لیکن جب انہیں ہر مرحلے پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو تب انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایسے سمجھوتے کی کوشش کی جس سے کفر اور اسلام کا ایسا ملغوبہ تیار ہو جس سے ان کی انا کو بھی ٹھیس نہ پہنچے اور آنحضرت ﷺ بھی اس پر

Marfat.com

مطمئن ہو جائیں۔ چنانچہ ان کی اس طرح کی پیشکشوں کے جواب میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اس بات کا اعلان کر دیجئے کہ تم جس طرح کی پیشکشیں کر رہے ہو اس کیلئے اسلام کی دعوتِ توحید میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس طرح کی باتیں کہ ایک سال میں تمہارے بتوں کی پوجا کروں، اور ایک سال تم خدائے واحد کو پوجو، یہ اسلام کی دعوت نہیں بلکہ کفر ہے۔ اسلام جس توحید کی دعوت دیتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی کو شریک کیا جا سکتا ہے اور نہ صفات میں۔ وہ ہر لحاظ سے ہر لحہ اور ہر موقع پر وحدہ لاشریک ہے۔ زندگی کے کسی لمحے میں کسی دوسرے کو اس کی عبادت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کو اس طرح ماننا چاہتا ہے کہ اس کو اِلٰہ بھی مانا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بہت ساری صفات میں دوسری قوتوں کو شریک بھی کیا جائے۔ اور اس کی بندگی اور عبادت میں دوسری قوتوں کی بھی جگہ نکالی جائے۔ اسلام ایسی ہر کوشش کو کفر قرار دیتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی مملکت کا تاجدار اپنی تاجوری یا اپنے اختیارات میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ تو اللہ تعالیٰ جو ہر لحاظ سے بے مثال اور ہر طرح کی ہمسری سے پاک ہے، کسی دوسرے کی شرکت کو کیسے گوارا کرے اور کس طرح توحید کی دعوت میں اسے شامل کرنے کی اجازت دے دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ درحقیقت اسلام کی نہیں، کفر کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو آنحضرت ﷺ کے سامنے باہمی سمجھوتے کیلئے ایسی تجویزیں پیش کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی وحدانیت کے منکر ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ جس دعوت کو لے کر اٹھے ہیں اس کا انکار کرنے والے ہیں۔ اس لئے ایسے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کافر کا لفظ استعمال کیا گیا۔ کیونکہ کافر انکار کرنے والے اور نہ ماننے والے کو کہتے ہیں۔ یہ کوئی گالی نہیں بلکہ درحقیقت ان کی اس غلطی کی طرف توجہ دلانا ہے جو وہ سمجھوتے کی دعوت کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔

بعض مفسرین کرام کی رائے یہ ہے کہ یہ خطاب قریش کے ان آئمۂ کفر سے ہے جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ کو بتا دیا گیا تھا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں۔ اور وہی لوگ تھے جو آنحضرت ﷺ کے سامنے اس طرح کی پیشکشیں کر رہے تھے۔ لیکن یہ بات زیادہ وزنی معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر یہی بات ہوتی تو پھر ان کے مرکھپ جانے کے بعد اس سورۃ کی تلاوت ختم ہو جانی چاہئے تھی۔ اور اسے قرآنِ کریم میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن اس کا قرآنِ کریم میں شامل کیا جانا اور پھر قیامت تک مسلمانوں کا اسے پڑھنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آیت میں کٰـــفِـــرُوْنَ کے لفظ سے خاص کافر مراد نہیں بلکہ اس میں عموم پایا جاتا ہے اور قیامت تک دنیا کے جس حصے میں بھی ایسی صورتحال پیدا ہوگی ان لوگوں کو کافر ہی کہہ کر پکارا جائے گا۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾

(میں پرستش نہیں کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو۔ ۲)

قریش کی پیشکش کا جواب

کفار کی پیشکش کے جواب میں پروردگار کے حکم سے آنحضرت ﷺ نے ان کو یہ جواب دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت میں غیر اللہ کی عبادت کو شامل کرنا چاہتے ہو جبکہ میرا عقیدہ یہ ہے اور یہی میرا طرزِ عمل ہے کہ میں ان چیزوں کی پرستش نہیں کروں گا جن کی پرستش تم کرتے ہو۔ اس طرح سے پہلے ہی فقرے میں ان کی تمام تر توقعات کو ختم کر کے رکھ دیا۔

Marfat.com

بعض مفسرین نے لَآ اَعْبُدُ کو حال کے معنی میں لیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو، میں ان کی پرستش نہیں کرتا۔ اگر یہ مفہوم مراد لیا جائے تو اس سے کفار کی پیشکش کے جواب میں آنحضرت ﷺ کا جواب واضح نہیں ہوتا۔ کیونکہ قریش میں سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ نبی کریم ﷺ ان بتوں میں سے کسی کو نہیں پوجتے، اور نہ آپ کسی اور قوت کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ پرستش کرتے ہیں۔ تو پھر ان کو یہ بات بتانا کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو، میں ان کی پرستش نہیں کرتا، ایک بے معنی سی بات ہے۔ اس لئے اس جواب میں اصل زور اسی طرح پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ تم مجھ سے جو توقع کر رہے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں، میں وہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ اور اس حوالے سے میرے رویئے میں کوئی لچک پیدا نہیں ہو سکتی۔

صاحب کشاف کے نزدیک تو جب لَآ مضارع پر داخل ہوتا ہے تو اسے حال کے معنی میں لینا عربیت کے خلاف ہے بلکہ مضارع پر لَا کا داخل ہونا لازماً اسے مستقبل کے معنی میں خاص کر دیتا ہے۔ اس لئے صاحب کشاف کہتے ہیں لااعبد اريد به العبادة فی ما يستقبل لان لا. لاتدخل الا علی مضارع فی معنی الاستقبال یعنی مضارع پر لا داخل ہے اور اس صورت میں مستقبل کی نفی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ کفار کی پیشکش کے جواب میں یہ فرما رہے ہیں کہ تم مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کی پوجا کی جو دعوت دے رہے ہو، میں یہ پوجا یا پرستش کبھی نہیں کروں گا۔ یعنی تم جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی پوجا نہیں کرتا، لیکن تمہاری پیشکش کے جواب میں، میں یہ کہتا ہوں کہ آئندہ بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔

مَاتَعْبُدُوْنَ میں مَا عموم کیلئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا بھر کے کفار اور مشرکین جن کی عبادت کرتے ہیں خواہ وہ ملائکہ ہوں یا جن، انبیاء ہوں یا اولیاء، زندہ ہوں یا مردہ، انسانوں کی ارواح ہوں یا سورج چاند ستارے۔ جانور، درخت، دریا ہوں یا بت اور خیالی دیویاں اور دیوتا، میں ان میں سے کسی کی نہ عبادت کرتا ہوں اور نہ کروں گا۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿٣﴾

(اور نہ ہی تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ ۳)

اس میں حقیقت نفس الامری بھی ہے اور ایک غلطی کی نشاندہی بھی

اس آیت میں کفار کی پیشکش کا جواب بھی ہے اور ان کی غلطی کی نشان دہی بھی۔ ان کا گمان یہ تھا کہ جس طرح ہم اپنے بتوں کی عبادت صرف پوجا پاٹ کی حد تک کرتے ہیں، باقی زندگی کے معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اور پھر اس عبادت میں اگر ہم کسی اور کو بھی شامل کر لیں جب بھی بتوں کی عبادت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کر سکتے ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے کہ تم نے سمجھوتے کی جس پیشکش میں اللہ تعالیٰ اور غیر اللہ کی عبادت کو ایک ساتھ رکھا ہے اور تم سمجھتے ہو کہ اس طرح سے دونوں کی عبادت کی جا سکتی ہے، یہ تمہاری غلطی ہے۔ بتوں کی عبادت تو واقعی پوجا پاٹ کے سوا اور کچھ نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جس طرح اس کی ذات کو ایک ماننا ضروری ہے اسی طرح اس کی صفات اور اس کے حقوق میں بھی کسی اور کی شرکت کا تصور بھی گناہ ہے۔ وہ جس طرح اپنی ذات میں واحد ہے اسی طرح اپنی صفات میں اور اپنے حقوق میں بھی وحدہ لاشریک ہے۔ تو اپنی پیشکش میں تم اللہ تعالیٰ کی جس عبادت کا ذکر کر رہے ہو وہ اللہ

Marfat.com

تعالیٰ کی عبادت نہیں بلکہ اس کے ساتھ شرک اور کفر کرنا ہے۔ جس طرح اس کو نہ ماننا اور اس کے سامنے سر نہ جھکانا اور اس کی غیر مشروط اطاعت نہ کرنا کفر ہے اسی طرح اس کی عبادت اور اطاعت میں کسی اور کو شریک کرنا بھی کفر ہے۔ جو شخص اپنے دیویوں اور دیوتاؤں سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکا کر اور اس کی عبادت کر کے بھی اس کی عبادت سے محروم رہتا ہے۔ کیونکہ اس کی بندگی میں داخل ہونے کیلئے ضروری ہے کہ تم اپنے تمام معبودوں سے لاتعلقی کا اظہار کرو۔ اگر اس کی بندگی کے ساتھ تم نے اپنے معبودوں کی بندگی بھی جمع کرنے کی کوشش کی تو اپنے معبودوں کے پرستار تو بے شک رہو گے لیکن اللہ تعالیٰ کی بندگی میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

گزشتہ آیت میں ماتعبدون فرمایا گیا ہے۔ وہاں تو اس کا استعمال بالکل صحیح ہے کیونکہ مَا کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اور مشرکین چونکہ فرضی اور وہمی چیزوں کو پوجا کرتے تھے اس لئے ایسے معبودوں کیلئے مَا کا استعمال ہر طرح مناسب ہے۔ لیکن مَا اَعْبُدُ میں مَا کا استعمال بظاہر کھٹکتا ہے۔ چنانچہ اہلِ علم نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں۔ بعض کا گمان یہ ہے کہ یہاں مَا مَن کے معنی میں ہے۔ بعض دوسرے لوگوں کے نزدیک اَلَّذِیْ کے معنی میں۔ اور بعض اہلِ علم اسے مَا مصدریہ قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں وہ عبادت نہیں کرتا جو تم کرتے ہو۔ لیکن اکثر اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ یہاں مَا کا استعمال مجانست کے اصول پر ہوا ہے۔ اور یہی بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝۵

(اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم نے عبادت کی۔ ۴) اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو، جس کی عبادت میں کرتا چلا آ رہا ہوں۔ ۵)

ماضی کے حوالے سے بھی اس پیشکش کا رد

جہاں تک کفار و مشرکین کی مفاہمت کے سلسلے میں پیشکشوں کا تعلق تھا اس کا جواب تو اوپر کی آیات میں دے دیا گیا۔ وہ اگرچہ مکمل جواب ہے لیکن کفار کے رویئے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسا جواب نہ تھا جس سے بتمام و کمال ان کی امیدیں ٹوٹ جاتیں اور وہ آنحضرت ﷺ سے مفاہمت کی ہر کوشش کو ختم کر دیتے۔ کیونکہ اس جواب میں اس بات کا امکان موجود تھا کہ یہ صحیح ہے کہ آپ ہمارے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے۔ اور آئندہ بھی آپ نے ایسا نہ کرنے کی ہر کوشش کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ماضی میں کبھی آپ نے ایسا کیا ہو۔ نبوت سے پہلے جبکہ آپ ایک عام شخص کی زندگی گزار رہے تھے، کبھی ہمارے معبودوں کیلئے آپ کے دل میں نرم گوشہ رہا ہو۔ ہم اس حوالے سے آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ اپنے عزم پر نظر ثانی کریں۔ اور ہم آپ کو گزشتہ زندگی کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں۔ پیشِ نظر دونوں آیتوں میں پروردگار نے ماضی کے حوالے سے بھی ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ اور صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ جس طرح میں مستقبل میں کبھی بھی تمہارے معبودوں کی عبادت نہیں کر سکتا اور نہ ایسا کرنے کا کوئی امکان ہے۔ اسی طرح میں ماضی کے حوالے سے بھی کہتا ہوں کہ میں کبھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ایسے معبود کا پرستار نہیں رہا جس کی پوجا اور عبادت تمہارے آباؤ اجداد کرتے رہے ہیں۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معبودانِ باطلہ ہر قوم کے الگ الگ رہے ہیں اور پھر زمانے کے بدلنے سے ان میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے، اسی طرح عبادات اور خرافات میں بھی کبھی یکسانی نہیں رہی۔ نئے نئے آستانے وجود میں آتے رہے ہیں اور پرانے آستانوں کو دنیا بھولتی رہی ہے۔ ہر دور میں نئی وابستگیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اور نئی سے نئی خرافات جنم لیتی رہی ہیں۔ لیکن میں نے جس طرح تمہارے معبودانِ باطلہ اور عبادت کے باطل طریقوں کو کبھی اختیار نہیں کیا، اسی طرح تاریخ میں تمہارے آباؤ اجداد میں شرک کی جتنی صورتیں بھی موجود رہی ہیں، میں کبھی بھی ان کا برداشت کرنے والا نہیں رہا۔ اس طرح سے ان کی تمام امیدوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔

یاد رہے کہ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ اگرچہ جملہ اسمیہ ہے، جس کا کسی زمانے کے ساتھ مقید ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ تینوں زمانوں کے ساتھ یکساں ربط رکھتا ہے۔ البتہ ماعبدتم چونکہ ماضی ہے اس وجہ سے یہ واضح قرینہ موجود ہے کہ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ کی نفی ماضی ہی سے متعلق ہے۔ یعنی میں پہلے بھی کبھی ان معبودوں کو پوجنے والا نہیں رہا ہوں جن کی تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے کبھی پوجا کی ہے۔

اس آیت سے آنحضرت ﷺ کے انکار میں ایک اور پہلو سے بھی شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ جب تمہارے معبودانِ باطلہ کی عبادت سے ماضی میں مجھے کبھی تعلق نہیں رہا اور میں کبھی تمہاری خرافات میں شریک نہیں ہوا جبکہ میں ابھی شرفِ نبوت سے مشرف نہیں ہوا تھا اور نورِ وحی نے ابھی میرے دل میں اپنا مسکن نہیں بنایا تھا تو اب جبکہ میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے فیض یاب ہو رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت براہِ راست مجھ تک پہنچ رہی ہے تو تمہاری ان خرافات میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں۔ اور کس طرح اپنے مصفیٰ اور مجلیٰ دامن پر تمہارے شرک اور جاہلیت کے چھینٹوں کو برداشت کر سکتا ہوں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ کو آیت ۳ کا اعادہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کے اعتبار سے بے شک یہ آیت ۳ کا اعادہ ہے لیکن معنی کے اعتبار سے یہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ آیت ۳ کا تعلق مستقبل سے تھا اور پیشِ نظر آیت کا تعلق ماضی سے ہے۔ قریش پر یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ تم نے اپنی پیشکش میں جو یہ بات کہی ہے کہ اگر آپ ہمارے معبودوں کی پوجا گوارا کر لیں تو ہم آپ کے خدا کو پوجنا شروع کر دیں گے اور اس کی عبادت اختیار کر لیں گے، یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ کیونکہ تمہارے معبودانِ باطلہ میں سے کوئی بھی نہ حقیقی معبود ہے، نہ معبودِ برحق ہے اور نہ کامل معبود ہے۔ تم نے اپنے توہمات اور جھوٹے خیالات کو معبودانِ باطلہ کی شکل دے رکھی ہے۔ اس لئے تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کی جزوی عبادت کی جائے یا کلی عبادت کی جائے، ان کو چھوٹا معبود سمجھا جائے یا بڑا معبود سمجھا جائے جبکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کسی اور شرکت کو گوارا نہیں کرتی، جب تک دوسرے معبودوں کا انکار نہ کیا جائے اور بندگی کے ہر تصور کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص نہ کیا جائے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی عبادت ممکن نہیں۔ اس لئے تمہارا یہ کہنا کہ تم اپنے معبودوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بھی عبادت کرو گے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ جس طرح صاف اور طیب چیز میں گندگی کی ملاوٹ کے بعد وہ چیز کھانے اور پینے کے قابل نہیں رہتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی اور کی عبادت اور پوجا پاٹ کے شامل ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبادت کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے تم جس طرح آج دوسری مشرکانہ ملاوٹوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کر سکتے بلکہ اس کی عبادت خاص اسی کی عبادت ہونی

Marfat.com

چاہئے۔اسی طرح تم ماضی میں بھی کبھی اپنے مشرکانہ روئیے کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے نہیں رہے۔بلکہ تم نے ہمیشہ دوسری قوتوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ شریک کیا، اس کی صفات کا حامل بنایا اور ان کے ساتھ اسی طرح عقیدت و محبت رکھی جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونی چاہئے۔اس لحاظ سے امرِ واقعہ یہ ہے کہ تم ماضی میں بھی اس طرح اللہ تعالیٰ کے عبادت کرنے والے کبھی نہیں رہے جیسے میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا چلا آ رہا ہوں۔

مـا اعبد مضارع ہو کر بھی ماضی کے معنی میں ہے۔کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر بہتر یہ تھا کہ یہاں مَـا عَبَدتُّ کو لایا جاتا تا کہ ماضی کا معنی متعین ہو جاتا۔لیکن ایسا کرنے سے جو چیز پیشِ نظر ہے اس کا اظہار نامکمل رہتا۔پیشِ نظر یہ ہے کہ جس طرح آج میں خالصتاً اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتا ہوں اور آئندہ بھی ایسا ہی کروں گا، اسی طرح ماضی میں بھی یہی میرا عمل رہا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے تمام نبی اور رسول اسی پر عامل رہے ہیں۔یعنی اس سے تسلسل اور استمرار کا اظہار ہو رہا ہے۔جو ظاہر ہے کہ ماضی کا صیغہ لانے سے نہیں ہو سکتا۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿٦﴾

(تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔ ۶)

حرفِ انکار کی تکمیل

یہ اظہارِ براءت اور حرفِ انکار کی تکمیل ہے۔یعنی تم نے اپنی زندگی کیلئے جو ضابطہ بنا رکھا ہے وہ تمہارا دین ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو ضابطۂ حیات دیا ہے وہ ہمارا دین ہے۔ان دونوں میں کوئی اشتراک نہ کبھی ماضی میں ہوا، نہ حاضر میں ہے اور نہ اس کی آئندہ کوئی توقع کی جا سکتی ہے۔ایسی مغائرت کی موجودگی میں کسی مفاہمت اور سمجھوتے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔اس لئے میرے لئے میرا دین اور تمہارے لئے تمہارا دین ہے۔میں اپنے طریقے پر کام کرتا رہوں گا اور تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو۔انجام بتا دے گا کہ بات کس کی سچی ہے۔اور انجام نے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب رہا، اللہ تعالیٰ کے رسول کو اللہ تعالیٰ نے عزت و رفعت سے نوازا۔پورے عرب کی شوکت ان کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی اور تمام ادیانِ باطلہ ان کے دین کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔اور مفاہمت کی پیشکشیں کرنے والے موت کے گھاٹ اتر گئے اور یا ذلت کی موت ان کا مقدر بنی۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ النَّصْرِ

(۱۱۰)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ النَّصْرِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کے کئی نام ہیں۔اسے سورۃ التوزیع بھی کہا جاتا ہے، یعنی رخصت کرنے کی سورۃ۔ کیونکہ توزیع کے معنی کسی کو رخصت کرنے کے ہیں۔اس سورۃ میں چونکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات قریب ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لئے اسے اس نام سے یاد کیا گیا ہے۔اس کا دوسرا نام سورۃ الفتح ہے۔کیونکہ اس میں فتح کی خبر دی گئی ہے۔لیکن یہ سورۃ النصر کے نام کے ساتھ معروف ہے جو اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔یہ ایک رکوع اور ۳ آیات پر مشتمل ہے، اس کے کلمات کی تعداد ۱۹ ہے اور حروف کی ۹۷۔

زمانۂ نزول:۔ ہجرت کے بعد جو سورتیں نازل ہوئی ہیں انہیں مدنی کہا جاتا ہے، خواہ ان کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا ہو یا اثنائے سفر میں مدینہ سے باہر کسی دوسرے مقام پر۔ یہ سورۃ اگرچہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی لیکن ہجرت کے بعد ہوئی ہے اس لئے اسے مدنی کہا جاتا ہے۔حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا بیان ہے جسے صحیح مسلم میں روایت کیا گیا ہے کہ سورۃ النصر قرآنِ کریم کی آخری سورۃ ہے۔یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورۃ نازل نہیں ہوئی۔بعض روایات میں بعض آیات کے نازل ہونے کا ذکر ہے، وہ اس کے منافی نہیں۔جس طرح سورۃ الفاتحہ کو قرآن کی سب سے پہلی سورۃ اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ مکمل سورۃ سب سے پہلے سورۃ الفاتحہ ہی نازل ہوئی ہے۔سورۃ الاقراء اور سورۃ المدثر کی چند آیات کا اس سے پہلے نازل ہونا اس کے خلاف نہیں کیونکہ ان کا بقیہ حصہ بعد میں کسی وقت نازل ہوا ہے۔

امامِ قرطبی اپنی تفسیر میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت ابنِ عمرؓ کا ارشاد ہے کہ یہ سورۃ حجۃ الوداع میں نازل ہوئی۔اس کے بعد آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ نازل ہوئی۔ان دونوں کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں صرف ۸۰ روز رہے، اس کے بعد وفات ہوگئی۔ان دونوں کے بعد آیتِ کلالہ نازل ہوئی جس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک کے کل ۵۰ دن باقی رہ گئے تھے۔اس کے بعد آیت لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ الخ۔ نازل ہوئی جس کے بعد آپ ۳۵ روز دنیا میں رہے۔اس کے بعد آیت وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ نازل ہوئی جس کے بعد صرف ۲۱ روز، اور مقاتل کی روایت میں ۷ روز کے بعد وفات ہوگئی۔صاحب روح المعانی نے بحرِ محیط سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں سورۃ کا نزول غزوۂ خیبر سے لوٹنے کے وقت بیان کیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کا نزول مکہ کی فتح سے پہلے ہوا ہے۔انہوں نے دونوں روایات میں تطبیق دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ سورۃ نازل تو فتح خیبر کے موقع پر ہوئی ہے لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر بھی آپ نے اسے لوگوں کے سامنا پڑھا ہوگا جس سے بعض لوگوں نے یہ گمان کیا کہ یہ سورۃ اب نازل ہوئی ہے۔لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے مسند احمد اور ابنِ جریر وغیرہ نے یہ بات نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے اور میرا وقت آن پورا ہوا ہے۔بعض دوسری روایات میں بھی حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ اس سورۃ کے نزول سے آنحضرت ﷺ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپ کو دنیا سے رخصت ہونے کی اطلاع

Marfat.com

دے دی گئی ہے۔ اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک دفعہ شیوخِ بدر کی موجودگی میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے پوچھا کہ آپ اس سورۃ کے بارے میں کیا کہتے ہیں، تو انہوں نے عرض کیا کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی اجل ہے۔ اس میں حضورؐ کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی نصرت آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا وقت آن پورا ہوا ہے۔ اس کے بعد آپ اللہ تعالیٰ کی حمد اور استغفار کریں۔ اور حضرت عمرؓ نے ان کے جواب کی تصویب فرمائی۔

احادیثِ مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس سورۃ کے نزول کے بعد کثرت سے ایسے الفاظ کا وظیفہ شروع کر دیا جس میں تسبیح و تحمید اور استغفار اور توبہ کا ذکر ہوتا۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک پر آپؐ کے آخری زمانۂ حیات میں اٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے یہ الفاظ جاری رہتے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ میں نے ایک روز پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کثرت سے یہ ذکر کیوں کرتے رہتے ہیں۔ فرمایا: مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر آپ نے یہ سورۃ پڑھی۔ (ابنِ جریر)

ان روایات کو جمع کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ عمر کے آخری حصے میں نازل ہوئی ہے۔ اور فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس لئے وہ روایات راجح معلوم ہوتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ سورۃ حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔

سورۃ کا مرکزی مضمون

اس سورۃ میں آنحضرت ﷺ کو یہ خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی نصرت آ جائے اور اللہ تعالیٰ اسلام کو عرب میں فتح عطا فرما دے اور لوگ فوج در فوج دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کیلئے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت تو تمام ادیانِ باطلہ پر اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنا تھا۔ اور ادیانِ باطلہ صرف سرزمینِ عرب تک محدود نہ تھے بلکہ ساری دنیا میں اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ موجود تھے۔ اور آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو فتح عطا فرمائی تھی اس کا تعلق صرف جزیرۂ عرب سے تھا تو پھر ہم اسے یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں آپ کا کام مکمل ہو گیا۔ کیونکہ جزیرۂ عرب کے باہر تو آپ کو نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جزیرۂ عرب کی حد تک اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے سے وہ مرکز وجود میں آ گیا جس سے اسلامی انقلاب کو دوسرے ملکوں میں برآمد کیا جا سکتا تھا۔ اور وہ عظیم جماعت صحابہ کی صورت میں تیار ہو گئی جو باقی دنیا تک اسلام کے پیغام کو پہنچانے اور ان کے قوت و شوکت کے سرچشموں کو توڑنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اور اس نے فی الواقع چند ہی سالوں میں آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد یہ سب کچھ کر دکھایا۔ اس لئے جتنا کام آنحضرت ﷺ کے سپرد کیا گیا تھا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جب وہ بتمام و کمال پورا ہو گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ اب آپ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں لگ جایئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف واپسی کی تیاری کیجئے۔ اور اپنی امت کیلئے استغفار کیجئے۔ اور آپ دنیا کے سامنے یہ اسوہ پیش کیجئے کہ بڑی سے بڑی کامیابی اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک بندہ بڑی سے بڑی کامیابی کے حصول کے بعد بھی غرور میں مبتلا ہونے کی بجائے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتا ہے کہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ سراسر اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش ہے۔ میرا احساس تو یہ ہے کہ میں وہ کچھ نہ کر سکا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ یہی وہ فرق ہے جو اللہ تعالیٰ کے رسول اور دنیا کے شہنشاہوں کو واضح طور پر الگ الگ کر دیتا ہے۔ اور یہی وہ کلمۂ شفاء ہے جس کے بغیر نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت آتی ہے اور نہ فتح نصیب ہوتی ہے۔ اور جس کے حاصل ہو جانے کے بعد کسی بادشاہ کا تخت نہیں بچھایا جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا تختِ اقتدار اس کی سرزمین پر سایۂ رحمت بن کر انسانوں کو نوازتا اور ان کیلئے انصاف اور عدل کا سامان کرتا ہے۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ۱	سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۰)	اٰيَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ
اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

رکوع: ۱۔ (جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے۔ ۱) اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔ ۲) تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے اور اس سے مغفرت کی دعا مانگئے، بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ۳)

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾

(جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے۔ ۱)

یہ آخری سورۃ ہے، نصر اور فتح مخصوص مفہوم میں ہے

ہم اس سے پہلے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ یہ سورۃ قرآن کریم کی آخری سورۃ ہے، اس کے بعد کوئی مکمل سورۃ نازل نہیں ہوئی۔ البتہ بعض آیات کا نازل ہونا ثابت ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے مطابق اس سورۃ میں آنحضرت ﷺ کی وفات حسرت آیات کی خبر دی گئی ہے۔ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے بالغ نظر شخص نے بھی اس بات کی تصدیق فرمائی۔ اور اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت آپہنچے، ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ مدد نہیں ہے جو زندگی کے بیشتر معاملات میں انفرادی اور اجتماعی طور پر صاحب ایمان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچتی رہتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ مدد ہے کہ جس مقصد کیلئے نبی کریم ﷺ کو مبعوث کیا گیا تھا اور مسلمان آپ کے ساتھ شب و روز جس مقصد کے حصول کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے وہ مقصد ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا وہ عمومی غلبہ تھا جس کے بعد

Marfat.com

کفر اسلام کے راستے کی رکاوٹ بننے کی بجائے اسلام کیلئے راستہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اور وہ تمام جتھے اور گروہ جنہوں نے اجتماعی طور پر اسلامی تحریک کو آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا، سرنگوں ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے کے آثار سامنے نظر آنے لگیں۔

اسی طرح فتح سے مراد بھی کسی ایک جنگ کی فتح یا عمومی فتوحات نہیں ہیں بلکہ وہ فتح ہے جس کے بعد کفر کی طاقتیں ٹوٹ جائیں اور کافرانہ قوتوں کا مرکز اعصاب اسلام کی گرفت میں آ جائے۔ اس لحاظ سے وہ فتح، فتحِ مکہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ کیونکہ قریش عرب کی مقتدر قوت تھے۔ ان کی تاریخی حیثیت، کاروباری برتری اور کعبۃ اللہ کی تولیت نے ان کو پورے جزیرہ عرب میں ایک فیصلہ کن حیثیت دے رکھی تھی۔ عرب کے دور دراز گوشوں کے لوگ بھی کسی بھی اجتماعی فیصلے سے پہلے ان کی طرف دیکھتے تھے۔ چنانچہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے جس طرح بے بسی کے ساتھ اپنا شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیئے گئے اور پھر ان کو مدینہ منورہ میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا، وہ صرف آٹھ سال کے محدود عرصے میں اس قابل ہو جائیں کہ وہ مکہ کی سرزمین پر قوت کا مظہر بن کر اس طرح حملہ آور ہوں کہ قریش ان کے سامنے سر اٹھانے کی بھی جرأت نہ کر سکیں۔ اور مکہ جو کل تک کفر کا مرکز تھا اسلام کا قلعہ اور مرکز بن جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ نصرت تھی جس نے فتحِ مکہ کا راستہ صاف کیا اور فتحِ مکہ کے بعد لوگوں کو اسلام کے بارے میں فیصلہ کرنے کی آزادی مل گئی۔ اب وہ اسلام کی خوبیاں دیکھتے تھے، اس کی صداقت کو پہچاننے کی کوشش کرتے تھے، قریش کے تیوروں کو دیکھنے کی ضرورت چنداں ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بعض اہلِ علم کو غزوۂ طائف و حنین سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ فتحِ مکہ وہ فتح نہ تھی جس کے بعد لوگوں کے سامنے اسلام کی حقانیت کا راستہ کھل گیا، بلکہ اب بھی کفر میں بہت دم خم باقی تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزوۂ حنین کفر کی حرکتِ مذبوحی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ بجھتے ہوئے دیئے کی آخری لو تھی جس کے بعد اس کا تیل ختم ہو گیا۔ اور یہ وہ درخت تھا جس کی جڑیں خشک ہو کر رہ گئیں۔ اور جزیرہ عرب میں سے کسی نے ان کی حمایت میں سر اٹھانے کی کوشش نہ کی تھی بلکہ جزیرہ عرب کے رہنے والے لوگوں کا اب رجحان انکار و تکذیب کی طرف نہیں بلکہ تسلیم و انقیاد کی طرف تھا۔

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲

(اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔ ۲)

فتح کا نمایاں پہلو

اور آپ ایک محدود عرصے کے بعد فتحِ مکہ کے اثرات کے طور پر لوگوں کو دیکھیں کہ اب وہ چھپتے اور ڈرتے ہوئے ایک ایک دو دو کر کے اسلام میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کر رہے بلکہ وہ پورے کے پورے قبیلے اور بڑے بڑے علاقوں کے باشندے فوج در فوج مدینے کا رخ کرنے لگیں اور اسلام کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش کرنے لگیں۔ چنانچہ یہ زمانہ فتحِ مکہ کے تقریباً ایک سال کے بعد ۹ ہجری میں شروع ہوا کہ دور دراز علاقوں سے وفود کا سیلاب پھوٹ نکلا، اس لئے اس سال کو عام الوفود کہتے ہیں۔ یمن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں سے سات سو آدمیوں پر مشتمل قافلہ نکلا جو راستے میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے ترانے گاتا ہوا، نمازیں پڑھتا ہوا مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ اس

Marfat.com

طرح چند ہی مہینوں میں عرب کے بیشتر لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئے۔ حتیٰ کہ جب نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع کیلئے تشریف لے گئے تو اس وقت پورا عرب اسلام کے زیرِ نگیں ہو چکا تھا اور ملک میں کوئی مشرک باقی نہیں رہا تھا۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ﴿٣﴾

(تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے اور اس سے مغفرت کی دعا مانگئے، بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ۳)

ادائے شکر کیلئے آنحضرت ﷺ کو تسبیح وحمد اور استغفار کی ہدایت

حمد اللہ تعالیٰ کی تعریف کو بھی کہتے ہیں اور اس کا شکر ادا کرنے کو بھی۔ اور تسبیح کا معنی اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور منزہ قرار دینا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے آنحضرت ﷺ کو تین باتوں کا حکم دیا ہے۔ پہلی بات یہ کہ آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں۔ تسبیح تنزیہ کا ہم معنی ہے۔ یعنی آپ کے اور اصحاب ایمان کے دلوں میں کبھی اس بات کا وہم بھی پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کے غلبے اور اپنے کلمے کی بلندی کیلئے ہماری کاوشوں کا محتاج ہے۔ ہم نے شب و روز محنت کی، پسینہ بہایا، مال خرچ کیا، قربانیاں دیں، گلے کٹوائے اور خون دیا۔ اس کے نتیجے میں اسلام کو غلبہ ملا۔ اپنے دلوں کو اس بات سے یکسر خالی کر لیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی سربلندی کیلئے کسی کا محتاج نہیں۔ اس کی سنت یہ ہے کہ وہ انسانوں کو جنت کا مستحق اور اپنی رضا کا سزاوار بنانے کیلئے ان کو محنت، ایثار اور قربانی کا موقع دیتا ہے۔ ورنہ اگر وہ چاہتا تو اس کے بغیر بھی سب کچھ کر سکتا تھا۔ اور دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ تمہاری یہ تسبیح اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ ہونی چاہئے۔ یعنی تمہیں جب بھی اپنی قربانیاں یاد آئیں، اپنے کارناموں کی یاد تازہ ہو تو فوراً دلوں اور دماغوں میں یہ تصور غالب آجانا چاہئے کہ ہماری یہ تمام مساعی اور ہماری یہ ساری قربانیاں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کی محتاج تھیں۔ اسی کی توفیق تھی کہ ہمیں ایمان کی دولت ملی اور اسی کی تائید تھی کہ ہم اس کیلئے کچھ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ورنہ کتنے بے شمار لوگ ہیں کہ وہ جسمانی توانائیاں، دماغی رعنائیاں اور حالات کی کامرانیاں ہم سے زیادہ رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں وہ توفیق نصیب نہ ہو سکی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نصیب میں لکھی ہے۔

اور ساتھ ہی ساتھ حمد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کوئی تجریدی آرٹ نہیں جس کی حقیقت کوئی نہ ہو۔ نہ وہ کوئی ذہنی آورش ہے جو محض تصوراتی چیز ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثبات ہے جسے دلوں اور دماغوں میں رسوخ ملنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی حکمرانی ہونی چاہئے۔ اور یہی وہ مقصد ہے جسے لے کر دنیا میں اللہ تعالیٰ کے رسول مبعوث ہوتے ہیں اور یہی وہ امانت ہے جو امتوں کے سپرد کی جاتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے سب اس بات کے پابند ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل، اس کی صفتِ حاکمیت اور اس کی کبریائی کا جھنڈا اس کی زمین پر گاڑ دیں۔ اور اہلِ زمین کو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی ترغیب دیں۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں۔ یعنی مغفرت اور بخشش مانگیں۔ مغفرت اور بخشش کا تعلق گناہ سے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ تو پھر یہاں مغفرت کا کیا مفہوم؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ

Marfat.com

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انبیاء ورسل علیہم السلام اتباعِ ہوئی کی قسم کے گناہ تو کبھی نہیں کرتے۔ وہ شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور کبھی ان پر گناہ کے محرکات غالب نہیں آتے۔ البتہ بعض اوقات کوئی نیک محرک ان کو کسی نیکی میں حدِ مطلوب سے متجاوز کر دیتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو کسی امتی میں ہو تو نیکی کہلائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا رسول چونکہ ہر لحاظ سے ایک نمونہ ہوتا ہے اس لئے اسے اس سے بھی روکا گیا ہے اور اس کو اس پر بھی استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے مقامِ بلند کے حوالے سے بعض ایسی چیزوں کو بھی جو عام حالات میں بری نہیں، لیکن ان کے مقامِ بلند کے حوالے سے وہ فروتر نظر آتی ہیں انہیں گناہ قرار دیا گیا ہو۔ ایسی بھول چوک اور ایسی کوتاہی سے بھی انہیں استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور مزید یہ کہ ان کے زیرِ تربیت اصحابِ ایمان کی خوبیاں اور قربانیاں جس طرح ان کی طرف منسوب ہوتی ہیں اسی طرح ان کی ہلکی پھلکی کمزوریاں بھی آپ کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے دیگر اصحابِ ایمان کیلئے بھی آپ کو استغفار کا حکم دیا گیا اور ان کی غلطیوں کو آپ کی غلطیاں ٹھہرایا گیا تا کہ ان کی مغفرت یقینی ہو جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ جب کوئی نماز پڑھتے تو یہ دعا کرتے تھے سُبْحَانَکَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ (رواہ البخاری) حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ اس سورۃ کے نزول کے بعد اٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے آپ ہر وقت یہ دعا پڑھتے تھے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ۔

ان دعاؤں کے ساتھ ساتھ آپ کی عبادات میں بھی اضافہ ہو گیا اور آپ نے اس حد تک مجاہدہ فرمایا کہ آپ کے پاؤں متورم ہو گئے، لیکن آپ برابر اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید اور استغفار میں لگے رہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ اللَّھَبِ

(۱۱۱)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ اللَّهَبِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَللَّهَبُ ہے۔اس میں ایک رکوع، پانچ آیتیں، بیس کلمات اور ستر حروف ہیں۔

مقام نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے، کیونکہ یہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے۔جن لوگوں نے اس کے مضمون کو دیکھ کر اسے مدنی قرار دیا ہے ان کا اندازہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مفسرین کا اس کے مکی ہونے پر اتفاق ہے۔

زمانۂ نزول:۔ ٹھیک ٹھیک اس زمانے کا تعین جب یہ سورۃ نازل ہوئی ہے مشکل ہے۔بعض لوگوں نے صحیحین کی روایت کو اس کا شانِ نزول قرار دے کر اس کے نزول کو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے جلدی بعد کا واقعہ قرار دیا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا جو مزاج قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت اور آپ کے لائے ہوئے دین کے بارے میں اشتعال کا نہیں بلکہ حلم اور بردباری کا ہے۔اس لئے یہ بات کسی طرح قرینِ قیاس نہیں کہ ابولہب کی کسی بدزبانی پر غضب میں آکر پروردگار نے آنحضرت ﷺ کی جمعیتِ خاطر کیلئے یہ سورۃ نازل فرمائی ہو۔کیونکہ مکے اور طائف کے سرداروں کا مزاج ابولہب سے مختلف نہ تھا۔وہ بارہا اس طرح کی گستاخیوں کا ارتکاب کرتے تھے لیکن پروردگار نے ان کا نام لے کر کبھی مذمت نہیں فرمائی۔اور آنحضرت ﷺ نے بھی ہمیشہ درگزر سے کام لیا اور کبھی ان کیلئے بددعا تک نہ فرمائی۔البتہ صحیحین کی روایت اپنی جگہ بالکل صحیح ہے جس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے بارے میں سب سے پہلے دریدہ دہنی کا ثبوت ابولہب نے دیا ہے۔لیکن جب یہ مرض بڑھتا گیا اور باہر سے آنے والے کفار کیلئے غلط فہمیوں کا باعث بننے لگا تو یہ ضروری ہو گیا کہ ایسی سورۃ نازل ہو۔اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورۃ تو مکہ معظمہ ہی میں نازل ہوئی ہے لیکن آغاز میں نہیں بلکہ اس وقت نازل ہوئی ہے جب ابولہب کی مخالفت اپنی حد سے آگے نکل گئی تھی۔

صحیحین کی وہ روایت جسے اس کا شانِ نزول سمجھا جاتا ہے اور جسے ابولہب کی مخالفت کا آغاز کہا جاتا ہے، وہ روایت یہ ہے جسے ابن عباس نے مختلف سندوں سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو دعوتِ عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآنِ مجید میں وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو آپ نے صبح سویرے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا "یاصباحاہ" (ہائے صبح کی آفت)۔عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کیلئے آتے دیکھ لیتا تھا۔حضورؐ کی یہ آواز سن کر لوگوں نے دریافت کیا، یہ کون پکار رہا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ محمد (ﷺ) کی آواز ہے۔اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے۔جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا اور جو نہ آسکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا۔جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے لے کر پکارا۔اے بنی ہاشم، اے بنی

Marfat.com

عبدالمطلب، اے بنی فہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر حملہ کرنے کیلئے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں آپ سے کبھی جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے، اس پر قبل اس کے کوئی اور بولتا، حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا ''ہلاکت ہو تیرے لئے، کیا تو نے اس لئے ہمیں جمع کیا تھا'' ایک روایت میں ہے کہ اس نے پتھر اٹھا لیا تا کہ رسول اللہ ﷺ پر کھینچ مارے۔

اس روایت کی بنیاد پر بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ اس کے فوراً بعد متذکرہ بالا سورۃ نازل ہوئی ہے۔ روایت کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس سورۃ کا نزول اس کے فوراً بعد ہوا ہے۔ کیونکہ جہاں تک اس روایت میں تَبًّا کے لفظ کا تعلق ہے جس سے غلط فہمی ہو رہی ہے تو یہ لفظ صرف یہیں استعمال نہیں ہوا بلکہ ابنِ زید کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسول اللہ ﷺ سے ایک روز پوچھا کہ اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا۔ آپ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا میرے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پر وہ بولا تَبًّا لِھٰذَا الدِّیْنِ تَبًّا اَنْ اَکُوْنَ وَھٰؤُلَاءِ سَوَاءً ''ہلاکت ہو اس دین کیلئے جس میں، میں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں'' اس لئے صرف اس لفظ کے استعمال کو اس سورۃ کا سبب قرار دینا مناسب نہیں۔ اصل میں اس سورۃ کا نزول چند اسباب کی وجہ سے ہوا جسے ہم اختصار سے ذکر کرتے ہیں۔

ا۔ سب جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت ملکِ عرب میں شدید بدامنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ کسی کی جان، مال اور عزت محفوظ نہ تھی۔ حفاظت کا صرف ایک ذریعہ تھا، وہ تھا قبیلے کا وجود۔ کیونکہ ہر قبیلہ اپنے ایک ایک شخص کی حفاظت کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ قبیلے کا سردار قبیلے کے ہر شخص کے جان، مال اور عزت کا محافظ ہوتا تھا۔ اور اسی وجہ سے قبیلے میں صلہ رحمی اور قرابت داری کو بے حد اہمیت دی جاتی تھی۔ اگر کسی شخص کا باپ نہ ہوتا تو چچا باپ کے قائم مقام سمجھا جاتا تھا۔ چچا حتی الامکان بھتیجے کیخلاف لب کشائی نہ کرتا تھا۔ اور بھتیجا ممکن حد تک اپنے چچا کا احترام بجا لاتا اور کبھی اس کی رائے کیخلاف سوچنے کی زحمت بھی نہ کرتا تھا۔ کیونکہ یہی ان کے تحفظ کی ضمانتیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد آپ کے اپنے خاندان کے ان افراد نے بھی کبھی آنحضرت ﷺ کی مخالفت نہ کی، جو آپ پر ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن آپ سے قبیلے کا رشتہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ شعب ابی طالب میں جب مسلمانوں کو محصور کر دیا گیا اور معاشرتی اور مالی بائیکاٹ کر دیا گیا۔ تو اس انتہائی تکلیف دہ حالت میں بنی ہاشم اور بنی مطلب دونوں شریک رہے قطع نظر اس سے کہ وہ آپ پر ایمان لائے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایمان کا معاملہ اپنی جگہ لیکن دوسرے قبائل کے مقابلے میں آنحضرت ﷺ کی حمایت ہماری ذمہ داری ہے کیونکہ آپ سے ہماری قرابت داری اور قبیلے کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ لیکن ابولہب نے سب سے پہلے ان رشتوں کو توڑا۔ اس نے سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی مخالفت کی اور پھر اس مخالفت میں بڑھتا چلا گیا جس کے شواہد مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ مکہ معظمہ میں ابولہب حضورؐ کا ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر کی دیوار مشترک تھی۔ اور عرب میں ہمسائیگی کا بے حد لحاظ کیا جاتا تھا۔ لیکن اس شخص نے اس رشتے کی بھی پرواہ نہ کی۔ یہ شخص آپ کو گھر میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ کبھی آپ پر بکری کی اوجھ پھینک دیتا، کبھی ہنڈیا کے اوپر گندگی پھینک دی جاتی اور کبھی آپ کے گھر کے باہر خاردار جھاڑیاں ڈال دی جاتیں تا کہ جب آپ باہر نکلیں تو آپ زخمی ہو جائیں۔

Marfat.com

۲۔ نبوت سے پہلے آپ کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں کے نکاح میں تھیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد جیسے جیسے آپ کی دعوت کا دائرۂ اثر بڑھا اس کی مخالفت بھی شدید ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو بلا کر کہا کہ میرے لئے تم سے ملنا حرام ہے جب تک تم محمد (ﷺ) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دو۔ چنانچہ ان دونوں نے طلاق دے دی۔ اور اس کے ایک بیٹے عتیبہ نے انتہائی بدتمیزی کرتے ہوئے آپ پر تھوکنے کی کوشش کی۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ پروردگار اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر دے۔ چنانچہ یہ شخص اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر گیا تو ایک رات ساری احتیاطوں کے باوجود شیر آیا اور اسے چیر پھاڑ کے پھینک گیا۔

۳۔ آنحضرت ﷺ کے بیٹے کا انتقال ہوا تو یہ ظالم شخص کلمۂ تعزیت کہنے کی بجائے خوشی خوشی قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور ان کو اس حادثے کی خبر دی۔

۴۔ آنحضرت ﷺ جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کیلئے جاتے، یہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا۔ اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ آپ پر پتھر بھی پھینکتا جن سے آپ کی ایڑیاں خون سے تر ہو جاتیں اور ساتھ یہ کہتا جاتا، یہ جھوٹا ہے اس کی بات نہ ماننا۔ ان شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص نے مخالفت کو دشمنی کا رنگ دے دیا تھا اور اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت آگے نہ بڑھنے پائے اور اس کے کسی کام سے یہ گمان نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کا آنحضرت ﷺ سے کوئی رشتہ بھی ہے۔ ان حالات میں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک ایسی سورۃ نازل ہوتی جس سے لوگوں کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو جاتی کہ یہ شخص صرف مخالف نہیں بلکہ دشمنی میں باولا ہو گیا ہے اور اس نے خاندانی اور قرابت کے تمام رشتوں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے تاکہ لوگ اس کی مخالفت سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہیں۔ یہ سبب ہے جس کی وجہ سے عرب کی عام روایت اور رشتوں کے عام تقدس کے علی الرغم ابولہب کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی اور اس کی دشمنی کو بھی صحیح تناظر میں نمایاں کیا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نگاہ میں اسلام کے مقابلے میں حقیقی چچا کا رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا تو کسی اور نسبت کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ اصل حوالہ صرف اسلام سے وابستگی اور آنحضرت ﷺ پر ایمان ہے۔ اس کے نتیجے میں غیر بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے انکار کر کے اپنے بھی غیر بن جاتے ہیں۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ۵	سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّة (۱۱۱)	رُكُوْعَاتُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ②
سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④
فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ⑤

رکوع: ۱۔ (ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ، اور وہ تباہ و برباد ہوگیا۔ ۱) اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ۲) ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا۔ ۳) اور اس کی بیوی بھی ایندھن اٹھانے والی۔ ۴) اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی۔ ۵)

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ①
(ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ، اور وہ تباہ و برباد ہوگیا۔ ۱)

لفظ ابولہب کی تحقیق

ابولہب کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا جس کا معنی ہے عزیٰ کا بندہ۔ عزیٰ ایک بت کا نام ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اسے عبدالعزیٰ کے نام سے پکارنا پسند نہ فرمایا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ابولہب کا معنی ہے شعلے والا، یعنی شعلہ رو۔ اس کا رنگ بہت چمکتا ہوا اور سرخ و سفید تھا۔ اس لئے یہ ابولہب کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے خود اپنی کنیت ابولہب رکھی یا اس کے خوشامدیوں نے اسے ابولہب کی کنیت سے پکارنا شروع کر دیا۔ قرآنِ کریم نے بھی اسے اسی کنیت سے ذکر فرمایا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اس کی اس کنیت سے اس کے انجام کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کیونکہ قیامت کے دن وہ جہنم کے شعلوں میں ڈالا جائے گا۔

Marfat.com

تَبَّتْ يَدَاهُ کا مفہوم

تَبَّ تباب سے مشتق ہے۔ اور تَبَّتْ بھی اسی سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے ہلاک اور برباد ہو۔ تو پہلے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں یا ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔ دونوں ہاتھوں کے ٹوٹ جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقاصد کے حصول میں ناکام اور نامراد ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بددعا ہے۔ اور اس کے بعد میں آنے والا تَبَّ وہ بھی ایک جملہ ہے۔ اس کا معنی ہے اور وہ ہلاک ہو گیا۔ اس لحاظ سے یہ جملہ خبریہ ہے۔ یعنی پہلے جملہ انشائیہ میں جو بددعا دی گئی تھی دوسرے جملے نے اس کے پورا ہونے کی اطلاع دے دی۔ بعض لوگوں نے دونوں جملوں کو خبریہ قرار دیا ہے اور پھر دوسرے جملے کو پہلے جملے کی تاکید ٹھہرایا ہے۔ لیکن علامہ پانی پتی فرماتے ہیں اَخْبَارٌ بَعْدَ اَخْبَارٍ لِلتَّاكِيْدِ اَوِ الْاُوْلٰى دُعَائِيَّةٌ وَالثَّانِيُ اَخْبَارِيَّةٌ چنانچہ دوسرے جملے میں جو اس کی ہلاکت اور ناکامی کی خبر دی گئی ہے وہ جنگِ بدر کے بعد پوری ہوگئی کہ جنگِ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور قیادت کی دوسری صف گرفتار ہوگئی۔ اور یہ سب لوگ اسلام کی دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ اس طرح سے اسلام کو ناکام کرنے میں وہ شب و روز جن کوششوں میں مصروف تھا ان میں ناکام ہو گیا۔ اور جہاں تک اس کی ہلاکت کا تعلق ہے جنگِ بدر کو ابھی ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ اسے طاعون کی گلٹی نکلی جس کو عرب عدسہ کہتے ہیں۔ اس بیماری کو متعدی سمجھا جاتا تھا۔ گھر والوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ متعدی مرض میں مبتلا ہو گیا ہے اس کو الگ ڈال دیا۔ اسی حالت میں وہ مر گیا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا۔ یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بو پھیلنے لگی۔ آخر کار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دیئے تو ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے کچھ حبشیوں کو اجرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور انہیں مزدوروں نے اسے دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اسے ڈھانپ دیا۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝۲

(اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ۲)

ابولہب کی امارت پر تعریض

کہا جاتا ہے کہ ابولہب مکہ معظمہ کے چار امیر ترین لوگوں میں سے تھا۔ قاضی رشید بن زبیر اپنی کتاب الذخائر والتحف میں فرماتے ہیں کہ ان چار آدمیوں میں سے ہر ایک، ایک قنطار سونے کا مالک تھا۔ قنطار دو سو اوقیہ کا اور ایک اوقیہ سوا تین تولے کا ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی گرفت آئی تو اس کا یہ کثیر مال اس کے کسی کام نہ آیا اور اسے عزت کی موت بھی نصیب نہ ہوسکی۔ حالانکہ اس کا حال یہ تھا کہ حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا تو ابولہب نے یہ کہا تھا کہ جو کچھ یہ میرا بھتیجا کہتا ہے اگر وہ حق ہی ہوا تو میرے پاس مال و اولاد بہت ہے میں اس کو دے کر اپنی جان بچا لوں گا۔

Marfat.com

مَا کَسَبَ سے مراد؟

مَا کَسَبَ بعض مفسرین نے اس سے مال کا منافع مرادلیا ہے۔گویااس کا منافع اس کا کسب تھا۔اور بعض اہلِ علم نے اس سے اولاد مرادلی ہے۔کیونکہ اولاد بھی انسان کی کمائی ہوتی ہے۔حضرت عائشہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان اطیب ما اکل الرجل من کسبه وان ولده من کسبه ''یعنی جوکھانا آدمی کھاتا ہےاس میں سب سے زیادہ حلال طیب وہ چیز ہے جوآدمی اپنی کمائی سے حاصل کرے،اورآدمی کی اولاد بھی اس کے کسب میں داخل ہے۔'' ان دونوں معنی میں سے کوئی معنی بھی مرادلیا جاسکتا ہے،دونوں معنی ابولہب کے انجام سے مناسبت رکھتے ہیں۔کیونکہ جب وہ عدسہ کے مرض میں مبتلا ہواتو نہ تواس کا مال اس کے کسی کام آیااور نہ اس کی اولاد نے اس کو سہارا دیا بلکہ اسے بےکسی کی موت مرنے کیلئے چھوڑ دیا۔اس کو عزت کے ساتھ دفن کرنے کی بھی اولاد کو توفیق نہ ہوئی۔اس طرح سے قرآنِ کریم نے جو پیشگوئی کی تھی وہ چند ہی سال میں پوری ہوئی۔

سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳

(ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا۔ ۳)

آخرت میں ابولہب کا انجام

دنیا میں عبرتناک موت ہی اس کے اندوہناک انجام کیلئے کافی نہیں بلکہ قیامت کے دن اسے ایک ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جو شعلے اگلنے والی ہوگی۔یوں تو جہنم کی آگ کی تیزی اوراس کی حدت اپنی مثال نہیں رکھتی لیکن یہاں بطورِ خاص جس آگ کو شعلہ زن قرار دیا ہے،اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے شعلوں کی تیزی کا عالم کیا ہوگا۔اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ چونکہ یہ ابولہب کے نام سے معروف تھا اس لئے اسے جس آگ میں ڈالا جائے گا وہ آگ بھی ذات لہب ہوگی۔اس طرح سے اس کے نام اوراس کے انجام میں مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴

(اوراس کی بیوی بھی ایندھن اٹھانے والی۔ ۴)

اِمْرَاَتُهٗ سے مراد؟

اس کی بیوی کا نام اروٰی تھا اور کنیت ام جمیل تھی۔یہ ابوسفیان کی بہن تھی اور بھینگی تھی۔اس کے دل میں آنحضرت ﷺ کی عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اس لحاظ سے وہ اپنے شوہر سے کم نہ تھی۔کہا جاتا ہے کہ اس کا مشغلہ یہ تھا کہ دن کے وقت جنگل میں نکل جاتی، خاردار لکڑیاں چنتی رہتی اور گٹھا باندھ کر اٹھالاتی اور رات کے وقت اس راستے میں ان کانٹوں کو بچھادیتی جہاں سے نبی کریم ﷺ کا گزر رہتا تھا۔جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو وہ بپھری ہوئی آنحضرت ﷺ کی تلاش میں نکلی اوراپنی مٹھیوں میں سنگریزے لئے ہوئے تھی۔حرم میں پہنچی تو

Marfat.com

وہاں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب اس کو آتے ہوئے دیکھا تو عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ام جمیل آ رہی ہے اور یہ ضرور کوئی بے ہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا وہ مجھے نہ دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ قریب آ کر حضورؐ کو نہ دیکھ سکی اور بڑبڑاتے ہوئے واپس چلی گئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس آگ میں اس کا گستاخ خاوند جلایا جائے گا اسی آگ میں اسے بھی جھونکا جائے گا۔ بعض اہلِ علم نے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا ترجمہ لوگوں میں فساد ڈلوانے کیلئے چغلیاں کھانی والی کیا ہے۔ یعنی اس عورت کا مشغلہ یہ تھا کہ یہ ادھر کی بات ادھر لگا کر فساد کی آگ بھڑکاتی تھی اور اس طرح سے لوگوں کو آنحضرت ﷺ اور ان کے لائے ہوئے دین کے خلاف مشتعل کرتی تھی۔ لیکن بعض دیگر اہلِ علم اسے تکلف قرار دیتے ہیں۔ اور لکڑیاں اٹھانے والی کو بھی ترجمہ کے طور پر قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ابولہب مکہ کا ایک رئیس آدمی تھا۔ اور سیاسی طور پر بھی اسے بڑی اہم حیثیت حاصل تھی اور اس کی بیوی بھی ایک نامور قبیلے کی عزت اور ایک نامور بھائی کی بہن تھی۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ جنگل میں لکڑیاں چننے کیلئے جاتی ہو۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کا تعلق اس کی دنیوی زندگی سے نہیں بلکہ آخرت سے ہے۔ یعنی آخرت میں قدرت اس کو یہ سزا دے گی کہ وہ اپنے خاوند کی آگ کو بھڑکانے کیلئے لکڑیاں اٹھا کے لائے گی اور اسی آگ میں خود بھی جلے گی۔ گویا یہ اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے مترادف ہے۔ اور قرآنِ کریم نے بھی اپنا بوجھ خود اٹھانے کا قیامت کے دن ذکر فرمایا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مشہور روایات میں آنحضرت ﷺ کے گھر کے باہر خاردار جھاڑیاں بچھانے کا ذکر ہے لیکن اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی لونڈیاں اور غلام خاردار جھاڑیاں چن کر لاتے ہوں اور اس کے حکم سے حضور کے راستے میں بچھا دیتے ہوں۔ اور ان ہی خاردار جھاڑیوں کا بوجھ وہ قیامت کے دن اٹھائے ہوئے ہوگی۔

فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

(اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی۔ ۵)

ابولہب کی بیوی کا انجام

جِیْدِ عربی زبان میں ایسی گردن کو کہتے ہیں جس میں زیور پہنا گیا ہو۔ اور اس خاتون کے بارے میں روایات میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک بہت قیمتی ہار گردن میں پہنتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ لات اور عزیٰ کی قسم میں یہ ہار بیچ کر اس کی قیمت محمد (ﷺ) کی عداوت پر خرچ کروں گی۔ یہی ہار اس کا قیامت کے دن مونجھ کی رسی میں تبدیل ہو جائے گا۔

مَسْدِ بسکون السین مصدر ہے جس کے معنی رسی یا ڈور بٹنے یا اس کے تار پر تار چڑھا کر مضبوط کرنے کے ہیں۔ اور مَسَدٍ بفتح المیم والسین اس رسی یا ڈور کو کہا جاتا ہے جو مضبوط بنائی گئی ہو، خواہ وہ کسی چیز کی ہو۔ کھجور یا ناریل وغیرہ سے ہو یا آہنی تاروں سے ہر طرح کی مضبوط رسی اس میں داخل ہے۔ (کذافی القاموس)

مختصر یہ کہ ابولہب شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور اس کی بیوی اس کی آگ بھڑکانے کیلئے لکڑیاں اٹھا کر لائے گی اور اس کی گردن میں مضبوط سے مضبوط تر رسی ہوگی جو اس کیلئے سزا بھی ہوگی اور ذلت کا سامان بھی۔

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑ گڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ

(۱۱۲)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کے بہت سے نام ہیں لیکن ان سب میں معروف اور متداول نام الاخلاص ہے۔ یہ صرف اس سورۃ کا نام ہی نہیں بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے۔ کیونکہ اخلاص کا مطلب اللہ تعالیٰ پر اس طرح ایمان لانا ہے کہ اس کی ذات یا صفات یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی پہلو سے کسی دوسرے کی شرکت کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔ اور اس سورۃ میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی آیات چار، اس کے کلمات پندرہ اور اس کے حروف کی تعداد سنتالیس ہے۔

زمانۂ نزول:۔ اس کے مکی اور مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور بعض اہلِ علم کے نزدیک اس کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔ یہ اختلاف درحقیقت ان روایات کی بنا پر ہے جو اس کے سببِ نزول کے بارے میں منقول ہوئی ہیں۔

حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ کی روایت اور ابوالعالیہ کی وہ روایت جو انہوں نے حضرت ابی ابنِ کعبؓ کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن حضرت عکرمہؓ نے جو حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت نقل کی ہے جس میں چند اشراف یہود کا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح عامر بن طفیل کی روایت اور نجران کے عیسائیوں کے وفد کے آنحضرت ﷺ سے سوالات اور ایسی ہی چند دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ آپ سے کیئے گئے سوالات کے جواب میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور ان روایات میں خاص طور پر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان میں صراحت کی گئی ہے کہ یہ سورۃ اس موقع پر نازل ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سورۃ نہ صرف کہ مکی ہے بلکہ اس کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں قرآنِ کریم کی مفصل آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں۔ رہی یہ بات کہ دونوں طرح کی روایات میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ یہ سورۃ اس موقع پر نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نازل تو یہ مکہ مکرمہ میں ہی ہوئی لیکن مدینہ طیبہ میں جب آپ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوالات کیئے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہ ہدایت کی گئی کہ یہ سورۃ انہیں پڑھ کر سنائی جائے۔ اس ہدایت کو اس طرح روایات کیا گیا ہے کہ گویا یہ سورۃ اس وقت آپ پر نازل ہوئی۔ اور بعض اہلِ علم نے اسے تکرارِ نزول سے تعبیر کیا ہے، یعنی اس سورۃ کا نزول ایک سے زیادہ مرتبہ ہوا ہے۔

Marfat.com

مضامین:۔ نبی کریم ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو آپ نے مشرکین کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تصور پیش کیا اور پوری قوت سے توحید کی دعوت لوگوں کے سامنے رکھی۔ تو اس وقت باوجود اس کے کہ تمام لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے خالق و مالک ہونے کو بھی مانتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے شرک کے بے شمار دروازے کھول رکھے تھے۔ مشرکینِ عرب ان خداؤں کو پوج رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ مختلف چیزوں سے بنے ہوئے تھے اور شکل، صورت اور جسم بھی رکھتے تھے۔ لیکن بعض دوسری قومیں دیویوں اور دیوتاؤں کو تسلیم کرتی تھیں اور ان میں باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی، اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ انسانوں کی طرح انہیں بھی غذائی ضروریات لاحق تھیں اور ان کے پجاری ان کیلئے ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ بعض مشرکین ایسے بھی تھے جو اللہ تعالیٰ کے انسان میں حلول کے قائل تھے۔ اور بعض لوگوں کو اس کا اوتار مانتے تھے۔ اہلِ کتاب اگرچہ اپنے آپ کو توحید پرست کہتے تھے لیکن عیسائیوں کا خدا ایک بیٹا رکھتا تھا اور اس کی خدائی میں روح القدس بھی شامل تھا۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کے باوجود حضرت عزیر کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ اور ان کا خدا انسانی صفات رکھتا تھا۔ وہ ٹہلتا بھی تھا اور کبھی اپنے کسی بندے سے کشتی بھی لڑ لیتا تھا۔ دنیا میں آتش پرستوں کی بھی ایک تعداد تھی اور ستارہ پرست بھی پائے جاتے تھے۔ ان حالات میں جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت پیش کی تو لوگوں کے ذہنوں میں وہ سوالات پیدا ہوئے جو ان کے اپنے اعتقادات سے پھوٹتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مختلف قسم کے سوالات کے جواب میں ایک ایسی سورۃ نازل فرمائی جو چند گنے چنے الفاظ پر مشتمل ہے۔ صرف چار چھوٹے چھوٹے بول ہیں لیکن اس کے اعجاز کا کمال یہ ہے کہ اس نے تمام مشرکانہ تصورات کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کی صفات میں کسی آمیزش اور آلودگی کیلئے کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔

فضیلت اور اہمیت:۔ چونکہ اس میں اسلام کے سب سے اہم عقیدے کو بیان کیا گیا ہے اور لوگوں کے سوالات اور اشتباہات کا جواب دیا گیا ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں اس سورۃ کی بڑی عظمت تھی۔ آپ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اس کی اہمیت محسوس کراتے تھے تاکہ وہ کثرت سے اسے پڑھیں اور لوگوں میں پھیلائیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کہ آنحضرت ﷺ نے ایک روز صحابہ کو حکم دیا کہ اکٹھے ہو جاؤ میں تمہیں ایک تہائی قرآن سناؤں گا۔ چنانچہ لوگ جمع ہو گئے۔ حضور تشریف لائے، سورۃ اخلاص کی تلاوت فرمائی اور حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے گئے۔ لوگ کہنے لگے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا میں تمہیں ایک تہائی قرآن سناؤں گا اور آپ صرف ایک سورۃ سنا کر تشریف لے گئے ہیں۔ حضورؐ نے واپس آ کر فرمایا کہ میں نے تمہیں یہی کہا تھا کہ میں تمہیں ایک تہائی قرآن سناؤں گا، کان کھول کر سن لو، یہ سورۃ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ مفسرین نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید جس دین کو پیش کرتا ہے اس کی بنیاد تین عقیدے ہیں۔ ایک توحید، دوسرا رسالت اور تیسرا آخرت۔ یہ سورۃ چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔ بخاری اور مسلم نے ایک صحابی کا واقعہ بیان کیا ہے جو ہر نماز میں قُلْ هُوَ اللّٰه ضرور پڑھتے تھے۔ حضورؐ نے جب یہ بات سنی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ اسے خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ اسے محبوب رکھتا ہے۔ اسی طرح کے اور فضائل بھی بعض روایات میں نقل کئے گئے ہیں جس سے اس سورۃ کی فضیلت اور اہمیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ۴	سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ (۱۱۲)	رُكُوْعَاتُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴

(کہہ دیجئے! وہ اللہ ہے یکتا۔ ۱) اللہ صمد ہے۔ ۲) نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ ۳)

اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ ۴)

قُلْ کا مفہوم

سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ کہہ دیجئے یعنی اعلان کر دیجئے اور جو سوالات آپ سے کئے جا رہے ہیں ان کے جواب میں یہ سورۃ ان کو پڑھ کر سنا دیجئے۔ بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد قریش میں سب سے زیادہ جس موضوع پر بحث ہوتی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی وحدانیت تھی۔ کیونکہ حضورؐ اپنی دعوت میں سب سے زیادہ زور اسی مرکزی مضمون پر دیتے تھے۔ اگرچہ رسالت اور معاد بھی ہر مجلس کا موضوع تھے، لیکن ان کی حیثیت ضمنی مباحث کی تھی، توحید کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ دنیا کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی بات پر گرما گرمی ہوتی اور وہ ہر مجلس کا موضوع بن جاتی اور بات بحث و مناظرہ تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے ختم کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ اس کا دوٹوک انداز میں اعلان کر دیا جائے تا کہ بحث کرنے والی زبانیں بند ہو جائیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو قُلْ کے ذریعے اس بات کا حکم دیا گیا۔ لیکن یہ بات جو بعض روایات میں کہی گئی ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا تھا کہ آپ جس رب کی طرف ہمیں دعوت دے رہے ہیں، وہ کون ہے؟ اس کا آپ ہم سے تعارف کرائیے تو اس بات کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن اس عاجز کا گمان یہ ہے کہ جب ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآنِ کریم قریش کے اسلوب پر نازل ہوا ہے اور بالخصوص اس کا اندازِ تخاطب اور سوالات کا انداز وہی ہے اور کسی بات کو سمجھنے کا اسلوب بھی وہی ہے جو قریش کا عام طریقہ تھا، تو پھر ان روایات کے انکار کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ قریش کا یہی طریقہ تھا کہ جب کوئی اہم بات ان کے سامنے آتی تھی اور کسی ذات کی طرف انہیں دعوت دی جاتی تھی۔ تو وہ سب سے پہلے اس کا تعارف چاہتے تھے اور ان کا انداز یہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ اس کا نسب بیان کیجئے۔ اور مراد یہ ہوتی تھی کہ اس کی پہچان کی جو باتیں کہی جا سکتی ہیں وہ آپ ہم سے کہئے۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تعرض نہیں کہ ان کی مجالس میں توحید سب سے اہم موضوع تھا اور آنحضرت ﷺ جب انہیں توحید کی دعوت دیتے تھے یا اپنے رب کی طرف بلاتے تھے تو وہ اس رب کا تعارف چاہتے تھے جس کی انہیں دعوت دی جا رہی تھی، انجام کے اعتبار سے بات ایک ہی ہے۔

Marfat.com

آیت کی ترکیب اور مفہوم

هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اگر هُوَ کو ضمیرِ شان قرار دیا جائے، جب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر یہ کہا جائے کہ هُوَ مبتداء ہے اور اللہ اس کی خبر ہے تو تب بھی بات وہی ہے۔ اور اگر اس بات کو مزید کھول دیا جائے کہ اَحَدٌ اس کی دوسری خبر ہے تو تب بھی کوئی فرق پڑنے کی بجائے بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جس رب کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہوں اور جس کا تم مجھ سے تعارف چاہتے ہو، وہ کوئی ایسا رب نہیں جو تمہارے لئے اجنبی ہو، بلکہ وہ اللہ ہے۔ یعنی وہی ہستی ہے جس کو تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔ اور اللہ رب کیلئے اسمِ ذات ہے کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی کے خدا یا انگریزی کے گاڈ (God) کی طرح اسمِ نکرہ نہیں کہ معبودِ واحد کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی بولا جاسکے۔ اس کی نہ جمع آتی ہے نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔

نزولِ قرآن سے پہلے بھی عربوں میں اللہ کا لفظ خدا کیلئے بطور اسمِ ذات کے ہی مستعمل تھا جیسا کہ شعراء جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے بلکہ نوعِ انسانی کے دینی تصورات کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے تصورِ توحید میں جب بگاڑ پیدا ہوا اور شرک کی مختلف صورتیں پیدا ہوئیں تو ان میں اہم تر مظاہرِ فطرت کی پرستش تھی۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ دیوتاؤں کے لئے پیدا ہو گئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اصنام پرستی کی اس وسعت کے باوجود ایک ایسی ہستی کے تصور سے انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا جو سب سے اعلیٰ اور سب کو پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام قوموں میں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے سے اس ان دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کو پکارا جاتا تھا بلکہ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ سامی زبانوں میں حروف واصوات کی ایک خاص ترکیب موجود رہی ہے جو اس معبودِ اعلیٰ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور تمام زبانوں میں اس کا مادہ مشترک رہا ہے۔ چنانچہ کلدانی اور سریانی کا ''الاہیا'' عبرانی کا ''الوہ'' اور عربی کا ''اِلٰہ'' اسی سے ہے اور بعض علماء کے نزدیک یہی اِلٰہ ہے جو حرفِ تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالقِ کائنات کیلئے مخصوص کر دیا ہے۔ مگر بیشتر علماء الف، لام کو تعریف کے لئے نہیں مانتے بلکہ اسے اس نام کا جزو قرار دیتے ہیں۔ اس لئے وہ لفظ اللہ کو کسی سے مشتق نہیں مانتے اور نہ اس سے کسی کو مشتق مانتے ہیں۔ چنانچہ یہی لفظ اللہ ہے جسے قرآنِ کریم نے بطور اسمِ ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی۔ ارشاد ہوا:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۝

اللہ کے لئے حسن وخوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں ہیں) پس چاہیے کہ اسے ان صفتوں کے ساتھ پکارو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر جن کلماتِ الٰہی کے ذریعے ذاتِ حق سبحانہٗ کا عرفان بخشا گیا وہ یہ ہیں اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا (طہٰ: ۱۴) اس میں بھی پروردگار نے لفظ اللہ کو بطور اسمِ ذات کے اختیار فرمایا اس لفظ کی معنوی بحث تو آگے آئے گی اس کے خواص لفظی کے سلسلہ میں ہم چند باتیں عرض کرتے ہیں:۔

Marfat.com

اللہ کے لفظی خواص

ا۔ یہ لفظ عجیب شان رکھتا ہے کہ جس کلمہ توحید کے ذریعے اللہ نے اپنا تعارف کرایا یعنی لاَاِلٰــہَ اِلَّا اللّٰــہ اور اسے مسلمانوں کا شعار بنایا۔ اس میں غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کلمہ توحید میں کوئی بھی زائد حرف موجود نہیں۔ وہی حروف ہیں جو اسمِ ذات کے اندر موجود ہیں، انہی کی ترکیب سے کلمہ توحید کو متشکل کیا گیا۔

۲۔ اللہ کا اگر حرف ''ھمزہ'' نہ لکھا جائے تو للہ پڑھا جائے گا۔ جس کے معنی ہیں ہر شے اللہ ہی کی ملک ہے۔

لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (منافقون:۷)

۳۔ للہ سے ایک لام کم کر دیا جائے تو (لہ) اور مزید ایک لام کرنے سے صرف (ہ) رہ جائیگا۔ جس کا تلفظ ''ھو'' ہے۔ یہ حرف واحد بھی اسی ذاتِ احد پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے '' قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' ''هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ''

۴۔ یہ اسی لفظ اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس پر تائے قسم وارد ہوتی ہے۔ ورنہ حرف ''تا'' بمعنی قسم اور کسی اسم پر وارد نہیں ہوتا۔

۵۔ اس اسمِ پاک کا ایک خاصہ یہ ہے کہ الحمد کا استعمال اسی اسمِ ذات کیلئے خاص ہے اور کسی اسم کے ساتھ الحمد کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ الحمد للہ کہیں گے۔ الحمدللرحمن یا الحمد للرحیم وغیرہ نہیں بولا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ اسمِ پاک مسمّٰی کی ذات وصفات سب پر حاوی ہے اسی طرح لفظ حمد بھی تمام صفاتِ کمال و جمال کا جامع ہے۔ لہٰذا کامل اسم کیلئے کامل ترنعت کی ضرورت تھی۔

۶۔ یہ بھی اسم اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس کے آخر میں حرف ''م'' شامل کیا جاتا ہے اور وہ حرفِ ندا کا کام دیتا ہے اور اس کے ساتھ حرفِ ندا شامل نہیں ہوتا یعنی ''یااللھم'' نہیں کہتے بلکہ اللھم کا معنی ہے ''اے اللہ''۔ قرآنِ کریم نے کئی جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ O

(آلِ عمران: ۲۶)

یہ تو تھے اس اسمِ پاک کے خواص لفظی اب دیکھئے اس کی معنوی بحث کو۔ پیچھے گزر گیا کہ بعض علماء کے نزدیک لفظ ''اللہ'' وہ عربی کا الٰہ ہے جو حرفِ تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اللہ، الٰہ سے ہے تو الٰہ کے معنی کیا ہیں؟ علماء لغت واشتقاق نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں۔ جنہیں ہم تفسیر کبیر کے حوالہ سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

ا۔ الهت الی فلاں سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں سکنت الی فلاں یعنی اللہ وہ ہے جس کے نام سے دلوں کو

Marfat.com

تسکین ملتی ہے اور قلبِ مضطر کو سکون۔ جیسے قرآن کریم کہتا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد : ۲۸)

۲۔ اِلٰہ، ولہ سے مشتق ہے جس کے معنی وارفتگی، تحیر اور درماندگی کے ہیں۔

۳۔ الــــہ لاہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی بلندشان کے ہیں یعنی اللہ وہ ہے جو لوازمات مادہ سے زمان و مکان کے احاطہ سے اور عقلمندوں کے فہم و ادراک سے ارفع اور بلند ہے۔

۴۔ لاہ یلوہ لاھیا سے مشتق ہے۔ جس کے معنی پوشیدہ اور مستور ہونا ہے یعنی اللہ وہ ہے جس کی ذات عقول سے محجوب ہے۔

۵۔ اِلٰہ الفیصل سے بنا ہے۔ یعنی اونٹنی کا بچہ جب بچھڑنے کے بعد ماں کو ملتا ہے تو وہ ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ وہ ہے کہ آفات و مصائب میں انسان اسی کی جانب لپکتا ہے اور وہیں اسے تسکین ملتی ہے۔

۶۔ الہ الۃ (سمع) سے بنا ہے۔ محاورہ ہے ''الہ علی فلاں'' اس سے ڈرتا رہا۔ الہ الۃ اس کی پناہ ڈھونڈی۔ یعنی اللہ وہ ہے جو خوف و ہراس کے وقت بندوں کی پناہ ہے۔ تمام عالم اور تمام مخلوقات اس کی حفاظت میں ہر ایک خطرہ سے محفوظ ہیں۔

ان تمام معنوں پر اگر تدبر سے کام لیا جائے تو چند باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ ہی کی ذات ہے جہاں پریشانی اور مصیبت میں قرار اور پناہ ملتی ہے۔ وہی آغوش ہے جہاں انسان سکون پاتا ہے۔ دل اس کی طرف لپکتے ہیں۔ محبتیں اسی کیلئے بے تاب ہوتی ہیں اور دوسری یہ بات کہ اگر اس ذات کی حقیقت کو جاننے کیلئے فہم و ادراک سے کام لیا جائے اور انسان کے پاس جتنے علوم دستیاب ہیں ان سب کو اس راستے میں استعمال کر کے دیکھ لیا جائے اور ظن و تخمین کے تمام ہتھیار بھی استعمال کر لئے جائیں تو حقیقت یہ ہے کہ بجز اس کے کہ انسان تحیر اور درماندگی کا شکار ہو جائے اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور و خوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی۔ اس لئے کہ ایک مخلوق اپنی فہم و ادراک کی وسعتوں کے باوجود مخلوق ہی ہے۔ وہ اپنے دستیاب وسائل میں ایک خالق کی وسعتوں کو نہیں سمیٹ سکتا۔ انسانی ذہن مخلوقات میں قدرت کا شاہکار ہے، لیکن وہ بہرحال مخلوق اور محدود ہے۔ محدود میں غیر محدود کبھی نہیں سما سکتا، اکبر مرحوم نے خوب کہا:

جو ذہن میں گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

البتہ! اس سے اگر اپنی ذات میں فہم و ادراک کی نارسائی اور اپنی عجز و درماندگی کا اعتراف نصیب ہو جائے تو یہ وہ دولت ہے جو عبدیت کی معراج ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ عرفان و بصیرت کی راہ کے سالک ہیں ان کے ادراک کا منتہا ہمیشہ یہی رہا ر ب زدنــی فیک تحیرا ''اے اللہ! ہمیں اپنے بارے میں ایسا کر کہ تیرے بارے میں ہمارا تحیر ہمیشہ بڑھتا رہے'' اس لئے اگر اس لفظ کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ جل جلالہٗ وہ ذات ہے جس کو جاننے اور سمجھنے کیلئے تمام فہم و ادراک کی قوتیں عاجز و درماندہ ہیں۔ البتہ! انسان کے پریشان دل کو اس وقت تک قرار نصیب نہیں ہوگا اور اس کے الجھے ہوئے مسائل کی گرہ اس وقت تک نہ کھلے گی جب تک اللہ کے ذکر سے زبانیں زمزمہ سنج نہیں ہوں گی اور اس کی دی ہوئی تعلیمات سے انسان کی فکر روشن نہیں ہوگی۔

Marfat.com

آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے اللہ احد ہے۔ اہلِ لغت نے واحد اور احد میں یہ فرق کیا ہے کہ احد وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو۔ اور واحد وہ ہے جس کی صفات میں کوئی شریک نہ ہو۔ غالباً اسی وجہ سے لفظِ احد اللہ تعالیٰ کے سوا صفت کے طور پر نہیں آیا۔ اس سے یکتائی و بے ہمگی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے۔ ہر رشتہ و قرابت سے پاکی و برتری اس کا لازمہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلی ہے کہ وہ قدیم اور باقی سارے حادث و مخلوق۔ وہ چونکہ احد ہے اس لئے اس میں کسی حیثیت سے کثرت کا کوئی شائبہ نہیں۔ وہ اجزاء سے مرکب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل اور صورت رکھتا ہو، جو کسی جگہ میں رہتا ہو یا کوئی چیز اس کے اندر جگہ پاتی ہو جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضاء ہوں، جس کی کوئی سمت اور جہت ہو اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے بالکل پاک اور منزہ وہ ایک ہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے احد ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ وہ قدیم لم یزل اور خالقِ کل ہے۔

صَمَد کا مفہوم

اَللّٰـهُ الصَّمَدُ اللہ تعالیٰ کی صفت احد کے بعد دوسری صفت صمد لائی گئی ہے تا کہ لفظِ احد سے اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور بے ہمگی کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے مغلوب ہو کر کوئی اللہ تعالیٰ کو ایک بالکل الگ تھلگ اور خاموش علۃ العلل نہ سمجھ بیٹھے۔ ورنہ یہ غلط فہمی بھی دوسرے سہارے کی تلاش کا سبب بن سکتی ہے۔ اس غلط فہمی سے بچانے کیلئے اللہ الصمد کہہ کر وضاحت فرمادی ہے۔ تو بے شک اللہ ہے تو سب سے الگ، بے نیاز و بے ہمہ مگر وہ سب کی خبر گیری اور دستگیری بھی کرتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کی تھوڑی سی معنوی تشریح کر دی جائے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اور اس مادے سے نکلنے والے الفاظ کے اگر معانی دیکھے جائیں تو اس لفظ کی معنوی وسعت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اسی معنوی وسعت کی وجہ سے صحابہ تابعین اور بعد کے اہلِ علم سے اس لفظ کی تعریف میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام اقوال اس کے کسی نہ کسی معنی کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب صحیح ہیں اگر انہیں جمع کر دیا جائے تو ایک ایسی تصویر بن جاتی ہے جو پروردگار کے اس اسمِ پاک کی معنوی وسعتوں کو کسی حد تک واضح کر دیتی ہے۔ ہم بغیر نام کے حوالے کے وہ اقوال ذکر کر رہے ہیں۔

۱۔ وہ جس سے بالاتر نہ ہو۔

۲۔ وہ سردار جس کی سیادت کامل ہو اور انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔

۳۔ جس کی طرف لوگ کسی بلا یا مصیبت نازل ہونے پر مدد کیلئے رجوع کریں۔

۴۔ وہ سردار جو اپنی سیادت میں، اپنے شرف میں، اپنی عظمت میں، اپنے علم میں اور بردباری میں اپنے حلم میں اور اپنی حکمتِ عملی میں کامل ہو۔

۵۔ وہ جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اس کے محتاج ہوں۔

۶۔ وہ جس میں سے نہ کوئی چیز کبھی نکلی ہو نہ نکلتی ہو، جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو۔

۷۔ وہ جو اپنی تمام صفات اور اعمال میں کامل ہو۔

۸۔ وہ جو بے عیب ہو۔

Marfat.com

۹۔ جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو۔

۱۰۔ جس کے حکم اور فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا کوئی نہ ہو۔

۱۱۔ وہ جو کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں اور سب لوگ اپنی حاجتوں کے لئے اس کی طرف رجوع کریں۔

سورۃ الاخلاص میں اللہ احد کے بعد اللہ الصمد کہا گیا۔یعنی احد نکرہ اور الصمد معرفہ لایا گیا۔جس کا مطلب یہ ہے کہ اصلی اور حقیقی صمد اللہ تعالیٰ ہی ہے۔مخلوق اگر کسی حیثیت سے صمد ہو بھی تو کسی دوسری حیثیت سے وہ صمد نہیں ہے کیونکہ وہ فانی ہے، لازوال نہیں۔قابلِ تجزیہ و تقسیم ہے۔مرکب ہے کسی وقت اس کے اجزاء بکھر سکتے ہیں۔بعض مخلوقات اس کی محتاج ہیں تو بعض کا وہ خود محتاج ہے۔کسی کے مقابلے میں وہ برتر ہے تو اس کے مقابلے میں کوئی اور برتر ہے۔بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کی صمدیت ہر لحاظ سے کامل ہے ساری دنیا اس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔دنیا کی ہر چیز اپنے وجود و بقاء اور اپنی حاجات و ضروریات کیلئے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کی طرف رجوع کرتی ہے اور وہ سب کی تمام حاجات پوری کرنے والا ہے۔وہ غیر فانی اور لازوال ہے۔رزق دیتا ہے لیتا نہیں۔مفرد ہے مرکب نہیں۔ساری کائنات پر اس کی سیادت قائم ہے اور وہ سب سے برتر ہے۔اس لئے محض صمد نہیں بلکہ الصمد ہے یعنی ایک ہی ایسی ہستی ہے جو حقیقت میں صمدیت سے بتمام و کمال متصف ہے۔

پھر اس کے الصمد ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ ایک معبود ہو یکتا اور یگانہ کیونکہ انسان عبادات اسی کی کرتا ہے جس کا وہ محتاج ہو اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہ ہو کیونکہ جو حاجت روائی کی طاقت اور اختیارات ہی نہ رکھتا ہو اس کی بندگی اور عبادت کوئی ہوش مند آدمی نہیں کرسکتا ہے۔

شرک سے پیدا ہونے والے واہموں کا ازالہ

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ "نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد" مشرکین نے ہر دور میں جو شرک کے مختلف راستے نکالے ہیں اس میں ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے انسانوں کی طرح خداؤں کی بھی ایک جنس تصور کی ہے جس کے بہت سے افراد ہیں۔ جن میں شادی بیاہ اور توالد و تناسل کا سلسلہ چلتا ہے اور ایسا تصور کرنے والے صرف جاہل اور غیر متمدن اقوام ہی نہیں بلکہ اس گمراہی میں وہ قومیں بھی بری طرح مبتلا رہی ہیں جو انبیاء و رسل پر ایمان لائی تھیں اور جن کے پاس آسمانی کتب موجود تھیں۔اگر عرب کے جاہل مشرک فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے تو یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت اور تورات کے حامل حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا فرزند کہتے تھے اور عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے تھے۔حالانکہ معمولی عقل کا آدمی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کے تصورات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نہیں بلکہ باقاعدہ خداؤں کی ایک جنس ہے اور ان میں خدائی کے اختیارات موجود ہیں۔اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ان کے یہاں اگر اولاد ہوتی ہے تو پھر وہ جسم بھی رکھتے ہیں، ان میں نر اور مادہ کی تقسیم بھی ہے، ان میں اتصال بھی ہوتا ہے اور پھر ان میں ہر ایک فانی بھی ہے اور تمام فانی افراد کی طرح نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی بھی ایک ابتداء اور انتہاء ہے۔اور اس سے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح ایک لاولد شخص اپنی زندگی میں کسی مددگار کا اور اپنی وفات کے بعد کسی

Marfat.com

وارث کا حاجت مند ہوتا ہے، اسی طرح ایسا خدا بھی ان دونوں باتوں سے موصوف ہوگا۔ اسی طرح کی اور کمزوریاں بھی ہیں جو ان مشرکانہ تصورات سے خود بخود جنم لیتی ہیں۔ اولاً تو اللہ تعالیٰ نے اللہ الصمد کہہ کر ہی ان تمام مفروضات کی جڑ کاٹ دی ہے، لیکن پیشِ نظر آیت نے تو ان باطل تصورات کو یکسر مٹا ڈالا اور واضح کیا کہ نہ اس کا کوئی بیٹا اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔ وہ لم یزل ولا یزال ہے۔ فنا و حدوث سے منزہ اور پاک ہے۔ ساری مخلوقات اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہیں۔ اس کو کیا ضرورت ہے کہ کسی کو بیٹا بنائے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ "اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔" کُفُوٌ ہمسر کو کہتے ہیں جو قدرت، علم، حکمت اور دیگر صفات میں ہم پلہ اور ہم پایہ ہو۔ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی پہلو، کسی جہت اور کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ سب اس کے بندے ہیں، اس کی مخلوق ہیں، اسی کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے "علماء لکھتے ہیں کہ شرک کبھی عدد میں ہوتا ہے، احد کہہ کر اس کی نفی فرما دی۔ اور کبھی مرتبہ و منصب میں ہوتا ہے، صمد کہہ کر اس کا بطلان کر دیا۔ کبھی نسب میں ہوتا ہے، لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ سے اس کا ابطال کر دیا۔ اور کبھی کوئی کام کرنے اور اثر اندازی میں ہوتا ہے، اس کی تردید وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ سے کر دی ہے۔ توحید کے اسی جامع مضمون کے باعث اس سورۃ کو سورۃ الاخلاص کہا جاتا ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ
کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ الْفَلَقِ

(۱۱۳)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْفَلَقِ وَالنَّاسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ پہلی سورۃ کا نام الفلق اور دوسری کا نام الناس ہے۔ یہ دونوں سورتیں الگ الگ ناموں سے مصحف میں لکھی ہوئی ہے۔ لیکن ان دونوں میں معنوی اعتبار سے اتنا گہرا اتصال ہے کہ انہیں الگ الگ دو سورتیں قرار دینا مشکل ہے۔ اور پھر یہ نازل بھی دونوں ایک ساتھ ہوئی ہیں اور انہیں ایک مشترک نام معوذتین سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان دونوں کی تشریح ان شاء اللہ الگ الگ کروں گا لیکن دونوں کا ایک ہی تعارف لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

الفلق ایک رکوع، پانچ آیتوں، تیس کلموں اور ۷۴ حروف پر مشتمل ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ دونوں سورتیں کہاں نازل ہوئیں اور کس زمانے میں نازل ہوئیں اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ حضرت حسن بصری، عطاء، عکرمہ اور جابر بن زید رضی اللہ عنہم کی یہ رائے ہے کہ یہ سورتیں مکی ہیں۔ یعنی ان کا نزول مکہ میں ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباس کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن قتادہ، ابوصالح اور ابنِ عباس کے علاوہ علماء کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں۔ بعض مفسرین نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور بعض مفسرین نے دوسرے قول کو۔ لیکن جہاں تک احادیثِ مرفوعہ کا تعلق ہے وہ دوسرے قول کے حق میں ہے۔ ایک مرفوع حدیث جسے مسلم، ترمذی، نسائی، احمد ابنِ حنبل جیسے جلیل القدر محدثین نے روایت کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عقبہ ابنِ عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز مجھ سے فرمایا **الم تر ایات انزلت اللیلۃ لم یر مثلھن اعوذ برب الفلق اعوذ برب الناس** "یعنی تمہیں خبر ہے اللہ تعالیٰ نے آج رات مجھ پر ایسی آیتیں نازل فرمائی ہیں جن کی پہلے مثال نظر نہیں آتی۔ وہ اعوذ برب الفلق اور اعوذ برب الناس ہیں۔ ان سورتوں کے مدنی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عقبہؓ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ ان کا یہ روایت کرنا کہ حضورؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ آج رات مجھ پر ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں جن کی مثال پہلے نظر نہیں آتی۔ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ ان سورتوں کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا۔ دوسری حدیث جو اس قول کی تائید کرتی ہے وہ، وہ ہے جس میں ان کے شانِ نزول کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شراحِ حدیث میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدرالدین عینی نے اپنے اپنے اسفارِ جلیلہ میں لکھا ہے کہ سات ہجری میں جب ایک یہودی لبید بن اعصم نے جادو کیا اس وقت اس جادو کے اثرات کو کالعدم کرنے کیلئے یہ دو سورتیں نازل ہوئیں۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ جادو کا یہ واقعہ مدینہ طیبہ میں پیش آیا۔ ان آئمۂ حدیث کی تحقیق کے بعد اور حضرت عقبہؓ کی مرفوع روایت کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں۔ رہے وہ اقوال جو اس کے مکی ہونے پر

Marfat.com

دلالت کرتے ہیں تو ان کے قائلین کیسے ہی جلیل القدر کیوں نہ ہوں وہ مرفوع حدیث کے مقابل میں نہیں لائے جاسکتے۔اور یہ گمان کرنا کہ حضرت عقبہؓ کا ان سورتوں کے بارے میں نزول کے لفظ کا استعمال ممکن ہے پہلے سے نازل شدہ سورتوں کی طرف توجہ دلانے کیلئے ہو تو یہ محض ایک گمان ہے جس کی حدیثِ مرفوع کے مقابل میں کوئی حیثیت نہیں۔

ان سورتوں میں بیان کردہ مباحث اور مضامین کی تفصیل تو ان سورتوں کی آیات کی تفسیر میں آئے گی۔لیکن اس سے پہلے چند ایسے مباحث سے تعرض کرنا ضروری ہے جو عام طور پر ان سورتوں کی تشریح سے پہلے اٹھائے گئے ہیں۔ان میں سے سب سے پہلی بحث ان سورتوں کی جزوِ قرآن ہونے کی ہے۔

معوّذتین کی قرآنیت

ان سورتوں کے قرآن کا جزو ہونے کی بحث اس لئے پیدا ہوئی کہ ہماری روایات کے ذخیرے میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ انہیں قرآن کی سورتیں شمار نہیں کرتے تھے۔اور جو مصحف انہوں نے مرتب کیا تھا اس میں بھی یہ سورتیں موجود نہ تھیں۔الدرالمنثور میں علامہ سیوطی نے صراحت کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ امام احمد، بزاز، طبرانی، ابن مردویہ نے صحیح طریقوں سے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ معوّذتین کو مصحف سے محو کر دیا کرتے تھے اور کہا کرتے کہ قرآن کے ساتھ ایسی چیزیں خلط ملط نہ کرو، جو اس میں سے نہیں۔حضورؐ نے تو ان دو سورتوں کے ساتھ فقط پناہ مانگنے کا حکم دیا تھا، نیز حضرت ابن مسعودؓ ان دو سورتوں کی تلاوت نماز میں نہیں کرتے تھے۔اس طرح کی روایات ہیں جن سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا معوّذتین قرآن کا جزو ہیں یا نہیں۔اور اس بات سے مخالفینِ اسلام کو قرآنِ کریم کے بارے میں طرح طرح کے شبہات ابھارنے کا موقع مل گیا۔چنانچہ انہوں نے یہاں تک کہنے کی جرأت کی کہ جب یہ دو سورتیں ابنِ مسعودؓ جیسے صحابی کے بیان کے مطابق الحاقی ہیں تو نہ معلوم اور کیا کیا حذف واضافے اس کے اندر ہوئے ہوں گے۔حالانکہ اگر اس پوری صورتحال پر تدبر کی نگاہ ڈالی جاتی تو کبھی بھی اس طرح کا موقع پیدا نہ ہوتا۔علامہ سیوطی نے الدرالمنثور میں جو باتیں حضرت ابنِ مسعودؓ کے بارے میں روایت کی ہیں ان کی تردید خود ان کی اپنی بیان کردہ ایک حدیث سے ہو جاتی ہے جسے انہوں نے طبرانی سے روایت کیا ہے۔''طبرانی نے اوسط میں سندِ حسن سے حضرت ابنِ مسعودؓ سے یہ ارشادِ رسالت نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ پر ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں جن کی مثل مجھ پر نازل نہیں ہوئی اور وہ معوّذتین ہیں۔'' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ ان دونوں سورتوں کے قرآن ہونے سے آگاہ تھے۔اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ ان کی طرف جو باتیں منسوب کی گئی ہیں وہ کہاں تک صحیح ہوں گی؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ سے جن روایات میں معوّذتین کے جزوِ قرآن نہ ہونے کو بیان کیا گیا ہے وہ سب اخبارِ احاد ہیں۔علماء اصولِ حدیث نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ اخبارِ احاد کی صحت کیلئے صرف راویوں کی عدالت اور قوتِ حافظہ ہی کافی نہیں بلکہ اخبارِ احاد کو قبول کرنے کیلئے چند شرائط بھی ضروری ہیں۔جن میں سے ایک یہ ہے کہ خبرِ واحد کسی ایسی بات کو بیان نہ کر رہی ہو جو بداہتِ عقل کے خلاف ہو۔اگر اس قاعدے کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ وہ صحابی ہیں جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں شاید سب سے زیادہ رہے ہیں۔ان کا شمار اصحابِ صفہ میں تھا اور جو آٹھوں پہر مسجدِ نبوی میں پڑے رہتے۔اور آپ کو ہر وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت تھی۔

Marfat.com

ان کی زندگی کے مشاغل آنحضرت ﷺ کی خدمت، آپ کی خدمت میں حاضری، آپ کے ارشادات کو سننا اور یاد رکھنا اور قرآنِ کریم کی جو آیتیں نازل ہوں ان کو حفظ کرنا، ان کے سوا کوئی نہ تھے۔ تو کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جو پانچوں وقت آنحضرت ﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے اور نمازوں میں آپ کی تلاوت سنتے تھے اور جن کی زندگی کی ساری سرگرمیاں ان ہی باتوں میں سمٹ کر رہ گئی تھیں ان کو یہ تک معلوم نہ ہوسکا کہ معوذتین قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں۔ جبکہ آنحضرت ﷺ نے بارہا نماز میں ان کو تلاوت فرمایا۔ سینکڑوں صحابہ نے اپنے کانوں سے اسے سنا۔ اور آپ جو ہر وقت کے حاضر باش تھے آپ ان کو نہ سن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ امامِ نووی، امام ابنِ حزم اور امام فخر الدین رازی نے سرے سے اس بات ہی کو جھوٹ اور باطل قرار دیا کہ ابنِ مسعودؓ نے ایسی کوئی بات کہی ہو۔ اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ویسے بھی قرآنِ کریم کے بارے میں اس قسم کے اشتباہات کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیونکہ قرآنِ کریم کی تعریف یہ ہے کہ وہ، وہ کتاب ہے جسے حضور اکرمؐ سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سنا، پھر بذریعہ تواتر نقل کیا۔ صحابہ سے تابعین نے اسی تواتر سے سنا اور یوں ہی سلسلہ وار نسلاً بعد نسل ہم تک منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں تمام صحابہ کی تائید سے ایک مصحف لکھا گیا۔ پھر حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں اس کے نسخے تیار کروا کے دنیائے اسلام کے مراکز میں سرکاری طور پر بھجوائے گئے۔ اور آج تک تمام دنیائے اسلام کا اسی مصحف پر اجماع ہے۔ اور اس میں آج تک کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکی۔ اور سب جانتے ہیں کہ اس مصحف میں دونوں سورتیں درج تھیں اور درج ہیں۔

آنحضرت ﷺ پر جادو کا اثر ہونا

دوسرا مسئلہ جو ان سورتوں کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ پر جادو کیا گیا تھا اور آپ اس کے اثر سے بیمار ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس اثر کو دور کرنے کیلئے یہ سورتیں نازل ہوئیں اور انہیں پڑھنے کی ہدایت کی گئی۔ اس پر بہت سے عقلیت پسندوں نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ ان کا جائزہ لینے سے پیشتر ان تمام روایات کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے جو مختلف کتب میں بہ اختلافِ الفاظ منقول ہیں۔ اس سے صحیح صورتحال سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

> صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی کریم ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ ہجری میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم سے ملا جو انصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو، یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں انہیں قبول کرو اور محمد (ﷺ) پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمتگار تھا، اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، ان سے اس نے جادو کروایا تھا۔ بہر حال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر لبید نے بنی زریق کے کنوئیں ذروان یا ذی اروان

Marfat.com

نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی کریم ﷺ پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا۔ دوسری ششماہی میں کچھ تغیر مزاج محسوس ہونا شروع ہوا۔ آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضورؐ پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے چلے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپ کی ذات تک محدود رہے۔ حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے۔ رہی آپ کے نبی ہونے کی حیثیت تو اس میں آپ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں آپ قرآن کی کوئی آیت بھول گئے ہوں یا کوئی آیت آپ نے غلط پڑھ ڈالی ہو یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں آپ کی تعلیمات کے اندر کوئی فرق واقع ہو گیا ہو یا کوئی ایسا کلام آپ نے وحی کی حیثیت سے پیش کر دیا ہو جو فی الواقع آپ پر نازل نہ ہوا ہو یا نماز آپ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات معاذ اللہ پیش آ جاتی تو دھوم مچ جاتی اور پورا ملک عرب اس سے واقف ہو جاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چت نہ کر سکی تھی اسے ایک جادوگر کے جادو نے چت کر دیا۔ لیکن آپ کی حیثیتِ نبوت اس سے بالکل غیر متاثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپ اپنی جگہ اسے محسوس کر کے پریشان ہوتے رہے۔ آخر کار ایک روز آپ حضرت عائشہؓ کے ہاں تھے کہ آپ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اسی حالت میں نیند آ گئی یا غنودگی طاری ہوئی اور پھر بیدار ہو کر آپ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں نے جو بات اپنے رب سے پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتا دی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا وہ کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا دو آدمی (یعنی فرشتے دو آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے۔ ایک سرہانے کی طرف تھا اور دوسرا پائینتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا انہیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو ہوا ہے۔ اس نے پوچھا کس نے کیا ہے؟ جواب دیا لبید بن اعصم نے۔ پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا کنگھی اور بالوں میں ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ پوچھا وہ کہاں ہے؟ جواب دیا بنی زریق کے کنویں ذی اروان (یا ذروان) کی تہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پوچھا اب اس کیلئے کیا کیا جائے؟ جواب دیا کہ کنویں کا پانی سونت دیا جائے اور پھر پتھر کے نیچے سے اس کو نکالا جائے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت زبیرؓ کو بھیجا۔ ان کے ساتھ جبیر بن ایاس الزرقیؓ اور قیس بن محصن الزرقیؓ (یعنی بنی زریق کے یہ دو اصحاب) بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں حضورؐ خود بھی چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ پانی نکالا گیا اور وہ غلاف برآمد کر لیا گیا۔ اس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پتلا تھا جس میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آ کر بتایا کہ آپ معوذتین پڑھیں۔ چنانچہ آپ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گرہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک ایک سوئی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گرہیں کھل گئیں،

Marfat.com

ساری سوئیاں نکل گئیں اور آپ جادو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہو گئے جیسے کوئی شخص بندھا ہوا تھا، پھر کھل گیا۔ اس کے بعد آپ نے لبید کو بلا کر باز پرس کی۔ اس نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا کیونکہ اپنی ذات کیلئے آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اس معاملہ کا چرچا کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی ہے اب میں نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔ (تفہیم القرآن)

یہ ہے اس جادو کا سارا قصہ۔ اس میں دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ آپ اپنی ذاتی حیثیت میں جسمانی طور پر جادو سے ضرور متاثر ہوئے۔ اسی وجہ سے آپ کی طبیعت میں وہ تغیر بھی آیا جس کا ذکر ابھی آپ نے پڑھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ذاتی حیثیت سے آپ کو زخمی کیا جا سکتا ہے، آپ کو بخار ہو سکتا ہے، گھوڑے سے گر کر چوٹ لگ سکتی ہے، آپ کو بچھو کاٹ سکتا ہے، جنگِ احد میں جبینِ سعادت زخمی ہو سکتی ہے اور یہ چیزیں آپ کی شانِ رسالت کے خلاف نہیں تو پھر آپ کا جادو سے متاثر ہونا کیوں مستبعد از عقل ہے جبکہ ہم قرآنِ کریم میں پڑھ چکے ہیں کہ ساحرانِ فرعون کے جادو سے لوگ رسیوں کو سانپ خیال کرنے لگے اور انہیں سانپوں کی طرح لہراتے ہوئے دیکھ کر وقتی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی خائف اور ہراساں ہو گئے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ یہ ہیں فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهَا تَسْعَىٰ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ”پس ان کی رسیاں اور لاٹھیاں آپ کو یوں معلوم ہوئیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں، ان کے دل میں خوف پیدا ہوا، ہم نے کہا اے موسیٰ! مت ڈرو، تم ہی سربلند ہو۔“ اور لوگوں کے بارے میں سورۃ طٰہٰ میں ہے سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ ”یعنی ان جادوگروں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا۔“ تو جب جادو کا اثر نصِ قرآنی سے اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر پر ہونا ثابت ہے تو آنحضرت ﷺ اگر جسمانی طور پر اس سے متاثر ہوئے تو اس میں ایسی کون سی بات ہے جسے قبول کرنا مشکل ہو۔

اور دوسری جو بات ان تمام واقعات سے کھل کر سامنے آتی ہے وہ حیثیتِ نبوت ہے۔ یعنی نبی ہونے کی وجہ سے آپ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں اور آپ جس طرح وحی کو قبول کرتے اور پھر لوگوں تک اسے پہنچاتے تھے اور جس طرح آپ لوگوں کی رہنمائی فرماتے تھے اور جس طرح لوگوں کی تربیت اور تربیتِ نفوس فرماتے تھے اور جس طرح اوقاتِ صلوٰۃ میں نماز پڑھاتے اور اس میں تمام ضوابط کی پابندی فرماتے تھے، کیا اس میں کوئی تغیر پیدا ہوا تھا۔ اس میں کسی کمی بیشی کا ثبوت ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ آپ کے کسی بدترین دشمن نے بھی یہ بات نہیں کہی کہ ایسا کوئی واقعہ آنحضرت ﷺ سے سرزد ہوا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی حیثیتِ نبوت پر جادو نے کوئی اثر نہیں کیا، بلکہ آپ بدستور فرائضِ نبوت انجام دیتے رہے اور جادو کا جو کچھ بھی اثر تھا وہ آپ کے جسم اور آپ کی ذاتی حیثیت پر تھا جس کا دوسروں کو ادراک تک نہ تھا۔

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت

چونکہ ان دونوں سورتوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ جادو کے اثر کو ختم کرنے کیلئے نازل کی گئیں۔ اور پھر انہیں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے ہمیشہ دم کے طور پر استعمال کیا۔ تو اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا اسلام میں جھاڑ پھونک کی کوئی گنجائش ہے، اور کیا جھاڑ پھونک مؤثر بھی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ جھاڑ پھونک کا رواج تو انسانی معاشرے میں ہمیشہ رہا۔ البتہ غیر مسلموں میں اس

Marfat.com

مقصد کیلئے جو منتر، طلسم یا نقوش پائے جاتے تھے ان میں دیویوں، دیوتاؤں کے نام، شیطانی قوتوں سے استمداد، آسمانی کواکب و سیارات سے استغاثہ وغیرہ عام تھا۔ نیز وہ ان چیزوں کو مؤثرِ حقیقی اور فاعلِ مستقل یقین کرتے تھے۔ اسلام نے اس بارے میں جو ہدایات جاری فرمائیں، اس میں سب سے پہلے تو ان لوگوں کو قابلِ تعریف گردانا جو کسی طرح کے جھاڑ پھونک سے واسطہ نہیں رکھتے۔ نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں اور نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں، ان کے بارے میں فرمایا کہ ایسے لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے، سوائے معوذتین یا معوذات کے۔ (ابوداؤد، نسائی) بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں حضورؐ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے۔ کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جاسکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں۔ اور بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنائے گا۔

ان احتیاطوں کے ساتھ خود نبی کریم ﷺ سے جھاڑ پھونک کرنا ثابت ہے اور صحابہ بھی آنحضرت ﷺ کی اجازت کے بعد ایسا کیا کرتے تھے۔ امام بخاری اور امام ترمذی نے حضرت ابنِ عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ، سیدنا حسنؓ اور سیدنا حسینؓ کو یہ پڑھ کر دم فرمایا کرتے تھے۔ اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّۃِ مِنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ وَّھَامَّۃٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّۃٍ ''میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں، ہر شطان اور موذی سے اور ہر نظر بد سے۔''

حضرت عثمان بن العاص الثقفی کے متعلق مسلم میں روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے جو مجھ کو مارے ڈالتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا اپنا سیدھا ہاتھ اس جگہ پر رکھو جہاں درد ہوتا ہے، پھر تین بار بسم اللہ کہو، اور سات مرتبہ یہ پڑھتے ہوئے درد کی جگہ پر ہاتھ رکھو۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ ''میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں، اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے۔'' موطا میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ عثمان نے کہا کہ اس کے بعد میرا وہ درد جاتا رہا اور اسی چیز کی تعلیم میں اپنے گھر والوں کو دیتا رہا۔ صحیح مسلم میں ابوسعید الخدریؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ بیمار ہوئے تو جبریل امین نے آ کر پوچھا کہ اے محمد (ﷺ) کیا آپ بیمار ہو گئے؟ فرمایا، ہاں۔ انہوں نے کہا بِاسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یُّؤْذِیْکَ مِنْ کُلِّ نَفْسٍ اَوْعَیْنٍ حَاسِدٍ اللّٰہُ یَشْفِیْکَ بِاسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ ''میں اللہ کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں، ہر اس چیز سے جو آپ کو اذیت دے اور ہر نفس اور حاسد کی نظر کے شر سے، اللہ آپ کو شفا دے میں اس کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں۔''

اس موضوع پر بڑی تعداد میں احادیث پائی جاتی ہیں لیکن ہم نے ان میں سے صرف چند کا ذکر کیا ہے جو اس موضوع کی وضاحت کیلئے کافی ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہر چیز اسی وقت نفع پہنچاتی ہے جب اذنِ الٰہی ہو، اس کے علاوہ کوئی چیز بھی اثر نہیں کرتی۔ جڑی بوٹیاں، گولیاں، شربت، معجونیں اور ٹیکے اذنِ الٰہی سے صحت و عافیت کا سبب بنتے ہیں۔ تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ، آیاتِ قرآنی اور آنحضرت ﷺ کی بتائی ہوئی دعائیں اذنِ الٰہی سے مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ تو توکل اذنِ الٰہی پر ہونا چاہئے لیکن ذرائع کے طور پر اگر علاج کو

Marfat.com

اختیار کیا جاسکتا ہے تو ان چیزوں کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے جو جھاڑ پھونک اور تعویذ وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔ البتہ یہ بات صحیح نہیں کہ دوا اور علاج جہاں میسر ہو اسے چھوڑ کر جھاڑ پھونک سے کام لینے پر اکتفا کیا جائے۔ اسی طرح بعض لوگوں کا عملیات اور تعویذوں کو ذریعہ معاش بنا لینا اور عملیات کے مطب کھول کر بیٹھ جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ اس معاملے میں بہت سے لوگ حضرت ابو سعید الخدری کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو بخاری، مسلم، ترمذی، مسند احمد، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ میں منقول ہوئی ہے اور اس کی تائید بخاری میں ابنِ عباس کی بھی ایک روایت کرتی ہے ہم اسے تفہیم القرآن سے نقل کر رہے ہیں۔

اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضورؐ نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا جن میں حضرت ابو سعیدؓ خدری بھی تھے۔ یہ حضرات راستہ میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جا کر ٹھہرے اور انہوں نے قبیلے والوں سے کہا کہ ہماری میزبانی کرو۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اتنے میں قبیلے کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا اور وہ لوگ ان مسافروں کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے پاس کوئی دوا یا عمل ہے جس سے تم ہمارے سردار کا علاج کر دو؟ حضرت ابو سعیدؓ نے کہا ہے تو سہی مگر چونکہ تم نے ہماری میزبانی سے انکار کیا ہے اس لئے جب تک تم کچھ دینا نہ کرو ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ انہوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ (بعض روایات میں ہے ۳۰ بکریاں) دینے کا وعدہ کیا اور حضرت ابو سعیدؓ نے جا کر اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور لعابِ دھن اس پر ملتے گئے۔ آخر کار بچھو کا اثر زائل ہو گیا اور قبیلے والوں نے جتنی بکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ لا کر دے دیں مگر ان حضرات نے آپس میں کہا ان بکریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ جب تک رسول اللہ ﷺ سے پوچھ نہ لیا جائے، نہ معلوم اس کام پر اجر لینا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ حضورؐ نے ہنس کر فرمایا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ جھاڑنے کے کام بھی آسکتی ہے؟ بکریاں لے لو اور ان میں میرا حصہ بھی لگاؤ۔"

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس حدیث سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کے مطب چلانے کا جواز نکالنے سے پہلے عرب کے ان حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں حضرت ابو سعید خدری نے یہ کام کیا تھا اور حضورؐ نے اسے نہ صرف جائز رکھا تھا بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا حصہ بھی لگاؤ تاکہ اس کے جواز و عدمِ جواز کے معاملہ میں ان اصحاب کے دلوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ عرب کے حالات اس زمانے میں بھی یہ تھے اور آج تک یہ ہیں کہ پچاس پچاس، سو سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اس وقت ایسی نہ تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے کی دکانیں موجود ہوں اور مسافر کئی روز کی مسافت طے کر کے جب وہاں پہنچے تو سامانِ خورد و نوش خرید سکے۔ ان حالات میں یہ بات عرب کے معروف اصولِ اخلاق میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پر پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ اس سے انکار کے معنی بسا اوقات مسافروں کیلئے موت کے ہوتے تھے، اور عرب میں اس طرزِ عمل کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے اس فعل کو جائز رکھا کہ جب قبیلے والوں نے میزبانی سے انکار کردیا تھا تو ان کے سردار کا علاج کرنے سے انہوں نے بھی انکار کردیا اور اس شرط پر اس کا علاج کرنے پر راضی ہوئے کہ وہ ان کو کچھ دینا کریں۔ پھر جب ان میں سے ایک صاحب نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر سورۂ فاتحہ اس سردار پر پڑھی اور وہ اس سے اچھا ہوگیا تو طے شدہ اجرت قبیلے والوں نے لاکر دے دی اور حضورؐ نے اس اجرت کے لینے کو حلال وطیب قرار دیا۔ بخاری میں اس واقعہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی جو روایت ہے اس میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں اِنّ احقّ ما اخذتم علیه اجرًا کتاب اللّٰہِ یعنی بجائے اس کے کہ تم کوئی اور عمل کرتے، تمہارے لئے یہ زیادہ برحق بات تھی کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھ کر اس پر اجرت لی۔ یہ آپ نے اس لئے فرمایا کہ دوسرے تمام عملیات سے اللہ کا کلام بڑھ کر ہے۔ علاوہ بریں اس طرح عرب کے اس قبیلے پر حق تبلیغ بھی ادا ہوگیا کہ انہیں اس کلام کی برکت معلوم ہوگئی جو اللہ کی طرف سے نبی کریم ﷺ لائے ہیں۔ اس واقعہ کو ان لوگوں کیلئے نظیر قرار نہیں دیا جاسکتا جو شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کے مطب چلاتے ہیں اور اسی کو انہوں نے وسیلۂ معاش بنا رکھا ہے۔ اس کی کوئی نظیر بھی نبی کریم ﷺ یا صحابہ وتابعین اور آئمۂ سلف کے ہاں نہیں ملتی۔ (تفہیم القرآن)

Marfat.com

رُكُوعَاتُهَا ۱	سُورَةُ الْفَلَقِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۳)	اٰيَاتُهَا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ وَمِنْ شَرِّ
غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴿۴﴾ وَ
مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

رکوع: ۱۔ (کہہ دیجئے! میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے پروردگار کی۔ ۱) ہر اس چیز کے شر سے جسے اس نے پیدا کیا۔ ۲) اور رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے۔ ۳) اور گروہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے۔ ۴) اور حاسد کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے۔ ۵)

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾
(کہہ دیجئے! میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے پروردگار کی۔ ۱)

تعوذ کا مفہوم

قُلْ کہہ دیجئے یا اعلان کر دیجئے۔ یہ درحقیقت قُلْ کے بعد جو جملہ آتا ہے اس کی اہمیت اور افادیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس بات کی طرف بھی کہ یہ آنحضرت ﷺ کے فرائض میں شامل ہے اور آپ کے واسطے سے امت اس کیلئے مسؤل ہے۔ چنانچہ جس بات کے کہنے کا حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں۔ اصل حکم پناہ لینے اور پناہ مانگنے سے متعلق ہے۔ علامہ راغب عوذ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں العوذ: الالتجاء الی الغیر والتعلق به کسی کی پناہ لینا اور اس کے ساتھ چمٹ جانا اور پناہ مانگنے سے مراد یہ ہے

Marfat.com

کہ جس چیز کے متعلق پناہ لینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اس خوفناک چیز سے وہ خودنہیں بچ سکتا یا اس سے بچتے ہوئے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے تو وہ کسی ایسی ذات کی پناہ ڈھونڈ تا ہے جو اس کو بچانے پر قدرت رکھتی ہو۔اس کی دو قسمیں ہیں۔ پناہ کی ایک قسم تو وہ ہے جو قوانینِ طبعی کے مطابق عالمِ اسباب کے اندر کسی محسوس مادی چیز یا شخص یا طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً دشمن سے بچاؤ کیلئے، گولیوں کی بچھاڑ سے بچنے کیلئے یا کسی طاقتور ظالم سے بچنے کیلئے یا چلچلاتی دھوپ سے بچنے کیلئے مختلف چیزوں کی پناہ ڈھونڈی جاتی ہے۔اور پناہ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں ہر طرح کے خطرات اور ہر طرح کی مادی، اخلاقی یا روحانی مضرتوں اور نقصان رساں چیزوں سے کسی فوق الفطری ہستی کی پناہ اس عقیدے کی بنا پر مانگی جاتی ہے کہ وہ ہستی عالمِ اسباب پر حکمران ہے۔اور اسباب کی ساری دنیا اس کے احکام کے تحت ہے۔اور وہ ہر اس شخص کی حفاظت کرسکتی ہے جو اس کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اصلاً تو یہ دوسری قسم کی پناہ ہے جس کا حکم قرآنِ کریم نے بار بار دیا اور ان دونوں سورتوں میں بھی اسی پناہ کا ذکر کیا جارہا ہے۔لیکن اگر آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور آپ کی خصوصی تربیت اور سلف صالحین کے طرزِ عمل کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن ہر طرح کے حالات میں اللہ تعالیٰ کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔اور یہی اس کے ایمان کا اصل تقاضا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کو جن عزائم سے بہرہ ور کیا گیا ہے اور جو اس کی منزل متعین کردی گئی ہے اور جو اس کے اہداف مقرر کردیئے گئے ہیں اور اس کے مقصدِ زیست کو جس طرح وسیع کردیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا اس کے دشمنوں سے بھری ہوئی ہے۔کبھی شرورِ نفس کے حملے اس پر ہوتے ہیں، کبھی خواہشات مختلف چاہتوں کی شکل میں اس پر حملہ آور ہوتی ہیں، کبھی اعزہ واقرباء کے تعلق کی نزاکتیں اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں، کبھی وقت کا چلن اس کی زندگی کے طریقوں سے ٹکرانے لگتا ہے اور کبھی زندگی کا وہ شعور جو وہ اہلِ دنیا میں عام کرنا چاہتا ہے تاریک راتوں کے مسافر اس کے راستے میں حائل ہوجاتے ہیں، کبھی اقتدار اس کا راستہ روکنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کبھی مال و دولت کے پجاری اس کی زندگی دشوار کردیتے ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ کس قدر متنوع مخالفین ہیں جو اسے آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔حتیٰ کہ بسا اوقات تو اس کے بیوی بچے بھی اس کیلئے سوہانِ روح بن جاتے ہیں۔اب اگر وہ خود ان تمام دشمنوں سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے تو یہ اس کے بس کی بات نہیں۔مشرک قوتوں نے تو ان دیکھے خطرات کے مقابلے میں کبھی جنات سے مدد لی اور کبھی دیوتاؤں سے۔اور مادہ پرست لوگوں نے وسائل کو بروئے کار لا کر اپنے آپ کو ان کی پناہ میں دے دیا۔لیکن ایک مومن ہر طرح کے حالات میں صرف اللہ تعالیٰ سے مدد کا طالب ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اسی کی پناہ میں دیتا ہے۔اقبال نے مادہ پرستوں کے حوالے سے شاید یہ بات کہی تھی:

اللہ کو پامردیٔ مومن کا بھروسہ
اور ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

فلق کا مفہوم

پناہ کا یہ وسیع تر تصور ہے جس کا ہر مومن کو یہاں مکلّف ٹھہرایا گیا۔لیکن پناہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی بجائے رب کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا تاکہ اسے خالقِ کائنات اور مالکِ کل کی عظمت کی بجائے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا استحضار ہو اور وہ محسوس کرے کہ میں ایک ایسی ذات کے حصار میں ہوں جس کے حصار کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔اور اس حصار کو اور زیادہ عظیم کرنے کیلئے ارشاد فرمایا وہ رب کہ ہے جو رب الفلق ہے۔فلق کا

Marfat.com

معنی ہے چیرنا اور پھاڑنا، لیکن یہاں اس سے مراد صبح ہے۔ یعنی جو طلوع صبح کا رب ہے۔ اور تم اس کی غیر معمولی عظمت اور قدرت کو دیکھتے ہو کہ جب رات کی تاریکیاں کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں اور کسی طرف روشنی کی لکیر پھوٹتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ صحرا میں کھڑا ایک شخص ناامیدیوں کی دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے کہ اچانک وہ دیکھتا ہے کہ تاریکی کی چادر پھٹنے لگی ہے اور اس سے روشنی کی ایک لکیر پھوٹ رہی ہے جو بڑھتے بڑھتے اجالے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تب اس کو احساس ہوتا ہے کہ وہ اجالے اور طلوع صبح کا رب اپنے اندر کس قدر بے پناہ قدرت رکھتا ہے کہ جب اندھیرے پوری طرح کائنات پر غالب آ جاتے ہیں اور اس کے چھٹ جانے کی ہر امید شکست ہو جاتی ہے تو اس کی قدرت بروئے کار آتی ہے اور صبح طلوع ہوتی ہے اور پھر سورج بے نقاب ہو کر ساری دنیا کو روشن کر دیتا ہے۔ اس کا ذکر فرمانے سے ایک مومن کو حوصلہ دیا جا رہا ہے کہ تم متنوع قسم کی مخالفتوں اور انتہائی خوفناک دشمنوں کو دیکھ کر ممکن ہے گھبرا اٹھو کہ ایسے نامساعد حالات میں کسی بڑی تبدیلی کا مناد اور مبلغ کیسے بنا جا سکتا ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہیں سب سے پہلے اس ذات کی پناہ میں آنا ہے جس کے سامنے یہ روکاٹیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جو تمام روشنیوں کا رب ہے اور تاریکی تو ایک دیئے کی روشنی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چہ جائیکہ تمام روشنیوں کے رب کی قدرت کو کوئی چیلنج کر سکے۔ چنانچہ جب مومن اس عظیم تصور سے بہرہ ور ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر ایک ایسی عظمت جاگ اٹھتی ہے کہ وہ گمراہیوں کے ہر اندھیرے سے ٹکرا جانے کا عزم لے کر اٹھتا ہے۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾

(ہر اس چیز کے شر سے جسے اس نے پیدا کیا۔ ۲)

مخلوقات کے شرور کو خالق ہی جانتا ہے اور وہی پناہ دے سکتا ہے

آیتِ کریمہ میں مَا عموم کیلئے ہے جو تمام مخلوقات پر چاہے وہ ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول، حاوی ہے۔ سب کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مخلوقات بے شمار قسموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں جواہر بھی ہیں اور اعراض بھی، حیوانات بھی ہیں اور چرند و پرند بھی، نباتات بھی ہیں اور جمادات بھی۔ ان میں بعض مخلوقات میں حس پائی جاتی ہے اور بعض میں حس کا ادراک نہیں ہوتا۔ بعض میں حواسِ خمسہ کا سراغ ملتا ہے اور بعض اس سے تہی دامن ہیں۔ صرف انسان ہے جسے جوہرِ عقل سے نوازا گیا ہے۔ اس قدر متنوع مخلوقات سے انسان آگاہ نہیں۔ انہیں صرف وہ جانتا ہے جس نے ان کو پیدا کیا۔ اسی لئے پیدا کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کی گئی ہے۔ کیونکہ اور کسی ذات میں یہ قدرت نہیں کہ وہ کسی کو تخلیق کر سکے۔ تو جب یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مخلوقات کس قدر ہیں تو یہ کیسے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے شرور کی کیا نوعیت ہے اور کیا تعداد ہے۔ اور پھر ان میں کتنی مخلوقات ہیں جن کے شرور سے انسان بچ سکتا ہے اور کتنی مخلوقات ہیں جن کے شرور سے انسان بچنے پر قادر نہیں۔ علاوہ ازیں ایسی کس قدر مخلوقات ہیں جن کے بارے میں انسان غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ انہیں اپنے لئے خیر سمجھتا ہے لیکن حقیقت میں وہ شر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور پھر ایسی کتنی مخلوقات ہیں جو ذرا سے تغافل سے شر کا باعث بن جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مخلوقات کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے کیونکہ یہ سراسر اس کی عظیم صفت قدرت پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن ان کے شرور کی نسبت اپنی طرف نہیں فرمائی۔

Marfat.com

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کیلئے پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس کا ہر کام خیر اور کسی مصلحت ہی کیلئے ہوتا ہے۔ البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف ہیں وہ اس لئے پیدا کئے ہیں کہ اس کی تخلیق کی مصلحت پوری ہو، ان سے بعض اوقات اور بعض اقسام کی مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

انسان کی بے بسی ملاحظہ کیجئے کہ اسے آنحضرت ﷺ کے واسطے سے حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ہر اس مخلوق کے شر سے پناہ مانگو جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ اور اس کی علمی بے بضاعتی کا حال یہ ہے کہ نہ وہ مخلوقات کی تعداد سے واقف ہے اور نہ وہ یہ جانتا ہے کہ مخلوقات سے کون کون سے شرور صادر ہونے کا امکان ہے۔ اب وہ کس مخلوق سے اور کس طرح کے شر سے پناہ مانگے۔ اس لئے پروردگار نے کرم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم اس اللہ کی پناہ مانگو جس نے تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا اور جس نے ان مخلوقات کو ایسے اوصاف سے بہرہ ور کیا جن سے بعض دفعہ یا ہمیشہ شرور کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے جب تم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جاؤ گے تو تم ہر مخلوق سے اور ان سے پیدا ہونے والے ہر طرح کے شر سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ کیونکہ وہ ہر مخلوق کو پوری تفصیلات سمیت نہ صرف جانتا ہے بلکہ ان کے اندر فعلی اور انفعالی کیفیات سے بھی واقف ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝۳

(اور رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے۔ ۳)

عام مخلوقات کے بعد چند خاص مخلوقات سے پناہ مانگنے کا حکم

اَلْغَاسِقِ. اللیل المظلم تاریک رات کو کہتے ہیں۔ وَقَبَ کسی چیز کا کسی چیز میں داخل ہو جانا، اس کے رگ و پے میں سما جانا، یعنی چھا جانا۔

تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دینے کے بعد اب خاص خاص مخلوقات کے شر سے خصوصیت کے ساتھ پناہ مانگنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ ان میں سب سے پہلے رات کی تاریکی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اکثر جرائم پیشہ لوگ جرائم کے ارتکاب کیلئے تاریکی کا انتظار کرتے ہیں۔ اور جہاں ان کو تاریکی کی پناہ ملتی ہے اور دیکھنے والی نگاہیں ان سے غافل ہوتی ہیں وہ جرائم کا ارتکاب کرنے میں دلیر ہو جاتے ہیں۔ تمام موذی جانور رات ہی کو نکلتے ہیں۔ چور رات کو چوریاں کرتے ہیں، ڈاکو رات کو ڈاکے ڈالتے ہیں، قاتل تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خونریزی کرتے ہیں اور عزتیں ہمیشہ تاریکی میں لوٹی جاتی ہیں۔ اور عرب کے جو حالات تاریخ نے ہمارے سپرد کئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے ہر قبیلے میں رات کی تاریکی کو انتہائی خوفناک چیز سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ رات کی تاریکی میں چھاپہ مار نکلتے تھے اور بستیوں پر غارت گری کیلئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ اور جو لوگ کسی کی جان لینے کی سازش کرتے تھے وہ بھی رات ہی کو اوٹ بناتے تھے۔ اور یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ آج شہروں کے رہنے والے اس تاریکی کا شاید تصور نہ کر سکیں جو نزولِ قرآن کے وقت اہلِ زمین میں پائی جاتی تھی۔ اور اہلِ عرب چونکہ ترقی کے ہر کام سے کوسوں دور تھے اس لئے ان کے یہاں اجالا پیدا کرنے کے مصنوعی طریقے بھی بہت حد تک مفقود تھے۔

آیتِ کریمہ میں اگرچہ رات کی تاریکی مراد لی گئی ہے لیکن غاسق کا اطلاق صرف رات ہی کی تاریکی پر نہیں ہوتا بلکہ ہر طرح کی تاریکی پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ اگر اس سے دل و دماغ کی تاریکیاں مراد لی جائیں۔ کیونکہ جب

Marfat.com

دماغ تاریک ہوتے ہیں تو انسان فکری بے مائیگی کا شکار رہتا ہے۔اور جب دل تاریک ہوتے ہیں تو انسان کا صرف عقیدہ ہی نہیں بگڑتا بلکہ اخلاق کی قوتیں نہ صرف سرد پڑ جاتی ہیں بلکہ برائی کی خدمت انجام دینے لگتی ہیں۔اور عمل کی ہر جہت بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت انسانی بگاڑ کا یہی عالم تھا۔اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ تاریکی میں اس صورتحال کو بھی شامل کرلیا جائے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴿۴﴾

(اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے۔ ۴)

روحانی واخلاقی آفتوں سے پناہ مانگنے کا حکم

نَفّٰثٰتِ ، نَفَّاثَة کی جمع ہے۔اس کو مبالغہ کا صیغہ بھی کہا جاسکتا ہے اور مؤنث کا صیغہ بھی۔پہلی صورت میں اس کا معنی ہوگا، بہت پھونکنے والے مرد۔اور دوسری صورت میں بہت پھونکنے والی عورتیں۔اور اگر اس سے نفوس یا جماعتیں مراد لی جائیں تو وہ بھی غلط نہیں۔

الْعُقَدِ، عُقْدَہ کی جمع ہے، اس کا معنی ہے گرہ۔جیسی گرہیں تاکے یا رسی میں ڈالی جاتی ہیں۔جادوگر جب جادو کرتے ہیں تو وہ منتر اور طلسم پڑھ کر تاکے میں گرہ ڈالتے ہیں اور اس پر پھونک مارتے ہیں۔اور یہ لفظ تمام مفسرین کے نزدیک جادو کیلئے استعارہ ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں طلوعِ فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں، جادوگروں یا جادوگرنیوں کے شر سے۔اس مفہوم کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب جادو ہوا تھا تو اس کی صورت یہی تھی کہ لبید بن اعصم یا اس کی بہنوں نے ایک تاگہ لے کر اس میں گرہیں دی تھیں اور جادو کا منتر پڑھ کر ہر گرہ پر پھونکا تھا۔اور یہ عمل آنحضرت ﷺ کے بالوں پر کیا گیا تھا اور پھر انہیں ایک کنوئیں کے پتھر کے نیچے دبا دیا گیا تھا۔اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آکر آنحضرت ﷺ کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ معوذتین کی ایک ایک آیت پڑھتے جائیں اور ایک ایک گرہ کھولتے جائیں۔اس طرح تمام گرہیں کھولی گئیں اور آنحضرت ﷺ اس جادو کے اثر سے آزاد ہوگئے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے دین کے نفوذ اور اس کی بالادستی کیلئے لوگوں میں کام کرتے ہیں، مخالفین جب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ان کے ساتھ ہے اور وہ کسی طرح بھی ان کو ان کے فریضہ سے روکنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور ہر میدان میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابیاں دی ہیں تو پھر وہ آخری چارۂ کار کے طور پر ایسے عظیم لوگوں پر جادو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس لئے آنحضرت ﷺ اور آپ کے واسطے سے دوسرے لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ممکن ہے کہ تمہیں بھی کبھی ایسی صورتحال سے واسطہ پڑے اس لئے ہمیشہ ایسے جادوگر مردوں یا عورتوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے رہو۔اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کی پناہ میسر آگئی تو کسی کا جادو ٹونہ مؤثر نہیں ہوسکے گا۔

جادو کے متعلق ہم پہلے بھی یہ بات واضح کرچکے ہیں کہ جادو کرنے والے عام طور پر شیاطین یا ارواحِ خبیثہ یا ستاروں سے مدد مانگتے ہیں۔اس لئے قرآنِ کریم نے ان کے اس عمل کو کفر قرار دیا ہے۔لیکن اگر وہ کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے ایسا کوئی عمل ان مشرکانہ طریقوں سے ہٹ کر بھی کرتے ہیں تو تب بھی اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔آنحضرت ﷺ نے اسے کبیرہ گناہوں میں شامل فرمایا ہے۔اور اس سے بچنے کی بھی ایک صورت ہے کہ آدمی معوذتین یا معوذات کو اپنا معمول بنا لے۔گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور رات کو سوتے ہوئے۔اسے نہ صرف اپنے اوپر پھونکے بلکہ اپنے گھر اور اہلِ خانہ پر بھی اسے پھونکے۔تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ ایسی ہر آزمائش سے محفوظ رکھے گا۔

Marfat.com

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿٥﴾

(اور حاسد کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے۔ ۵)

حاسدوں کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم

حسد کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابنِ منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے اِذَا تَمَنّٰی اَنْ تَتَحَوَّلَ اِلَیْہِ نِعْمَتَہٗ وَفَضِیْلَتَہٗ اَوْیُسْلِبُھُمَا ھُوَ ''یعنی کسی کی خوشحالی اور عزت کو دیکھ کر جلنا اور یا آرزو کرنا کہ کاش یہ دولت اس کے بجائے مجھے ملتی۔ اس عزت وفضیلت سے اس کی بجائے میں بہرہ ور ہوتا اور اگر یہ چیزیں میرے نصیب میں نہ تھیں تو کم از کم اس سے چھین لی جاتیں، اس کو بھی ان سے محروم کر دیا جاتا۔'' اس کے مقابل ایک اور لفظ استعمال ہوتا ہے جسے غبطہ یا رشک کہتے ہیں۔ حسد میں اور اس میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ حسد کرنے والا اور غبطہ کرنے والا دونوں ہی دوسرے کی عزت اور فضیلت یا اس کا مال و دولت یا اس کی شہرت دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ کاش ہمیں بھی یہ سب کچھ مل جائے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ غبطہ کرنے والا ان نعمتوں کو حاصل کرنے کی خواہش تو رکھتا ہے اور اپنے لئے آرزو بھی کرتا ہے لیکن دوسرے کے پاس ان نعمتوں کو دیکھ کر نہ تو جلتا ہے اور نہ دوسرے سے چھن جانے کی تمنا کرتا ہے۔ البتہ حسد کرنے والا دوسروں کو ان نعمتوں سے بہرہ ور دیکھ کر برداشت نہیں کر پاتا بلکہ اس سے چھن جانے کی دعائیں کرتا ہے۔ ممکن ہو تو اس کیلئے تدبیر بھی کرتا ہے۔ اس لئے حسد کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا اور حسد کرنے والے سے پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی کمینگی اور خستِ طبع کا نتیجہ ہے کہ جس کی برائی صرف خواہش اور آرزو تک محدود نہیں رہتی بلکہ بعض دفعہ اس کے نتیجے میں بڑے بڑے جرائم وجود میں آتے ہیں۔ حاسد دوسرے کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اگر اس کا بس چلے تو وہ اس کے کاروبار کو تباہ کرنے کی تدبیریں کرتا ہے۔ دنیا میں جو پہلا قتل ہوا ہے جس میں قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اس کی وجہ حسد کے جذبے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سے پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ حسد اس وقت برا ہے یا اس وقت اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو جب حسد کرنے والا تم سے حسد کرے یعنی اپنے دل کی آگ بجھانے کیلئے قول یا عمل سے کوئی اقدام کرے۔ تو تم بھی اس سے بچنے کیلئے احتیاط بھی کرو اور اللہ تعالیٰ سے پناہ بھی مانگو۔ اور اس سے پناہ مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو اور یقین رکھو کہ جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور جب تک تمہیں اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ حاسد تمہارے خلاف کوئی اقدام کر رہا ہے اس وقت تک اس کے حسد کی کوئی بات اپنی زبان پر نہ لاؤ۔ حاسد کیلئے یہی سزا کافی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر جلتا بھنتا رہے۔ کیونکہ ایسا شخص کسی وقت بھی قلبی سکون حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمیشہ ایک بے کلی اور بے چینی اس کی قسمت بنی رہتی ہے اور یہ سزا اس کیلئے کافی ہے۔ لیکن اگر وہ قدم آگے بڑھا کر محسود کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ محسود ضروری نہیں کہ اس کے اقدامات سے آگاہ ہو۔ اس کے بچنے کی بہتر صورت یہی ہے کہ وہ اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا رہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ کی پناہ مل گئی دنیا بھر کے بداندیش بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَةُ النَّاسِ

(۱۱۴)

Marfat.com

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٦	سُوْرَةُ النَّاسِ مَكِّيَّةٌ (۱۱۴)	رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾
مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ﴿۴﴾ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ
صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾

رکوع: ۱۔ (کہہ دیجئے! میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی۔ ۱) انسانوں کے بادشاہ کی۔ ۲) انسانوں کے حقیقی معبود کی۔ ۳) اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے، جو بار بار پلٹ کر آتا ہے۔ ۴) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا رہتا ہے۔ ۵) خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ ۶)

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿۳﴾

(کہہ دیجئے! میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی۔ ۱) انسانوں کے بادشاہ کی۔ ۲) انسانوں کے حقیقی معبود کی۔ ۳)

اللہ تعالیٰ کی تین صفتوں کے واسطے سے پناہ

تعوذ کا مفہوم ہم گزشتہ سورۃ کی تشریح میں عرض کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اسمِ ذاتی لانے کی بجائے اس کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام رب الفلق کے ذکر کرنے کا سبب کیا ہے اور پیشِ نظر سورۃ میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کو تین صفاتی ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اور تین حوالوں سے اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اور وہ تین صفاتی نام یہ ہیں رب الناس، یعنی تمام انسانوں کا پروردگار۔ ملک الناس، یعنی تمام انسانوں کا بادشاہ اور حاکم و فرمانروا۔ اور الٰہ الناس، یعنی تمام انسانوں کا حقیقی معبود۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ گزشتہ سورۃ میں ان مضرتوں اور شر انگیزیوں سے پناہ طلب کی گئی تھی جن کا تعلق انسان کے ظاہری حالات اور جسمانی ضروریات سے

Marfat.com

ہے۔اس لئے اس کیلئے رب الفلق کا اسمِ مبارک تجویز کیا گیا ہے۔یعنی اس رب کی پناہ مانگو جو طلوعِ سحر کا رب ہے۔رب پالنے والے،یعنی صفتِ ربوبیت کے حامل کو کہتے ہیں اور ربوبیت کا تعلق اگرچہ انسان کی معنوی اور روحانی دنیا سے بھی ہے لیکن زیادہ تر اور ظاہری طور پر اس کا تعلق انسان کی جسمانی اور ظاہری ضرورتوں سے ہے۔اور مزید یہ بات بھی کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں جس کا تعلق انسانی ضرورتوں سے ہے اس سے کسی مشرک کو انکار نہیں۔اہلِ عرب بھی جس طرح اللہ تعالیٰ کو خالق اور رازق مانتے تھے،اسی طرح رب بھی تسلیم کرتے تھے۔یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں دوسروں کو شریک بھی کر رکھا تھا اور اپنے احبار و رہبان کو بھی ارباب میں شامل کر رکھا تھا۔لیکن جہاں تک ملک اور الٰہ کا تعلق ہے اس کے نہ وہ حقیقی مفہوم سے واقف تھے اور نہ وہ ان کے حقیقی حقوق سے آگاہ تھے۔اس سورۃ میں جس بات کیلئے پناہ طلب کی جارہی ہے وہ ہر شخص کی ایمانی زندگی اور اس پر ہونے والے حملے ہیں۔اس لئے ضروری تھا کہ اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو ذکر کیا جائے جن کا تعلق براہِ راست ایمان اور انسان کی روحانی زندگی سے ہے۔کیونکہ ملک حکمران اور بادشاہ کو کہتے ہیں۔جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے تو اس کا ایمان ناقابلِ اعتبار ہوگا جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کر لیتا۔اسے مطاعِ مطلق نہیں جانتا۔اسے مقنن اور قانون ساز نہیں مانتا اور زندگی کے بنیادی فیصلوں اور اساسی باتوں کے حق کا فیصلہ صرف اسی کے حوالے نہیں کرتا۔وہ اگر اللہ تعالیٰ کے سامنے سر بھی جھکاتا ہے لیکن ساتھ ہی حکم دینے کا کسی اور کو اختیار بھی دیتا ہے وہ عبادت اللہ تعالیٰ کی کرتا ہے لیکن اطاعت غیر اللہ کی کرتا ہے۔وہ زندگی کی ضروریات اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے لیکن غیر مشروط بندگی دوسروں کی کرتا ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو ملک تسلیم نہیں کیا۔اگر ایسا ہوتا تو ہر طرح کی حکمرانی چاہے وہ کسی عبادت گاہ میں ہو یا زندگی کے کسی اور مقام پر،چاہے معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی،اس میں یہ حق وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں دیتا۔کیونکہ:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری

اسی طرح ملک کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جس دوسری صفت کو ذکر کیا گیا ہے،وہ ہے اِلٰہ النَّاس۔حقیقی اِلٰہ اس ذات کو کہتے ہیں جو عبادت کا استحقاق رکھتا ہو،اور جو حقیقت میں معبود ہو،خواہ لوگ اس کی عبادت کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں۔جس طرح اللہ تعالیٰ کو ماننے اور اس پر ایمان لانے میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے،اسی طرح اس کی الوہیت کو بھی اساسی درجہ حاصل ہے۔عبادت کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ تمام اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص ہیں۔کیونکہ وہی ایک اِلٰہ ہے باقی جس کسی نے بھی اپنے لئے عبادت کا حق غصب کر رکھا ہے وہ درحقیقت اِلٰہ نہیں،بلکہ وہ طاغوت ہے جس کا وہی انجام ہوگا جو شیطان کا ہوگا۔ان تین بنیادی صفاتی ناموں کو ذکر کرنے اور ان کے حقوق کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس بات کا ذکر فرمایا جس سے بچنے کیلئے اس ذاتِ بالا بلند کی پناہ طلب کی گئی ہے جو رب ہونے کے ساتھ ساتھ ملک بھی ہے اور اِلٰہ بھی۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ڏ الْخَنَّاسِ ۝۴ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵

(اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے،جو بار بار پلٹ کر آتا ہے۔ ۴) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا رہتا ہے۔ ۵)

Marfat.com

وَسْوَاسِ کا مفہوم

وسواس کا معنی ہے بار بار وسوسہ ڈالنے والا۔ اور وسوسہ حدیثِ نفس کو کہتے ہیں۔ یعنی نہایت خاموشی اور پے در پے کسی کے دل میں کوئی بری بات اس طرح ڈالنا کہ اسے خیال تک نہ گزرے کہ میرے دل میں کوئی چیز اتاری جا رہی ہے۔ اس عمل کو وسوسہ اندازی کہتے ہیں۔

شیطان کی وسوسہ اندازی کی تکنیک

الخَنَّاسِ پیچھے کھسک جانے والے، دبک جانے والے اور پلٹ پلٹ کر وسوسہ ڈالنے والے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی برائی کو کسی دل میں ڈالنے کیلئے ایک دفعہ کی کوشش کبھی کارگر نہیں ہوتی۔ وسوسہ ڈالنے والے کو یہ عمل بار بار کرنا پڑتا ہے۔ گویا کہ تکرار اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ برائی کا عادی نہیں تو اسے برائی سے طبعی نفرت ہوتی ہے۔ جب کسی برائی کا بھی خیال اس کے دل میں ڈالا جاتا ہے تو وہ فوراً اسے جھٹکنے کی کوشش کرتا ہے۔ وسوسہ اندازی کرنے والا چونکہ اس تکنیک کو خوب سمجھتا ہے اس لئے وہ فوراً پیچھے ہٹ کر دبک کر بیٹھ جاتا ہے اور پسپائی اختیار کرتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اسے اپنا مقصد بنا چکا ہے اس لئے ایسے شخص کے دل میں پھر وہی بات ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اگر وہ پھر اسے برا مانتا ہے تو وہ پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لیکن مسلسل وہ یہ عمل جاری رکھتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جس کے دل میں خیال ڈالا جا رہا ہے اس کا ردِعمل کمزور پڑنے لگتا ہے اور ہوتے ہوتے وہی بات جسے وہ سننا گوارا نہ کرتا تھا، وہ اس کی خواہش بن جاتا ہے۔ پھر مزید وسوسہ اندازی اس خواہش کو بری نیت اور برے ارادے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر جب اس وسوسہ اندازی کی تاثیر میں تیزی آتی ہے تو یہ ارادہ عزم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور پھر آخری قدم برائی کا ارتکاب ہے۔ اس میں آپ نے دیکھا کہ خناس یعنی وسوسہ اندازی کرنے والا وہ ایک ہی دفعہ کان میں بری بات ڈال کر یا دل میں کوئی خیال اتار کر اطمینان سے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ پلٹ پلٹ کر حملے کرتا ہے اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ وسوسہ اندازی کا اسلوب بدلتا رہتا ہے، کبھی وہ اسے نصیحت کی شکل دیتا ہے، کبھی وقت کے چلن کی، کبھی مفادات کے پردے میں اور کبھی اندیشوں کے ہجوم میں اسے اندرونی طلب میں تبدیل کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہ وہ خطرناک صورتحال ہے جس سے پناہ مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور اس میں پناہ اس بات سے نہیں مانگی جاتی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس برائی کے ارتکاب سے محفوظ کر دے بلکہ اس بات میں اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کی جاتی ہے کہ وہ شیطان کو اس کا موقع نہ دے کہ وہ کسی عملِ شر کیلئے وسوسہ اندازی کا آغاز کر سکے۔

شیطان کی تکنیک کے بعد اس کی تدریج کا ذکر

اگر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیں تو جس طرح ہمیں شیطان کی تکنیک کا اندازہ ہوتا ہے، اسی طرح اس کی تدریج کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے کفر و شرک اور دہریت پر ایک مسلمان کو آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں ناکامی ہو تو کسی بدعت کی راہ دکھاتا ہے۔ اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہو سکے تو پھر اس کے دل میں کسی گناہ کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ اور اگر اس پر بھی ردِعمل نظر آئے تو پھر یہ بات سمجھاتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہ کر لینے میں کیا حرج ہے۔ اولاً تو یہ حربہ انتہائی کارگر ثابت ہوتا ہے اور اگر اس میں

Marfat.com

بھی ناکامی نظر آئے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے دین کو بالادست کرنے کے تصور سے لاتعلق یا غیر جانبدار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔اور جس طرح کے حالات سے ہم گزر رہے ہیں یہ وسوسہ دلوں میں بہت جلدی اپنی جگہ بنا تا ہے۔کیونکہ اس طرح آدمی کی اپنی عبادات اور چھوٹی موٹی نیکیاں بھی محفوظ رہتی ہیں اور اپنی جگہ آدمی مطمئن رہتا ہے کہ وہ کسی برائی کا ارتکاب تو نہیں کرتا۔لیکن اسے یہ خیال کبھی نہیں پریشان کرتا کہ اگر معاشرے میں میں اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کی کوششوں میں شریک نہیں ہوں تو آخر اس معاشرے کو مسموم ہونے سے کون بچائے گا۔اور پھر اگر وہ ملازمت پیشہ آدمی ہے تو وہ خوب جانتا ہے کہ میری ملازمت کا تحفظ اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کی کسی بھی کوشش سے غیر جانبدار رہنے میں ہے، ورنہ یہی چیز میرے لئے نقصان کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔یہ وہ تدریجی مدارج یا شیطان کے تلبیسی پھندے ہیں جنہیں شیطان حسب موقع استعمال کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والے کیلئے از بس ضروری ہے کہ وہ ان باتوں کا شعور پیدا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ہر موقع پر پناہ طلب کرتا رہے

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿٦﴾

(خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ ۶)

شیطان کے ہمنواؤں کا ذکر

یعنی وہ ابلیسِ رجیم جسے شیطان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس آیتِ کریمہ میں اس کے خاندان یا اس کے ہمنواؤں کا حوالہ دیا گیا ہے۔یعنی وسوسہ اندازی کا عمل اس قدر وسعت رکھتا ہے کہ اس ڈیوٹی پر متعین صرف جنات ہی نہیں، انسان بھی ہیں۔جنات میں کچھ تو وہ ہیں جو ابلیس کا اپنا خاندان یعنی اس کی اپنی اولاد ہے۔اور کچھ وہ ہیں جو اس کی تبلیغ و دعوت، یعنی وسوسہ اندازی کے عمل سے متاثر ہوئے اور اب بگاڑ کی اس انتہا کو پہنچ گئے ہیں کہ انہوں نے وہی کچھ کہنا اور کرنا شروع کر دیا ہے اور اسی کو اپنا مقصد بنا چکے ہیں جو مقصد ابلیس کا ہے۔اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ یہ ابلیس سے ذاتی اعتبار سے تو کوئی قربت نہیں رکھتے کیونکہ وہ جنات میں سے ہے اور یہ انسان ہیں۔لیکن اس کی مسلسل وسوسہ اندازی سے جس کی اس نے جدید ترین شکلیں پیدا کر دی ہیں اس حد تک متاثر ہو چکے ہیں کہ انہوں نے شیطان کی جگہ لے لی ہے۔تعلیمی اداروں میں ابلیس نے صرف یہ کیا کہ کسی اولیں فیصلہ کرنے والے کے دماغ میں مخلوط تعلیم کا تصور پیدا کیا۔اب اس کے جو برگ و بار پیدا ہو رہے ہیں ان کو بروئے کار لانے کیلئے ابلیس کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں، ہر ادارہ اس میں خود کفیل ہے۔تعلیمی نصاب کی تبدیلی میں یقیناً اس کی کوششیں شامل ہیں۔لیکن اب اس تعلیمی نصاب سے جو ذہن تیار کئے جا رہے ہیں اور کتنے ہیں جو اس سے پہلے تیار ہو کر اساتذہ کی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔اب وہ اس عمل کو جس طرح آگے بڑھا رہے ہیں اس میں ابلیس کو کوئی تکلیف اٹھانے کی بالکل ضرورت نہیں۔یہی حال ہمارے سیاستدانوں کا، ہمارے تاجروں کے اداروں کا، ہمارے نیشنل سنٹروں اور تفریحی اداروں کا ہے۔ان میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جو شیطان کے مشن کو آگے نہیں بڑھا رہا۔اب عافیت کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہر مومن و مسلم اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔اور اس پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا سب کچھ اس راہ میں جھونک دے۔

Marfat.com

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں (القرآن)

هُدًى لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(جلد: ۱۲)

سُورَۃُ المُلک (٦١) ...... سُورَۃُ النَّاس (١١٤)

مؤلف

مولانا ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی

Marfat.com